ماءالملوک
نگہت سیما

# ماءالملوک

## نگہت سیما

# قسط نمبر 1

وہ ماہ الملوک تھی.......

ہر دکھ، ہر پریشانی اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔ اپنے اندر اتار لیتی بنا کوئی شکوہ کیے۔

صرف اپنے ہی نہیں، دوسروں کے غم اور دکھ بھی اپنے دل میں اتار لیتی تھی، یوں جیسے اس کے اپنے دکھ ہوں۔

اور کبھی کوئی خوشی ملتی تو دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا دیتی تھی۔ نہ خوشی میں آپے سے باہر ہوتی نہ غم میں واویلا کرتی۔

دادا اسے ماہ الملوک کہتے تھے اور وہ زحل شاہ زیب تھی، مرزا شاہ زیب اور مریم شاہ زیب کی اکلوتی بیٹی۔

☆......☆......☆

لاہور کے ذکی دروازے کی اندرونی اور بیرونی سمت شان دار حویلیاں تھیں۔ کچھ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اور کچھ مسلمانوں کی اپنی تعمیر کردہ۔ ان ہی حویلیوں میں سے ایک حویلی مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنائی تھی۔ نابینا افراد کے اسکول سے ذرا سا آگے جائیں تو دائیں طرف ایک شان دار حویلی تھی جسے موروں والی حویلی کہتے تھے۔ کیونکہ صدر دروازے کے دونوں اطراف نیلی اور سفید چینی کی ٹائلیں تھیں، ان میں مور نقش کیے گئے تھے۔

چھت تک اونچے لکڑی کے پیتل کے کیلوں جڑے دروازے کے دونوں طرف، ٹائلوں کے اندر نقش ہوئے دونوں مور کئی ٹائلیں ٹوٹ جانے کی وجہ سے آدھے ادھورے رہ گئے تھے۔ اس کیلوں

جڑے دروازے سے اندر جائیں تو ایک طویل اور کشادہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی میں صدر دروازے کے دائیں بائیں روشن دان تھے، جن میں شیشے لگے تھے۔ ان شیشوں سے آنے والی دھوپ اور روشنی سے ڈیوڑھی سورج غروب ہونے تک روشن رہتی تھی۔ البتہ رات میں پیلی روشنی والا بلب جلتا رہتا تھا۔ ڈیوڑھی میں دائیں طرف دو واش روم تھے جو غالباً حویلی کی تعمیر کے وقت ملازموں کے لیے بنوائے گئے ہوں گے۔

وقت کے ساتھ ساتھ حویلی میں جہاں اور تبدیلیاں ہوئی تھیں، انہیں بھی جدید تقاضوں کے مطابق بنا دیا گیا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ تھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا۔ مہمان خانہ ایک مکمل گھر تھا۔ سٹنگ، بیڈ روم، اٹیچڈ باتھ، چھوٹا سا کچن۔

شاہ زیب بیگ نے اسے جدید تقاضوں کے مطابق فرنشڈ کر رکھا تھا کہ جب وہ جاب میں تھے تو ان کے دوست احباب آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام بھی کرتے تھے لیکن اب بہت کم مہمان خانہ کھلتا تھا لیکن اس کی صفائی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ دائیں طرف واش رومز کے پاس سیڑھیاں اوپر پہلی منزل تک جاتی تھیں۔

ہمایوں بیگ کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی یہ سیڑھیاں، عموماً گھر کے ملازمین استعمال کرتے تھے جبکہ گھر کے افراد اندرونی سیڑھیاں استعمال کرتے تھے۔ البتہ آج کل یہ سیڑھیاں گھر کے افراد کے استعمال میں ہی تھیں۔ ڈیوڑھی کے اختتام پر لکڑی کا منقش دروازہ تھا، جو ایک کشادہ صحن میں کھلتا تھا۔ صحن میں دروازے کے دونوں اطرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ کیاریوں کے اختتام پر دائیں طرف آم اور بائیں طرف جامن کا درخت تھا۔ جامن کے درختوں کے ساتھ ہی لیموں کا درخت بھی تھا۔

مشرق اور مغرب دونوں طرف سے چکردار سیڑھیاں پہلی منزل تک جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کشادہ کچن تھے۔ کبھی دونوں کچن بہت آباد رہتے تھے۔ شاہ زیب بیگ اور ظفریاب بیگ کے مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لیکن اب مدت سے مغربی سمت والا کچن بند تھا۔ مرزا جہاں زیب اس

موروں والی حویلی کے تنہا وارث تھے۔ کیونکہ وہ بھی اکلوتے تھے اور ان کے والد بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ بڑے دونوں بیٹے اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ اوپر والی منزل پر رہتے تھے، جبکہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاہ زیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا بیٹا شاہ رخ پھر دو بیٹیاں اور پھر ایک بیٹا، جبکہ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ سو پہلی منزل پر خوب رونق رہتی تھی جبکہ گراؤنڈ فلور پر زیادہ تر خاموشی رہتی تھی۔

مرزا جہاں زیب اور شاہ زیب بیگ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے۔ آزین کی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ حویلی میں کم ہی ٹکتا تھا اور زل شاہ زیب تھی جو سارا دن اکیلی، حویلی کے خالی کمروں میں چکراتی پھرتی تھی۔ آزین کے والد کچھ عرصہ پہلے اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ امریکہ سیٹل ہو گئے تھے۔ یوں گراؤنڈ فلور پر ان دنوں کل چار افراد تھے لیکن نہیں، ان چاروں کے علاوہ گراؤنڈ فلور پر ایک اور مکین بھی تھا جس کا ٹھکانہ ڈیوڑھی تھا۔ یہ شیخو بابا تھا۔ جس کا اصل نام تو شہزادہ سلیم تھا لیکن کئی سال پہلے مرتضیٰ ارباب نے اسے شیخو بابا کا نام دیا تھا۔ اب وہ سب کا شیخو بابا تھا۔ ہولے ہولے سب اس کا اصل نام بھول گئے تھے۔ دراصل ان دنوں مرتضیٰ ارباب کے زیر مطالعہ امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' تھا۔

وہ اپنے کالج میں یہ ڈرامہ اسٹیج کر رہے تھے۔ اس روز نہ جانے کس کام سے مرزا جہاں زیب نے شہزادہ سلیم کو آواز دی تھی۔

''شہزادہ سلیم......آہ! میرا شیخو۔ آؤ باپ کے گلے لگ جاؤ۔''

وہ ڈرامے میں شہزادہ سلیم کے باپ بادشاہ اکبر کا کردار ادا کرنے والا تھا اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اپنے مکالمے بولتا رہتا تھا تو یوں شہزادہ سلیم کو شیخو بابا کا نام مل گیا تھا۔ سب کو شہزادہ سلیم کی نسبت

بلانے میں زیادہ آسان لگا تھا۔

اس کی عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ لیکن جب وہ اٹھارہ انیس سال کا تھا تب سے سب کا شینخو بابا تھا۔ مہرین، ماہ وش اور بلال اور رنگ زیب تو اکثر اسے صرف بابا کہہ کر ہی بلا لیتے تھے حالانکہ وہ بابا تو کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا۔ سیاہ بال زلفوں کی صورت کندھوں تک بکھرے رہتے تھے۔ مغل شہزادوں جیسی آنکھیں، گورا رنگ، اونچی ناک......

زل کا خیال تھا کہ وہ ضرور کسی مغل شہزادے کی اولاد ہوں گے۔ ڈیوڑھی میں ہر وقت اس کی چارپائی بچھی رہتی تھی۔ جب کسی کام سے باہر جاتا تو بستر لپیٹ کر پائنتی رکھ دیتا تھا۔ جب گھر میں ہوتا تو اسی چارپائی پر لیٹ کر میر وارث شاہ، جنگ نامۂ حامد اور ایسی ہی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں اخبار بھی نظر آتا تھا۔

حویلی کے حالیہ مکینوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شینخو بابا کون تھا کہاں سے آیا تھا۔ اس کا خاندان کہاں تھا، ماں، باپ، بہن بھائی تھے یا نہیں۔ وہ تقریباً شاہ رخ کا ہم عمر تھا۔ یا شاید ایک سال بڑا یا چھوٹا ہو۔ کسی نے کبھی اس سے اس کی عمر نہیں پوچھی تھی۔ بس خود ہی اندازہ لگا لیا تھا۔ نوجوان نسل نے ہوش سنبھالنے کے بعد اسے یہاں ہی دیکھا تھا۔ بڑوں میں سے کسی کو علم بھی ہو تو کسی نے ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کی چارپائی کے ساتھ، دیوار میں بنے طاقچے پر انٹرکام رکھا رہتا تھا۔ حویلی کے مکینوں کے باہر کے سب کام اس کے ہی ذمے تھے۔

زل شاہ زیب سوچتی تھی، اگر شینخو بابا نہ ہوتا تو حویلی کے مکینوں کے باہر کے کام کون کرتا۔ سارے کام رک جاتے، دوپٹے رنگوانے سے لے کر سبزی گوشت تک لانا اس کے ہی ذمے تھا۔ حویلی اور ڈیوڑھی میں ایسے کئی طاقچے تھے۔ لاہور میں جب بجلی نہیں آئی تھی تو شاید ان طاقچوں میں لالٹین یا لیمپ رکھے جاتے ہوں گے۔ یہ زل کا خیال تھا اور کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

اور یہاں، اس موروں والی حویلی کے گراؤنڈ فلور میں بڑا سکون تھا لیکن مشرقی سیڑھیوں کے تیسرے پوڑے پر بیٹھی ہوئی زل شاہ زیب نے سوچا کہ زندگی اتنی بے رنگ اور بور کیوں لگتی ہے۔ شاید

اس لیے کہ زندگی میں کرنے کو کچھ خاص نہیں۔ یونی ورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھی۔

اور زل شاہ زیب کو لگتا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں کبھی بھی اتنی طویل نہیں ہوتی تھیں جتنی اس بار لگتی تھیں۔ اوپر والے ان دنوں کم ہی نیچے آتے تھے۔ ان کی اپنی زندگیاں اور اپنی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ مرزا جہاں زیب ان دنوں اپنی کتابوں کی مرمت میں مصروف تھے اور وہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ان کے کمرے سے ملحق ہی ان کا اسٹڈی روم تھا۔ دیوار گیر الماریوں میں سینکڑوں نایاب کتابیں تھیں۔ الماریوں میں دیوار کی طرف سے سیم آگئی تھی، جس نے بہت سی قیمتی اور نایاب کتابوں کو تباہ کر دیا تھا اور زیب النساء مخفی کا دیوان ڈھونڈتے ہوئے زل نے ہی دادا کو بتایا تھا کہ کتابوں کو شاید دیمک لگ گئی ہے اور پھر دادا کے ساتھ مل کر اس نے سب کتابوں کو دھوپ لگوائی تھی۔

کچھ کتابیں تو بالکل راکھ ہو گئی تھیں، بوسیدہ اوراق الگ کر کے کتابوں کی مرمت کی جا رہی تھی۔

اور شاہ زیب بیگ تو مریم کے بعد گوشہ نشین ہی ہو گئے تھے۔

''اور پتا نہیں ابا ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔ اتنے چپ چاپ، اتنے خاموش، جانے ان کے دل میں کیا ہے، کیا سوچتے رہتے ہیں۔''

کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ ابا اس سے باتیں کریں۔ اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھیں، اس کی کامیابیوں پر خوش ہوں۔ وہ اماں کو یاد کر کے اداس ہو تو اسے گلے سے لگا کر تسلی دیں۔ وہ جب چھوٹی تھی تو وہ بہت کم گھر آتے تھے۔ تب بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ابا اس سے اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھیں اور وہ اپنے انعامات انہیں دکھائے لیکن تب بھی ابا آتے تو محض اس کا رخسار سہلا کر ذرا سا مسکرا کر اسے دیکھتے اور بس......

ان کا زیادہ وقت مہمان خانے میں ہی گزرتا تھا، ہمیشہ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی مہمان ہوتا تھا۔

وہ دور دور سے انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ وہ اتنے شان دار، اتنے بارعب لگتے تھے۔ وہ چاروں بھائیوں میں سے سب سے زیادہ وجیہ اور خوب صورت تھے۔ اور اب جب کہ وہ گھر پر ہوتے تھے، تب بھی، ہاں! تب بھی وہ اس سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے کہ پہلے۔ بلکہ اب تو وہ خود سے بھی بے نیاز

تھے۔ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھے خلاؤں میں جانے کیا تکتے رہتے تھے۔ اگر وہ ان سے کھانے اور کپڑے بدلنے کے لیے نہ کہے تو شاید وہ ہفتوں نہ کھانا کھائیں نہ کپڑے بدلیں۔ حالانکہ کتنے ویل ڈریسڈ ہوتے تھے۔ شہزادوں کی سی آن اور شان والے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر دیوار کے ساتھ بنی پھولوں کی کیاریوں میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھا۔

''اور آزین...... آزین پتا نہیں کہاں ہوتا ہے آج کل۔ صبح ناشتہ کر کے جو گھر سے نکلتا ہے تو شام کو ہی اس کی شکل نظر آتی ہے۔''

پچھلے سال اس نے ایم بی اے کیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں تلاش کے باوجود ابھی تک اسے اپنے مطلب کی جاب نہیں ملی تھی۔ دائیں کہنی گھٹنے پر ٹکائے اور دائیں ہاتھ کی ہی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے اس نے سوچا اسے آزین سے پوچھنا تو چاہیے کہ وہ صبح سے شام تک کہاں غائب رہتا ہے اور مرتضٰی یا ارباب تایا کی آفر کیوں نہیں قبول کر لیتا۔ ارباب تایا نے کہا تھا کہ فارغ رہنے کے بجائے وہ ان کی فیکٹری جوائن کر لے۔

ان کی فیکٹری میں مختلف جوسز، دودھ اور ایسی ہی دوسری پراڈکٹس کے ڈبے وغیرہ بنتے تھے جبکہ مرتضٰی اپنا الگ کام کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس کئی پلان تھے اور وہ چاہتا تھا کہ آزین اس کے ساتھ پارٹنرشپ کر لے لیکن آزین ایسا نہیں چاہتا تھا۔

''پتا نہیں کیوں...... اور دادا بھی اسے نہیں سمجھاتے تھے کہ اس طرح فارغ رہنا اچھا نہیں ہے۔ بی بی اماں کہتی تھیں فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ لیکن دادا تو اسے کبھی کچھ نہیں کہیں گے۔ دادا کا لاڈلا جو ہوا۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

''اور کیا ہو کہ بی بی ان چھٹیوں میں آ ہی جائیں۔ ان بور اور اکتا دینے والے روز و شب میں بی بی اماں کے آنے سے ہی کچھ ہلچل ہو جائے۔ بی بی اماں ہوتی تھیں تو دن بھر آس پاس کے گھروں اور حویلیوں سے خواتین ان سے ٹوٹکے نسخے اور کچھ نہ کچھ پوچھنے آتی رہتی تھیں۔''

بی بی اماں کی والدہ کم عمری میں موروں والی حویلی میں آتی تھیں۔ دادی نے اسے بتایا تھا کہ

انہیں شاہ زیب کے لیے رکھا گیا تھا کہ شاہ زیب اور اختر بانو کی عمروں میں بس سوا سال کا ہی فرق تھا اور دو چھوٹے بچوں کو سنبھالنا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دادی کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں خانساماں غلام شبیر اپنی بھانجی شاہ جہاں بیگم کو لے آیا تھا۔ جس کے والدین دو سال پہلے آگے پیچھے چل بسے تھے اور ددھیال میں کوئی رکھنے کو تیار نہ تھا۔ یوں شاہ جہاں بیگم موروں والی حویلی میں آئیں تو ادھر کی ہو رہی تھیں۔ دادی نے ہی ان کی شادی کروائی تھی۔ بی بی اماں ان ہی کی بیٹی تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہوئیں تو حویلی میں آ گئیں۔

اولاد کوئی تھی نہیں۔ شاہ جہاں بیگم اور بہن بھائیوں نے دوبارہ شادی کے لیے بہت کہا لیکن وہ تیار نہ ہوئیں۔ شاہ رخ سے لے کر زمل تک سب ان کی گود میں ہی پلے تھے۔ پتا نہیں کب کس نے انہیں پہلی بار بی بی اماں کہا تھا کہ پھر سب ہی انہیں بی بی اماں کہنے لگے تھے۔ چھ ماہ پہلے وہ اپنی چھوٹی بہن کے پاس قصور چلی گئی تھیں کہ وہ بیمار تھیں۔ شاید کینسر تھا انہیں اور وہ بار بار انہیں بلاتی تھیں کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھیں۔

''اللہ کرے بی بی اماں ہی آ جائیں تو یہ بوریت کچھ تو کم ہو۔'' اس نے صحن میں چاروں طرف نظر دوڑائی تب ہی کوئی اوپر سیڑھیوں سے دبے پاؤں اترتا، اس کے پیچھے والے قدمچے پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی اس کے مخصوص کلون کی خوشبو سے پہچان گئی تھی کہ وہ آزین ہے۔ یوں بھی اوپر والے تو کہیں آنے جانے کے لیے ڈیوڑھی کی سیڑھیاں کم ہی استعمال کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار جب انہیں زمل سے کوئی کام ہوتا یا دادا سے ملنا ہوتا تو تب ہی اندرونی سیڑھیوں کو استعمال کرتے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ تم اس وقت اوپر سے کیسے آ رہے ہو؟''

''سیڑھیوں سے اپنے پاؤں پر چلتا ہوا۔'' وہ مدھم سا مسکرایا تھا۔

''میرا مطلب ہے اس وقت تو تم نے باہر جانا ہوتا ہے اپنے دوستوں کی طرف۔'' اس نے اب بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں آج موڈ نہیں بنا کہیں جانے کا۔ مرتضیٰ کی طرف گیا تھا۔'' وہ ایک سیڑھی نیچے اتر کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

''دادا جان کیا کر رہے ہیں؟''

''اپنی کتابوں کی مرمت کر رہے ہیں جو صفحات صحیح تھے ہم نے انہیں جوڑ کر آج کور چڑھانے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ردی کا یہ ڈھیر سنوار کر بھلا کیا کریں گے آپ لوگ؟'' اسے یہ سب فضول لگتا تھا۔

''کیا مطلب ردی کا ڈھیر؟'' زل نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''قلمی نسخے، قیمتی اور نایاب کتابیں تمہاری نظر میں ردی کا ڈھیر ہیں۔''

''ہاں تو بھلا دادا جان کے بعد کس نے ان بوسیدہ کتابوں کو سنبھال کر رکھنا ہے۔'' اب وہ ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں...... میں رکھوں گی سنبھال کر......'' اس نے تفاخر سے کہا۔ ''اتنا قیمتی خزانہ ہے یہ تم کیا جانو ان کی قدر......''

''اور یہ قیمتی خزانہ ایک دن بے کار چلا جائے گا۔'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''ایسے ہی بے کار چلا جائے گا۔ میں اسے پنجاب لائبریری کو ڈونیٹ کر دوں گی مرنے سے پہلے۔''

اسے آزین کا اس طرح کہنا برا لگا تھا۔ وہ ایک بار پھر کیاریوں کی طرف دیکھنے لگی تھی جہاں اب بھی خاکستری چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ کیاریوں کے پاس ہی مٹی کی سکوریوں میں، وہ صبح صبح ہی باجرہ اور پانی ڈال کر رکھ دیتی تھی۔

''تمہاری یہ چڑیاں بہت شور کرتی ہیں۔ صبح سویرے جگا دیتی ہیں، تم یہ باجرہ اور پانی کہیں کسی اور جگہ نہیں رکھ سکتیں زل......''

اس نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں کیاریوں کے آس پاس پھدکتی چڑیوں کو دیکھا۔ زل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور کیاریوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ناراض ہو۔''

''کیوں......؟''

زمل نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ اتنی خوب صورت، اتنی گھنی پلکیں، لمحہ بھر کے لیے تو وہ پلکوں کے اس گھنے جنگل میں الجھ سا گیا تھا اور نظریں ان جنگلوں سے نہیں ہٹا سکا تھا۔

''تمہاری اور دادا جان کی کتابوں کو بے کار جو کہا ہے۔''

''اس میں بھلا ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ سب کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ کسی کے لیے کوئی چیز قیمتی ہو سکتی ہے، اور کسی کے لیے وہی چیز بے کار۔ یہ تو دل سے جڑے احساسات ہوتے ہیں جو کسی چیز کو قیمتی بناتے ہیں اور کسی کو بے قیمت۔''

''شاید تم صحیح کہتی ہو۔''

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

''آزین تم صبح کے گئے رات کو گھر آتے ہو، کیا کرتے پھر رہے ہو آخر اور یہ تمہارے آخر کون سے دوست ہیں جو سارا دن فارغ ہوتے ہیں۔''

زمل نے آج پوچھ ہی لیا تھا۔

''تو گھر میں سارا دن رہ کر کیا کروں؟ چچا جان گوتم بدھ بنے جانے کس دھیان گیان میں گم رہتے ہیں۔ دادا اپنی کتابوں میں گم اور تم......تم کبھی دادا جان کی مددگار بنی ہوتی ہو اور کبھی اوپر والوں کے دکھڑے سن رہی ہوتی ہو۔ مجھے تو تم ملتی ہی نہیں ہو۔''

اس نے گلہ کیا تھا یا یوں ہی بتایا تھا۔ زمل نے رخ موڑ کر بغور اسے دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں تھیں اور اندر کی تلخی اس کے چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی تھی۔

''تم آخر سب سے اتنے خفا کیوں ہو زین؟'' زمل کے لہجے میں نرمی تھی، گداز تھا۔

''دوسروں سے نہیں، خود سے خفا ہوں زمل، اپنے آپ سے ناراض رہتا ہوں۔''

''کیوں زین، کیوں خفا ہو خود سے۔'' وہ بے چین سی ہوئی تھی۔ ''کوئی مسئلہ ہے، کوئی پریشانی

ہے تو مجھے بتاؤ۔ مجھ سے تو شیئر کر سکتے ہونا، اور کسی سے نہ بھی کرو تو مجھ سے تو......"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے زمل، بس جاب نہ ملنے کی وجہ سے تھوڑا اپ سیٹ رہتا ہوں بس۔"

اب اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

"جاب تو ملتی ہی ہے تمہیں لیکن تم پتا نہیں کیا چاہتے ہو۔ مرتضیٰ بتا رہا تھا کہ تمہیں ایک بہت اچھی جاب ملی تھی پچھلے ہفتے لیکن۔"

"اور مرتضیٰ نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ تنخواہ کتنی کم دے رہے تھے۔" اس نے تلخی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"تو ابتدا میں تو ایسا ہی ہوتا ہے زین۔ وقت کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔ جب انہیں تمہاری کارکردگی، تمہاری ذہانت کا اندازہ ہوجاتا تو خود ہی بڑھا دیتے تمہاری تنخواہ۔"

زمل کا انداز سمجھانے والا تھا۔ آزین خاموش ہی رہا تو کچھ دیر بعد زمل نے پھر مشورہ دیا۔

"تم مرتضیٰ کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ کم از کم تب تک جب تک تمہیں مطلب کی جاب نہیں ملتی۔"

"یہ مرتضیٰ آخر آج کل تمہارے ساتھ ہر بات کیوں ڈسکس کرنے لگا ہے۔" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلی تھیں۔

"نہیں میرے ساتھ تو نہیں، وہ تو دادا جان سے کہہ رہا تھا تو میں نے سنا۔" زمل کا انداز نارمل تھا۔

"اور دادا جان نے کیا کہا؟" اس کی سوالیہ نظریں زمل کی طرف اٹھیں جن میں اب بھی ہلکی سرخی تھی۔

"انہوں نے کہا تھا زین زیادہ بہتر سمجھتا ہے کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے۔" زمل نے بتایا تو ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے اس کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہوگئی تھی۔

"دادا جان کو ایسے ہی کہنا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ مرتضیٰ کیوں چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ پارٹنر شپ کروں۔"

"کیوں؟" زمل نے بے اختیار پوچھا۔

"اس لیے کہ تایا جان اسے اپنا بزنس کرنے کے لیے ایک دھیلا تک دینے کو تیار نہیں ہیں۔

کیونکہ پچھلے چھ ماہ میں وہ بزنس کے نام پر تایا جان سے کافی پیسہ لے کر ڈبو چکا ہے۔ اور اب اس کی نظر کرم مجھ پر ہے کہ میں اپنے والد محترم سے بیس پچیس لاکھ منگواؤں بزنس کے لیے اور میں ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

اس کا انداز حتمی تھا اور زل جانتی تھی کہ بیس پچیس لاکھ تو بہر حال بہت بڑی رقم ہے وہ تو ایک دھیلا تک اپنے باپ سے لینے کو تیار نہیں تھا۔

"اور پتا نہیں جاب کب ملے گی زین کو اور جب تک جاب نہیں ملے گی وہ یوں ہی رہے گا، چڑچڑا اور تلخ سا......" زل نے سوچا۔

"اور پتا نہیں یہ جن دوستوں میں سارا دن بیٹھا رہتا ہے وہ کیسے ہیں، کس قماش کے......آج کل تو کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے، کیا پتا کوئی دہشت گرد ہوں اور کل کو خودکش حملہ کروادیں اس سے۔"

"یہ تم کون سا مسئلہ فیثا غورث حل کر رہی ہو؟" اسے سوچوں میں گم دیکھ کر آزین نے پوچھا تو اس نے سادگی سے اپنی سوچ اسے بتا دی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ زل نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور دیکھے چلی گئی۔ کتنے دنوں بعد وہ اس طرح ہنسا تھا۔

"تم بھی نا زل شاہ زیب! میں کوئی اٹھارہ سال کا بچہ ہوں جو وہ مجھے جنت کا لالچ دے کر خودکش جیکٹ پہنا دیں گے۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"تم فارغ رہنے کے بجائے ایم فل کیوں نہیں کر لیتے؟" اپنی جھینپ مٹانے کے لیے زل نے فوراً مشورہ دیا تھا۔

"میں دادا جان کا مزید دست نگر نہیں رہنا چاہتا مشورہ بیگم۔" اس کے لہجے میں کچھ دیر پہلے کی خوش گواریت باقی تھی۔

"اچھا بتاؤ کیا پکایا ہے، مجھے کھانا کھا کر جانا ہے۔"

"یخنی پلاؤ پکایا ہے۔ ابھی دم دے کر آئی تھی۔ رائتہ، سلاد، پودینے کی چٹنی ہے۔ کل کے شامی کباب بھی ہیں کہو تو وہ بھی تل دوں گی۔"

''ٹھیک ہے۔''

آزین نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ کتنا خیال رہتا تھا اسے اس کا اور ایک وہ تھا کہ کبھی کسی موقع پر اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ اس کی سالگرہ پر وہ اسے کوئی خوب صورت گفٹ دینا چاہتا تھا لیکن اس کی ساری بچت دوستوں کو وِلیج میں کھانا کھلانے پر صرف ہو گئی تھی۔

''ساجدہ......! ساجدہ! پلیز چولھا بند کر دینا۔''

زمل نے کچن کی صفائی کرتی لڑکی کو آواز دے کر کہا اور آزین کی طرف دیکھا۔

''کھانا کب تک کھاؤ گے؟''

''کچھ دیر تک کھا لوں گا۔ ہاں شاید رات کو دیر سے آؤں، پریشان مت ہونا۔''

''کہاں جاؤ گے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''ایک خودکش حملے کی پلاننگ کرنی ہے۔''

وہ پھر ہنسا تھا اور زمل جھینپ گئی تھی۔

''یار زمل! دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن ہماری زندگی میں کوئی انقلاب، کوئی تبدیلی کیوں نہیں ہوتی۔ بچپن سے اب تک وہی روٹین۔ سوچتا ہوں کیوں نہ کوئی خودکش حملہ، کوئی دھماکا وغیرہ کر کے زندگی میں کوئی تبدیلی لائی جائے۔''

اس کی خوش نما ہیزل براؤن آنکھوں میں شرارت تھی اور وہ دلچسپی سے زمل کو دیکھ رہا تھا۔ جب چھوٹے تایا کی سحرش ارباب نے ریلنگ سے جھانک کر دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھا اور مڑ کر قریب ہی بیٹھی مہرین کو دیکھا، جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سامنے پڑی چھوٹی سی ٹیبل پر ٹانگیں رکھے اپنی میڈیکل کی موٹی سی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

''مہرو...... مہرو ادھر دیکھو۔ کیسا رومانٹک سین ہے۔ زین بھائی اور زمل سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے راز و نیاز کر رہے ہیں۔''

''اچھا......!'' مہرین اورنگ زیب نے اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے دیکھا۔

''انہیں راز و نیاز کے لیے سیڑھیوں پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے یہاں ریلنگ پر ہی لٹکی رہتی ہو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے نیچے درجنوں کمرے ہیں وہ کہیں بھی کسی بھی کمرے میں بیٹھ کر راز و نیاز کر سکتے ہیں۔''

مہرین کی عادت تھی بھگو بھگو کر مارنے کی لیکن ادھر بھی سحرش تھی، جو ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتی تھی۔ وہ ذرا سا منہ بنا کر پھر ریلنگ پر جھک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''تم زندگی میں کوئی تبدیلی کیوں چاہتے ہو زین! کیا تمہیں یہاں اس حویلی میں رہنا اور روٹین کے مطابق زندگی بسر کرنا اچھا نہیں لگتا؟'' زمل سنجیدہ تھی۔

''پتا نہیں میں کیا چاہتا ہوں کوئی تبدیلی، کوئی انقلاب یا پتا نہیں کیا۔''

وہ خود الجھا ہوا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ہماری زندگیوں میں اتنی بڑی تبدیلی آئی تو تھی زین۔ جس نے ہمارے ہونٹوں کی ہنسی چھین لی تھی اور ہم نے بچپن میں ہی بڑھاپا اوڑھ لیا تھا۔ میری اماں کا دنیا سے گزر جانا۔ تمہارے اماں ابا کی علیحدگی اور پھر تمہارے ابا کی دوسری شادی، تو کیا اس سے بڑی تبدیلی بھی کوئی ہو سکتی ہے۔'' اس نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔

''میں دادا جان کی طرف جا رہا ہوں زمل! تم کھانا وہاں ہی لے آنا۔''

اس نے پہلے قدمچے پر قدم رکھا اور اوپر سحرش ارباب ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر پھر مہرین کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

''تم مانو یا نہ مانو، ان دونوں میں کوئی چکر ہے۔''

''اچھا۔'' مہرین نے عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ ''انہیں بھلا چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے سحرش بیگم۔''

''کیوں ضرورت نہیں۔ چکر تو چل ہی جاتا ہے نا جب دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوں اور زمل صاحبہ کے مقابل آزین جیسا لڑکا ہو اس قدر سمارٹ، وجیہ اور......''

''اس لیے کہ دونوں کا رشتہ بہت پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ تمہاری پیدائش سے بھی پہلے یعنی جب زمل شاہ زیب کی پہلی سالگرہ تھی اور آزین ظفریاب صرف تین سال کا تھا، تب دادا نے دونوں کا رشتہ طے کر دیا تھا۔'' مہرین نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''یعنی کہ...... یعنی کہ زمل شاہ زیب آزین ظفریاب کی منگیتر مطلب فیانسی ہے۔'' وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''نہیں منگیتر نہیں، زمل آزین کی منکوحہ ہے۔ جب انکل ظفر امریکہ جا رہے تھے تو دادا جان نے دونوں کا نکاح کر دیا تھا۔'' مہرین کی بات نے اسے مایوس کیا۔

''ہائے کیا دادا کو ہم نظر نہیں آئے تھے۔ چلو میں نہ سہی، تم ماہ وش اور شانزہ تو تھیں نا تب۔ بس یہ دونوں ہی لاڈلے ہیں ان کے۔''

''خیر نکاح کے وقت تو تم بھی دنیا میں تشریف لا چکی تھیں۔'' مہرین مدھم سا مسکرائی۔

''ہاں جب دادا جان نے رشتہ طے کیا تھا تو ہم تینوں تھے۔ اور تم تو زمل سے ایک سال بڑی تھیں، پھر بھی دادا جان نے تمہارے بجائے......'' سحرش کا افسوس ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔

''شانزہ تو چلو آزین سے بڑی تھی لیکن تم اور ماہی تو...... دادا کو کم از کم ان کے متعلق زمل سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم تو دادا کو بیچ میں نظر ہی نہیں آتے۔''

''دادا کو ہم، تم اس لیے نظر نہیں آتے سحرش بی بی، کہ یہ دونوں تو ہر وقت دادا جان کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں، ان کی خدمت کرتے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں ان کا، تم تو کہیں مہینوں بعد دادا جان کے بار بار بلانے پر انہیں سلام کرنے جاتی ہو اور یہ ہی حال شانو اور ماہی کا ہے۔''

''توبہ ہے مہرو، کیا سچ سنانا ضروری ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

''اور تم کون سا دوڑ دوڑ کر دادا جان کی خدمت کے لیے جاتی ہو۔ اگر جاتی ہوتیں نا تو دادا جان ضرور اپنی ہونے والی ڈاکٹر پوتی کا پلو آزین کی شرٹ سے باندھ دیتے۔''

اب آزین دوپٹا تو لیتا نہیں تھا، اس لیے اس نے شرٹ کہا تھا۔ مہرین کو ہنسی آئی تھی لیکن وہ سنجیدہ

سامنہ بنا کر سحرش کو دیکھنے لگی۔

"یعنی کہ دادا جان کو خیال ہی نہیں آیا کہ خاندان کی سب سے ذہین لڑکی کو خاندان کے سب سے وجیہ لڑکے کے ساتھ باندھ دیں۔ بھلے بچپن میں رشتہ طے ہو چکا تھا۔ بچپن کے رشتے کی بھلا کیا اہمیت ہے، ہے نا۔"

"لیکن مجھے اس سڑو میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو......"

"ہاں ہاں پتا ہے مجھے، تمہاری نظر میرے بھائی پر ہے۔ آزین کے بعد وہی تو ہے اس حویلی کا خوب صورت ترین لڑکا۔"

سحرش ہنسی اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ویسے میں نے غلط تو نہیں کہا تھا مہرو، دونوں کا نکاح ہو چکا ہے تو سیڑھیوں پر بیٹھ کر رومینٹک باتیں ہی کر رہے ہوں گے۔" وہ پھر ریلنگ سے جھانکنے کے لیے اٹھی تھی۔

"کبھی تم نے ان کی باتیں سنی ہیں سحرش؟"

مہرین نے اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" سحرش نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے گندم رنگ رخساروں پر بکھری لالی کو دیکھا، جو مرتضٰی ارباب کے نام پر ہمیشہ ہی رخساروں پر بکھر جاتی تھیں۔

"تو کبھی سننا تمہیں پتا چلے گا کہ آزین کے پاس قوم، سیاست، مہنگائی، غربت، عوام، حکمران، انصاف ان کے علاوہ باتیں کرنے کے لیے اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ اور زمل اسے ہر وقت دوسروں کے غم سناتے رہتے ہیں۔ ساجدہ کے، بی بی اماں کے، دادا جان کی کتابوں کے، شینو بابا کی تنہائی کے، سلمٰی آپا کی بے اولادی کے......اور نہ جانے کیا کیا ایسے ہی غم وہ آزین سے شیئر کرتی رہتی ہے۔"

"اف او......کس قدر بورنگ گفتگو کرتے ہیں وہ دونوں۔"

وہ پھر مایوس ہو کر ریلنگ پر لٹک گئی تھی لیکن نیچے سیڑھیاں خالی تھیں۔ آزین دادا کے کمرے میں اور زمل کچن میں جا چکی تھی جبکہ ساجدہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔

''اف کس قدر بوریت ہے یہاں۔ میں ذرا ماہی کی طرف جارہی ہوں۔'' وہ ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر لمحہ بھر کے لیے مہرین کے پاس رکی۔

''ہاں جاؤ لیکن کم از کم ایک گھنٹہ اس کے پاس بیٹھ کر بوریت دور کرنا۔'' مہرین نے دوپٹے کے پلو سے عینک کے شیشے صاف کیے اور عینک لگا کر اپنی کتاب کھول لی۔

''اس گھر میں سب ہی بور ہیں سوائے میرے اور شاہ رخ کے۔''

''لیکن افسوس شاہو بھائی تو ماہی سے منسوب ہیں۔''

مہرین کے لبوں پر شریری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''بکومت مہرو! اب میں اپنی سگی بہن کے منگیتر پر بری نظر ڈالوں گی۔ تم بھی نا۔ نیم حکیم، خطرہ جان۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تو مہرین مسکرا کر اپنی کتاب پر جھک گئی۔

☆......☆......☆

ماہ وش اس کی ہم عمر تھی لیکن ماہ وش سے زیادہ اس کی سحرش سے بنتی تھی۔ اپنی بڑی بہن شانزہ سے بھی زیادہ وہ سحرش سے بے تکلف تھی۔ وہ ایف اے کی طالبہ تھی لیکن وہ شاہ رخ سے لے کر چھوٹے بلال تک کو نام لے کر ہی بلاتی تھی۔ کبھی کبھی تو لاڈ میں آ کر اپنی اماں کو بھی مونا اماں کہہ کر بلا لیتی تھی۔ شروع شروع میں اماں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ یہ سب تمہارے بڑے بہن بھائی ہیں۔ باجی اور بھائی کہہ کر بلایا کرو لیکن وہ بھی سحرش ارباب تھی۔

''احترام دل میں ہونا چاہیے تو وہ ہے پیاری اماں جانی۔ بس ہم تو نام لے کر ہی بلائیں گے سب کو۔''

تھک ہار کر انہوں نے ہی سمجھانا چھوڑ دیا تھا۔ اورنگ زیب اور ارباب بیگ دونوں کی بیویاں بھی سگی بہنیں تھیں۔ سو آپس میں سب کی ہی خوب دوستی تھی۔ البتہ نیچے والوں کے ساتھ تب بھی زیادہ دوستی نہیں تھی جب ظفریاب اور شاہ زیب کی بیویاں بھی نیچے ہوتی تھیں۔

دو سال پہلے ہی شاہ رخ اور ماہ وش کی منگنی ہوئی تھی جبکہ ارباب بیگ اور ان کی بیوی مونا کی

خواہش تھی کہ مرتضیٰ اور مہرین کی منگنی بھی کر دی جائے لیکن مرتضیٰ فی الحال اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے منگنی صرف شاہ رخ اور ماہ وش کی ہوئی تھی۔ البتہ دونوں بہنوں نے زبانی بات کر رکھی تھی جس کا علم بچوں کو نہیں تھا۔ شانزہ کا رشتہ بھی اپنے ماموں کے سسرالی عزیزوں میں ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب اور ان کی بیوی رخسانہ کا خیال دونوں بچوں کی شادی اکٹھی کرنے کا تھا۔

زمل ٹرالی دھکیلتی دادا جان کے کمرے میں آئی تو جہاں زیب بیگ نیم دراز تھے اور آزین ان کی پائنتی بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

''بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔'' آزین نے ایک گہرا سانس لے کر چاولوں کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔

''میری بیٹی نے جو پکایا ہے۔'' جہاں زیب نے محبت سے زمل کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آزین اٹیچڈ واش روم میں ہاتھ دھونے چلا گیا۔

''شاہ زیب کو بھی بلا لو ہمارے ساتھ ہی کھا لے۔''

وہی ہر روز کا مخصوص جملہ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ شاہ زیب نہیں آئیں گے، برسوں سے انہوں نے سب کے ساتھ ٹیبل پر کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب تو خیر سب تھے ہی کتنے۔ ظفریاب کے باہر جانے کے بعد وہ شاہ زیب سمیت چار ہی افراد تو رہ گئے تھے۔

''جی دادا جان! کہہ دوں گی۔''

زمل بھی جانتی تھی کہ ابا اس کی بات نہیں مانیں گے لیکن وہ کہتی ضرور تھی۔

''تم بھی آ جاؤ نا زمل، کیا ہمارے ساتھ نہیں کھاؤ گی؟'' آزین ہاتھ دھو کر آیا تو ٹرالی میں دو پلیٹیں دیکھ کر زمل سے کہا۔

''ابا کو کھانا دینے جا رہی ہوں تو ان کے ساتھ ہی کھا لوں گی ورنہ اگر ایسے ہی کھانا دے کر آ گئی تو وہ خود سے نہیں کھائیں گے۔''

ابا کی یہ حالت اسے افسردہ کرتی تھی۔ کبھی جو جہاں زیب بیگ بیٹے کی محبت سے مجبور ہو کر زمل کو کھانا شاہ زیب کے کمرے میں لگانے کا کہہ دیتے تو شاہ زیب بے چین سے ہو جاتے۔ آزین اور

باپ کی موجودگی انہیں بے چین سا کر دیتی تھی۔ وہ ایک آدھ لقمہ لے کر فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیتے تھے۔ زل کے سامنے وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے تھے۔

''اب تو ان کی خوراک بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ بہت تھوڑا سا کھاتے ہیں۔''

''چچا جان کو کسی اسپیشلسٹ کو دکھاتے ہیں۔ میں بات کرتا ہوں مرسل سے۔ میرا دوست ہے اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر ہے۔''

اس نے باہر جاتے جاتے سنا آزین دادا جان سے کہہ رہا تھا۔

''یہ جسمانی بیماری نہیں ہے زین بچے...... یہ تو کوئی اور ہی دکھ ہے۔ کوئی اور ہی روگ ہے جو زیبی کو کھائے جا رہا ہے۔ کچھ بتاتا بھی نہیں کہ کیا روگ لگا بیٹھا ہے دل کو۔'' بیٹے کی حالت پر وہ دکھی تھے۔

''چچی جان کی موت کا دکھ دل سے لگا لیا ہے۔''

''پتا نہیں بیٹا......! زندگی میں تو اس بے چاری کی قدر نہ کی، اپنی کمشنری کے نخرے میں ہی رہتا تھا۔ اس کے بعد جانے کب کیسے کایا پلٹی کہ نوکری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ کیسا آن بان شان والا تھا میرا زیبی۔''

زل کو دادا کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی تو وہ نم آنکھیں پونچھتے ہوئے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

ساجدہ سارے کام سے فارغ ہو کر اب برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ شینخو بابا کی طرف کھانا بھجوایا۔ ساجدہ کو تازہ اور بچا ہوا کھانا دیا۔ وہ عموماً کھانا گھر ہی لے جاتی تھی کہ بچے بھی کھا لیں گے۔ اس خیال سے زل کچھ زیادہ ہی پکاتی تھی کہ اس کے بچوں کے کام آ جائے گا۔ وہ دوپہر تک کام سے فارغ ہو کر کھانا گھر لے جاتی تھی۔ دو ہی گھروں میں کام کرتی تھی۔

ایک ان کے ہاں اور ایک اعوان شوز والوں کے ہاں۔ پہلے اُدھر جاتی تھی، اور پھر اِدھر آتی تھی۔ بچے چھوٹے تھے اور ساس بیمار تھی سو ادھر سے ہی کام کر کے گھر چلی جاتی تھی۔ اوپر والوں کا کام اس کی نند نے اٹھایا ہوا تھا۔ موروں والی حویلی میں آج کل کوئی کل وقتی ملازم نہیں تھا۔ بس دونوں نند بھابھی کام کر کے چلی جاتی تھیں۔ رضیہ کے جانے سے زل کو تو کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

سال بھر پہلے وہ کام چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن اوپر نازیہ شازیہ دونوں بہنوں کی شادی کے بعد تین ماہ سے مسلسل تلاش جاری تھی لیکن مطلب کی لڑکیاں نہیں مل رہی تھیں۔ ساجدہ کو رخصت کر کے وہ ٹرے اٹھائے شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ اکثر ہی بیڈ یا کرسی پر بیٹھنے کے بجائے نیچے کارپٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔

''ابا! کھانا کھالیں۔'' اس نے ٹرے ان کے سامنے قالین پر رکھا اور خود بھی نیچے ہی بیٹھ گئی تھی۔ ''دادا جان کا دل چاہتا ہے آپ بھی ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں۔ کیا خیال ہے دادا جان کے کمرے میں چلیں۔ آزین اور وہ ساتھ ہی کھانا کھا رہے ہیں۔''

شاہ زیب بیگ نے سر اٹھا کر زل کی طرف دیکھا، ان کی بے حد خوب صورت آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ زل کو وہ گیلی گیلی سی بھی لگی تھیں۔ وہ جانتی تھی وہ جواب نہیں دیں گے۔ اس نے ٹرے میں سے پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی۔

انہوں نے پلیٹ نہیں پکڑی تھی اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں ابا! تھوڑا سا تو کھائیں نا آپ، اتنے مزے کا مٹن پلاؤ ہے دادا جان اتنی تعریف کر رہے تھے۔'' اس نے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے اور ان کی طرف پلیٹ بڑھائی جو انہوں نے پکڑ لی تھی۔

''اتنی تھوڑی خوراک ہوگئی ہے آپ کی، صبح بھی آپ نے صرف چائے پی تھی۔ وہ بھی آدھا کپ......اس طرح تو آپ کمزور ہو جائیں گے۔''

اس نے چٹنی اور رائتہ بھی ان کی طرف بڑھایا۔

''آپ کیا سوچتے رہتے ہیں سارا دن، کیا اماں یاد آتی ہیں آپ کو؟''

اس کی نظر سامنے دیوار پر اماں اور ابا کی شادی کی تصویر پر پڑی۔ ابا تو کسی شہزادے کی طرح ہی لگ رہے تھے کہ وہ جہاں زیب بیگ کے چاروں بیٹوں میں سے سب سے خوب صورت تھے۔ اونچا لمبا قد، خوب صورت تیکھے نقوش، شربتی آنکھیں، بلاشبہ ان کا شمار حسین مردوں میں ہوتا تھا۔

انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں ابا! مجھ سے تو دل کی بات کر لیا کریں نا۔ اچھا خیر چاول ٹھنڈے ہو جائیں گے، کھالیں۔"

وہ رائتہ سلاد کچھ بھی ڈالے بغیر چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگے تھے۔ کبھی ٹیبل پر پورے اہتمام سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ چھری، کانٹے سب ہی ہوتے تھے۔

"کیسے ہیں، اچھے ہیں نا؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے انہیں تھوڑا بہت کھانا کھلا دیا کرتی تھی اور وہ کھا بھی لیتے تھے ورنہ جب وہ یونی ورسٹی سے آتی تھی، ساجدہ کا رکھا ہوا کھانا ایسے ہی ٹرے میں پڑا ہوتا تھا۔ پتا نہیں وہ ایسے کیوں ہو گئے تھے۔ سب سے الگ تھلگ خاموش...... زل کو یاد تھا جب اماں زندہ تھیں تو وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ ڈی سی تھے اور ان کی پوسٹنگ مختلف شہروں میں ہوتی رہتی تھی لیکن ہر ویک اینڈ پر وہ حویلی آتے تھے اور کبھی لمبی چھٹیاں لے کر بھی آتے تھے تو ان کے مہمان بھی آتے رہتے تھے۔

وہ بہت خوش پوشاک تھے اور وہ مغرور سے لگتے تھے۔ دادا جان کہتے تھے تیری دادی اور تیری اماں نے اس کے آگے پیچھے پھر پھر کر اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ مزاج ہی نہیں ملتے تھے صاحب زادے کے...... لیکن جانے اماں کے بعد کیا ہو گیا تھا انہیں۔ تب وہ بارہ سال کی تھی جب اماں صرف چند ماہ بیمار رہ کر چل بسی تھیں۔

پہلے وہ سنجیدہ ہوئے تھے پھر کم گو ہوئے اور مختصر بات کرتے تھے۔ لیکن اب تو عرصہ ہوا انہوں نے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا بلکہ جاب چھوڑ کر گوشہ نشین ہی ہو گئے تھے۔

زل سوچ سوچ کر ان سے باتیں پوچھتی تھی۔ ایسے سوال کرتی تھی جن کے جواب طویل ہوں لیکن ان کا جواب مختصر ہی ہوتا تھا۔

"اچھا بتائیں آپ کو اماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کون سا کھانا پسند تھا؟"

”سب......“ وہی مختصر جواب۔

”داداجان کہتے ہیں میرے ہاتھ میں اماں کے ہاتھ کا ذائقہ ہے۔ کیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ نیچے ٹرے میں رکھ دی تھی۔ زل نے دیکھا، انہوں نے چند لقمے ہی لیے تھے۔

”داداجان کہتے ہیں آپ کو گرائنڈر میں بنی ہوئی چٹنی پسند نہیں تھی۔ اماں آپ کے لیے کونڈی میں بناتی تھیں۔ میں نے بھی آپ کے لیے کونڈی میں بنائی ہے لیکن آپ نے چکھی تک نہیں۔“

وہ ایسے ہی کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی۔ انہوں نے ایک چمچ چٹنی میں ڈال کر یوں ہی کھالی۔ زل کو یوں لگا جیسے وہ مدھم سا مسکرائے ہوں۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔

”ابا! آپ باتیں کیا کریں نا۔ جو کھانے کو دل چاہے، بتایا کریں۔ میرا جی چاہتا ہے میں آپ کی فرمائش پر کچھ پکاؤں۔ کچھ ایسا جو آپ کو بہت پسند ہو۔“

یہ ہی باتیں وہ اکثر دہراتی رہتی تھی۔ اپنے چاول ختم کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”قہوہ بنانے لگی ہوں، آپ پئیں گے؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ کچھ دیر لیٹ جائیں۔ صبح سے یوں ہی بیٹھے ہیں، تھک گئے ہوں گے۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جلدی سے بیڈ کی چادر درست کر کے اس نے انہیں لیٹنے میں مدد کی۔ وہ کچھ دیر بیڈ کے پاس کھڑی زل کو دیکھتے رہے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگایا اور زل کا دل جیسے پھٹنے لگا۔ ابا کے اس التفات پر یک دم آنسوؤں کا ریلا آنکھوں تک آیا تھا لیکن اس نے بمشکل ان بے اختیار امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور ان کے ہاتھ پر پیار کیا، اپنا ہاتھ چھڑا کر انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لمحہ بھر کھڑا رہنے کے بعد وہ ٹرے اٹھا کر کچن میں آئی تو آنکھوں سے آبشار بہہ نکلا تھا۔

"ابا ایسے کیوں ہیں؟ کاش وہ بھی بڑے تایا اور چھوٹے تایا کی طرح ہوتے۔ میری فکر کرتے، میرے لیے پریشان ہوتے۔ میں ان سے اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں شیئر کرتی۔ سحرش کی طرح ان سے فرمائشیں کرتی۔" داداجان کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور چولہے کی طرف رخ کر کے کھڑی ہوگئی۔ آزین ٹرالی لا رہا تھا۔

"تم کہیں جانا نہیں آزین، داداجان کے کمرے میں ہی بیٹھو، میں قہوہ بنا کر لا رہی ہوں، پیو گے نا؟"

اس نے رخ موڑے بغیر کیبنٹ سے ساس پین نکالا۔

"پی لوں گا۔"

وہ دروازے سے ہی مڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر قہوے کے تین کپ، وہ ٹرے میں رکھے داداجان کے کمرے میں آئی تو داداجان اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ سارا دن کہاں غائب رہتا ہے۔

"کہیں بھی نہیں داداجان! بس دوستوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

شکر ہے داداجان نے بھی پوچھا تھا۔ زل دونوں کو کپ پکڑا کر اپنا کپ لے کر بیڈ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھی۔

"کون سے دوست زین! مرتضیٰ کہہ رہا تھا کہ تمہارے یہ دوست کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔" جہاں زیب بیگ کی آنکھوں سے پریشانی جھانکتی تھی۔

"کیا مرتضیٰ آج کل میری مخبری پر لگا ہوا ہے کوئی اور کام نہیں ہے اسے۔" وہ تلخ ہوا تھا۔

"بیٹا! یہ سیاست وغیرہ کے چکروں میں مت پڑنا۔ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے یہ۔" داداجان نے اس کی بات نظر انداز کی تھی۔

"نہیں داداجان! میں تو بس وقت گزارنے چلا جاتا ہوں۔ مرسل میرا یونی ورسٹی فیلو ہے۔ اسی کے دوست ہیں رضا وغیرہ۔" اب کے اس کا لہجہ نرم تھا۔

"اور تمہارے باپ کا کوئی فون یا خط آیا؟" جہاں زیب بیگ نے بھی موضوع بدل دیا۔

"دراصل میں نے سم بدل لی ہے ان کے پاس نیا نمبر نہیں ہے۔ اور خط آئے تو تھے دو تین میں

نے پڑھے نہیں ہیں۔"

وہی ظفریاب کے ذکر پر اس کا لاپروا انداز۔

جہاں زیب نے ایک گہری سانس لی۔

"باپ ہے تمہارا کبھی اس کی خیریت پوچھ لیا کرو اور کبھی اپنی خیریت بتا دیا کرو۔"

ظفریاب نے ان سے گلہ کیا تھا کہ وہ ان کا فون نہیں سنتا۔ اب تو سم ہی بدل لی ہے۔ خط لکھا تو جواب تک نہیں دیا۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا، کوشش کرتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کی دل آزاری ہو۔ لیکن زل کے سامنے بے حد بولتا تھا کہ اسے اپنے باپ سے بے حد، بے حساب گلے تھے۔ قہوہ پی کر خالی کپ سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"زل بیٹی! اسے سمجھایا کرو، خوامخواہ ہی باپ سے ناراضی پال کر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تو ہمیں ہی الزام دے گا نا۔" وہ افسردہ سے تھے۔

"جی دادا جان۔"

وہ قہوے کے خالی کپ اٹھا کر تیزی سے آزین کے پیچھے لپکی۔

"سنو آزین! دیر سے بھی آئے تو کھانا گھر پر ہی کھاؤ گے نا تو پھر رات کے لیے کیا پکاؤں؟"

ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف جاتے جاتے آزین ایک دم مڑا تھا، اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

دلکش سراپا، لانبی گھنی پلکوں والی بے حد سیاہ آنکھیں جو سوالیہ انداز میں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور بے حد دلربا نقوش۔

"یہ کی ہے نا تم نے خالص بیویوں والی بات۔"

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلائی۔

"مطلب کہ بیویاں اس طرح شوہروں سے پوچھتی ہیں کہ کیا پکائیں آج، چاہے بعد میں وہ

پکائیں اپنی مرضی سے ہی۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''بکومت،، بہت فضول بولتے ہو۔''

اس کے رخساروں پر لمحہ بھر کے لیے شفق نمودار ہوئی تھی اور گھنی پلکیں ہولے سے لرزی تھیں۔

''اس میں فضول بات کیا ہے بھلا؟'' اس کا موڈ یک دم ہی خوش گوار ہو گیا تھا۔ ''کیا بیوی نہیں ہو میری؟''

''داداجان تو رات کو کھانا کھاتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے تم سے پوچھ لیا۔'' زل کی نظریں جھک گئیں۔

''بھئی جس لیے بھی پوچھا، یہ بتاؤ تم کیا میری بیوی نہیں ہو۔'' اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور وہ جیسے پوری فرصت سے کھڑا اسے نظروں ہی نظروں میں دل میں اتار رہا تھا۔

''کیوں کیا تم نہیں جانتے۔'' وہ جھنجھلائی تھی۔

''میں تو جانتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دوسرے کو بھی پتا چل جائے۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے داداجان سے کہتا ہوں وہ اب تمہیں رخصت کر دیں۔ مجھے سر پر سہرا باندھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

اس کی پرشوق نظروں نے اس کے پورے وجود کو حصار میں لیا تھا۔

''ہاں......نہیں...... پلیز ابھی نہیں زین، ابھی مجھے اپنی پڑھائی تو مکمل کرنے دو، چند ماہ ہی تو رہتے ہیں فائنل میں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''تو پیپرز تو شادی کے بعد بھی دیے جا سکتے ہیں۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا ہوا، پتا نہیں سنجیدہ تھا یا یونہی اسے تنگ کر رہا تھا۔

''نہیں زین، شادی کے بعد اتنی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں کہ پھر پڑھائی کی طرف توجہ نہیں رہتی۔'' وہ ملتجی ہوئی تھی۔

''خیر تمہاری ذمہ داریاں تو نہیں بڑھیں گی اور لڑکیوں کی بڑھ جاتی ہوں گی کیونکہ میں تو اب بھی تمہاری ہی ذمہ داری ہوں۔ بھلا تمہیں کیا فرق پڑے گا سوائے اس کے کہ اپنے کمرے سے میرے

کمرے میں منتقل ہو جاؤں گی۔'' ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں شرارت نظر آئی تھی۔

آج سے پہلے تو اس نے اس طرح کی بات کبھی نہیں کی تھی پھر آج یہ آزین کو کیا ہو گیا تھا۔ زل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملیں تو اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

''نہیں زین، پھر تمہارے ساتھ اور بھی ذمہ داریاں بڑھ......'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی، رخسار تپ اٹھے۔

''مثلاً کیا ذمہ داریاں؟'' آنکھوں میں شرارت لیے وہ اسے آج سچ میں حیران کر رہا تھا۔ ''اوہ اچھا سمجھا...... تمہارا مطلب ہے بچے...... ہاں خیر وہ تو بھئی ہوں گے ہی اور مجھے تو کم از کم چار بچے پسند ہیں۔''

تب ہی ریلنگ پر جھکی سحرش نے آواز دی۔

''زل...... زل...... !تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔ ان کی بات سن جاؤ۔''

''جاؤ۔'' زین کا موڈ یک دم خراب ہوا تھا۔

''تائی اماں کے دکھڑے سنو جا کر اور ہاں خاص میرے لیے کچھ مت بنانا...... میں رات دیر سے آیا تو شاید کھانا کھا کر ہی آؤں۔''

وہ تیز تیز چلتا ہوا ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر پوری طاقت سے بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور وہ صحن کے درمیان حیران سی کھڑی رہ گئی تھی۔

''تو تم آ رہی ہو نا زل......'' سحرش ابھی تک ریلنگ پر لٹکی ہوئی تھی۔ ''جلدی آنا تمہیں پتا تو ہے نا ہماری موٹا اماں کے حکم کی فوراً تعمیل نہ ہو تو انہیں اختلاج ہونے لگتا ہے۔''

''کچھ دیر میں آتی ہوں۔'' زل نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ سحرش بھی نا ہمیشہ غلط وقت پر انٹری دے گی۔ کتنے سارے دنوں بعد آزین کا موڈ آج خوش گوار لگ رہا تھا اور......''

ایک گہری سانس لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جانتی تھی جب تک تائی جان کی بات نہیں سن لے گی انہیں چین نہیں آئے گا۔

☆......☆......☆

''دادا جان! ابا ایسے کیوں ہو گئے ہیں اتنے چپ چپ اپنے آپ سے بے گانہ......''

فارسی کے قلمی نسخوں کو الگ کرتے ہوئے زمل نے کئی بار کی پوچھی ہوئی بات پھر سے پوچھی تھی۔

''ہاں کیسے ہو گئے ہیں تمہارے ابا......؟''

جہاں زیب بیگ نے پھٹے ہوئے صفحوں کو ٹیپ سے جوڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، شاید انہوں نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی۔

''چپ، گم صم، جیسے ان کا کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو اور جیسے وہ عمر بھر کی پونجی ہار بیٹھے ہوں۔''

زمل نے ایک بوسیدہ سا دیوان اٹھایا اور اس کے ورق الٹنے لگی تھی۔

''تمہاری اماں کی موت سے بڑا نقصان کیا ہو گا۔ شاید اسی کا غم اندر اندر کھا رہا ہے اسے۔''

مرزا جہاں زیب نے ہاتھ میں پکڑی کتاب رکھ کر ایک اور کتاب اٹھا لی۔

''بارہ برس تو ہو گئے اماں کو رخصت ہوئے اور ابھی تک ابا اس غم سے نہیں نکل سکے۔ دادا جان آپ نے بھی تو کوشش نہیں کی انہیں اس غم سے نکالنے کی اور نہ ہی تایا جان وغیرہ نے۔''

اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا شکوہ در آیا تھا جسے محسوس کرتے ہوئے جہاں زیب بیگ کتاب رکھ کر، پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''ایسا نہیں ہے زمل بچے...... تمہارے ظفر تایا اور میں نے تو بہت کوشش کی، ظفر تو جب تک پاکستان میں رہا، جتنی دیر گھر میں رہتا، شاہ زیب کے ساتھ ہی رہتا۔ ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا۔ اصل میں چپ اسے تمہاری اماں کی زندگی میں ہی لگ گئی تھی۔ تمہاری اماں کی موت سے سال بھر پہلے ہی چپ چپ رہنے لگا تھا۔

شاید اسے پتا چل گیا تھا تمہاری اماں کی بیماری کا۔ اس نے ہم سب سے چھپایا لیکن خود اندر ہی

اندر گھلتا رہا۔ ہمیں تو آخری دنوں میں ہی پتا چلا کہ اسے کینسر تھا۔ تمہاری اماں کے جانے کے بعد تو بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ حالانکہ پہلے تو تمہیں پتا نہیں یاد ہے کہ نہیں جتنا عرصہ یہاں رہتا دوستوں کا جمگھٹا لگائے رکھتا تھا۔

تمہاری اماں کے بعد سال یا شاید ڈیڑھ سال بعد جاب بھی چھوڑ دی اور جاب چھوڑنے کے بعد نہ جانے کہاں چلا گیا۔ چھ ماہ تک تو کوئی خیر خبر نہیں ملی اور پھر ظفریاب کو ہی اچانک ہری پور میں مل گیا اور وہ اسے گھر لے آیا اور ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرتا رہا۔ جانے کیا روگ لگا بیٹھا تھا۔ تمہاری اماں کی زندگی میں تو کوئی پروا نہیں کرتا تھا اس کی اور تمہاری اماں......"

وہ ہولے سے ہنسے۔

"بڑی نیک روح تھی کبھی گلہ نہیں کیا۔ کبھی ساتھ جا کر رہنے کی ضد نہیں کی۔ حالانکہ تمہاری تائیاں بہت اکساتی تھیں اسے، کہ میاں کے ساتھ کیوں نہیں جاتی ہو۔ ہمارا میاں ہوتا نا ڈپٹی کمشنر تو ہم ایک دن بھی یہاں نہ رہتے۔ تو وہ کہتی مجھے نہیں شوق فیتے کاٹنے کا......

میں نے اور تمہاری دادی نے بھی کتنی ہی بار شاہ زیب سے کہا کہ مریم کو بھی ساتھ لے جاؤ لیکن وہ کہتا۔

"آئے روز تو تبادلہ ہوتا رہتا ہے خوامخواہ زل کی پڑھائی کا حرج ہو گا۔"

"تو زل کو یہاں چھوڑ جاؤ بس مریم کو لے جاؤ۔ اکیلا بندہ تو گھبرا ہی جاتا ہے۔"

"ارے اماں اکیلا کہاں ہوتا ہوں اتنا سٹاف ہوتا ہے وہاں۔"

اس کے پاس تو سینکڑوں جواز اور دلیلیں ہوتی تھیں لیکن تیری دادی بہت دکھی ہوتی تھی۔ تیری اماں سگی بھانجی تھی اس کی۔ اکثر مجھ سے گلہ کرتی تھی کہ زیبی مریم کا اس طرح خیال نہیں رکھتا جیسے باقی تینوں رکھتے ہیں اپنی بیویوں کا۔"

جہاں زیب بیگ آج پہلی بار اس طرح اماں اور ابا کے متعلق بات کر رہے تھے۔ زل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب نیچے رکھ دی۔ ماں کے ذکر پر اس کا دل تڑپ اٹھا

تھا۔ ماں تھی نہیں اور باپ خود سے بے گانہ ہو چکا تھا۔

وہ بارہ سال کی تھی جب اماں اچانک بیمار ہوئیں۔ باقی لوگوں کو تو چھ سات ماہ سے ان کی بیماری کا علم تھا لیکن اسے تو اچانک ہی پتا چلا تھا۔

اور وہ ایک ہفتے کے اندر اندر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اسے تو ان کے جانے کے بعد پتا چلا تھا کہ انہیں کینسر تھا۔ اپنے آخری مہینوں میں اماں اسے پاس بٹھا کر گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔ کچن میں بھی اسے ساتھ لگائے رکھتی تھیں۔ ابا کی پسند ناپسند کے متعلق بتاتی تھیں۔

ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ بارہ سال کی عمر میں ہی وہ سب کچھ اسے سکھا دیں جو وہ خود جانتی ہیں، اور اپنا سارا علم و ہنر اس میں انڈیل دیں۔ کبھی کبھی تو وہ چڑ جاتی تھی لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ اماں شاید اسے اس وقت کے لیے تیار کر رہی تھیں جب انہیں نہیں ہونا تھا۔ ان کی کہی باتیں، نصیحتیں، دعائیں جیسے اس کے دل پر کھب گئی تھیں۔ جب بھی وہ الجھ جاتی اسے سمجھ نہ آتا کہ وہ کیا کرے۔ اماں کی کہی ہوئی کوئی بات یاد آ کر اسے اس الجھن سے نکال لیتی۔

"مجھے لگتا ہے شاہ زیب کو پچھتاوا مار رہا ہے۔

تیری ماں کا خیال نہ رکھنے کا پچھتاوا......

اس کی پروانہ کرنے کا پچھتاوا......

اتنی تھوڑی سی زندگی لے کر آئی تھی مریم اور اس تھوڑی سی زندگی میں شاہ زیب نے کتنا تھوڑا وقت دیا تیری ماں کو۔ جب بھی آتا ہوا کے گھوڑے پر سوار، کبھی جو چند دن رکتا تو مہمان خانے میں دوستوں کے ساتھ ہی مصروف رہتا۔ بس گھڑی دو گھڑی کو ہی اندر آتا۔ اور تیری ماں اتنی صابر کہ نہ کبھی کوئی گلہ کیا نہ کوئی جھگڑا۔"

ماں کو یاد کر کے اس کی ہی آنکھیں نم نہیں ہوئی تھیں، جہاں زیب بیگ کی پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

"بہت کم عمر تھی مریم صرف اٹھارہ سال کی......شاہ زیب نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ اسے اتنی کم عمر لڑکی سے شادی نہیں کرنی......پر تیری دادی کی ضد کہ سوتیلی ماں کا سلوک اچھا نہیں ہے مریم کے ساتھ کسی

دن کسی بڈھے کے پلے باندھ دے گی اور میں نے مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ مریم کو اپنے شاہ زیب کی دلہن بنا کر لے جاؤں گی۔ پہلے تو شاہ زیب بہت بولا پھر خاموش ہو گیا اور پھر تیرہ سال بعد...... صرف اکتیس سال کی عمر میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس کے مرنے کی عمر تو نہیں تھی زمل......''

جہاں زیب بیگ نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھیں۔ ''تم پوچھتی ہو نا تمہارے ابا کو کیا ہوا ہے تو میرا دل کہتا ہے اسے پچھتاوے کا روگ کھا رہا ہے۔''

''پردادا جان بارہ سال ہو گئے ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تو جہاں زیب بیگ نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

اس نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا۔

''کیا ابا کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی، ہاں مریم اور شاہ زیب کی عمر میں دس سال کا فرق تھا۔ وہ اٹھائیس سال کا تھا اور کہتا تھا اسے کسی ہم عمر اور میچور لڑکی سے شادی کرنی ہے اور پھر اگر وہ کسی کو پسند کرتا تو ضرور بتاتا، وہ ایسے دل میں تو بات رکھنے والا نہیں تھا اور میرا نہیں خیال کہ تمہاری دادی پھر بھی اسے مجبور کرتی مریم سے شادی کرنے پر۔

تمہارے بڑے تایا کی شادی ہوئی تو ارباب نے شادی میں ہی تمہاری تائی کی چھوٹی بہن کو پسند کر لیا۔ جبکہ تمہاری دادی کو وہ بالکل پسند نہیں تھی۔ دو تین بار سمجھایا ارباب کو، وہ نہیں سمجھا تو چپ کر گئی۔ کہتی تھی ہے تو چھچھوری اور بے لحاظ پر مجھے کیا زندگی ارباب نے گزارنی ہے تو گزار لے گا۔'' وہ مسکرائے۔

''پر اب تو...... اب تو ابا کو اس پچھتاوے سے نکل آنا چاہیے نا دادا جان...... بارہ سال بہت نہیں ہوتے کیا۔'' اس نے دل گرفتگی سے پوچھا۔

''ہاں اب تو...... ارے ہاں تم زیب النساء مخفی کا دیوان ڈھونڈ رہی تھیں، یہ رہا۔'' انہوں نے جھک کر ایک بوسیدہ سا دیوان اٹھا کر زمل کو دیتے ہوئے، موضوع بدلنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کام یاب بھی ہو گئے کہ وہ اپنا سوال بھول کر، بہت احتیاط اور شوق سے اوراق پلٹ رہی تھی۔

''دادا جان! کیا یہ اصل دیوان ہے۔ ہماری ٹیچر کہتی تھیں کہ لوگوں نے نہ جانے کس کا دیوان اس کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔''

''پتا نہیں......'' جہاں زیب بیگ نے اس کے ہاتھ سے دیوان لے کر دیکھا۔

تیرہویں ہجری میں چھپنے والا یہ دیوان لاہور کے مشہور عالم پریس نے چھاپا تھا۔

''تو مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اصلی ہی ہے۔''

''تو کیا اس میں وہ اشعار ہیں جو ہماری ٹیچر نے سنائے تھے۔'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کون سے اشعار......؟'' جہاں زیب بیگ نے دیوان اسے پکڑایا۔

''ایک تو وہی جس کا پہلا مصرعہ کسی اور شاعر نے پڑھا تھا اور کوئی درباری شاعر اسے مکمل نہیں کر سکا تھا لیکن زیب النساء نے اسے مکمل کیا تھا۔

؎ بے گانہ وار می گزری از دیارِ چشم

(آنکھوں کے دیار سے تو اجنبیوں کی طرح گزر گیا)

''اے نور دیدہ حب وطن در دل تو نیست''

(اے آنکھوں کے نور تیرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے)

''یاد نہیں، بہت پہلے سرسری سا دیکھا تھا، تم خود دیکھ لو۔''

موضوع بدل گیا تھا۔ جہاں زیب بیگ نے اطمینان محسوس کیا۔ ورنہ زمل کی اداسی اور نم آنکھیں دیکھ کر ان کا دل بھاری ہو گیا تھا کہ خوامخواہ گزری باتیں دہرائیں۔ زمل پھر اوراق پلٹنے لگی تھی۔

''ہاں یہ آزین کہاں ہے، صبح سے نظر نہیں آیا۔''

''وہ تو آج صبح ناشتے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔''

اس نے دیوان بند کر کے واپس کتابوں کے ڈھیر پر رکھ دیا تھا۔

''مرتضیٰ کہہ رہا تھا شاید گوجرانوالہ گیا ہے۔ اس کی پارٹی کی کوئی میٹنگ تھی۔''

''کیسی پارٹی......؟''

جہاں زیب بیگ چونکے تو وہ جھجکی۔ جانتی تھی دادا جان اس بات کو پسند نہیں کریں گے لیکن اب زبان سے نکل گیا تھا تو اس نے سوچا بتا ہی دے تا کہ وہ اسے سمجھائیں۔

''اس نے کوئی پارٹی جوائن کر لی ہے۔''

''لیکن میں نے اسے منع کیا تھا۔ سیاست وغیرہ میں پڑنے سے۔'' جہاں زیب بیگ پریشان ہو گئے تھے۔ ''کیا جانتا نہیں ہے اس کے باپ نے اس سیاست کے چکر میں کتنی اذیت اٹھائی تھی۔'' انہوں نے جھرجھری سی لی تھی۔

''تم نے اسے سمجھایا نہیں زل؟''

وہ اسے کیا سمجھاتی...... اس نے کون سا اسے بتایا تھا۔ یہ تو اس کے جانے کے بعد، مرتضیٰ نے بظاہر سرسری ساذکر کیا تھا لیکن وہ جانتی تھی اس کا مقصد اسے بتانا تھا۔ مخاطب مونا تائی تھیں۔

''اور کیا کہہ رہا تھا مرتضیٰ؟'' اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

مرتضیٰ نے تو اور بھی بہت کچھ کہا تھا لیکن وہ دادا جان کو بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کچھ نہیں دادا جان۔''

اس نے کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی اور ہاتھوں سے اس کے بوسیدہ ورق کو سیدھا کرتے ہوئے سلوشن ٹیپ اٹھائی۔

''بس کر دو بیٹی، اب تھک گئی ہو گی باقی کام کل کریں گے۔ میں بھی ذرا شاہ زیب کے پاس جاتا ہوں۔ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ اب آرام کے بجائے اوپر نہ چل دینا۔ یہ آج کل میمونہ کو بھی تم سے بہت کام پڑنے لگے ہیں۔''

وہ میمونہ تائی کے اسے بار بار اوپر بلانے پر کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔

''وہ دراصل شادی کی تیاری کرنا ہے نا انہوں نے تو بس اسی لیے دو تین بار وہ مجھے شاپنگ کے لیے بازار لے کر گئی تھیں، پھر کچھ دوسرے کام وغیرہ بھی تھے۔ جوڑے وغیرہ سیٹ کرنا تھے۔''

''اوپر چار چار لڑکیاں ہیں تو ان سے کیوں نہیں کہتی۔ انہیں ساتھ لے جائے شاپنگ کے لیے۔

کل بھی تم اتنی دیر سے آئیں، میرا دل گھبرانے لگا تھا۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

''کیا کروں دادا جان اب مونا (میمونہ) تائی کو انکار تو نہیں کر سکتی نا۔'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''مہرین اپنی پڑھائی میں مصروف ہے۔ اس کا فائنل ہے۔ شانزہ اور ماہ وش آپی کی شادی ہے تو تائی کا خیال ہے کہ انہیں اس گرمی میں باہر نہیں جانا چاہیے۔ رنگت جل جائے گی۔ اور سحرش ابھی بچی ہے۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ جہاں زیب بیگ نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے فوراً اٹھ کر دیوار کے کونے میں رکھی ان کی چھڑی اٹھا کر انہیں پکڑائی۔

''نہیں رہنے دو......'' انہوں نے چھڑی واپس کر دی۔ ''اس کی ضرورت نہیں اور ہاں عصر کی نماز کے بعد چائے بنا کر شاہ زیب کے کمرے میں ہی لے آنا۔''

سر ہلا کر چھڑی کونے میں رکھ کر وہ بکھری ہوئی کتابیں اٹھا کر، ایک طرف ترتیب سے رکھنے لگی۔ جہاں زیب بیگ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ کتابیں رکھ کر اس نے ان کے بیڈ کی چادر درست تھی اور بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

''پتا نہیں یہ زین کیا کرتا پھر رہا ہے اور اس نے کون سی پارٹی جوائن کی ہے۔ اور جانے کیسے لوگ ہیں۔ دادا جان نے کتنا منع کیا تھا اسے پھر بھی...... یہ ساری سیاسی پارٹیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مطلبی...... انہیں کب پروا ہوتی ہے اپنے کارکنوں کی...... بھلے وہ جان سے گزر جائیں ان کی بلا سے۔ آج وہ ماہ وش کے دوپٹوں پر لیس لگا کر اوپر دینے گئی تھی جو تین دن پہلے مونا تائی نے اسے دیے تھے۔ واپس آتے ہوئے سیڑھیوں کے پاس اسے مرتضٰی ملا تھا۔ وہ مونا تائی کے کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے ہی سیڑھیوں تک آیا تھا۔

''کیسی ہو زمل؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''تمہیں کچھ خبر بھی ہے یہ زین کیا کرتا پھر رہا ہے؟'' اس نے مونا تائی سے کی گئی بات کو دہرایا تھا۔

''کیا......؟''

وہ جو اس کو جواب دے کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گہری اندر تک اترتی نظروں سے اسے الجھن ہوئی۔ پتا نہیں کیوں آج کل مرتضیٰ اسے ایسی ہی گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔

''عجیب عجیب لوگوں سے دوستی کر رکھی ہے اس نے۔ تمہیں پتا ہے آج بھی گوجرانوالہ گیا ہوا ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کر لیا ہے اس نے۔ مجھے تو تمہارا مستقبل بہت مخدوش لگ رہا ہے زمل۔ جاب وہ کرتا نہیں، میری بزنس آفر اس نے ٹھکرا دی ہے تو کرے گا کیا آخر...... کیا تم اسے کما کر کھلاؤ گی زمل یار سمجھاؤ اسے۔''

وہ جیسے اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

''اس نے کئی جگہوں پر اپلائی کر رکھا ہے ان شاء اللہ جلد جاب مل جائے گی۔''

اسے مرتضیٰ کا اس طرح بات کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

تب ہی دروازہ کھول کر آزین کمرے میں داخل ہوا تو وہ چونکی اور مڑ کر دیکھا۔ آزین ناک سکیڑ کر پرانی کتابوں کی مخصوص بو جو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ رخ موڑ کر تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی جس کا جہاں زیب بیگ مطالعہ کر رہے تھے۔ پھر اسے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔

''دادا جان کہاں ہیں؟''

''ابا کے کمرے میں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''تم سارا دن اس بو سے اکتاتی نہیں ہو۔ یہ پرانی کتابوں کی بو اونہہ......''

اس نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو آزین کو محسوس ہوا جیسے وہ ناراض ہو۔

''کیا ناراض ہو؟''

''نہیں......''

مختصر جواب دے کر اس نے باہر جانا چاہا لیکن وہ دروازے کے بالکل سامنے اس طرح کھڑا تھا

کہ وہ اسے ہٹائے بغیر باہر نہیں جاسکتی تھی۔

''راستہ دو زین......''

''اگر نہ دوں تو......؟''

وہ زیادہ پھیل کر کھڑا ہوگیا۔اس نے سائیڈ سے نکلنا چاہا تو آزین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بہت موڈ خراب ہے۔''

''تمہیں کسی کے موڈ کی کیا پروا ہے زین۔'' دل ہی دل میں کہتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا آزین کی طرف دیکھا۔

''یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا ملی......''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جس نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔اور یہ مسکراہٹ زمل کے دل کو اتھل پتھل کر رہی تھی۔ بقول سحرش کے،اس مسکراہٹ پر تو سو خون معاف کیے جاسکتے ہیں اور تم کیسی پتھر دل ہو کہ ایسا پتھر چہرا لیے کھڑی ہو جیسے مسکراہٹ تمہارے مجازی خدا کے لبوں پر نہیں کسی اجنبی کے ہونٹوں پر تمہیں دیکھ کر چمکی ہو۔''

اس روز وہ مونا تائی کے بلانے پر اوپر گئی تھی اور سحرش نے اسے ٹیرس پر ہی روک لیا تھا۔

''کمال ہے یار، جب سے مجھے تمہارے اور زین کے رشتے کا پتا چلا ہے تب سے میں تمہاری جاسوسی کر رہی ہوں لیکن مجھے تم دونوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو دو نکاح شدہ بندوں میں ہونی چاہیے۔نہ مسکراہٹوں کا تبادلہ، نہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں میں جگنو چمکنا، نہ جھجکنا، ٹھٹکنا...... یہ تم کیسے لوبرڈ ہو زمل شاہ زیب......''

''ہم تو بس ایسے ہی ہیں سحر......'' وہ مسکرائی تھی۔

''اتنے روکھے، اتنے پھیکے......'' سحرش نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''یار کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دو۔ دو چار رومینٹک جملے بول دو۔ کہو تو میں تمہاری مدد کروں۔ میں نے اپنی ڈائری میں مختلف افسانوں سے لے کر ڈھیر سارے جملے لکھ رکھے ہیں۔ دو چار

تمہیں دے سکتی ہوں۔''

اور وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

''تم بھی نا سحرش......''

اور عین اسی وقت آزین، مرتضٰی کے ساتھ اس کے کمرے سے نکلا تھا اور ٹیرس پر سحرش کے ساتھ کھڑی، بے اختیار ہنستی ہوئی زہل پر اس کی نظر پڑی تو اس کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تو وہ ہنستے ہنستے، یک دم رخ موڑ گئی تھی۔ تب سحرش نے کہا تھا کہ زین کی اس مسکراہٹ پر تو سو خون معاف کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہ سچ تھا کہ اس کی مسکراہٹ اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی تھی اور آنکھیں بھی جیسے دمک اٹھتی تھیں۔

سحرش کی بات یاد کر کے، اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی لیکن آزین کی نظروں سے یہ مسکراہٹ چھپی نہ رہ سکی اور اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ مسکراہٹ کی کرنیں اب بھی اس کی آنکھوں میں لو دیتی تھیں اور وہ یک ٹک اسے دیکھتا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو زین؟'' وہ پزل ہوئی تھی۔

''تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے تمہیں دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ شاید اب ہر پل ہر لمحہ تمہیں ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پتا نہیں کب......'' اس نے ایک گہری سانس لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بہت تھکن ہو رہی ہے۔ دادا جان سے مل کر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔''

''تم چائے پیو گے بنا دوں؟'' وہ ساری ناراضی بھول کر اس کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''نہیں ابھی نہیں، جب سب کے لیے بناؤ گی، تو پی لوں گا۔'' وہ ایسا ہی تھا۔ خاص اپنے لیے وہ اسے کم ہی تکلیف دیتا تھا۔

''دادا جان نے کہا تھا عصر کے بعد چائے بنا کر ابا کے کمرے میں ہی لے آؤں۔'' وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں بھی ابھی ادھر چچا جان کے کمرے میں ہی ہوں۔"

زمل نے سر ہلایا تھا۔

"پوچھو گی نہیں میں صبح صبح کہاں چلا گیا تھا اور اب چار بجے واپس آ رہا ہوں۔" وہ جاتے جاتے مڑا تھا۔

"بتانا چاہتے ہو تو بتا دو۔" وہ ایک دم جیسے سنجیدہ ہوئی تھی۔

"چائے پی کر بات کرتے ہیں۔ سب بتاتا ہوں۔" وہ خوش گوار لہجے میں کہتا اور ایک استحقاق بھری نظر اس پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا تو اس کے دل پر موجود ہلکا سا غبار بھی چھٹ گیا اور وہ مرمت شدہ کتابوں کو اٹھا کر اسٹڈی میں رکھنے لگی۔ جہاں زیب بیگ کا کمرا درست کر کے جب وہ باہر نکلی تو عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے نماز پڑھ کر چائے بنائی اور شاہ زیب کے کمرے میں آزین شاہ زیب بیگ کے بیڈ پر بیٹھا تھا اور شاہ زیب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے، اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دیکھ رہے تھے۔ جہاں زیب بیگ اور آزین کی موجودگی سے بے نیاز۔

"دادا جان! مرسل کے بھائی کراچی سے آ گئے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں آج چچا جان کو ان کے پاس لے چلتے ہیں۔ وہ رات آٹھ بجے اپنے پرائیوٹ کلینک میں بیٹھتے ہیں۔"

اسے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کافی ٹیبل اٹھا کر بیڈ کے سامنے رکھی اور ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ زمل نے اس خیال سے کہ پتا نہیں دن میں آزین نے کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں، فریزر میں پڑے کباب تلنے کے علاوہ شینو بابا سے کہہ کر باہر سے سموسے اور دہی بھلے بھی منگوا لیے تھے۔

وہ ٹرے میں موجود لوازمات دیکھ کر مدھم سا مسکرایا۔ اسے زمل کا اس طرح اس کا خیال رکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اہتمام زمل نے اس کے لیے کیا ہے۔ جہاں زیب بیگ شام کی چائے کے ساتھ کچھ نہیں لیتے تھے۔ زمل نے دیوار کے ساتھ موجود روم چیئر اٹھا کر بیڈ کے سامنے جہاں زیب

بیگ کی کرسی کے پاس رکھی اور پلیٹ اٹھا کر جہاں زیب بیگ کی طرف بڑھائی۔

''دادا جان! آپ کچھ لیں گے؟''

''نہیں، میرے لیے چائے بنا دو۔''

''چچا جان آپ تو لیں نا۔''

آزین نے پلیٹ میں سموسہ اور کباب رکھ کر شاہ زیب بیگ کی طرف بڑھایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا لیکن نظریں اب بھی اپنے پھیلے ہاتھوں پر تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کیا تلاشتے تھے۔

''دہی بھلے تو لے لیں نا ابا، شان بھائی کی دکان سے آئے ہیں، کالی مرچ والے۔ آپ کو پسند تھے نا۔''

انہوں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''چائے تو لیں گے نا آپ۔''

زل ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے زل کی طرف دیکھتے رہے پھر اثبات میں سر ہلایا تو زل کپوں میں قہوہ ڈالنے لگی۔

''اب تو خیر تھرموس میں چائے دم دینے لگے ہیں لیکن تمہاری اماں کی عادت تھی چائے دانی میں چائے دم دے کر، اسے ٹی کوزی سے ڈھک دیتی تھی حالانکہ اس وقت بھی مونا اور شانو تھرموس میں ہی چائے دم دیتی تھیں۔''

جہاں زیب بیگ کو یوں ہی اکثر کوئی پرانی بات یاد آ جاتی تھی۔

''ایک بار شاہ زیب آزاد کشمیر گیا تو وہاں سے بہت خوب صورت اونی ٹی کوزی لایا تھا۔ تمہاری اماں کو بہت پسند تھی۔''

شاہ زیب بیگ کو چائے پکڑاتے ہوئے زل نے دیکھا ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

''تھینک یو زل، اس وقت سچ میں کچھ بھوک لگ رہی تھی مجھے۔'' آزین نے سموسہ اور کباب کھا

کر خالی پلیٹ میز پر رکھی۔

''دہی بھلے بھی لو نا۔''

زل خوش ہو گئی تھی کہ اس نے چائے کے ساتھ اہتمام کر لیا تھا۔ ورنہ آزین نے کبھی خود سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔

''نہیں بس اب چائے بنا دو۔ اور ہاں دہی بھلے فریج میں رکھ دو۔ رات کو مرسل آئے گا۔ میں نے اسے کہا تھا، چچا جان کو ارسلان بھائی کے کلینک میں لے کر جانا ہے تو اس نے کہا تھا وہ گاڑی لے کر آ جائے گا تو شاید چائے کے لیے رک جائے۔''

چائے اسے پکڑاتے ہوئے زل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن زین بیٹا! شاہ زیب پتا نہیں جائے گا بھی یا نہیں۔''

جہاں زیب بیگ پریشان سے ہو گئے تھے۔ جانتے تھے کہ شاہ زیب کو ڈاکٹر کی طرف جانے کے لیے تیار کرنا مشکل ہو گا۔ دو تین بار اورنگ زیب اور ارباب نے لے جانا چاہا تھا لیکن شاہ زیب کسی صورت نہیں مانے تھے اور تب تو وہ کچھ بہتر ہی تھے لیکن اب پتا نہیں۔

''ابا!'' زل نے آہستگی سے شاہ زیب کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''آزین آپ کو ڈاکٹر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ چلیں گے نا؟''

شاہ زیب نے نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھیں نا ابا! آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروا لیں آپ کو بھوک بھی تو نہیں لگتی نا۔ وہ آپ کو ضرور کوئی ایسی دوا دے گا کہ آپ کو بھوک لگے گی۔''

شاہ زیب نے پھر نفی میں سر ہلایا اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ، جس میں سے انہوں نے ابھی ایک گھونٹ ہی بھرا تھا ٹیبل پر رکھ دیا اور بیڈ پر لیٹ کر دیوار کی طرف رخ کر لیا۔

''دیکھا زین بیٹا! میں نے کہا تھا نا یہ نہیں جائے گا ڈاکٹر کے پاس۔'' جہاں زیب کی آواز بھرا گئی تھی۔

''ٹھیک ہے دادا جان! میں مرسل کو کہوں گا وہ ڈاکٹر صاحب کو گھر ہی لے آئیں گے آپ

پریشان نہ ہوں۔'' اس نے انہیں تسلی دی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

زل نے ایک کپ چائے مزید بنائی اور کپ اٹھا کر کھڑی ہوگئی، آزین کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''شینخو بابا کو چائے دینے جارہی ہوں۔''

''تم نہیں پیو گی؟''

''نہیں میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' وہ کپ لے کر باہر چلی گئی۔

☆......☆......☆

''شینخو بابا!'' اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر آواز دی۔ ''یہ چائے لے لیں۔''

شینخو بابا جو اپنی چارپائی پر بیٹھے کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے وہ کاغذ تکیے کے نیچے رکھے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ کپ انہیں پکڑاتے ہوئے زل نے دیکھا ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے اور پلکیں بھیگی سی تھیں۔

''شینخو بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

''جی!''

وہ کپ لے کر جلدی سے مڑ گئے تھے۔ زل لمحہ بھر انہیں دیکھتی رہی پھر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے ہولے ہولے چلتی ہوئی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ شینخو بابا کی نم آنکھوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ان سے پوچھے کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ ان کی آنکھیں نم کیوں ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کی ان سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ ان سے، ان کے کسی ذاتی دکھ کے متعلق پوچھتی جس نے ان کی آنکھیں نم کردی تھیں۔ ان سے اس نے کبھی ان کی ذاتی زندگی کے متعلق بات نہیں کی تھی، بس ضروری اور کام کے متعلق ہی بات ہوتی تھی۔ شاید کوئی بھی ان کی ذاتی زندگی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک بار اس نے بی بی اماں کو کہتے سنا تھا، وہ دادا جان کو بتا رہی تھیں۔

''اپنی ماں کی قبر پر جاتا ہے نگوڑا اور کہاں جائے گا۔''

شینحو بابا دو تین ماہ بعد ایک دو روز کے لیے کہیں جاتے تھے۔

''ماں تو زندہ نہیں تھی لیکن باپ...... کیا پتا وہ زندہ ہو۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہو اور سوتیلی ماں نے گھر سے نکال دیا ہو۔

آج پہلی بار وہ شینحو بابا کے متعلق سوچ رہی تھی۔

کوئی عزیز، رشتہ دار...... کوئی تو ہوگا۔

اور آج پہلی بار ہی زل کا جی چاہا کہ وہ ان سے ان کے متعلق پوچھے۔ شاید ان کی آنکھوں کے کونوں میں اٹکے آنسو اسے مضطرب کر رہے تھے۔ شاید یہ نظر نہ آنے والے آنسو اس کے دل میں ٹھہر گئے تھے۔ بی بی اماں ہوتیں تو وہ ان سے ضرور کہتی کہ وہ ان سے پوچھیں کہ انہیں کیا دکھ ہے، کیا تکلیف ہے۔

''اور بی بی اماں جانے کب آئیں گی۔''

اب وہ بی بی اماں کے متعلق سوچ رہی تھی جو اپنی بہن کے پاس قصور گئی ہوئی تھیں۔ بہنوئی کا انتقال سال بھر پہلے ہو گیا تھا۔ بہن کی دو ہی بیٹیاں تھیں اور دونوں ہی شادی شدہ، ایک اندرون سندھ کی بیاہی ہوئی تھیں اور ایک سعودیہ میں تھیں۔ وہ سال بھر بعد ہی چکر لگاتی تھیں۔ سو جب پتا چلا کہ بہن جسے کینسر تھا اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے تو بی بی جان۔ بہن کے پاس قصور چلی گئیں کہ کوئی دیکھ بھال کرنے کے لیے نہیں تھا۔ تو وہ انہیں اس بیماری کی حالت میں تنہا کیسے چھوڑ دیتیں۔ ان کی مجبوری جان کر بھی وہ ضد نہیں کرتی تھیں ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ بی بی اماں کو واپس لے آئے۔

''بی بی اماں آجائیں تو ان سے کہوں گی کہ وہ ان سے پوچھیں کیا سوچتے رہتے ہیں وہ۔'' کئی بار اس نے ان کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔

''بی بی اماں کو کچھ نہ کچھ تو پتا ہی ہوگا ان کے متعلق۔''

وہ ایک بار پھر ان کے متعلق سوچنے لگی۔ تب ہی آزین آہستہ سے آکر اس کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں......'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا میرے متعلق سوچ رہی تھیں؟'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''نہیں، شینخو بابا کے متعلق سوچ رہی تھی۔'' اس نے ایمان داری سے صحیح بات بتا دی۔

''آہ! اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی ہمارے متعلق سوچے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر شوخ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پتا ہے آزین......'' اس نے آزین کی بات نظر انداز کر دی۔ ''ابھی جب میں انہیں چائے دینے گئی تو مجھے لگا جیسے ان کی آنکھوں میں آنسو ہوں۔ جب وہ سموسے وغیرہ لے کر آئے تب بھی وہ بہت اداس لگے تھے مجھے۔ انہوں نے مجھے چائے کے ساتھ کچھ بھی بھیجنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بی بی اماں کے قریب تھے، وہ ہوتیں تو میں ان سے کہتی وہ شینخو بابا سے پوچھیں وہ اتنے پریشان کیوں ہیں۔''

''بی بی اماں اتوار کو آ جائیں گی۔''

آزین نے اس کی پوری بات دھیان سے سنی تھی۔

''رئیلی!'' وہ خوش ہو گئی تھی۔ خوشی اس کی گھور سیاہ آنکھوں سے بھی چھلکتی تھی۔

''ہاں سچ!'' وہ مسکرایا۔

''تمہیں کس نے بتایا آزین، کیا عذرا خالہ اب ٹھیک ہیں؟ اتنے دنوں سے ان کا کوئی فون بھی تو نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی شاید عذرا خالہ زیادہ بیمار ہیں۔'' وہ ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''ہاں...... اتنے دنوں سے ان کا فون نہیں آیا تھا نا تو اس لیے میں خود قصور چلا گیا تھا ان کا پتا کرنے۔''

آزین کو بھی ایک طرح سے بی بی اماں نے ہی پالا تھا اور اسے ان سے بہت محبت تھی۔

''اور عذرا خالہ کا چند دن پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی سندھ والی بیٹی تو آ گئی تھی لیکن سعودیہ والی نہیں آ سکی تھی۔ وہ کل صبح پہنچیں گی اور بی بی اماں دونوں بہنوں کی امانتیں ان کے حوالے کر کے آ جائیں گی۔ عذرا خالہ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانا تھا اس کے علاوہ بھی کچھ کام تھے اس لیے واپسی میں کچھ دیر ہو گئی۔'' اس نے تفصیل سے بتایا تو بے اختیار رزل کے لبوں سے نکلا۔

"تو تم قصور گئے ہوئے تھے اور مرتضٰی کہہ رہا تھا کہ تم گوجرانوالہ گئے ہوئے ہو کسی سیاسی تنظیم کے ایک اجلاس میں شرکت کرنے......"

"مرتضٰی!"

چند لمحے پہلے جو اس کے چہرے اور لہجے میں خوش گوار سا تاثر تھا یک دم مفقود ہو گیا تھا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مرتضٰی تمہیں الٹی سیدھی خبریں کیوں دیتا ہے اور تم بھی آنکھیں بند کر کے کیوں اعتبار کر لیتی ہو۔"

"اس نے بطور خاص تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا آزین...... وہ تو میں مونا تائی کے بلانے پر اوپر گئی تو وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ تم بھی چچا جان کی طرح سیاست میں دلچسپی لے رہے ہو۔ چچا جان نے اس سیاست کے چکر میں جو اذیت سہی، جو تکلیف اٹھائی تھی وہ اس وجہ سے تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا اور خوف زدہ تھا کہ کہیں تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسا نہ ہو جو ان کے ساتھ ہوا۔ وہ چاہتا تھا تائی جان تمہیں سمجھائیں۔"

اس نے سیڑھیوں والی گفتگو گول کر کے صرف تائی جان کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کا بتایا۔ جب سے مرتضٰی نے بتایا تھا کہ وہ گوجرانوالہ گیا ہوا ہے اور اس نے شاید کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے، تب سے ہی وہ بہت پریشان تھی۔

"اچھا......" آزین کا لہجہ طنزیہ سا ہو گیا۔ "اگر وہ اتنا ہی پریشان اور خوف زدہ تھا میرے لیے تو اس نے مجھ سے خود بات کیوں نہیں کی، مجھے کیوں نہیں سمجھایا۔ تمہاری موجودگی میں ہی تائی جان سے بات کیوں کی، جانتی ہو کیوں؟"

اس نے سر ہلایا۔

یہ بات تو وہ اسی وقت جان گئی تھی کہ مرتضٰی کا مقصد اسے آزین کی اس سرگرمی کے متعلق بتانا تھا۔ ورنہ اوپر والوں کو آزین سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، نہ پروا تھی کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔

"کیا جانتی ہو؟"

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ کہ وہ صرف مجھے تمہارے متعلق بتانا چاہتا تھا کہ میں تمہیں سمجھاؤں اور براہ راست بات کرنے کے بجائے تائی سے بات کر رہا تھا کہ کہیں میں یہ نہ سمجھوں کہ وہ تمہاری شکایت لگا رہا ہے۔ اور یہ کہ دادا جان سے بھی میں ہی بات کروں کہ......''

''واہ! کافی سمجھ دار ہو بھئی۔'' اب وہ دل چسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن اتنی بھی سمجھ دار نہیں ہو میری جان۔''

وہ یک دم بلش ہوئی تھی۔

''یہ کیا تخاطب ہے زین۔''

''یہ وہ تخاطب ہے جو شوہر کبھی کبھار اپنی بیویوں......''

''فضول مت بولو زین......'' اس کی نظریں جھک گئیں اور گھنی پلکیں ہولے ہولے لرزنے لگیں۔

''اس میں فضول بات کیا ہے وضاحت کرو گی؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اب ادھر ادھر کی باتیں مت کرو زین! اصل بات بتاؤ؟ کیا سیاسی پارٹی جوائن کرنے والی بات صحیح ہے یا مرتضٰی نے جھوٹ بولا ہے۔''

اس نے فوراً ہی خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ حالانکہ آزین کے اس طرح دیکھنے سے وہ پزل ہو رہی تھی۔

''اس نے آدھا سچ، آدھا جھوٹ بولا تھا۔''

وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں وارفتگی اور اشتیاق تھا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے نظریں چرائیں۔

''مطلب یہ کہ مرسل نے مجھے گوجرانوالہ چلنے کے لیے کہا تھا۔ اپنی فلاحی تنظیم کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے مرتضٰی کے سامنے ہی اس نے بات کی تھی اور میں نے حامی بھر لی تھی گوجرانوالہ جانے کی، لیکن بعد میں میرا ارادہ بدل گیا مجھے بی بی اماں کی فکر تھی کہ وہ فون کیوں نہیں کر رہی ہیں سو میں قصور چلا گیا۔''

بی بی اماں جب سے قصور گئی تھیں، چھ سات دن بعد فون کر کے خیریت معلوم کرتی تھی۔ کبھی پی

سی او سے، کبھی کہیں پڑوس کے کسی گھر سے...... خالہ عذرا کے گھر فون نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا تھا کہ خود جا کر ان کی خیریت معلوم کر آئے۔

''فلاحی تنظیم...... کیسی فلاحی تنظیم......؟'' زمل کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''فلاحی تنظیمیں کیسی ہوتی ہیں یار......؟'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ ''عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی ہیں۔''

''جیسے ہمارے سیاسی لیڈر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ کھل کر ہنسا۔

''نہیں ملی، یہ لوگ میرا مطلب ہے مرسل اور عمار وغیرہ سچ میں بہت کام کر رہے ہیں۔ خاص طور پر گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے دیہات میں انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے سلائی اسکول، غریب بچیوں کی شادیاں...... ذہین طلباء کے لیے وظائف وغیرہ۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے آزین! انسان کو صرف اپنے لیے نہیں جینا چاہیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی اپنی استطاعت بھر کام کرنا چاہیے۔'' اس نے سراہا۔

''ہاں یہ لوگ تو اور بھی بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس فنڈز کی بہت کمی ہے تو یہ میٹنگ اسی سلسلے میں تھی۔''

اس نے آزین کی پوری بات دھیان سے سنی اور سوچا کہ یہ مرتضیٰ نے پھر اتنے وثوق سے آزین کے متعلق سیاسی پارٹی جوائن کرنے کا کیوں کہا اور یہ پہلی بار تو نہیں تھا، بلکہ پہلے بھی وہ تین چار بار اس طرح کا خدشہ ظاہر کر چکا تھا۔

''کیا تم واقعی کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی لیڈر میں انٹرسٹڈ نہیں ہو زین؟'' اس نے بہت سوچ سوچ کر لفظوں کا انتخاب کیا تھا۔

اگر وہ ڈائریکٹ اس سے پوچھتی کہ کیا اس نے کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کیا ہے تو شاید وہ برا مان جاتا یا خفا ہو جاتا۔

''تم ڈائریکٹ بھی مجھ سے پوچھ سکتی ہو کہ کیا میں نے کوئی پارٹی جوائن کر رکھی ہے۔'' وہ جیسے اس کے دل میں چھپی بات جان لیتا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''تو زمل شاہ زیب! مجھے سیاست یا سیاسی پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو زمل، میں وہ دکھ، وہ اذیت بھول سکتا ہوں جو ابا کی وجہ سے ہم سب نے سہی۔''

اس کی آنکھوں میں اذیت تھی اور اندر کہیں کسی گہرے درد نے کروٹ لی تھی۔ وہ دن وہ کبھی نہیں بھول پایا تھا جب اماں اس کی انگلی پکڑے پارٹی کے بڑوں کے گھر منتیں کرنے جاتی تھیں۔ بڑے بڑے دعوے کرنے والوں نے اپنی ہی پارٹی کے ایک رکن کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

''سوری زین......!'' زمل نادم سی ہو گئی تھی۔

کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ظفریاب چچا کی وجہ سے سب نے کتنی تکلیف برداشت کی تھی اور خاص طور پر آزین اور صوبی چچی نے، تب وہ تو دس سال کا تو تھا جب ایک رات اچانک برسر اقتدار پارٹی نے ظفریاب کو گھر سے اٹھا لیا تھا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لے رہے تھے اور اپنی پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظفریاب کے علاوہ بھی ان کی پارٹی کے دو تین اور افراد کو بھی بے بنیاد الزام لگا کر گھر سے لے گئے تھے۔ انہیں کہاں لے جایا گیا تھا کس جگہ رکھا گیا تھا، کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

ان کے خلاف کسی تھانے میں کوئی ایف آئی آر بھی نہیں کٹوائی تھی۔ شاہ زیب جو خود گورنمنٹ کے ملازم تھے، وہ بھی معلوم نہیں کروا سکے تھے کہ وہ کہاں ہیں۔ ان دنوں شاہ زیب جہلم میں تعینات تھے۔ ذاتی طور پر بھی انہوں نے پتا لگانے کی کوشش کی تھی اور سرکاری ذرائع سے بھی لیکن سات ماہ ظفریاب بیگ کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تو تب چھ سات سال کی ہو گی۔ بعد میں ایک بار جب وہ فرسٹ ایئر میں تھی تو اس کے پوچھنے پر دادی جان نے بتایا تھا۔

''ارے میرا بچہ تقریریں تو کرتا تھا جلسے جلوسوں میں، بھلا اور کیا جرم کیا تھا اس نے کہ اٹھا کر لے گئے ظالم۔''

''صبوحی تو جیسے پاگل ہوگئی تھی اور آزین تو ہنسنا ہی بھول گیا تھا۔'' بی بی اماں کو بھی کبھی ماضی کی یادیں اداس کر دیتی تھیں۔

''صبوحی اور ظفریاب بہت محبت کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ صبوحی سے دور پار کی رشتہ داری تھی پھر یونی ورسٹی میں دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ ظفریاب نے اس سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو کسی کو اعتراض نہ ہوا، دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے۔''

''دونوں ایک دوسرے کے دیوانے تھے تو پھر صبوحی چاچی نے ان سے طلاق کیوں لی تھی۔''

وہ اتنی بڑی تو ہوگئی تھی کہ بی بی اماں سے سوال کرنے لگی تھی۔

''پتا نہیں......'' بی بی اماں مزید اداس ہو جاتیں۔

''یہ معمہ تو آج تک حل نہیں ہو سکا۔ صبو کی تو جان اٹکی رہتی تھی ذرا جو ظفر کو گھر آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ پھر جب وہ اسے اٹھا کر لے گئے تو اس کی پارٹی کے ایک ایک فرد کے گھر پر دستک دی۔ صبح زین کی انگلی پکڑ کر نکلتی تو دوپہر ڈھلے لوٹتی تھی۔ سب ہی سمجھاتے تھے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں ظفر کو ڈھونڈنے کی، لیکن اسے کسی پل چین نہ آتا تھا۔ تمہارے دونوں تایا تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔''

''دن میں ماری ماری پھرتی اور راتوں کو تمہاری دادی اور وہ سجدے میں گر گر کر دعائیں مانگتیں۔ ظفریاب کی پارٹی سے مایوس ہو کر وہ برسر اقتدار پارٹی کے دروازے کھٹکھٹانے لگی اور پھر اس پارٹی کا ایک شخص ابرار شاہ، ایک صبح اپنی گاڑی میں ظفریاب کو یہاں چھوڑ گیا۔ لیکن اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ مہینوں اس کا علاج ہوتا رہا...... پہلے ہاسپٹل میں، پھر گھر پر۔ صبوحی نے تو جیسے اس کی پٹی ہی پکڑ لی تھی۔

اور جس روز ظفریاب اپنے قدموں سے چل کر باہر بازار تک گیا اس سے اگلے روز صبو نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ سب نے ہی سمجھایا لیکن صبو نے کسی کی نہ سنی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ میکے میں ایک ماں تھی۔ باپ تو شادی کے بعد فوت ہو گیا تھا۔ بھائی اپنی پسند سے شادی کر کے کسی دوسرے ملک میں

جا بسا تھا۔تمہارے دادا اور دادی خود گئے تھے اسے سمجھانے کہ آزین کی خاطر ہی وہ واپس آ جائے، اگر ظفریاب سے کچھ شکایت ہے تو انہیں بتائے۔ ماں نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی۔ ظفریاب کے لیے کیسے سارا دن روتی کرلاتی تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا، کوئی نہ جان سکا۔ کچھ عرصہ بعد سنا تھا کہ ظفر سے طلاق لینے کے بعد اس نے کسی سے شادی کر لی تھی۔''

اوپر کوئی برتن گرا تھا شاید اس نے چونک کر آزین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے سامنے دیکھ رہا تھا۔

''سوری آزین......''

اس نے آزین کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے زخمی نظروں سے زل کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے زل! میں وہ اذیت، وہ دکھ کبھی بھول سکتا ہوں، جو میں نے تب اٹھائی تھی اور جو میں نے بعد میں سہی......نہیں کبھی نہیں، مجھے نفرت ہے سیاست سے اور سیاست دانوں سے۔ ہمارے ملک میں سیاست بہت گندی ہے اور سیاست دان مطلبی اور خود غرض......کوئی بھی سیاست دان وطن اور عوام سے مخلص نہیں ہے۔ اور مرتضیٰ بھی یہ بات جانتا ہے، بہت اچھی طرح جانتا ہے میری نفرت اور میرے خیالات کو پھر وہ ایسی باتیں کیوں کرتا ہے، میں سمجھ نہیں پاتا۔ خاص طور پر تم سے اور دادا جان سے۔ تمہیں کیا جتانا چاہتا ہے زل۔''

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زل گھبرائی۔

''میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔''

''نہیں......'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''غلط فہمی کیسی......وہ مرسل اور اس کی فلاحی تنظیم کے متعلق اچھی طرح جانتا ہے۔ دراصل وہ دادا جان کی اور تمہاری نظروں میں میرا امیج خراب کر رہا ہے۔''

''لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا بھلا......'' زل پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں......وہ بھلا ایسا کیوں کر رہا ہے۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست

ہے۔ ہم نے اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک ایک ساتھ پڑھا ہے۔ میں اپنی ہر بات اس سے ہی شیئر کیا کرتا تھا۔ وہ باتیں جو میں تم سے اور دادا جان سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن پچھلے چند ماہ سے مجھے لگتا ہے جیسے وہ بدل گیا ہے پہلے جیسا مرتضیٰ نہیں رہا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے محبت اور دوستی کے وہ رنگ دکھائی نہیں دیتے جو خالص اور شفاف تھے۔ وہ آنکھیں اب اجنبی سی لگتی ہیں۔ بظاہر تو کوئی بات نہیں ہے ملی، لیکن پس پردہ کیا کچھ ہے۔

کیا صرف اتنی سی بات پر وہ اجنبی بن گیا ہے کہ میں نے ابا سے پیسے منگوا کر اس سے پارٹنر شپ نہیں کی۔ گزرے سالوں کی ساری محبتیں، دوستی سب فراموش کر بیٹھا ہے۔"

"زین......" زمل کی پریشانی بڑھ گئی۔

"کیا اس نے تمہارے خلاف دادا جان سے کچھ کہا ہے؟"

"شاید نہیں۔ لیکن وہ دادا جان سے، تایا جان سے سب سے ایسی باتیں کرنے لگا ہے جیسے میں بہت ناکارہ ہوں، بے کار شخص...... جیسے میں کبھی کچھ نہیں کر سکوں گا اور کسی سیاسی جلسے میں کسی اندھی گولی کا شکار ہو جاؤں گا۔ بظاہر مجھ سے ہمدردی کرتا ہوا میرے لیے پریشان ہوتا ہوا...... مجھ سے اس کی یہ منافقت برداشت نہیں ہو رہی زمل......"

اس سے زمل کو وہ بہت اداس اور دل گرفتہ سا لگا۔

"مے بی ایسا کچھ نہ ہو جو تم سوچ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے اسے سچ مچ ایسا لگتا ہو کہ تم کسی سیاسی پارٹی کو جوائن کرنا چاہتے ہو۔" زمل نے ایک بار پھر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی۔

"تم خوامخواہ ٹینشن لینے کے بجائے اس سے پوچھ لو کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ آخر کو وہ کوئی غیر نہیں، کزن ہے تمہارا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زمل......" آزین نے سر ہلایا۔

"لیکن پتا نہیں کیوں میں اس کی ایسی باتوں سے ڈر سا جاتا ہوں۔ لیکن تم مجھ سے کبھی بدگمان مت ہونا زمل۔ شاید کسی روز وہ ڈائریکٹ بھی میرے متعلق بات کر لے۔"

''لیکن میں بھلا تم سے کیوں بدگمان ہوں گی زین۔''

زمل کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر چکا ہے۔

''بس ایسے ہی مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں مرتضٰی کی باتیں تمہیں مجھ سے بدگمان نہ کر دیں۔ میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں زمل۔ اگرچہ ہمارے درمیان جو بندھن ہے وہ کمزور نہیں ہے۔ پھر بھی ڈر جاتا ہوں۔ ماما بھی تو ابا سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا بندھن بھی تو کمزور نہیں تھا بلکہ وہ ہمارے بندھن سے زیادہ مضبوط تھا پھر بھی......''

وہ بے حد قنوطی ہو رہا تھا۔

''فضول باتیں مت کرو آزین۔'' وہ ناراضی سے بولی تھی۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں جلدی رخصتی کروالوں۔ دادا جان سے بات کروں زمل۔'' اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تو تھا کہ پڑھائی کے بعد......لیکن پھر بھی اگر تمہارے دل میں کوئی ڈر اور خوف ہے تو دادا جان سے بات کرلو۔'' اس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اچھی سی جاب مل جائے تو بات کرتا ہوں۔ لیکن اچھی سی جاب ملنا بھی آسان کہاں ہے۔ تم دعا کرو نا جلد ہی مجھے میرے مطلب کی جاب مل جائے۔''

اور عین اسی وقت سحرش نے اوپر ریلنگ سے جھانکا۔

''واو......یعنی کہ زمل بی بی پر میری باتوں کا اثر ہو ہی گیا آج واقعی دونوں لو برڈز لگ رہے ہیں۔ وارفتگی سے اس کی طرف دیکھتا آزین ظفریاب اور لرزتی پلکوں والی زمل شاہ زیب......واؤ!'' اس نے پھر ہونٹ گول گول کیے اور مڑ کر دیکھا۔ لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا، ٹیرس خالی پڑا تھا۔ کوئی نہیں تھا جسے وہ بتاتی کہ زمل اور آزین......پھر وہ مسکراتی ہوئی مہرین کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ ایک مہرین ہی تو تھی جو اس کی ہر بات سن لیتی تھی۔

☆......☆......☆

اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے مرتضٰی ارباب نے یونہی ریلنگ کے پاس رک کر عادتاً نیچے جھانکا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ بھی سحرش کی طرح آتے جاتے نیچے جھانکنے لگا تھا اور اس کی نظریں سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے آزین اور زمل پر پڑی تھیں۔ اس کے لب بھینچ گئے تھے اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلی تھیں۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

آزین بہت وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور زمل نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

''یقیناً آزین صاحب کوئی رومانوی ڈائیلاگ جھاڑ رہے ہوں گے۔'' اس نے سحرش کی طرح اندازہ لگایا۔

خاندان کی سب سے خوب صورت، سب سے دل کش، دل ربا لڑکی تو آزین ظفریاب کے لیے، جس کی ماں نے طلاق لے لی تھی اور باپ دوسری شادی کر کے دوسرے دیس جا بسا اور دادا کے ٹکڑوں پر پلنے والا آزین ظفریاب، جو دو سال سے نوکری کے لیے جوتیاں چٹخا رہا ہے اور میں مرتضٰی ارباب، ارباب بیگ کا اکلوتا بیٹا۔ جس کے باپ کی نہ صرف ایک فیکٹری ہے بلکہ ایک پلازہ بھی ہے۔ اس کے لیے مہرین اور رنگ زیب، وہ عینکو...... جس کی عینک بار بار اس کی ناک سے پھسل جاتی ہے۔ چشما تو مہرین ہرگز نہیں......

زمل کو تو وہ بچپن سے ہی دیکھتا چلا آرہا تھا لیکن یہ خیال کہ وہ اس خاندان کی سب سے دل کش لڑکی ہے اسے چند ماہ پہلے ہی آیا تھا اور ہر بہترین چیز پر وہ اپنا حق سمجھتا تھا اور جب اسے زمل شاہ زیب کا خیال آیا تھا تو وہ آزین کے مقدور میں لکھی جا چکی تھی۔ تو مرتضٰی ارباب کو بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اپنی قسمت بدلنا جانتا تھا۔

ایک پرانی یاد نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ارباب بیگ ہمیشہ ہی اسے کہا کرتے تھے جب بھی رزلٹ آتا۔

''یہ آزین ہر بار ہی تم سے زیادہ نمبر لے لیتا ہے جبکہ تمہاری طرح نہ ہی وہ کسی اکیڈمی جاتا ہے اور نہ کوئی ٹیوٹر اسے گھر پڑھانے آتا ہے۔ کبھی تو تم اس سے زیادہ نمبر لے کر مجھے احساس دلاؤ کہ میں

تمہاری ٹیوشنز پر فضول رقم ضائع نہیں کر رہا ہوں۔''

اور اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس سال آٹھویں کے امتحان میں مرتضیٰ ارباب کے نمبر آزین ظفریاب سے زیادہ ہوں گے۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کے پیپر آزین سے بہت اچھے ہوئے تھے یا آزین اچھے پیپر نہیں کر سکا تھا۔ بس تھوڑی سی ذہانت، تھوڑا پیسہ اور نتیجہ اس کے حسب منشا۔ کلاس ٹیچر حامد رضا صاحب کی الماری کی چابی ہمیشہ دسویں جماعت کے منور عزیز کے پاس ہوتی تھی۔ اور منور عزیز کی مٹھی گرم کرنے کے بعد آزین کے حل شدہ ایک دو سوالوں پر کراس لگانا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا تھا۔ اور رزلٹ والے دن وہ آزین کی حیرت سے بہت محظوظ ہوا تھا۔

ارباب بیگ اس روز بہت خوش تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے بعد پھر کبھی وہ انہیں یہ خوشی نہیں دے سکا تھا لیکن اس نے انہیں پھر مایوس بھی نہیں کیا تھا۔

آزین سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ دونوں اکٹھے مل کر پڑھتے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں آزین کے اس سے چند ہی نمبر زیادہ تھے کہ ظفریاب کی شادی اور پھر ان کے باہر چلے جانے سے وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگا تھا۔

''تو یہ طے ہوا کہ مرتضیٰ ارباب اپنا نصیب بدلنا جانتا تھا۔'' لبوں پر پراسراری مسکراہٹ لیے وہ مڑا۔ اس کا رخ میمونہ کے کمرے کی طرف تھا جو مہرین کے فائنل کے بعد اس کے ساتھ اس کے نکاح کا پکا ارادہ کر چکی تھیں۔
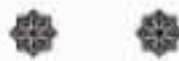
ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 2

ماسٹر عبدالعزیز نے نیم وا دروازے کو آہستگی سے کھولا اور دبے قدموں چلتے صحن کے اس حصے کی طرف بڑھے، جہاں مٹی کا چولہا تھا۔ موسم اچھا ہوتا تو زہرا بتول اندر باورچی خانے میں کھانا بنانے کے بجائے باہر صحن میں ہی کھانا بناتی تھی۔ اس وقت بھی وہ چولہے پر مٹی کی ہانڈی رکھے کچھ پکا رہی تھی۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز مدھم مسکراہٹ لیے زہرا بتول کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں زہرا بتول کی پیٹھ پر لہراتی گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی پر تھیں جو پیڑھی سے نیچے لگ رہی تھی۔ اس کے بال آج بھی اتنے ہی گھنے اور خوب صورت تھے جتنے اس وقت تھے جب وہ اسے بیاہ کر لائے تھے۔

"آج آپ جلدی آ گئے ماسٹر صاحب۔"

زہرا بتول نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تو ماسٹر عبدالعزیز نے چونک کر، نظریں اوپر اٹھائیں۔

"تم نے تو میرا سرپرائز ہی خراب کر دیا زہرا...... ویسے تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ میں ہوں جبکہ عام طور پر میں اس وقت نہیں آتا۔"

صحن کے دروازے کو دن میں اندر سے کنڈی نہیں لگائی جاتی تھی اور یہ صرف ماسٹر عبدالعزیز کے گھر میں ہی نہیں، گاؤں کے سب گھروں میں ہی دن کے وقت دروازے اندر سے بند نہیں کیے جاتے تھے۔ آنا جانا لگا رہتا تھا۔

"مجھے تو تب ہی پتا چل جاتا ہے ماسٹر صاحب! جب آپ گلی میں داخل ہوتے ہیں۔"

"وہ کیسے بھئی، کیا تمہیں الہام ہوتا ہے؟" ماسٹر عبدالعزیز چند قدم بڑھا کر اب اس کے قریب آ

گئے تھے۔

''بس پتا نہیں کیسے لیکن پتا چل جاتا ہے۔ شاید دل کو آپوں آپ خبر ہو جاتی ہے۔'' زہرا بتول نے ذرا سا رخ موڑ کر ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا جن کی بے حد روشن آنکھیں اور بھی روشن ہو گئی تھیں۔

''اچھا......'' وہ اچھا کو لمبا کرتے ہوئے پاس پڑی دوسری پیڑھی پر بیٹھ گئے۔

''تمہارا دل تمہیں میرے آنے کی خبر پہلے دے دیتا ہے، آج سے پہلے تو تم نے کبھی نہیں بتایا۔''

''پہلے آپ نے کبھی پوچھا بھی تو نہیں۔'' زہرا بتول کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اور یہ آپ یہاں کیوں بیٹھ گئے، ادھر جا کر بیٹھیں نا، کوئی آ گیا تو کیا کہے گا۔''

''کیا کہنا ہے کسی نے، یہ ہی نا کہ ماسٹر چولہے کے پاس بیٹھا اپنی زہرا جبیں سے راز و نیاز کر رہا ہے یا یہ کہ دونوں مل کر پکا رہے ہیں۔''

''آپ بھی نا ماسٹر صاحب کبھی کبھی......''

زہرا بتول نے چولہے میں سے جلتی لکڑیاں باہر نکالیں اور ان پر پانی کا چھینٹا مارا اور جلتی انگاریاں چولہے میں ہی چھوڑ دیں تا کہ ہانڈی دھیمی آنچ پر گرم رہے۔

''کیا کبھی کبھی...... جملہ تو مکمل کیا کرو زہرا......'' ماسٹر عبدالعزیز دل چسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آج شادی کے اتنے عرصہ بعد بھی وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے تو وہ شرما جاتی۔ رخساروں پر شفق پھیل جاتی، آج بھی گندم رنگ رخساروں پر سرخی تھی اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ چمٹے کی مدد سے دو بڑے انگارے اٹھائے اور باہر رکھ کر ان پر بھی پانی کا چھینٹا مار کر بجھایا اور کھڑی ہو گئی۔ اور برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔

''آ جائیں۔ بھائی نیاز فروٹ دے گئے تھے ویسے تو کھانے کا وقت نہیں ملتا آپ کو، آج جلدی آ گئے ہیں تو میں کاٹتی ہوں۔'' یوں ہی نظریں جھکائے جھکائے وہ برآمدے کی طرف بڑھی تو وہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

برآمدے کی چھتیں اٹھی ہوئی تھیں۔ کشادہ صحن، کشادہ برآمدہ، برآمدے میں تین کمروں کے

دروازے کھل رہے تھے۔ ایک کمرہ جو قدرے بڑا اور کشادہ تھا اس کا ایک دروازہ بائیں طرف باہر گلی میں بھی کھلتا تھا اور یہ کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ برآمدے میں دیوار کے ساتھ کچھ کرسیاں اور موڑھے پڑے تھے۔ ایک میز تھی جس پر پلاسٹک کی ٹوکری میں سیب، امرود اور کیلے رکھے تھے۔ دیوار کے ساتھ ہی سرخ پایوں والی چارپائی تھی جس پر سفید اور کالی ڈبیوں والا کھیس بچھا تھا۔ ایک گول تکیہ بھی پڑا تھا۔ برآمدے کا فرش سرخ سیمنٹ کا تھا، جس کے گرد سبز حاشیہ تھا۔ البتہ صحن میں فرشی اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ باورچی خانہ جو صحن میں دائیں طرف تھا، کافی کشادہ اور بڑا تھا۔

ماسٹر عبدالعزیز کا گھر، گاؤں کے ان چند گھروں میں سے تھا جو پکے اور اچھے بنے ہوئے تھے۔ زہرا بتول کو گھر سجانے سنوارنے کا بہت شوق تھا۔ اور ماسٹر عبدالعزیز اس شوق میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔

ماسٹر عبدالعزیز نے صاف ستھرے برآمدے کو ستائش سے دیکھا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے تکیہ گود میں رکھ کر، اس پر اپنی کہنیاں ٹکائیں اور زہرا بتول کو باورچی خانے سے پلیٹیں اور چھری اٹھا کر لاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ زہرا نے برآمدے میں آکر پلیٹ میز پر رکھی اور میز کو ذرا سا گھسیٹ کر چارپائی کے سامنے کیا اور خود موڑھے پر بیٹھ کر سیب کاٹنے لگی۔

"نیاز بھائی کیا صرف یہ فروٹ ہی لے کر آئے ہیں۔ باقی سامان نہیں لائے؟"

نیاز علی، ماسٹر صاحب کے اسکول میں چپڑاسی تھے۔ جب کسی کام سے شہر جاتے تو ماسٹر عبدالعزیز نے جو کچھ وہاں سے منگوانا ہوتا، ان سے منگوا لیتے۔

"نہیں باقی سامان بھی لے آئے تھے۔ آپ کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔ کہہ رہے تھے شام کو آ کر حساب بتا دیں گے۔ آپ نے بتایا نہیں آج جلدی کیسے آ گئے۔"

سیب چھیلتے ہوئے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر زہرا بتول نے ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔

"آج چوہدری صاحب کے ہاں ان کے بچوں کو پڑھانے نہیں گیا۔ انہیں کہیں جانا تھا۔"

ماسٹر عبدالعزیز اسکول کے بعد، چوہدری عبدالمالک کے بچوں کو پڑھانے چلے جاتے تھے۔ انہیں پڑھا کر مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرتے اور یوں گھر آتے آتے دو ڈھائی بج جاتے تھے۔ اسکول میں

ساڑھے بارہ بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ آج ہاف ڈے تھا، اسکول جلدی بند ہو گیا تھا اور بچوں کو پڑھانے بھی نہیں جانا تھا اس لیے وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔

''اور یہ ہماری شہزادی کہاں ہے، کیا ابھی تک سو رہی ہے؟'' ماسٹر عبدالعزیز نے ادھر ادھر دیکھا۔

''اتنی دیر تک کہاں سوتی ہے وہ۔'' زہرا بتول نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔ ''استانی کی طرف گئی ہے۔ ان کی بیٹی آئی ہوئی ہے اور زیب النساء کو اپنی باجی فاطمہ سے بہت محبت ہے۔ سنتے ہی کہ فاطمہ آئی ہوئی ہے ملنے چلی گئی۔ بس آنے ہی والی ہوگی، وہ آجائے تو روٹیاں بناؤں گی۔''

''فاطمہ کالج میں پڑھتی ہے نا۔'' ماسٹر عبدالعزیز نے پلیٹ پکڑ لی۔

''ہاں شہر میں اپنی خالہ کے گھر رہ کر پڑھ رہی ہے۔ زیبی استانی جی کے پاس جب قرآن پڑھنے جاتی تھی تو فاطمہ بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ اب بھی جب بھی شہر سے آئے، اسے بلوا بھیجتی ہے۔''

زہرا نے سیب کاٹ کر پلیٹ میں رکھا اور امرود اٹھایا۔

''نہ...... امرود مت کاٹنا۔ بس یہ سیب ہی کھاؤں گا۔ ہاں تم نے خود کھانا ہے تو کاٹ لو۔'' انہوں نے پلیٹ سے سیب کی قاش اٹھائی۔

''نہیں......!'' زہرا بتول نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی جی نہیں چاہ رہا ماسٹر صاحب، پھر کھا لوں گی۔''

''فروٹ کھایا کرو زہرا بتول، میں دیکھ رہا ہوں روز بروز تمہاری رنگت پھیکی پڑتی جا رہی ہے۔ سوچ رہا ہوں کسی روز شہر چل کر تمہیں ڈاکٹر کو دکھا لوں۔ خون کی کمی لگتی ہے مجھے۔'' ماسٹر عبدالعزیز اب تشویش سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''مجھے کچھ نہیں ہے ماسٹر صاحب! آپ کو خوامخواہ کے وہم ستاتے ہیں۔ کبھی خون کی کمی لگتی ہے، کبھی کچھ۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''ہاں شاید وہم ہی ہو، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے حامد کے بعد تم بہت کمزور ہو گئی ہو۔ تمہاری خوراک بھی بہت کم ہو گئی ہے۔'' ماسٹر عبدالعزیز کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ماں ہوں ماسٹر صاحب......'' ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

''اکلوتے بیٹے کی دائمی جدائی کا دکھ تو سینے میں گڑھے پر جیسا ہوتا ہے جو سدا تکلیف دیتا رہتا ہے لیکن میں اللہ کی رضا میں راضی ہوں۔ ماسٹر صاحب، جتنے دن وہ ہمارے آنگن میں کھیلا، ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو خوشی عطا کی، اس کے لیے اپنے اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمیں اس قابل سمجھا نعمت عطا کی، پھر لے لی تو اپنی مصلحتیں اور حکمتیں تو وہ خود جانے بس اللہ سے صبر کی دعا کرتی ہوں اور ڈرتی رہتی ہوں کہ کہیں زبان سے کوئی ناشکری کا کلمہ نہ نکل جائے۔ بس آپ بھی دعا کیا کریں، اللہ ہمارے حامد کو ہم سے جنت کے باغوں میں ملائے۔''

''زہرا بتول! تمہاری یہ ہی باتیں تو ہر روز مجھے تمہارا اسیر بناتی ہیں۔ تم نہ جانے میری کس نیکی کا انعام ہو۔'' ماسٹر عبدالعزیز کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہی نہیں، عقیدت بھی تھی۔

''زہرا بتول! میں تمہیں کبھی بتا نہیں سکا کہ تم میرے لیے کیا ہو اور......''

''یہ لیں کیلا تو لیں نا، نیاز بھائی ہمیشہ ہی بہت اچھا فروٹ لے کر آتے ہیں۔''

وہ آج بھی ان کے اظہار سے شرما جاتی تھی اس لیے ان کی بات کاٹتے ہوئے کیلا ان کی طرف بڑھایا۔

''اور مجھے آپ سے ایک بات بھی کرنی تھی آج ماسی نور بھری آئی تھی۔''

''تو یہ کون سی ایسی نئی بات ہے، وہ تو تقریباً روز ہی آتی ہیں۔'' انہوں نے کیلا اس کے ہاتھ سے لیا۔

''ہاں آتی تو رہتی ہیں پر آج کسی اور مقصد سے آئی تھیں۔ اپنے بیٹے اسلم کا رشتہ لے کر آئی تھیں اپنی زیب النساء کے لیے۔''

انہوں نے کیلا پلیٹ میں رکھ دیا۔

''دماغ ٹھیک ہے ان کا۔''

''اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے ماسٹر جی۔'' زہرا بتول نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ''کیا لوگ اپنے بچوں کے رشتے نہیں کرتے۔ پھر جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی

ہیں۔ ہماری زیب بھی اب بڑی ہوگئی ہے تو رشتے تو آئیں گے ہی نا۔''

''ہاں تو رشتہ بھی تو کوئی ڈھنگ کا ہو نا زہرا...... اسلم کو کیا تم نہیں جانتیں۔ سارا دن تو گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتا ہے۔ سارے جہاں کا لفنگا، نکما، میری بیٹی کے لیے کیا وہ ہی رہ گیا ہے۔'' ان کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔

''ماسی آئے تو صاف بتا دینا کہ ہم نے نہیں کرنی اپنی بیٹی کی شادی ان کے نکمے سپوت سے اور یوں بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی پورے تیرہ سال کی بھی نہیں ہوئی اور سن لو زہرا بتول...... مجھے اپنی بیٹی کو پڑھانا ہے، بہت سارا۔ آٹھویں پاس کرلے تو اسے نویں میں داخل کرواؤں گا۔''

''لیکن ادھر تو صرف آٹھ ہی جماعتیں ہیں۔ کیا استانی جی کی بیٹی کی طرح آپ بھی اسے شہر میں بھیج دیں گے۔ لیکن وہ شہر میں رہے گی کہاں۔ فاطمہ تو اپنی ماسی کے پاس رہتی ہے۔''

زہرا اب پریشانی سے ماسٹر عبدالعزیز کو دیکھ رہی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز مسکرائے۔

''ابھی سے یہ فکر چھوڑو۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ اپنے چوہدری صاحب کوشش تو کر رہے ہیں کیا پتا ہماری بیٹی کے آٹھویں پاس کرنے تک یہ مڈل اسکول ہائی ہو جائے۔''

اور زہرا بتول نے ایک اطمینان بھرا سانس لے کر ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔

''دس پڑھ کر بھی آخر میں شادی تو کرنی ہی ہے نا۔ میں تو کہتی ہوں کوئی اچھا رشتہ آئے تو بس طے کر دیں۔ شادی دو سال بعد سہی...... اسلم تو مجھے بھی پسند نہیں، وہ تو ماسی نور بھری نے اصرار کیا تھا کہ آپ سے بات ضرور کروں تب بات کی۔ ویسے چند ماہ پہلے آپا رسولاں نے بھی یوں ہی سرسری سا کہا تھا اپنے بیٹے کا کہ اس کی نوکری لگ جائے تو اس کے رشتے کی بات کریں گی اور ہاں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب بھی زیب کا رشتہ کرنے لگوں تو ان کا بھی خیال رکھوں۔ اب تو سنا ہے ان کے بیٹے کی پکی نوکری لگ گئی ڈاک خانے میں۔ مجھے تو بہت پسند ہے۔ اچھی شکل وصورت ہے۔ دس جماعت پاس ہے۔ شریف بھلا مانس بڑوں کی عزت کرنے والا۔ آپ کہیں تو آپا رسولاں سے بات کروں۔''

''نہ......'' ماسٹر عبدالعزیز نے بے اختیار ہاتھ اونچا کیا۔ ''مجھے نہیں کرنی اپنی شہزادی کی شادی

کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے۔"

"کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی ہے نا اور سچی بات تو یہ ہے گاؤں میں سب سے سوہنا پڑھا لکھا، پکی نوکری والا تو بس آپار سولاں کا بیٹا ہی ہے۔"

زہرا کو ماسٹر عبدالعزیز کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"میں نے کہہ دیا ہے ناز ہرا بتول، میں نے یہاں کسی سے بھی اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی۔"

ماسٹر عبدالعزیز کی خواہش تھی کہ وہ زیب النساء کو بہت پڑھائیں۔ ہوسکے تو ڈاکٹر بنائیں۔ نہیں تو کسی مضمون میں ماسٹر کرے۔ سوان کے دل میں دور دور تک ابھی اس کی شادی کا خیال تک نہ تھا۔

"تو کیا کوئی شہزادہ آسمان سے اترے گا آپ کی شہزادی کے لیے۔"

زہرا بتول کو کبھی کبھی ماسٹر عبدالعزیز کی زیب النساء سے اتنی شدید محبت پریشان کر دیتی تھی کہ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ ایک دن رخصت کرنا پڑتا ہے پھر جدائی برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"ہاں تو کیا میری بیٹی کے لیے شہزادہ نہیں آسکتا تمہارے لیے بھی تو آسمان سے اترا تھا شہزادہ......"

آنکھوں میں شرارت بھری چمک لیے ماسٹر عبدالعزیز نے اپنی قمیص کے کالر کو دو انگلیوں میں پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا۔

اور زہرا بتول نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کشادہ پیشانی، خوب صورت روشن آنکھیں، گندمی رنگت، سیاہ ہلکے ہلکے گھنگھریالے بال، وہ کسی شہزادے سے کم تو نہیں تھے۔ اللہ نے کیسے اس کا نصیب کھولا تھا۔ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے ماسٹر صاحب۔ وہ تو ستر اسی سالہ بوڑھے سے بیاہی جا رہی تھی اور اس کے لیے تو سچ میں آسمان سے شہزادہ ہی اتر آیا تھا۔ مہینوں تو وہ حیران سی رہی تھی۔ زرینہ اماں نے اچانک ہی اس کی شادی طے کر دی تھی۔ ابھی تو وہ پورے سولہ برس کی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

"اچھا ہے ناز ہرا، تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو اپنی زرینہ اماں کی مار پیٹ سے بھی تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔"

اس روز ابا نہ جانے کیا لینے باورچی خانے میں آئے تھے اور وہ وہاں پیڑھی پر بیٹھی رو رہی تھی۔

تو کیا ابا کو پتا ہے کہ زرینہ اماں مجھے مارتی ہیں۔ پھر بھی انہوں نے کبھی اماں کو منع نہیں کیا، سمجھایا نہیں۔

''ہاں!'' ابا نے جیسے اس کے دل کی بات جان لی تھی۔ ''سوتیلی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں زہرا...... دوسری عورت کی اولاد کو محبت سے پالنا بڑے دل گردے کا کام ہے اور تیری زرینہ اماں کا دل اتنا بڑا نہیں ہے۔ فضل الرحمٰن چوہدری بڑا زمین دار ہے، پیسے والا زمین جائیداد نوکر ملازم، شان دار گھر، میرا دل کہتا ہے تو وہاں بہت خوش رہے گی زہرا۔ پہلی بیوی مر چکی ہے۔ چار بچے ہیں۔ تین بیٹے، ایک بیٹی لیکن تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔''

''ابا! آپ ان سے ملے ہیں؟ سنا ہے یہ زمین دار چوہدری ٹائپ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔''

پتا نہیں کیسے بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔ ورنہ وہ تو کبھی ابا کے سامنے بولتی نہیں تھی، نہ کبھی اماں کی شکایت کی تھی کہ وہ کتنا ظلم کرتی ہے، نہ کبھی اپنی کوئی خواہش، آرزو بیان کی تھی۔

''ہاں...... نہیں تو۔'' انہوں نے نظریں چرالی تھیں۔ ''زرینہ اچھی طرح جانتی ہے اس کی بڑی بھرجائی (بھابھی) کے میکے کا گاؤں ہے۔ زرینہ بہت تعریف کرتی ہے فضل الرحمٰن کی...... کہتی ہے اپنی زہرا بتول عیش کرے گی۔''

ابا اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے شادی نہیں کرنی۔ کوئی بات نہیں جو اماں اسے دو چار تھپڑ مار لیتی ہے۔ سارا کام اس سے کرواتی ہے۔ ہزاروں باتیں سناتی اور بے عزتی کرتی ہے۔

لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھی اور ابا چلے گئے تھے۔ وہ وہیں بیٹھی روتی رہی تھی۔ اسے اپنی اماں یاد آ رہی تھیں، اپنا شہزادہ بھائی یاد آ رہا تھا۔ جانے کہاں رل رہا ہوگا۔ روتے روتے تھک گئی تو اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اور پھر چند دن بعد اماں نے اس سے کہا تھا کہ نہا دھو کر کپڑے بدل لو، آج فضل الرحمٰن کے گھر سے وہ لوگ شگن کرنے آئیں گے۔ وہ خاموشی سے تیار ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس روز اماں نے اسے کوئی بھی

کام کرنے کے لیے نہیں کہا تھا، خود ہی پھرتی سے سب کام کرتی رہی اور پھر ظہر سے پہلے تین عورتیں ایک تقریباً اس کی عمر کی ہی لڑکی مٹھائی کے بڑے بڑے ٹوکروں کے ساتھ آئی تھیں۔ساتھ آنے والے مرد بیٹھک میں ابا کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ایک عورت نے جب اس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اونچا کیا تو اس نے دیکھا، وہ سب حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"چاچا کی قسمت دیکھو، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور یہ کچی کلی جیسی لڑکی، اس نے کیا خدمت کرنی بڈھے کی، الٹا وہ اس کے نخرے اٹھاتا اٹھاتا مرجائے گا۔"

ان میں سے ایک عورت نے کہا تھا۔وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"سچ بتا یہ تمہارے سگے ماں باپ ہیں؟" ایک عورت نے جو ہمدردی سے اسے دیکھ رہی تھی، پوچھا۔

"اماں سوتیلی ہیں۔" اس نے چہرہ پھر جھکا لیا تھا۔

"تب ہی تو...... پر یہ تو ظلم ہے اماں......" اس کی ہم عمر لڑکی کہہ رہی تھی۔

"دادا کو اس عمر میں بھلا شادی کی کیا ضرورت تھی۔نوکر چاکر ہیں تو خدمت کرنے کے لیے......"

اور آنسو چھپانے کے لیے اس نے سر مزید جھکا لیا تھا، وہ آپس میں باتیں کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں۔وہ نکاح کا جوڑا اور زیور وغیرہ دینے آئی تھیں۔

اس نے سنا وہ کہہ رہی تھیں ٹھیک چار دن بعد اس کا نکاح تھا۔اماں سے اسے اچھائی کی توقع نہیں تھی پھر بھی وہ ابا کی بات پر یقین کر بیٹھی تھی۔وہ یونہی اپنی چارپائی پر نہ جانے کتنی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔آنسو آنکھوں سے پھسل کر رخساروں پر آتے تو وہ انہیں ہاتھوں کی پشت سے پونچھ دیتی۔نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، باہر یک دم خاموشی چھا گئی۔شاید وہ لوگ چلے گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد ابا کی آواز سنائی دی تھی۔جو کبھی بلند ہو جاتی کبھی آہستہ......وہ کیا کہہ رہے تھے اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔وہ تو بس ایسے ہی بیٹھی رہی تھی۔اماں کے اونچا اونچا بولنے کی آواز، رضوان کے رونے کی آواز سب آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔وہ کبھی رونے لگتی کبھی خود ہی چپ کر جاتی اور جب یوں ہی بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو اٹھی۔اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔سر درد سے پھٹ رہا تھا۔اس نے سوچا باہر مہمانوں کے لیے

چائے بنی ہو گی شاید کچھ بچی ہو۔ اس نے دروازہ کھولا تو اماں کی آواز سنائی دی تھی۔

''ارے رضوان کے ابا! فضل الرحمٰن تو اپنی زہرا کو سونے میں تول دے گا۔ دیکھا کتنا زیور لے کر آئے ہیں اور وہ بھی اتنا بھاری۔''

ابا برآمدے میں ہی بیٹھے حقہ پی رہے تھے اس نے سنا وہ کہہ رہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے زرینہ! پر اس کی عمر بہت زیادہ ہے۔ ہماری زہرا تو اس کی پوتی سے بھی چھوٹی ہے دیکھا تھا نا تم نے اور اس کی بہویں کتنی خرانٹ لگ رہی تھیں اور وہ جو اس کے بیٹے آئے تھے۔ وہ تو میری عمر کے تھے۔ چھوٹا بیٹا بھی چالیس سال سے کم کا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ زرینہ، منع کر دے انہیں، ہمیں نہیں کرنا زہرا کا رشتہ ادھر، ابھی کون سا وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔''

''نہ اب کیسے منع کر دوں...... ہاں کر چکے ہیں۔ منہ میٹھا کروا دیا ہے۔'' اماں کی آواز کان پھاڑتی تھی جبکہ ابا کی آواز آہستہ تھی۔ دکھی سی......

''تم نے مجھے یہ سب پہلے نہیں بتایا تھا زرینہ کہ اس کی عمر کتنی ہے اور بچے کتنی عمر کے ہیں ورنہ میں کبھی ہاں نہ کرتا۔ تم تو یہ ہی کہتی رہیں کہ میں بھی تو دو بچوں کی ماں بن کر آئی تھی اپنی زہرا اگر چار بچوں کے باپ سے بیاہی جائے گی تو قیامت نہیں آ جائے گی۔ دولت میں کھیلے گی۔ چوہدرانی بن کر راج کرے گی۔ نہ زرینہ نہ، مجھے اپنی بیٹی اتنی بھاری نہیں ہے کہ میں اسے بوجھ کی طرح اتار پھینکوں......''

اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر، پیچھے اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر روئے۔ پہلی بار اس نے ابا کو زرینہ اماں کے سامنے اس کی حمایت کرتے اور اس کے لیے بحث کرتے سنا تھا۔ ہاں پہلی بار وہ اماں کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ اب اگر اس کی شادی فضل الرحمٰن چوہدری سے بھی ہو جاتی ہے تو اسے کوئی غم نہیں، ابا کی خاطر وہ نباہ لے گی۔

''توبہ کریں رضوان کے ابا۔ وہ بڑے لوگ...... اب انکار کریں گے تو وہ تو دشمنی پر اتر آئیں گے۔ کیا خبر زہرا کو اٹھوا لیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے زبان دے دی اب زہرا ان کی منگ اور غیرت ہے۔''

نیم وا دروازے سے اماں کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔ وہ ابا کو ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابا پتا نہیں ڈرے تھے یا نہیں، لیکن وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور شاید اماں بھی ان کے پیچھے ہی چلی گئی تھی۔ باہر اب خاموشی تھی۔ اس نے بھی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں موند لی تھیں، اور دل ہی دل میں ابا کی کہی باتوں کو دہرانے لگی تھی۔ یہ احساس کتنا خوش کن تھا کہ ابا اس کے لیے اماں سے بحث کر رہے تھے۔

اللہ نے اتنے سالوں بعد ان کے دل میں اس کی محبت اور احساس پیدا کر دیا تھا۔ اب بھلے جو بھی ہو، اور وہ جانتی تھی کہ کیا ہونا ہے، آخر میں بات تو اماں کی ہی مانی جائے گی لیکن ابا اس کے لیے بولے تو...... اور اسی خوش کن احساس میں گھرے وہ سو گئی تھی۔ جب اماں رضوان کی انگلی پکڑے، اس کے کمرے میں آئی اور اس کے کندھے کو ہلایا۔

"اے لڑکی......!"

عموماً اس کا انداز تخاطب یہی ہوتا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"سنو وہ پیسے کدھر ہیں جو انہوں نے تمہارے ہاتھ پر رکھے تھے۔"

"یہ...... یہ رہے......" اس نے تکیے کے پاس پڑے ہزار ہزار کے سارے نوٹ اٹھا کر انہیں دے دیے تھے۔

"تو ابا ان کے دیے روپے اور چیزیں واپس کرنے جا رہے تھے شاید......" دل خوش فہم نے امید دلائی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے خوش فہمی کا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔

"میں ذرا مارکیٹ جا رہی ہوں رضوان کے لیے کپڑے اور جوتے خریدنے ہیں تمہاری شادی کے لیے، ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے اس کے پاس اپنے لیے بھی ایک آدھ جوڑا لے لوں گی۔ اب تین دنوں میں کسی نے سی کر دینے نہیں، ورزن آپا کی منت کروں گی کہ ایک تو سی ہی دے۔ اور ہاں یہ روپے پھر واپس کر دوں گی تجھے۔ تمہارے لیے تو انہوں نے کچھ بھی لینے سے منع کر دیا ہے۔ بڑے پیسے

والے ہیں۔ تمہارا نکاح کا جوڑا تو وہ دے ہی گئے ہیں۔ باقی بھی وہ بی بی کہہ رہی تھی اپنے درزی سے سلوا لیں گے۔ میں نے وہ تمہارا عید والا گلابی جوڑا دے دیا تھا ناپ کے لیے۔"

پیسے گن کر اماں نے پرس میں رکھے۔

"چل اٹھ، اب دروازے کو کنڈی لگالے۔ تیرے ابا دکان سے آئیں تو انہیں روٹی پکا دینا۔ کہا بھی تھا کھانے کا وقت تو ہو ہی گیا ہے کھا کر چلے جائیں لیکن چلے گئے کہ دکان یوں ہی کسی کے حوالے کر کے آ گیا تھا۔ مجھے تو دیر ہو جائے گی۔ کپڑے خرید کر پھر درزن کی طرف جاؤں گی۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ باہر برآمدہ اور صحن دھوپ سے بھرا تھا۔ مطلب وہ بہت دیر نہیں سوئی تھی۔ شاید چند لمحوں کے لیے ہی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔

دروازے کو کنڈی لگا کر وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

"تو ابا اماں کے سامنے ہار گئے۔" اس نے دل گرفتگی سے سوچا اور صبح کی بچی ہوئی روٹی نکال کر اس پر اچار کی پھانک رکھی اور کھانے لگی کہ صبح اماں نے ناشتا بھی نہیں کرنے دیا تھا کہ جلدی سے تیار ہو کر بیٹھ جاؤ کہ انہوں نے جلدی آنے کا کہا تھا۔ روٹی کھا کر وہ پھر اپنے کمرے میں آ گئی اور ابا کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ کھانا کھانے نہیں آئے تھے۔ شاید غصے میں گھر سے گئے تھے۔ اسے یاد آیا کہ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے سنا تھا ابا غصے میں بولتے ہوئے باہر جا رہے تھے۔

"ہماری بیٹی ہے، اگر ہم رشتہ نہ دیں تو کیا کر لیں گے بھلا وہ ہمارا......"

ہاں شاید یہ ہی کہہ رہے تھے وہ اور اماں ان کے پیچھے پیچھے شاید دروازہ بند کرنے گئی تھیں۔

"جو کچھ وہ کریں گے تم سوچ بھی نہیں سکتے رضوان کے ابا۔"

اماں کی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ سو گئی تھی۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی۔ منٹوں میں سو جاتی تھی۔ جہاں ذرا ٹیک لگائی وہاں ہی آنکھیں بند اور پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ کہیں ابا ناراض ہو کر تو نہیں گئے تھے کہ کھانا کھانے بھی نہیں آئے۔

لیکن نہیں اگر ایسا ہوتا تو اماں خریداری کرنے نہ جاتی۔ یہ تو طے ہے کہ آخر میں ابا نے اماں کی

بات مان لی ہوگی۔ تو...... پھر بھوک نہیں ہوگی اب رات میں ہی گھر آئیں گے۔ اس نے خود ہی سوچ لیا تھا۔ لیکن پھر وہ عصر کی اذان کے کچھ دیر بعد آ گئے۔ اماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"تمہاری ماں نے کب تک آنے کا کہا تھا؟" انہوں نے باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر روک لیا تھا۔

"کہہ رہی تھی دیر ہو جائے گی لیکن مغرب سے پہلے آ جائے گی۔ بازار سے پھر درزن کی طرف جانا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم برقع پہن کر آ جاؤ۔" انہوں نے اسے کہا تھا۔

"ابا! کہاں جانا ہے؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"ابھی چلو میرے ساتھ، پھر بتاؤں گا۔"

وہ بہت جلدی میں تھے اور وہ ان سے کھانے کا بھی نہیں پوچھ سکی تھی۔ خاموشی سے برقع پہن کر باہر آ گئی تھی اور ابا نے صحن میں جانے کے بجائے اسے بیٹھک میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بیٹھک میں آئی تھی۔ انہوں نے بیٹھک کا گلی والا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ گلی میں ذرا فاصلے پر ایک شخص کھڑا تھا اور اس کے علاوہ آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔

"عبدالخالق ہے۔ میرا یار میرا بھائی سمجھ لے تیرا چاچا ہے۔ سگا چاچا۔ بس اس کے ساتھ چلی جا، میں کل صبح آؤں گا اور پھر سب بتاؤں گا۔"

"ابا......!" اس کے لبوں سے کانپتی سی آواز نکلی تھی۔

"جلدی کر وزہرا...... اس سے پہلے کہ تمہاری اماں آ جائے عبدالخالق کے ساتھ چلی جاؤ، گھبراؤ نہیں، میں تمہارے بھلے کے لیے ہی تمہیں عبدالخالق کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔"

اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی، بیٹھک کے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ ابا وہیں بیٹھک کے دروازے میں ہی کھڑے رہے تھے اور وہ ابا کی ہدایت کے مطابق اچھی طرح نقاب میں چہرہ چھپائے، چاچا عبدالخالق کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ جب وہ اپنے گھر سے کافی دور

آ گئے تھے تب عبدالخالق نے رک کر پہلی بار اسے مخاطب کیا تھا۔

''گھبراؤ نہیں بیٹی، مجھے اپنے باپ کی جگہ ہی سمجھو۔''

اب وہ اس سے آگے آگے چلنے کے بجائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دو تین مزید گلیاں مڑنے کے بعد وہ ایک گھر میں داخل ہوئے تھے۔ گھر کا دروازہ ایک بزرگ خاتون نے کھولا تھا۔

''اتنی دیر سے کیا دیکھ رہی ہو زہرا بتول؟ کیا میں تمہیں شہزادہ نہیں لگتا۔'' شرارتی چمک دار آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

''نہیں، میں تو بس ایسے ہی سوچ رہی تھی......'' وہ چونکی۔

''اس روز پتا نہیں کیسے ابا کے دل میں میری سوئی ہوئی محبت جاگ گئی تھی۔ مجھے ابا سے بہت گلے شکوے تھے، پر اس روز میرے سارے گلے شکوے ختم ہو گئے تھے ماسٹر صاحب، جب میں چاچا کے ساتھ اس گھر میں گئی تھی تو مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ ابا نے مجھے وہاں کیوں بھیجا ہے۔ میں تو بس اس لیے ان کے ساتھ چلی گئی تھی کہ ابا نے کہا تھا اور میں نے ابا کی کسی بات سے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اور میں تو راستے بھر یہ ہی سوچتی آئی تھی کہ ابا کو بھوک لگی ہو گی انہوں نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا اور اماں جانے کب آئے گی کہ اماں جب بھی درزن خالہ کے گھر جاتی تھی دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں آتی تھی کہ خالہ سے اس کی دوستی بھی بہت تھی۔

اور وہاں اس گھر میں جو خاتون تھیں وہ مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی تھیں۔ بہت محبت اور شفقت سے میرا حال احوال پوچھا تھا۔ رات کو زبردستی کھانا کھلایا۔ چاچا نے ایک بار آ کر مجھے تسلی دی تھی کہ میں بے فکر ہو کر سو جاؤں۔ اور میں کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹتے ہی سو گئی تھی اور صبح ابھی ناشتا کر رہی تھی کہ ابا آ گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرا نکاح چاچا عبدالخالق کے بیٹے کے ساتھ کر رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو بس انہیں حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ ابھی چند دن پہلے تو وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ وہ میری شادی فضل الرحمٰن چوہدری سے کر رہے ہیں اور اب اچانک کسی اور سے اور وہ بھی اماں سے چوری چھپے......''

"تم تو ہمارے نصیب کا چاند تھیں زہرا بتول ہمارے آنگن کو مہکانا تھا تمہیں پھر بھلا کیسے فضل الرحمٰن سے تمہارا نکاح ہوتا۔"

ماسٹر عبد العزیز جو بہت دلچسپی سے اسے ہولے ہولے بولتا ہوا سن رہے تھے، بے اختیار بولے۔ لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوئی تھی، روشن آنکھیں دمک اٹھی تھیں۔

کیسے اللہ نے اپنے گاؤں سے اتنی دور ان کا نصیب، زہرا بتول سے جوڑ دیا تھا، جس پر وہ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔

عبد الخالق کا بچپن بہاول پور میں گزرا تھا۔ ماں کی وفات کے بعد نانی انہیں ساتھ لے گئی تھیں، تب ان کی عمر چار سال تھی۔ میٹرک تک تعلیم انہوں نے بہاول پور میں ہی حاصل کی تھی۔ میٹرک کے بعد بھی دو سال وہ وہیں رہے تھے اور نانا کے ساتھ ان کی دکان پر جانے لگے تھے۔ پھر نانا نانی وفات پا گئے۔ خالہ کی شادی نانی کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ اکیلے پن سے گھبرا کر وہ ابا کے پاس رحیم یار خان آ گئے تھے جنہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور ان کے ہوش سنبھالنے کے بعد اکثر انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرتے تھے لیکن وہ نانی کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔ رحیم یار خان واپس آنے کے بعد بھی چھ مہینے بعد بہاول پور کا چکر لگاتے تھے کہ وہاں خالہ خالو تھے، ان کے بچپن کے دوست یار تھے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ خالہ خالو بے اولاد تھے۔ ان کے جانے سے خوش ہوتے تھے۔ وہ ڈھیروں ضرورت کا سامان خالہ کو دے آتے۔ اور جس قدر ہو سکتا روپے پیسے سے بھی مدد کرتے تھے۔ اس روز پتا نہیں ان کے دل میں کیا خیال آیا تھا کہ انہوں نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا وہ تعلیم مکمل کر چکے تھے اور نوکری کے لیے مختلف جگہ درخواستیں دے رکھی تھیں۔ فارغ تھے سو ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔

"خالہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ کبھی تمہیں بھی ساتھ لے کر آؤں...... لیکن تمہاری پڑھائی کے خیال سے لے کر نہیں جاتا تھا۔ اب فارغ ہو تو سوچا کہ تم بھی ساتھ چلو، خالہ بہت خوش ہوں گی اور اپنے یار بیلیوں سے بھی ملواؤں گا۔ تین چار روز رہیں گے ادھر بہاول پور کی سیر شیر بھی کر لینا۔" ابا نے کہا لیکن سیر کیا کرنی تھی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی مثال ان پر صادق آئی تھی۔ پہلی بار انہوں نے اتنا لمبا سفر

کیا تھا سو رات کو کھانا کھا کر جو سوئے تو صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ ابا نے بھی جگایا نہیں تھا کہ سفر کی تھکان اتر گئی تو خود ہی جاگ جائے گا۔ خالہ نے بتایا تھا کہ ان کے ابا کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔ کچھ دیر تک آجائیں گے تو پھر تمہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔

ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر تک خالہ سے باتیں کرتے رہے۔ خالو سے اخبار کی خبروں پر تبصرہ کیا اور پھر کمرے میں آکر لیٹ گئے کہ دیسی گھی کے تر بتر پراٹھے اور دیسی انڈوں کے آملیٹ نے خمار طاری کر دیا تھا۔ اماں کی وفات کے بعد آج سالوں بعد انہوں نے عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا تھا۔

انہوں نے سوچا تھا کہ ابا کے آنے سے پہلے وہ فریش ہو کر تیار ہو جائیں گے اور پھر بہاول پور شہر کی سیر کو نکلیں گے۔ وہ تیار ہو ہی رہے تھے کہ ابا واپس آگئے لیکن وہ اکیلے نہیں تھے ان کے ساتھ زہرا بتول تھی۔ زہرا بتول کو خالہ کے ساتھ بھیج کر وہ اس کے پاس آئے تھے۔

''میں بس تیار ہی ہوں ابا، چلتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کنگھی آئینے کے سامنے بنے ریک پر رکھی۔

''عبدالعزیز......!''

ابا انہیں بے حد سنجیدہ لگے تھے۔

''میں نے تمہاری شادی اپنے دوست کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔ امیر الدین میرا بچپن کا دوست ہے۔ کل صبح تمہارا نکاح ہے۔''

وہ ہکا بکا سے انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔

''لیکن ابا! ابھی تو میری نوکری بھی نہیں لگی۔ گورنمنٹ کی جابز تو ابھی نکلی ہی نہیں۔ اور......''

''عبدالعزیز......!'' ابا نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ زہرا بہت پیاری بچی ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔ بہت پہلے سے میرے ذہن میں تھا کہ اگر امیر الدین مان گیا تو میں تمہاری شادی اس کی بیٹی سے کروں گا، لیکن اس طرح گھر سے دور، یوں ایمرجنسی میں تمہارے نکاح کا کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب جو

ایسا ہے تو اس کی بھی ایک وجہ ہے اور یقین کر عبدالعزیز اللہ تجھ سے بہت راضی ہوگا۔"

اور انہوں نے پہلے کبھی ابا کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا، اب بھی خاموش ہو گئے تھے اور ابا خالو جی کو ساتھ لے کر نکاح کے انتظام کے لیے چلے گئے تھے۔ رات جب وہ کمرے میں سونے کے لیے آئے تو انہوں نے بتایا زہرا کی ماں کی وفات کے بعد امیر الدین نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن سوتیلی ماں کا سلوک زہرا اور اس کے بھائی کے ساتھ کبھی اچھا نہیں رہا۔ لیکن امیر الدین نے کبھی زیادہ دھیان نہیں دیا تھا کہ بیوی کا سلوک بچوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بیٹا ماں کی مار سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا اور زہرا کی شادی اس کی سوتیلی ماں نے طے کر دی اور امیر الدین کو بتایا کہ فضل الرحمٰن کی پہلی بیوی مر چکی ہے، اس لیے وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی عمر اسی سے بھی زیادہ ہے۔ بس اس کی دولت اور گھر کی تعریفیں کرتی رہی۔

امیر الدین کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی تھی کہ اس نے فضل الرحمٰن سے ملنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی، یا پھر اس کی بیوی نے اسے ایسا مصروف کیا بقول اس کے گھما ڈالا کہ وہ فضل الرحمٰن سے مل ہی نہ سکا۔ وہ تو جب اس کے گھر سے اس کی بہویں اور بیٹے شگن کرنے آئے تو وہ حیران رہ گیا۔ چھوٹا بیٹا کم از کم چالیس سال کا تھا اور بڑا امیر الدین سے تھوڑا بڑا ہی ہوگا۔

ان کے جانے کے بعد، جب اس نے بیوی سے فضل الرحمٰن کی عمر کی بات کی تو اس نے لاپروائی سے کہہ دیا کہ مرد کی عمر اور شکل کون دیکھتا ہے، امیر الدین تیری بیٹی عیش کرے گی۔ لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ انکار کر دو۔ لیکن اس کی بیوی کسی صورت اس کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔

"زبان دے کر کون مکرتا ہے۔ وہ بڑے لوگ ہیں پیسے والے۔ عزت بے عزتی کا مسئلہ بنالیں گے۔ میں ہرگز انکار نہیں کروں گی۔ اگر تم نے کرنا ہے تو کر دو اور اپنی بیٹی کو لے کر چلے جاؤ اور مجھے طلاق دے دو۔"

امیر الدین تو ہکا بکا رہ گیا اور پہلی بار اسے لگا کہ اس کی بیوی اس کی غیر موجودگی میں اس کے

بچوں کے ساتھ کتنی زیادتی کرتی ہوگی۔ جب عبدالخالق اس سے ملنے اس کی دکان پر گئے تو وہ بہت پریشان تھا۔ ساری بات سن کر عبدالخالق نے اسے مشورہ دیا کہ اس سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے میں تمہیں طلاق دے دوں گا لیکن اپنی بیٹی کی شادی ہرگز اس عیاش بڈھے سے نہیں کروں گا۔

لیکن امیر الدین بھی عجیب چوہا مرد ہے اور بے وقوف بھی۔ کہنے لگا اسے طلاق دے کر میں سڑک پر آجاؤں گا۔ زرینہ سے نکاح کے وقت میں نے مکان اس کے نام کر دیا تھا اور جب رضوان پیدا ہوا تو اس نے دکان رضوان کے نام کروالی۔ رضوان کے بالغ ہونے تک اس کی ملکیت زرینہ کی ہوگی پھر بھی اگر میں گھر اور دکان کی قربانی دے بھی دوں تو وہ رضوان کو زندگی بھر مجھ سے ملنے نہیں دے گی۔ وہ ایسی ہی ضدی اور ہٹ دھرم عورت ہے۔ ایک بیٹا کھو چکا ہوں۔ دوسرے کے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اس سے کہا کہ اتفاق سے اس بار میرا بیٹا بھی ساتھ آیا ہے۔ اگر تم راضی ہو تو میں کل صبح ہی بیٹے کی بارات لے کر آجاتا ہوں۔ اس شہر میں میرے بہت جاننے والے ہیں۔ لیکن وہ بزدل احمق آدمی کہنے لگا کہ اس سے میرا مسئلہ کہاں حل ہوگا زرینہ تو وہی کرے گی جو کہہ رہی ہے۔ تم ایسا کرو عبدالخالق، میری بیٹی کو خاموشی سے ساتھ لے جاؤ اپنے شہر لے جا کر اپنے بیٹے سے اس کی شادی کر دینا۔ میں کہہ دوں گا گھر سے بھاگ گئی۔

مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس پر ترس بھی آیا۔ کیسا مجبور باپ تھا۔ لیکن مجھے مناسب یہ ہی لگا کہ تمہارا نکاح یہاں ہی امیر الدین کی سرپرستی میں ہو جائے، باقی ولیمہ اپنے گھر جا کر کرتے رہیں گے۔"

"یہ آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ماسٹر صاحب......" زہرا بتول انہیں یوں مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر پریشان ہوگئی۔

"کچھ نہیں زہرا بتول......! اپنی خوش قسمتی پر رشک کر رہا ہوں کیا خبر تھی کہ اس روز ابا کا حکم ماننے کا اتنا خوب صورت صلہ ملے گا کہ میرا دل اور گھر سنور جائے گا۔"

"باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے......" زہرا بتول نے نگاہیں چراتے ہوئے اعتراف کیا۔

"یہ تو میری خوش نصیبی تھی جو اس روز چاچا بہاول پور چلے آئے تھے ورنہ......"

''ورنہ اس وقت چوہدرانی بن کر راج کر رہی ہوتیں۔'' ماسٹر عبدالعزیز نے شرارت بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''مجھے کوئی چاہ نہیں تھی چوہدرانی بن کر حکومت کرنے کی۔'' زہرا بتول نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

''اگر ابا اور میں وہاں نہ آتے تو تم کیا کرتیں زہرا......؟'' ماسٹر عبدالعزیز کی آنکھیں اب بھی شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''میں نے کیا کرنا تھا ماسٹر صاحب......'' زہرا بتول کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔ ''میں بھلا کر بھی کیا سکتی تھی۔ ابا جس کے ساتھ رخصت کرتے مجھے تو اسی کے ساتھ جانا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اماں جیسی سوتیلی ماں نہیں بنوں گی۔ بلکہ اپنے سوتیلے بچوں کو اپنے سگے بچوں کی طرح سمجھوں گی۔ کبھی ان سے ایسا سلوک نہیں کروں گی جیسا اماں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔''

بے اختیار ماسٹر عبدالعزیز کے لبوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا تو وہ حیرانی سے انہیں تکنے لگیں۔

''اس میں بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے ماسٹر جی......؟''

''چالیس پچاس سالہ بچوں کی سولہ سالہ ماں......'' مسکراہٹ اب بھی ان کے لبوں پر بکھری تھی۔

''تو وہ چالیس سال کے ہوں یا پچاس کے، رشتہ تو ماں کا ہی ہوتا نا۔'' وہ ابھی تک حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں خیر رشتہ تو ماں کا ہی ہوتا۔'' ماسٹر عبدالعزیز نے بمشکل بے اختیار امڈ آنے والی ہنسی چھپائی کہ کہیں زہرا بتول خفا ہی نہ ہو جائے۔

''ایک بات پوچھوں ماسٹر صاحب......؟'' زہرا بتول نے ایک اور کیلا ٹوکری سے اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

''یہ سوتیلے رشتوں، ساس، نندوں، بہوؤں کو ہمیشہ برا کیوں کہا جاتا ہے۔ بچپن سے ہی بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں والی کہانیوں میں ہم پڑھتے آتے ہیں کہ سوتیلی ماں بڑی ظالم ہوتی ہے۔ شہزادوں شہزادیوں کی دنیا سے نکل کر جب ہم بڑے ہوتے ہیں، تو تب بھی کہانیوں، ڈراموں

میں ایسا ہی دکھایا جاتا ہے۔ ہم اپنے اردگرد سے بھی ایسا ہی سنتے اور دیکھتے ہیں۔ کہیں سوتیلی ماں ظالم ہے تو کہیں ساس، نندوں نے بہو کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور کہیں بہو نے ساس، نندوں کا۔“

”شاید یہ رشتے ہی ایسے ہوتے ہیں۔“ ماسٹر عبدالعزیز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں ماسٹر صاحب!“ زہرا بتول کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ایسا اس لیے ہے کہ سنڈریلا کی کہانی سے لے کر دوسری کہانیوں تک ان کرداروں کو ایسا ہی پینٹ کیا گیا ہے، ہمیں باور کروادیا جاتا ہے کہ سوتیلی ماں ظالم ہوتی ہے۔ ساس اور نندیں بری ہوتی ہیں اور ہم جب خود یہ کردار ادا کرتے ہیں تو ہم ایسے ہی ہو جاتے ہیں، کیونکہ ہمیں یہ ہی پتا ہوتا ہے لیکن اگر ہم انہیں ایک احساس رکھنے والے خوب صورت رشتے کے طور پر پیش کریں تو پھر ہم ایسے ہی ہوں گے نا...... پتا نہیں میں اپنی بات آپ کو سمجھا بھی پائی ہوں یا نہیں لیکن میں ایسا سوچتی ہوں۔“

”نہیں میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں تم صحیح کہہ رہی ہو۔“ ماسٹر عبدالعزیز کی نگاہوں میں ستائش تھی۔

صرف سات جماعتیں پاس، زہرا بتول اکثر انہیں اپنی باتوں سے حیران کر دیتی تھی۔ اس کی سوچ کی خوب صورتی اور پاکیزگی انہیں متاثر کرتی تھی۔

”ہماری چھٹی جماعت کی کلاس ٹیچر ہمیشہ کہتی تھیں کہ کبھی کسی کو نالائق، نکما اور برا نہ کہا۔ وہ ایسا ہی ہو جائے گا۔“

ماسٹر عبدالعزیز نے سر ہلایا۔ چودہ سال پہلے ان کی زندگی میں اچانک شامل ہونے والی زہرا بتول یقیناً ان کی کسی نیکی کا انعام تھیں۔ عبدالخالق اکثر کہا کرتے تھے۔

”عبدالعزیز! اس روز یونہی بس بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا تھا کہ اس بار تمہیں بھی خالہ سے ملوانے ساتھ لے چلوں۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی کتنی ہی بار میں تمہاری چھٹیوں میں بہاول پور گیا کبھی تمہیں ساتھ لے جانے کا خیال نہیں آیا تھا لیکن میرے دل میں خیال پیدا کرنے والا اللہ جانتا تھا کہ یہ سفر تمہیں عطا کرنے والا ہے۔ اچھی بیوی اللہ کا انعام ہوتی ہے عبدالعزیز ہمیشہ اس کی قدر کرنا۔“

اور انہوں نے زہرا بتول سے صرف محبت ہی نہیں کی، بلکہ ہمیشہ اس کی عزت اور قدر بھی کی

تھی۔ شادی کے فوراً بعد ہی انہیں اپنے ہی گاؤں چک اٹھہتر پی کے مڈل اسکول میں حساب کے ٹیچر کی جاب مل گئی تھی۔ یہ مڈل اسکول اب ہائی ہو چکا تھا۔ یہ عبدالخالق کی خواہش تھی کہ استاد بن کر وہ اپنے ہی گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیں اور ان کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

گاؤں میں ان کا اپنا گھر تھا۔ جب تک اماں زندہ رہیں۔ عبدالخالق ہر ہفتے رحیم یار خان سے گاؤں آجاتے تھے لیکن اماں کی وفات کے بعد وہ انہیں بھی اپنے ساتھ ہی رحیم یار خان لے آئے تھے۔ انہوں نے دکان کے ساتھ قریب ہی ایک چھوٹا سا گھر لے رکھا تھا۔ اماں کی وفات کے وقت وہ آٹھویں جماعت میں تھے۔ اور باقی کی تعلیم انہوں نے رحیم یار خان رہ کر ہی مکمل کی تھی۔ کبھی کبھار گھر کی دیکھ بھال کے لیے عبدالخالق گاؤں آتے تو اگر چھٹی ہوتی تو ساتھ وہ بھی چلے آتے تھے لیکن ایک بار پھر گاؤں کا گھر آباد ہو گیا تھا۔

عبدالخالق پرانے معمول کے مطابق ہفتے میں ایک بار آتے اور چھٹی کا دن گزار کر چلے جاتے جبکہ عبدالعزیز کو ان کی فکر رہتی تھی۔

''ابا! آپ یہاں گاؤں میں ہی آجائیں۔ میری تنخواہ میں آرام سے گزارا ہو جائے گا۔ یا پھر یہاں ہی پرچون کی چھوٹی سی دکان کھول لیں۔''

لیکن عبدالخالق یوں چلتی دکان کو فروخت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ جبکہ انہیں کون سا ہل جوتنا ہوتا تھا۔ دکان پر بیٹھنا ہی تھا۔ ایک چھوٹا ہیلپر لڑکا بھی انہوں نے رکھا ہوا تھا۔

''کل کو تمہارے بچے ہوں گے ان کی تعلیم اور پرورش کے لیے آج کی بچائی رقم کام آئے گی۔'' انہوں نے عبدالعزیز کو سمجھایا تھا اور وہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن وہاں ان کی تنہائی کا خیال انہیں پریشان رکھتا تھا۔

شادی کے سال بعد پہلے زیب النساء اور پھر چار سال بعد حامد کی آمد کے بعد خود ان کا دل بھی رحیم یار خان میں نہیں لگتا۔ کچھ ان کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی اس لیے وہ دکان فروخت کر کے گاؤں ہی آگئے تھے۔ زہرا ان کی بڑی خدمت کرتی تھی۔ انہیں بھی زہرا سے بہت پیار تھا اور بچوں میں

تو ان کی جان تھی۔ جب حامد تین سال کا ہوا تو انہیں اچانک دل میں شدید درد اٹھا تھا۔ عبدالعزیز انہیں رحیم یار خان لے گئے تھے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے تھے۔ مرتے دم انہوں نے وصیت کی تھی۔

''عبدالعزیز! زہرا کا بہت خیال رکھنا اسے کبھی احساس نہ ہونے دینا کہ اس کا کوئی نہیں۔ عورت کو میکے کا بڑا مان ہوتا ہے۔ سمجھو اس کا میکے میں کوئی نہیں ہے۔ اگر کبھی اس کا دل چاہے تو اسے ضرور بہاول پور لے جانا۔ ممکن ہو سکے تو امیر الدین سے چوری چھپے ملاقات کروا دینا۔ وہ منہ سے نہ بھی کہے، دل تو چاہتا ہوگا باپ سے ملنے کو۔''

اور ابا کو اس دنیا سے گئے چار سال ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک بار بھی زہرا سے نہیں پوچھا تھا کہ اس کا دل بہاول پور جانے کو چاہتا ہے، اسے اپنے گھر اور ابا کی یاد آتی ہے۔

ابا کی وفات کے ایک سال بعد چار سال کی عمر میں، حامد بھی چند دن بیمار رہ کر چل بسا تھا۔ پہلے ابا کی جدائی پھر حامد کا دکھ...... انہیں کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ امیر الدین کی خیریت معلوم کروائیں اور نہ ہی کبھی زہرا نے اپنی زبان سے کچھ کہا۔ جب تک خالہ خالو زندہ رہے، عبدالخالق معمول کے مطابق چار چھ ماہ بعد ان سے ملنے جاتے تو امیر الدین سے بھی ملتے۔ انہیں زہرا کی خیریت بتاتے اور واپس آ کر زہرا کو امیر الدین کا احوال بتاتے۔

خالہ خالو کے بعد، وہ کبھی خط لکھ کر کبھی کسی دوست کے ذریعے اور کبھی خود جا کر امیر الدین کا حال احوال معلوم کر کے زہرا کو بتا دیتے۔ اپنی بیماری سے پہلے انہوں نے کتنی ہی بار زہرا سے کہا تھا کہ وہ کسی روز امیر الدین کو ساتھ لے کر آئیں گے اس سے ملوانے یا اسے لے جائیں گے لیکن ان چار سالوں میں عبدالعزیز کو، ایک بار بھی امیر الدین کی خیریت معلوم کرنے کا خیال نہیں آیا تھا اور زہرا تو خیر اپنی زبان سے کچھ کہتی ہی نہیں تھی۔ دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے انہوں نے زہرا بتول کی طرف دیکھا، جو گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''زہرا بتول......!'' ندامتوں میں ڈوبا لہجہ...... زہرا چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''یوں ہی سوچ رہی تھی کہ مائیں تو سوتیلی ہوتی ہیں، لیکن سگے باپ کیوں سوتیلے ہو جاتے ہیں۔ وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ وہی بیٹا ہے جسے انہوں نے اپنے کندھوں پر جھلایا تھا۔ یہ وہی بیٹی ہے جس کے پھول جیسے رخساروں کو سینکڑوں بار انہوں نے چوما تھا۔''

''شاید عورت مرد کو اپنی مٹھی میں کر لیتی ہے اور اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں، اپنی اولاد بھی دکھائی نہیں دیتی۔''

''ہاں شاید وہ عورتیں زیادہ زور آور ہوتی ہوں گی۔ بہاول پور چلتے ہیں زہرا، چلوگی؟'' اس کی بات کا جواب دے کر وہ نادم سے پوچھ رہے تھے۔

''میں بھلا وہاں جا کر کیا کروں گی ماسٹر صاحب، وہاں کون ہے میرا۔'' زہرا بتول نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''تمہارے ابا ہیں۔ اور......''

''آپ بھول گئے ماسٹر جی کہ ابا نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا اب کبھی یہاں لوٹ کر نہ آنا زہرا۔ ورنہ میرا گھر اجڑ جائے گا۔ میں نے تیری خاطر اپنی پگ (پگڑی) میں مٹی بھر لی۔ کل رات سے پورا محلّہ میری پگ اچھال رہا ہے کہ امیر الدین کی بیٹی بھاگ گئی اور میں سن رہا ہوں بے عزتی برداشت کر رہا ہوں تو بھی میرا خیال کرنا زہرا! کچھ بھی ہو جائے کبھی اس شہر میں لوٹ کر نہ آنا۔'' آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔

''چاچا بتاتے رہتے تھے ابا کی خیر خیریت ان کا گھر نہیں اجڑا تھا۔ ماں چند دن واویلا مچا کر خاموش ہو گئی تھی کہ ابا مجھے چاچا کے ساتھ بھیج کر خود دکان پر چلے گئے تھے۔ اماں مغرب کے بعد واپس آئی تو میں گھر پر نہ تھی اور ابا دکان پر تھے۔ چاچا جی جب آخری بار بہاول پور گئے تھے اپنی خالہ کی وفات پر تو ابا نے کہلوایا تھا۔ میں تمہارے لیے جو کر سکتا تھا کیا جو نہیں کر سکا اس کے لیے اپنے باپ کو معاف کر دینا۔''

آنسو آنکھوں سے نکل کر رخساروں تک آئے۔

''ابا کے بعد تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں زہرا میں خود جا کر چاچا امیر الدین کی خیریت معلوم کر آتا۔'' ماسٹر عبدالعزیز کی آنکھیں شکوہ کرتی تھیں اور اندر ندامت سے بھیگ رہا تھا۔ یہ تو ان کا فرض تھا

خود جا کر یا خط لکھ کر امیر الدین کی خیریت پتا کرواتے۔ زہرا بتول نے چودہ برسوں میں کب کوئی خواہش کی تھی جوان سے اپنے باپ کی خیریت پوچھنے کے لیے کہتی۔

''میں نے تو چاچا سے بھی کبھی نہیں کہا ماسٹر صاحب، وہ خود ہی بتا دیتے تھے۔''

زہرا نے شکوہ نہیں کیا تھا لیکن انہیں شکوہ ہی لگا تھا۔

''ہاں میری غلطی ہے۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔ ''مجھے خود ہی پتا کرنا چاہیے تھا لیکن خیر چند دنوں تک گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ میں جا کر پتا کر آؤں گا۔ بلکہ ابا کے کاغذوں میں دیکھتا ہوں ان کا پتا مل گیا تو خط لکھوں گا۔''

''خط میں کچھ ایسا مت لکھیے گا جس سے......'' زہرا بتول نے پریشان سا ہو کر انہیں دیکھا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں لکھوں گا۔ بس خیر خیریت ہی پتا کروں گا۔ لیکن زہرا بتول، میری مانو تو دونوں چلتے ہیں چھٹیوں میں بہاول پور کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے اور میں چاچا امیر الدین کو لے آؤں گا تم مل لینا۔ دل تو چاہتا ہوگا نا تمہارا اپنے ابا سے ملنے کا۔''

''دل کا کیا ہے ماسٹر صاحب......'' زہرا بتول افسردہ ہوگئی۔ ''لیکن میں نہیں جاؤں گی، کسی نے دیکھ لیا تو...... ابا نے میری خاطر بے عزتی سہی۔ کون باپ ایسا کرتا ہے لیکن ابا نے کیا۔ خود اپنے ہاتھوں اپنے سر میں خاک ڈال لی۔ ابا سے جتنے شکوے تھے سارے اپنی موت آپ مر گئے۔ پتا نہیں میرے ابا اب بھی اپنے گلی محلے میں سر جھکا کر چلتے ہوں گے۔ اگر لوگ بھول بھی گئے ہوں تو پرانے اوراق پھر سے کھل جائیں گے۔'' وہ سر جھکائے ہولے ہولے بول رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکتے ہوئے گردن میں جذب ہو رہے تھے۔

''مجھے ابا یاد آتے ہیں مجھے رضوان یاد آتا ہے بلکہ مجھے تو اماں بھی یاد آتی ہیں۔ لیکن رضوان کو تو میں یاد بھی نہیں ہوں گی تب رضوان صرف تین سال کا تھا اور عرفان تو میرے آنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ چاچا نے بتایا تھا تب......''

''اور تمہارا اپنا سگا بھائی؟ کیا خبر وہ لوٹ آیا ہو، میں وہاں جا کر اس کا پتا بھی کرواؤں گا۔'' ان کا

انداز تسلی دینے والا تھا۔

''اس نے لوٹ کر آنا ہوتا ماسٹر صاحب، تو نو سالوں میں لوٹ آتا۔ میں سات سال کی تھی تب اور وہ تو دس سال کا۔ اس روز اماں نے اسے بہت مارا تھا۔ وہ مجھے گلے لگا کر بہت سارا رویا تھا۔ میں نے سمجھا وہ تکلیف سے رو رہا ہے کہ اماں نے جلتی لکڑی اس کے بازو پر ماری تھی لیکن وہ تو اس لیے رو رہا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ میں اس کے آنسو پونچھتی تھی وہ میرے ہاتھوں پر پیار کرتا تھا۔ میں سولہ سال کی تھی جب ابا نے آپ کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ نو سال تک میں اس کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔''

آنسو اور زیادہ روانی سے بہنے لگے تھے۔

''زہرا......!''

ماسٹر عبدالعزیز کا دل دکھ سے بھر گیا۔ انہوں نے چودہ سالوں میں کبھی زہرا سے اس کے دکھ نہیں پوچھے تھے۔ وہ تو بس اپنی قسمت پر خوش ہوتے رہتے تھے کہ اللہ نے انہیں بہترین بیوی عطا کی۔ انہوں نے کبھی اس بہترین بیوی کی آنکھوں میں چھپے غم کھوجنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

دل ہی دل میں مزید شرمندہ ہوتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ وہ زہرا بتول کے بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ کیا خبر وہ مل جائے۔

''تمہارے ابا نے کیا کبھی اخبار میں بیٹے کی گم شدگی کا اشتہار دیا تھا؟''

''پتا نہیں......'' زہرا نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ ''میں نے تو کبھی ابا کو اسے یاد کرتے اور اس کے لیے پریشان ہوتے بھی نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ تو اسے ہی برا بھلا کہتے رہتے تھے کہ نکما، آوارہ گھر سے بھاگ گیا۔ حالانکہ وہ تو بہت لائق اور اچھا تھا۔ اس کے استاد اس کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ میرا بھائی بہت خوب صورت تھا ماسٹر صاحب......اس کی آنکھیں اتنی پیاری تھیں اور بال ذرا سے لمبے ہوتے تو نیچے سے گھنگھر بن جاتے تھے۔ وہ بڑھے ہوئے بال بہت سجتے تھے اسے۔ لیکن ابا کہتے تھے یہ کیا لڑکیوں کی طرح بال بڑھائے رکھتا ہے۔''

وہ جیسے ماضی میں جھانک رہی تھی کہ ماسٹر عبدالعزیز اسے ماضی سے باہر لے آئے۔

''نام کیا ہے تمہارے بھائی کا......؟''

''اماں اسے شہزادہ کہتی تھیں اور......''

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ زیب النساء نے صحن میں قدم رکھا تھا۔

''لو میری بیٹی آ گئی۔'' ماسٹر عبدالعزیز بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ان کی عادت تھی وہ گھر میں ہوتے تو زیب النساء اسکول سے یا کہیں باہر سے آتی تو وہ اٹھ کر ہی اس کا استقبال کرتے تھے۔ زیب النساء نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔

''ابا آپ جلدی آ گئے۔''

وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی تو زہرا بتول نے چھلکوں والی پلیٹ اٹھائی اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اور ماسٹر عبدالعزیز حسب معمول ایک بازو بیٹی کے گرد حمائل کر کے اس کے سر پر پیار کرنے لگے۔

☆......☆......☆

بی بی اماں تخت پر بیٹھی پالک کاٹ رہی تھیں جب سحرش نے ریلنگ پر سے آدھا لٹکتے ہوئے آواز دی۔

''بی بی اماں! مٹر ہوں گے؟''

''کیوں کیا بازار میں سبزی کی دکانیں بند ہو گئی ہیں یا ہم نے سبزی کی دکان کھول رکھی ہے۔''

بی بی اماں کو بہت غصہ آتا تھا جب اوپر والے کوئی چیز مانگتے تھے۔ دوسری طرف بھی سحرش تھی جس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا تھا۔

''نہ تو بازار میں سبزی کی دکانیں بند ہوئی ہیں نہ آپ نے سبزی کی دکان کھول رکھی ہے، اصل بات یہ ہے کہ اول تو بازار سے مٹر ملیں گے نہیں اور اگر کہیں سے سڑے ہوئے مل بھی گئے تو وہ بھی سونے کے بھاؤ......''

''تو کیا ہمیں کہیں سے مفت مل گئے ہیں؟'' بی بی اماں بڑبڑائیں۔

''اوہ بی بی اماں! آپ بھی نا کنجوس مہا کنجوس ہیں۔ کیا مجھے نہیں پتا کہ زمل نے جب مٹر سستے تھے ڈھیروں فریز کیے ہوں گے۔''

بات کرتے کرتے وہ ریلنگ کے پاس سے ہٹ گئی اور کچھ ہی دیر بعد، سیڑھیوں پر نمودار ہوئی تو بی بی اماں منہ بنا کر پھر سے پالک کاٹنے لگیں۔

''زین اور بڑے صاحب کو مٹر پلاؤ پسند ہے تو زمل فریز کر لیتی ہے۔ پر یہ اوپر والے بدنظرے......'' وہ ہولے ہولے بڑبڑا رہی تھیں جب سحرش ان کے تخت کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

''لو اب میرے سر پر کیوں کھڑی ہوگئی ہو، جاؤ جا کر فریزر سے ایک پیکٹ نکال لو۔''

انہوں نے کٹی ہوئی پالک والی پرات ایک طرف کھسکائی۔ ڈنڈیاں اور خراب پالک اٹھا کر شاپر میں ڈالنے لگیں۔

''میں آپ کے سر پر کہاں کھڑی ہوں، میں تو یہ فرش پر کھڑی ہوں اور پھر میں کوئی سرکس کی مداری ہوں بی بی اماں، جو آپ کے سر پر کھڑی ہو جاؤں گی جیسے وہ سرکس والی لیڈی رسی کے اوپر چلتی ہے۔'' سحرش کو دوسروں کو زچ کر کے مزا آتا تھا۔

اب کے بی بی اماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔

''کیسی ہو سحرش؟''

''بالکل ٹھیک، صبح ذرا ہلکا ناشتہ کیا تھا تو دل چاہا مٹر اور آلو فرائی کر کے کھاؤں تو وہی لینے آئی تھی۔ تم نے تو کافی فریز کر کے رکھے ہیں نا۔'' اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں، ساجدہ ہے نا کچن میں، اس سے کہو فریزر سے پیکٹ نکال دے۔''

وہ جتلاتی نظروں سے بی بی اماں کی طرف دیکھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ یہ الگ بات کہ جب وہ کچن سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک کے بجائے دو پیکٹ تھے جنہیں وہ لہراتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔ پھر جاتے جاتے کسی خیال کے تحت مڑ کر پوچھا۔

''یہ شیخو بابا کب تک آ جائیں گے۔ دراصل آج رات شانزہ کے سسرال والے آ رہے ہیں تو

سودا وغیرہ منگوانا تھا۔"

"سارے کاموں اور بھاگ دوڑ کے لیے کیا یہ نگوڑ مارا شینخو ہی رہ گیا ہے۔ بتایا تو تھا تمہیں بی بی، بخار سے بھن رہا تھا۔ زین اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔ اپنی اماں سے کہو مرتضیٰ یا شاہ رخ سے کہے لے آئیں گے سودا سلف چھوٹے بچے تو ہیں نہیں۔"

بی بی اماں کو شینخو بابا سے بہت پیار تھا۔ نو دس سال کا تھا جب ظفر یاب نے اسے ان کے حوالے کیا تھا۔

"یہ شینخو بابا کو بھی آج ہی بیمار ہونا تھا۔"

سحر دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو بی بی اماں نے زمل کی طرف دیکھا۔

"یہ شانزہ کے سسرال والے مجھے کچھ چھچھورے سے لگ رہے تھے، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اچھے ہی ہوں گے بی بی اماں تب ہی تو تایا جان اور تائی جان نے شانزہ کا رشتہ دیا۔ ورنہ ایک دو رشتے اور بھی تھے۔ ایک تو وہ رقیہ خالہ نہیں ہیں، تائی اماں کی کزن انہوں نے بھی اپنے بیٹے کے لیے سوال کیا تھا لیکن تائی جان نے انکار کر دیا جبکہ اورنگ زیب تایا کو تو رقیہ خالہ کا بیٹا بہت پسند تھا۔"

زمل نے کبھی کسی کے متعلق غلط گمان نہیں کیا تھا۔ اس لیے شانزہ کے سسرال والوں کے متعلق اس کی رائے اچھی تھی۔ ایک دو بار اس کی ساس اور نند سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔

"تو یہ تمہاری تائی اماں دراصل پیسے پر ریجھ گئیں۔ سنا ہے بہت دولت مند ہیں وہ لوگ، ورنہ رقیہ کا بیٹا تو بڑا بھلا مانس اور اچھا لڑکا ہے۔ بس بیوہ ماں کا بیٹا ہے پیسے کی ریل پیل نہیں ہے لیکن ایسے غریب بھی نہیں ہیں۔ باپ اتنا کچھ تو چھوڑ کر مرا تھا کہ گزر اوقات اچھی ہوتی رہی۔"

بی بی اماں کی رقیہ سے خاصی بنتی تھی وہ جب بھی اوپر آتیں تو گھڑی دو گھڑی کے لیے بی بی اماں کے پاس بھی ضرور آتیں۔

"کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔" وہ بعض اوقات نام بھول جاتی تھیں۔

"عمر نام ہے ان کا۔ عمر اعجاز......"

زمل نے کئی بار عمر کو اوپر جاتے دیکھا تھا۔ چند بار اوپر آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ ہمیشہ نگاہ جھکا کر بات کرتا تھا۔ سحرش چند ماہ پہلے تک اس کا بہت ذکر کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید شانزہ کی شادی عمر بھائی سے ہو۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ عمر اور شانزہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اب تو جب سے شانزہ کی منگنی ہوئی تھی، وہ نہیں آیا تھا۔ شانزہ کی منگنی کے فنکشن میں، رقیہ خالہ نے مونا تائی کے استفسار پر بتایا تھا کہ وہ اپنی جاب کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے۔

اب پتا نہیں وہ ابھی تک کراچی میں ہی تھا یا پھر واپس آ گیا تھا لیکن اس نے اوپر آنا چھوڑ دیا تھا۔ شاید سحرش کا خیال صحیح ہو کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں۔ لحہ بھر کے لیے اسے خیال آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ سحرچ کو تو عادت ہے الٹے سیدھے اندازے لگانے کی۔

"ارے ہاں یاد آیا۔ رات کو زین کے کچھ دوست آ رہے ہیں۔ کہہ رہا تھا کہ کھانا کھا کر جائیں گے۔ تم ذرا سوچ لینا کیا کیا پکے گا۔ شینو کو بخار میں جلتے دیکھ کر ایسی مت ماری گئی کہ پوچھنا یاد ہی نہیں رہا کہ کتنے بندے ہوں گے۔ اب آئے تو پوچھ لینا۔"

بی بی اماں کٹی ہوئی پالک والی پرات اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔

"دن کو تو پالک گوشت پکے گا۔ ایک ڈونگا الگ سے رات کے لیے نکال کر رکھ لوں گی۔ اور کیا کیا بنے گا، زین سے بھی پوچھ لینا۔"

تب ہی ساجدہ کچن سے نکل کر باہر آئی۔

"کچن صاف ہو گیا ہے بی بی اماں! اب مشین لگا لوں۔"

"نہیں پہلے یہاں سے صفائی کر لو۔ میں ذرا ابا کو دیکھ لوں پھر آ کر تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔"

زمل اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی عادت تھی کہ ساجدہ جب بھی کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی وہ تھوڑی بہت مدد کر دیتی تھی۔

"مفت میں کپڑے تھوڑی دھوتی ہے ساجدہ...... مٹھی بھر تنخواہ دیتے ہیں، پھر بھی زمل کھڑی ہو

جاتی ہے اس کے ساتھ کپڑے دھلوانے...... یہ لڑکی بھی نا......'' بی بی اماں بڑبڑاتے ہوئے کچن میں گھس گئیں۔

''سنو ساجدہ! زین کی شرٹس مشین میں مت ڈالنا، ہاتھوں سے دھونی ہیں اور دادا جان کے واش روم میں بھی دیکھ لینا تولیہ وغیرہ ہو تو لے آنا۔''

ساجدہ کو ہدایت دے کر زمل شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو وہ سوئے تھے۔ جب سے ڈاکٹر ارسلان کی دوائیں شروع کی تھیں، انہیں نیند بہت آنے لگی تھی۔ وہ ان کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کے اتنے شان دار بارعب ابا کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔

اس روز زین، ڈاکٹر ارسلان کو لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر ارسلان نے سب سے پہلے تو دادا جان سے یہ بات کی تھی۔

''جب خلاف معمول انہوں نے خاموش رہنا شروع کر دیا تھا تو اگر آپ اسی وقت کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرتے تو اب تک شاہ زیب صاحب ٹھیک بھی ہو چکے ہوتے، اب اتنے عرصہ بعد مشکل تو بہت ہو گا لیکن ناممکن نہیں۔ آپ شروع میں ہر ہفتے اور پھر ہر پندرہ دن بعد سیشن کے لیے انہیں میرے پاس لے کر آئیں۔ دواؤں کے علاوہ انہیں باہر لے جایا کریں۔ یہاں ایک ہی کمرے میں بند رہ کر تو ان کی طبیعت مزید بگڑتی جائے گی۔''

انہیں سیشن کے لیے لے کر جانا اور پھر دوائیں کھلانا آسان نہیں تھا لیکن بہرحال زین یہ مشکل کام کر رہا تھا۔ ابھی تک تو کوئی خاص امپرو ومنٹ نہیں ہوئی تھی۔ جاگتے تو اسی طرح خاموش دیواروں کو گھورتے رہتے تھے۔

''ڈپریشن کی اس حالت کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو بند گلی میں پاتا ہے۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ کبھی کوئی پچھتاوا کوئی احساس جرم کوئی بے بسی، جینے کو دل نہ چاہنا، زندگی بے مقصد لگنا......''

ڈاکٹر ارسلان نے دادا جان سے کہا تھا اور ان کے متعلق دادا جان سے چھوٹی سے بات

بھی معلوم کی تھی اور امید دلائی تھی کہ ان شاء اللہ ایک دن وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔

''یا اللہ! بابا بالکل ٹھیک ہو جائیں۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ وہ ابا سے ڈھیر ساری باتیں کرے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنے غم ان سے شیئر کرے۔ تب ہی انہوں نے کروٹ بدل لی اور بڑبڑائے۔

''مجھے معاف کر دو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔''

پھر یوں ہی آنکھیں بند کیے کیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

جیسے کسی سے معافی مانگ رہے ہوں، لیکن کس سے......

کیا اماں سے؟

اور دادا جان کا خیال صحیح ہے کہ اماں کے بعد انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے اماں کو اپنی محبت اور خیال سے محروم رکھا جو ان کا حق تھا۔ لیکن اماں تو ان سے ناراض نہیں تھیں۔

اسے یاد تھا جب وہ گھر آتے تو کیسے پھول کی طرح کھل جاتی تھیں۔ کیسے اڑی پھرتی تھیں۔ کبھی اپنے ہاتھوں سے چائے بنا رہی ہیں، کبھی ان کے پسندیدہ کھانے تیار کیے جا رہے ہیں۔ جب انہیں اپنی بیماری کا پتا چلا تھا تب سے ہی وہ اسے کہتی رہتی تھیں۔

''اپنے ابا کا بہت خیال رکھنا زمل......'' ان کی پسند و ناپسند بتاتی رہتی تھیں اور وہ حیران ہوتی تھی کہ بھلا اماں اسے یہ سب کیوں بتاتی رہتی ہیں۔ وہ خود خیال رکھتی تو ہیں ابا کا، پھر میں کیوں؟

''ابا!'' اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن وہ پھر گہری نیند میں چلے گئے تھے۔ اس نے ان کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

''اور وہ دن میری زندگی کا شاید سب سے خوب صورت دن ہوگا، جب ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ایک محبت بھری نظر ان پر ڈالتی ہوئی وہ باہر آئی تو ساجدہ مشین لگا چکی تھی۔ اس نے زین کی ہاتھ سے دھونے والی شرٹس الگ کیں۔

''تم انہیں پہلے دھو لو، میں اتنے میں مشین میں کپڑے ڈالتی ہوں۔''

''ہے زمل!'' سحرش ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

''اماں تمہیں بلا رہی ہیں۔''

''کیوں؟'' زمل نے مڑ کر اوپر دیکھا۔

''شاید کوئی مشورہ کرنا ہے۔'' سحرش نے جواب دیا۔

''اچھا تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔'' اس نے اپنا ایک سوٹ اٹھایا۔

''اس کا رنگ اترتا ہے ساجدہ، اسے بعد میں الگ سے دھونا۔''

ساجدہ نے سوٹ لے کر الگ رکھ دیا تو وہ مشین چلا کر کچن کی طرف آئی۔ بی بی اماں گوشت چڑھا کر خود کچن چیئر پر بیٹھی تھیں اور سامنے ٹیبل پر پیاز کی ٹوکری پڑی تھی۔

''پھر سوچا کچھ رات کو کیا بنانا ہے؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایک تو مٹن یخنی پلاؤ بنا لیتے ہیں۔ گوشت میں نے نکال دیا ہے۔ یخنی تو ابھی تیار کر دیں گے۔ باقی کچھ اور بنانا ہو تو بتا دو پیاز وغیرہ کاٹ دیتی ہوں۔''

''چکن کا قورمہ بنا لیں۔ شامی کباب بنے ہوئے ہیں، تل لیں گے۔ اور کچھ بنانا ہوا تو زین آتا ہے تو اس سے پوچھ لوں گی۔'' وہ کرسی کھینچ کر بی بی اماں کے سامنے بیٹھ گئی۔

اس وسیع کچن میں ایک گول میز کے گرد چار کرسیاں رکھی تھیں۔ سردیوں میں اکثر زین اس کے اور بی بی اماں کے ساتھ کچن میں ہی کھانا کھا لیتا تھا۔ دادا جان اور شاہ زیب کو وہ کھانا کمرے میں ہی دے دیتی تھی۔

''یہ سحرش کیا کہہ رہی تھی جنگلے پر لٹکی ہوئی کہ اماں کو مشورہ کرنا ہے۔ مونا بی بی نے کب کسی سے مشورہ کیا ہے۔ دھیان رکھنا کہیں کچن میں ہی نہ گھسا دیں تمہیں۔'' بی بی اماں نے لہسن چھیلتے ہوئے زمل سے کہا۔

''بھلا وہ مجھے کیوں کچن میں گھسائیں گے۔'' زمل نے بی بی اماں کی طرف دیکھا۔

''ہوں...... میں تو جیسے جانتی نہیں تیری تائیوں کو۔ بتا دینا نیچے بھی دعوت ہے۔ سالوں بعد تو زین میاں کے دوست آ رہے ہیں۔ اب تو سالوں کوئی نہیں آتا۔ ایک زمانہ تھا کبھی شاہ زیب کے دوست آ رہے ہیں اور کبھی ظفریاب کے...... کیسی رونق لگی رہتی تھی۔ ہر وقت بڑے صاحب کے بھی دوست احباب وقت بے وقت آ جاتے تھے۔ مریم کو تو اللہ نے بلا لیا اور صبوحی اپنی مرضی سے چلی گئی۔ ہائے کیا زمانہ تھا صبوحی کیسے پروانوں کی طرح ظفریاب کے گرد چکراتی رہتی تھی۔ آج بھی یقین نہیں آتا کہ صبوحی یوں ایسے ظفر کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔ سب نے کتنا سمجھایا تھا لیکن......''

انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور پھر جیسے کسی خیال کے آتے ہی زل کی طرف دیکھا۔

''یہ زین نے دیر نہیں کر دی؟''

''کیا خبر ڈاکٹر نے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کروانے کو کہا ہو۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ شینو بھی تو گھنا ہے۔ منہ سے کچھ پھوٹتا ہی نہیں۔ جانے کب سے بیمار پڑا ہے۔ یہ تو میں آج ناشتا دینے گئی تو دیکھا بخار میں اوندھا پڑا تھا۔ کتنی آوازیں دیں، تب کہیں جا کر ذرا سی آنکھ کھولی۔ سچی بات ہے میں تو اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔''

''بی بی اماں!'' اس نے پلیٹ سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

''کیا شینو بابا کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے؟ اور یہاں ہماری حویلی میں کیسے اور کیوں آئے تھے؟ کون لایا تھا انہیں یہاں؟''

کئی بار اس کے ذہن میں آیا تھا کہ بی بی اماں سے شینو بابا کے متعلق پوچھے گی لیکن پھر ذہن سے نکل جاتا تھا۔

''ظفریاب ہی لایا تھا۔ نو دس سال کا ہوگا۔ تم تب تقریباً چھ سال کی ہوگی۔ ظفر کو باہر اپنی ہی گلی میں ملا تھا۔ کہنے لگا بی اماں غریب مسکین ہے۔ رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ دو دن سے ادھر گلیوں میں گھوم پھر رہا ہے۔ رات کو مسجد کے صحن میں سو جاتا ہے۔ اوپر کے کام کے لیے رکھ لیتے ہیں۔''

''میرے تو کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ ایسا پیارا، معصوم صورت کہ دیکھ کر پیار آتا تھا۔ اللہ نے اولاد

نہیں دی تھی لیکن دل میں اس کے لیے مامتا ابل پڑی تھی، میں نے کہا ظفریاب اسے تو مجھے دے دو اپنا بیٹا بنا کر رکھوں گی۔''

بی بی اماں نے ہاتھ میں پکڑی چھری ٹیبل پر رکھ دی تھی اور تفصیل سے بتا رہی تھیں۔

''اور اگر جو اس کے عزیز رشتہ دار اسے ڈھونڈتے ہوئے آ گئے تو......؟'' ظفریاب نے پوچھا تھا۔

''تو جن کی امانت ہے ان کے حوالے کر دیں گے۔'' میں نے کہا تھا۔ اور پھر ظفریاب کی اجازت پر میں اسے اپنے کوارٹر میں لے گئی تھی۔

حویلی سے ملحق دو سرونٹ کوارٹر تھے کچن کے پیچھے والی گلی میں راستہ تھا کچن کا ایک دروازہ بھی گلی میں لانڈری کے سامنے کھلتا تھا۔ یوں شینخو بابا بی اماں کے کوارٹر میں رہنے لگے تھے۔ جب وہ سولہ سترہ سال کے تھے تو سب بھائیوں نے مشورہ کر کے سرونٹ کوارٹر گرا کر وہاں دکانیں بنوا دی تھیں۔ ان دکانوں کے مین دروازے دوسری طرف روڈ پر کھلتے تھے۔ سو دکانیں فوراً ہی کرائے پر چڑھ گئی تھیں۔ بی بی اماں کو اندر حویلی میں ایک کمرہ دے دیا گیا تو شینخو کی چارپائی ڈیوڑھی میں ڈال دی گئی تھی۔

''پھر کیا ان کے رشتے دار کبھی انہیں ڈھونڈتے ہوئے آئے؟'' زمل متجسس ہو رہی تھی۔

''نہیں کبھی کوئی نہیں آیا۔ ظفر کہتے تھے ذرا فرصت ملی تو اس کے عزیزوں کو تلاش کروں گا۔ میں نے ہی پیار محبت سے بہلا پھسلا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد اس کی ماں کی سہیلی اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔ وہ ان کے شوہر کے ساتھ ہی لاہور آیا تھا۔ وہ کہتے تھے ادھر لاہور میں اس کا ماموں رہتا ہے۔ وہ اسے اس کے پاس چھوڑ کر چلے جائیں گے لیکن اگر ماموں نہ ملا تو پھر کسی مدرسے میں داخل کروا دیں گے۔ مگر رش میں وہ ان سے بچھڑ گیا اور انہیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر ہماری گلی میں آ گیا۔''

بی بی اماں نے پیاز اور لہسن چھیل کر ٹوکری ایک طرف کی اور چھلکے اکٹھے کر کے ڈسٹ بن میں پھینکے۔

''تو پھر کیا ظفر تایا نے ان کے عزیزوں کو تلاش کیا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''ارے کہاں کیا تلاش...... ظفر تو صبح کے نکلے شام کو کہیں گھر آتے تھے اپنی نوکری کے علاوہ ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی مصروف رکھتی تھیں انہیں۔ اتنی مہربانی کی تھی کہ اسے ادھر قریب ہی اسکول میں

چھٹی جماعت میں داخل کروا دیا گیا تھا کہ اس نے بتایا تھا کہ پانچویں پاس کر لی تھی اس نے۔

شروع میں ظفر بہت خیال رکھتے تھے۔ صبوحی کو بھی اس کا خیال رکھنے کا کہتے تھے کہ کیا خبر اللہ اس کا خیال رکھنے کے طفیل ہمیں مزید اولاد سے نواز دے۔ زین اکلوتا تھا۔ دونوں میاں بیوی کو بہت شوق تھا بچوں کا خاص کر صبوحی کو۔ وہ اکلوتی تھی نا۔ پھر اگلے دو تین سالوں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ ظفر کو وہ اٹھا کر لے گئے۔ صبوحی نے طلاق لے لی اور گھر سے چلی گئی۔ تمہاری اماں نے بھی صبوحی کے جانے کے بعد دنیا چھوڑ دی۔ ظفر شادی کر کے باہر چلے گئے جب وہ باہر گئے تو اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا تھا۔ ظفر نے جانے سے پہلے بہت تاکید کی تھی کہ اسے کالج میں ضرور داخل کروا دے گا۔ لیکن شاہ زیب نے چپ اوڑھ لی تھی۔ ان ہی دنوں تمہاری دادی بھی چند دن بیمار رہ کر چل بسیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پے در پے اتنی پریشانیاں آئیں کہ میں بھی زیادہ خیال نہ رکھ سکی۔ وہ نگوڑا ابھی دسویں میں ہی تھا کہ ڈیوڑھی میں اس کا ٹھکانہ کر دیا گیا۔ زیادہ آمنا سامنا بھی نہ ہو پاتا تھا تو اس کا رزلٹ آیا تو پتا ہی نہ چلا۔ نہ یہ منہ سے کچھ پھوٹا نہ اورنگ زیب یا ارباب کو اس کی پڑھائی کا خیال آیا۔

ایک دو بار بڑے صاحب نے ارباب سے کہا بھی کہ بچے کا سال ضائع ہو رہا ہے۔ کوئی سفارش وغیرہ کروا کے کسی کالج میں داخل کروا دو۔ لیکن انہوں نے کان ہی نہ دھرے اور شینو غریب، سب کا ملازم بن کر رہ گیا۔ میں نے دو تین بار کہا بھی کہ شینو بچے کالج میں داخلہ لے لو تو بولا، بی بی اماں پڑھ کر کیا کروں گا۔ خوامخواہ میری پڑھائی کا خرچا ہوگا۔ بڑے صاحب کو تو جب کسی سے اس کے نمبروں کا پتا چلا تو بہت افسوس کرتے تھے کہ اتنا ذہین بچہ اور کہتے تھے، اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر اس کے تھے۔"

بی بی اماں شینو کے متعلق بتاتے ہوئے چھوٹے موٹے کام بھی ساتھ کے ساتھ نمٹا رہی تھیں۔ یخنی کے لیے گوشت دوسرے چولہے پر چڑھا دیا تھا، پالک والا گوشت ابھی بھی اچھی طرح سے گلا نہیں تھا۔ وہ آنچ دھیمی کر کے پھر کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

"میٹھے میں کیا بناؤ گی؟ میرا خیال ہے آئس کریم یا لالے کی فرنی منگوا لینا۔ نان زین باہر سے لے آئے گا۔"

''جی......''

زمل نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ شیخو بابا کے متعلق سوچ رہی تھیں اور دل ان کے لیے گداز ہو رہا تھا کہ کیا وہ ساری زندگی یوں ہی ڈیوڑھی میں گزار دیں گے۔

''بیس سال کا تھا جب پہلی بار مجھے بتا کر ماں کی قبر پر گیا۔ کہتا تھا گاؤں کا نام پتا ہے اسے، چلا جائے گا۔ میرا تو دل ہی ہولتا رہا جب تک واپس نہیں آیا۔ کبھی اس شہر سے باہر نہیں گیا تھا نا۔ پھر تب سے ہر سال چلا جاتا ہے ایک بار ماں کی قبر پر۔''

بی بی اماں پھر یاد کرتے ہوئے بتانے لگی تھیں۔

''ایک بار میں نے پوچھا تھا کہ گاؤں جاتے ہو تو کسی سے اپنے عزیز رشتہ داروں کا پوچھا۔ اماں تو تمہاری اللہ کو پیاری ہوئیں۔ بابا، دادی، نانا نانی دوسرے رشتہ دار کیا سب مر کھپ گئے۔''

''زمل......زمل......!'' اوپر سے سحرش کی آواز آئی۔

''یار اوپر آؤ نا، اماں اور خالہ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں کتنی دیر پہلے تمہیں بتا کر گئی تھی کہ اماں اور خالہ بلا رہی ہیں تمہیں۔''

''ہاں ہاں یہاں تو جیسے سب حکم کے غلام بیٹھے ہیں۔ ادھر ملکہ عالیہ حکم دیں گی اور ادھر غلام ہاتھ باندھے حاضر ہو جائیں گے۔'' بی بی اماں کی بڑبڑاہٹ پر زمل کو ہنسی آ گئی۔

''اب ہنسی ہنسی میں کہیں ان کے کچن میں نہ گھس جانا۔ بتا دینا انہیں کہ رات زین کے دوستوں کی دعوت ہے۔'' انہوں نے دوبارا تاکید کرنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھی۔ اور کچن سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اوپر سیڑھیاں چڑھتے ہی اس نے برآمدے میں تخت پر رخسانہ اور مونا تائی کو بیٹھے دیکھا۔ ان کے سامنے کچھ شاپر پڑے تھے جن میں سے کپڑے جھانک رہے تھے۔ تخت کے پاس دیوار کے ساتھ کئی موڑھے اور کین کی کرسیاں رکھی تھیں۔ کرسیوں کے سامنے لمبی سی تپائی تھی۔ جس پر اخبار اور کچھ میگزین رکھے تھے۔ ایک کرسی پر شانزہ بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں رسالہ تھا۔

''جی تائی جان! آپ نے بلایا تھا۔'' وہ سلام کر کے ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ ''آپ کو کام تھا کوئی۔''

''ہاں کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور یہ شینخو ابھی آیا کہ نہیں۔''

مونا تائی نے تخت پر پڑا دوپٹا پاس پڑے شاپنگ بیگ میں ڈالا۔

''بی بی اماں نے بتایا تھا کہ انہیں بہت تیز بخار ہے اور زین انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔''

رخسانہ بیگم نے ناک چڑھائی۔

''یہ ملازموں کی عادت ہوتی ہے جب کوئی موقع ہو کام کا تو بیمار ہو جاتے ہیں۔''

''لیکن شینخو بابا ملازم تو نہیں ہیں۔'' زل کو برا لگا تھا۔

''اے لو، ملازم نہیں تو کیا مالک ہیں؟'' مونا تائی کا لہجہ تمسخر اڑاتا ہوا سا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

''وہ سحرش نے تمہیں بتایا تو ہو گا کہ شانی کی ساس اور نند آ رہی ہیں اور شاید منگیتر بھی ہو تو اچھا نہیں لگتا کہ کھانا کھائے بغیر ہی چلے جائیں۔''

''جی......'' اس نے شانزہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ گود میں رکھے رسالے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اور جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی وہ اسے اداس اور چپ چپ سی لگتی تھی۔

''ہاں تو زل تمہارے خیال میں کیا مینیو ہونا چاہیے؟'' رخسانہ تائی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''پلاؤ یا بریانی تو ضرور ہو۔'' سحرش نے جو طوطے کے پنجرے کے پاس کھڑی تھی قریب آتے ہوئے مشورہ دیا۔

''جی، ساتھ میں مٹن کڑاہی بنا لیں۔ چکن بروسٹ اور کباب تو ہونے چاہئیں...... سسرال کا معاملہ ہے۔'' زل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تو چندا ایسا کرو نا لسٹ بنا دو جو سامان چاہیے مرتضٰی سے کہتی ہوں لا دے گا۔ کچھ سامان تو گھر میں ہو گا ہی تم دیکھ لینا فریزر میں کتنا گوشت ہے۔ میرا خیال ہے مٹن اور بیف تو کل ہی آیا ہے۔ چکن منگوا لینا جیسا اور جتنا منگوانا ہو۔ اور ابھی سے تیاری شروع کر دو۔ سحرش بھی تمہاری مدد کر دے گی۔''

رخسانہ بیگم کے لہجے میں شیرینی گھل گئی تھی۔

''لیکن تائی جان میں تو آج فارغ نہیں ہوں۔ وہ آج......'' اسے بی بی اماں کی تاکید یاد تھی۔

''آج ایسی کیا کمائیاں کرنی ہیں؟'' میمونہ بیگم نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''سوری تائی اماں......''

وہ میمونہ بیگم کو تائی اماں اور رخسانہ بیگم کو تائی جان کہتی تھی۔

''دراصل آج زین کے کچھ دوست بھی آ رہے ہیں کھانے پر تو مجھے ابھی سے تیاری کرنی ہے۔ بی بی اماں تو سب نہیں کر سکتیں اکیلے......'' وہ نادم سی ہوئی۔

کیا تھا اگر آج زین کے دوستوں نے نہ آنا ہوتا یا پھر آج شانزہ کے سسرال والے نہ آتے۔

''ہیں یہ زین نے کون سے دوستوں کی دعوت کی ہے۔ پہلے تو کبھی اس نے دوستوں کو گھر نہیں بلایا دعوت پر۔'' مونا تائی کو نیچے کی سب خبر ہوتی تھی کہ کون آیا اور کون گیا۔

''پتا نہیں۔ انہیں دادا جان سے ملنے آنا تھا تو زین نے کہا تھا کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔''

''لو! ایک تو یہ کم بخت شیخو بیمار ہو گیا اوپر سے یہ زین کے دوستوں نے بھی آج ہی آنا تھا۔'' رخسانہ بیگم جھنجھلائی سی بولیں۔

''وہ اگر میں فارغ ہو گئی تو آ کر کچھ ہیلپ کر دوں گی۔''

وہ ایسی ہی تھی، مروت میں اکثر اپنا ہی نقصان کر لیتی تھی۔

''نہیں میں اور مہرین مل کر کر لیں گے۔ ماہ وش اور سحرش بھی ہیں۔ کچھ بازار سے منگوا لیں گے۔''

شانزہ نے رسالے سے سر اٹھا کر رخسانہ بیگم کی طرف دیکھا۔

''مشکل کے وقت کون کام آتا ہے بھلا......'' میمونہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک تو شانو کے سسرال والے ہمیشہ اچانک ہی دھما کا کرتے ہیں۔''

''ہمیشہ تو زمل ہی کام آتی ہے اماں......'' سحر تو سدا کی منہ پھٹ تھی جو دل میں ہوتا فوراً کہہ دیتی۔ ''اب اگر اس کی کوئی مجبوری ہے تو آپ بھول گئیں، آپ نے جب جب اپنے رشتہ داروں کی

دعوت کی تو زمل نے ہی سب سنبھالا۔"

مونا نے غصے سے اسے گھورا۔

"پتا نہیں یہ کیسی منہ پھٹ اولاد تھی مونا کی۔" رخسانہ بیگم نے برا سا منہ بنایا۔

"شانی کہہ تو رہی ہے مل جل کر سب کر لیں گے۔ اب ایسے بھی ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھے ہیں ہم بھی...... ہر روز زمل بی بی ہی تو آ کر ہمارا کچن سنبھالتی ہیں۔"

لڑکیاں کچن کا کام کر تو لیتی تھیں لیکن بس سستی اور سہل پسندی......

بچپن سے ہی کچن کے کام کے لیے کل وقتی ملازمہ تھی سو عادت نہیں تھی۔

زمل دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی حالانکہ رخسانہ اور میمونہ کی تو عادت تھی تاک تاک کر مارنے کی۔ تب ہی مرتضیٰ بلال کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور سیڑھیوں کی طرف جاتے جاتے اس کی نظر زمل پر پڑی تو وہ ان کی طرف پلٹا۔

"کیا میٹنگ ہو رہی ہے خواتین......؟"

"کیا میٹنگ ہونی ہے بیٹا......" میمونہ بیگم بے زاری سے بولیں۔ "شانی کے سسرال والے شام کو آ رہے ہیں تو اسی کے متعلق بات کر رہے تھے۔"

"کس سلسلے میں آ رہے ہیں؟" وہ پوچھ تو میمونہ بیگم سے رہا تھا لیکن نظریں زمل پر تھیں۔

"دراصل عقیل کو کسی کام کے سلسلے میں امریکا جانا ہے تو شانی کی ساس چاہ رہی تھی کہ شانی اور عقیل کی پسند سے ولیمے کا ڈریس اور جیولری لے لیں۔ واپسی پر کھانا کھا کر جائیں گے۔ تمہاری خالہ جان نے کہہ دیا تھا انہیں حالانکہ وہ تو بہت منع کر رہی تھیں۔" میمونہ بیگم نے تفصیل سے بتایا۔

"لیکن شادی تو غالباً ستمبر میں ہے اور ابھی سے ہی......؟" مرتضیٰ کو حیرت ہوئی تھی۔

"بتایا تو ہے کہ عقیل نے جانا ہے ڈیڑھ دو ماہ کے لیے...... زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ شادی سے چند دن پہلے ہی واپس آئے گا تو بھلا ایمرجنسی میں کہاں کوئی اچھی چیز ملتی ہے۔ ابھی آرڈر دیں گے تو تیار ہونے میں بھی مہینہ ڈیڑھ تو لگ ہی جائے گا، پھر شادی کی تیاری کوئی ایک دم سے تو نہیں ہو

جاتی۔ مہینوں لگ جاتے ہیں۔ ہم بھی تو پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے لگے ہوئے ہیں۔ تین تین شادیوں کی تیاری کرنا ہے اور......"

"لگے ہاتھوں مرتضٰی بھائی کو بھی بھگتا دیتیں۔" سحرش نے ان کی بات کاٹتے ہوئے مفت مشورہ دیا تو مرتضٰی نے اسے گھورا۔

"تم تو اپنی زبان بند ہی رکھا کرو، بلا وجہ چلتی ہے۔"

"اچھا اب تم دونوں نہ شروع ہو جانا۔"

رخسانہ بیگم نے انٹری ضروری سمجھی۔ جانتی تھی سحرش شروع ہوئی تو اسے خاموش کروانا مشکل ہو جائے گا۔

"اور مرتضٰی بیٹا! تم کہیں جا رہے ہو باہر تو ایک کام کر دو۔ ماہا (ماہ وش) سامان کی لسٹ بنا دیتی ہے تو پہلے وہ جا کر لے آؤ پھر اپنا کام کرتے رہنا۔"

"میں......؟" مرتضٰی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "وہ ہیں نا شینخو بابا ہمیشہ تو وہ ہی لاتے ہیں سودا سلف، آج مجھ پر یہ نظر عنایت کیوں؟"

"وہ شینخو اللہ مارا تو بیمار ہو گیا ہے۔" جواب میمونہ بیگم نے دیا تھا۔

"تو وہ ہے نا خالہ جانی کا سپوت بلال اس سے کہیں نا، مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ سودا سلف خریدنے میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔" اس نے بلال کی طرف دیکھا جو نیچے جانے والی سیڑھیوں کے قریب ریلنگ پر ہاتھ رکھے، ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"بلال بیٹا! یہ تمہاری اماں جانی بلا رہی ہیں تمہیں......"

"لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے فرخ سے نوٹس لینے جانا ہے۔" وہ ایف ایس سی سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ "اور آپ نے کہا تھا آپ مجھے فرخ کے گھر ڈراپ کر دیں گے۔"

"ہاں تو ابھی پہلے سب سامان لے آؤ پھر فرخ کی طرف چلے جانا، میری بائیک لے جاؤ اور پھر بائیک پر ہی فرخ کی طرف چلے جانا۔"

مرتضٰی کی فیاضی پر بلال کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں کہ مرتضٰی اپنی بائیک کم ہی دیتا تھا کسی کو، ابھی وہ اس سے بائیک مانگنے گیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ وہ خود دوستوں کی طرف جارہا ہے راستے میں اسے ڈراپ کردے گا۔ اور اب یکایک یہ فراخ دلی......

''اور آپ......؟''

''یار میں بھی چلا جاؤں گا، تم یہ چابی لو......'' اس نے پاکٹ سے بائیک کی چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

''ٹھیک ہے۔'' بائیک ملنے کی خوشی میں وہ مان گیا۔

''لائیں لسٹ دیں۔ کیا منگوانا ہے؟''

''ماہا کچن میں ہے، اسے کہو وہ دیتی ہے۔ سحرش کو کہا تو تھا اسے کہے جو منگوانا ہے لکھ دے۔'' رخسانہ بیگم کچھ بے زاری تھیں۔

وہ چابی لیتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ مرتضٰی کرسی پر زمل کے عین مقابل بیٹھ گیا۔ تب ہی مہرین ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کچن سے نکلی۔ اس کی عادت تھی پڑھائی کے دوران دو تین بار چائے ضرور پیتی تھی۔ اس کے پیچھے ہی ماہ وش اور بلال بھی کچن سے نکلے تھے۔ بلال کے ہاتھ میں سامان کی لسٹ اور پیسے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مبادا مرتضٰی کا ارادہ بدل جائے اور وہ بائیک واپس لے لے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ فرخ سے نوٹس لے کر اس نے کہاں کہاں جانا ہے۔ مہرین کپ ہاتھ میں لیے تخت پر ہی ٹک گئی۔

''مہرین بیٹی! تم بھی آج تھوڑی دیر کے لیے کتابیں ایک طرف رکھ کر بہنوں کی مدد کر دینا۔ پتا تو ہے نا تمہیں آج شانی کے سسرال والوں کی دعوت ہے۔'' میمونہ بیگم کو اس کا ہر وقت کتابوں میں گھسا رہنا پسند نہ تھا۔

''کیوں کیا زمل نے مدد کرنے سے انکار کر دیا؟''

یہ سحرش کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ کبھی کبھی وہ بالکل سحرش کے انداز میں بات کرتی تھی۔

''ڈاکٹر بننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بندہ بالکل ہی کام وام نہ کرے۔ شوہر اور بچے دوائیں پھانک کر تو نہیں جئیں گے۔ انہیں کھانے کی بھی حاجت ہو گی اور......'' کئی بار کی کہی ہوئی بات میمونہ بیگم نے دہرائی تو کن اکھیوں سے مرتضٰی کو دیکھتے ہوئے مہرین نے ناک پر پھسل آنے والی عینک درست کی۔

''وہ دراصل آج ہمارے ہاں بھی دعوت ہے مہرو، آزین کے کچھ دوستوں کی...... ورنہ میں کروا دیتی مدد۔'' زمل کچھ شرمندہ ہو کر بولی۔

''ہیں کون سے دوستوں کی دعوت؟ زین نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔'' مرتضٰی چونکا۔

''پتا نہیں، زین کے کچھ دوستوں نے دادا جان سے ملنے آنا ہے تو چونکہ ڈنر کا وقت ہو گا تو زین نے کہا تھا وہ کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔'' زمل نے مرتضٰی کو بتایا تو وہ جو پہلے کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا، اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''پتا نہیں یہ زین نے آج کل کیسے کیسے لوگوں سے دوستیاں کر رکھی ہیں۔ مجھے تو کبھی اس نے اپنے دوستوں سے نہیں ملوایا۔ لیکن میں جانتا ہوں عجیب عجیب سے لوگوں سے ملنا ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے یہ لوگ کسی سیاسی پارٹی کے غنڈے ہیں جنہیں وہ ساتھ لیے پھرتا ہے۔''

''نہیں مرتضٰی بھائی، ایسا نہیں ہے۔ اس کے ان دوستوں نے ایک فلاحی تنظیم بنا رکھی ہے اور مجبور و بے کس لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

زمل کو برا لگا تھا اس کا یوں سب کے سامنے آزین کو ڈسکس کرنا۔

''یہ سیاسی پارٹیاں بھی تو خدمت خلق کا نعرہ لگا کر لوگوں کو ٹریپ کرتی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو زمل، اس نے ضرور کوئی سیاسی پارٹی جوائن کر رکھی ہے۔''

مرتضٰی آزین کے متعلق ایسی باتیں کرتا ہی رہتا تھا پھر بھی زمل نے وضاحت کی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مرتضٰی بھائی، یہ چند دوست مل کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں اور کسی سیاسی پارٹی سے ان کا تعلق نہیں ہے۔''

''یہ تو تمہیں زین نے بتایا ہوگا۔ ہو سکتا ہے حقیقت اس کے برعکس ہو۔'' مرتضٰی اسے آزین سے بدگمان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

''ابھی پرسوں رات میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا تو میں نے گلی میں زین کو آتے دیکھا۔ تمہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ آدھی رات کو کہاں سے آیا تھا۔ میرا تو یوں ہی سوتے میں دل گھبرایا تو تازہ ہوا کے لیے اٹھ کر بالکونی میں گیا تھا۔''

''ہاں پتا ہے مجھے، وہ دادا جان کو بتا کر گیا تھا اس کے یونی ورسٹی فیلو احسان کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے۔ اور احسان اکیلا تھا۔ پھر ہاسپٹل سے ہی اس کا فون آگیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے تو اسے دیر ہو جائے گی تو میں نے شینو بابا کو بتا دیا تھا کہ زین دیر سے آئے گا۔''

''اوہ ہاں......!'' مرتضٰی نے سر کھجایا۔ ''میں نے سوچا کہ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ وہ اتنی رات گئے گھر آیا ہے۔ شاید اکثر آتا ہو۔''

''نہیں وہ رات کو کبھی دیر سے گھر نہیں آتا۔'' زل کے ماتھے پر ناگواری سے شکن سی پڑی۔

''دراصل مجھے تمہاری فکر رہتی ہے زل، اگر زین کا میل جول غلط لوگوں سے ہو گیا تو تمہارا کیا بنے گا۔ ابا بتا رہے تھے کہ تمہارا ماسٹرز مکمل ہوتے ہی دادا جان تمہاری شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اور نہ وہ کوئی جاب کرتا ہے نہ کوئی اور کام......''

مرتضٰی جو سب کے سامنے یہ باتیں کر رہا تھا، تو اس کا مقصد شاید دوسروں کو بھی کچھ جتانا تھا۔ اور کسی حد تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا تھا کہ میمونہ بیگم کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''نہ مرتضٰی! تمہیں اس کی کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے۔ اس کی فکر کرنے کو اس کے باپ دادا ہیں نا۔''

''باپ......؟'' اس نے جیسے تاسف سے زل کو دیکھا تھا۔ ''انہیں تو اپنی خبر نہیں، وہ بھلا زل کی کیا فکر کریں گے۔ اور زل چونکہ کزن ہے میری تو زین کی حرکات دیکھ کر مجھے اگر اس کے مستقبل کی فکر ستاتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے اماں......؟''

اب وہ میمونہ بیگم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے برا سا منہ بنایا۔ انہیں مرتضٰی کا زل کی طرف

متوجہ ہونا پسند نہیں تھا۔ کئی دفعہ وہ چونک جاتی تھیں۔ پتا نہیں اس لڑکے کے دل میں کیا ہے لیکن پھر وہ خود ہی دل میں آجانے والے خیالات کو جھٹک دیتی تھیں کہ زمل کا تو نکاح ہو چکا تھا۔ اور مرتضیٰ تو ایسا ہی لاابالی سا بغیر سوچے سمجھے بات کر جاتا تھا۔ اب یقیناً مہرین اور رخسانہ کو برا لگ رہا ہوگا۔

''آزین کی سرگرمیوں پر نظر رکھا کرو زمل......'' اس کے لبوں پر پراسراری مسکراہٹ تھی اور نگاہیں زمل پر جو جزبزسی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے مرتضیٰ کی باتیں بہت بری لگ رہی تھیں۔ زین شاید صحیح ہی کہتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ اس سے بدگمان ہو جائے۔ پہلے کبھی اسے ایسا محسوس نہیں ہوا تھا لیکن آج اسے لگا تھا کہ وہ اسے زین سے متنفر کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ اسے آزین سے کیوں متنفر کرنا چاہتا ہے۔ اس نے الجھی الجھی نظروں سے مرتضیٰ کی طرف دیکھا اور پھر باقی سب کی طرف......

''میں چلتی ہوں اب......''

''سنو......!'' سحرش نے جو شانزہ کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی مسلسل چیونگم چبا رہی تھی، اسے روکا۔

''تم تھوڑی بہت ان خواتین کی اب بھی مدد کر سکتی ہو۔''

زمل کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''اس روز...... مطلب دو دن پہلے تم نے جو ڈھیروں شامی کباب بنا کر فریز کیے تھے، ان میں سے بیس پچیس اوپر بھجوا دینا۔ شانی کی ساس کو تمہارے ہاتھ کے کباب بڑے پسند ہیں۔ پچھلی بار بھی بہت تعریفیں کی تھیں۔''

رخسانہ اور میمونہ نے ایک ساتھ ستائشی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ایسی باتیں اسے ہی سوجھ سکتی تھیں۔ زمل نے اثبات میں سر ہلایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مرتضیٰ کی نظروں نے سیڑھیوں تک اس کا تعاقب کیا۔ شانزہ نے رسالے سے سر اٹھا کر مرتضیٰ کی طرف دیکھا اور کتنی ہی دیر تک یوں ہی اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر مہرین کی طرف دیکھا جو لاپروائی سے دیوار سے ٹیک لگائے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھی، جو غالباً کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی، پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے رسالے پر جھک گئی۔

مرتضٰی کے لیے اب یہاں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، اس لیے وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اب بلال کا انتظار کرنا تھا کہ وہ سودا لے کر آئے تو وہ اس سے اپنی بائیک واپس لے سکے۔

سحرش کچھ دیر آنکھیں پٹپٹا کر سب کو دیکھتی رہی۔ پھر پاس کھڑی ماہ وش کے بازو پر ہاتھ مارا۔

''ایک ڈش کا انتظام تو میں نے کر لیا ہے۔ اب وقت کے وقت میں فرائی کر لوں گی۔ تم لوگ اٹھ کر اب اپنے اپنے حصے کا کام شروع کر دو۔''

میمونہ بیگم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''چلو بھئی اٹھو سحری صحیح کہہ رہی ہے۔ پیاز وغیرہ میں کاٹ دیتی ہوں۔''

سحرش نے جتاتی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ریلنگ سے جھانکنے لگی۔ نیچے کوئی دکھائی نہیں دیا، سوائے ساجدہ کے جو مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی۔ زمل غالباً کچن میں جا چکی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور زمل نیچے کچن میں کرسی پر بیٹھے آزین کو دیکھ رہی تھی جو بی بی اماں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

''اتنی دیر کر دی بی بی اماں پریشان ہو رہی تھیں۔''

آزین نے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ وغیرہ بتائے تھے۔ بلڈ ٹیسٹ سے پتا چلا ٹائیفائڈ ہے۔ روٹی وغیرہ بند کر دی ہے۔ نرم غذا کھانے کو کہا ہے۔ میں آتے ہوئے ساگودانہ لے آیا تھا۔ آج کے لیے تم ساگودانہ بنا دینا۔''

''شینخو بابا اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتے جانے کب سے بخار ہو رہا ہے بتایا تک نہیں۔'' زمل تشویش سے کہتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں نے سمجھا دیا ہے کہ جب تک مکمل ٹھیک نہیں ہو جاتے مکمل آرام کریں۔ ڈاکٹر نے بھی ریسٹ کا اور پرہیز کا کہا ہے۔''

''یہ او پر والوں نے سانس لینے دیا تو......'' بی بی اماں بڑبڑاتی ہوئی دودھ گرم کرنے لگیں۔

''دودھ کے ساتھ ایک رسک بھی دے دیتی ہوں، اب کیا خالی پیٹ دوا کھائے گا نگوڑا۔ اور کیا کہا تمہاری تائیوں نے؟'' اب وہ زمل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''صبح صبح کیوں تمہاری یاد آ رہی تھی؟''

''بس وہی دعوت کا بتا رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ فارغ نہیں ہوں۔''

''سچ میں کہا یا کوئی وعدہ کر آئی ہو؟'' بی بی اماں نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا اور پھر آزین کے پوچھے بغیر خود ہی تفصیل بتانے لگیں۔

آزین کی پیشانی پر بل پڑے۔

''تم کوئی غلام نہیں ہو ان کی کہ جب بلائیں بھاگی چلی جاتی ہو۔''

''کسی کا کام کرنے میں کیا برائی ہے زین؟'' سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ گھور سیاہ آنکھیں جو آزین کے دل کی دنیا اتھل پتھل کر دیتی تھیں۔

''کوئی برائی نہیں ہے۔'' آزین نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ ''بشرطیکہ کوئی مستحق ہو اور میرے خیال میں اوپر والے مستحق نہیں ہیں۔ چار لڑکیاں، ان کی مائیں، ملازمہ پھر تمہیں بلانے کا مقصد......؟''

آج کل وہ اس کے اوپر جانے سے چڑنے لگا تھا لیکن وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیوں......

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کتنے دوست آرہے ہیں تمہارے اور کچھ خاص بنانا ہے؟'' زل نے اس کی پیشانی پر پڑے بل دیکھ کر موضوع بدلا۔

''مرسل کے علاوہ دو دوست اور ہوں گے۔ اور جو دل چاہے بنا لینا۔ میرے یہ دوست تو مسور کی دال کے ساتھ تندور کی روٹی کھا کر خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔''

''یہ کیا تم ہر وقت تم تم کرتی رہتی ہو؟'' بی بی اماں نے دودھ کپ میں ڈالا۔ ''عزت سے بلایا کرو، آپ کہہ کر، کتنی بار کہا ہے۔''

''وہ بچپن سے ایسے ہی عادت ہے نا بی بی اماں......'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو بچپن گزر گیا بی بی، اب یہ شوہر ہے تمہارا اور اس کا احترام فرض ہے۔'' بی بی اماں نصیحت کرنا اور سمجھانا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

زل کی پلکیں جھک گئیں اور رخسار گل رنگ ہو گئے۔

آزین نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں بی بی اماں، جب دو چار بچوں کا باپ بن جاؤں گا تو خود ہی احترام

کرنے لگے گی، ابھی ایسے ہی چلنے دیں۔"

"ہم نے تو نہ تمہاری اماں کو نہ چچی کو تم کہہ کر بلاتے سنا۔ اس لیے سمجھاتے ہیں۔" بی بی اماں نے چھوٹی ٹرے میں دودھ کا کپ اور رسک رکھے۔

زمل کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں اور رخساروں پر جیسے شفق پھوٹی پڑتی تھی۔ اب کے آزین کی نظریں اٹھیں تو پھر واپس نہ مڑ سکیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" زمل نے ذرا سا رخ موڑا، اس کے رخسار تپ اٹھے تھے۔

"کیوں کیا اپنی بیوی کی طرف دیکھنا منع ہے؟" وہ ہولے سے ہنسا۔

"لو اب تم میری بچی کو تنگ نہ کرو اور جاؤ دادا جان کو سلام کر آؤ، دو تین بار پوچھ چکے ہیں تمہارے متعلق۔"

"آپ کا بھی جواب نہیں بی بی اماں......" وہ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "پارٹی بدلنے میں دو منٹ بھی نہیں لگاتیں۔"

"مجھے تو تم دونوں ہی ایک جیسے پیارے ہو۔" انہوں نے ٹرے اٹھائی۔

"میں ذرا شینو کو دے آؤں۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھوں گی۔ گوشت گل گیا تو چولہا بند کر دینا اور ہاں زین چائے کا کہہ رہا تھا۔ ایک کپ چائے بنا دینا اسے۔"

"چائے دادا جان کے کمرے میں ہی لے آنا۔" آزین ایک استحقاق بھری نظر اس پر ڈالتا بی بی اماں کے پیچھے ہی نکل گیا۔

چائے کا پانی رکھ کر وہ مڑی تو کچن کے دروازے پر مرتضٰی کو کھڑے دیکھ کر جو بڑی والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، گھبرا گئی۔

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 3

''آپ یہاں......؟''

''کیوں کیا میں یہاں نہیں آسکتا؟'' مرتضیٰ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''آسکتے ہیں لیکن یہاں کچن میں کیا کرنے آئے ہیں؟'' زل نے فوراً ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا۔

''وہ دراصل میں دادا جان کو سلام کرنے آیا تھا تو تمہیں دیکھ کر یوں ہی رک گیا کہ دیکھوں رات کی دعوت کے لیے کیا تیاریاں ہورہی ہیں۔''

وہ کچھ دیر بلال کا انتظار کرنے کے بعد اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے نکلا تھا کہ وہ اس کا انتظار کررہے ہوں گے۔ ان کا ارادہ آج لنچ باہر کرنے کا تھا۔ سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے وہ یوں ہی ریلنگ کے پاس رکا تھا اور پھر جھک کر نیچے دیکھا تھا۔

آزین کچن کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور اس کے لبوں پر بڑی دل کش سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر باہر جانے والی سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے، اندر والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور اب کچن کے دروازے کے پاس کھڑے اسے یہاں آنے کا مناسب جواز یہ ہی سوجھا تھا۔

''میں فی الحال تو زین کے لیے چائے بنارہی تھی اور دادا جان اپنے کمرے میں ہیں۔'' فوراً ہی رخ موڑ کر وہ کاؤنٹر پر پڑی ہوئی خالی پلیٹیں اٹھا کر سنک میں رکھنے لگی۔

مرتضیٰ لحہ بھر کھڑا رہا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور پھر کچھ کہے بغیر ہی واپس مڑ گیا۔

اس نے کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ دادا جان کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے ڈیوڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ حیران ہوئی......

''تو کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔ لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔'' کندھے اچکا کر وہ چائے بنانے لگی۔

چائے بنا کر اس نے چولہے بند کیے اور کپ اٹھا کر دادا جان کے کمرے میں آئی۔ دادا جان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور آزین روم چیئر پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔

''مرسل کو تو آپ جانتے ہی ہیں نا، ڈاکٹر ارسلان کا بھائی۔ وہ میرا یونی کا دوست ہے۔ طیبہ اور اسد اس کے دوست ہیں۔ ان تینوں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر کچھ عرصہ پہلے فلاحی کاموں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یتیموں، غریبوں، بیواؤں کی مدد کرنے کے علاوہ آس پاس کے دیہاتوں میں جا کر وہاں کے مسائل حل کرنا۔ پہلے تو یہ اپنے طور پر ہی کام کرتے تھے۔ لیکن اب یونی کے کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔

ہمارے پرانے کالج کے ایک پروفیسر صاحب بھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک باقاعدہ لائحہ عمل ہو جس کے تحت کام کیا جائے۔ ایک منشور ہو کہ کیسے اور کس طرح کام کرنا ہے۔ باقاعدہ ریکارڈ ہو کہ کیا کیا ہے اور کیا کرنا ہے۔ جو پیسہ خرچ کیا وہ کہاں سے آیا اور جو کام کیا اس کا رزلٹ کیا نکلا وغیرہ۔ تو اس کے لیے ایک باقاعدہ آفس یا کوئی جگہ ہو۔ جہاں ہفتہ دس دن بعد سب لوگ اکٹھے ہو کر سب معاملات طے کریں۔ لیکن چونکہ ابھی ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ کوئی جگہ کرائے پر لے سکیں تو مرسل نے مجھ سے کہا کہ یہاں گیسٹ روم خالی ہے اور رہائش سے الگ ڈیوڑھی میں ہے تو اگر آپ اجازت دیں تو جب تک وہ کوئی جگہ کرائے پر نہیں لے لیتے وہ ہمارے گیسٹ روم میں اکٹھے ہو جایا کریں۔ ویسے بھی اب تو چچا جان کے گیسٹ وغیرہ وہاں نہیں آتے۔''

جہاں زیب بیگ نے سر ہلایا تھا۔ زل نے چائے کا کپ اسے پکڑایا جسے اس نے لے کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''دراصل مرسل ادھر آتا رہتا ہے تو اسے پتا ہے کہ گیسٹ روم اب کسی کے زیر استعمال نہیں۔'' اس نے جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھا۔

''میں نے مرسل سے کہا تھا وہ خود ہی آپ سے بات کر لیں۔ اگر آپ کو مناسب لگا تو پھر وہ گیسٹ روم میں اپنی میٹنگز کر سکتے ہیں۔''

''کیا تم بھی ان کی تنظیم کے لیے کام کرتے ہو؟'' جہاں زیب بیگ نے تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھائی۔

''کوئی باقاعدہ تنظیم تو نہیں ہے ان کی، میں نے آپ کو بتایا ہے۔ ویسے میں مرسل کے ساتھ ایک دو بار سیالکوٹ کے ایک دو دیہات میں گیا تھا، بہت غربت ہے وہاں۔ مرسل وغیرہ نے وہاں ایک چھوٹا سا دست کاری سینٹر بنایا ہے جہاں خواتین سلائی وغیرہ سیکھ کر اپنے لیے کچھ کر سکیں۔ انہوں نے اس کا بھی انتظام کیا ہے کہ وہاں کی خواتین کا کیا کام شہر میں مناسب داموں پر فروخت ہو جائے۔''

تب ہی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے فون کی بیل ہوئی تو جہاں زیب بیگ نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا تو زل نے چائے کا کپ اٹھا کر پھر آزین کی طرف بڑھایا۔

''ٹھنڈی ہو جائے گی زین......''

آزین نے کپ پکڑ کر مشکور نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہیلو...... ہاں...... ہاں کیسی ہو بانو بیٹا؟''

اور پھپھو کا نام سن کر دروازے کی طرف جاتے جاتے زل پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کب آ رہی ہو؟ آنے سے پہلے جب سیٹ بک ہو جائے تو فون کر دینا۔ آزین لینے آ جائے گا اسٹیشن پر۔

ہیلو...... ہیلو بانو بچے میری آواز آ رہی ہے؟''

تین چار بار ہیلو ہیلو کہنے کے بعد انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ صبح سے اب تک اختر بانو نے یہ تیسری بار کال کی ہے۔ ہر بار چند باتیں ہونے کے بعد فون کٹ جاتا ہے۔ رات ظفر کا فون آیا، تب بھی ٹھیک سے بات نہیں ہو سکی۔ زین بیٹا! تم ذرا کمپلین کروا دینا آج۔''

''جی......''

گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے آزین، زمل کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں خوشی بھری چمک تھی۔

''داداجان! کیا پھپھو آرہی ہیں؟'' ان کی بات ختم ہوتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کہہ تو رہی تھی آنے کا جب میں نے شانزے، ماہ وش اور شاہ رخ کی شادی کا بتایا تو کہنے لگی پھر شادی پر ہی آؤں گی۔ ابھی آگئی تو پھر دو تین ماہ بعد دوبارہ آنا مشکل ہوگا۔ لیکن میں نے اصرار کیا کہ دل بہت اداس ہے تو پھر کہنے لگی کہ ثوبان میاں سے پوچھ کر بتائے گی، اگر انہوں نے اجازت دی تو چند دنوں تک دو چار دنوں کے لیے آئے گی۔ اب شاید اسی کے متعلق بتانے کے لیے فون کیا ہو کہ آئے گی یا نہیں۔ لیکن بات نہیں ہوسکی، فون کٹ گیا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں داداجان! ایک بار یہاں سے ملانے کی کوشش کریں اگر پھر بھی بات نہ ہوسکی تو میں باہر پی سی او سے کرلوں گا۔ اور کمپلین بھی کروادوں گا۔'' آزین نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر نمبر ملانے لگا پھر مایوس ہو کر ریسیور واپس کریڈل پر ڈال دیا۔

''دو تین نمبر ملانے کے بعد ڈیڈ ہو جاتا ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ ادھر سے تو نمبر ملتا ہی نہیں، میں بھی کوشش کر چکا ہوں۔''

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے پھپھو کو یہاں آئے ہوئے۔ چھ سال پہلے آئی تھیں، جب آپ کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ کیا ان کا دل نہیں چاہتا یہاں آنے کو؟'' زمل کی آنکھوں میں جلتی مسرت کی جوت بجھ گئی تھی۔

''کس بچی کا دل نہیں چاہتا میکے آنے کو لیکن بچیوں کو، اپنا گھر بسانے کے لیے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں زمل بیٹی۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''آپ نے بھی تو لے کے انہیں اتنی دور سندھ کے ایک گوٹھ میں بیاہ دیا۔ کیا یہاں آس پاس ادھر ادھر کوئی رشتہ نہیں ملا تھا ان کے لیے......'' اس نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

''رشتے تو تھے خاندان برادری میں اور ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ تمہاری دادی نے تو بہت منع

کیا بلکہ بہت واویلا مچایا۔ اورنگ زیب، ارباب، ظفر سب نے ہی مخالفت کی۔ کوئی بھی اتنی دور اجنبی لوگوں اور ماحول میں اپنی اکلوتی لاڈلی بہن کا رشتہ دینے کے حق میں نہیں تھا۔ زیبی تو ناراض ہو گیا تھا۔ غلطی میری تھی میں نے کسی کی نہ سنی۔'' دکھ ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

''جب سب ہی مخالف تھے تو پھر آپ نے کیوں......؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''سلطان شاہ میرا دوست تھا۔ ایسا دوست جس کی دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تعلق صوبہ سندھ سے تھا۔ حیدر آباد کے نواح میں کہیں اس کا گاؤں تھا۔ کافی بڑی جاگیر تھی ان کی۔ اس نے گورنمنٹ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تو پہلے روز ہی میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ کر راوین کہلانا اس کا خواب تھا اور وہ والد سے ضد کر کے یہاں آیا تھا۔ گریجویشن کے بعد اس نے بھی میرے ساتھ ہی پنجاب یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ ہمارا زیادہ وقت ساتھ ہی گزرتا تھا۔ میرا کوئی بھائی اور کزن وغیرہ نہیں تھا اور وہ ایک دوسرے صوبے سے آیا تھا۔ اکثر میں ضد کر کے اسے یہاں گھر پر ہی روک لیتا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اماں، ابا اور میں ہم تین افراد ہی تھے تو اماں ابا بھی اس کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ تعلیم مکمل کر کے وہ واپس اپنے علاقے میں چلا گیا لیکن ہم ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے کہ ہمارے درمیان دوستی کا تعلق بہت مضبوط تھا۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک تو ہوتے ہی تھے ویسے بھی تین چار ماہ بعد وہ مجھ سے اور اماں ابا سے ملنے آ جاتا تھا۔ جب بھی میری زندگی میں کوئی مشکل وقت آیا تو میں نے اسے اپنے ساتھ کھڑا پایا۔''

وہ ہولے ہولے بول رہے تھے۔ آزین اور زل خاموشی سے سن رہے تھے۔ انہیں اس سے پہلے علم نہیں تھا کہ اختر بانو کی شادی صرف دادا جان کی خواہش پر کی گئی تھی۔

''وہ ایسا دوست تھا کہ اگر اسے میری خاطر جان بھی دینی پڑتی تو دے دیتا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہم اپنے بچوں کے آپس میں رشتے کریں گے تاکہ دوستی کا یہ تعلق اور رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے۔ ایک بار میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ میں نے تو سن رکھا ہے کہ سید، غیر سیدوں میں رشتہ نہیں کرتے۔ یہ سب ہمارے اپنے بنائے ہوئے رواج ہیں۔ یہ بھلا کہاں کس کتاب میں لکھا ہے کہ سید غیر

سیدوں میں رشتہ نہیں کرتے۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ تمہاری بیٹی میری بہو بنے گی اور میری بیٹی تمہاری بہو۔ وہ حتمی لہجے میں کہتا تھا۔

لیکن فرض کرو، ہم دونوں کے ہاں بیٹے ہوئے یا بیٹیاں تو......؟ میں ہنستا تو وہ منہ پھلا لیتا تھا۔

میرے ساتھ وعدہ کرو جہاں زیب کہ ایسا نہ ہوا تو ہم اپنے بچوں کے رشتے آپس میں کریں گے اور میں نے اس کے اصرار پر وعدہ کیا تھا۔ حالانکہ میں کچھ متذبذب سا تھا۔

وہ جاگیردار تھا۔ حیدر آباد کے نواح میں اس کی بے شمار اراضی تھی لیکن اس میں جاگیرداروں والی اکڑ اور غرور نہ تھا۔ بہت عاجز اور نرم دل تھا۔ میں اکلوتا تھا سو اس کی صورت میں بھائی کی کمی پوری ہوگئی تھی۔ سونے کے دل والے سلطان شاہ کے دو بڑے بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن سے بھی نو سال چھوٹا تھا۔ سو اپنے بہن بھائیوں سے بے تکلفی کا رشتہ نہیں تھا۔ جب وہ لاہور آیا تھا تو اس وقت اس کے بڑے بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کی تنہائی کو بانٹا تھا۔ وہ جب تین چار ماہ بعد چکر لگاتا تو ہم دن بھر لاہور کی سڑکیں ناپتے پھرتے اور رات تھک ہار کر مہمان خانے میں آ کر سو جاتے۔ ہفتہ جیسے پلک جھپکتے ہی گزر جاتا۔ اور وہ بے دلی سے جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔

کچھ دن اور رک جاؤ نا...... میرا دل بھی چاہتا کہ وہ نہ جائے لیکن اس کے بابا نے اسے صرف ہفتہ بھر کی اجازت دی ہوتی تھی۔ یوں اس کے جانے کے بعد کتنے ہی دن ہم اداس رہتے۔ اماں اٹھتے بیٹھتے اسے یاد کرتی رہتیں۔

بڑا بھلا مانس بچہ ہے سلطان شاہ کیسے اس کے آنے سے گھر میں رونق سی ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی کہی ہوئی بات بھولتا نہیں تھا۔ اکثر یاد دہانی کراتا رہتا کہ ہمیں اپنے بچوں کے رشتے ایک دوسرے سے کر کے اس دوستی کے رشتے کو مزید مضبوط کرنا ہے۔ حتیٰ کہ جب میری شادی ہوئی اور میں دلہا بنا ہوا تھا تو اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

جہاں زیب! وہ عہد جو ہم نے کر رکھا ہے اسے بھول نہ جانا بلکہ بھابی کو بھی بتا دینا۔ عجیب سرپھرا

تھا۔ میری شادی کے پانچ سال بعد اس کی شادی ہوئی تب اورنگ زیب تین سال کا اور ارباب چند ماہ کا تھا۔ اپنی شادی پر اس نے مجھے پھر یاد دلایا تھا۔

سنو یار! میری بیٹی تمہاری بہو بنے گی لیکن اللہ نے اسے یکے بعد دیگرے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ اس کا تیسرا بیٹا ظفریاب سے چند ماہ چھوٹا تھا۔ اس کی پیدائش پر وہ کچھ مایوس سا ہو گیا تھا۔ لگتا ہے میرا خواب پورا نہ ہو سکے گا لیکن ظفریاب کے بعد جب اختر بانو پیدا ہوئی تو وہ اگلے ہی دن ڈھیروں سامان اور مٹھائی کے ٹوکرے لے کر آ گیا تھا۔ میری اماں اور تمہاری دادی حیران تھیں لیکن اصل بات کا علم تو مجھے تھا کہ وہ کیوں یوں لدا پھندا آیا ہے۔

تو تم ہی بتاؤ میں ایسے دوست کا دل کیسے توڑتا جو برسوں سے اس خواہش کو اپنے دل میں پال رہا تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا اختر بانو کے لیے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے لے کر آتا۔ میں کبھی منع کرتا تو ناراض ہوتا۔ یہ میں اپنی بیٹی، اپنے ثوبان کی دلہن کے لیے لاتا ہوں تم اس معاملے میں اپنی زبان بند ہی رکھا کرو۔ اختر بانو کی پیدائش کے چار سال بعد اس کی بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے مجھے خط لکھا۔

لو یار اللہ نے ہماری سن لی۔ تمہاری بہو بھی دنیا میں آ گئی۔ بڑا ہی سر پھرا تھا محبتوں سے بھرا۔ جب تک زندہ رہا مجھے کبھی اختر بانو کی فکر نہیں ہوئی۔ وہ کہتا تھا سمجھو اختر بانو اپنے باپ کے گھر ہے۔ دو تین ماہ بعد اسے خود لے کر لاہور آتا یا پھر ثوبان کے ساتھ بھیج دیتا۔

اختر بانو ثوبان کے ساتھ بہت خوش تھی اور اسے خوش دیکھ کر سب ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ شاہ زیب بھی جو اختر بانو کے رشتے کی وجہ سے مجھ سے ناراض تھا۔ اختر بانو کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا لیکن پھر اختر بانو کی شادی کے چار سال بعد اچانک سلطان کا انتقال ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

اس کے اس طرح دنیا سے چلے جانے سے میں صرف دکھی ہی نہیں، پریشان بھی تھا۔ جس کے آسرے پر اپنی بیٹی کو اتنی دور غیروں میں بیاہا تھا وہ ہی نہیں رہا تھا تو اب کیا ہو گا میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن بہت جلد جان گیا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ کئی کئی مہینے گزر جاتے وہ نہ آپاتی۔ ثوبان سے گلہ کیا تو جواب ملا۔

میں بڑا بیٹا ہوں اور یہ اس گھر کی بڑی بہو ہے اور اس پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ سب نظام اسی

نے دیکھنا اور سنبھالنا ہے۔ یہ ہماری ریت ہے کہ بڑی بہو ہی حویلی کے معاملات کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

سلطان شاہ کی وفات کے بعد پورا سال اختر بانو میکے نہیں آئی۔ سلطان کی برسی پر میں اور تمہاری دادی گئے تو وہ بہت کمزور اور تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ تمہاری دادی نے بہت کہا کہ وہ ساتھ چلے، ہفتہ دس دن رہ آئے لیکن اس نے منع کر دیا کہ......

ابھی تو بہت مشکل ہے اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں تو ثوبان اجازت نہیں دیں گے۔ وہ سمجھیں گے میں ان کی والدہ کی تیمارداری سے بھاگ رہی ہوں۔ حویلی کے اتنے بکھیڑے ہیں۔ ڈھیروں ملازم آئے دن مہمانوں کی آمد...... وہ کہتے ہیں، یہ سب مجھے ہی دیکھنا ہیں۔ پھر ثوبان کے دادا چونکہ یہاں ہی رہتے ہیں تو ان کے مہمانوں اور ملنے والوں کا خیال مجھے ہی رکھنا ہے۔ مطلب ان کی خاطر تواضع۔ ڈیرے اور مہمان خانے میں چائے، کھانا بھجوانا۔

سلطان شاہ کے والد اپنی آبائی حویلی میں سلطان شاہ کے ساتھ ہی رہتے تھے جبکہ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کی اپنی الگ حویلیاں تھیں۔ تمہاری دادی واپس آ کر بھی بہت دن دکھی رہیں کہ اتنی کم عمری میں اتنی ذمہ داریاں میری بچی کیسے نبھا پائے گی۔

ان دنوں گھر میں اورنگ زیب کی شادی کی بات ہو رہی تھی تو ظفر نے مشورہ دیا کہ اورنگ زیب بھائی کے ساتھ ارباب کی شادی بھی کر دیں۔ جیسا کہ سلطان چچا اور آپ کے درمیان طے ہوا تھا آپ ان کی بیٹی کا رشتہ، ارباب بھائی کے لیے مانگ لیں اس طرح اختر کے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔ ثوبان اپنی بہن سے ملنے آئے گا تو ساتھ میں اختر بھی آ جایا کرے گی۔

سب کو ہی ظفر کا مشورہ پسند آیا تھا۔ گو سلطانہ ابھی صرف سولہ سال کی تھی تو ہماری اختر بھی تو اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہی گئی تھی۔ رخصتی تک سال ڈیڑھ سال تو ہو ہی جاتا۔ فیصلہ ہونے کے بعد میں تمہاری دادی اور ظفر کے ساتھ سلطان شاہ کی حویلی پہنچ گیا۔ وہ لوگ ہماری آمد پر کچھ حیران ہوئے تھے لیکن میں نے بغیر کسی تمہید کے دست سوال دراز کر دیا اور کہا کہ میرے اور سلطان کے درمیان یہ بات طے تھی کہ اس کی بیٹی میری بہو بنے گی، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارے اور سلطان کے

درمیان جو کچھ طے تھا وہ اس کی موت کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ہم غیر سیدوں میں اپنی بیٹیاں نہیں دیتے۔ مجبوراً لے تو لیتے ہیں، لیکن دیتے نہیں۔

سلطان کے والد نے دوٹوک بات کی تھی، اس کے چچا، تایا اور بڑے بھائی بھی ان کے ہم خیال تھے۔

تو ٹھیک ہے اس صورت میں ہم بھی اپنی بہن کو ساتھ لے جائیں گے۔ ظفر ہمیشہ سے ہی جذباتی اور جوشیلا تھا۔

بڑے شوق سے لے جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یوں بھی یہ شادی صرف سلطان کی خوشی اور مرضی تھی۔ ہم نے دخل نہیں دیا تھا لیکن سلطان کے بچے ہماری نسل کے امین اور ہمارے وارث ہیں۔ ہم انہیں نہیں جانے دیں گے۔

سلطان کی وفات کے وقت اختر بانو کا ایک بیٹا دو سال کا تھا اور دوسرا بیٹا صرف دو ماہ کا تھا۔ سلطان نے دونوں بچوں کی پیدائش پر بڑی خوشیاں منائی تھیں۔

سلطان کے والد، اپنی بات کر کے ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے اور ان کے پیچھے ہی سلطان کے دونوں بھائی بھی نکل گئے تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

چلو اٹھو اختر بانو! ہمارے ساتھ چلو۔ ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

نہیں میں اپنے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور بچے میرے بغیر کیسے رہیں گے۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

جن کی اولاد ہے سنبھال لیں گے تم بس چلو ابھی ہمارے ساتھ۔

ظفر غصے کا تیز تھا لیکن میں نے اسے خاموش کرا دیا۔ میں ایک ماں کو اس کے جگر گوشوں سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں تمہاری دادی اور ظفر کے ساتھ واپس آ گیا۔ ظفر کا موڈ بہت خراب تھا۔

آپ اور اختر بانو ذرا حوصلے سے کام لیتے نا تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ چار دن بچے سنبھالنے پڑتے نا تو خود ہی سیدھے ہو جاتے۔

ظفر نہیں جانتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جہاں نوکروں کی فوج ہو وہاں بچے سنبھالنا کون سا مشکل ہوتا۔

دو چار دن رو دھو کے ماں کو بھول جاتے لیکن میری اختر بانو، ان کی جدائی نہ سہہ سکتی۔ صرف اٹھارہ سال کی تھی جب اس کا بیاہ ہوا۔ بالکل بچوں کی طرح لاڈ کرتی تھی۔ زیبی جب بھی گھر آتا اس کے لیے کوئی نہ کوئی گڑیا لے کر آتا۔ اس کی الماری طرح طرح کی گڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ تمہاری دادی ہر بار شاہ زیب سے کہتی تھی کہ بھلا اس کی عمر کوئی گڑیوں سے کھیلنے کی ہے لیکن زیبی ماں کی پروانہ کرتا اور اگلی بار پھر گڑیا لے آتا۔''

وہ جیسے تھک کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ آزین اور زمل نے پہلی بار دادا جان سے اختر بانو کے متعلق اتنی تفصیل سے سنا تھا۔ سو بے چینی سے ان کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''تو کیا پھر پھپھو کے ساتھ ان کے سسرال والوں کا سلوک صحیح ہوا اور پھر انہوں نے یہاں آنے دیا انہیں؟'' انہیں خاموش دیکھ کر آزین نے پوچھا تھا۔

''ہاں...... لیکن وہ کہتی تھی اس کا آنا بہت مشکل ہے۔ ذمہ داریاں بہت ہیں۔ سالوں بعد آتی تھی۔ اللہ نے اسے اتنا صبر اور حوصلہ دیا ہے کہ اس کا صبر اور حوصلہ دیکھ کر دل بند ہونے لگتا ہے۔''

آنکھوں کے کونوں پر اٹکے آنسوؤں کو انہوں نے انگلی کی پوروں سے پونچھا تو آزین نے ان کا بازو تھپتھپا کر تسلی دی۔

''ایسا کرتے ہیں، میں زمل اور آپ اگلے ہفتے چلتے ہیں پھپھو سے ملنے۔''

''لیکن میں تو پھر کبھی اس روز کے بعد گیا ہی نہیں اس کے گھر۔'' وہ جھجکے تھے۔

''اس کے بیٹے کی پیدائش پر بھی بس تمہاری دادی کو حیدر آباد ہاسپٹل میں چھوڑ کر آ گیا تھا۔ بعد میں ارباب جا کر لے آیا تھا۔''

''تو کیا ہوا دادا جان! وہ آپ کی بیٹی ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنے نہیں جا سکتے۔ جب آپ کا دل چاہے تب......'' زمل بے حد دکھی ہو رہی تھی۔

''ہاں کیوں نہیں جا سکتے دادا جان! اور ابھی تو ہم شاہ رخ، ماہ وش اور شانزہ کی شادی کی دعوت دینے جائیں گے نا کہ دو تین ماہ بعد شادی ہے سب تیاری رکھیں۔''

''یوں بھی تایا ابو کہہ رہے تھے کہ انہیں اختر پھپھو اور دوسرے رشتہ داروں کو فون کر کے بتانا ہے شادی کے متعلق......''

انہوں نے سر ہلایا۔ دل بیٹی سے ملنے کو ہمکتا تھا لیکن وہ خود کو بہلائے رکھتے تھے کہ وہ آئے گی نا خود ہی، اس کا بھی تو دل میکے کے لیے تڑپتا ہو گا لیکن اسے آتے آتے سالوں بیت جاتے تھے اور وہ آتی بھی تو بس چند دنوں کے لیے، آنکھوں کی پیاس بجھتی ہی نہ تھی۔

''اختر بانو! سالوں بعد آتی ہو، جلدی جلدی چکر لگایا کرو نا۔''

''مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں ابا جان۔ لیکن آپ بھی تو نہیں آتے۔'' وہ شکوہ کرتی تو وہ کچھ کہہ ہی نہ پاتے کہ شروع شروع میں ظفریاب کو بہت غصہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سلطان چچا کے والد نے ہماری بے عزتی کی ہے اور اختر بانو نے بھی ہمارا مان نہیں رکھا۔ یہاں سے اب کوئی وہاں نہیں جائے گا۔ پھر وقت کے ساتھ اس کا غصہ بھی ختم ہو گیا لیکن پھر یہاں سے کوئی گیا ہی نہیں اختر بانو کے گھر......

اختر بانو کے ساس سسر فوت ہوئے تو ارباب اور رنگ زیب اپنی بیویوں کے ساتھ چلے گئے کہ انہیں ایک تو ظفریاب کی طرف سے پریشانی تھی اور پھر مریم کی بیماری کی وجہ سے وہ اس کے سسر کی وفات پر بھی نہ جا سکے تھے ارباب اور رنگ زیب کو ہی بھیجا تھا۔

''تو پھر پکی بات ہے نا دادا جان! ہم چلتے ہیں پھپھو سے ملنے۔'' آزین نے کہا تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

''ہاں پکی بات......''

''لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں؟ تم دادا جان کے ساتھ چلے جانا۔ یہاں ابا کا خیال کون رکھے گا۔'' اسے شاہ زیب کی فکر ہوئی تھی۔

''بی بی اماں ہیں نا اور پھر شیخو بابا بھی تو ہیں۔ دو تین دن تک ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ ہماری عدم موجودگی میں شیخو بابا چچا جان کے کمرے میں ہی سو جایا کریں گے۔ دو تین دن کی تو بات ہے۔''

آزین چاہتا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے۔ اس کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ کبھی گھر سے

باہر نکلی ہی نہیں۔ بس گھر کالج اور اب یونیورسٹی۔

تب ہی بی بی اماں نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

''تم تو زین میاں کو چائے دینے آئی تھیں۔ ادھر ہی بیٹھ گئیں اور ہاں یہ اوپر کیا لارے لگا کے آئی ہو۔ تمہاری تائی نے بھیجا ہے ستارہ کو کہ کباب دے دیں۔ اب تم جانو کون سے کباب دینے کا کہہ کر آئی ہو اب خود ہی آ کر دے دو۔ بیٹھی ہے میرے سر پر۔''

''ہیں آپ کے سر پر تو کوئی نہیں بیٹھا ہوا بی اماں۔'' آزین کو مذاق سوجھا۔

''ادھر کچن میں ہے وہ سرمہ ستارہ بیگم۔'' وہ آنکھوں میں بھر بھر سرمہ لگاتی تھی تو سحرش نے اسے یہ نام دیا تھا۔

بی بی اماں نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی۔

''وہ بی بی اماں سحرش کو پتا تھا نا کہ ہم نے شامی کباب بنا کر فریز کیے ہیں تو وہ کہہ رہی تھی کہ رات کی دعوت کے لیے کچھ انہیں بھجوا دوں۔ وہ وقت کے وقت فرائی کر لیں گے۔'' زمل اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاں ہم نے تو جیسے ان کے لیے اتنی محنت سے بنا کر فریز کیے تھے اور میں کہتی ہوں یہ سحرش کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ ہر وقت ہماری جاسوسی کے لیے ریلنگ پر لٹکی رہتی ہے۔''

بی بی اماں کی بڑبڑاہٹ پر آزین اور زمل دونوں کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جنہیں انہوں نے سر جھکا کر چھپا لیا تھا۔

''شیخو بابا نے دوا لے لی تھی کیا؟'' آزین نے بی بی اماں کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔ ورنہ وہ نہ جانے کب تک سحرش اور کبابوں میں الجھی رہتیں۔

''ارے کہاں میاں، کہتا تھا متلی ہو رہی ہے۔ دودھ نہیں پیوں گا۔ میں نے ہی پھر خالی پیٹ دوا کھانے سے منع کر دیا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو پھر دوبارہ دودھ بھجواتی ہوں، تب تک ساگودانہ بھی بن جائے گا۔ ابھی پودینے والا قہوہ بھجوایا ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے متلی روکنے والی دوا بھی دی تھی ڈاکٹر نے۔'' آزین اٹھ کر چلا

گیا تو بی بی اماں نے زمل کی طرف دیکھا۔

''اب تم یہاں کھڑی کیا سوچ رہی ہو جا کر ستارہ بیگم کو کباب دے دو۔ ورنہ ساجدہ کے کان کھاتی رہے گی۔ کپڑے دھو کر اسے آج ڈرائنگ روم بھی صاف کرنا ہے۔ تم بھی ذرا دیکھ لینا جا کر ورنہ کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار جاتی ہے۔ کبھی پردے نہیں جھاڑتی اور کبھی ڈسٹنگ نہیں کرتی۔ گھر میں بھلے ایک دوسرے کو منہ نہ لگائیں، لیکن یہاں ان نند بھابھی کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔''

''جی اچھا......''

زمل چائے کا خالی کپ اٹھا کر باہر چلی گئی تو انہوں نے جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھا، جو بی بی اماں کی گفتگو سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔

بی بی اماں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر کچھ کہے بنا دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

جہاں زیب بیگ نے بار بار نم ہو جانے والی آنکھوں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔ آج کتنے دنوں بعد زخموں کے ٹانکے پھر سے کھل گئے تھے۔ اختر بانو انہیں کتنی پیاری تھی۔ کتنی لاڈلی تھی ان کی۔ وہ تو ذرا سا روتی تو ان کی جان پر بن آتی تھی۔ ضد کرتی تو فوراً اس کی ضد پوری کر دیتے۔ جہاں آرا منع کرتیں کہ بیٹیوں کے اتنے لاڈ نہیں اٹھانا چاہئیں پرائے گھر جا کر مشکل ہو جاتی ہے جہاں کوئی لاڈ اٹھانے والا نہیں ہوتا۔

لیکن بیٹیاں تو ہمیشہ باپ کی لاڈلی ہوتی ہیں تو وہ بھی ان کی لاڈلی تھی اور اس کی ہر ضد پوری کرنا جیسے ان پر فرض تھا۔ لیکن اختر بانو نے تو ان سے کچھ بھی نہ کہا تھا، چپ چاپ ان کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔

''کیوں تم نے کیوں ضد نہ کی اختر بانو کیوں نہ کہا مجھے اتنی دور اجنبی لوگوں میں مت بھیجیں۔ مجھے میکے کی گلیوں سے اتنا دور نہ کریں کہ میں انہیں دیکھنے کو ترس جاؤں۔'' انہوں نے دل ہی دل میں بیٹی سے شکوہ کیا تھا۔

''تم ایک بار کہتیں تو میں سلطان شاہ سے معذرت کر لیتا لیکن تم نے تو کچھ بھی نہ کہا، بس میرے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ اور یہ تو کتنے سالوں بعد جہاں آرا نے انہیں بتایا تھا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی

تھی۔ وہ آپ کی طرح پڑھانا چاہتی تھی۔ استاد بننا اس کا خواب تھا۔ آپ نے اپنی بیٹی کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ شادی سے صرف دو دن پہلے وہ میری گود میں سر رکھ کر بلک بلک کر روئی تھی۔ کہتی تھی بھلے بابا میری شادی کسی غریب مزدور سے کر دیتے لیکن مجھے اتنی دور اجنبی لوگوں میں نہ بھیجتے۔

اور تب وہ جہاں آرا سے شکوہ کر بیٹھے تھے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں سلطان شاہ کو منع کر دیتا اور سلطان شاہ ایسا تھا کہ ایک لفظ بھی شکوے کا نہ کہتا اور جہاں آرا نے بتایا تھا کہ وہ ان کا مان، ان کا یقین نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ وہ ان کو ان کے دوست کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے تو اپنی طرف سے بہترین کا انتخاب کیا تھا اور وہ بھی تو ثوبان کی رفاقت میں خوش نظر آتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی میکے سے جدائی کا دکھ اس کی آنکھوں کو نم کر دیتا تھا اور یہ دکھ تو ہر لڑکی کو سہنا پڑتا ہے۔ لیکن پھر سلطان شاہ چلے گئے جو بیٹیوں جیسا مان دیتے تھے اسے......

''میری بچی...... میری اختر بانو!'' ان کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی اور وہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوار گیر الماری کی طرف بڑھے اور بے قراری سے اس کا پٹ کھولا۔ جہاں آرا نے اس الماری میں اختر بانو کی چھوٹی چھوٹی چیزیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کا چھوٹا سا جیولری باکس جس میں اب بھی اس کی چھوٹی چھوٹی چیزیں پڑی تھیں، اس کی ایک گڑیا جو شاہ زیب انگلینڈ سے لائے تھے جسے لٹاؤ تو آنکھیں بند کر لیتی تھی، بٹھاؤ تو کھول دیتی تھی۔

وہ کہتی تھی اماں میری گڑیا کسی کو نہ دینا۔ میں اپنی بیٹی کو دوں گی اگر اللہ نے مجھے بیٹی دی۔ لیکن اس کی ساری گڑیاں ہولے ہولے ارباب، اورنگ زیب کی بچیوں میں تقسیم ہو گئیں لیکن یہ ایک گڑیا جہاں آرا نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔ چوڑیوں والا اسٹینڈ جس پر اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی، دو تین سیٹ چوڑیوں کے موجود تھے ایک سنہری جلد والی ڈائری جس میں وہ اقوال زریں اور اشعار لکھتی تھی۔

کچھ دیر وہ یوں ہی الماری کے پٹ پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے۔ پہلے آنکھیں نم ہوئیں پھر برس پڑیں۔

جہاں آرا کہتی تھیں، بیٹیاں زبان سے کچھ نہ بھی کہیں تو ان کے دل خود بخود ماں باپ کے دل میں اتر آتے ہیں۔ میری اختر بانو بھی زبان سے کچھ نہیں کہتی لیکن اس کا دکھ میرے دل میں اتر آیا ہے۔

ٹھہر گیا ہے میری بانو خوش نہیں ہے بیگ صاحب، بھلے زبان سے وہ ہزار بار کہے وہ خوش ہے لیکن ماں کا دل کیسے یقین کر لے۔ جب سے سلطان بھائی فوت ہوئے ہیں، میں نے اس کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ نہیں دیکھے۔

انہوں نے الماری بند کی اور ہولے ہولے چلتے ہوئے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔ آنسو اب بھی آنکھوں سے بہتے تھے اور کانوں میں جیسے کہیں دور سے رخصتی کے گیتوں کی آوازیں آتی تھیں۔

گڈیاں پٹولے چھڈ کے ویراں تو دور چلی

انہوں نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

شادی شروع ہوتے ہی ہر طرف گھر میں رونق رہنے لگی تھی۔ عشا کے بعد اختر بانو کی سہیلیاں اور پڑوسی لڑکیاں ڈھولک بجا کر گیت گاتی تھیں پھر اچانک ہی کوئی رخصتی کے گیت کا بول اٹھاتی تو ماحول سوگوار ہو جاتا اور اپنے کمرے میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے آنسو، ان کے رخساروں کو بھگوتے رہتے۔ جہاں آرا انہیں شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی تھیں۔

''مجھے معاف کر دینا جہاں آرا......'' انہوں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور یادوں کے دوش سے اڑتی آوازیں، سماعتوں میں گونجنے لگیں۔

''بابل اساں اڈ جانڑا......ساڈی لمبی اڈاری اے

ساڈا چڑیاں دا چنبا اے، بابل اساں......''

☆......☆......☆

''بابل میری گڈیاں تیرے گھار (گھر) رہ گیاں۔''

چراغ سائیں باڑے کی طرف جاتے ہوئے بلند آواز میں گا رہا تھا۔ اس کی بلند پرسوز آواز حویلی کے صحن تک آتی تھی اور اختر بانو کے دل میں گھاؤ کرتی تھی۔

''بابل میری گڈیاں......''

وہ بند ہونٹوں کے ساتھ چراغ سائیں کے ساتھ دہراتی تھی۔ حویلی کے کشادہ صحن میں منیرا اور

نوراں گندم صاف کرتے ہوئے گاہے گاہے اختر بانو کی طرف بھی دیکھ لیتی تھیں جو صحن میں ہی بڑے بڑے سرخ پایوں والی چارپائی پر بیٹھی اپنی نگرانی میں گندم صاف کروا رہی تھی لیکن اس کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا بلکہ اس کی سماعتیں چراغ سائیں کی آواز کی طرف لگی تھیں۔ جو آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

''اماں۔'' منیرا نے سرگوشی کی۔

''یہ بڑی بی بی اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں؟'' نوراں نے جواب دینے کے بجائے اسے گھورا۔ منیرا اس کی بہو تھی جو رحیم یار خان کے ایک گاؤں چک سات سو چھیاسی سے بیاہ کر آئی تھی۔ منیر فاطمہ جسے سب منیرا کہتے تھے۔ چند دنوں سے وہ اسے بھی ساتھ حویلی لا رہی تھی۔

''بتا ناں اماں؟'' اس نے نوراں کا کندھا ہلایا تو نوراں نے تنبیہ کی۔

''مالکوں کے متعلق تجسس نہیں کرتے کملی نہ ہو تو، جلدی جلدی ہاتھ چلا۔ کرم دین آتا ہی ہوگا کنک (گندم) لینے۔''

چراغ سائیں کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی تو اختر بانو نے نوراں اور منیرا کی طرف دیکھا۔

''گندم صاف ہوگئی ہے تو کرم دین چاچا کو کہو کہ پسوائی کے لیے لے جائے۔''

''چاچا کرم دین تو صبح صبح ڈیرے پر چلا گیا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا اسے کہ گندم چکی پر لے کر جانی ہے۔ آتا ہی ہوگا۔'' نوراں ہاتھ میں پکڑا چھاج نیچے رکھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''اس کو کیا کام تھا ڈیرے پر۔ وہاں ملازم ہیں تو......'' اختر بانو حیران ہوئی تھیں کہ کرم دین حویلی کے باہر کے کاموں پر مامور تھا۔

''وہ زمان شاہ صاحب نے ڈیرے پر بھیجا تھا کہ ان کے مہمان آرہے ہیں تو ذرا اپنی نگرانی میں صفائی کروا دے۔ ادھر کا نگران شاید بیمار ہے۔ کرم دین چاچا نے کہا تو تھا جلدی آجائے گا لیکن ابھی تک نہیں آیا تو میں بخشو سے کہتی ہوں وہ گندم لے جائے۔ وہ مردانے میں ہوگا۔'' اس نے اپنے بیٹے کا نام لیا۔

اور اختر بانو کو بھی یاد آیا کہ صبح زمان شاہ نے ڈیرے جانے سے پہلے بتایا تو تھا کہ اس کے مہمان آنے والے ہیں، دن کا کھانا ڈیرے پر ہی کھائیں گے۔ مینیو میں دیسی مرغی ضرور ہونی چاہیے۔

”ٹھیک ہے نوراں! تم بخشو کے ساتھ گندم چکی پر بھجوا دو لیکن کہو پہلے دو مرغ بھی ذبح کروا کے اور صاف کروا کے لا دے۔“

نوراں اپنا دوپٹہ درست کرتی ہوئی چلی گئی تو اس نے منیرا کی طرف دیکھا، جو صاف کی ہوئی گندم اب بوری میں ڈال رہی تھی۔

”منیرا! تم صفورا بی بی سے جا کر کہو کہ زمان بھائی کے مہمان آ رہے ہیں تو وہ اپنی نگرانی میں کھانا تیار کروا دیں۔ ماسی تاج کو زمان بھائی نے بتا دیا تھا کیا کیا بنانا ہے۔“

”لیکن صفورا بی بی اور ثمینہ بی بی تو ناشتے کے بعد ہی چلی گئی تھیں۔ صفورا بی بی تو کہہ رہی تھیں چھ سات دن میکے میں ہی رہیں گی۔ یوں بھی زمان شاہ صیب اپنے مہمانوں کے ساتھ کراچی جا رہے ہیں اور ثمینہ بی بی نے بتایا تھا کہ ان کے بھائی بھاوج آئے ہوئے ہیں تو وہ بھی کچھ دن، ادھر اپنے اماں ابا کی طرف ہی رہیں گی کہ مہینوں بعد تو وہ گھر آتے ہیں۔“

منیرا کی عادت تھی ہر بات تفصیل سے کرنے کی۔ اختر بانو کے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔

”اور مجھے کتنے سال ہو گئے میکے گئے ہوئے۔ آنکھیں ترس گئی ہیں میکے کی گلیاں دیکھنے کو، اور وہ سب میرے ماں جائے، میرے ابا جان، وہ میرا موروں کی حویلی کے نام سے جانا جانے والا گھر، وہ اونچی چھتوں والے کمرے جن کی چھتوں پر رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ وہ سرخ چھوٹی اینٹوں والا صحن۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کیاریاں۔ وہ موتیے کی بیل جو برآمدے کے ستونوں سے لپٹی اوپر ریلنگ تک جاتی تھی۔“

تھکاوٹ جیسے اختر بانو کے پورے وجود میں اتر آئی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھی۔

”منیرا!“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”نوراں سے کہنا بخشو مرغ لے آئے تو اندر بھاگی یا ماسی تاج کو دے دے اور بھاگی سے کہے کہ لہسن پیاز وغیرہ کاٹ کر مجھے بتا دے۔“

شوربے والی دیسی مرغی وہ خود ہی پکاتی تھیں۔ جب تک ثوبان کی دادی اور والدہ زندہ تھیں تو وہ ہی پکاتی تھیں کہ گھر کے مردوں کو، ان کے ہاتھ کی پکی دیسی مرغی پسند تھی۔ اس نے بھی اپنی ساس سے ہی

سیکھا تھا کہ شوربے والی مرغی کیسے پکاتے ہیں۔ وہ نڈھال اور تھکی تھکی سی حویلی کے صحن سے نکل کر اندرونی حصے میں چلی گئی۔ منیرا نے اسے یوں نڈھال اور تھکے تھکے انداز میں حیرانی سے جاتے دیکھا اور سوچا۔

''اتنا پیسہ، اتنا عیش و آرام، نوکر چاکر، حویلی، زمینیں، شہزادوں جیسے کڑیل جوان بیٹے، پھر بھی بڑی بی بی کو دیکھ کر ایسا کیوں لگتا ہے جیسے کوئی بڑا دکھ ان کے دل کو چیرتا ہو۔

منیرا نے بوری کا منہ بند کیا اور بوری کے منہ پر ہاتھ رکھے رکھے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اندرونی حصے میں جانے والا بڑا سا منقش دروازہ بند ہو چکا تھا۔ یہ اتنے بڑے بڑے گھروں میں رہنے والوں کو بھلا کیا غم ہو سکتا ہے۔ اب وہ صحن کے اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جو باہر والے صحن میں کھلتا تھا۔

گو اسے یہاں آئے ہوئے چند دن ہو گئے تھے پھر بھی وہ ہر بار جب نوراں کے ساتھ حویلی آتی تو حیرت سے اس بڑی سی حویلی کو دیکھتی تھی۔ جس کے گیٹ سے اندر داخل ہوں تو ایک طرف بڑا سا پورچ تھا جس میں بیک وقت دس بارہ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

چار گاڑیاں اور ایک جیپ تو ہر وقت موجود ہوتی تھی۔ بائیں طرف مردانہ تھا جس میں ایک بڑا ہال، سٹنگ، ڈرائنگ، ڈائننگ اور چار بیڈ رومز تھے۔ گیٹ سے اندرونی صحن کے دروازے تک کافی طویل روش تھی۔ اندرونی صحن کافی کشادہ تھا۔ جس کے فرش پر خوب صورت ٹائلیں تھیں۔ صحن میں ہی ایک طرف بڑا سا کچن تھا جس کا ایک دروازہ اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ کچن کے ساتھ ہی صحن میں ایک دروازہ تھا، جو باہر پچھلے حصے میں جانے کے لیے تھا جہاں کل وقتی ملازم عورتوں کے کمرے وغیرہ تھے۔

اس رہائشی حصے میں بھاگی اور اس کی بیٹی سنہری جو تیرہ سال کی تھی، رہتی تھی۔ تاج ماسی بھاگی کی ساس تھی، اس کے ذمہ کچن کا کام تھا۔ بھاگی کے کوارٹر کے علاوہ دو کوارٹر اور تھے ایک میں ماروی اور سوہنی رہتی تھیں، جو صفورا اور ثمینہ کے ذاتی کاموں کے لیے مختص تھیں اور دونوں ہی شادی کے وقت میکے سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔

صحن کی دیواروں کے ساتھ کیاریوں میں خوش رنگ پھول تھے۔ منیرا نے روز اول کی طرح آج بھی خوش گوار حیرت سے حویلی کا جائزہ لیا تھا۔ اور پھر فرش پر ہی بیٹھ کر نوراں کا انتظار کرنے لگی تھی۔

بخشو کے ہاتھ گندم چکی پر بھجوا کر ان دونوں نے مل کر صحن کی صفائی کرنی تھی۔ نوراں اور وہ صبح آتی تھیں اور شام کو چلی جاتی تھیں۔ اس کی شادی سے پہلے اس کی نند نوراں کے ساتھ آتی تھی جس کی شادی اس کے بھائی سے ہوئی تھی اور وہ بیاہ کر ان کے گاؤں چلی گئی تھی جبکہ وہ بیاہ کر ادھر آئی تھی۔ اندرونی حصے میں اختر بانو بجھے دل کے ساتھ لاؤنج میں کھڑی تھیں۔

صفورا اور ثمینہ چاچا زاد تھیں اور ان کی آپس میں بہت بنتی تھی۔ وہ اختر بانو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا جیسے وہ اسے حقیر سمجھتی ہوں۔ وہ ذمہ داریوں سے بھی بھاگتی تھیں اور یہ آج پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ اکثر ایسے موقعوں پر وہ میکے چلی جاتی تھیں۔ زمان شاہ کے مہمانوں کا خیال رکھنا صفورا کی ذمہ داری تھی کہ زمان شاہ اس کا شوہر تھا۔

زمان سے چھوٹے مہران شاہ ثمینہ کے شوہر تھے۔ مہران شاہ زیادہ تر کراچی میں رہتے تھے کہ انہیں زراعت سے زیادہ صنعت سے دلچسپی تھی اور انہوں نے ثمینہ کے بھائی کے ساتھ مل کر کراچی میں ٹیکسٹائل مل لگائی ہوئی تھی۔

آج پتا نہیں کیوں اس کا دل بہت گداز ہو رہا تھا۔ آج برسوں بعد اس کے دل میں پھر خیال آیا تھا کہ کاش وہ اس بڑی حویلی میں بیاہ کر آنے کے بجائے کسی چھوٹے سے گھر میں بیاہ کر جاتی۔ آج بھی ابا سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ بار بار فون کٹ جاتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ آج ان کی آواز سن کر، دل ان سے ملنے کو تڑپ اٹھا تھا۔ فون پر بھی تو کم کم بات ہوتی تھی اور آج کتنے دنوں بعد اس نے کال کی تھی اور ٹھیک سے بات بھی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آئیں تو ٹھٹک کر دروازے کے پاس ہی رک گئیں۔ ثوبان شاہ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے بالوں میں برش کر رہے تھے۔ رات وہ ثمرہ کے بیڈ روم میں تھے تو اس وقت انہیں وہاں ہی ہونا چاہیے تھا۔

برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر انہوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ عمر کے اس حصے میں بھی وہ لمحہ بھر کے لیے اسیر کر لیتی تھی۔ گزرے وقت نے اسے سنجیدہ اور باوقار بنا دیا تھا۔ آج بھی دل اس کی

طرف کھنچتا تھا۔ شوخ، لاابالی اور بے انتہا خوب صورت اختر بانو کو بابا کے اصرار پر جب وہ بیاہ کر لائے تھے تو پہلی نظر پڑتے ہی دل نے بے اختیار سراہا تھا۔ بابا کا انتخاب لاجواب تھا۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں تھی اسے بات کرنے کا قرینہ اور سلیقہ بھی تھا۔ ایف ایس سی تک تعلیم بھی تھی۔ کم عمری کی معصومیت اور سادگی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اور وہ اپنا دل اس کے سامنے ہار بیٹھے تھے۔ آج اتنے سالوں بعد جب بچے بھی جوان ہو چکے تھے پتا نہیں کیوں، انہیں وہ پہلے دن والی سہمی سہمی، ہرنی جیسی آنکھوں والی اختر بانو یاد آ گئی تھی۔ جسے دادا، دادی کی مخالفت کے باوجود بابا نے ان کی زندگی میں شامل کیا تھا۔

اور وہ اس کی رفاقت پا کر خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھتے تھے۔ پھر یہ اجنبیت اور غیریت نہ جانے کب ان کے درمیان چلی آئی تھی۔

شاید ثمرہ سے شادی کے بعد......

سر جھٹک کر ماضی کے تصور کو جھٹک کر انہوں نے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''زمان شاہ کے مہمان آ رہے ہیں، ان کی خاطر تواضع میں کوئی فرق نہ آئے۔ صفورا اور ثمینہ بھابھی گھر پر نہیں اور ثمرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں اسے لے کر ڈاکٹر کی طرف جا رہا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بہت کم بولتی تھی۔ حالانکہ شادی کے ابتدائی دنوں میں، وہ بہت بولتی تھی اور وہ اسے چہکتی مینا کہتے تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ آج بار بار ماضی میں جھانکنے لگے تھے۔ کتنے خوب صورت لمحے تھے جو ماضی کا حصہ بن کر وقت کی دھول میں چھپ گئے تھے۔

اس نے پوچھا نہیں تھا کہ ثمرہ کو کیا ہوا ہے، اسے سوال کرنے کی عادت نہیں تھی، انہوں نے خود ہی بتایا۔

''رات ثمرہ کو بخار ہو گیا تھا کھانسی اور جسم میں درد بھی ہے۔''

''ریحان سے بات ہوئی آپ کی، کب تک واپسی ہے؟''

ریحان اور نعمان اس سے بے تکلف نہ تھے۔ دادی اور دادا کے بعد وہ ثوبان کو ہی اپنے پروگرام بتایا کرتے تھے اور سارے معاملے ان سے ہی ڈسکس کرتے تھے۔ ریحان چند دن پہلے، اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئے تھے اور اس کا علم بھی اسے ثوبان سے ہی ہوا تھا۔ وہ ماں تھی سو فکر مند تھی۔

''ہاں رات بالاکوٹ سے فون کیا تھا اس نے۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی تھی کہ وہاں سگنل کا پرابلم تھا۔''

انہوں نے کرسی کی پشت پر پڑا ہوا اپنا ویسٹ کوٹ اٹھایا۔

ثمرہ کو چیک کروا کے میں ادھر سے ہی حیدر آباد چلا جاؤں گا۔ شایان کو بھی اپنی نانو کے گھر گئے ہفتہ بھر ہو گیا ہے۔ ثمرہ اس کے لیے اداس ہو رہی تھی اور......''

''اپنی نانو کے گھر......''

اختر بانو کے دل پر جیسے کسی نے ہاتھ مارا تھا۔

بے اختیار اس نے نظریں اٹھائیں تو ثوبان شاہ اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ زخمی نظروں میں سینکڑوں شکوے تڑپ رہے تھے لیکن لب خاموش تھے۔ اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لی تھیں۔ ثوبان شاہ کے دل کو لمحہ بھر کے لیے، کچھ ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے سر جھٹک کر انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔

''شانی کہہ رہا تھا کہ تایا جان ثمرہ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ کافی دن ہو گئے ہیں اسے حیدر آباد گئے ہوئے تو پروگرام یہ ہے کہ ثمرہ کو حیدر آباد چھوڑ کر میں کراچی چلا جاؤں گا۔ نعمان کو کچھ مشورے کرنے ہیں وہ اور ریحان دراصل اپنا الگ سے کچھ کرنا چاہ رہے ہیں۔ واپسی پر شایان اور ثمرہ کو لیتا آؤں گا۔''

اور اسے کتنے سال ہو گئے تھے لاہور گئے ہوئے۔ ابا اور بھائیوں سے ملے۔ زخمی نظریں ایک بار پھر ان کی طرف اٹھ کر جھک گئیں۔ ثوبان شاہ کی نظریں اس کے چہرے پر ہی ٹھہر گئیں۔ پتا نہیں کیوں آج ثوبان شاہ کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اختر بانو کے ساتھ کہیں نہ کہیں زیادتی ہوئی ہے اور اس کی حق تلفی کے وہ بھی مجرم ہیں۔

یہ احساس شاید مولوی فقیر اللہ کے بیان کی وجہ سے تھا کہ چند دن پہلے وہ بے ارادہ ہی مولوی

صاحب کے ڈیرے پر چلے گئے تھے اور ان کا بیان سنا تھا اور کتنے سالوں بعد آج پہلی بار انہیں اختر بانو کی آنکھوں میں یہ زخمی سی کیفیت نظر آئی تھی۔

''تم لاہور جانے کا کہہ رہی تھیں۔ ثمرہ واپس آ جائے تو تم بھی چلی جانا لاہور، چھ سات دنوں کے لیے میں سیٹ بک کروا دوں گا۔''

اس نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر پر ڈال کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ وہ ہاتھ گود میں دھرے یوں ہی ساکت بیٹھی رہی۔ اندر جیسے سمندر ابل رہے تھے۔ لیکن آنکھیں خشک صحرا تھیں۔

اور اندر کہیں ایک ہی جملے کی تکرار ہو رہی تھی۔

اپنی نانو کے گھر......

''نہیں ہے وہ اس کی نانو کا گھر۔'' وہ بند لبوں سے چیخی تھی۔ ''وہ اس کے کوئی نہیں ہیں۔'' اس کی نانو تو اسے دیکھنے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئیں اور وہ اپنی ماں سے اسے ملانے نہ لے جا سکی کہ اسے اجازت نہ تھی کہ ہاسپٹل سے گھر آتے ہی وہ اس سے چھین لیا گیا تھا۔

''تمہارے پاس پہلے ہی دو بیٹے ہیں۔ ثمرہ کی گود خالی ہے۔ جب سے ڈاکٹر نے بتایا ہے اس کی اولاد نہیں ہو سکتی، وہ سائیکو ہوتی جا رہی ہے۔''

ثوبان شاہ نے اسے اٹھا کر ثمرہ کو دے دیا تھا۔ اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی، یہ بھی نہیں کہ پہلے دو بیٹوں کو کب اس کے قریب آنے دیا گیا۔

نعمان اور ریحان تو سارا وقت دادی کی نگرانی میں رہتے تھے۔ نعمان کو تو یہ کہہ کر دادی زیادہ وقت اپنے پاس ہی رکھتی تھیں کہ ابھی کم عمر ہو۔ سمجھ اور تجربہ نہیں ہے بچے سنبھالنے کا۔ اس کے پاس تو ملازمہ صرف فیڈ کے لیے ہی لاتی تھی۔ اور نعمان ابھی دو پونے دو سال کا تھا تو ریحان پیدا ہو گیا۔ اور ابھی وہ دو ماہ کا ہی تھا تو سلطان شاہ وفات پا گئے اور زندگی اس کے لیے مشکل ہو گئی۔

سلطان شاہ کے والد اور والدہ نے ڈھیروں ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر ڈال دی تھیں۔

شروع میں سلطان شاہ کی بیوی نے، اس کا کچھ خیال کیا تھا لیکن پھر وہ اپنے ساس سسر کی طرح اس سے بے نیازی برتنے لگی تھیں۔ ملازمہ ان کی نگرانی میں ہی بچوں کو سنبھالتی۔ وہ ان کے مقابلے میں اپنی پھپھو اور دادی سے زیادہ مانوس تھے اور یہ سب ایک منصوبے کے تحت تھا، اس کا اندازہ اسے بہت بعد میں ہوا تھا۔ سلطانہ کی شادی کے بعد نعمان رو رو کر بیمار ہو گیا تھا۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی، پیار سے پاس بلاتی تو وہ روتا ہوا چلا جاتا۔

''آپ میری ماما نہیں ہیں۔ مجھے پھپھو اماں کے پاس جانا ہے۔''

ہولے ہولے دادی نے اسے بہلا لیا تھا۔ لیکن اس کے اندر ایک گھاؤ سا ہو گیا تھا۔ بچے اس کے تھے لیکن ان کی نظروں میں اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ وہ اپنی ہر بات دادی سے یا پھر ثوبان سے کہتے تھے اس نے ایک بار ثوبان سے شکایت کی کہ بچے اس کے پاس نہیں آتے وہ بلائے بھی تو چند منٹوں بعد چلے جاتے ہیں۔ ہر ضرورت کے لیے دادی اور پھپھو کے پاس جاتے ہیں جبکہ ماں میں ہوں تو ثوبان نے اس کی بات کو اہمیت ہی نہیں دی تھی بلکہ حیران سا ہوا تھا۔

''شکر نہیں کرتی ہو، تم پر بچوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ میری ماں، دادی اور بہن اچھے سے سنبھال رہی ہیں انہیں......اور ہم دونوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے انجوائے کرنے کے لیے۔'' وہ شوخ ہوئے تھے لیکن اس نے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اب اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا تو وہ اپنے بچے کو، ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرے گی۔ خود پالے گی، سارے کام خود کرے گی۔ ملازمہ سے اپنے بچے کا کوئی کام بھی نہیں کروائے گی۔ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اس کے لیے اور آزمائشیں بھی ہیں۔

سلطان شاہ کی وفات کے چار سال بعد، ثوبان شاہ کے دادا نے ان کی شادی ان کے چھوٹے تایا کی بیٹی سے کروا دی اور اسے بلا کر صرف اتنا کہا تھا۔ خاندان میں ثمرہ کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں ہے سو مجبوری ہے۔ امید ہے تم اچھی اور خاندانی لڑکیوں کی طرح اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس رشتے کو قبول کرو گی۔ ہمارے خاندان میں دوسری شادی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ثوبان کے بڑے تایا کی بھی دو شادیاں ہوئی ہیں۔ پہلی بیوی میری بھتیجی تھی۔ اس سے عمر میں کافی بڑی تھی۔ دوسری شادی پھر اولاد

کے لیے کی تو تم بھی اچھی لڑکیوں کی طرح واویلا اور ہنگامہ نہیں کرو گی۔''

البتہ ثوبان شاہ نے بڑے وعدے کیے اور تسلیاں دی تھیں۔

''میں مجبور ہو گیا ہوں اختر! دادا کو انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہارا جو مقام میرے دل میں ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ تم میری اولین محبت ہو۔ پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن پھر کیا ہوا تھا۔ بہت جلد ثمرہ ان پر حاوی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بہت عام سی شکل و صورت کی عام سی لڑکی تھی۔ اختر بانو کی خوب صورتی، سادگی اور معصومیت سب پس منظر میں چلے گئے تھے شاید اس میں کچھ ہاتھ، ثوبان کے دادا اور دادی کا بھی تھا کہ ثوبان شاہ ہولے ہولے اس سے دور چلے گئے اور وہ جیسے خود کو بھی بھولتی جا رہی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے زندگی ہولے ہولے اس کے اندر مر رہی ہو ایسے میں شایان کی آمد کی خبر نے اس کے دل میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا کر دی تھی۔

آنے والا بچہ اس کا ہو گا صرف اس کا......لیکن ثوبان شاہ نے اسے ثمرہ کی گود میں ڈال دیا۔ وہ خالی گود لیے تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر روئی لیکن وہاں اس کی پروا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ثمرہ چھ دن کے بچے کو لے کر حیدر آباد اپنے میکے چلی گئی اور پھر دو ماہ بعد آئی تھی تو وہ تڑپ کر اسے دیکھنے کو لپکی تھی تو ثمرہ نے سختی سے کہا تھا۔

''اختر بانو! تم بھول جاؤ کہ اس بچے کو تم نے جنم دیا ہے۔ اور کبھی بھی اسے معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اس کی ماں ہو۔''

ثوبان شاہ نے بھی ثمرہ کی تائید کی تھی۔

''ثمرہ ٹھیک کہتی ہے اختر بانو......شایان کو کبھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ثمرہ نہیں تم اس کی ماں ہو اس طرح اس کی شخصیت میں بڑا ہونے پر کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔''

''لیکن وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا دل اس کے لیے ہمکتا ہے۔ میں اسے گود میں لینا چاہتی ہوں۔ پیار کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ رو پڑی تھی۔

''تو اپنے دل کو سمجھاؤ، ثمرہ کو اچھا نہیں لگتا کہ تم اس کے ارد گرد گھومو۔''

ثوبان شاہ بدل گئے تھے۔ وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

''تم نعمان اور ریحان پر توجہ دیا کرو۔''

ثوبان کی دادی فوت ہو گئی تھیں۔ سلطانہ کی شادی ہو گئی تھی اور ثوبان کی والدہ بیمار رہنے لگی تھیں۔

''وہ میرے پاس ٹکتے ہی کب ہیں؟''

''کیسی ماں ہو تم جو دو چھوٹے بچوں کو قائل نہیں کر سکتیں۔''

اور وہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی، تاہم وہ نعمان اور ریحان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتی تھی۔ انہیں پاس بٹھا کر ہوم ورک کرواتی، سبق یاد کرواتی۔ شروع شروع میں تو وہ مشکل سے اس کے پاس بیٹھتے انہیں اپنے کمرے میں یا اپنی دادی کے پاس جانے کی جلدی ہوتی تھی لیکن پھر ہولے ہولے وہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے بلکہ ریحان تو کہانی سننے کی فرمائشیں کرنے لگا تھا۔ ایک دو بار تو وہ ضد کر کے اس کے پاس ہی سو گیا تھا جس پر ثوبان شاہ کے دادا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ اسے اپنے پاس سلانے کا عادی نہ بنائے۔ پھر بھی وہ خوش تھی، مطمئن تھی اس کے بچے اس سے مانوس ہو رہے تھے اس کے قریب آ رہے تھے۔ جب ریحان اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا تھا تو وہ اس کے ہاتھوں کو بے اختیار چومنے لگتی تھی لیکن یہ خوشی کتنی عارضی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔

صرف دو ماہ بعد ثوبان نے اسے بتایا کہ بچوں کو ایبٹ آباد داخل کروا دیا گیا ہے، اور وہ اب ہوسٹل میں رہیں گے۔

''اتنے چھوٹے بچے وہاں ہوسٹل میں رہیں گے۔'' اس کی آنکھیں برسنے کو بے تاب ہوئی تھیں۔

''ہاں، دادا جان بہتر سمجھتے ہیں اختر بانو، اور یہ ان کا فیصلہ ہے کہ یہاں اس چھوٹی سی جگہ پر بچوں کی صحیح تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کوئی ڈھنگ کا سکول تو ہے نہیں۔''

خلاف معمول ثوبان شاہ نے نرمی سے کہا تھا ورنہ جب سے ثمرہ سے ان کی شادی ہوئی تھی، وہ نرمی سے گفتگو کرنا بھول گئے تھے۔

''لیکن ابتدائی تعلیم تو سب نے یہاں ہی حاصل کی ہے، سلطان چاچا نے بتایا تھا۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے ایک بار پھر اس سے دور چلے جائیں، ورنہ اسے بحث کی عادت نہ تھی۔

''وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا پڑتا ہے اختر بانو!''

اور وہ خاموش ہو گئی تھی۔ بچوں کو ہوسٹل میں داخل کروا دیا گیا۔ تو گھر میں جیسے ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ بولائی بولائی سی پھرتی رہتی تھی۔ ثمرہ شایان کو اس کی موجودگی میں اپنے کمرے سے باہر کم ہی لاتی تھی۔

بچے چھٹیوں میں آتے تو دادی کے پاس ہی رہتے۔ یا پھر اپنے کمرے میں مصروف رہتے۔ وہ ہولے ہولے پتھر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اسے لگتا تھا۔ حالانکہ وہ پتھر کیسے ہو سکتی تھی۔ انسان تھی۔ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا۔ اور اس کے دل پر چوٹ بھی لگتی تھی۔ اسے تکلیف بھی ہوتی تھی لیکن آنکھیں خشک صحرا بن گئی تھیں آنسو اندر گرتے تھے۔

لاہور سے اماں کا فون آتا تو وہ اصرار کرتیں اختر بانو میرے نواسے کو لے کر آؤ یہاں سب اسے دیکھنے اور ملنے کو بے تاب ہیں اور میں نے بھی جی بھر کر کہاں دیکھا تھا۔ ہاسپٹل سے ہی گھر آ گئی تھی۔ اس کی صورت آنکھوں سے ہٹتی ہی نہیں۔ نومی اور ہانی (نعمان اور ریحان) بھی ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں اللہ انہیں نظر بد سے بچائے لیکن شانی کو تو میں نے گود میں لیا تو جیسے چاند میری گود میں اتر آیا ہو۔ پورے ہسپتال میں شور مچ گیا تھا کہ اتنا خوب صورت بچہ ہے۔

نرسیں اور ڈاکٹر زاسے دیکھنے کمرے میں آتی تھیں تو یہاں تمہارے بھائی اور بھابیاں مجھ سے سن کر اسے دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہیں۔ زیبی تھوڑا مصروف ہے، کہتا ہے کسی روز خود جا کر تمہیں اور بچوں کو لے آئے گا۔ تم نے حویلی سر پر تو نہیں اٹھا رکھی نا۔

اور وہ چپ چاپ اماں کی باتیں سنتی رہتی۔ آنسو اس کے اندر گرتے رہتے۔ وہ انہیں بتانا چاہتی کہ شانی کو دیکھنے کو تو وہ خود ترس جاتی ہے۔ بیس بیس دن کے لیے ثمرہ اسے لے کر حیدر آباد چلی جاتی ہے۔ لیکن اس خیال سے لب سی لیتی کہ وہ دکھی ہوں گی۔

ثوبان کی والدہ کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں بہت سے مسائل تھے۔ شوگر تھی، گردوں میں

انفیکشن تھا اور اب ہارٹ کی تکلیف بھی ہوگئی تھی۔ وہ فارغ وقت ان کے پاس گزارتی تھی۔ اگرچہ ایک ملازمہ خصوصی ان کی خدمت کے لیے موجود تھی۔ گو سلطان شاہ کی وفات کے بعد ان کا رویہ بھی اس کے ساتھ بدل گیا تھا۔

وہ اپنے ساس سسر کے زیر اثر تھیں۔ پھر بھی وہ اتنی بیمار تھیں کہ بنا کسی کے کہے ان کا خیال رکھنا اس نے اپنا فرض بنالیا تھا۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے ہمدردی اور تاسف نظر آتا تھا۔ زمان شاہ اور مہران شاہ کی بیویاں بس کھڑے کھڑے ہی کمرے میں آتی تھیں۔ اور حال دریافت کر کے چلی جاتی تھیں۔ ثمرہ تو اتنا بھی نہ کرتی تھی۔ شایان ابھی صرف چھ ماہ کا تھا کہ ایک بار پھر اسے خوش خبری ملی تو وہ چیخ چیخ کر روئی۔

”نہیں، نہیں چاہیے مجھے یہ بچہ، پلیز ڈاکٹر اسے ختم کر دیں۔ اسے بھی وہ نومی، ہانی اور شانی کی طرح مجھ سے چھین لیں گے۔ نہیں، یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی میں۔“

وہ روتے روتے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ اسے کئی دن ہاسپٹل رکھنا پڑا۔ بار بار بے ہوش ہو جاتی۔ ہوش آتا تو ہاتھ جوڑنے لگتی، چیخنے لگتی۔ ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔

”ایسا نہیں ہوگا اختر بانو، تمہارا بچہ صرف تمہارا ہی ہوگا۔ ریحان اور نعمان بھی تمہارے ہی ہیں۔ ہاں صرف شایان کو......“

ثوبان نے اسے تسلی دی تھی لیکن اسے اعتبار نہیں تھا۔

”آپ اسے ثمینہ بھابھی کو دے دیں گے، مجھے پتا ہے۔ اللہ نے ابھی تک انہیں اولاد نہیں دی نا تو......“

”نہیں دی تو دے دے گا، دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“

ثوبان اس کی حالت پر پریشان تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اس کی حالت یہ ہی رہی تو نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ ہے اور شاید......

”مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے۔“

"مجھ پر تو اعتبار کرو گی نا۔" ثوبان شاہ کی والدہ چیک اپ کے لیے حیدر آباد اسپتال آئی ہوئی تھیں اور اسے دیکھنے اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

"آپ عورت ہیں اماں جان۔ میرا درد سمجھ سکتی ہیں۔ آپ کے دل میں ذرا بھی میرا خیال ہے یا مجھ سے ہمدردی ہے تو ثوبان شاہ سے کہیں، اجازت دے دیں کہ......"

"نہیں۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے بچے کو تم سے کوئی نہیں لے گا قسم کھاتی ہوں۔ اور ثوبان بھی قسم کھاتا ہے۔ اس بچے کو تم پالو گی اس کی پرورش اور اس کے دوسرے معاملات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ یہ صرف تمہارا ہوگا۔"

☆......☆......☆

"اماں جان!" امان نے دروازے سے جھانکا۔

"بابا کہاں گئے ہیں؟" اس نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ اپنے اندر کے دکھوں سے لڑتے ہوئے وہ سن ہی نہیں پائی تھی کہ امان نے کیا کہا ہے۔

"اماں جان!" امان پریشان سا ہو کر اندر چلا آیا۔

"کیا ہوا، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" اب وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی لیکن دل کا درد آنکھوں سے جھانک کر کہہ رہا تھا کہ اندر کہیں بہت تکلیف ہے، بہت اذیت ہے۔

"اماں جان!" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"کیا بابا نے کچھ کہا ہے آپ پریشان لگ رہی ہیں؟"

"ہاں...... نہیں تو انہوں نے بھلا کیا کہنا تھا۔" اب وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ "وہ تو بس یہ ہی کہہ رہے تھے کہ ڈیرے پر زمان بھائی کے مہمان آئے ہوئے ہیں تو ان کی خاطر تواضع میں کمی نہ ہو۔"

''مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' وہ تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''زمان چاچو کے مہمان ہیں نا تو صفورا چچی سے کہیں وہ دیکھ لیں گی سب۔''

''وہ اور ثمینہ بھابھی دونوں ہی میکے چلی گئی ہیں۔'' سادگی سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ امان شاہ کے ہاتھوں سے چھڑائے تو غصے کی ایک لہر سی امان شاہ کے اندر اٹھی۔

''تو ثمرہ امی تو گھر پر ہیں نا، ان سے کہیں۔ ساری ذمہ داریاں کیا آپ نے ہی سنبھالنی ہیں۔ میں نے تو انہیں کبھی آپ کی طرح حویلی کے کاموں کے لیے کھپتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ عمر میں وہ آپ سے کافی بڑی ہیں بھلے ان کی شادی آپ کے بعد ہوئی۔ بابا کو آپ کا خیال کرنا چاہیے۔ ہر چھوٹی بڑی ذمہ داری آپ پر ڈال دیتے ہیں۔''

اور اختر بانو کے دل پر جیسے پھوار سی گرنے لگی تھی اور سارا گرد و غبار دھل کر صاف ہو گیا تھا۔ کوئی تو ہے ان کا احساس کرنے والا۔ ان کا غم گسار ان کا دوست، ان کا بیٹا امان شاہ۔ شایان شاہ سے صرف ڈیڑھ سال چھوٹا۔ ثوبان شاہ اور اماں جان نے وعدہ نبھایا تھا۔ امان شاہ کے معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا انہوں نے...... امان شاہ کے متعلق سارے ہی فیصلے وہ ہی کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں امان دیا تھا وہ اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے تھکتی نہ تھیں۔

انہوں نے امان کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ کسی کو بھی نہ حتیٰ کہ اماں اور ابا کو بھی نہیں پتا تھا۔ کیا خوف تھا جو اس کے دل کے اندر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔

ثوبان شاہ نے اس فیصلے پر اسے سراہا تھا۔

''یہ تم نے اچھا کیا اس طرح تمہارے میکے میں بھی کوئی شایان کے متعلق نہیں جان پائے گا۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے اختر بانو کہ کسی کو علم نہ ہو کہ شایان تمہارا بیٹا ہے۔ اور انہوں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ امان اور شایان ہم عمر ہی لگتے تھے گو وہ اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ جب پہلی بار ماں کی وفات پر امان کو لے کر گئی تھی تو سب نے اسے شایان ہی سمجھا تھا اس کا تیسرا بیٹا اور نام تو یہاں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''ارے یہ تو بالکل شاہ زیب جیسا ہے۔'' ابا نے کہا تھا۔

''تمہاری اماں نے یہ تو نہیں بتایا تھا بس ہر وقت تعریفیں کرتی رہتی تھی کہ میری اختر کا بیٹا ماشاء اللہ اتنا خوب صورت ہے کہ نظر اس پر ٹھہرتی ہی نہیں۔ یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ تو ساری شباہت ہی زیبی کی چرالایا ہے۔''

اور تب وہ ابا کو اپنے راز میں شریک کر بیٹھی تھی۔ اور جہاں زیب کو لگا تھا جیسے ان کا دل پھٹ جائے گا۔ ایک لفظ کہے بغیر اسے گلے سے لگائے چپ چاپ اس کے آنسو پونچھتے رہے تھے۔

''میرے دل پر بہت بوجھ تھا میں نے آپ کو اپنے اس راز کا امین بنایا ہے۔''

''میری بچی......!'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ ''مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے لیے صحیح اور بہتر فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔''

''ابا!'' اس نے ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تھا۔ ''ایسا مت کہیں۔ میرے مقدر میں یہ ہی لکھا تھا۔''

''تم میں کیا کمی تھی اختر بانو جو ثوبان نے دوسری شادی کی۔''

وہ اس روز اتنا روئے تھے کہ اماں کی وفات پر بھی اس نے انہیں اتنا روتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں کے سوئم کے بعد وہ واپس آ گئی تھی جبکہ ثوبان تو جنازے کے بعد ہی چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

''میں جا کر ثمرہ اماں سے بات کرتا ہوں۔'' امان اٹھنے لگا تو اس نے اسے روکا۔

''ثمرہ آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تمہارے ابا انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں۔ پھر وہاں سے ہی حیدر آباد چلے جائیں گے۔ بہت دن ہو گئے تھے انہیں میکے گئے ہوئے۔''

اس کے سادہ سے لہجے میں بھی ایسا کیا تھا کہ امان شاہ کا دل، اس کے ان کہے درد سے تڑپ اٹھا۔

''آپ کا دل نہیں چاہتا اماں جان میکے جانے کو، کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو لاہور گئے ہوئے۔''

''چھ سال، چار ماہ اور سات دن۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''اور دل کا کیا ہے

میری جان۔ وہ تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔'' افسردہ سی مسکراہٹ کے پیچھے جو درد چھپا تھا امان نے اسے اپنے دل میں محسوس کیا۔

''بابا واپس آجائیں تو میں آپ کو لاہور لے کر جاؤں گا۔ بس آپ تیاری رکھیں۔ پورے دو ہفتے کے لیے جائیں گے۔ مجھے تو خود کچھ یاد نہیں، نہ نانا ابو کا گھر نہ اپنے ماموں زاد بہن بھائی۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ کس ماموں کے کتنے بچے ہیں۔''

''جب تم آخری بار ساتھ گئے تھے تو بہت چھوٹے تھے، بھلا کیا یاد ہوگا۔ پھر جب بھی گئی تو اکیلی ہی گئی۔ تمہارے بابا کہتے تھے بچوں کو مت لے کر جانا پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

آنکھوں میں چھائی اداسی اور بھی گہری ہوگئی تھی۔

''بابا نے کچھ بتایا تھا کب تک واپس آئیں گے۔ دراصل ان سے ہی بات کرنی تھی مجھے۔''

''کیا بات کرنی تھی برخوردار؟'' ثوبان شاہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ اپنا والٹ ڈریسنگ ٹیبل پر بھول گئے تھے۔ سو ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچنے سے پہلے ہی پلٹ آئے تھے۔

''مجھے ماسٹر پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے کرنا ہے بابا۔ کچھ دنوں تک وہاں ایڈمیشن کھل جائیں گے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ مجھے دادا جان کی طرح گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنا ہے لیکن تب آپ نے اجازت نہیں دی تھی لیکن اب ماسٹرز وہاں سے ہی کرنا ہے۔''

''جامعہ کراچی سے کیوں نہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی میں کیا کوئی اسپیشل ایجوکیشن ہوتی ہے؟'' طنزیہ انداز میں کہتے وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھے۔

''نہیں لیکن مجھے شوق ہے پنجاب یونی ورسٹی سے جرنلزم میں ماسٹرز کرنے کا۔'' امان شاہ بالکل اپنے دادا سلطان شاہ کی طرح تھا۔ متحمل مزاج، صابر اور سمجھ دار۔

''یہ مجھے تمہارا جرنلزم میں ماسٹرز کرنا سمجھ نہیں آیا۔ کیا کرو گے صحافی بن کر بہت ایمان دار اور سچے ہوئے تو کسی روز مار دیئے جاؤ گے، دوسری صورت میں لفافہ صحافی کا ٹھپہ لگ جائے گا تمہارے ماتھے پر۔ ایم بی اے کرو اپنے بھائیوں کی طرح کارخانہ یا مل لگالو، تم اور شانی مل کر سنبھال لینا۔''

"فی الحال تو مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے بابا۔ رہی بات کہ میں صحافی بن کر کیا کروں گا تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن مجھے شوق ہے۔"

"او کے واپس آ کر بات کریں گے۔"

انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا اپنا والٹ اٹھایا۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے دل میں خیال آیا کہ وہ اختر بانو کو یاد دلا دیں کہ آج زمان بھائی کے گیسٹ آ رہے ہیں، لیکن پھر سر جھٹک کر باہر چلے گئے۔ اتنے سالوں کی رفاقت میں اتنا تو وہ جانتے ہی تھے کہ وہ غیر ذمہ دار نہیں ہے اور حویلی سے متعلق ہر ذمہ داری کو اس نے بڑے احسن طریقے سے نبھایا ہے اور کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

"تو آپ تیاری کریں، ثمرہ اماں کے واپس آتے ہی ہم لاہور جائیں گے۔"

امان شاہ کھڑا ہو گیا کہ اسے ایک دوست کی طرف جانا تھا جو ساتھ والے گوٹھ میں رہتا تھا۔

"لیکن مانی......" اختر بانو نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ "ابا جان نے بتایا تھا ایک دو ماہ تک ارباب بھائی اور اورنگ زیب بھائی کے بچوں کی شادیاں ہیں تو میں سوچ رہی ہوں، ابھی گئی تو پھر جانا مشکل ہو جائے گا۔"

"تو کیا ہوا۔ پھر بھی چلے جائیں گے۔ میں لے جاؤں گا آپ کو لیکن ابھی جو پروگرام بنا ہے وہ ڈن ہے۔" وہ مسکرایا۔ "بس آپ تیاری رکھیں۔" اس نے ان کا بازو تھپتھپایا اور وہ بھی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیں۔

☆......☆......☆

ان کا یہ بیٹا بچپن سے ہی اس کے بے حد قریب تھا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی اسے بھی اداس کر دیتی تھی۔ سارا وقت اس کے آس پاس ہی چکراتا رہتا تھا۔ وہ اس کے لیے اس کی ساری محرومیوں ساری تشنگیوں کا نعم البدل تھا ذرا سا بڑا ہوا تو پوچھ بیٹھا تھا۔

"بابا آپ کے ساتھ اتنا روکھا رویہ کیوں رکھتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اسے کیا بتاتی کہ ثوبان شاہ ایک دم سے کیوں بدل گئے

تھے۔ ثمرہ کے ساتھ شادی سے پہلے، کتنے وعدے کیے تھے انہوں نے کتنا یقین دلایا تھا کہ اس کا جو مقام ہے وہ اس کا ہی رہے گا۔ وہ ہمیشہ ان کے دل کی مسند پر اونچی جگہ پر براجمان رہے گی لیکن پھر وہ سب وعدے بھول گئے تھے۔

ثمرہ میں ایسا کیا تھا جو اس میں نہیں تھا۔ شاید وہ اتنی تیز طرار نہیں تھی۔ اسے اپنا حق لینا اور اپنا آپ جتانا نہیں آتا تھا۔ اور شاید وہ غیر خاندان سے تھی اور ثمرہ ان کے اپنے خاندان کی۔ ثمرہ کی چھوٹی سی تکلیف پر بھی ثوبان شاہ پریشان ہو جاتے تھے لیکن اس کا دکھ، اس کا کرب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ نعمان کے لیے تڑپتی تھی۔

''وہ ہمارا بیٹا ہے پھر اسے مجھ سے دور کیوں کر دیا گیا ہے؟''

''دور کہاں گیا ہے یار! تمہارے بھلے کے لیے ہی تو اس کی ذمہ داری انہوں نے لے لی ہے اور وہ تم سے بہتر اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔''

ریحان آیا تو ابھی کمزور کہہ کر دادی کی نگرانی میں دے دیا اور ثوبان شاہ کی ثمرہ سے شادی کے بعد تو وہ ان کی دوری بہت زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔ کہ ثوبان شاہ شروع کے چند ماہ باقاعدگی سے دو دن ثمرہ کے ساتھ دو دن اس کے ساتھ گزارتے رہے پھر ہولے ہولے ہفتوں مہینوں وہ اس کے کمرے میں نہ آتے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' امان اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں......'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''اور کچھ سوچنا بھی نہیں ہے آپ نے بس طے ہو گیا تو ہو گیا۔ بس مجھے یہ بتائیں کہ نانا جان کے گھر میں کون کون ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے نا کہ مجھے یہ تک نہیں پتا کہ میرے ماموؤں کے کتنے بچے ہیں۔ میں واپس آ کر سب کے متعلق آپ سے پوچھتا ہوں۔ اتنے عرصے بعد جائیں گی آپ تو سب کے لیے گفٹ بھی تو لینے ہوں گے۔ جانے سے پہلے ہم حیدر آباد جا کر سب کے لیے گفٹ لے آئیں گے۔''

وہ بولتا جارہا تھا اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ نمی جس میں محبت بھی تھی اور تشکر بھی۔

''اوکے میں اب چلتا ہوں۔ واپسی عصر تک ہوگی۔ کھانے پر انتظار مت کیجیے گا۔ ڈنر ان شاء اللہ آپ کے ساتھ۔'' اس نے محبت اور عقیدت سے اس کا ہاتھ پہلے ہونٹوں سے لگایا اور پھر آنکھوں سے۔

''اللہ کے حوالے......''

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں تاکہ کچن میں اپنی نگرانی میں کھانا تیار کرواسکیں اور زمان شاہ کو کوئی شکایت نہ ہو۔

☆......☆......☆

''تمہارے ابا نے آج ہی آنے کا کہا تھا نا زیب......'' زہرا بتول نے زیب النساء کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی اماں۔ آج ہی آنے کو کہا تھا۔''

زیب النساء جو تکیے سے ٹیک لگائے نسیم حجازی کا کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ ہڑبڑا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند دن پہلے ہی وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی اور استانی جی کے گھر سے یہ ناول لے کر آئی تھی۔ اسے تاریخی ناول پڑھنا پسند تھا۔ نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے ناول بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ یہ شوق اسے فاطمہ باجی کو دیکھ کر ہوا تھا۔ پہلی بار فاطمہ باجی نے ہی اسے آٹھویں کے امتحان کے بعد ایک تاریخی ناول پڑھنے کو دیا تھا۔

''رشید اختر ندوی کا ''یلغار''، زیب! یہ تاریخی ناول ہے۔ آج کل فارغ ہو تو انہیں پڑھو۔ اردو بھی اچھی ہوگی اور کچھ تاریخ کا بھی علم ہوگا۔'' یوں بادشاہوں اور شہزادیوں کی کہانیوں کے بجائے اس نے جو پہلی چیز پڑھی تھی، وہ یہ تاریخی ناول تھا اور تب سے ہی اسے تاریخی ناول پڑھنے کا چسکا پڑا تھا۔ جب بھی فرصت ملتی وہ استانی جی کے گھر سے کوئی نہ کوئی ناول لے آتی تھی۔ ان کے گھر دو بڑی بڑی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے ناول تکیے کی سائیڈ پر اوندھا کر کے رکھ دیا۔

"لیکن شام تک ہی آئیں گے نا۔"

"ہاں اگر صبح سویرے وہاں سے نکلیں تو بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

زہرا بتول کمرے میں موجود دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے زیب، تمہارے نانا تمہارے ابا کے ساتھ آئیں گے؟"

"ہاں اگر ابا نے کہا ہے کہ وہ نانا کو لے کر آئیں گے تو وہ ضرور لے کر آئیں گے۔ ابا کبھی کوئی ایسا وعدہ نہیں کرتے اماں، جو پورا نہ کر سکیں۔" زیب النساء نے اسے یقین دلایا۔

اور یہ یقین تو اسے بھی تھا کہ عبدالعزیز وعدہ کر کے نبھانے والوں میں سے ہے۔ تین سال پہلے انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ چھٹیوں میں، بہاول پور جا کر امیر الدین چاچا سے مل کر ان کی خیر خیریت معلوم کر کے آئیں گے اور آئندہ کبھی اپنے اس فرض میں کوتاہی نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ گزرے تین سالوں میں وہ تین بار بہاولپور گئے تھے اور خط تو ہر دو تین ماہ بعد امیر الدین کی دکان کے پتا پر لکھتے۔ مختصر سا خط خیریت موجود خیریت مطلوب والا خط وہاں سے بھی مختصر جواب آ جاتا کہ یہاں سب خیریت ہے، امید ہے وہاں بھی ہوگی۔ اور زہرا بتول اس پر ان کی بہت ممنون ہوئی تھی کہ اسے اپنے ابا اور بھائیوں کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ سوتیلے ہی سہی، پر تھے تو بھائی ہی نا۔ سگے بھائی کا تو کچھ اتا پتا نہیں چلا تھا۔

عبدالعزیز نے بہاول پور میں سب سے پوچھا تھا کہ کیا خبر کسی نے کہیں دیکھا ہو۔ لیکن زہرا بتول کے شہزادے بھائی کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ امیر الدین نے بتایا تھا کہ ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ اس نے اسے لاہور کی سبزی منڈی میں، مزدوری کرتے دیکھا ہے لیکن جب وہ بتانے والے دوست کے ساتھ لاہور منڈی میں گئے تو کہیں سے کچھ پتا نہ چل سکا۔ ایک دو بندوں نے بتایا کہ سترہ اٹھارہ سال کا ایک لڑکا کچھ دن یہاں مزدوری کرتا رہا پھر پتا نہیں کہاں چلا گیا۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں اماں؟"

"کچھ نہیں بس یوں ہی تیرے ماموں کا خیال آ گیا تھا۔ اماں کتنے ناز اٹھاتی تھیں اس کے، جانے کہاں دھکے کھاتا ہوگا۔ بھلے اماں زرینہ اسے مارتی تھیں لیکن ابا بھی تو تھے وہاں اور میں بھی...... ابا

تھوڑا بہت اس کا تو خیال رکھتے ہی تھے۔ تھوڑا بہت صبر کر لیتا اماں کی مار برداشت کر لیتا تو......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''گھر تو محفوظ پناہ گاہ ہوتے ہیں زیب! گھر سے نکل کر تو بچے رل ہی جاتے ہیں اور عمر ہی کتنی تھی اس کی تب، نو دس سال......'' اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ زیب النساء کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن لفظوں میں اماں کو تسلی دے۔ اماں کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں تھا نہ اس کے پاس نہ ابا کے پاس تو اس نے زہرا بتول کا دھیان بٹانا چاہا۔

''نانا پہلی بار مجھے دیکھیں گے۔ وہ حیران تو ہوں گے نا مجھے دیکھ کر۔''

''تمہارے ابا نے انہیں بتا رکھا ہے تمہارے متعلق، اور جب تم پیدا ہوئی تھیں تب بھی چاچا عبد الخالق نے فوراً ہی ابا کو خط لکھ دیا تھا۔ وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گے زیب! جب میری اماں زندہ تھیں تو وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور کہتے تھے بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ دل کے بہت قریب......'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے نم آنکھوں کو پونچھا۔

''اماں! نانا کیسے ہیں؟ کیا آپ کی شکل ان سے ملتی ہے؟'' اب وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں ابا کہتے تھے میں بالکل اپنی ماں کی طرح ہوں۔ وہی ناک نقشہ، ویسا ہی رنگ وروپ، قدبت......البتہ تمہارے ماموں کی ابا سے کافی مشابہت ہے۔''

''آپ اتنے سالوں بعد ابا سے ملیں گی اب تو وہ بوڑھے ہو گئے ہوں گے نا۔ فاطمہ باجی کے نانا کی طرح کچھ کچھ سفید بالوں والے۔'' وہ زہرا بتول کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''ہاں سترہ سال بعد، سترہ سال پہلے جب ابا نے مجھے ماسٹر صاحب کے ساتھ رخصت کیا تھا تب وہ جوان ہی تھے۔ سیاہ کالے بالوں میں ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ مجھے یہ تو نہیں پتا کہ ان کی عمر کتنی تھی تب لیکن بڑے شان دار لگتے تھے ابا۔ دھوبی کے دھلے کلف لگے کپڑے۔ سیاہ گھنی مونچھیں۔ اب تو بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ سیاہ بالوں میں سفید بالوں کی چاندی چمکتی ہو گی۔ میں بوڑھی ہو گئی ہوں تو وہ بھی بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔'' زہرا بتول کی بات سن کر زیب النساء کو ہنسی آ گئی۔

"آپ بوڑھی ہیں اماں؟ بھلا بوڑھے آپ جیسے ہوتے ہیں؟ کتنی عمر ہو گی آپ کی؟ سولہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی اور سترہ سال آپ کی شادی کو ہو گئے۔ تو بھلا آپ کہاں سے بوڑھی ہوئیں۔ وہ شہر سے جو ہماری حساب کی استانی آئی تھیں، عمر میں وہ آپ سے بھی بڑی تھیں۔ کیسے اونچی ہیل والی جوتی پہنتی تھیں اور شوخ رنگوں کے کپڑے، کانوں میں یہ بڑے بڑے بالے۔ لڑکیاں کہتی تھی ابھی چند ماہ پہلے ان کی منگنی ہوئی ہے اور شادی چھٹیوں میں ہو گی۔"

"ساری بات تو اپنے دل کی ہوتی ہے نا زیب النساء۔ عمر اپنی جگہ پر لیکن دل جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے۔" اس نے ٹانگیں اوپر کر لی تھیں اور تکیے سے ٹیک لگا لی تھی۔

"اور آپ کا دل کیا کہتا ہے آپ سے کہ آپ بوڑھی ہو گئی ہیں؟" مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

"میرا دل کہتا ہے کہ میں تمہاری شادی کر دوں اور شادی کے بعد، جب تمہارے بچے ہوں گے تو میں نانی بن جاؤں گی۔ اور نانیاں دادیاں تو پھر بوڑھوں میں ہی شمار ہوتی ہیں نا۔" وہ زیب النساء کو دیکھ رہی تھی۔

زیب النساء شرما گئی۔

"آپ بھی نا اماں! مجھے تو ابھی شادی نہیں کرنی، پڑھنا ہے۔ پڑھ کر میں یہاں اپنے ہی سکول میں پڑھاؤں گی۔ ابا کی طرح استاد بننا ہے مجھے۔"

"پر میرا دل نہیں مانتا زیب! تجھے ایک دوسرے شہر بھیجنے کا۔ جتنا پڑھ لیا ہے اتنا کافی نہیں ہے کیا۔"

"نہیں اماں! میٹرک تک کی تعلیم تو بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ میں اکیلی تھوڑی ہوں گی۔ فاطمہ باجی کو جب صادق آباد میں جاب ملی تھی تو تب ہی انہوں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ تم میرے پاس رہ کر میرے ہی کالج میں پڑھنا۔ بس میرا رزلٹ آ جائے۔"

"نمبر اچھے ہوں اور مجھے فاطمہ باجی کے کالج میں داخلہ مل جائے۔ آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔ کریں گی نا؟"

اس کی سوالیہ نظریں زہرا بتول کی طرف اٹھیں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ تو ہر ہر لحہ اس کے لیے دعا کرتی تھی لیکن اچھے نمبروں کے لیے نہیں بلکہ اچھے رشتے کے لیے...... وہ دعا کرتی تھی کہ اللہ زیب النساء کا نصیب بہت اچھا کرے۔ اسے قدر کرنے، عزت کرنے والے اور محبت کرنے والے لوگوں سے واسطہ پڑے۔ زہرا کو آپا رسولاں کا بیٹا بہت اچھا لگتا تھا۔ چھوٹی سی فیملی۔ آپا رسولاں، اس کا بیٹا اور بیاہی بیٹی، لیکن تب زیب النساء تو آٹھویں میں پڑھتی تھی اور آپا رسولاں کو جلدی تھی۔ اگر وہ دو سال انتظار کر لیتیں تو وہ ماسٹر صاحب کو راضی کر ہی لیتی۔

بھلا اس سے بہتر بر یہاں اس گاؤں میں کہاں تھا زیب النساء کے لیے۔ ان کے ہم پلہ لوگوں میں تو کہیں نہیں۔ رہے بڑے زمین دار تو وہ بھلا ایک غریب ماسٹر کے گھر کیوں رشتہ کریں گے۔ تو بس وہ بہت دعائیں کرتی تھی کہ اس کی زیب کے لیے کوئی شہزادہ ہی کہیں سے آ جائے جیسے ماسٹر صاحب آئے تھے میرے لیے۔

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی۔

☆......☆......☆

وقت کتنی جلدی گزر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو، جب چاچا عبدالخالق نے زیب النساء کے کان میں اذان دے کر اسے اس کی گود میں ڈالا تھا اور وہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ چاچا عبدالخالق نے کہا تھا۔

"ماشاءاللہ ہمارے گھر تو جیسے آسمان سے پری اتر آئی ہے۔"

اور وہ پریوں جیسی ہی تو تھی۔ اتنی خوب صورت، اتنی پیاری کہ وہ نظر لگ جانے کے ڈر سے اسے نظر بھر کر دیکھتی بھی نہ تھی۔

وہ جب پہلی بار چارپائی پکڑ کر کھڑی ہوئی تھی جب ڈولتی ہوئی چلی تھی، جب پہلی بار اماں اور پھر ابا کہا تھا۔ اور جب پہلی بار چھوٹا سا بستہ کندھے پر لٹکائے ماسٹر صاحب کی انگلی پکڑے اسکول گئی تھی۔ سب مناظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ اور اب اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ سولہ سال کی ہو گئی تھی۔

آج کل یا کچھ مہینوں بعد، اس کی شادی ہو جائے گی وہ اس گھر سے رخصت ہو جائے گی۔

اس نے ماسٹر صاحب سے کہہ دیا تھا وہ چاہتی ہے کہ زیب النساء کی اب شادی ہو جائے۔

''اپنے دوستوں اپنے ملنے جلنے والوں سے کہیں نا کہ ہماری زیب کے لیے کوئی اچھا رشتہ ہو تو بتائیں۔''

''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے زہرا! جب اللہ کو منظور ہوگا تو ہو جائے گی اس کی بھی شادی۔ ابھی پڑھ تو لے۔''

ماسٹر صاحب اس کی جلد شادی کے حق میں نہ تھے۔

''پتا نہیں کیوں...... لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میں اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گی۔ اور میں اپنی زندگی میں ہی اس کو اپنے گھر میں ہنسی خوشی بستے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

پچھلے دو سال سے اس کی طبیعت کافی خراب تھی۔ نقاہت اور کمزوری تو پہلے بھی کبھی کبھی بہت محسوس ہوتی تھی۔ تھوڑا سا کام کر کے تھک جاتی تھی۔ لیکن پچھلے دو سالوں میں وہ بہت بیمار رہی تھی۔ کبھی بخار ہو جاتا، کبھی سانس کی تکلیف شروع ہو جاتی۔ چند قدم چلنے سے سانس پھولنے لگتا تھا۔

ماسٹر عبدالعزیز انہیں رحیم یار خان لے کر گئے تھے۔ بڑے اسپتال کے علاوہ کئی پرائیوٹ ڈاکٹروں کو بھی دکھایا تھا۔ بے شمار ٹیسٹ ہوئے تھے۔ کوئی ایسی خطرناک بیماری تو نہ تھی۔ سب نے یہ ہی کہا کہ خون کی کمی ہے۔ ڈھیروں دوائیاں، سیرپ، فروٹ...... کسی سے کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا۔ ماسٹر عبدالعزیز خود ہر روز انار کا جوس نکال کر دیتے تھے۔ خاص اس کے لیے انہوں نے لاہور سے جوس نکالنے والی مشین منگوائی تھی۔ انار کا موسم نہ ہوتا تو دوسرے موسمی پھلوں سے دن میں دو بارہ جوس بنا کر اسے دیتے تھے۔ کچھ دن آرام رہتا، چہرے کی رنگت بہتر ہو جاتی لیکن پھر کچھ دنوں بعد نقاہت ہونے لگتی۔ چند دن پہلے کسی نے ماسٹر عبدالعزیز کو بتایا تھا کہ راجن پور میں ایک حکیم ہے بڑا ہی سیانا۔ نبض دیکھ کر مرض کی نوعیت بتا دیتا ہے۔ اور انہوں نے راجن پور جا کر اس حکیم سے اس کا علاج کروانے کا سوچا تو اس نے منع کر دیا۔

''مرض الموت کا بھی کوئی علاج ہوتا ہے ماسٹر صاحب، خوامخواہ وقت اور پیسے کا زیاں......''

اور ماسٹر عبدالعزیز اس سے ناراض ہو گئے تھے۔

''ماسٹر صاحب ناراض نہ ہوا کریں۔ آپ کی ناراضی میرا دل چیر دیتی ہے۔''

''تو پھر ایسی دل چیر دینے والی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''کیا کروں ماسٹر صاحب پتا نہیں کیوں دل اندر سے بجھتا جا رہا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے آپ بہاول پور سے ہو کر آ جائیں تو پھر راجن پور لے جایئے گا۔ جب سانسیں پوری ہو جائیں تو پھر حکیم بھی کیا کرلے گا پر آپ کی خوشی کے لیے...... حکیم کو بھی دکھا لیتی ہوں۔''

وہ ماسٹر عبدالعزیز کی کسی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بس کبھی کبھی بے ارادہ خود بخود ہی منہ سے ایسی بات نکل جاتی تھی۔

''ٹھیک ہے میں معلومات لیتا ہوں، ہیڈ ماسٹر صاحب سے۔ کافی دن ہو گئے ہیں امیر الدین چاچا کو خط لکھا تھا جواب نہیں آیا، اور مجھے بھی گئے ہوئے نو دس ماہ تو ہو ہی گئے ہیں۔ تو پہلے بہاول پور کا چکر لگا آؤں۔''

ماسٹر عبدالعزیز کو اب خیال رہتا تھا کہ امیر الدین کی خیر خیریت معلوم ہوتی رہے۔

''ماسٹر صاحب اٹھارہ سال ہو گئے ہیں ابا سے جدا ہوئے۔ بڑا دل چاہتا ہے مرنے سے پہلے ایک بار ابا کو دیکھ لوں۔ پتا نہیں کیسے ہو گئے ہوں گے۔''

لہجے کی حسرت نے ماسٹر عبدالعزیز کو تڑپا دیا۔

''وعدہ کرتا ہوں زہرا بتول، اس بار چاچا کو ساتھ لے کر آؤں گا۔''

''پتا نہیں ابا آئیں گے بھی یا نہیں......'' مایوسی سے اس نے ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا

''کیوں نہیں آئیں گے؟'' ماسٹر عبدالعزیز نے یقین دلایا۔ ''پچھلی بار بھی وہ میرے ساتھ آنے کو تیار ہو گئے تھے۔ یوں بھی دکان پر اب ان کے ساتھ رضوان بھی بیٹھتا ہے تو دو تین دن کے لیے آ سکتے تھے۔ کہتے تھے اب یہ فکر نہیں ہے کہ میرے جانے کے بعد دکان بند رہے گی۔ لیکن اللہ کو ہی تب منظور نہیں تھا کہ رضوان اپنے موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ کر کے ٹانگ تڑوا بیٹھا تھا۔''

''ہاں......!'' اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ پر ماسٹر صاحب مجھ سے آج ایک اور وعدہ کریں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو دوسری شادی سے پہلے میری زیب کی شادی کر دیجیے گا۔ میں نہیں چاہتی میری بیٹی بھی وہ ہی دکھ اٹھائے جو میں نے اٹھائے تھے۔ اماں زرینہ جب مجھے جوتوں اور کپڑے دھونے والے ڈنڈے سے مارتی تھی، تو مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ بہت چھوٹی تھی اور اماں مجھے رونے بھی نہیں دیتی تھی اور ڈراتی بھی تھی کہ اگر ابا کو بتایا تو اور ماروں گی۔ میرا شہزادہ بھائی ان کی مار سے بھاگ گیا۔ پھر مڑ کر آیا ہی نہیں۔''

اور ماسٹر صاحب نے پھر منہ پھلا لیا تھا۔

''تم یہ فضول باتیں کرنا چھوڑ نہیں سکتی ہو زہرا؟''

''تمہیں کچھ نہیں ہونے والا...... بلکہ ایسا کرتے ہیں ہم کل ہی راجن پور چلتے ہیں۔ بہاول پور بعد میں جائیں گے۔''

''یہ فضول باتیں نہیں ہیں ماسٹر صاحب! زندگی کی حقیقت یہ ہی ہے۔ حامد کے بعد آپ کا دل تو چاہتا ہو گا نا کہ آپ کا بیٹا ہو آپ کا نام لیوا تو میرے بعد شادی......''

''میری نام لیوا ہے نا میری بیٹی......'' ماسٹر عبدالعزیز نے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''اور میں نے کبھی بیٹا نہ ہونے کا شکوہ نہیں کیا۔ اللہ نے دیا، لے لیا اس کی مرضی...... اور کبھی تم سے کہا کہ مجھے بیٹے کی خواہش ہے۔''

''نہیں آپ نے کبھی نہیں کہا۔ یہ آپ کی بڑائی ہے ماسٹر صاحب! پر کس کا جی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنی نعمت سے نوازے۔ تو میں چاہتی ہوں کہ آپ......''

''بس اب اور کوئی فضول بات نہیں سنوں گا زہرا...... تم تیاری کرو۔'' انہوں نے اسے مزید بات کرنے سے روک دیا تھا۔

''صبح راجن پور زیب کو بھی ساتھ ہی لے چلیں گے۔ استانی جی تو اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی ہیں اور کسی کے گھر جوان بیٹی کو چھوڑ کر جانے کا دل نہیں کرتا۔''

''نہیں ماسٹر صاحب! ابا کے لیے یہ دل بہت تڑپتا ہے آج کل۔ آپ پہلے بہاول پور جائیں

اور ابا کو لے کر آئیں۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا لیکن تین چار ماہ سے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے کہ اڑ کر ابا کے پاس پہنچ جاؤں۔''

ملتجی نظریں ماسٹر عبدالعزیز کی طرف اٹھیں تو انہوں نے بے اختیار اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''تم مجھے پہلے ہی کہہ دیتیں زہرا! میں تب ہی چلا جاتا بہاول پور اور چاچا کو جا کر لے آتا وہ بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ بے شک زبان سے نہ کہیں، لیکن میں جتنی بار ان سے ملا، میں نے ان کی آنکھوں میں تمہارے لیے تڑپ دیکھی۔''

''مجھے ابا سے کوئی گلہ نہیں ہے ماسٹر صاحب! آپ انہیں بتا دیجیے گا میں ان سے راضی ہوں۔'' وہ مدھم سا مسکرائی تھیں۔

''ابا نے میرے لیے جو قدم اٹھایا شاید کوئی عام باپ ایسا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکتا۔ ماسٹر صاحب میرے دل سے تو ہر وقت ابا کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ پر بیٹی ہوں نا بہت دل چاہتا ہے مرنے سے پہلے ایک بار ابا کو دیکھ لوں۔ حالانکہ آپ کو یاد ہے نا ابا نے کہا تھا۔ آج کے بعد بھول جانا کہ تمہارا اس شہر سے کوئی تعلق یا مجھ سے کوئی رشتہ تھا۔ کبھی بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرنا اور میں نے اٹھارہ سال ابا کا حکم مانا پر اب......''

آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور ماسٹر عبدالعزیز نے اس بار، اپنی موت کا ذکر کرنے پر اسے ٹوکا نہیں تھا۔ بیماری نے اسے شاید وہمی اور کمزور کر دیا تھا۔

''ماسٹر صاحب! کیا ہی اچھا ہوتا جو آپ آپا رسولاں کو منع نہ کرتے۔ مجھے آپا رسولاں کا بیٹا بہت پسند تھا۔''

ان دنوں وہ اکثر زیب النساء کی شادی کا ذکر کرنے لگی تھی۔ ماسی نور بھری کو تو اس نے بتا دیا تھا کہ ماسٹر صاحب زیب النساء کی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے۔

''جلدی تو مجھے بھی کوئی نہیں ہے۔ کون سا میرا اسلم بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں تو بس تسلی چاہتی تھی کہ ماسٹر صاحب ہاں کر دیں کہ زیب میری ہی بہو بنے گی۔ خیر ابھی تو اسلم بھی چلا گیا ہے صادق آباد اپنے دوست کے ساتھ مل کر کاروبار کرے گا اس کا کام چل جائے تب تک زیبو بھی دس پڑھ لے گی۔''

چوہدری عبدالمالک کی کوشش سے مڈل اسکول ہائی ہوگیا تھا اور اس کی سب سے زیادہ خوشی زہرا بتول کو ہی تھی۔ یہ تو بعد میں ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ اسلم ساتھ والے گاؤں سے مراثیوں کی لڑکی بھگا کر لے گیا ہے اور وہ حیران ہوئی تھی کہ بیٹے کے ایسے کرتوت اور ماں رشتے مانگتی پھر رہی ہے۔

''اب آپا رسولاں کے بیٹے کو بھول جاؤ زہرا بتول۔ دیکھنا ہمارا داماد آپا رسولاں کے بیٹے سے بھی اچھا ہوگا۔ ہماری شہزادی کے لیے کوئی شہزادہ ہی آئے گا ان شاء اللہ!''

''حقیقی زندگی میں شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر نہیں آتے ماسٹر صاحب!''

اور وہ مسکرا دیے۔

''چلو گاڑی پر سوار ہو کر آجائے گا۔''

اور اسے ماسٹر عبدالعزیز کی سادگی پر حیرانی ہوتی۔ بھلا اس چھوٹے سے گاؤں میں اس کی بیٹی کے لیے کسی شہزادے کا رشتہ کہاں آنا تھا۔

''بس تم میری بیٹی کو سکون سے پڑھنے دینا۔ پھر اس کا جو مقدر......''

''اتنی دیر سے خلاؤں میں تکتے ہوئے کیا سوچ رہی ہیں اماں؟'' زیب النساء جو خاموشی سے ماں کو سوچوں میں کھوئے دیکھ رہی تھی، بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''ہاں...... کچھ نہیں۔'' زہرا بتول چونکی۔

''بس سوچ رہی تھی ابا کو کھانے میں کیا پسند ہے۔ کیا بنائیں جو ابا کو بہت پسند آئے۔ ویسے تو میں نے نیاز بھائی کو صبح کہہ دیا تھا۔ جب وہ پوچھنے آئے تھے کہ کیا منگوانا ہے۔''

''کیا کہہ دیا تھا اماں؟'' زیب النساء نے پوچھا۔

''مرغ کا گوشت کہا تھا اور سوجی بھی۔ مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے وہ اماں سے فرمائش کر کے حلوہ پکواتے تھے۔ تمہاری سہیلی نے صبح شامی کباب بھیجے تھے وہ بھی رکھ دیں گے۔ ہم دونوں ماں بیٹی دن میں رات کی بچی ہوئی سبزی کھالیں گے۔''

''ٹھیک ہے اماں، میں پکالوں گی سب آپ آرام کریں۔ نیاز چاچا آنے ہی والے ہوں گے اتنی دیر میں پیاز وغیرہ کاٹ لیتی ہوں۔'' زیب النساء اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابا تو شام تک ہی آئیں گے۔ میں پکالوں گی جب تک نیاز بھائی سودا لائیں گے تب تک تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتی ہوں۔ پتانہیں کیوں نیند سی آرہی ہے۔''

وہ تکیہ سیدھا کرکے لیٹ گئی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''شاید چاچا نیاز آگئے ہیں۔ اماں، آپ فکرمت کرنا میں پکالوں گی۔ اور دیکھنا نانا کو بہت پسند آئے گا میرا بنایا ہوا کھانا۔ آپ سے ہی تو سیکھا ہے میں نے۔''

اسے تسلی دیتی ہوئی زیب النساء کمرے سے باہر چلی گئی اور زہرا بتول کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ زیب النساء بہت اچھا کھانا بنالے گی۔ آخر پچھلے چند ماہ سے تو وہ ہی سب کررہی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ اپنے ابا کے لیے اپنے ہاتھ سے کچھ پکائے۔

چلو آج نہ سہی، تو کل ضرور کچھ اپنے ہاتھوں سے بناؤں گی۔ ابا پلاؤ بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ماسٹر صاحب سے کہوں گی نیاز بھائی کو شہر بھیج کر بکرے کا گوشت منگوادیں۔ یخنی پلاؤ کے ساتھ میٹھے چاول بھی بنالوں گی۔ ابا کی پسندیدہ چیزوں کے متعلق سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موندلیں۔

ماسٹر عبدالعزیز جب گھر میں داخل ہوئے تو پورے گھر میں مرغی بھوننے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اور دھوپ پورے صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ وہ صحن عبور کرکے سیدھے کچن میں آئے تھے۔ زیب النساء لکڑیاں بمشکل جلاپاتی تھی اس لیے وہ زیادہ کام مٹی کے تیل والے چولہے پر کرتی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے اس کے لیے نئے ڈیزائن کا تیل والا چولہا بھی منگوایا تھا۔ اگرچہ ایک چولہا پہلے بھی تھا۔ زیب النساء نے آہٹ پر مڑکر دیکھا اور ماسٹر عبدالعزیز کو دیکھ کر حیران ہوئی۔

''ابا! آپ......؟''

''ہاں......'' ماسٹر عبدالعزیز نے ہاتھ میں پکڑا اسفری بیگ باورچی خانے میں پڑی چوکی پر رکھا تو صافی سے پکڑ کر زیب النساء نے دیگچی چولہے سے اتار کر نیچے رکھی اور کھڑی ہوگئی۔

''السلام علیکم ابا!''

''جیتی رہو بیٹی۔'' سلام کا جواب دے کر انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے پنجوں کے بل ذرا سا اونچا ہوکر ان کے کندھے کے اوپر سے باہر دیکھا۔

''نانا نہیں آئے؟''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں رات بہت دیر سے رحیم یار خان پہنچا تھا اس وقت چک کے لیے کوئی سواری نہیں ملی تو ابا کے دوست کی طرف چلا گیا۔ وہ ہی جنہوں نے ابا کی دکان خریدی تھی۔ صبح ناشتہ کر کے نکلا ہوں رحیم یار خان سے۔''

انہوں نے خود ہی بتا دیا تھا ورنہ وہ اب پوچھنے ہی والی تھی کہ وہ اس وقت کیسے آ گئے، ورنہ ہمیشہ تو وہ مغرب کے وقت ہی گاؤں پہنچتے تھے۔

''اماں کہاں ہیں تمہاری؟''

''بڑے کمرے میں لیٹی ہوئی ہیں۔ صبح سے نانا کا انتظار کر رہی تھیں۔ بہت مایوس ہوں گی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا نا تو کسی نہ کسی طرح نانا کو لے ہی آتے۔ اماں کو یقین تھا آپ کے وعدے پر۔'' اس نے جھک کر بیگ اٹھایا تا کہ ابا کے کمرے میں رکھ سکے۔

''لا سکتا تو ضرور لاتا سوہنی پر......'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''مجھے دیر ہو گئی۔ تمہارے نانا ایسے سفر پر چلے گئے جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔''

''نہیں......!'' زیب النساء نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''مجھے تمہارے نانا کے پاؤں بھی پکڑنے پڑتے نا تو میں تمہاری اماں سے کیا وعدہ ضرور نبھاتا۔ پر وہ تو تین ماہ ہوئے اس دنیا سے چلے گئے۔ تمہارے ماموں رضوان نے بتایا کہ ایک رات سوئے تو صبح اٹھے ہی نہیں۔ شاید سوتے میں ہی دل بند ہو گیا تھا۔''

ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ اس نے نانا کو کبھی دیکھا نہیں تھا، کبھی ملی نہیں تھی لیکن پھر بھی دل، درد سے بھر گیا تھا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے کہ خون کا تعلق تو تھا نا۔

''اماں کو بہت دکھ ہو گا ابا! وہ بہت روئیں گی۔ پہلے تو کبھی اتنا یاد نہیں کیا تھا انہوں نے نانا کو لیکن پچھلے تین چار ماہ سے وہ نانا کو بہت یاد کرتی تھیں۔ بہت باتیں کرتی تھیں مجھ سے نانا کی۔'' اس نے پھونک مار کر چولہا بجھایا۔

''یہ خون کے رشتے بھی عجب ہوتے ہیں زیبی! سینکڑوں میل دور بیٹھے بھی دل کو خبر ہو جاتی ہے کہ ہمارے پیاروں کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔'' انہوں نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور باورچی خانے سے باہر نکل گئے۔ زیب النساء خاموشی سے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ برآمدے کے پاس رک کر اس نے پوچھا۔

''آپ اماں کو بتا دیں گے کہ نانا......''

''ہاں...... خوامخواہ اسے جھوٹی آس کیوں دلاؤں زیب النساء...... پھر سے انتظار کی سولی پر لٹکا دوں...... نہیں!'' وہ کمرے میں داخل ہو گئے اور زیب النساء برآمدے میں ہی چارپائی پر بیٹھ گئی کہ اس میں اماں کی مایوسی دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کیسے اماں کی آنکھوں میں اٹھارہ سال سے جلتے انتظار کے دیئے بجھتے دیکھے گی۔ کیسے......؟

اندر کمرے میں زہرا دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی تھیں۔

''زہرا......!'' ماسٹر عبدالعزیز نے آہستگی سے آواز دی۔ لیکن زہرا کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔

''زہرا! تمہیں تو میرے گلی میں داخل ہوتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ میں آیا ہوں تو آج کیا تمہارے دل نے میرے آنے کی خبر نہیں دی؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''زہرا......!'' بے اختیار ہاتھ پیشانی پر ٹکا۔ ٹھنڈی یخ پیشانی تھی۔ موت کی خنکی ان کے اندر اترتی چلی گئی۔

''نہیں......!'' وہ چیخے۔

''نہیں زہرا......! تم ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔'' وہ چیخے اور پھر چیختے ہی چلے گئے۔

❁ ❁

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 4

''ہم کتنے خود غرض ہیں آزین۔'' زمل اپنی مخصوص جگہ یعنی سیڑھیوں پر بیٹھی صحن میں اور کیاریوں میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ اوپر سے آتے ہوئے اس کے پیچھے والی سیڑھیوں پر بیٹھنے والا آزین ہی ہے۔

''اوہ ہاں...... وہ کیسے...... کیا خود غرضی کی ہے ہم نے؟''

''ہم نے شیخو بابا کے متعلق کبھی نہیں سوچا زین! کیسی بے مقصد اور بے کار سی زندگی گزار رہے ہیں وہ۔ کسی چھوٹے کی سی۔ کیا ساری زندگی وہ ایسے ہی گزار دیں گے۔ دوڑ دوڑ کر سب کے کام کرتے ہوئے۔ دوپٹے رنگواتے، سبزی لاتے، درزی کی دکان کے چکر لگاتے۔''

اس نے ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

''ڈیوڑھی میں چوکیدار کی طرح چارپائی پر لیٹے اور بیٹھے۔ ان کا بھی تو حق ہے نا زین! کہ وہ زندگی کو اس طرح جئیں جیسے سب جیتے ہیں۔ ان کا بھی ایک گھر ہو، بیوی بچے ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم نے واقعی کبھی ان کے متعلق نہیں سوچا۔ لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں ان کے لیے؟'' وہ اب اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''کیوں ممکن نہیں زین؟'' وہ پرجوش ہوئی۔ ''میں دادا جان سے بات کرتی ہوں۔ وہ تایا جان سے بات کر کے ان کو کارخانے میں ملازمت دلوا دیں۔ انہوں نے نو دس سال کی عمر سے لے کر اب تک کی ساری زندگی ہماری اس ڈیوڑھی میں گزاری ہے۔ وہ شاہ رخ بھائی کے ہم عمر ہوں گے یا ان سے کچھ چھوٹے یا کچھ بڑے۔ شاہ رخ بھائی کی شادی ہو رہی ہے تو کیا ان کی بھی اب شادی نہیں ہو جانی چاہیے؟''

''تو کیا وہ اپنی دلہن کو ڈیوڑھی میں رکھیں گے؟'' آزین ہولے سے ہنسا۔

اور عین اسی لمحے سحرش نے ریلنگ سے جھانکا۔

وہ دونوں برڈز کی طرح ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور آزین شاید ہنس رہا تھا۔

''اس خاندان کا سب سے اچھا پیس تو یہ زل لے اڑی ہے۔'' سحرش نے دانت پیسے۔

''تم ضرور کسی دن ان کو نظر لگا دو گی۔'' مہرین کچن سے چائے کا کپ اٹھائے باہر نکلی۔ اور لمحہ بھر کے لیے اس کے پاس ٹھہر کر جھانک کر سیڑھیوں پر بیٹھے زل اور آزین کو دیکھا اور پھر ریلنگ کے پاس سے ہٹتے ہوئے غور سے سحرش کو دیکھا۔

''یہ تم آج کل کیوں مرچیں چبا رہی ہو؟''

''تمہیں تو جیسے پتا نہیں ہے نا۔'' سحرش بھی ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر برآمدے میں موجود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''نہیں مجھے سچ میں نہیں پتا۔'' مہرین کپ اٹھائے اس کی کرسی کے پاس کھڑی تھی۔

''وہ رشتے والی ماسی ایک سے بڑھ کر ایک نمونے کا رشتہ لا رہی ہے۔'' ماتھے پر بل پڑے تھے۔

''کس کے لیے......؟'' مہرین نے بے وقوفی سے پوچھا۔

''احمق...... میرے لیے، میرے علاوہ اور کون بچا ہے یہاں۔ اماں کو ایک دم خیال آیا ہے کہ مرتضٰی بھائی اور تمہاری شادی کے ساتھ مجھے بھی بھگتا دیں سو دھڑا دھڑ رشتے دیکھ رہی ہیں۔ حد ہو گئی زیادتی کی یار۔ تم ڈاکٹر بن رہی ہو۔ ماہ وش اور شانزہ نے ماسٹر کیا اور میرا تو ابھی گریجویشن بھی نہیں ہوا۔''

وہ بی ایس کر رہی تھی۔

''دراصل تمہاری اماں تمہارے لیے شانزہ کے سسرال کی ٹکر کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ جب تک انہیں ایسا رشتہ ملے گا تب تک تمہارا ایم ایس سی ہو جائے گا۔''

مہرین کبھی کبھی پتے کی بات کر جاتی تھی۔

''سچ......؟''

سحرش کا خراب موڈ ذرا بہتر ہوا تھا۔ مہرین نے تسلی کے انداز میں اس کے بازو کو تھپتھپایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے بھی تخت پر پڑے شانزہ کے رسالوں کے ڈھیر میں سے ایک رسالہ اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

نیچے سیڑھی پر بیٹھی زمل کہہ رہی تھی۔

”ڈیوڑھی میں کیوں، یہاں کتنے ہی فالتو کمرے ہیں، کسی میں بھی رہ سکتے ہیں۔ اختر بانو پھپھو کا کمرا تو بالکل بی بی اماں کے کمرے کے ساتھ ہے اور پھپھو کون سا اب یہاں آتی ہیں۔

ویسے میرے ذہن میں ایک پلان اور بھی ہے۔ وہ جو پیچھے کوارٹر گرا کر دکانیں بنوائی تھیں، وہاں ان دکانوں کے اوپر فلیٹ بنوالیں۔ شینو بابا پہلے جاب کریں، کچھ پیسے اکٹھے کریں اور کچھ رقم دادا جان لگائیں۔ ظفریاب تایا سے بھی دادا جان کہہ سکتے ہیں شینو کی مدد کے لیے آخر وہ ہی تو لے کر آئے تھے انہیں یہاں اور بی بی اماں کہتی ہیں تب وہ کہتے تھے یہ بھی میرا بیٹا ہے۔“

”ہوں اچھا خیال ہے لیکن تم میرے ابا سے کسی مدد کی امید مت رکھو، جنہیں اپنے سگے بیٹے کا خیال نہیں، انہیں بھلا کسی دوسرے کا کیا خیال ہوگا۔“

زمل اس کی بات کی تردید کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ خوامخواہ اس کا موڈ خراب ہو جائے گا۔

اسے اپنے باپ سے بے حد بے حساب گلے تھے، حالانکہ ظفریاب کبھی اس سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ یہ تو وہ تھا جو خود ساختہ ناراضی کا چولا پہنے بیٹھا تھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد آزین نے بغور زمل کی طرف دیکھا۔

”خیر تم دادا جان سے بات کر کے دیکھ لینا، وہ ابا سے بھی بات کر لیں گے۔ مجھے تمہاری سوچ اچھی لگی زمل! واقعی ہم کچھ کچھ بے حس اور خود غرض لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی دوسروں کے متعلق نہیں سوچا ہمیں صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔ مفت کے نوکر ملے ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں امید کہ تایا جان انہیں ملازمت دیں کیونکہ ان کی ملازمت سے سب سے زیادہ فرق تو اوپر والوں کو ہی پڑے گا۔ ہر گھنٹے بعد تو

انہیں کوئی نہ کوئی کام پڑتا ہے۔ تائی جان کا بس چلے تو برتن دھونے اور جھاڑو پونچھا کرنے کا کام بھی ان کے سپرد کر دیں۔ میں مرسل کے بھائی جان سے بات کروں گا وہ کہیں نہ کہیں اٹکا دیں گے انہیں۔''

''بس ان کو ملازمت مل جائے تو پھر میں بی بی اماں سے کہوں گی ان کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈیں پھر ہم ان کی شادی کر دیں گے۔'' زمل خوش ہوگئی تھی۔

''دوسروں کی شادی کی بہت فکر ہے تمہیں، بس میرا خیال ہی نہیں ہے۔'' آزین نے چہرے کے تاثرات سے ناراضی کا تاثر دیا۔

''تو کیا میں دادا جان سے کہوں کہ آزین اور میری شادی کر دیں، کیا مجھے کہنا ہے یہ؟'' بغیر سوچے سمجھے ہی اس کے لبوں سے نکلا تو آزین نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں تو پھر میں ہی بات کر لیتا ہوں دادا جان سے کہ سب کی شادیاں ہو رہی ہیں، ہماری بھی کریں۔''

زمل کے رخسار گل رنگ ہوئے اور پلکیں جھک گئیں۔ آزین نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''تو پھر بات کروں رخصتی کی اجازت ہے؟''

''فضول باتیں مت کرو زین۔'' اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ ''تمہیں پتا ہے نا، چند ماہ بعد میرے فائنل پیپرز ہیں تو پلیز۔''

''آہ!'' اس نے مصنوعی طور پر ٹھنڈا سانس لیا۔ ''ہماری ایسی قسمت کہاں، تم کرواؤ اپنے شینو بابا کی شادی۔''

''اچھا اب بنو نہیں۔'' اس نے بامشکل اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ ''یہ بتاؤ سیٹیں بک کروالی ہیں اور پھپھو کو بتا دیا ہے؟''

''سیٹیں تو بک کروالی ہیں لیکن پھپھو کو نہیں بتایا۔ سرپرائز دیں گے پھپھو کو۔ ویسے پھپھو سے آج صبح بھی بات ہوئی تھی۔ وہ پریشان ہو رہی تھیں کہ دادا جان سے بات نہیں ہو رہی تھی ان کی میں نے بتا دیا تھا کہ فون خراب ہے ہمارا۔''

''تو فون کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟'' اسے بھی ایک کلاس فیلو کو ضروری فون کرنا تھا۔

"کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔ سفارش کروائی ہے آج، ہو سکتا ہے آج ہی ہو جائے۔ تمہیں پتا تو ہے یہاں سفارش اور رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔"

"خیر ایسا بھی نہیں ہے زین! سینکڑوں لوگوں کے کام بغیر سفارش اور رشوت کے بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر چند لوگ برے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب ہی برے ہیں۔"

زمل اپنے ملک کے خلاف تو ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

"سارے ملکوں میں برائیاں ہوتی ہیں لیکن کوئی اپنے ملک کو برا بھلا نہیں کہتا لیکن یہ ہمارے ملک کے لوگ، جب دیکھو اپنے ہی ملک کی برائیاں کر رہے ہوتے ہیں۔"

"تقریر اچھی کر لیتی ہو زمل! ویسے میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔ میرا مقصد اپنے ملک کی برائیاں کرنا نہیں تھا۔ اب دیکھتے ہیں مجھے بغیر سفارش اور رشوت کے جاب ملتی ہے یا نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"ان شاء اللہ ضرور ملے گی۔ ویسے انٹرویو کب ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی ہیں دس دن، تب تک ہم پھپھو سے مل کر واپس آجائیں گے۔ تم دعا کرنا زمل! اس بار تو جاب مل ہی جائے گی۔"

"دعا تو میں کرتی ہی ہوں، اب بھی کروں گی لیکن اگر تمہیں جاب مل گئی تو تمہیں اسلام آباد میں رہنا پڑے گا۔ تم بتا رہے تھے نا دادا جان کو کمپنی کا ہیڈ آفس وغیرہ اسلام آباد میں ہے۔" وہ یک دم افسردہ ہو گئی تھی۔

"ہاں لیکن وہ لوگ اپنی کمپنی کی ایک برانچ یہاں لاہور میں بھی کھول رہے ہیں۔ کچھ سینیئرز ٹرانسفر ہو کر یہاں کی برانچ میں آئیں گے اور کچھ نئے لوگ رکھیں گے۔ اور کچھ نئے لوگ اسلام آباد ہیڈ آفس میں بھی اپائنٹ کریں گے۔ اب دیکھو جاب مل جانے کی صورت میں مجھے اسلام آباد ہیڈ آفس میں رکھیں گے یا یہاں لاہور کی برانچ میں۔"

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا جو افسردہ سی لگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ زمل اور اس کے درمیان نکاح کا مضبوط بندھن ہے۔ زمل اس سے محبت کرتی ہے۔ بچپن سے ہی دونوں میں دوستی کا رشتہ تھا لیکن اب نکاح کے بعد زمل کی کسی بات یا حرکت سے معمولی سا اظہار بھی اسے اندر تک شانت کر دیتا تھا۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اس کے اسلام آباد چلے جانے کے خیال سے افسردہ ہو رہی تھی۔ اور اس کی افسردگی اسے مطمئن کرتی تھی۔

''زمل!''

زمل نے اس کی طرف دیکھا۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں جب ہماری شادی ہوگی۔ تم اپنے کمرے سے رخصت ہو کر میرے کمرے میں آجاؤ گی تو کیسا لگے گا۔ کچھ عجیب سا، انوکھا سا، کچھ خوش کن سا، دل میں پھول کھلاتا سا۔''

اب وہ پورا کا پورا اس کی طرف مڑ گیا تھا۔

''کیا تم نے بھی کبھی سوچا جب ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو کیسا لگے گا؟''

''میں نے کبھی نہیں سوچا۔'' زمل نگاہیں جھکائے اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو نا۔ لڑکیاں تو بہت تصوراتی ہوتی ہیں۔ آنے والی زندگی کے متعلق نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں کہ ایک شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک دن اس کے محل کے دروازے پر دستک دے گا اور......'' اس کی شرارتی نظریں زمل کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''مجھے کسی شہزادے کا خواب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا شہزادہ تو پہلے ہی میرے پاس ہے۔'' ایک نظر اس پر ڈال کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر کچن میں گھس گئی۔ آزین وہیں بیٹھا رہا۔ مدھم سی مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

ان کی زندگی میں ایسے لمحے کم ہی آتے تھے جب کبھی فراغت سے بیٹھ کر، انہوں نے اس احساس کے ساتھ ایک دوسرے سے بات کی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے نکاح میں ہیں، ان کے درمیان ایک خوب صورت رشتہ ہے۔''

زمل کی اپنی مصروفیات اور پریشانیاں تھیں۔ آزین کی اپنی الجھنیں، پریشانیاں اور دکھ تھے۔ کبھی کبھی تو وہ زندگی سے ہی بے زار لگنے لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اماں، ابا دونوں ہی شادیاں کر کے اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھے۔ کسی نے اس کا خیال نہیں کیا، کسی

نے اس کے متعلق نہیں سوچا اور اپنی اپنی زندگی شروع کر دی۔ بس وہ رہ گیا اکیلا اور تنہا۔ اگر بی اماں، دادا جان اور مریم چچی نہ ہوتیں تو وہ تنہا کمرے میں ہی رو رو کر مر جاتا۔

بے حد، بے حساب گلے تھے......

اس کی زندگی کا سب سے خوش گوار اور اہم واقعہ زل سے اس کا نکاح تھا۔ جب زل سے اس کا نکاح ہوا تھا تب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زل سے محبت کرتا ہے۔ بے حد، بے حساب محبت......بس وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک دوسرے کا دکھ بٹاتے تھے۔ جب مریم چچی فوت ہوئیں تو زل صرف بارہ سال کی تھی اور وہ پندرہ سال کا۔ چھ سال پہلے جب وہ نو سال کا تھا اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ ماں کی جدائی اور باپ کی بے اعتنائی کے دکھ سے آشنا تھا۔ اس لیے اس نے زل کے درد کی شدت کو ایسے ہی محسوس کیا تھا جیسے وہ اس کا اپنا دکھ ہو۔ یوں وہ خود بھی تو مریم چچی سے بہت اٹیچڈ تھا۔ ان دنوں وہ کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

وہ روتی تو اس کے آنسو پونچھتا۔ اداس ہوتی تو ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں دنیا چھوڑ گئی تھی اور باپ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا، ملا تو خود سے بے گانہ تھا۔ اسے اپنا اور اس کا دکھ مشترک لگتا تھا۔

اور پھر جب ظفریاب نے یو کے کے لیے رخت سفر باندھا تو دادا جان نے، اس کا نکاح زل سے کر دیا۔ اس وقت زل کے لیے اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا۔ اور یہ تو نکاح کے دو سال بعد اسے لگا تھا کہ وہ تو زل سے محبت کرتا ہے۔ بے حد، بے حساب محبت اور اگر زل اس کی زندگی میں شامل نہ ہوتی تو شاید وہ سانس بھی نہ لے پاتا۔

اس روز اس نے مونا اور رخسانہ کو باتیں کرتے سنا تھا۔ مونا چچی کہہ رہی تھیں۔

”یہ ابا جان بھی نہ کسی سے مشورہ کرتے ہیں نہ کچھ پوچھتے ہیں اور خود ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ اب دیکھو نا، انہوں نے زل اور آزین کا نکاح کر دیا۔ ورنہ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ شانزہ کی شادی آزین سے ہو جائے گی۔ ماہ وش اور شاہ رخ کی تو بچپن سے طے ہے۔ مہرین کی میرے مرتضٰی سے، پیچھے رہ گئی سحرش اور تمہارا بلال تو ان دونوں کے لیے میں نے بھائی جان سے بات کرنے کا سوچ رکھا تھا۔“

''اور زمل کا کیا ہوتا؟'' یہ رخسانہ چچی تھیں۔

''زمل کی بھی کہیں شادی کروا دیتے ہم۔ وہ رقیہ آپا کا بیٹا ہے نا، ابا جان اسے پسند بھی بہت کرتے ہیں۔''

اور اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا تھا۔ نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زمل کے بغیر وہ کیسے جی پاتا اور وہ وہاں سے ہی واپس پلٹ آیا تھا اور اس روز اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو زمل سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اور یہ بات کتنی اطمینان بخش تھی کہ وہ اس کی منکوحہ تھی اور اس روز، اسے دادا جان پر بہت پیار آیا تھا کہ انہوں نے اس کے اور زمل کے نکاح کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا۔ حالانکہ جب دادا جان نے بتایا تھا کہ وہ اس کا زمل سے نکاح کر رہے ہیں تو وہ بہت جز بز ہوا تھا۔

''بھلا نکاح کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو میری شادی زمل سے کرنا ہے تو کر دیجیے۔ میں کوئی انکار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ اس وقت نکاح کی کیا ضرورت ہے۔''

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے آزین۔ ظفریاب کے باہر جانے سے پہلے میں یہ فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں زمل پسند نہیں ہے تو الگ بات ہے۔'' وہ بے حد سنجیدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''نہیں خیر ناپسند تو نہیں ہے۔ بس مجھے ابھی اتنی جلدی اچھا نہیں لگ رہا ہے تو۔'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح دادا جان کو اپنے احساسات سمجھائے جبکہ وہ خود بھی اپنے احساسات سے بے خبر تھا۔

دادا جان نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ظفریاب کے یو کے جانے سے پہلے اس کا نکاح کر دیا تھا۔ اگر دادا جان جلدی نہ کرتے تو میمونہ چچی ضرور کوئی گڑبڑ کرتیں، اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن دونوں جانتے تھے کہ دونوں کے درمیان ایک خوب صورت بندھن ہے۔

جب وقت آئے گا تو وہ زمل کو بتائے گا کہ کب کیسے وہ خود پر منکشف ہوا تھا اور کب اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین آیا تھا۔

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے وہ اٹھا تو اٹھتے اٹھتے اس کی نظر اوپر ریلنگ پر جھکی سحرش پر پڑی تو اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ہے...... مس جاسوس کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں بس یوں ہی زمل کو دیکھ رہی تھی۔'' سحرش جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

یہ بی بی اماں نے بھی اس کا صحیح نام رکھا ہے۔ مس جاسوس بیگم۔

''زمل کچن میں ہے سحرش، کوئی کام ہے کیا؟'' صحن میں آ کر اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

''ہاں!'' سحرش کا سر پھر ریلنگ پر نظر آیا۔

''ہاں وہ ایک کتاب کے متعلق پوچھنا تھا۔ فارغ ہو کر آتی ہوں۔''

سحرش پیچھے ہٹ گئی تو وہ مسکراتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔

پتا نہیں کیوں آج دل بے ایمان سا ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ زمل کو پاس بٹھا کر بہت سی باتیں کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اسے کتنا سوچتا ہے۔ اس کے سنگ زندگی گزارنے کے کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی ہتھیلیوں پر کوئی امید کے چراغ رکھے اسے بتائے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔ وہ اسے یوں سنبھال کر رکھے گا کہ کوئی گرم ہوا تک اسے نہ چھو سکے۔ وہ اس کے سارے آنسوؤں کو اپنے اندر اتارے گا اور کہے گا بس اب کبھی نہ رونا میں ہوں نا تمہارے ساتھ، یہ میرا سینہ حاضر ہے، جتنے آنسو بہانے ہیں بہا لو بس پھر نہیں۔

ہم زندگی بھر آخری سانس تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، زندگی کی شاہراہ پر ہنسی خوشی چلتے رہیں گے۔

ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا ہوا وہ کچن کے دروازے تک آیا تو زمل کی پیٹھ، دروازے کی طرف تھی اور وہ سنک میں رکھے برتن دھو رہی تھی اور ساتھ ساتھ بی بی اماں سے باتیں بھی کر رہی تھی جو کچن ٹیبل پر سبزی کی ٹوکری رکھے سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''بی بی اماں، یہاں سے جانے کے بعد کیا صبوحی چچی نے پھر رابطہ نہیں کیا؟ کبھی دادا جان کو

فون کیا ہو زین کا پوچھنے کے لیے؟"

اور وہ وہاں ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ ایسا زخم تھا جو کبھی بھر نہیں پایا تھا۔ ہمیشہ رستا رہتا تھا۔ اماں کا ایک دم ابا سے طلاق کا مطالبہ کرنا اور پھر طلاق لے کر چلے جانا۔ اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ابھی چند دن پہلے تک تو وہ ابا کے غم میں رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ نو سال کا تھا اور سب یاد تھا اسے وہ کیسے اس کی انگلی پکڑے خوار ہوتی پھرتی تھیں۔ کیسے پارٹی کے ایک ایک بندے کے گھر جا کر منتیں کرتی تھیں۔ اس نے اماں کو پارٹی کے بڑوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے، منتیں کرتے روتے دیکھا تھا۔

اپنی پارٹی سے مایوس ہو کر وہ برسر اقتدار پارٹی کے دروازے کھٹکھٹانے لگی تھیں۔ اورنگ زیب اور ارباب تایا تو چند دن کوشش کر کے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ شاہ زیب چاچو اپنے ذرائع سے ان کا پتا کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دادا جان بھی دن بھر اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے پاس جاتے یا پھر فون کرتے رہتے تھے۔ صبوحی کچھ دن انتظار کرنے کے بعد خود اس کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل پڑی تھیں۔

دادی منع کرتیں۔

"صبوحی بیٹا! عورت ذات ہو۔ کہاں تلاشو گی اسے۔ شاہ زیب کوشش کر رہا ہے اس کا پتا چلانے کی۔"

"اماں مجھے اپنے طور پر پتا کرنے دیں۔"

دونوں عورتوں کا درد مشترکہ تھا۔ غائب ہو جانے والا ایک کا بیٹا اور ایک کا شوہر تھا۔ دادی خاموش ہو جاتی تھیں اور پھر ظفریاب گھر آ گئے اور پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ ظفریاب کے زخم بھرتے ہی وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اس نے اماں کو ظفریاب کی خدمت کرتے اس کے زخموں پر مرہم رکھتے دیکھا تھا۔ ظفریاب آ بھی گئے تھے پھر بھی ان کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔

بی بی اماں بتاتی تھیں کہ دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے......

یہ خیال آتے ہی وہ ڈر سا جاتا، خوف زدہ ہو جاتا کیا محبت اتنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ اتنی کمزور کہ ختم ہو جائے۔

اور کیا کبھی میری محبت بھی......؟

بی بی اماں کہہ رہی تھیں۔

''پتا نہیں، ہوسکتا ہے کبھی کیا ہو تمہارے دادا جان کو لیکن بڑے صاحب نے کبھی ذکر نہیں کیا، بتایا نہیں۔ آہ! دل آج بھی نہیں مانتا بیٹی، کہ صبوحی بی بی یوں اس طرح اچانک اتنا بڑا فیصلہ کرلیں گی کیسے چاند چکور کی طرح تھے دونوں، ظفریاب کو سر میں درد بھی ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ دس گیارہ سالوں میں ایک بار بھی میں نے اسے میاں سے جھگڑتے نہ دیکھا تھا۔ جیسے وہ ہر وقت ہاتھ باندھے اس کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔''

''اتنی محبت کے باوجود کوئی کیسے اچانک علیحدگی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ ضرور صبوحی چچی کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔''

وہ برتن دھو کر مڑی تو آزین پر اس کی نظر پڑی......

سپاٹ چہرہ، بے رنگ، بجھی آنکھیں......

''زین تمہیں کوئی کام تھا کیا۔'' وہ گھبرا سی گئی تھی۔

''ہاں...... میں بی بی اماں سے یہ کہنے آیا تھا کہ کل مرسل کی تنظیم کی کوئی میٹنگ ہے اور وہ مہمان خانے میں اکٹھے ہوں گے تو آپ صبح اپنی نگرانی میں ڈسٹنگ وغیرہ کروا دیجیے گا۔''

اس رات مرسل اور اس کے دوستوں نے جہاں زیب بیگ سے ملاقات کر کے جب وضاحت سے اپنے اغراض و مقاصد اور ارادے وغیرہ بتائے تو جہاں زیب بیگ نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ جب چاہیں وہاں اپنی میٹنگز وغیرہ کرسکتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے ان کے کام کی بے حد تعریف بھی کی تھی جو وہ کر چکے تھے اور کر رہے تھے۔

''جی بیٹا! وہ تو میں کروادوں گی کیا کوئی چائے پانی وغیرہ بھی کرنا ہوگا؟'' بی بی اماں نے پوچھا۔

لیکن وہ بی بی اماں کی بات سنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''زین، رکو، سنو......'' زمل لپک کر دروازے تک آئی۔

"رہنے دو بیٹا۔" بی بی اماں کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ماں کا ذکر سن کر وہ ہمیشہ ہی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ کتنی بھی احتیاط کروں کبھی نہ کبھی منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ صبوحی بیٹی تھی بھی تو بہت اچھی۔ بی بی اماں، بی بی اماں کہتے جیسے زبان سوکھتی تھی اس کی۔ آہ! مجھے کیا پتا تھا وہ دروازے پر کھڑا ہے اور تم نے بھی خوامخواہ صبوحی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اب دیکھو کتنی دیر تک خود کو بند رکھے گا کمرے میں۔"

"میں اس کے پاس جاؤں بی بی اماں اور......"

"نہیں......" بی بی اماں نے زل کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "خود ہی اپنا غم منا کر باہر آ جائے گا۔ تم جاؤ گی تو اور ڈسٹرب ہوگا۔ ننھے سے دل پر بڑے زخم کھائے ہیں اس نے، ایک تو ماں کے اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کا غم، باپ کی حالت۔ دوسرا تمہاری تائیوں کی طنزیہ باتیں۔ تو یہ ہے کہ میں تب سے ہی ان سے چڑنے لگی ہوں۔ معصوم بچے کی دل جوئی کرنے کے بجائے الٹا زخم لگاتی ہیں۔ وہ تو اللہ بخشے تمہاری ماں نے اپنی محبت سے اس کے اتنے بڑے دکھ کو کم کرنے کی کوشش کی۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھری پلیٹ میں رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ سبزی میں نے کاٹ دی ہے۔ تم ہانڈی چڑھا دینا۔ رات کے لیے آلو گوشت بن جائے گا۔ دل چاہا تو ساتھ میں چاول ابال لیں گے۔"

گھر میں کیا پکتا ہے۔ یہ فیصلہ بی بی اماں خود ہی کرتی تھیں۔ آزین، زل یا جہاں زیب بیگ نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ جو پکاتیں سب بغیر اعتراض کے کھا لیتے تھے۔ ہاں کوئی دعوت وغیرہ ہوتی تو وہ ضرور زل اور آزین سے مشورہ کرتیں۔

"میں ذرا تمہارے ابا کے گیسٹ روم کو دیکھ لوں، کل ساجدہ نے تو چھٹی کرنی ہے، بتا کر گئی ہے غریب۔" وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ "ضرورت محسوس ہوئی تو شیخو کے ساتھ مل کر صفائی کروا لوں گی۔"

"لیکن بی بی اماں شیخو بابا کوئی صفائی کرنے والے تو نہیں ہیں نا۔ ساجدہ صبح آئے گی تو کر لے گی صفائی وغیرہ اچھا نہیں لگتا شیخو بابا سے اس طرح کے کام کروانا۔ بازار سے سودا سلف لے آتے ہیں، بس کافی ہے۔ اور آج کل تو وہ ابا کی بھی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ جب سے وہ ابا کے ساتھ ڈاکٹر

ارسلان کے کلینک میں گئے ہیں...... ابا کا بہت خیال کرنے لگے ہیں۔ کل تو کلینک سے واپسی پر وہ ابا کو مینار پاکستان لے گئے تھے۔ بتا رہے تھے ابا وہاں جا کر بہت خوش ہوئے۔''

''آزین کو ضروری کام سے فیصل آباد جانا تھا۔ اور شاہ زیب کا سیشن بھی تھا ڈاکٹر ارسلان کے ساتھ، تب آزین نے شینخو بابا کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ انہیں ڈاکٹر ارسلان کے کلینک میں لے جائیں۔ اور حیرت انگیز طور پر وہ بغیر کسی ضد اور انکار کے ان کے ساتھ چلے گئے تھے اور اب کل اگرچہ آزین موجود تھا پھر بھی شینخو بابا کے کہنے پر، آزین نے انہیں اس کے ساتھ ہی بھیج دیا تھا۔ اور کل اتنے دنوں کے بعد اس نے ابا کو خوش دیکھا تھا۔ وہ شینخو بابا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے گھر کے اندر آئے تھے۔ شینخو بابا نظریں جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

''وہ شاہ زیب صاحب نے ضد کی کہ ان کے ساتھ اندر چلوں۔''

''کوئی بات نہیں شینخو بابا۔ آپ ابا کو ان کے کمرے میں لے جائیں۔ اور کچھ دیر ان کے پاس ہی بیٹھ کر باتیں کریں۔''

''اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹی! جو اس غریب کے متعلق سوچتی ہو۔ ورنہ اوپر والوں کا بس چلے تو جھاڑو پونچھا تک اس سے کروائیں۔ نگوڑ مارا نہ جانے کس خاندان کا لعل ہے۔ منہ سے کبھی کچھ نہیں پھوٹتا۔ مجھے تو کسی اونچے، اعلیٰ خاندان کا لگتا ہے۔ ظفریاب چلے گئے ورنہ وہ ضرور اس کے خاندان کا کھوج لگا لیتے ایک دو بندوں سے کہہ رکھا تھا انہوں نے۔''

''بیٹھ جائیں بی بی اماں! میں خود صبح جا کر سب دیکھ لوں گی۔ وہ لوگ تو شام میں آئیں گے نا۔''

اس نے بی بی اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھایا اور انہیں وہ سب بتانے لگی جو اس نے زین سے کہا تھا۔

''اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹی! میں نے تو خود شینخو کو دو تین بار کہا کہ وہ اب کہیں نوکری شوکری کر کے اپنا گھر ٹھکانہ بنائے۔ کیوں پرائے دروازے پر پڑا ہے۔ پر اس کا تو ایک ہی جواب ہے کہ اسے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ یہ ڈیوڑھی ہی اس کا گھر اور ٹھکانہ ہے اور یہاں کے مکین اس کے عزیز رشتہ دار۔ دیوانہ ہے نگوڑا۔ سارا دن ڈیوڑھی میں بیٹھا خالی دیواروں کو تکتا ہے۔'' وہ پھر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''میں ایک نظر دیکھ ہی لوں۔ صبح کہیں مصروفیت میں ذہن سے نکل ہی نہ جائے اور زین کو شرمندگی ہو۔ ویسے مجھے یہ زین میاں کی سمجھ نہیں آتی۔ یہ گھر ہے کوئی آفس نہیں ہے کہ وہ ادھر بیٹھ کر میٹنگ کریں گے۔''

''وہ یہ ہے کہ بی بی اماں! ابھی ان کے پاس کوئی آفس وغیرہ نہیں ہے۔ دراصل وہ لوگ افورڈ نہیں کرسکتے کسی آفس کا کرایہ تو اس لیے دادا جان نے اجازت دے دی کہ وہ لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہے ہیں۔'' زمل نے بتایا۔

''ارے یہ زین کے ابا بھی تو اپنے دوستوں کے ساتھ گھنٹوں بیٹھک میں بیٹھ کر میٹنگیں کرتے تھے، بے چاری صبوحی گھڑی گھڑی چائے بھجواتی رہتی تھی اور انجام کیا ہوا'' انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

''وہ سیاسی لوگ تھے بی بی اماں اور ان کی میٹنگ بھی سیاست کے حوالے سے ہوتی ہوں گی۔ یہ تو سادہ سے لوگ ہیں۔ ان کی تنظیم فلاحی کام کرتی ہے۔'' زمل نے پھر سمجھایا اور بی بی اماں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں تو اس نے چولہا جلا کر ہانڈی چولہے پر رکھی۔

کتنا اچھا موڈ تھا زین کا اور اب نہ جانے کب تک وہ خود اپنے آپ سے بھی خفا رہے گا۔ خود سے ہی ناراض ہوتا رہے گا۔ میں بھی نا......

وہ پچھتا رہی تھی۔ اب بھلا مجھے کیا ضرورت تھی یہ پوچھنے کی کہ صبوحی چچی نے پھر کبھی رابطہ کیا یا نہیں۔

اس نے خود کو ڈپٹا اور مرتبان سے گھی نکال کر دیگچی میں ڈالا۔ تب ہی سحرش کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

''زمل!''

وہ چونک کر مڑی اور سحرش کو دیکھ کر سر ہلایا۔ پیاز گھی میں ڈال کر آنچ دھیمی کی۔

''کیا بن رہا ہے؟'' سحرش نے قدم اندر رکھا۔

''مکس سبزیاں بنانے لگی ہوں۔''

''مکس سبزیاں......'' اس نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی۔ ''کیا زین بھائی کھا لیتے ہیں سبزیاں؟''

''زین کبھی کسی کھانے پر اعتراض نہیں کرتا۔ پسند آئے یا نہ آئے، کھا لیتا ہے۔ ویسے بی بی اماں زیادہ تر اس کی پسند سے ہی کھانا بناتی ہیں۔ دن کو سبزی پکے گی تو رات کے لیے آلو گوشت کا کہہ رہی ہیں بی بی اماں۔''

زمل اب نمک مرچ ہلدی ڈال کر سبزیاں ڈال رہی تھی۔

''اوپر تو ابھی تک یہ ہی ڈیسائڈ نہیں ہو رہا کہ کیا پکے گا آج اور یہاں بی بی اماں نے رات کا مینیو بھی بتا دیا۔ ہائے کاش! ہمیں بھی ایسی ہی ایک بی بی اماں مل جاتیں۔'' ٹھنڈی سانس لے کر وہ گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا کوئی کام تھا سحرش؟'' زمل نے کفگیر دیگچی میں ہلاتے ہوئے پوچھا کہ سحرش بنا کسی کام کے کم ہی نیچے آتی تھی۔

''اوہ ہاں......!'' سحرش کو بھی یاد آیا کہ وہ کس کام سے آئی تھی۔ ''کل یہاں...... مطلب باہر تخت پوش پر کوئی ناول پڑا تھا۔ میں نے یوں ہی ایک صفحہ کھول کر دیکھا تو بہت دل چسپ لگا تھا۔ وہ لینا تھا۔ کیا نام تھا اس کا بھول گیا ہے۔ دادا جان کا تھا یا تم نے لائبریری سے منگوا رکھا تھا۔''

''ہاں وہ ساجدہ اپنی باجی کے لیے جدھر وہ کام کرتی ہے لے کر آئی تھی تو اسے لائبریری میں واپس کرنا تھا۔ نسیم حجازی کا ''خاک و خون'' تھا۔ ویسے دادا جان کے پاس نسیم حجازی کی کتابوں کا پورا سیٹ ہے۔'' زمل نے آنچ مزید دھیمی کی اور دیگچی پر ڈھکن رکھا۔

''اچھا تو پھر مجھے دادا جان کی کتابوں میں سے ڈھونڈ کر نکال دو۔'' سحرش نے اٹھ کر چولہا بند کر دیا۔ ''پکاتی رہنا ہانڈی، پہلے میرے ساتھ چل کر مجھے کتاب دو۔''

''تمہیں کب سے شوق ہو گیا کتابیں پڑھنے کا۔'' زمل نے پوچھا۔

''خیر ایسا شوق تو نہیں تمہارے اور شانزہ جیسا لیکن دوپہر میں بہت بوریت ہوتی ہے۔ پڑھ پڑھ کر تھک چکی ہوتی ہوں اور نیند آتی نہیں۔ اوپر سے یہ چھٹیاں بھی اتنی لمبی ہو گئی ہیں۔ شانی تو اتنی بور سی کتابیں پڑھتی ہے یا پھر ڈائجسٹ، یہ مجھے دلچسپ سی لگی تھی۔ شرارتیں تھیں۔ ہنسی آئی تھی مجھے۔''

''ہاں شروع کے ایک دو باب میں لیکن پھر آخر میں اتنا ہی رلائے گا تمہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ پاکستان کا ہر بچہ اسے پڑھے۔ اسے پتا چلے کہ پاکستان کا وجود کتنا ناگزیر تھا۔ وہ جو منہ ٹیڑھے کر کر کے اور لفظ چبا چبا کر کہتے ہیں کہ پاکستان کیوں بنایا۔ قائداعظم نے بڑی غلطی کی، ہندوؤں اور سکھوں سے دوستی اور محبتوں کی باتیں کرتے ہیں، انہیں پتا چلے کہ پاکستان یوں ہی نہیں بن گیا تھا۔ بڑی قربانیاں دی تھیں۔ انہیں پتا چلے کہ ایک لاکھ نوے ہزار مسلمان عورتیں آج بھی سکھوں کے گھروں میں ہیں جو سکھوں کے گلے لگ لگ کر اپنی محبتوں کا یقین دلاتے ہیں انہیں۔'' وہ پاکستان اور قائداعظم کے متعلق بات کرتے ہوئے اتنی ہی جذباتی ہو جاتی تھی۔

''تم نے پڑھا ہے یہ ناول؟'' سحر جانتی تھی کہ وہ پاکستان کے قیام کے موضوع پر گھنٹوں بول سکتی تھی۔

''ہاں پہلی بار پانچویں جماعت میں پڑھا تھا اور تب سے لے کر اب تک نہ جانے کتنی بار پڑھ چکی ہوں۔''

''ایک ہی ناول......'' سحرش کو حیرت ہوئی۔

''ہاں ایک ہی......'' وہ مسکرائی اور صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آئی۔

سحرش کچن کے دروازے تک آ کر رک گئی تھی۔

''ایسا کرو زمل تم خود ہی جا کر دادا جان سے لے آؤ۔ اس وقت موڈ نہیں ہے ان کی باتیں سننے کا اور پھر دادا جان کے پاس گئی تو کافی دیر تک بیٹھنا پڑے گا اور اوپر اماں نے ہنگامہ کر دینا ہے۔''

''کیوں؟ کیا دادا جان کے پاس بیٹھنے پر؟'' اس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''نہیں وہ دراصل اماں نے مجھے کچن کے کیبنٹ صاف کرنے کو کہا تھا تو سمجھیں گی جان بوجھ کر کام سے جی چرا کر چلی گئی۔ آج کل سارا نزلہ مجھ پر ہی گرتا ہے اور اماں نے تو جیسے مجھے ہی تاڑ رکھا ہے ہر کام کے لیے...... دو مہارانیوں کی شادی ہے اور تیسری کی ٹف پڑھائی، ورنہ مجھے تو دادا جان سے باتیں کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ اتنا علم ہے ان کے پاس، اتنی نالج ہے اور پھر اتنے مزے مزے کے واقعات سناتے ہیں۔''

وہ تیز تیز بول رہی تھی۔ زل مزید کوئی بات کیے بغیر دادا جان کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئی اور وہ باہر کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وسیع صحن، کشادہ برآمدہ، کیاریوں میں لگے پھول، پودے...... ستون سے لپٹی موتیا کی بیلیں...... جو اوپر ٹیرس تک جا رہی تھیں۔ جولائی کا مہینہ تھا اور موتیا کی بیلیں کلیوں اور پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سارے میں موتیا کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ خوشبو تو خیر اوپر برآمدے میں بھی بکھری رہتی تھی۔

یہ نہیں کہ وہ پہلی بار سب دیکھ رہی تھی۔ سینکڑوں بار دیکھ چکی تھی، لیکن آج نظریں کچھ تنقیدی سی تھیں۔

یہ دادا جان نے یہاں بھی ڈنڈی ماردی، ہمیں تو دے دیا اوپر والا پورشن اور خود اپنے چہیتے بیٹوں کے ساتھ نیچے والا حصہ سنبھال لیا۔

اسے لگا کہ یہ خالص اس کی سوچ نہیں ہے بلکہ یہ جملہ اس نے پہلے سے سن رکھا ہے۔ شاید رخسانہ خالہ یا پھر اماں سے۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ اسے تو زل سے یہ بھی پوچھنا تھا کہ یہ زین بھائی کو کیا ہوا۔ کیسے غصے سے تیز تیز چلتے ہوئے کچن کی طرف سے جا رہے تھے شاید اپنے کمرے میں...... اس نے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ منہ سجائے۔

ضرور زل نے ہی کوئی بات کر کے خفا کر دیا ہوگا۔ اور وہ مارے تجسس کے اماں کے روکنے کے باوجود چلی آئی تھی۔ کتاب کا تو محض بہانہ تھا۔ اب ایسی بھی شوقین نہیں تھی کتابوں کی۔ وہ تو کسی بھی وقت آکر لے جاتی لیکن یہ کم بخت حافظہ...... اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ تب ہی زل دادا جان کے کمرے سے باہر آئی اور کتاب اسے دی۔

”احتیاط سے پڑھنا سحرش! پچھلی دفعہ تم نے شوکت تھانوی کی جو کتاب لی تھی اس کی جلد الگ ہوگئی تھی۔ دادا جان بہت ناراض ہوئے تھے۔ تمہیں پتا ہے نا انہیں اپنی کتابوں سے بہت محبت ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ اب کے احتیاط سے پڑھوں گی۔ وہ تو پچھلی بار اس بلال کے بچے نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔ میں وہ پڑھ رہی تھی تو وہی کتاب اٹھا کر اسے دے ماری تو جلد الگ ہوگئی۔ اب مجھے کیا

پتا تھا کہ ذرا سا پھینکنے پر جلد الگ ہو جائے گی۔'' معصومیت کی اداکاری تو اس پر ختم تھی۔
''ویسے یہ بہت زیادہ رلانے والی اور دکھی تو نہیں۔ میرا دل برداشت نہیں کر پاتا دکھی دکھی کہانیوں کو۔'' وہ یوں ہی کتاب کے اوراق پلٹنے لگی۔
''یہ پاکستان بننے اور پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والوں کی کہانی ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت جسے قلم لہو میں ڈبو کر لکھا گیا ہے اور ہجرت کوئی بھی ہو اس کے دامن میں آنسو، دکھ اور ہجر کی اذیتیں ہوتی ہیں۔ تم دیکھ لینا ایک نظر نہ برداشت کر سکو تو نہ پڑھنا۔'' سنجیدگی سے کہتی وہ کچن کی طرف بڑھی تو اس نے روکا۔
''سنو یہ زین کو کیا ہوا تھا تھو بڑا سجائے جا رہا تھا۔''
سحرش کا جب جی چاہتا، زین بھائی کہہ کر بلاتی جب جی چاہتا صرف نام لے لیتی تھی۔
''جب کہ کچھ دیر پہلے تم دونوں ادھر سیڑھیوں پر بیٹھے بڑے خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے بلکہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ شاید کوئی رومانٹک خیال آ رہا تھا لیکن پھر فوراً ہی خراب موڈ کے ساتھ واپس جاتے نظر آئے۔''
زمل کی آنکھوں سے کرب سا جھلکا اور وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
''پتا نہیں، بی بی اماں سے اپنے دوستوں کی بات کر کے چلا گیا تھا۔''
''پتا رکھا کرو زمل......'' وہ بہت کم سنجیدہ ہوتی تھی لیکن اس وقت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ''ہماری ٹیچر واسعہ کمال کہتی ہیں کہ اپنی چیزوں کی خود حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ کھو جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات واپس ہی نہیں ملتیں۔ اگر مل بھی جائیں تو ویسی نہیں ہوتیں جیسی پہلے تھیں۔ سو ان کا پتا رکھنا پڑتا ہے۔''
''زین کوئی چیز نہیں ہے سحرش......'' زمل الجھ سی گئی تھی۔
''ہاں وہ......'' سحرش کی نظریں اچانک اوپر اپنے ٹیرس کی طرف اٹھیں اور مرتضیٰ کی نظروں سے ملیں جو نظریں ملتے ہی فوراً پیچھے ہٹ گیا تھا۔
''لوگ چیزوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں زمل۔'' اس کی نظریں پھر ٹیرس کی طرف اٹھیں۔ اب

وہاں کوئی نہ تھا۔

"جانتی ہو زمل، جیتے جاگتے انسان کب کھوتے ہیں۔ جب کوئی دو رشتوں کے درمیان بدگمانی پیدا کر دے اور تب اگر رشتے نہ بھی ٹوٹیں تو رشتوں میں دراڑ ضرور پڑ جاتی ہے۔ اس لیے کبھی اپنا یقین نہ کھونا اور کبھی زین بھائی سے بدگمان نہ ہونا۔ شیطان بدگمانیاں پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ ہمارے آگے پیچھے ہوتا ہے۔"

وہ بھلا کیوں زین پر شک کرے گی اور وہ اپنا یقین کبھی نہیں کھو سکتی۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

یہ سحرش بھی نا...... ضرور یہ اس کی ڈائری میں لکھا کوئی اقتباس ہوگا جو اس نے کسی افسانے یا کہانی سے لیا ہوگا لیکن آج سے پہلے اپنی ڈائری میں لکھے کسی شعر یا اقتباس کا اتنا مناسب استعمال اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اپنی بات کر کے وہ رکی نہیں تھی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر جا رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی، جو دل میں آتا فوراً کہہ دیتی۔ چند لمحے پہلے اگر وہ کسی کی شدید مخالفت کر رہی ہوتی تو دوسرے ہی لمحے وہ اس کی ہمدردی میں مری جا رہی ہوتی۔

سحرش ارباب بیگ جو بہت لاپروا اور لاابالی سی تھی، اس نے مرتضیٰ کی آنکھوں میں زمل کے لیے جو جذبہ محسوس کیا تھا وہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی بے حد ہوشیار ماں اور خالہ تائی نے بھی نہیں...... اور اسے مہرین بے حد پیاری تھی، وہ اس کی کزن ہی نہیں، دوست بھی تھی اور مہرین کے دل میں جو مرتضیٰ کے لیے تھا، بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

سو اس نے ضروری سمجھا تھا کہ زمل کو خبردار کر دے لیکن زمل کے لیے نہیں، مہرین کے لیے اور کچن کے پاس کھڑی زمل نے، سیڑھیوں کی طرف دیکھا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ یہ سحرش بھی ناخوامخواہ فلاسفر بننے کی کوشش کرتی ہے۔ نہیں جانتی کہ میرا زین پر یقین ایسے ہی ہے جیسے خود پر۔

سر جھٹک کر وہ بی بی اماں کی طرف دیکھنے لگی جو ڈیوڑھی کے دروازے سے اندر آ رہی تھیں۔

لیکن کیا آزین بھی اس کے لیے اتنا ہی پر یقین ہوگا۔ اس نے خود سے پوچھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی

تھی کہ وہ آزین نو سال کی عمر میں جس کا اعتبار اور یقین اس طرح ٹوٹا تھا کہ پھر کبھی جڑ نہ سکا، کبھی اس سے بدگمان نہیں ہوگا۔

وہ کچھ الجھی سی بی بی اماں کے قریب آنے کا انتظار کیے بغیر کچن میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

منیرا اور نوراں حویلی کے اندرونی حصے میں کچن کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ صحن کی صفائی کر کے فرش دھو دیا تھا۔ درختوں کے گرے ہوئے پتے اکٹھے کر کے بخشو کے حوالے کیے تھے تاکہ وہ کھاد تیار کرنے کے لیے باغ کے گڑھے میں دفن کر دے سو باہر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ اندر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

صفورا، ثمینہ اور ثمرہ گھر پر نہ ہوتیں تو کام بھی زیادہ نہ ہوتا۔ گھر میں اختر بانو اور امان کے علاوہ صرف ملازم تھے۔

''اماں! آج بڑی بی بی سے پوچھ کر گھر نہ چلے جائیں۔ کام تو کوئی ہے نہیں۔ کتنے دنوں سے میں نے تیلیاں پھنسا کر رکھی ہیں الٰہی بخش کے ازار بند کے لیے۔ آج چلے جائیں گھر تو میں شام تک بنا لوں۔''

منیرا آزاد فضاؤں کی عادی تھی۔ رحیم یار خان کے چک بی سات چھیاسی میں اس نے ایسی غلامی والی زندگی نہیں گزاری تھی۔ تھے تو وہ غریب ہی لیکن کسی کی نوکری نہیں کرتے تھے۔ اپنا گھر تھا اپنی مرضی سے کام کرتے تھے۔ مرد کھیتوں میں اجرت پر کام کرتے تھے اور عورتیں گھروں میں ہی ازار بند بناتیں، کھجور کے پتوں کی چنگیریں اور ٹوکریاں وغیرہ۔ دوسوتی اور چار سوتی کی چادروں پر کڑھائی کرتیں۔ غرض گھر میں بیٹھ کر کرنے کا جو بھی کام ہوتا تھا کر لیتی تھیں۔ یہ پابندی والی زندگی اسے گراں گزرتی تھی۔ اس لیے اکثر بخشو سے کہتی تھی۔

''الٰہی بخش! میری بات سن۔ ہمارے گاؤں چلتے ہیں۔ وہاں کٹائی اور بوائی کے وقت کھیتوں میں کام کرنا، اناج کے ساتھ اجرت بھی ملے گی پھر میں بھی کام کراؤں گی تو کچھ رقم جوڑ کر چھوٹی سی کریانے کی دکان کھول لینا۔ نہ کسی کی غلامی نہ پابندی ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہو۔'' لیکن بخشو

سے پہلے اس کے باپ دادا نے بھی ایسی ہی زندگی گزاری تھی سو وہ اس کا عادی تھا۔ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔

''کیا پتا کوئی کام پڑ جائے۔''

نوراں لکیر کی فقیر تھی۔اسے منیرا کی باتیں عجیب ہی لگتی تھیں۔

''اماں......!''منیرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا شاید وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ ماسی تاج نے کچن کے دروازے سے جھانک کر نوراں کو مخاطب کیا۔

''نوراں! چراغ سائیں دودھ لینے گیا تھا باڑے سے، آتا ہی ہوگا۔تم ایسا کرنا لے کر کاڑھ (ابال) دینا۔میں ذرا بھاگی کو دیکھ لوں، رات سے تاپ (بخار) چڑھا ہے۔''

وہ واپس کچن میں چلی گئی تو نوراں نے جتاتی نظروں سے منیرا کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو دیکھا کام پڑ گیا نا۔ماسی تاج کچن کے پچھلے دروازے سے نکل کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔نوراں کھڑی ہو گئی۔منیرا ایسے ہی بے زار سی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔تب ہی چراغ سائیں کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی سی اس کے کانوں میں پڑی تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اماں! یہ چراغ سائیں ایک ہی بول کیوں گاتا ہے؟''

اور نوراں کا جواب سنے بغیر بتانے لگی۔

''پتا ہے اماں کل میں قمری کے گھر گئی تھی تو میں نے دیکھا چراغ سائیں باڑے کے باہر بیٹھا تھا اور اس کے پاس کپڑے کی بنی ہوئی ایک گڈی (گڑیا) تھی۔بڑی میلی کچیلی سی۔اس کے بالوں کے دھاگے بھی جو کبھی کالے رہے ہوں گے، مٹیالے ہو رہے تھے۔کیا چراغ سائیں پاگل ہے اماں......''

''نہیں......بس صدمہ دل میں بیٹھ گیا ہے اس کے۔''نوراں نے نفی میں سر ہلایا اور چراغ سائیں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

''بابل میری گڑیاں تیرے گھر رہ گیاں......''

نوراں دودھ لینے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اختر بانو نے اپنے کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں قدم رکھا ہمیشہ کی طرح آج بھی چراغ سائیں کی آواز میں اسے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی تھی، اس کے اندر کن من کن من ہونے لگی تھی اور اسے لگا تھا جیسے وہ اندر سے پوری بھیگ گئی ہو۔

چراغ سائیں کی آواز آنا بند ہوئی تو وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جب سے امان نے لاہور لے کر جانے کا کہا تھا، ایک ایک لمحہ گزارنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

ثوبان شاہ اور ثمرہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اور پتا نہیں وہ کب واپس آئیں گے۔ شاید آج کل میں آجائیں۔ وہ وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے دیکھنے لگی کہ کون کون سے ساتھ لے کر جاؤں۔ اب جاؤں گی تو ہفتہ بھر تو ضرور رہوں گی ماں کو کہوں گی اپنے بابا سے اجازت لے لے۔

بیٹوں کی کسی بھی بات سے وہ انکار نہیں کرتے۔ میں پوچھوں تو شاید کہہ دیں دو تین دن بعد واپس آجانا۔ وہ ہینگر ادھر ادھر کرتے ہوئے سوچ رہی تھی جب نوراں نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”آجاؤ۔“ نوراں نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”بی بی وہ لاہور سے آپ کے مہمان آئے ہیں۔ آپ کے میکے والے۔“

”کیا؟“ وہ حیران سی نوراں کو دیکھنے لگی۔

”جی وہ لاہور سے آپ کے مہمان آئے ہیں۔“

نوراں نے اپنی بات دہرائی تو کتنی ہی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا اور پھر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر پہلے برآمدے اور پھر صحن میں آئی تھی۔

”اختر......بانو......میری بچی......“

جہاں زیب بیگ بے اختیار ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھے تھے اور پھر تو جیسے بند ٹوٹ گئے تھے۔ جہاں زیب بیگ کے سینے سے لگ کر وہ اتنا روئی کہ منیرا اور نوراں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ جہاں زیب بیگ نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے الگ کیا تو وہ دونوں بھی دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ

رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی میکے کی یاد نے رلا دیا تھا۔

''پھپھو جانی! ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ ایک نظر کرم ادھر بھی۔''

آزین سنجیدہ مزاج تھا لیکن ماحول کی اداسی دور کرنے کے لیے قدرے شوخی سے بولا تھا۔

''میری جان! آزین۔'' وہ اب آنسو پونچھ رہی تھی۔

''یہ......'' آزین نے زمل کی طرف اشارہ کیا۔ ''پہچانا اسے......''

''کیوں نہیں پہچانوں گی، میرے زیبی بھائی اور مریم بھابھی کی راج دلاری میری زمل شہزادی ابا کی ماہ الملوک......'' وہ اب اسے گلے لگائے پیار کر رہی تھی۔

''یہ تو اب بالکل مریم بھابھی کی طرح لگنے لگی ہے، میں نے جب آخری بار دیکھا تھا تو دبلی پتلی اور شرمیلی سی تھی۔ مشابہت تو خیر تب بھی تھی مریم بھابھی سے لیکن اب تو ایسا لگتا ہے جیسے مریم بھابھی کو دیکھ رہی ہوں۔''

نوراں کے ساتھ کھڑی منیرا بہت دلچسپی اور شوق سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ میرے ابا جان......اور یہ بھتیجا اور بھتیجی ہیں۔''

اختر بانو نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں نے سر جھکا کر سلام کیا اور ان کا سامان اٹھا کر گیسٹ روم میں لے گئیں۔ انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ کیا کرنا ہے۔ اختر بانو ان سب کے ساتھ سٹنگ میں آگئیں۔

''ابا جان! آج آپ کتنے سالوں بعد میرے گھر آئے ہیں۔ آپ کو یاد ہے جب آپ آخری بار آئے تھے تو ریحان صرف دو ماہ کا تھا اور اب اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر ہے......آپ نے بھلا دیا مجھے۔ میں نہیں آسکتی تھی جلدی جلدی آپ جانتے تھے نا پھر بھی آپ کبھی نہیں آئے۔ کیا میری یاد نہیں آتی تھی، کیا ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔'' اختر بانو کو شکوے کی عادت نہ تھی لیکن بے اختیار ہی لبوں سے نکل گیا تھا۔

''آپ سب نے مجھے چھوڑ دیا ابا جان!'' آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ ''کبھی کسی نے میری خبر نہیں لی، بیس سال میں نہ جاؤں تو وہاں سے کوئی نہیں آتا۔ ارباب بھائی، بڑے بھائی، شاہ

زیب بھائی، ظفر بھائی...... کوئی بھی نہیں۔ جو ہوا اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا کہ سب نے مجھے چھوڑ دیا اکیلا کر دیا۔ کیوں ابا جان...... کیوں؟'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ جہاں زیب بیگ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ آنسوؤں نے ان کی آنکھیں دھندلا دیں۔ ان کے پاس اختر بانو کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے۔ رشتے ناتے تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ گلہ تو انہیں سلطان شاہ کے والد اور بھائیوں سے تھا۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹی کو کیوں اکیلا کر دیا......

انہیں تو اپنی بیٹی کی غمی خوشی میں شریک ہونا چاہیے تھا اس کی خبر رکھنی چاہیے تھی۔ یہ غلطی تو ان سے ہوئی تھی۔

جس طرح انکار سن کر وہ یہاں سے گئے تھے پھر ان کا دل ہی نہ چاہا آنے کو...... وہ توہین جو انہوں نے تب محسوس کی تھی، وہ احساس دل سے کبھی گیا ہی نہیں۔ حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ اس گھر میں ان کی بیٹی بھی ہے۔ بیاہی بیٹیوں کو یوں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میکے والے تو ان کا مان ہوتے ہیں اور جب میکے سے کوئی نہ پوچھے تو یہ مان ٹوٹ جاتا ہے۔ بیٹی اپنی ہی نظروں میں سسرال میں بے وقعت ہو جاتی ہے۔

''سوری بیٹا......'' انہوں نے اختر بانو کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور آزین نے اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''اب دیکھیے گا میں اتنے چکر لگاؤں گا کہ آپ کہیں گی زین میاں اب بس کر دو، جان چھوڑو۔''

آزین اپنی فطرت کے خلاف باتیں کرتا ہوا زمل کو اچھا لگا تھا کہ اس کے پیچھے جو جذبہ تھا وہ قابل تحسین تھا۔

''کبھی نہیں......'' اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سال کے تین سو پینسٹھ دن تم آؤ تو وہ ہر دن میرے لیے عید ہو گا، تمہیں کیا پتا زین میں اپنوں کی شکلیں دیکھنے کو کتنا ترسی ہوں۔''

تب ہی منیر اٹھنڈا ٹھار خوشبودار صندل کا شربت لے آئی۔

''سنو ماسی تاج اور بھاگی سے کہو، جلدی سے ناشتہ تیار کریں۔'' منیر اشربت سرو کر کے جانے

لگی تو اختر بانو نے اسے روکا۔

''نہیں پھپھو، ناشتہ تو ہم نے حیدر آباد اسٹیشن پر کر لیا تھا۔ ہاں صرف چائے کا ایک ایک کپ پی لیں گے۔'' زمل نے تائیدی نظروں سے جہاں زیب بیگ اور آزین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی سر ہلا دیئے۔

''ہاں بیٹی! صرف چائے لیں گے۔ رات کا سفر تھا۔ صبح صبح حیدر آباد پہنچے تھے تو ناشتہ تو وہاں کر لیا تھا۔ اب چائے پی کر کچھ دیر آرام کریں گے۔''

جہاں زیب بیگ نے کافی عرصہ بعد طویل سفر کیا تھا تو تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔

منیرا بات سمجھ کر چلی گئی تھی۔ اور جہاں زیب بیگ اب اختر بانو سے ثوبان اور بچوں کے متعلق پوچھنے لگے تھے

''ثوبان تو کراچی گئے ہوئے ہیں، نعمان تو مہران بھائی کے ساتھ ہی مہران ٹیکسٹائل مل کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ایک دو ماہ بعد چکر لگاتا ہے اور ریحان کا بھی ہاؤس جاب ہو گیا تھا۔ آج کل دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف گیا ہوا ہے۔ وہ بھی زیادہ تو کراچی میں رہتا ہے۔ پہلے پڑھائی کے سلسلے میں اور اب وہاں رہ کر پارٹ ون کی تیاری کر رہا ہے۔ البتہ مانی کچھ دیر پہلے ہی ناشتہ کر کے نکلا ہے۔ ساتھ والے گوٹھ میں اس کا دوست رہتا تو کبھی کبھار اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آجائے گا۔'' اختر بانو نے تفصیل سے بتایا۔

''اور شا......'' لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی آکر دم توڑ گئے۔ آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا تھا۔ اختر بانو کے لبوں سے بھی سسکی سی نکلی۔

''اور سب لوگ مطلب ثمرہ آپا، صفورا اور ثمینہ بھابھی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اپنے اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔'' اختر بانو جانتی تھی وہ کس کے متعلق پوچھتے پوچھتے رک گئے ہیں۔

''اور آپ اب اتنے سالوں بعد آئے ہیں تو کچھ دن تو رکیں گے ہی نا۔''

''ہاں دو تین دن۔'' جہاں زیب بیگ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''صرف دو تین دن۔'' لہجے میں حسرت تھی اور سوالیہ نظریں جہاں زیب بیگ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''بڑھاپے میں کسی دوسری جگہ سکون نہیں ملتا اختر بانو، مجھے تو کبھی اوپر تمہارے بھائیوں کی طرف جانا پڑے تو کچھ ہی دیر بعد دل گھبرانے لگتا ہے۔''

جہاں زیب نے حقیقت بیان کی تھی کہ بڑھاپے میں آدمی کو اپنے ہی ٹھکانے پر سکون ملتا ہے۔

''دراصل دادا جان کے کمرے میں وہ جو کتابوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے وہ کہیں دوسری جگہ تو نہیں ہوتی نا۔ آپ کو پتا ہے دادا جان اور یہ خاتون......'' اس نے زمل کی طرف اشارہ کیا۔ ''مل کر کتابوں کی مرمت کر رہے ہیں۔ اتنی پرانی اور بوسیدہ کتابیں پھپھو! کئی بار مشورہ دے چکا ہوں کہ ردی میں دے دیں۔'' آزین ماحول کی اداسی محسوس کر رہا تھا اس لیے اپنی سی کوشش کر رہا تھا ماحول کو خوش گوار بنانے کی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

اس دوران چائے بھی مع لوازمات آ گئی تھی اور چائے کے ساتھ آنے والے لوازمات کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بہت باتیں ہوئیں۔ جہاں زیب کی کتابوں سے لے کر بی اماں اور شینخو بابا تک کی باتیں۔

کئی بار اختر بانو اور جہاں زیب بیگ کی آنکھیں نم ہوئیں اور کئی بار کسی خوش گوار یاد نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بھی بکھیری۔ جی تو کسی کا بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سالوں کی تشنگی گھنٹوں میں کہاں ختم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ سفر کر کے آئے تھے، خاص طور پر جہاں زیب بیگ بے حد تھکے اور نڈھال لگ رہے تھے۔ انہیں سلطان شاہ بھی یاد آ رہا تھا۔

جب جب وہ یہاں آتے تھے کیسے کھل اٹھتا تھا اور کھلے بازوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کرتا تھا۔ کیسا پیارا اور دلربا شخص تھا وہ بھی......

''ابا جان......زمل......زین! آپ لوگ کچھ دیر آرام کر لیں۔ فریش ہوں پھر ان شاء اللہ بہت باتیں ہوں گی۔'' اختر بانو کو ہی جہاں زیب بیگ کی تھکن کا خیال آیا تھا اور وہ ان تینوں کو گیسٹ روم میں

چھوڑ کر خود کچن میں آ گئی تھی تا کہ اپنی نگرانی میں دن کے کھانے کی تیاری کروا سکے۔

کچھ دیر آرام کرنے اور نہانے کے بعد جب وہ کھانے کی ٹیبل پہ آئے تھے تو بالکل تازہ دم تھے۔ کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔

''امان جب اپنے دوستوں کی طرف جائے تو کھانا کھا کر ہی آتا ہے۔'' اختر بانو نے انہیں بتایا تھا۔ سو کھانے کی میز پر اختر بانو کے علاوہ وہ تینوں ہی تھے۔

کھانا کھانے کے بعد، وہ سٹنگ میں قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ثوبان شاہ بھی آ گئے لیکن ثمرہ اور شایان ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اختر بانو نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اگر شایان بھی آ جاتا تو جہاں زیب اپنی بے تابی اور بے قراری کیسے چھپا پاتے۔ اگرچہ زبان سے کچھ بھی نہ کہتے لیکن نگاہیں ضرور راز عیاں کر دیتیں۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ یہ بے تابی ثمرہ کے بیٹے کے لیے نہیں، اختر بانو کی اولاد کے لیے ہے۔

ثوبان شاہ نے اسے سختی سے کہہ رکھا تھا کہ شایان کو کبھی معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اس کی ماں ہو۔ شاید اسی خوف سے کہ کہیں وہ اپنی ممتا سے مجبور ہو کر شایان کو بتا ہی نہ دے، ثمرہ زیادہ تر حیدر آباد ہی رہتی تھی۔ اور شایان کی ساری تعلیم بھی حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ حالانکہ میٹرک تک لڑکوں کے لیے گورنمنٹ کا اسکول تھا اور اس ہائی اسکول کی پڑھائی اچھی تھی۔

ابتدائی تعلیم تو سب نے یہاں ہی حاصل کی تھی بعد میں نعمان اور ریحان کو ایبٹ آباد بھیج دیا گیا تھا، البتہ امان نے میٹرک اسی اسکول سے کیا تھا جبکہ شایان کو ثمرہ نے نرسری سے ہی حیدر آباد بھیج دیا تھا۔

ثوبان شاہ، جہاں زیب بیگ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ چھبیس سال پہلے جب وہ یہاں سے مایوس ہو کر گئے تھے تو پھر کبھی نہیں آئے تھے۔ تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے ان سے ملے تھے۔ زل اور آزین سے بھی بڑی شفقت سے ملے تھے اور جہاں زیب سے ملتے ہوئے انہیں اپنے بابا سلطان شاہ بے حد یاد آئے تھے کہ یہ جہاں زیب بیگ تھے جو سلطان شاہ کے دل کے بے حد قریب تھے۔ جب انہوں نے ثوبان شاہ سے اختر بانو کی بات کی تھی تو کہا تھا۔ ''جہاں زیب مجھے بے حد عزیز ہے۔ وہ

میرے لیے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہے۔ میرے اندر کے سارے خلا پر کرنے والا میرا یار۔ اور اس کی بیٹی مجھے سلطانہ کی طرح ہی پیاری ہے۔ تم کبھی اختر بانو کو تکلیف نہ دینا اور کبھی اس کا دل نہ دکھانا۔ وہ بہت معصوم اور کم عمر ہے۔ میرے یار نے اپنے خاندان والوں کی مرضی نہ ہونے کے باوجود مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، میرا مان رکھا اور اپنی ہیرے جیسی بیٹی میرے حوالے کی اور اب تمہیں میرا مان رکھنا ہے۔ اختر بانو کی بہت قدر کرنا وہ بہت بڑے دل والے باپ کی بیٹی ہے۔ اور جہاں زیب کی بھی ہمیشہ اسی طرح عزت کرنا جیسے میری کرتے ہو۔"

انہوں نے ایک نظر اختر بانو پر ڈالی، جو بظاہر اپنے والد کے آنے سے بہت خوش نظر آ رہی تھی لیکن اس کی سرخ آنکھیں اور سوجے ہوئے پپوٹے بتا رہے تھے کہ وہ روتی رہی تھی۔ یقیناً اتنے سالوں بعد باپ سے ملاقات نے رلا دیا ہوگا۔ اداسی کا ایک غبار سا جو ہمیشہ اس کے وجود کو اپنے ہالے میں لیے رکھتا تھا اس وقت بھی اس کے وجود کے گرد حصار بنائے ہوئے تھا۔

دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے انہوں نے جہاں زیب بیگ سے کہا۔

"چچا جان! اب آپ آئے ہیں تو کچھ دن رہیے گا۔ جب بابا زندہ تھے تو تب آپ کتنا آیا کرتے تھے۔"

"ہاں تب...... لیکن...... اب وہ شاخ نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور لب بھینچ لیے۔

"بابا نہیں تھے لیکن آپ کی بیٹی تو تھی نا، آپ کے نواسے تھے لیکن آپ تو ان سے بھی کبھی ملنے نہیں آئے۔" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا اور اختر بانو نے بھی ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تو ایک تاسف سا ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

"ہاں کوتاہی ہوگئی ثوبان میاں! بڑی کوتاہی۔ لیکن اب نہ تو گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے اور نہ اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔" دکھ ان کے لہجے سے جھلکتا تھا۔

انا کے ہاتھوں کبھی کبھی انسان اپنے کتنے پیاروں سے رابطے توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ثوبان شاہ نے ان کے دکھ کو محسوس کیا۔ کوتاہی تو ان سے بھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اختر بانو کو سالوں

بعد جانے کی اجازت دیتے تھے اور خود تو کبھی گئے ہی نہیں تھے۔ اختر بانو پر ایک نظر ڈال کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چچا جان! میں سفر سے آیا ہوں۔ فریش ہو کر آتا ہوں۔'' انہوں نے اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں...... ہاں بیٹا جاؤ۔'' جہاں زیب بیگ کی نظروں نے انہیں حصار میں لیا۔ گزرے وقت نے ثوبان شاہ کی شخصیت کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ وہ شان دار شخصیت اور مضبوط بیک گراؤنڈ کے مالک تھے۔ ان میں وہ سب کچھ تھا جس کی خواہش کوئی بھی لڑکی کر سکتی تھی لیکن اختر بانو خوش نہیں تھی۔ چپ اور خاموش سی اختر بانو جب جب میکے آتی اس کے نامعلوم آنسوؤں کو انہوں نے اپنے دل پر گرتے محسوس کیا تھا۔

دیکھنے والے اسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن وہ جانتے تھے وہ خود کو ایسا نہیں سمجھتی۔ ایک بار میمونہ نے کہا تھا۔

''اختر بانو تو پوری جاگیردارنی لگتی ہے۔ حویلی کی مالکہ، اتنے نوکر، ملازم سب پر حکم چلاتی کتنی خوش قسمت ہے نا۔ سب کچھ ہی تو ہے اس کے پاس۔''

لیکن سب کچھ نے میری بیٹی کی ہنسی چھین لی ہے۔ اس کی آنکھوں کی جوت چرا لی ہے۔ کیسی جگمگ کرتی تھیں اس کی آنکھیں...... اور اب یہ ہی بات زل اس سے کہہ رہی تھی۔

''پھپھو آپ تو پوری جاگیردارنی لگ رہی ہیں۔ وہ کہانیوں اور ڈراموں والی جاگیردارنی۔''

ادھر ادھر کام والیوں کو ہدایات دیتے، مردانے میں ملازموں کو کھانا بھجواتے، زل نے جو محسوس کیا تھا کہہ دیا تھا۔ اور وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

اس ہنسی میں نہ جانے کتنی کرچیاں چھپی تھیں اور ان کرچیوں کی چبھن کو جہاں زیب بیگ نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ ایک بار یہ بات مونا بھابھی نے بھی کی تھی اور تب اس نے سوچا تھا کاش وہ اتنے بڑے گھر میں بیاہ کر نہ آتی۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا، وہاں ہی اپنے میکے گھر کے آس پاس، وہ جلدی جلدی

اپنے کام نمٹا کر بھاگ کر اپنے میکے جاتی۔اس کے بچے اس کے پاس ہوتے وہ ان کی پسند کے کھانے بناتی۔انہیں اپنے پاس لٹا کر کہانیاں سناتی۔وہ کہانیاں جو اس نے اپنی دادی اور اماں سے سنی تھیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں نا پھپھو۔'' زمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''شاید......'' ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور اس نے سوچا تم کیا جانو زمل ایک جاگیردارنی کے مقابلے میں ایک عام عورت ہونا زیادہ خوش نصیبی ہے۔

تب ہی امان شاہ اندر داخل ہوا۔

''یہ منیرا کیا کہہ رہی ہے اماں جانی؟''

جہاں زیب بیگ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔یہ امان شاہ تھا ان کا نواسا......انہوں نے کئی سال پہلے جب اسے دیکھا تھا تو وہ بہت چھوٹا سا تھا۔تب اختر بانو ہفتہ وہاں ٹھہری تھیں اور اس ایک ہفتے میں وہ ان سے بے حد مانوس ہو گیا تھا۔

''یہ امان ہے نا؟'' اس کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ میں امان شاہ اور آپ نانا جان۔'' وہ ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گیا۔انہوں نے بھی اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

''اماں جان کہتی ہیں میں بالکل اپنے ماموں جان کی طرح ہوں۔کیا سچ میں......؟''

اس میں شاہ زیب کی بے حد مشابہت تھی۔

''ہاں سچ تم زیبی سے بہت مشابہ ہو۔'' انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما۔

آزین نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''ایک ذرا نظر کرم ادھر بھی عزیز من۔''

''آپ......'' وہ ان سے الگ ہو کر اب اس سے گلے مل رہا تھا۔

''میں آزین ظفریاب......'' اس نے اپنا تعارف کروایا اور پھر زمل کی طرف اشارہ کیا۔

''اور یہ زمل شاہ زیب......''

تب ہی ثوبان شاہ فریش ہو کر آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ وہ کراچی سے سیدھے گھر آئے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ کراچی سے کچھ اور لوگ بھی آئے تھے۔ اس لیے وہ حیدر آباد نہیں گئے تھے۔ مہمانوں کو وہ ڈیرے کے مہمان خانے میں ٹھہرا کر حویلی آئے تھے۔ اختر بانو ان کے لیے چائے بنوانے کے لیے اٹھیں تو زمل بھی ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی آئی اور ثوبان شاہ، آزین اور جہاں زیب بیگ سے باتیں کرنے لگے۔

ثوبان شاہ نے جہاں زیب بیگ کو بہت عزت دی اور زیادہ تر حویلی میں ہی رہے جبکہ ڈیرے پر ان کے ساتھ کراچی سے آنے والے مہمان بھی تھے۔ انہیں بار بار سلطان شاہ کی کہی باتیں یاد آتی تھیں۔ وہ اکثر کہتے تھے ثوبان شاہ میں نہ بھی رہوں تو بھی میرے یار کی اتنی ہی عزت کرنا جتنی میری کرتے ہو۔ اختر بانو کے ساتھ کبھی ناانصافی نہ کرنا، کبھی زیادتی نہ کرنا۔ اور انہوں نے ثمرہ کے ساتھ شادی کر کے اختر بانو کے ساتھ کتنی زیادتی کی تھی اور پھر انصاف بھی نہ کر سکے تھے۔ اس نے نہ کوئی اعتراض کیا تھا نہ گلہ۔

لیکن اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی۔ وہ جھرنوں جیسی ہنسی کہیں کھو گئی تھی اور یہ شاید احساس ندامت ہی تھا کہ انہوں نے جہاں زیب بیگ کا بہت خیال رکھا تھا اور مزید رکنے کے لیے اصرار بھی کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ تین دن سے زیادہ نہیں رک سکتے تھے کہ یہاں سے واپس جا کر اگلے ہی دن آزین کو اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد انٹرویو دینے جانا تھا۔ انٹرویو کے لیے لیٹر اسے اس روز ملا تھا جب وہ حیدر آباد کے لیے ٹرین میں سیٹیں بک کروا چکے تھے ورنہ انٹرویو کے بعد ہی حیدر آباد کا پروگرام بناتے۔

حیدر آباد سے آگے انہیں بذریعہ بس یا ویگن سفر کرنا تھا۔ ان کا پروگرام تین دن سے زیادہ رہنے کا نہیں تھا بلکہ جہاں زیب بیگ نے تو یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ اگر ثوبان شاہ کا رویہ اچھا نہ ہوا تو وہ ایک دن کے بعد ہی واپس آ جائیں گے لیکن اپنی اس سوچ کے متعلق انہوں نے آزین یا زمل سے ذکر

نہیں کیا تھا۔ اور اب جب ثوبان شاہ نے جس طرح انہیں عزت و احترام دیا تھا اگر آزین کے انٹرویو کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دو دن مزید رک جاتے۔

اختر بانو بہت اداس تھی۔ دو دن جیسے خواب کی طرح گزر گئے تھے۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے جب جہاں زیب بیگ نے بتایا کہ کل دوپہر، وہ یہاں سے چلے جائیں گے کہ انہوں نے حیدرآباد سے سات بجے کی ٹرین پکڑنی تھی۔

''ڈرائیور اکرم آپ کو حیدرآباد چھوڑ آئے گا۔ ویسے تو میں خود آپ کو چھوڑ آتا لیکن مجھے صبح اپنے مہمانوں کو لے کر، سائیں بیدار بخت کے گوٹھ میں ملاقات کے لیے جانا ہے کہ یہ دراصل ان سے ہی ملاقات کی غرض سے آئے تھے لیکن سائیں بیدار بخت ملاقات کا وقت نہیں دے رہے تھے۔ اپنی کچھ نجی مصروفیات کی وجہ سے۔'' ثوبان شاہ نے ادب سے معذرت کی تو وہ بے اختیار بولے۔

''نہیں بیٹا! کوئی بات نہیں۔ ہم تو بس یا وین سے بھی چلے جاتے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے چچا جان۔'' ثوبان شاہ مدھم سا مسکرائے۔ ''گھر میں گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے۔ مجھے جانا نہ ہوتا تو میں اور اختر بانو حیدرآباد تک آپ کے ساتھ جاتے۔''

اختر بانو نے حیرت سے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا اسے ثوبان شاہ کے ساتھ کہیں باہر گئے۔ دل کا گداز آنکھوں میں نمی بن کر چمکا اور ثوبان شاہ کی نظروں نے اسے جیسے اندر تک کھوج لیا۔ اندر ہی اندر وہ نادم سا ہوئے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اختر بانو کے ساتھ اکثر یوں ہی بے مقصد لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے تھے۔

''ابا جان! آپ زمل کو چھوڑ جائیں نا یہاں کچھ دن میرے پاس۔ کتنے سالوں بعد میں اس سے ملی ہوں۔'' اختر بانو نے نگاہیں جھکا کر آنکھوں کی نمی چھپائی تھی۔

''ہاں چچا جان! زمل بیٹی کو چھوڑ جائیں۔ میں اور اختر بانو خود اسے لاہور چھوڑ جائیں گے اسی بہانے سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

ثوبان شاہ نے پھر اختر بانو کو حیران کیا تھا۔ لیکن وہ ثوبان شاہ کی طرف دیکھنے کے بجائے سوالیہ

نظروں سے جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''زمل سے پوچھ لو کیا کہتی ہے وہ......'' انہوں نے زمل کی طرف دیکھا۔ زمل یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ لاہور سے باہر کسی دوسرے شہر آئی تھی۔ اس نے منیرا کے ساتھ جا کر تقریباً وہ سارا علاقہ دیکھ لیا تھا۔ آزین کے ساتھ جا کر ڈھیروں تصویریں بھی بنائی تھیں۔ اور صبح ناشتے کے بعد اس کا پروگرام آموں کے باغات دیکھنے جانے کا تھا۔ لیکن ایک دو دن مزید رکنے کی خواہش کے باوجود وہ نہیں رک سکتی تھی کہ اسے شاہ زیب کا خیال پریشان کرتا تھا۔ پتا نہیں ابا نے کھانا بھی صحیح طرح سے کھایا ہو گا یا نہیں۔ گو وہ بی بی اماں کے علاوہ شیخو بابا کو بھی تاکید کر کے آئی تھی کہ وہ بطور خاص ان کا خیال رکھیں۔ دن میں ان کی خیر خبر لینے کے علاوہ رات کو ان کے کمرے میں ہی سو جایا کریں کہ بی بی اماں، جب رات کو دوا کھا کر سوتی تھیں تو ان کی نیند بہت گہری ہوتی تھی اور خدانخواستہ اگر کبھی رات میں ابا کی طبیعت خراب ہو جائے تو......

''رک جاؤ نا ملی......'' اختر بانو نے کہا تو وہ چونکی۔

''آپ کو پتا ہے نا ابا کا۔ پتا نہیں بی بی اماں ان کا صحیح طرح سے خیال بھی رکھ پاتی ہوں گی یا نہیں۔ جب سے ابا کی یہ حالت ہوئی ہے میں سوائے یونی ورسٹی کے کہیں نہیں گئی۔ پہلی بار اس طرح اتنے دنوں کے لیے گھر سے باہر ہوں۔ آپ آیئے گا نا امان بھائی اور انکل کے ساتھ اور بہت سارے دن رہیے گا۔ آئیں گے نا آپ......'' اس نے بات کرتے کرتے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا تو وہ شفقت سے مسکرائے۔

''ہماری بیٹی نے دعوت دی ہے تو ضرور آئیں گے ان شاء اللہ!''

تب ہی ان کا فون آ گیا تو وہ معذرت کرتے ہوئے ڈائننگ روم سے باہر نکل گئے تو اختر بانو امان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''مانی بیٹا! صبح ذرا جلدی اٹھ جانا ناشتے کے بعد زمل اور آزین کو آم کے باغات دکھا لانا۔ تمہارے بابا نے کہہ تو دیا ہے اکرم سے لیکن تم اپنی نگرانی میں آم کی پیٹیاں گاڑی میں رکھوا دینا۔''

"آپ بے فکر رہیں اماں جان...... میں آم کی پیٹیاں ٹرین میں بھی رکھوا دوں گا کیونکہ میں اکرم کے ساتھ خود بھی نانا جان کو چھوڑنے حیدر آباد تک جاؤں گا۔"

امان بہت بچپن میں کہیں اختر بانو کے ساتھ لاہور آیا تھا۔ تب زل خود بھی اتنی بڑی نہیں تھی کہ اسے یاد رہتا کہ تب امان کیسا تھا۔ لیکن اب امان اسے اچھا لگا تھا مخلص، بے تکلف اور خوش اخلاق سا۔ بالکل چھوٹے بھائی جیسا لگا تھا۔ وہ تقریباً دو سال اس سے چھوٹا تھا۔

اس کا یہاں آنے سے پہلے خیال تھا کہ پھپھو کے بچے بہت مغرور اور اکڑو سے ہوں گے لیکن امان سے مل کر اس کا خیال بدل گیا تھا۔ ریحان اور نعمان کیسے تھے یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی پتا چلنا تھا۔

"اور مجھے وہاں حیدر آباد اسٹیشن سے چوڑیاں بھی لینی ہیں سحرش کے لیے۔ کیا آپ کو پتا ہے امان کہ وہ کہاں سے ملیں گی؟ سحرش نے بطور خاص فرمائش کی تھی۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں؟" امان ابھی سب ماموں زاد بہن بھائیوں کے متعلق نہیں جانتا تھا۔

"ارباب چچا کی بیٹی ہیں اور ان کا مشغلہ ٹیرس پر لٹک کر ہماری جاسوسی کرنا ہے۔"

"بطور خاص آپ کی جاسوسی......؟" امان مسکرایا۔

"نہیں، نیچے والوں کی۔"

"چلیں کبھی لاہور آئے تو سب سے ملاقات ہو گی۔ بلکہ میرا ارادہ تو پنجاب یونی ورسٹی سے ماسٹر کرنے کا ہے۔ اپلائی کر رکھا ہے۔" اس نے بتایا تو جہاں زیب بیگ یک دم خوش ہو گئے تھے۔

"ایڈمیشن کے سلسلے میں کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔ میرے کچھ کولیگز اور جاننے والے ہیں وہاں اب بھی......"

"مجھے یہ تو پتا تھا کہ آپ پڑھاتے ہیں لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ پنجاب یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے۔"

امان کو اتنا ہی پتا تھا کہ نانا کا تعلق تعلیم کے شعبے سے تھا۔

"پہلے گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا تھا، پھر پنجاب یونی ورسٹی چلا گیا تھا۔ وہاں سے ہی ریٹائر ہوا۔ تم نے کس سبجیکٹ میں اپلائی کیا ہے؟"

امان انہیں بتانے لگا کہ اس نے کس مضمون میں اپلائی کیا ہے اور مستقبل میں کیا پروگرام ہے اس کا۔

اختر بانو اور زنل انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ زنل نے اختر بانو سے ان کی شادی کی البم دیکھنے کی فرمائش کی تھی اور اختر بانو نے ڈنر سے پہلے البم ڈھونڈ کر رکھی تھی۔ زنل کو بہت اشتیاق تھا سب کی تصویریں دیکھنے کا۔

تصویریں دیکھ کر وہ سونے کے لیے چلی گئی تھی کہ آزین نے کہا تھا کہ صبح جلدی اٹھیں گے اور وہ امان کے ساتھ صبح صبح قریبی گوٹھ میں فوٹو گرافی کے لیے جائے گا۔ واپس آ کر ناشتہ کر کے پھر آموں کا باغ دیکھنے جائیں گے اور پھر عصر سے پہلے ہی انہیں حیدر آباد کے لیے نکلنا تھا۔ آزین کو فوٹو گرافی کا شوق تھا اور جہاں کہیں جاتا اپنا کیمرہ ضرور لے کر جاتا تھا۔ سو صبح وہ نماز کے بعد سوئی نہیں تھی۔ بھاگی نے بیڈ ٹی کمرے میں ہی پہنچا دی تھی۔ آزین اور امان چائے پی کر نکل گئے تھے لیکن واپسی میں انہیں دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اختر بانو سے اجازت لے کر منیرا کے ساتھ باغات دیکھنے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو ثمرہ لاؤنج میں بیٹھی اپنی ملازمہ سے پاؤں دبوا رہی تھی۔ اس نے لاؤنج کے کھلے دروازے سے دیکھا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے کچن کی طرف جاتی نوراں سے پوچھا۔

''یہ چھوٹی بی بی ہیں۔ اپنے میکے گئی ہوئی تھیں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہیں۔'' نوراں نے بتایا۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی تھی جو وہ شاید کچن میں رکھنے جا رہی تھی۔

''اچھا پھپھو کی دیورانی ہیں۔ چھوٹی یا بڑی؟'' وہ ابھی تک لاؤنج کے باہر کھڑی تھی۔

''نہ جی نہ یہ تو......'' منیرا نے نوراں کی طرف دیکھا۔ ''اپنے ثوبان شاہ کی دوسری بیوی ہیں۔ عمر میں تو اپنی بانو بی بی سے کافی بڑی ہیں لیکن شاہ جی نے ان سے شادی بعد میں کی تھی اس لیے سب انہیں چھوٹی بی بی کہتے ہیں۔''

''مطلب......؟'' زنل حیران ہوئی تھی۔ ''پھپھو کی......''

''ہاں!'' اب کے نوراں نے جواب دیا تھا۔ ''چھوٹی بی بی آپ کی پھپھو کی سوکن ہیں۔''

اس نے ایک اذیت سی محسوس کی۔ ''بھلا پھپھو میں کیا کمی تھی جو ثوبان انکل نے دوسری شادی کر لی۔''

''کمی تو کوئی نہیں تھی پر ثمرہ بی بی، شاہ جی کے تایا کی بیٹی ہیں اور خاندان میں ان کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں تھا تو بڑے شاہ جی نے شاہ جی سے کہا کہ انہیں ہی ثمرہ بی بی سے شادی کرنا ہے۔ مہران شاہ اور زمان شاہ ایک تو چھوٹی بی بی سے کافی چھوٹے تھے دوسرا ان کے رشتے پہلے سے طے تھے اور شاہ جی بس سال بھر ہی چھوٹے تھے بی بی سے۔''

نوراں بتا کر کچن میں چلی گئی۔ وہ چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی، تب ہی تو پھپھو کی آنکھوں میں ایک اداسی سی مستقل ٹھہری ہوئی سی لگتی ہے اور دادا جان نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ...... اور وہ لاؤنج میں جانے کے بجائے گیسٹ روم کی طرف چلی گئی۔ اور منیرا اندرونی گیٹ کھول کر باہر صحن میں چلی گئی تا کہ صحن کی صفائی کر سکے۔ ابھی اس نے جھاڑو اٹھایا ہی تھا کہ بیرونی گیٹ کھول کر شایان اندر داخل ہوا۔ غیر ارادی طور پر منیرا نے اپنا دوپٹا درست کیا۔

''ہے منیرا...... ادھر آؤ بات سنو۔'' شایان اندر جانے کے بجائے صحن میں ہی رک گیا تھا۔ ''وہ لڑکی کون ہے جس کے ساتھ تم باغات کی طرف سے آ رہی تھیں؟ اور وہ تمہارے ساتھ ہی حویلی میں آئی ہے۔''

''جی بڑی بی بی کی بھتیجی ہے۔ لاہور سے آئی ہیں۔ بڑی بی بی کا بھتیجا اور ان کے والد بھی آئے ہوئے ہیں۔'' منیرا نے نظریں جھکائے جھکائے ادب سے جواب دیا۔

''اچھا پہلے تو یہ لوگ کبھی نہیں آئے۔'' شایان حیران ہوا۔

''جی بی بی جی بتا رہی تھیں،، بہت عرصہ بعد آئے ہیں۔ انہیں بھی میکے گئے بہت عرصہ ہو گیا تھا سو ملنے چلے آئے۔'' منیرا کی نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''کمال ہے، کیسے لوگ ہیں، کبھی بیٹی سے ملنے ہی نہیں آئے۔'' شایان بڑبڑایا اور وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا۔ وہ حیدر آباد سے ثمرہ کے ساتھ ہی واپس آیا تھا لیکن باہر مردانے میں ہی اسے بخشو سے پتا چلا تھا کہ ثوبان شاہ ڈیرے پر گئے ہیں اور وہاں سے ہی اپنے مہمانوں کو لے کر، سائیں بیدار بخت کی طرف چلے جائیں گے۔ اسے اپنے دوست کے لیے سفارش کروانی تھی جس نے مہران ٹیکسٹائل مل میں

جاب کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اور اسے بابا سے کہنا تھا کہ وہ آج ہی مہران چاچو کو فون کر کے اس کے دوست کے لیے کہہ دیں۔ اس سے پہلے کہ وہاں کسی اور کو رکھ لیا جائے۔

ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر آموں کے باغات کی طرف سے آتی ہوئی لڑکی پر پڑی، حویلی میں کام کرنے والی منیرا اس کے ساتھ تھی۔ وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟ نہ منیرا کی برادری کی لگتی ہے نہ یہاں کی رہنے والی، پھر کون ہے۔'' اسے لڑکیوں سے دوستیاں کرنا، ان سے فلرٹ کرنا اور بے وقوف بنا کر انجوائے کرنا پسند تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ ڈیرے پر جانے کے بجائے واپس مڑ کر منیرا کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ اپنی ہی حویلی تک آیا۔ وہ لڑکی اور منیرا اندر داخل ہو گئیں۔

شاید کوئی نئی ملازمہ یا پھر کوئی مہمان ہے۔ وہ سوچتا ہوا اندر داخل ہوا تو صحن میں ہی منیرا اسے جھاڑو اٹھائے نظر آ گئی اور پھر منیرا سے معلومات لے کر وہ واپس مڑ گیا کہ اس کا آج ہی بابا سے ملنا ضروری تھا۔

خیر واپس آ کر تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔

''کافی خوب صورت لڑکی ہے۔ اور اس کی ہنسی تو غضب کی ہے جیسے جھرنے بجتے ہوں۔ خیر میں بھی شایان شاہ ہوں اور آج تک شایان شاہ کو کوئی لڑکی رد نہیں کر سکی تو پھر یہ لڑکی بھی......'' اس نے خود سے کہا اور دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے دائیں مونچھ کو عادتاً مروڑتے ہوئے اس لڑکی کو پٹانے کے منصوبے بنانے لگا لیکن اس کے سارے منصوبے خاک میں ہی دم توڑ گئے جب رات کھانے کی ٹیبل پر صرف گھر کے ہی افراد تھے۔ وہ ڈیرے سے واپس گھر آنے کے بجائے ثوبان شاہ کے ساتھ ہی سائیں بیدار بخت کی طرف چلا گیا تھا کہ اس کا بیٹا، حیدر آباد کالج میں اس کا ہم جماعت تھا اور اچھی خاصی دوستی تھی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ اختر بانو کے عزیز واپس چلے جائیں گے تو وہ کبھی ثوبان شاہ کے ساتھ نہ جاتا۔

اس نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا اور اختر بانو سے پوچھا۔
''آپ کے مہمان کیا کھانا نہیں کھائیں گے؟'' اختر بانو نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ بہت کم ہی اس سے مخاطب ہوتا تھا۔
''میرے مہمان......؟''
''جی وہ منیر ابتا رہی تھی کہ لاہور سے آپ کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''
''ہاں!'' اختر بانو کو اس کا استفسار اچھا لگا تھا۔ ''وہ میرے ابا جان، بھتیجا اور بھتیجی آئے ہوئے تھے۔ آج واپس چلے گئے ہیں۔ ابا جان کو تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔'' وہ بے اختیار ہی کہہ گئی۔
ثمرہ نے برا سا منہ بنایا اور پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑ گئی تھیں۔
''مجھ سے ملنے کا شوق تھا انہیں......'' وہ حیران ہوا۔
''ہاں دراصل صرف مانی سے ہی ان کی ملاقات ہو سکی تھی تو وہ تم چاروں بھائیوں سے ملنا چاہتے تھے۔ ریحان اور نعمان بھی یہاں نہ تھے۔'' اس نے سٹپٹا کر پہلے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا اور پھر شایان کی طرف......
''میرے ہوش میں آپ کے ابا جان وغیرہ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔'' اس نے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش کی تھی۔
''ویسے اب کس سلسلے میں آنا ہوا ان کا......؟''
''کس سلسلے کا کیا مطلب؟ وہ اختر بانو کے میکے والے ہیں، بغیر وجہ کے بھی بیٹی سے ملنے آسکتے ہیں۔'' ثمرہ کو اس کا مسلسل اختر بانو سے بات کرنا پسند نہیں آ رہا تھا۔
''ہاں آ تو سکتے ہیں لیکن پہلے کبھی آئے جو نہیں، جیسے باقی سب آتے رہتے ہیں۔ ثمینہ اور صفورا چچی کے میکے والے، میرے نانکے کبھی یوں ہی ملنے کسی موقع پر۔'' اس نے چاول کی ڈش اپنی طرف کھسکائی۔
''دراصل ایک مقصد تو اماں جان سے ملنا تھا کہ انہیں اپنے میکے گئے تقریباً چھ سال ہو گئے ہیں۔'' اماں نے ایک جتاتی نظر ثوبان شاہ پر ڈالی۔ ''اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ میرے ماموں زاد بھائی اور

بہنوں کی شادی ہے تو وہ دعوت دینے آئے تھے کہ ہمیں شادی میں شامل ہونے کے لیے تیار رہنا ہے۔''

''کب ہے شادی......؟'' شایان اب امان سے پوچھ رہا تھا۔

''ابھی تاریخ طے نہیں ہوئی ہے شاید ڈیڑھ دو ماہ تک ہو۔'' امان نے ثمرہ بیگم کی ناگواری محسوس کر لی تھی اس لیے بات ختم کرنے کی کوشش کی اور اختر بانو کی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے۔

''آپ کچھ لے نہیں رہیں اماں جان۔''

اس کی عادت تھی کہ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں ڈالتا رہتا تھا۔

''شادی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہے اور دعوت دینے ابھی آئے ہیں۔ لگتا ہے کوئی ناراضی وغیرہ تھی شادی سے پہلے صلح، مطلب راضی کرنے آئے تھے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''لگتا ہے آپ اور بابا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں گے اور آپ نے اپنے والدین کی مرضی کے بغیر بابا سے شادی کی ہو۔'' اس نے اختر بانو کی طرف دیکھا، جس کا رنگ یک دم سرخ ہوا تھا۔

''شایان......!'' ثوبان شاہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی بے باک ہو گئے ہو۔''

''ظاہر ہے امان کی والدہ ہمارے خاندان کی نہیں، غیر خاندان سے ہیں تو خیال آ گیا۔ امی جان اکثر کہتی رہتی ہیں کہ وہ سید خاندان کی نہیں۔ بہر حال اگر آپ کو اور بڑی امی کو برا لگا ہو تو سوری۔''

وہ کچھ منہ پھٹ اور بے باک تھا لیکن ثوبان شاہ سے بہر حال ڈرتا تھا۔

''یہ شادی خالصتاً تمہارے دادا جان کی خواہش پر ہوئی تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہ تھا۔''

''ایک بار پھر سوری بڑی امی!'' اس نے معذرت طلب نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا۔ اختر بانو نے سر کی جنبش سے اس کی معذرت قبول کی۔

''یہ رواج ہے میری جان، اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو ایک دو ماہ پہلے ہی دعوت دی جاتی ہے کہ انہیں شادی میں شامل ہونا ہو گا، تیاری رکھیں۔ باقاعدہ دعوت پھر تاریخ طے ہونے پر دی جاتی ہے۔''

ثمرہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا لیکن وہ سر ہلا کر پھر اختر بانو کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''کیا یہ دعوت صرف آپ لوگوں کو ہے یا ہمیں بھی ہے؟''

''صرف ہم لوگوں کو کیوں، سب کو ہے۔ ابا جان نے تمہاری پھپھو اور تمہارے چچا وغیرہ کا فون نمبر لے کر انہیں بھی دعوت دی ہے۔'' اختر بانو نے بتایا۔

''اوہ اچھا پھر تو میں ضرور جاؤں گا، مجھے پنجاب کی شادی دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔''

''ضرور......!''

شایان کی بات پر جہاں اختر بانو کی آنکھوں میں جگمگاہٹ سی پیدا ہوئی تھی، وہاں ثمرہ بیگم کی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں اور شایان ان سب سے بے نیاز ہو کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

کیونکہ اب وہ مطمئن تھا کہ شادی میں وہ اس لڑکی کو جو پہلی نظر میں اسے اچھی لگی تھی اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی لڑکی شایان شاہ سے ملے اور اس کی اسیر نہ ہو۔ اسے زعم تھا لیکن نہیں جانتا تھا زل شاہ زیب وہ لڑکی نہیں ہے۔

☆......☆......☆

''زیب النساء!''

ماسٹر عبدالعزیز برآمدے میں چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور سامنے ہی کرسی پر زیب النساء دونوں ہاتھ گود میں دھرے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

''تیری اماں نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔ کیا اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس کے بغیر کیسے جئیں گے۔ ہمیں تو عادت ہی نہیں ہے اس کے بغیر جینے کی۔ پر اس نے کچھ نہیں سوچا اور وہ چلی گئی ہمیں اکیلا اور تنہا چھوڑ کر......''

زیب النساء نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے تھے اور یہ آنکھیں تو ایک سال سے گیلی ہی رہنے لگی تھیں......

جب سے زہرا بتول نے خاموشی سے آنکھیں بند کی تھیں، تب سے یہ آنکھیں خشک ہوئی ہی نہیں تھیں۔ ایک سال دس دن ہو گئے تھے زہرا بتول کو رخصت ہوئے، لیکن ابھی تک ان آنکھوں کو

خشک ہونا نہیں آیا تھا۔

''ایسا لگتا ہے زیب النساء جیسے ہمارا سب کچھ کھو گیا ہو، خالی ہاتھ رخصت ہوئی تھی لیکن لگتا ہے جیسے سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی۔ ہماری خوشی، ہماری ہنسی...... کتنا سنسان، کتنا ویران سا لگتا ہے نا یہ گھر اس کے بغیر...... بھلا کوئی اتنی جلدی کرتا ہے زیب النساء جتنی جلدی تمہاری اماں نے کی......'' عبد العزیز سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''جس طرح اچانک میری زندگی میں آئی تھی۔ اس طرح اچانک چلی بھی گئی۔ کم از کم میرے آنے کا تو انتظار کر لیتی نا......'' گلہ کرتی نظریں زیب النساء کی طرف اٹھیں۔

''پر میرا انتظار بھی نہیں کیا اور چلی گئی۔ چلو میرا نہ سہی، تمہارا ہی خیال کر لیتی...... اٹھتے بیٹھتے تمہاری شادی کا ذکر کرتی رہتی تھی تو کم از کم تمہاری شادی تک تو نہ جاتی۔''

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ زہرا بتول کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک سال دس دن ہو گئے تھے اور اس ایک سال دس دن کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب ماسٹر عبد العزیز نے زیب النساء سے زہرا کی باتیں نہ کی ہوں۔ وہ اسکول سے آ کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتے اور زیب النساء کو کام کرتے دیکھتے ہوئے باتیں کرتے رہتے۔ زیب النساء خاموشی سے سنے جاتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔

''جانتی ہو نا زیب النساء! تمہاری اماں کتنا کم بولتی تھی۔ بس سنتی رہتی تھی۔ پھر بھی کیسا بارونق سا لگتا تھا گھر...... بھرا بھرا سا...... اب کیسا خالی خالی اور بے رونق سا ہو گیا ہے گھر...... ساری رونق تو تیری اماں ساتھ ہی لے گئی زیب النساء۔''

انہوں نے ایک نظر زیب النساء کی طرف دیکھا جس کے رخسار بھی اب گیلے ہو رہے تھے اور وہ انہیں ہاتھوں کی پشت سے پونچھتی جاتی تھی۔ ان کا حلق بھی نمکین ہونے لگا۔ ان کے آنسو ان کے اندر گر رہے تھے۔

''پتا ہے زیب النساء! تمہاری اماں بڑی صابر، بڑی عاجز اور مسکین سی تھی۔ درویش فطرت، نہ

کوئی مطالبہ، نہ کوئی خواہش نہ کوئی فرمائش...... میں کہتا زہرا بتول کبھی تو کوئی فرمائش کیا کرو۔ بتایا کرو کیا جی چاہتا ہے تمہارا...... کچھ تو کہا کرو۔ کہتی کیا کہوں سب کچھ تو بن کہے مل جاتا ہے۔ میں تو کوئی ایسی نیک صالح نہیں تھی پر اللہ نے مجھے ایک انعام کی طرح آپ کا ساتھ دیا۔

بس اس کے بعد کوئی اور چاہ ہی نہیں سوائے اس کے کہ میری ذات سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔

کیا ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں دنیا میں زیب النساء تمہاری ماں جیسی...... نہیں نا؟ بس اسی لیے اللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اب وہاں جنت میں اپنے حامد کے ساتھ خوش خوش گھومتی ہوگی۔ پر اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا زیبی...... بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے اپنے پیاروں کے ساتھ۔"

حلق میں گرنے والے آنسو آنکھوں میں اُمڈ آئے۔

"آپ کے لیے کھانا لاؤں ابا؟ میں نے ماش کی دال پکائی ہے۔" زیب النساء ابا کے رونے سے خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے زیب النساء بیٹی! تم کھا لو۔" انہوں نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا۔

"بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے ابا۔" زیب النساء نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھا۔

"اچھا چل لے آ...... دونوں تھوڑا تھوڑا کھا لیتے ہیں۔"

تقریباً روز ہی ایسا ہوتا تھا۔ بھوک تو کسی کو بھی نہ ہوتی لیکن دونوں ایک دوسرے کی خاطر کھا لیتے۔"

"ارے ہاں زیب النساء! میں تمہارے لیے کالج میں ایڈمیشن لینے کے لیے فارم لایا ہوں۔ نیاز بھائی سے منگوائے ہیں۔" کھانا کھاتے ہوئے عبدالعزیز کو یاد آیا۔

"ایک سال تو ضائع ہو گیا تمہارا، اب اس سال تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گا۔"

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اب اور نہیں پڑھنا۔"

''کیوں؟'' ماسٹر عبدالعزیز کو حیرت ہوئی۔ ''تمہیں تو بہت شوق تھا پڑھنے کا اور تم اپنی فاطمہ باجی کی طرح لیکچرار بننا چاہتی تھیں۔''

''فاطمہ باجی تو شادی کے بعد اب لاہور چلی گئی ہیں۔ میں نے تو ان کے پاس ہی رہ کر پڑھنا تھا تو اب کہاں رہوں گی بھلا......'' اس نے نہ پڑھنے کا جواز ڈھونڈا۔

''جھلی نہ ہو تو...... ہوسٹل میں رہو گی تم اور کہاں...... میں نے تو پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ تمہاری فاطمہ باجی نے تو بعد میں تمہیں کہا تھا کہ تم ان کے پاس رہنا۔''

ماسٹر عبدالعزیز کی تو شروع سے ہی خواہش تھی کہ وہ اسے ماسٹر کروائیں گے۔ خود انہوں نے بی اے، بی ایڈ کیا ہوا تھا لیکن زیب النساء کو تو انہوں نے ایم اے کروانا تھا وہ بھی انگلش میں۔

پر زیب النساء نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے رحیم یار خان، صادق آباد کہیں بھی نہیں جائے گی۔ اسے ابا کو اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ ابا اس کے جانے کے بعد تنہا گھر میں کس سے باتیں کریں گے۔ وہ ابھی تک اماں کی جدائی کے غم سے باہر نہیں نکلے تھے۔ وہ بھی چلی گئی تو تنہائی انہیں مار ڈالے گی۔ پھر ان کے کپڑے کون دھوئے گا، کھانا کون پکائے گا۔ اسے خود بھی بہت شوق تھا پڑھ کر فاطمہ باجی کی طرح لیکچرار بننے کا لیکن ابا اب کچھ بھی کہیں، کتنا بھی مجبور کریں، اس نے سوچ لیا تھا، وہ کہیں نہیں جائے گی بس۔''

''ابا میں نے کہا نا میرا جی نہیں چاہتا اب پڑھنے کا بس......'' اس نے کھانے کے برتن سمیٹے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''علم حاصل کرنا تو بہت سعادت کی بات ہوتی ہے زیب النساء۔'' ماسٹر عبدالعزیز کو اس کی بات سن کر افسوس ہوا تھا۔

''جی ابا......!'' وہ برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

اور جب ماسٹر عبدالعزیز سمجھا سمجھا کر تھک گئے تو اس کے لیے کتابیں لے آئے۔

''ٹھیک ہے گھر میں پڑھ کر امتحان دے دینا۔ آسان سے مضامین کی کتابیں لایا ہوں۔ میں خود

بھی پڑھا دیا کروں گا۔ پڑھائی اچھی چیز ہوتی ہے زیب النساء ہمارے نبی ﷺ نے بھی علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔"

"جی ابا...... گھر میں پڑھ لوں گی۔"

اور ماسٹر عبدالعزیز نے سوچا چلو بارہ جماعتیں پڑھ لے پھر تب تک کچھ نہ کچھ حوصلہ ہو ہی جائے گا۔ جانتے تھے زہرا بتول کی بیٹی ہے اور ان کی وجہ سے ہی نہیں جانا چاہتی کہ وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ جھلی نہ ہو تو۔ آخر جب اس کی شادی کروں گا تب بھی تو اکیلا ہی رہ جاؤں گا۔

لیکن شادی......

بھلا اس پورے چک میں کون ہے جو میری زیب النساء کے لائق ہو جسے اپنی بیٹی کا رشتہ دے کر دل مطمئن ہو۔ اور زہرا بتول کو آپا رسولاں کا بیٹا بہت پسند تھا۔ پر تب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی چلی جائے گی اور مجھے وعدے کی زنجیر میں جکڑ جائے گی۔ میں نے تو اپنی زیبی کے لیے بڑے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اسے پڑھاؤں گا جتنا وہ پڑھے گی۔ پروفیسر بنے گی اور پھر میں اس کی شادی کسی بہت پڑھے لکھے شخص سے ہی کروں گا۔ لیکن انسان کے ارادے اور خواب......

بہاول پور جانے سے پہلے زہرا نے کیسے ان سے وعدہ لیا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ زیب النساء کی جلد شادی کر دیں گے اپنی شادی سے پہلے......

وہ تو تیاری کیے بیٹھی تھی آخری سفر کی، مجھے ہی سمجھ نہیں آئی اور میں وعدہ کر بیٹھا۔

"اور اپنی شادی......" وہ دل ہی دل میں ہنسے...... "میں بھلا کیوں شادی کروں گا۔ زہرا بتول کے بعد بھلا مجھے کوئی اس جیسی مل سکتی ہے۔ اور مل بھی جائے تو وہ زہرا بتول تو نہیں ہو سکتی نا۔ اور یہ زہرا بتول تو بس ایسی ہی جھلی باتیں کرتی رہتی تھی۔ حامد کی وفات کے بعد کتنی بار اس نے کہا تھا ماسٹر جی آپ کا دل تو چاہتا ہوگا نا کہ آپ کا بھی بیٹا ہو۔ تو آپ دوسری شادی کر لیں۔ میں خود آپ کو اجازت دے رہی ہوں نا۔"

بڑی آئی اجازت دینے والی حاتم طائی کی سگی......

وہ اس سے ناراض ہو جاتے۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی زندگی میں تو کیا، مرنے کے بعد بھی دوسری شادی کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ لیکن زیب النساء کی شادی کے لیے تو انہیں کوئی اچھا رشتہ دیکھنا چاہیے۔

زندگی کا کیا بھروسہ...... انہیں بھی زہرا بتول کی طرح اچانک کچھ ہو گیا تو زیب النساء تو اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں...... زہرا صحیح ہی تو کہتی تھی کہ میری زیبو کو جلد ہی اپنے گھر کا کر دیجیے گا تب ایک روز وہ استانی جی کے گھر چلے گئے۔

انہیں لگا تھا کہ استانی جی ضرور ان کی زیب النساء کے لیے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں گی۔ ان دنوں وہ اس کی پڑھائی کا بھول کر ہر وقت اس کی شادی کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔

''آپا جی!'' انہوں نے استانی جی سے دل کی بات کی تھی۔ ''زہرا اس طرح اچانک چلی گئی ہے کہ دل ڈرنے لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی میں ہی اسے اپنے گھر کا کر دوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو زیب النساء کے لیے......''

''فکر نہ کریں ماسٹر صاحب......'' استانی جی نے انہیں تسلی دی تھی۔ ''ان شاء اللہ اچھا رشتہ مل جائے گا۔ میں فاطمہ سے بھی کہوں گی کہ اپنے سسرال میں زیب النساء کے لیے کوئی رشتہ دیکھے۔ ہماری زیب النساء لاکھوں میں ایک ہے۔ اتنی حسین ہے پھر اتنے گنوں والی مجھے اپنی فاطمہ کی طرح ہی عزیز ہے اور جب تک اچھا رشتہ نہیں ملتا، آپ اس کی پڑھائی کی طرف دھیان دیں۔ ایف اے تو خیر پرائیوٹ ہی کر لے لیکن بی اے کے لیے کالج میں داخل کروا دیجیے گا۔ اس اثنا میں اگر مطلب کا رشتہ مل گیا تو ٹھیک، ورنہ پڑھتی رہے گی۔ میں لڑکیوں کے لیے تعلیم کو بہت ضروری سمجھتی ہوں ماسٹر صاحب...... اگر میرے والد صاحب نے مجھے تعلیم نہ دلوائی ہوتی تو فاطمہ کے والد کی وفات کے بعد فاطمہ کی اس طرح پرورش نہ کر سکتی جس طرح کی...... میکے میں بھائی بھی تھے اور انہوں نے کہا بھی کہ وہ میری اور فاطمہ کی کفالت کریں گے لیکن میری فاطمہ ساری زندگی ان کے سامنے جھکی نظروں کے ساتھ زندگی گزارتی۔

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے رشتے کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اور اسے پڑھنے دیں۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ یہ نہیں کہ زہرا کا غم دل میں ختم ہو گیا ہے لیکن صبر اور حوصلہ آ گیا

ہے۔ زیب النساء اب اس طرح روتی بلکتی نہیں ہے جیسے دو سال پہلے تڑپتی تھی اور اب دل لگا کر پڑھ بھی رہی ہے۔ دو تین ماہ تک امتحان ہو جائے گا اس کا تو پھر دیکھتے ہیں کچھ، لیکن ماسٹر صاحب شادی جلدی کرنے کے چکر میں کسی ایرے غیرے کو زیب بیٹی کا ہاتھ نہ تھما دیجیے گا۔"

اور ماسٹر صاحب بہت مطمئن ہو کر گھر آئے تو گھر میں ماسی نور بھری بتاشوں اور مٹھائی کا تھال لیے بیٹھی تھی۔

"یہ کیا......؟" انہوں نے میز پر پڑے تھالوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دو سال ہو گئے زہرا کو گزرے تو میں تو بھی اپنے اسلم کی بات پکی کرنے آئی ہوں۔ زہرا سے زبانی بات تو ہوئی تھی میری۔" خوشی سے چہکتے ہوئے ماسی نور بھری نے کہا تو وہ ہکا بکا سے اسے دیکھنے لگے۔
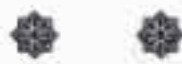
❁ ❁

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 5

''کیا......؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' ماسٹر عبدالعزیز ابھی تک حیران کھڑے تھے۔

''لو میں نے کون سی پہیلی ڈال دی ہے ماسٹر صاحب۔ سیدھی بات کی ہے کہ اب شادی کی تاریخ دے دیں تو میں بھی اپنے اسلم کے سر پر سہرا سجاؤں۔'' وہ ہنسی۔

''میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا ماسی! اسلم کی شادی کی تاریخ سے بھلا میرا کیا مطلب؟'' ماسٹر عبدالعزیز اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

''لو آپ کا تعلق کیسے نہیں، باپ آپ ہیں تو شادی کی تاریخ کیا میں گاؤں والوں سے لینے جاؤں گی۔'' اب وہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر زور سے ہنسی۔

''صاف صاف بات کریں ماسی! پہیلیاں نہ بجھوائیں۔'' ماسٹر عبدالعزیز الجھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''تو صاف بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ میں نے زہرا سے برسوں پہلے بات کی تھی اپنے اسلم اور زیب النساء کے رشتے کی تو تب اس نے کہا تھا کہ ہماری بیٹی ابھی چھوٹی ہے۔ پھر ہم اسے پڑھانا چاہتے ہیں تو میں نے کہا تھا۔ سو بسم اللہ کر کے پڑھائیں۔ میرا اسلم کون سا بوڑھا ہوا جا رہا ہے تو بس تب سے ہی اس انتظار میں تھی کہ زیبو پڑھ لے تو...... پر آہ!'' وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

''بے چاری زہرا چلی گئی اور اب تو اسے بھی مرے دو سال ہو گئے اور زیبو پڑھ بھی نہیں رہی تو میں نے کہا اب کتنا انتظار کروں۔ میرا بھی اکو اک (ایک ایک) بیٹا ہے تو بس ماسٹر جی مجھے آج تاریخ دے دیں کہ کب اپنے بیٹے کی بارات لے کر آؤں۔''

ماسٹر عبدالعزیز نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''ہم نے کب اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو دیا کہ آپ تاریخ لینے آ گئیں۔ زہرا نے آپ کو کہہ تو دیا تھا کہ ہمیں ابھی اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنی۔''

''ہاں تو یہ ہی کہا تھا کہ ہمیں ابھی شادی نہیں کرنی۔ تو میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ چلو ٹھیک ہے، انتظار کر لوں گی۔ صاف صاف یہ تو نہیں کہا تھا کہ رشتہ ہی نہیں دینا۔''

''تو ٹھیک ہے ماسی! میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دینا آپ کے بیٹے کو۔'' ماسٹر عبدالعزیز نے بمشکل اپنا غصہ دبایا۔

''میں سالوں سے انتظار کر رہی ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں رشتہ ہی نہیں دینا۔ واہ بھئی واہ!'' نور بھری نے تالی بجائی۔ ''اگر رشتہ نہیں دینا تھا تو پھر لارا کیوں لگایا تھا؟''

''کسی نے آپ کو لارا نہیں لگایا تھا۔ آپ کے اپنے دماغ کا فتور ہے سب...... زہرا نے ایک طرح سے انکار ہی کر دیا تھا اب آپ ہی نہ سمجھیں تو قصور کس کا ہے۔'' ماسٹر عبدالعزیز اب بھی تحمل سے کام لے رہے تھے۔

''پر میرا اسلم تو زیب النساء کو اپنی منگ ہی سمجھتا ہے۔ تب ہی تو انتظار کر رہا ہے۔'' ماسی نور بھری اب کے ذرا نرمی سے بولی تھی۔

''اچھا!'' ماسٹر عبدالعزیز کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تب ہی مراثیوں کی لڑکی بھگا کر لے گیا تھا۔ وہ تو مراثی تھوڑے تگڑے تھے تو لڑکی برآمد کروالی اور صرف برآمد ہی نہیں کروائی، جیل کی ہوا بھی کھلا دی۔''

''میرا بیٹا ایسا نہیں ہے ماسٹر صاحب! وہ تو کمی کمینوں کی لڑکیاں خود ہی اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ایسا گھبرو اور سوہنا جوان ہے میرا اسلم۔ شریف اور بھولا سا۔'' لہجے میں خود بخود ہی فخر آ گیا تھا۔

''میرا منہ مت کھلواؤ ماسی بھری!'' وہ بے زار سے ہوئے تھے۔ ''سارا گاؤں جانتا ہے آپ کے بیٹے کی شرافت اور بھولپن۔ کہیں تو ابھی دو چار قصے کھول کر سنا دوں۔''

''سارے گاؤں والے جلتے ہیں میرے پتر سے۔'' وہ چیخ کر بولی۔ ''آپ ان کی باتوں میں نہ

آئیں۔بس آپ مجھے بتائیں کہ کب بارات لے کر آؤں اپنے شہزادے پتر کی۔ بہو تو بس میری زیب النساء ہی بنے گی۔"

حق جتاتا انداز تھا لیکن ماسٹر عبدالعزیز کا صبر جواب دے گیا تھا۔

"بس......!" انہوں نے ذرا سا دایاں ہاتھ بلند کیا۔"بہت ہو گیا...... اپنے بتاشوں کا تھال اٹھائیں اور جائیں۔ آئندہ اس مقصد کے لیے میرے گھر مت آیئے گا۔انکار کر چکا ہوں صاف صاف پھر بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میرا بیٹا بے غیرت نہیں ہے۔ دیکھتی ہوں کیسے کوئی اور اس کی منگ کو بیاہ کر لے جاتا ہے۔"

ماسی نور بھری نے بتاشوں کا تھال اٹھایا اور بڑبڑاتی ہوئی دروازہ زور سے بند کرتی گھر سے باہر نکل گئی۔

ماسٹر عبدالعزیز سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ حیران ہو رہے تھے کہ کیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ جھوٹ بول رہی تھی۔

"کیا کوئی ایسا بھی دھوکے باز ہوتا ہے۔"

"ابا!" زیب النساء جو باورچی خانے میں ماسی نور بھری کے لیے چائے بنانے گئی تھی اور ماسٹر عبدالعزیز کے آنے کے بعد وہاں ہی پیڑھی پر بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی، پریشان ہو کر باہر آئی تھی۔

"یہ...... یہ ماسی کیا کہہ رہی تھی؟" اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں، تم پریشان مت ہو۔ ایسے ہی کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی اسے اور نادان عورت اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔"

"ابا......!" وہ سب کچھ سن چکی تھی۔"مجھے اسلم بھائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر کبھی گلی میں سے گزرتے ہوئے سامنا ہو جائے تو ایسے گھورتے ہیں جیسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ میں ہوں نا اور ہاں آئندہ جب میں گھر پر نہ ہوں تو دروازے کی اندر سے کنڈی لگا کر رکھنا۔"

اندر ہی اندر وہ فکر مند سے تھے لیکن اسے تسلی دی اور پھر اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے کہ کیسی تیاری ہے۔ اگر وہ مطمئن ہے تو اگلے ماہ ایڈمیشن جائیں گے تو وہ اس کا ایڈمیشن بھجوا دیں گے۔

”جی ابا! تیاری تو ہے۔ تھوڑی سی انگلش کی تیاری رہتی ہے۔ بی پیپر کی۔ مضامین وغیرہ کی...... لیکن ہو جائے گی ابھی تو کافی ٹائم ہے۔“

وہ بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ جانتی تھی کہ ابا کبھی بھی اسلم جیسے لوفر سے اس کی شادی نہیں کریں گے۔

لیکن ماسٹر عبدالعزیز مطمئن نہیں تھے، اسے تو تسلی دے دی تھی لیکن خود بے حد مضطرب اور بے چین تھے۔ کبھی ماسی نور بھری کی ڈھٹائی پر غصہ آتا کہ کیسے ایک جھوٹی بات پر ڈٹی ہوئی تھی اور کبھی خود پر غصہ آتا کہ جب پہلی بار وہ رشتہ لے کر آئی تھی تو بجائے یہ کہنے کے کہ زیب النساء ابھی چھوٹی ہے، صاف صاف انکار کر دیتے تو اس طرح دیدہ دلیری سے وہ بتاشوں کا تھال اٹھا کر نہ چلی آتی۔

رات کو انہیں ٹھیک طرح نیند بھی نہیں آئی تھی۔ اسکول میں بھی وہ ایسے ہی مضطرب اور بے چین سے رہے تھے، حتیٰ کہ جب وہ چوہدری عبدالمالک کے ہاں ان کے بیٹوں کو پڑھانے گئے تب بھی ایسے ہی مضطرب اور بے چین سے تھے۔ چوہدری عبدالمالک کے بڑے دونوں بیٹے تو اب یونی ورسٹی میں پڑھ رہے تھے جبکہ دونوں چھوٹوں کو وہ حساب پڑھانے جاتے تھے اور کبھی کبھار چوہدری عبدالمالک سے بھی دعا وسلام ہو جاتی تھی، زیادہ تر تو وہ مصروف ہوتے تھے لیکن آج اتفاق سے وہ گھر پر موجود تھے، جب ماسٹر عبدالعزیز بچوں کو پڑھا چکے تو معمول کے مطابق خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے وہ بھی وہاں ہی آ گئے۔

بچے چلے گئے تو عبدالعزیز صاحب سے خیر خیریت معلوم کرتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ ہمدرد آدمی تھے تو پوچھ بیٹھے کہ وہ کچھ پریشان ہیں اور ماسٹر عبدالعزیز صاحب نے بھی سب کچھ بتا دیا کہ بہت مضطرب اور پریشان تھے اور کوئی اپنا نہ تھا جس سے حالِ دل کہتے۔ عبدالمالک چوہدری نے ساری بات سن کر تسلی دی۔

”فکر نہ کریں ماسٹر صاحب! نور بھری اور اسلم کو تو میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ دوبارہ اس

ارادے سے آپ کے گھر کی طرف نہیں آئے گی۔ رہی زیب النساء بیٹی کے رشتے کی بات، تو میرے ایک دو جاننے والے ادھر صادق آباد میں ہیں، آپ کی ہی آرائیں برادری کے، ان سے بات کروں گا، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ یقیناً کہیں نہ کہیں بات بن جائے گی۔ باخدا اگر میرا بڑا اپنے ماموں کی بیٹی سے منسوب نہ ہوتا اور چھوٹے نے وہاں ہی یونی ورسٹی میں کوئی لڑکی پسند نہ کر لی ہوتی تو میں اسی وقت زیب النساء بیٹی کو بہو بنا کر گھر لے آتا۔"

چوہدری عبدالمالک ایسا ہی تھا۔ دلیر، سخی اور اعلا ظرف اسی لیے سارے چک والے اس کی عزت کرتے تھے اور اگر کسی کو کوئی مسئلہ ہوتا تو چوہدری عبدالمالک کے پاس ہی جاتے اور وہ بہت خلوص سے ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا۔

ماسٹر عبدالعزیز چوہدری عبدالمالک کا شکریہ ادا کر کے حویلی سے نکلے تو اضطراب اور پریشانی کسی حد تک کم ہو چکی تھی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ استانی کے بعد اب چوہدری عبدالمالک سے بھی انہوں نے زیب النساء کے رشتے کے لیے کہہ دیا تھا، اب جو اللہ چاہے۔

وہ سر جھکائے اپنی ہی سوچوں میں گم گلی میں داخل ہوئے تو گلی میں عین اپنے گھر کے دروازے کے سامنے اسلم کو ٹہلتا دیکھ کر چونکے۔ وہ انہیں آتا دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا اور اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا اپنے گھر میں چلا گیا۔ ماسٹر عبدالعزیز ایک بار پھر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے وہ زیب النساء کو استانی جی کے گھر چھوڑ جایا کریں گے اور واپسی پر لیتے ہوئے گھر آ جائیں گے کہ بھلے سے دروازے کی کنڈی اندر سے لگی ہو، چھت سے چھت ملی تھی، اگر نیت خراب ہو تو دیوار پھلانگ کر چھت پر آیا جا سکتا تھا۔

استانی جی تو ان کی بات سن کر خوش ہو گئی تھیں۔ وہ سارا دن گھر پر اکیلی ہوتی تھیں۔ ظہر کے بعد کچھ بچیاں قرآن پڑھنے آ جاتی تھیں تو دل ذرا بہل جاتا تھا۔ فاطمہ بھی تین چار ماہ بعد ہی چکر لگاتی تھی، وہ بھی دو تین روز کے لیے۔ اگرچہ دو دن بعد ہی چوہدری عبدالمالک نے انہیں بتایا تھا کہ انہوں نے اسلم اور نور بھری کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ اگر اسلم نے آپ کے گھر کی طرف نظر بھی ڈالی تو پھر ساری

عمر کے لیے جیل میں سڑتا رہے گا۔ پھر بھی کچھ استانی جی کا اصرار تھا اور کچھ ان کا اپنا دل بھی وہمی سا تھا، سو وہ ہر روز صبح زیب النساء کو استانی جی کی طرف چھوڑ جاتے تھے اور واپسی پر لے جاتے تھے۔

زیب النساء استانی جی کے گھر وقت گزار کر بہت خوش تھی۔ استانی جی سے باتیں کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ سالن وہ رات کو ہی بنا کر رکھ دیتی تھی۔ روٹیاں جا کر پکا لیتی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے بھی محسوس کیا تھا کہ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں اور چہرے پر رونق سی آ گئی تھی۔

زہرا کے بعد جس طرح وہ بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اب بولنے لگی تھی۔ کام کرتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ کر پڑھتے ہوئے وہ پہلے کی طرح باتیں کرتی رہتی تھی۔ اپنی استانی جی کی، فاطمہ آپا کی، زہرا کی......

یہ نہیں تھا کہ اس نے زہرا کو بھلا دیا تھا اس کا ذکر کرتے کرتے اب بھی اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں، رخسار گیلے ہو جاتے تھے لیکن وہ زندگی جو زہرا کے بعد اس کے اندر مر سی گئی تھی، ایک بار پھر نمو پانے لگی تھی۔ استانی جی کے پاس رہ کر اس نے حوصلہ، صبر اور شکر کرنا سیکھا تھا۔ اس نے اللہ کی رضا پر راضی ہونا سیکھ لیا تھا۔

استانی جی کی زندگی اس کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی، جس کا ہر ورق اسے کچھ سکھاتا تھا اور استانی جی ہر روز کوئی نہ کوئی ورق کھول کر اس کے سامنے رکھ دیتی تھیں۔

استانی جی جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ چھوٹی سی فاطمہ تب ان کی گود میں تھی۔ ان کی زندگی کی کتاب ان کی جدوجہد، ان کے صبر، حوصلے اور ہمت کی کہانی تھی اور وہ ایک ایک صفحہ پڑھ رہی تھی اور سیکھ رہی تھی...... صبر، حوصلہ، شکر۔

ماسٹر عبدالعزیز ان کے ممنون تھے اور وہ اکثر اپنی ممنونیت کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انہیں ایف اے کے داخلہ فارم لینے رحیم یار خان جانا تھا، پرائیوٹ داخلہ بھجوانے کی تاریخ کا اعلان ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ایک ساتھی ٹیچر کے گھر جس کا تعلق رحیم یار خان سے تھا اس کے سسر کی تعزیت کے لیے بھی جانا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ استانی جی سے کہیں گے کہ آج رات زیب النساء ان

کے گھر پر ہی رہے گی، ہوسکتا ہے واپسی پر انہیں دیر ہو جائے یا پھر وہ رات آ ہی نہ سکیں، سو اس روز جب وہ زیب النساء کو چھوڑنے گئے تو انہوں نے استانی جی سے درخواست کی تو استانی جی نے ان کی توقع کے مطابق انہیں تسلی دی تھی۔

''آپ بے فکر ہو جائیں ماسٹر صاحب!''

''میں ہاف ڈے کی چھٹی لے کر اسکول سے ہی چلا جاؤں گا۔''

انہوں نے زیب النساء کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ روز کی طرح گلی کا موڑ مڑنے تک انہیں دیکھتی رہی۔ جب وہ دروازہ بند کر کے مڑی تو استانی جی صحن عبور کر کے برآمدے میں پہنچ چکی تھیں۔ فاطمہ آپا کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔

''کیا فاطمہ آپا آئی ہوئی ہیں؟''

تیزی سے صحن عبور کر کے وہ ان کے قریب پہنچی تھی اور فاطمہ کے کمرے کی طرف جاتے جاتے استانی جی رک گئیں۔

''نہیں مہمان ہے۔ فاطمہ کے کمرے میں ٹھہرایا ہے۔ رات اقبال آیا تھا۔ شکاریوں کے ایک گروپ کے ساتھ اسے انہیں لے کر آگے جانا تھا لیکن یہ بچہ راستے میں ہی بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی ضد کر کے ساتھ چلا آیا کہ بخار ہے اتر جائے گا۔ اور یہاں آتے آتے تو اس کا بخار اتنا بڑھا کہ ہوش وحواس ہی کھو بیٹھا تو اقبال اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ رات بھر گھریلو ٹوٹکے ہی استعمال کرتی رہی ہوں اور کچھ دوائیں اقبال بھی دے گیا تھا۔ رات بھر سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی، فجر کے وقت جا کر کہیں بخار ذرا کم ہوا ہے۔ دیکھنے جا رہی ہوں کہ جاگ رہا ہے تو کچھ کھانے کو دے دوں، پھر ذرا حکیم صاحب کو بلا کر لے آتی ہوں۔''

زیب النساء جانتی تھی کہ استانی جی کا بھانجا اکثر شکار کے موسم میں شوقین لوگوں کے گروپ کو شکار کے لیے لے کر جاتا تھا۔ وہ جو فاطمہ آپا کے آنے کا سوچ کر خوش ہو گئی تھی، کچھ اداس سی ہو کر وہاں برآمدے میں پڑے موڑھے پر بیٹھ گئی اور استانی جی فاطمہ کے کمرے میں چلی گئیں اور کچھ ہی دیر بعد

واپس آ گئیں۔

''بے سدھ پڑا ہے بے چارا...... بخار پھر تیز ہو گیا ہے شاید، زیب النساء بیٹی میں ذرا حکیم صاحب کو لے کر آتی ہوں، تم میرے کمرے میں جا کر بیٹھو، بلا ضرورت باہر نہ نکلنا، میں بس ابھی گئی اور ابھی آئی۔''

زمانے کے سرد و گرم کو چکھی ہوئی استانی جی آج زیب النساء کو رات گھر پر رکھنے پر ہرگز راضی نہ ہوتیں اگر ماسٹر صاحب کو رحیم یار خان نہ جانا ہوتا۔

''اگر ڈر لگے تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔''

جاتے جاتے انہوں نے تاکید کی تھی اور زیب النساء ان کے چادر اوڑھنے تک ان کے کمرے میں جا چکی تھی۔ اور اس کا ارادہ استانی جی کے آنے تک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھنے کا تھا۔ ابھی اس نے کتاب کھولی ہی تھی کہ کھانسی شروع ہو گئی۔ پچھلے دو تین دنوں سے اسے خشک کھانسی ہو رہی تھی۔ جب شروع ہوتی تو رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ابھی بھی کھانس کھانس کر آنکھوں میں پانی آ گیا اور حلق میں جیسے کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ وہ بے اختیار پانی پینے کے ارادے سے باہر نکلی اور گھڑونچی پر رکھے گھڑے سے کٹورے میں پانی ڈال کر مڑی ہی تھی کہ نگاہ غیر ارادی طور پر فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف اٹھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے وہ کھڑا تھا۔

''پانی پلیز......!'' اسے مڑتے دیکھ کر گھٹی گھٹی سی آواز اس اجنبی کے لبوں سے نکلی تو وہ بے اختیار کٹورا ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھی۔ اور دو قدم کی دوری پر رک کر اس نے کٹورا آگے بڑھایا۔

''تھینک یو!'' اس نے کٹورا تھامنے کے لیے ہاتھ چوکھٹ سے ہٹایا تو لڑکھڑایا۔

''سنبھل کر پلیز......!'' زیب النساء کی نظریں اٹھیں۔ بخار کی حدت سے تپا ہوا چہرا...... مندی مندی سوجی ہوئی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے سلکی بال......

''کیا یہ کوئی شہزادہ ہے، جو دور دیس سے راہ بھول کر ادھر آ گیا ہے۔''

اور کٹورا تھامتے ہوئے اس کی نظریں بھی جیسے اس حسین چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔

''کیا یہ کوئی پری ہے جو آسمانوں سے اتر کر میری پیاس بجھانے آئی ہے یا میں پرستان میں ہوں۔''

دونوں ایک دوسرے کو مبہوت سے دیکھ رہے تھے اور لرزتے ہاتھوں میں پکڑے کٹورے سے پانی چھلک کر نیچے گر رہا تھا۔ نہ کٹورا بڑھانے والے کو احساس تھا نہ تھامنے والے کو، بس وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

کیوپڈ نے مسکرا کر اپنی کمان کو چوما اور آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔

☆......☆......☆

اگست کے ان حبس بھرے دنوں میں آج کا دن اتنا حبس بھرا نہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور صحن میں موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر تک جاتی موتیے کی بیل پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ زل اپنی مخصوص جگہ پر سیڑھیوں میں بیٹھی، کیاریوں کے پاس پڑی سکوریوں میں چڑیوں کو پھدکتے دیکھ رہی تھی، جب اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دھیان سے سامنے خاکستری چڑیا کو دیکھ رہی تھی، جو اپنے بچے کو اپنی چونچ میں دبا باجرے کا دانہ کھلا رہی تھی۔

''تو شادی کی تیاریاں ہو گئیں؟'' آزین دو سیڑھیاں چھوڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

''ابھی کہاں، اتنا ڈھیر سارا کام تو رہتا ہے مونا تائی کہہ رہی تھیں، آج شام کو ان کے ساتھ درزی کی طرف چلوں۔''

وہ اب بھی چڑیا کو دیکھ رہی تھی اور اس کے گرد پھدک کر چکر لگاتے چڑیا کے بچے کو......

''تو وہ سحرش اور رخسانہ تائی کو ساتھ لے جائیں، ہر جگہ تمہیں کیوں گھسیٹتی پھرتی ہیں۔'' بی بی اماں کے انداز میں کہتا وہ اسے کچھ ناراض سا لگ رہا تھا۔

''تم منع نہیں کر سکتیں انہیں......''

''خیر آج تو میں نے منع کر دیا ہے لیکن ہمیشہ تو نہیں کر سکتی نا، تین تین شادیاں ہیں اور شادیوں کا کتنا کام ہوتا ہے۔''

"جب تمہاری شادی ہوگی نا تو کسی نے تمہاری مدد نہیں کروانی لکھ کر رکھ لو۔"

اسے بھی ان دنوں زمل کا ہر وقت اوپر موجود ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"لیکن خیر، دیکھ لینا...... میں بھی سارے کام مونا تائی اور رخسانہ تائی کے ذمے ڈال دوں گا کہ دلہن خود اپنی شادی کی تیاری کرتی اچھی تو نہیں لگتی۔ بس ایک بار میری جاب ہو جائے تو میں نے تمہارے امتحان کا بھی انتظار نہیں کرنا۔"

"اور جاب کب ملے گی زین؟" اس نے اب بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"پتا نہیں...... مل چکی ہوتی اگر......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد آہستگی سے کہا جیسے اپنے آپ سے کہتا ہو۔

"لوگ اتنے دھوکے باز کیوں ہوتے ہیں۔ اتنے منافق اور فریبی......"

"تمہیں کس نے دھوکا دیا ہے زین؟" زمل نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"پتا نہیں دھوکا یا سازش...... یا" اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی ہلکورے لیتی تھی۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے زین؟" زمل بے چین ہوئی۔

"پتا نہیں کیا ہوا ہے ملی...... تمہیں یاد ہے جب میں اسلام آباد سے واپس آیا تو تمہیں بتایا تھا کہ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا ہے۔ اور پہلی بار مجھے لگا ہے کہ یہاں فیصلے میرٹ پر ہوتے ہوں گے لیکن میرا یقین اور میری امید ٹوٹ گئی۔ مجھے اپائنمنٹ لیٹر نہیں ملا تو میں نے سوچا کہ شاید ابھی تقرریاں نہیں ہوئیں۔ لیکن ہفتہ بھر پہلے مجھے پتا چلا کہ تقرریاں تو کب کی ہو گئیں اور لاہور برانچ کا افتتاح بھی ہو گیا، بہت افسوس ہوا مجھے۔

پہلے بھی کئی بار انٹرویو دیا لیکن سلیکٹ نہ ہونے پر کبھی افسوس نہیں ہوا کیونکہ مجھے پتا ہوتا تھا کہ یہ انٹرویو محض فارمیلٹی ہے۔ فیصلے تو پہلے ہی ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس بار مجھے لوگ مختلف لگے تھے تو مجھے یقین تھا کہ میں سلیکٹ ہو جاؤں گا اس لیے کئی دن تک دکھی رہا اور اسی وجہ سے دو اور کمپنیوں میں جہاں سے انٹرویو لیٹر آئے ہوئے تھے، انٹرویو دینے گیا ہی نہیں۔

کل شام میں مرسل کے ساتھ کافی پینے گیا تھا۔ وہ زبردستی لے گیا تھا مجھے۔ دراصل وہاں اسے کسی سے ملنا تھا۔ اس کے بھائی کے جاننے والے تھے اور اس نے ان سے اپنی فلاحی تنظیم کے لیے کچھ فنڈز کی درخواست کی تھی۔ وہ اس سے مل کر پہلے اس کی تنظیم اور اس کے مقاصد وغیرہ کے متعلق جاننا چاہتے تھے اور پتا ہے زمل! وہ شخص کون تھا، ان افراد میں سے ایک شخص، جنہوں نے اسلام آباد میں میرا انٹرویو لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کمپنی میں کام کر رہا ہوں اور اس کمپنی نے کیا پیکج دیا ہے تو میں نے بتایا کہ میں کہیں کام نہیں کر رہا ہوں۔ ان کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ابھی تک میں نے کہیں اپلائی نہیں کیا تو وہ بہت حیران ہوا اور اس نے بتایا کہ انہوں نے اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوا دیا تھا۔ سی وی میں دیئے گئے ایڈریس پر، لیکن مجھے وہ لیٹر نہیں ملا۔''

''تم نے اپنا فون نمبر نہیں لکھا تھا۔ اور سیل فون کا کیا کیا تم نے؟'' زمل نے پوچھا۔

''لکھا تو تھا، لیکن ہمارا ان دنوں فون خراب تھا اور سیل فون ٹوٹ گیا ہے۔ اور ظاہر ہے انہوں نے لیٹر بھجوا دیا تھا تو پھر فون پتا نہیں انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔ خیر ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ شاید اس وقت میرا رزق ان کی کمپنی میں نہیں لکھا ہوا تھا لیکن جب بھی کوئی ویکنسی ہوئی وہ مجھے انفارم کر دیں گے۔ انہوں نے نمبر لے لیا تھا۔ کوئی ویکنسی ہو نہ ہو، میرا ٹوٹا ہوا اعتماد ضرور بحال ہوا ہے کہ ہر جگہ سفارش نہیں چلتی، کہیں میرٹ پر بھی فیصلے ہوتے ہیں۔''

پچھلے دس پندرہ دنوں سے جو مایوسی اس پر طاری تھی، اس وقت زمل کو اس کی آنکھوں میں وہ مایوسی نظر نہیں آئی تھی۔

''تم نے شینخو بابا سے پوچھا، کیا خبر وہ بھول گئے ہوں تمہیں دینا، آج کل تو اوپر والوں کے کاموں میں گھن چکر بنے ہوئے ہیں۔'' زمل کو خیال آیا تھا کیا خبر شینخو بابا آزین کو لیٹر دینا بھول گئے ہوں۔

''ہاں پوچھا تھا کہہ رہے تھے۔ چودہ پندرہ دن پہلے پوسٹ مین آیا تو تھا، وہ ماہ وش بی بی کے کپڑے لینے درزی کے پاس جا رہے تھے تو مرتضٰی جو اس وقت کہیں باہر جا رہے تھے انہوں نے پوسٹ مین سے ڈاک لی تھی اور میں ابھی اوپر مرتضٰی سے پوچھنے گیا تھا تو اس نے کہا کہ ہاں اس روز انہوں نے

پوسٹ مین سے ڈاک وصول کی تھی اس میں میرا کوئی لیٹر نہیں تھا بلکہ تایا جان کے کچھ کاروباری دوستوں کے خط اور بینک اکاؤنٹ کی اسٹیٹ منٹ تھی لیکن پتا نہیں کیوں زمل مجھے لگا کہ مرتضٰی نے جو لیٹر وصول کیا تھا وہ میرا اپائنمنٹ لیٹر ہی ہوگا۔ اور اس نے مجھے نہیں دیا۔"

آزین کی نظریں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"لیکن مرتضٰی بھلا ایسا کیوں کرے گا زین؟" زمل حیران ہوئی تھی۔

"ہاں بھلا وہ ایسا کیوں کرے گا۔" آزین نے اس کی بات دہرائی تھی۔

"ہاں وہ تو خود تمہاری جاب کے لیے پریشان رہتا ہے، کئی بار اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ تمہاری جاب کے لیے کوشش کر رہا ہے۔"

"اچھا......" آزین کا اچھا کافی لمبا تھا۔

"کیا میری جاب کے لیے اس کی پریشانی حیران کن نہیں، جبکہ نہ میں اس کی ذمہ داری ہوں نہ وہ میرے اخراجات ادا کرتا ہے۔"

"وہ ہمارا کزن ہے زین تو اس لیے......" زمل کی نظریں غیر ارادی طور پر ٹیرس کی طرف اٹھی تھیں، جہاں مرتضٰی کھڑا تھا جو فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"ہاں کزن ہے لیکن اپنی جاب سے زیادہ اسے میری جاب کی فکر ہے تو پھر مجھے بھی اس کی جاب کی فکر کرنی چاہیے...... ہے نا۔" ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آزین کے لبوں پر آ کر معدوم ہوگئی۔

"لیکن تمہیں پتا ہے زین! وہ جاب نہیں کرنا چاہتا، اپنا بزنس کرنا چاہتا ہے لیکن تایا جان چاہتے ہیں کہ وہ شاہ رخ بھائی کی طرح ان کے ساتھ کام کرے تاکہ ان کے بعد شاہ رخ بھائی اور مرتضٰی ان کا بزنس سنبھالیں۔"

"اور یہ سب وہ تم سے ڈسکس کرتا ہے جبکہ......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اس کی آنکھوں سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"نہیں، مجھ سے تو نہیں۔" زمل نے فوراً وضاحت کی۔ "مونا تائی بتا رہی تھیں۔ دراصل وہ

چاہتی ہیں کہ مہرین کے ایگزام کے بعد وہ مہرین اور مرتضٰی کی شادی کر دیں لیکن تایا جان کہتے ہیں کہ جب تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا، وہ اس کی شادی نہیں کریں گے۔ فیکٹری ان کے ساتھ جائے یا جو کرنا چاہتا ہے کرے، بھلے جاب ہی کر لے لیکن عملی زندگی میں آئے تب......''

''ہوں......!'' آزین اب گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا۔

''تو اگر مجھے جاب نہ ملی تو کیا دادا جان تمہاری رخصتی بھی نہیں کریں گے۔''

''میرا بھلا یہاں کیا ذکر......'' اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی۔

''تمہارا ذکر کیوں نہیں......'' دو سیڑھیاں اتر کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''بھئی آخر دادا جان کو بھی تو خیال آ سکتا ہے کہ لڑکا پہلے کوئی کام شام کرے پھر رخصتی کریں گے، انہوں نے ایسی کوئی شرط رکھ دی تو میں غریب تو مارا جاؤں گا نا۔''

آزین کا موڈ ایک دم بدلا تھا۔ لہجے سے ایک خوش گوار سا احساس جھلکتا تھا۔

''نہیں تو دادا جان اس طرح کی کوئی شرط نہیں لگانے والے۔ بھلے تمہیں جاب ملے یا نہ ملے۔'' زمل کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''انہوں نے سوچ رکھا ہے کہ جیسے ہی میرا امتحان ہوتا ہے وہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور نگاہیں جھکا لیں۔ رخساروں پر ہلکی سرخی دوڑ گئی تھی۔

''ہاں ہاں بولو نا، رک کیوں گئی ہو؟ وہ کیا کریں گے تمہارے امتحان کے بعد......؟'' لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ لیے وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے زمل کی یہ حیا اٹریکٹ کرتی تھی۔

''دراصل ابا کی اس حالت کی وجہ سے دادا جان مجھے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس روز ظفر چاچو سے کہہ رہے تھے کہ وہ پاکستان آنے کا پروگرام بنائیں، تا کہ وہ میرے فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔'' وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میری زندگی کے بہت سارے کام ابا کے بغیر ہوئے ہیں تو شادی بھی ہو سکتی ہے۔'' ظفر یاب

کے ذکر پر وہ یوں ہی تلخ ہو جاتا تھا۔

''میں دادا جان سے کہتا ہوں فوراً ہی تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ میں حاضر ہوں دل و جان سے، ابا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ دادا جان میرے امتحان سے پہلے نہیں کرنے والے میری رخصتی۔''

اس نے ذرا کی ذرا رخ موڑ کر آزین کی طرف دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔

''تو مطلب ابھی چھ سات ماہ مزید انتظار...... خیر کر لیں گے انتظار۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔

''ویسے زل! میں سوچ رہا ہوں مجھے جو بھی جاب ملے مجھے کر لینی چاہیے۔ بھلے وہ میری ڈگری سے متعلق نہ بھی ہو اور بھلے سیلری کم بھی ہو۔ تاکہ کوئی یہ تو نہ کہہ سکے کہ لڑکا جاب لیس ہے۔ ویلا نکما...... کیا خیال ہے تمہارا، کر لوں کوئی جاب......؟''

''کر لو...... اچھا ہے فارغ رہ کر بوریت نہیں ہو گی اور کچھ experience (تجربہ) بھی ہو جائے گا۔''

زل نے بس یونہی اس کی تائید کی تھی۔ لیکن اس کا موڈ یک دم بدلا تھا۔

''ٹھیک کہتی ہو تم فارغ رہ رہ کر بوریت سی ہونے لگتی ہے۔ وہی ایک جیسے شب و روز...... کوئی تبدیلی نہیں۔ کبھی کبھی تو دل اس زندگی سے اکتانے سا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے آنکھیں موند کر پرسکون نیند سو جاؤں۔''

وہ مایوس اور اداس سا نظر آنے لگا تھا۔ آج کل وہ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پل پل اس کا موڈ بدلتا تھا۔

''فضول باتیں مت کرو زین۔'' زل نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

''یہ ہر چند دن بعد تمہیں مایوسی اور قنوطیت کا دورہ کیوں پڑتا ہے۔ زندگی بہت خوب صورت ہے زین۔ میں، دادا جان، بی بی اماں کیا ہم میں سے کوئی بھی تمہیں زندگی کی خوب صورتی کا احساس

نہیں دلاتا۔ کیا ہمارا ہونا تمہارے لیے زندہ رہنے کا جواز نہیں ہو سکتا زین۔''

''ایسا نہیں زمل!'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔'' باخدا ایسا نہیں ہے۔ میری تو زندگی کا جواز ہی تم لوگ ہو۔ بس پتا نہیں کیوں کبھی کبھی دل بے زار ہو جاتا ہے۔ اتنا کہ زندگی بری لگنے لگتی ہے کہ یار کیا ہے یہ زندگی......''

''میرا خیال ہے ابا کے ساتھ تم بھی ڈاکٹر ارسلان سے سیشن لینا شروع کر دو۔''

زمل کو اس کا مایوسی سے ایسی باتیں کرنا بہت برا لگتا تھا سو وہ ابھی تک ناراض سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''اچھا مشورہ ہے۔ لیکن اس مایوسی اور قنوطیت سے جان چھڑانے کا ایک اور حل بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیا؟'' زمل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ ہی کہ دادا جان سے کہوں چھوڑیں امتحان وغیرہ کو، میری امانت میرے حوالے کریں اور بس پھر ہم دونوں کچھ دنوں کے لیے کہیں دور نکل جائیں، سرسبز پہاڑوں کے دامن میں، بہتے آبشاروں کے پاس ہر غم و فکر سے آزاد، میں اور تم......''

''کیا آج کل کوئی ناول پڑھ رہے ہو زین......؟'' زمل بے اختیار ہنس پڑی۔ اور داہنے رخسار میں بھنور سا پڑا تھا۔

''نہیں......'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔'' دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت......کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا کہ کسی بہت اپنے کے ساتھ کسی پر سکون جگہ پر کچھ دن گزاریں۔''

''تم مانو یا نہ مانو......ضرور تم کوئی ناول پڑھ رہے ہو یا پھر سحرش کی ڈائری تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے۔'' وہ پھر ہنسی۔

''تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے زمل!'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا اور پھر وہ رخ موڑ کر تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

''سنو، تم میرا ساتھ دو گی نا زمل! اگر میں دادا جان سے کہوں کہ تمہارے امتحان سے پہلے ہی

تمہاری رخصتی کر دیں۔ تم اعتراض تو نہیں کرو گی نا۔ منع تو نہیں کرو گی زمل......؟''

''نہیں......لیکن تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے زین......صرف چند ماہ کی تو بات ہے۔'' زمل نے اپنی حیرانی چھپا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں کیوں کبھی کبھی مجھے وہم سا ستانے لگتا ہے۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں کہ کہیں تمہیں کھو نہ دوں۔ مجھ میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے زمل۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، زمل میں تمہیں کھو کر جی نہیں پاؤں گا۔'' وہ بے حد دل گرفتہ سا لگ رہا تھا۔

''تم خوامخواہ قنوطی ہو رہے ہو زین۔ بھلا مجھے تم سے کون چھین سکتا ہے۔ ہمارا نکاح ہو چکا ہے اور......''

''اماں کو بھی تو کسی نے چھین لیا تھا ہم سے، حالانکہ ان کی شادی بھی ہو چکی تھی، ان کا ایک بیٹا بھی تھا اور بی بی اماں کہتی ہیں انہیں ابا سے بے حد محبت تھی۔'' اس نے زمل کی بات کاٹی۔

''اور ہمارا تو صرف نکاح ہی ہوا ہے نا......اور شاید کوئی بھی بندھن اتنا مضبوط نہیں ہوتا جو ٹوٹ نہ سکے۔ کیا پتا کبھی تم بھی......''

''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں زین، اگر تم دادا جان سے کہو گے کہ کل ہی رخصتی کر دیں تو کل ہی سہی۔'' زمل کو لگا تھا جیسے وہ اس طرح اپنے جذبے کا اظہار کر کے اسے اس قنوطیت سے نکال سکتی ہے۔

''زمل!'' کتنی دیر تک وہ جیسے بول ہی نہ سکا اور مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔ اور جب بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

''تھینک یو زمل...... پتا نہیں کیوں کبھی کبھی میں اتنا بے یقین ہو جاتا ہوں۔ خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں کسی روز تم بھی اماں کی طرح مجھے چھوڑ کر چلی نہ جاؤ۔ مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا زمل۔ پلیز کبھی نہیں۔''

وہ جذباتی ہو گیا تھا۔ زمل کی سیاہ آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ زین کے ہاتھ پر رکھ کر یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی آخری سانس تک، اور آزین نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے، وہ جیسے بے خود سے

بیٹھے بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو ہمیشہ ساتھ رہنے کا یقین دلا رہے تھے۔

اوپر میمونہ بیگم کے کمرے سے نکل کر مرتضٰی کو بلانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف جاتی ہوئی سحرش نے رک کر، ٹیرس کی ریلنگ کے نزدیک پڑی آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے نیم دراز مرتضٰی کو دیکھا اور اس کی طرف چلی آئی۔

''آپ یہاں ہیں مرتضٰی بھائی! میں آپ کو ہی بلانے جا رہی تھی اماں آپ کو بلا رہی ہیں۔''

''کیوں خیریت؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہاں وہ انویٹیشن کارڈز کے متعلق بات کرنی تھی انہوں نے کہ آپ نے کوئی ڈیزائن پسند کیا ہے تو چھپنے کے لیے دے دیں۔ اور بھی کوئی کام ہوگا شاید آپ پوچھ لیں خود جا کر۔ میں تو ذرا مہرین کی طرف جا رہی ہوں۔''

واپس پلٹتے ہوئے عادتاً اس نے نیچے جھانکا اور ٹھٹک گئی۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے آزین اور زحل......

''واؤ......'' اس نے سیٹی کے سے انداز میں ہونٹ گول کیے۔

پہلی بار اس نے انہیں یوں اس طرح بیٹھے دیکھا تھا۔ اور عین اسی وقت اٹھتے ہوئے مرتضٰی نے بھی ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر انہیں دیکھا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اور ایک عجیب سے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شاید حسد، جلن......

وہ تیزی سے میمونہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سحرش نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں اور آنکھوں میں بل کھاتے غصے کو، گہری نظر سے دیکھا اور مہرین کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے واپس میمونہ بیگم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ جہاں مرتضٰی ارباب کچھ اکڑے اکڑے سے کرسی پر بیٹھے تھے اور میمونہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

''آخر کارڈ کب چھپ کر آئیں گے مرتضٰی!''

''چھپ جائیں گے، آپ کو اتنی جلدی کیا ہے۔'' مرتضٰی کہہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے میمونہ بیگم

کے پاس آ کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"جلدی تو ہے نا مرتضیٰ! دوسرے شہروں میں رہنے والے عزیزوں کو تو پہلے ہی بھجوانے ہوں گے نا۔ اب پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ نائی گھر گھر جا کر دعوت دیں۔ کارڈ ڈاک میں بھجوائیں گے اور فون کر دیں گے۔" میمونہ بیگم اکثر لمبی بات کرتی تھیں۔

"چھپ کر آ جائیں گے دو تین روز میں۔" مرتضیٰ بے زار سا ہو رہا تھا۔

"اور آج ذرا وقت نکال کر شاہ رخ کے ساتھ چلے جاؤ اور اس کی پسند کے کپڑے خرید دو۔"

میمونہ نے شاہ رخ کے کپڑے خریدنے کا کام مرتضیٰ کے لیے ہی رکھ چھوڑا تھا۔

"میرا جانا کیا ضروری ہے۔ شاہ رخ سے کہیں اپنے لیے خود ہی شاپنگ کر لے۔ جو کچھ اور لینا ہے اس کی لسٹ بنا کر دے دیں اسے۔ کوئی غیر تو نہیں ہے کزن ہے وہ ہمارا۔"

سحرش کو مرتضیٰ کا موڈ بے حد خراب لگا تھا اور وہ اس خراب موڈ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندازے مرتضیٰ کے متعلق غلط نہیں ہیں اور یہ کوئی اچھی بات ہرگز نہیں تھی۔

"کزن تو ہے بیٹا! پر اب وہ تمہارا ہونے والا بہنوئی بھی ہے۔ اور کیا اچھا لگے گا کہ اس سے کہوں کہ ہماری طرف سے اپنی شادی کی شاپنگ خود ہی کر لو۔"

میمونہ بیگم کو مرتضیٰ کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"آج شام چلے جاؤ یا کل دن کو چلے جانا۔ کل یوں بھی چھٹی ہے شاہ رخ کو فیکٹری نہیں جانا ہو گا۔ اس سے ہی طے کر لو۔ اس نے عقیل کے لیے بھی شاپنگ کرنی ہو گی خود ہی کیونکہ عقیل تو بارات سے دو تین دن پہلے ہی آئے گا۔" اس بار مرتضیٰ نے سر ہلا دیا۔

"موناماں!" سحرش نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

"مہرو کے لیے بھی تو جوڑا لینا ہو گا نا آپ نے۔ اس کے بھائی اور بہن کی شادی ہے تو سسرال سے جوڑا جانا تو بنتا ہے نا۔ یاد ہے بڑے ماموں کے بیٹے کی جب شادی ہوئی تھی تو فرو آپا کے سسرال سے جوڑا آیا تھا۔ معہ دوسرے سامان کے۔"

''ہاں میری تو مت ہی ماری گئی ہے ان شادی کے کاموں میں الجھ کر......شکر ہے تم نے یاد دلایا۔''میمونہ بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور مرتضٰی نے تیر برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم یہ اپنے مفت مشورے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔''

''ہاں تو کیا غلط کہہ دیا اس نے۔تمہیں کیا پتا رسم ورواج کا۔''میمونہ بیگم نے مرتضٰی کو گھورا اور پھر سحرش کی طرف دیکھا۔

''ایسا کرنا سحری......آج تم کسی وقت بلال اور مہرو کو لے کر اس کی پسند کا جوڑا اور دوسری چیزیں لے آنا۔وقت سے پہلے ہر چیز تیار ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ورنہ بھگدڑ مچ جاتی ہے کہ یہ نہیں تو وہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے اماں! آج کھانے کے بعد لے آئیں گے جا کر۔بلکہ میں تو کہتی ہوں اماں، ماہ وش کی مایوں پر مہرین کو انگوٹھی پہنا کر باقاعدہ منگنی کا اعلان بھی کر دیں۔فیملی میں تو سب کو پتا ہے لیکن باہر بھی دوسرے لوگوں کو پتا چل جائے گا۔آج کل مائیں اپنے بیٹوں کے لیے ڈاکٹر لڑکیوں کے رشتے ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔اس روز میری دوست بھی پوچھ رہی تھی کہ تمہاری کزن مہرین کی کہیں بات چیت طے تو نہیں ہو چکی۔''

سحرش نے کن اکھیوں سے مرتضٰی کی طرف دیکھا جو دانت پیستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تو بتا دینا تھا نا اپنی دوست کو کہ آجائے اپنے بھائی کا رشتہ لے کر۔''

''اے ہے مرتضٰی! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے جو منہ میں آتا ہے اول فول بولتے چلے جاتے ہو۔بچپن سے تمہارا اور مہرو کا رشتہ طے ہے۔''میمونہ بیگم کو برا لگا تھا۔

''میں بچپن کے رشتوں کو نہیں مانتا اور نہیں کرنی مجھے اس سے شادی۔''

''ہیں یہ کیا بک رہا ہے مرتضٰی!''میمونہ بیگم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے بھائی۔شادی تو آپ کی مہرین سے ہی ہوگی۔'' سحرش نے اسے تپایا اور وہ تپ گیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہ نہ بھولیے گا کہ ماہا آپ کی بہن کی شادی مہرین کے بھائی سے ہو رہی ہے۔'' اس نے جتایا تو وہ تنتناتا ہوا باہر نکل گیا۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہا تھا سحری؟'' میمونہ بوکھلا گئی تھیں۔

''کچھ نہیں ہوتا مونا اماں۔ ایسے دورے کبھی کبھی لڑکوں کو پڑتے رہتے ہیں۔'' اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''آپ ابا سے بات کر کے مہرین اور مرتضیٰ بھائی کی منگنی اناؤنس کر دیں۔''

اور انہوں نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ اپنے رشتوں کے ساتھ بے حد مخلص اور جب سے اس نے مرتضیٰ کی نظروں کی چوری پکڑی تھی، تب سے ہی وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح مرتضیٰ کو احساس دلا دے کہ اس کی منزل کیا ہے۔ اور یہ اس کا راستہ نہیں ہے جس پر چلنے کو وہ بے تاب ہو رہا ہے۔

''نو ٹینشن ڈیر مونا جی۔'' وہ مسکرائی اور میمونہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔ انہیں اپنی اس آخری اولاد کے بے دھڑک اور بہت بولنے سے اکثر شکایت رہتی تھی لیکن کئی بار اس کا یوں بولنا ان کے حق میں اچھا ہی ثابت ہوا تھا۔

''اوکے۔ آج ابا سے ضرور بات کر لیجیے گا۔'' وہ ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

مرتضیٰ باہر کہیں نہیں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ٹیرس کی طرف بڑھی۔ وہ دونوں ابھی تک وہاں ہی بیٹھے تھے۔ زل نگاہیں جھکائے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور آزین اپنا دایاں گھٹنا مسلسل ہلاتے ہوئے پاؤں ہولے ہولے زمین پر مار رہا تھا۔

بہت سارے خاموش لمحے ان کے درمیان سے گزر گئے تھے۔ ان کو کبھی اظہار کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک مضبوط بندھن میں بندھے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہیں لیکن پچھلے چند ماہ سے پتا نہیں کیوں آزین کو ایسا لگنے لگا تھا کہ اسے زل کو بتاتے رہنا چاہیے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ کتنی محبت کرتا ہے وہ اس سے اور اپنی پوری زندگی اس کے سنگ گزارنا چاہتا ہے۔

اور آج زمل نے اسے معتبر کر دیا تھا۔

''تھینک یو ملی! اینڈ سوری کہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔ تم آرام سے اپنا امتحان دو۔ میں تو بس یونہی کبھی کبھی......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں...... یوں ہی کبھی کبھی تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔''

وہ ہولے سے ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اسے آزین کی بے یقینی سے خوف آتا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ بدگمان نہ ہو جائے کہ ابھی تو وہ صبوحی چچی کے چلے جانے کے دکھ اور حیرت سے نہیں نکلا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو تم!'' اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو نظریں سامنے ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے اپنی طرف دیکھتی سحرش پر پڑیں تو وہ بے اختیار مسکرایا۔

''لو جی مس جاسوس صاحبہ اپنی ڈیوٹی دینے آ گئی ہیں۔''

زمل نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو وہ بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے مسکرائی۔ اور دل ہی دل میں کہا۔ ''پیارے لوگو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آج میں نے تمہارے لیے بارش آنے سے پہلے ہی بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔'' اپنی ڈائری میں لکھا ہوا ایک جملہ یاد آنے پر اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی بارشیں اتنی طوفانی ہوتی ہیں کہ مضبوط بند بھی توڑ دیتی ہیں اور یہ تو......

تب ہی اس کی نظر کچن سے باہر آتی بی بی اماں پر پڑی تو وہ مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اس کا موڈ بی بی اماں کی طنزیہ نظروں کا سامنا کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔

بی بی اماں آزین اور زمل کو سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر ادھر ہی چلی آئیں۔

''زین بیٹا! صبح تم کہہ رہے تھے آج عصر کے بعد تمہارے دوستوں نے آنا ہے میٹنگ کے لیے، میں نے ساجدہ سے کہہ دیا تھا کہ گیسٹ روم کی صفائی اور ڈسٹنگ کر دے۔ اور تم بتاؤ اگر دیر سے جائیں گے وہ لوگ تو کھانا تیار کرنا ہے۔''

''ارے نہیں بی بی اماں! آپ جو چائے وغیرہ بھجواتی ہیں اس پر بھی وہ شرمندہ ہوتے رہتے ہیں۔''
آزین اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
''لو بھلا اب ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ گھر آئے مہمانوں کو چائے بھی نہ پوچھ سکیں۔''
بی بی اماں برا مان گئی تھیں۔
''وہ مہمان کہاں ہیں بی بی اماں۔ اپنے کام سے آتے ہیں۔ خیر آپ صرف چائے بھجوا دیا کریں ساتھ میں اور کچھ نہیں۔''
''دیکھ لیں گے میاں...... کتنے بجے آئیں گے۔'' بی بی اماں اپنی مرضی کی مالک تھیں۔
''عصر کے بعد آنے کو کہا تھا۔ لنچ میں کیا کھلا رہی ہیں آپ۔ اگر کوئی میری پسند کی شے ہو تو کھانا کھا کر ایک دوست کی طرف جاؤں گا، ورنہ اس کے ساتھ ہی کھالوں گا لیکن عصر سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔''
آزین نے ایک دوست سے شیخو بابا کی جاب کے لیے بات کی تھی اس سے ہی ملنے جانا تھا اور اس نے کہا تھا کہ جلدی آ جانا، کھانا ساتھ ہی کھالیں گے، لیکن آزین کھانا گھر میں ہی کھانا پسند کرتا تھا۔
''مٹن قورمہ اور ساتھ میں بھنڈی کی بھجیا ہے۔''
بی بی اماں آزین اور زمل کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے خود سے کبھی فرمائش نہیں کی تھی۔ بی بی اماں جو پکاتی تھیں، کھا لیتے تھے لیکن بی بی اماں خود ہی سب کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔
''گڈ......!'' آزین خوش ہوا تھا۔
''آپ ذرا کھانا ظہر کی نماز کے فوراً بعد لگوا دیجیے گا۔''
''اچھا ٹھیک ہے، میں نے ویسے ہی ساجدہ سے کہا تھا، ایک بجے تک آ جائے۔''
دن میں روٹیاں ساجدہ بناتی تھی، رات کو زمل پکا لیتی تھی۔
''اور ہاں......'' انہیں یاد آیا۔ ''یہ شیخو ابھی تک بازار سے نہیں آیا، میں نے چینی کے لیے کہا تھا کہ لے آئے۔''
''شیخو بابا چینی لے آئے تھے۔ ساجدہ نے کچن میں رکھ دی تھی۔ جب آپ چاشت کی نماز پڑھ

رہی تھیں تب شینخو بابا آ گئے تھے اور اب وہ ابا کے پاس ہیں۔ کوئی اور کام بھی تھا کیا ان سے؟'' زمل نے بتایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں تمہارے ابا بہت خوش ہوتے ہیں شینخو کی باتیں سن کر، پتا نہیں وہ کیا ہولے ہولے بولتا رہتا ہے اور وہ سن کر خوش ہوتے رہتے ہیں لیکن اوپر والوں کے بکھیڑے ہی ختم نہیں ہوتے کہ بے چارہ سکون سے زیبی کے پاس بیٹھ سکے۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی تار پر سے دھلی ہوئی صافیاں اتارنے لگیں۔ تب ہی شینخو بابا شاہ زیب کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ اور وہاں سے ہی آزین کو آواز دی۔

''زین بھائی! آزین جلدی آئیں، پتا نہیں شاہ زیب صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔''

اور فوراً ہی واپس کمرے میں چلے گئے۔

آزین اور زمل نے تقریباً دوڑتے ہوئے صحن عبور کیا۔ کھلے دروازے سے شاہ زیب کے رونے کی آواز برآمدے تک آ رہی تھی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے تھے اور رو رہے تھے۔ شینخو بابا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔

''شاہ بابا، پلیز شاہ بابا کیا ہو گیا ہے آپ کو، اس طرح مت روئیں۔ مت روئیں شاہ بابا، میرا دل پھٹ جائے گا۔'' زمل نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے سنا تھا۔

''ابا...... ابا کیا ہوا ہے آپ کو؟'' آزین اور وہ ایک ساتھ ہی ان کی طرف بڑھے تھے۔

''چاچو......!'' آزین نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ شینخو بابا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''چاچو! پلیز کچھ تو بولیں کیا ہوا ہے۔ کوئی درد ہے کہیں کوئی اور تکلیف......'' لیکن وہ اسی طرح روئے چلے جا رہے تھے اور ہولے ہولے ان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

''ابا...... ابا!'' زمل نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''میری طرف دیکھیں ابا۔ میں آپ کی بیٹی زمل۔''

انہوں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ تھوڑا سا بلند کیا۔ ہونٹ کھلے

اور پھر بند ہو گئے۔

''ہاں...... ہاں ابا، بولیں نا کیا ہوا ہے آپ کو......؟ کیوں اس طرح رو رہے ہیں؟'' زمل کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

ان کے لب کپکپائے اور ہاتھ نیچے گر گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں، سر ڈھلک گیا۔

''زین! ابا......'' زمل کی چیخ نکلی تھی۔

''حوصلہ میری بچی کچھ نہیں ہوگا میرے زیبی کو۔'' بی بی اماں نے، جوان کے پیچھے ہی بوکھلائی ہوئی سی آئی تھیں، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور پھر آزین کی طرف دیکھا۔

''زین بیٹا! زیبی شاید نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ پہلے انہیں بیڈ پر لٹاؤ اور پھر ڈاکٹر کو فون کرو۔''

بی بی اماں بزرگ تھیں اور حوصلے والی بھی۔

''جی بی بی اماں......''

آزین جوان کا سر کندھے سے ٹکائے ابھی بھی انہیں خود سے لپٹائے بیٹھا تھا، چونکا اور انہیں دونوں بازوؤں میں اٹھا کر شینو بابا کی مدد سے بیڈ پر لٹایا۔ اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ زمل اٹھ کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ان کی نبض چیک کی جو بہت آہستہ چل رہی تھی۔ پیشانی پر بکھرے لائٹ براؤن سلکی بالوں کو پیچھے کیا۔ آنسو تیزی سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''ابا...... ابا پلیز مجھے چھوڑ کر مت جایئے گا۔ اماں کے بعد آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ پلیز ابا۔''

بی بی اماں بیڈ کی دوسری سمت بیٹھ کر مسلسل دعا کرتے ہوئے پھونک رہی تھی۔ شینو بابا کچھ دیر بے بس سے کھڑے رہے۔ پھر پائنتی بیٹھ کر ان کے پاؤں کے تلوے سہلانے لگے۔ بی بی اماں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا اور خود بھی ان کی ہتھیلی کو اپنے دوپٹے کے پلو سے سہلانے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی آزین ڈاکٹر ارسلان کو فون کر کے اور جہاں زیب بیگ کو بتا کر آ گیا۔

''ڈاکٹر ارسلان کلینک کے لیے نکل ہی رہے تھے، آ رہے ہیں۔ اب ادھر سے ہوتے ہوئے جائیں گے۔'' وہ بھی بیڈ کی پائنتی کے دوسری طرف بیٹھ گیا تو جہاں زیب بیگ کمرے میں داخل ہوئے۔ شینخو بابا کھڑے ہو گئے۔ زمل اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''دادا جان ابا...... ابا ٹھیک ہو جائیں گے نا۔''

''ان شاء اللہ ہمارا زیبی ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کا بازو تھپتھپا کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئے، جھک کر شاہ زیب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''میرے بچے...... کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ، کیوں امتحان لے رہے ہو ہمارا۔'' آنسو ان کی بوڑھی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔

''زیبی، میرے لاڈلے، کون سا دکھ دل میں چھپائے سب سے، خود سے خفا ہو گئے ہو۔''

بی بی اماں بیڈ سے اٹھ کر پیچھے کھڑی ہو گئی تھیں اور زمل کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ادھر آ کر بیٹھ جائے۔ زمل نے دیکھا، شینخو بابا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ شاید وہ بھی بی بی اماں کی طرح دل ہی دل میں کچھ پڑھ کر دعا کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ لمحہ لمحہ بعد شاید بے قرار ہو کر آنکھوں کے کونوں میں آ جانے والے آنسو کو ہتھیلی سے پونچھتے تھے۔

وہ لمحہ بھر کو حیران ہوئی اور پھر بیڈ پر بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا۔ اور آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔ وہ بے سدھ پڑے تھے۔ لانبی پلکوں والی خوب صورت آنکھیں بند تھیں۔

''دعا کرو بیٹا، اپنے ابا کی صحت زندگی کے لیے......'' بی بی اماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

کمرے میں موجود پانچوں نفوس مسلسل دعا کر رہے تھے۔ وہ کبھی نبض پر ہاتھ رکھتی، کبھی سینے پر سر رکھ کر دھڑکن محسوس کرتی، کبھی ہاتھ سہلانے لگتی۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔

''ڈاکٹر ارسلان ابھی تک نہیں آئے زین۔'' بھیگی بھیگی پلکیں اوپر اٹھیں۔ آزین کے دل کو کچھ ہوا۔

''آتے ہوں گے زمل، دس پندرہ منٹ تک آنے کو کہا تھا انہوں نے، نزدیک ہی تو ہے ان کا گھر۔''

آزین نے نظروں ہی نظروں میں اسے تسلی دی۔ تب ہی باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

''ڈاکٹر صاحب آ گئے۔'' شیخو بابا کے ساتھ آزین بھی باہر چلا گیا تو وہ بی بی اماں کے ساتھ کچن میں ہی آ کر بیٹھ گئی۔ اور کچن ٹیبل پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''نہ رو میری بچی، اللہ ہمارے زیبی کو صحت و زندگی دے گا۔ اتنی زیادہ دوائیں اور اس کے ساتھ خوراک چڑیا جیسی...... کمزوری ہو گئی ہے اسے۔''

بی بی اماں نے اس کا سر تھپتھپایا اور فریج سے جوس نکالنے لگیں۔ لیکن وہ یونہی بازو ٹیبل پر رکھے ان میں سر چھپائے ہولے ہولے روتی رہی۔ بی بی اماں کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہیں، پھر گلاس میں جوس ڈال کر گلاس ٹرے میں رکھا اور باہر نکل گئیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ بی بی اماں واپس نہیں آئی تھیں۔ اور وہ یوں ہی اسی انداز میں بیٹھی رہی جب آزین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی اور سر اٹھا کر آزین کی طرف دیکھتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

''ابا کیسے ہیں۔ ہوش آ گیا انہیں۔ کیا کہا ہے ڈاکٹر نے؟''

''ٹھیک ہیں اب۔ اور ڈاکٹر ارسلان نے کہا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ماضی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ شاید کوئی تکلیف دہ یاد تھی جس نے انہیں اس طرح رلا دیا اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خوش آئند بات ہے ایسے فیز اب آتے رہیں گے۔ کبھی کوئی خوش گوار یاد ذہن کے دروازے پر دستک دے گی اور کبھی کوئی دکھ اچانک یاد آئے گا اور ایک روز آئے گا جب وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر ارسلان بہت مطمئن تھے زمل۔''

''میں ابا کو دیکھ آؤں۔'' زمل اٹھی تو آزین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ڈاکٹر ارسلان نے انہیں سکون کے لیے انجیکشن لگایا ہے اور وہ سو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب تین چار گھنٹے سکون سے سوتے رہیں گے اور جب تک وہ خود نہ اٹھیں انہیں نہ اٹھایا جائے۔ اور پتا ہے جب ڈاکٹر ارسلان انہیں انجیکشن لگا رہے تھے تو انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور دادا جان کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جا رہے تھے کہ ابا جان وہ چلی گئی۔ ناراض ہو کر چھوڑ گئی۔ وہ یقیناً مریم چچی کی بات کر رہے تھے۔ دادا جان صحیح کہتے ہیں کہ انہوں نے مریم چچی کا دکھ دل سے لگا لیا ہے۔''

''اور اب ان کے پاس کون ہے؟'' زمل نے پوچھا۔

''ابھی تو شینخو بابا ہیں لیکن میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ اگر جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ چاچو تو چند گھنٹے سوتے رہیں گے۔ میں ذرا دادا جان کے پاس جا رہا ہوں۔ ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ ان کا بی پی تھوڑا لو ہو رہا تھا۔ بی بی اماں ان کے لیے شکنجبین بنا کر لے گئی ہیں۔'' آزین نے بتایا۔

''میں ایک نظر ابا کو دیکھ کر دادا جان کے پاس آ رہی ہوں۔'' زمل اٹھ کھڑی ہوئی تو آزین سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے سنک کے نل سے پانی لے کر منہ پر چند چھینٹے مارے اور دوپٹے کے پلو سے چہرہ اچھی طرح پونچھ کر شاہ زیب کے کمرے میں آئی تو شینخو بابا بیڈ کے نزدیک کرسی بچھائے شاہ زیب کے بازو پر ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنے پر کھڑے ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح نگاہیں جھکائے۔ اس نے بیڈ کے قریب آ کر دیکھا۔ وہ بہت پرسکون اور گہری نیند سو رہے تھے۔

''آپ ابا کا بہت خیال رکھتے ہیں شینخو بابا۔ بہت شکریہ...... آپ کو کہیں جانا ہو تو چلے جائیں۔ میں انہیں دیکھتی رہوں گی۔ ابھی میں ذرا دادا جان کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ شینخو بابا کی بہت ممنون تھی۔

''جی ابھی کچھ دیر میں ادھر ہی بیٹھوں گا۔'' شینخو بابا کی نظریں اپنے پیروں پر تھیں۔

''آپ بڑے صاحب کو حوصلہ دیں۔ بہت گھبرا گئے تھے وہ شاہ بابا کی حالت دیکھ کر۔''

''شاہ بابا......'' وہ جاتے جاتے مڑی۔ ''آپ ابا کو شاہ بابا کہتے ہیں۔''

''ہاں وہ......'' شینخو بابا ذرا سا گھبرائے کہ غیر اختیاری طور پر لبوں سے نکل گیا تھا۔ ''شاہ زیب صاحب کہتے ہیں میں انہیں شاہ زیب صاحب نہ کہا کروں۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تو وہ اس لیے......''

زمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کا دل چاہے اور جیسے ابا خوش ہوں، میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

وہ جہاں زیب بیگ کے کمرے میں آئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور آزین کہہ رہا تھا۔

''دادا جان! اگر آپ ہی حوصلہ ہار جائیں گے تو میں اور زمل کیا کریں گے۔''

''کیا کروں زین، گیارہ سال ہو گئے ہیں زیب کو اس حالت میں دیکھتے ہوئے۔ یہ کیسا امتحان ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔'' وہ بے بسی سے آزین کو دیکھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر ارسلان بہت پر امید ہیں دادا جان۔ ان شاء اللہ۔ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ خاموشی سے آکر دادا جان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹی۔''

''دادا جان!'' اس نے ان کے پیر پر ہاتھ رکھا۔

پلکیں بھیگ گئیں۔ ''ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ اپنا خیال نہیں رکھتے نا۔''

''کچھ نہیں ہوا مجھے، عمر کا تقاضا ہے ذرا سی پریشانی سے دل گھبرا جاتا ہے۔'' وہ مسکرائے اور زین کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں نے اپنے لیے شادی کی شاپنگ ابھی تک نہیں کی۔ اس روز بھی میں نے تمہیں کہا تھا کہ کسی روز اسے ساتھ لے جاؤ اور ہر فنکشن کے حساب سے خریداری کر لو۔ بی بی اماں اور شینو بابا کے لیے بھی شاپنگ کر لینا۔ خود سے تو اس نے ابھی تک کچھ نہیں لیا۔''

''جی دادا جان کل کا پروگرام رکھ لیتا ہوں۔ آج شام کو تو ارسل وغیرہ کی میٹنگ ہے۔ وہی ''نورے والا'' گاؤں میں کلینک اور دست کاری اسکول کھولنے کے سلسلے میں۔'' آزین نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، پھر کل یاد سے چلے جانا۔ اختر بانو کا بھی فون آیا تھا کہ وہ شادی سے ہفتہ بھر پہلے ہی آجائے گی اماں کے ساتھ۔ ثوبان وغیرہ بارات سے ایک دن پہلے آئیں گے۔''

''سچ دادا جان، پھپھو کتنے عرصے بعد آئیں گی۔'' زمل خوش ہو گئی۔

''ہاں اور ظفریاب بھی پروگرام بنا رہے ہیں آنے کا۔ جب سے گیا ہے ایک بار آیا ہے اور اب بھی سات سال ہو گئے ہیں، پتا نہیں کیسے اجنبی ملک میں دل لگا لیا ہے اس نے۔'' وہ افسردہ ہو گئے تھے۔

''شکر کریں اب بھی خیال آ گیا آنے کا۔ مرتضیٰ بتا رہا تھا ارباب تایا نے بہت اصرار کیا ہے ان

سے آنے کے لیے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''باپ ہے وہ تمہارا زین! بہت محبت کرتا ہے وہ تم سے۔'' جہاں زیب بیگ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''تم اتنے خفا کیوں ہو اس سے بچے۔ شادی کر کے کوئی جرم نہیں کیا اس نے۔ سب نے ہی اس کی تنہائی دیکھ کر اسے شادی کے لیے مجبور کیا تھا۔''

وہ خاموش ہی رہا۔ جہاں زیب بیگ کے سامنے وہ کم ہی باپ کے خلاف بولتا تھا لیکن بی بی اماں اور زل کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔

''اپنا دل صاف کر لو بچے......''

''جی دادا جان! میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا اس لیے کچھ دیر کے لیے سونا چاہتا ہوں۔''

''ہاں جاؤ آرام کرو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔''

جہاں زیب بیگ کی نظروں میں اس کے لیے محبت اور شفقت تھی۔

''زل! مجھے کھانے کے لیے مت جگانا، اگر میں سو گیا تو......'' اس نے جاتے جاتے زل کی طرف دیکھا۔

''لیکن تمہیں تو کھانا کھا کر اپنے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔''

''ہاں لیکن اب نہیں جا رہا، فون کر کے بتا دوں گا اسے۔''

اس کا موڈ یوں ہی لمحوں میں بدلتا تھا۔ زل نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ماں باپ کا ذکر اسے ہمیشہ ہی ڈسٹرب کر دیتا تھا۔ اور اب بھی ظفریاب کے ذکر نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر لیٹا تو کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔ ظفریاب نے شادی کی یہ ان کا حق تھا لیکن شادی کے بعد اسے چھوڑ کر باہر چلے جانا اور ماما کے جانے کے بعد اسے نظر انداز کر دینا آج بھی اسے اذیت دیتا تھا۔

کافی دیر بعد اسے نیند آئی تھی اس لیے عصر سے ذرا پہلے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر آیا

کہ کمرے میں گھٹن اور حبس ہو رہی تھی۔ پنکھا بند تھا شاید بجلی نہیں تھی۔ بی بی اماں باہر تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں دستی پنکھا تھا۔

''جاگ گئے ہو زین بیٹا! کھانا گرم کر دوں؟''

''نہیں۔'' وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''شیخو بتا رہا تھا کہ ٹرانسفارمر جل گیا ہے یا خراب ہو گیا ہے۔ تین چار گھنٹے لگیں گے ٹھیک ہونے میں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پنکھا اس کی طرف بڑھایا۔

''گیسٹ روم میں تو بہت حبس ہو گا اس موسم میں، کہو تو یہاں صحن میں تمہارے دوستوں کے لیے کرسیاں لگوا دوں۔ آنے ہی والے ہوں گے وہ لوگ۔''

''دادا جان سے پوچھ لیں، اگر وہ اجازت دیں تو۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''دادا جان اور چاچو ٹھیک ہیں۔''

''ہاں۔'' بی بی اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ عصر کی نماز مسجد میں ہی پڑھ کر آؤں گا اب۔''

وہ بی بی اماں کو بتا کر باہر نکل گیا اور بی بی اماں دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں تاکہ جہاں زیب بیگ سے صحن میں آزین کے دوستوں کے لیے بیٹھنے کی اجازت لے سکیں۔

☆......☆......☆

آج بڑے دنوں بعد حویلی میں رونق سی لگی تھی۔ ریحان اور نعمان بھی کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ مہران اور زمان بھی آئے ہوئے تھے۔ مہران تو فوراً ہی بیوی بچوں کو لے کر واپس کراچی چلے گئے تھے کہ چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور وہ کب سے کراچی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا میٹرک میں تھا جب کہ دونوں چھوٹی بیٹیاں بالترتیب ساتویں اور آٹھویں میں تھیں۔ مہران چھٹیوں میں ہمیشہ انہیں کراچی بلا لیتے تھے لیکن اس بار پہلے تو وہ جاپان گئے ہوئے تھے۔ پھر کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ وہ نہ خود آ سکے نہ بلا سکے۔ زمان کا ارادہ البتہ ہفتہ بھر ٹھہرنے کا تھا۔

اختر بانو بہت خوش تھیں۔ اتنے دنوں بعد بیٹوں سے ملی تھیں لیکن ان کا رویہ ہمیشہ کی طرح تھا روکھا روکھا اور کسی قدر اجنبیت لیے ہوئے۔ گو وہ اس کی عادی تھیں لیکن ہر بار نئے سرے سے تکلیف ہوتی تھی، پھر بھی خوشی خوشی انہوں نے اپنی نگرانی میں ان کی پسند کا کھانا بنوایا تھا۔ انہوں نے بھاگی کی مدد سے کھانا لگوایا اور خود کھیر فریج میں رکھنے چلی گئیں۔

نعمان اور ریحان کو بادام کی کھیر بہت پسند تھی اور وہ فرمائش کر کے اپنی پھوپھی سلطانہ سے بنوایا کرتے تھے۔ اختر بانو نے اس سے ہی باداموں کی کھیر بنانی سیکھی تھی۔ جب وہ کھیر کے باؤل فریج میں رکھوا کر واپس آئیں تو سب ہی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔

''ارے بھابھی! آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ یہاں آنتیں بھوک سے قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔''

زمان شاہ نے ہمیشہ ہی ان کا احترام کیا تھا۔

''آپ شروع کر دیتے زمان بھائی!'' وہ شرمندہ ہوئیں۔ ''مجھے خیال آیا تھا کہ کھیر کے دو باؤل کاؤنٹر پر ہی رہ گئے تھے تو میں وہ فریج میں رکھنے گئی تھی۔'' وہ امان کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''اوہ بادام کی کھیر......!'' نعمان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''ہاں بادام کی کھیر......'' وہ مسکرائیں۔

''لیکن وہ اتنی جلدی ٹھنڈی تو نہیں ہوگی اور ڈنر شاید ہم گھر پر نہ کریں۔ مطلب میں اور ریحان......''

''میں نے دو باؤل صبح کھیر بنتے ہی رکھ دیئے تھے۔ اب تک خوب ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔''

وہ نعمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اس نے متشکر نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا اور پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے جبکہ ثوبان شاہ کھانا کھاتے ہوئے زمان شاہ اور نعمان سے کراچی کے معاملات پر باتیں کر رہے تھے۔ اختر بانو گاہے گاہے نظر اٹھا کر ریحان اور نعمان کی طرف دیکھ لیتی تھیں جبکہ امان ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کچھ ان کی پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے

ثوبان شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا پروگرام ہے اختر کب جانا ہے لاہور؟''

''جی...... وہ ابا جان تو کہہ رہے تھے کہ دس بارہ دن پہلے آجانا، لیکن میں سوچ رہی ہوں ہفتہ بھر پہلے چلی جاؤں۔''

سوالیہ نظریں ثوبان شاہ کی طرف اٹھیں۔

''چچا جان صحیح کہہ رہے ہیں۔ دس بارہ دن پہلے ہی چلی جاؤ۔ دو تین دن پہلے میری ان سے بات ہوئی تھی۔ مجھ سے بھی کہا تھا انہوں نے...... یوں بھی اتنے عرصے بعد جا رہی ہو تو......'' بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے پانی کا گلاس اپنی طرف کھسکایا اور دو گھونٹ بھر کر رکھ دیا۔

''بلکہ میرا خیال ہے تم اور مانی...... ریحان اور نعمان کے ساتھ ہی کراچی چلے جاؤ۔ کچھ دن وہاں رہ کر شاپنگ کر لینا۔ اپنے اور مانی کے لیے بھی اور وہاں بھی سب کے لیے جو گفٹ لے کر جانے ہیں۔ وہ بھی لے لینا اور جن کی شادی ہے ان بچوں کے لیے گولڈ کی کوئی چیز لے لینا۔ اور پھر وہاں سے ہی بائے ایئر چلے جانا تم لوگ...... میں تمہاری اور مانی کی سیٹ بک کروا کے لاہور اطلاع کر دوں گا، آزین آجائے گا ایئر پورٹ پر۔''

''جی!'' اختر بانو نے ان کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح ان کے کسی معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ من بھیگنے لگا تھا۔

''اور آپ......؟'' شاید ثوبان شاہ نہ آئیں، دل میں خیال آیا تھا۔

''میں، ریحان اور نعمان بارات سے ایک دن پہلے آجائیں گے۔''

انہوں نے اختر بانو کی آنکھوں کی حیرت کو محسوس کیا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

''میں اور نومی...... کیا مطلب ہے بابا ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟'' ریحان حیران ہوا تھا۔

''تمہارے ماموں زاد بھائی اور بہنوں کی شادی ہے۔ شادی میں شرکت کرنا'' اب ثوبان شاہ

اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''لیکن بابا مجھے نہیں یاد کہ اپنے ہوش میں ہم کبھی وہاں مطلب لاہور گئے ہوں۔ ہمیں تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے ننھیال میں کون کون ہے۔'' اور ریحان کی بات سن کر اختر بانو کو لگا جیسے دل میں کسی نے نشتر چبھویا ہو۔ وہ جب بھی میکے جاتی تھیں، دادی اور اماں جان بچوں کو روک لیتی تھیں۔ ان کے پاس کئی بہانے ہوتے تھے۔

''ہم اتنے دن بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتے اور بچے بھی تو ہم سے ہلے ہوئے ہیں۔''

''بچوں کی وجہ سے پابند ہو جاؤ گی۔ میکے جا رہی ہو تو خوب انجوائے کرنا وہاں۔''

اور سب سے بڑھ کر...... ''پانی بدلے گا تو بچے بیمار ہو جائیں گے......'' وغیرہ وغیرہ۔

ایک دو بار اس نے ثوبان سے شکایت کی تو وہ ہنس پڑے تھے۔

''شکر کرو یار بچوں کا جھنجھٹ نہیں ہو گا وہاں، اپنی بھابھیوں اور بھائیوں کے ساتھ سکون سے وقت گزارنا۔''

اور انہیں عادت نہیں تھی ثوبان شاہ سے بحث کرنے کی سو بھاری دل کے ساتھ اکیلی ہی چلی جاتیں اور لاہور میں سب ہی خفا ہوتے کہ وہ بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتی۔ مریم اور صبوحی بھابھی تو بہت ناراض ہوتی تھیں، جب سے وہ بیاہ کر آئی تھیں۔

''تو یار! اب جا رہے ہو نا تو اپنے سارے کزنز سے مل لینا۔ اور اس کے بعد رابطہ رکھنا۔ آتے جاتے رہنا۔''

ثوبان شاہ کا لہجہ خوش گوار تھا یا اختر بانو کو لگا تھا۔ ریحان خاموش ہو گیا تھا۔ نعمان اور ریحان دونوں ہی ثوبان شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے اور کسی بھی معاملے میں بحث نہیں کرتے تھے جبکہ شایان ہمیشہ اپنی ہی منواتا تھا اور امان بہر حال انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن ضد اور ہٹ دھرمی اس کی فطرت میں نہیں تھی۔

''تو پھر ٹھیک ہے نا؟'' اسے خاموش دیکھ کر ثوبان شاہ نے کہا۔

''جی بابا......'' ریحان نے نعمان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''دو تین دن کی تو بات ہے یار، پنجاب کی شادی انجوائے کریں گے۔ مجھے یقین ہے تم بور نہیں ہو گے وہاں۔''
''ٹھیک ہے بابا...... آپ بتا دیجیے گا کہ کب جانا ہے۔'' اب نعمان نے جواب دیا تھا۔ اور پھر اختر بانو کی طرف دیکھا۔
''کھیر منگوا لیں اب۔ تقریباً سب ہی کھانا کھا چکے ہیں۔''
اور اختر بانو نے جو نم آنکھوں کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں، چونک کر بھاگی کو آواز دے کر کھیر لانے کو کہا۔
''بڑی امی اور مانی کے ساتھ میری بھی سیٹ بک کروا دیجیے گا بابا، میں بھی لاہور جاؤں گا۔''
شایان نے جو اس دوران خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا، ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔
''تم...... تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟'' ثمرہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
''وہی جو سب کریں گے یعنی شادی میں شرکت......'' لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
''تمہارا کیا رشتہ ہے بھلا جو تم شادی میں جانے کے لیے بے چین ہو رہے ہو اور وہ بھی ہفتہ بھر پہلے۔''
اس کی بات سن کر ثمرہ کو بے حد غصہ آ رہا تھا اور اس نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا۔
''رشتہ...... ہاں رشتہ تو ہے۔'' اس نے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ ''میرے بھائیوں کی کزن ہیں تو کچھ تھوڑا بہت رشتہ تو میرا بھی بنتا ہے۔ اور جہاں تک ہفتہ بھر پہلے جانے کی بات ہے تو میں نے ابھی تک لاہور نہیں دیکھا تو پہلے جا کر ذرا گھوموں پھروں گا۔ مجھے بہت شوق تھا لاہور، اسلام آباد جانے کا تو اب موقع مل رہا ہے تو اسی بہانے لاہور کی سیر ہو جائے گی۔''
''اگر جانا ہی ہے تو اپنے بھائیوں اور بابا کے ساتھ چلے جانا۔'' ثمرہ نے جیسے بادل نخواستہ کہا تھا۔
''نہیں مجھے بڑی امی اور امان کے ساتھ ہی جانا ہے۔ شادی میں تو مجھے لاہور دیکھنے کا وقت

نہیں ملے گا۔"

وہ جب دل میں کوئی بات ٹھان لیتا تھا تو پھر اس پر قائم رہتا تھا۔ اور اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے ضرور ملے گا جس کی خوب صورت ہنسی نے کئی دن تک اسے ڈسٹرب رکھا تھا، اس نے تو ٹھیک سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور وہ اچھی طرح اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ "تیرا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں" کا قائل تھا۔ اگر کوئی لڑکی کتنی بھی خوب صورت کیوں نہ ہوتی، لیکن اسے گفتگو کا قرینہ نہ آتا یا آواز بھدی ہوتو وہ جلد ہی اس سے بے زار ہو جاتا تھا۔

"کھیر بہت مزے کی ہے اماں!" نعمان نے تعریف کی تو اختر بانو خوش ہو گئی تھیں۔

"اوکے! مجھے اور زمان کو ذرا کام سے جانا ہے۔" ثوبان شاہ کھڑے ہو گئے تھے۔ اٹھتے اٹھتے ان کی نظریں اختر بانو پر پڑیں۔ جن کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو سے چمک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی اختر بانو کو گزرے سالوں میں بہت کم یوں خوش ہوتے دیکھا تھا۔

"کھیر واقعی بہت مزے کی تھی۔"

اور اختر بانو کی نظریں بے اختیار ان کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ پلکیں ہولے ہولے لرزنے لگیں۔ اتنے سالوں بعد، عمر کے اس حصے میں بھی ثوبان شاہ کے گہری نظروں سے دیکھنے پر ان کی پلکیں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر ہلکی سرخی سی بکھر گئی تھی اور کئی سالوں بعد ثوبان شاہ نے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھا۔ گہری نظریں اختر بانو کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

ثمرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تو بابا! میری سیٹ بک کروا کے مجھے ایک دن پہلے بتا دیجیے گا، میں کراچی چلا جاؤں گا۔" شایان بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" ثوبان شاہ نے چونکتے ہوئے نظریں اختر بانو کے چہرے سے ہٹائیں۔

"میں سیٹ بک کروا دوں گا، تم اپنی بڑی امی اور امان کے ساتھ چلے جانا۔"

ثمرہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ جبکہ اختر بانو ایک خوش گوار سی حیرت میں گھری بیٹھی تھیں۔ آنکھوں

میں نمی سی تھی۔ امان نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اختر بانو نے پلکیں جھپک کر اپنی آنکھوں میں پھیلی نمی کو جھاڑا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''تو یہ طے ہوا کہ میں آپ کے ساتھ ہی لاہور جاؤں گا۔'' شایان کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکا۔ ''آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا کوئی؟''

''نہیں!'' اختر بانو نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔ خوشی ہوگی بلکہ...... تمہاری وجہ سے مانی کا دل بھی لگا رہے گا۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ یہ وہاں بور ہی نہ ہو جائے۔ پہلی دفعہ اپنے ہوش میں جا رہا ہے۔ بہت چھوٹا سا تھا جب میرے ساتھ گیا تھا۔''

''نہیں خیر، میں بور تو ہرگز نہ ہوتا۔ آزین سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے۔ اور زمل سے بھی...... لیکن اچھا ہے شانی بھی ہوگا تو زیادہ انجوائے کریں گے۔'' امان شانی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''شیور!'' شایان نے کرسی کی پشت سے بازو ہٹائے اور سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ثمرہ کے پھولے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈال کر زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زمان شاہ اور ثمینہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا، جو شادی کے کافی عرصہ بعد پیدا ہوا تھا اور ایبٹ آباد لبرن ہال میں پڑھ رہا تھا۔ ثمرہ کے اندر ابال اٹھ رہے تھے۔ وہ بار بار ثوبان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ نظریں ملیں تو وہ نظروں ہی نظروں میں انہیں پیغام دے کہ وہ ہرگز شایان کو لاہور جانے کی اجازت نہ دیں لیکن وہ ایک بار پھر اختر بانو کی طرف دیکھنے لگے تھے، جن کی آنکھوں میں چمک سی تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔

کتنے سالوں بعد انہوں نے اس کی آنکھوں میں یہ چمک دیکھی تھی ورنہ مدت ہوئی ان کی آنکھیں بجھی بجھی سی رہنے لگی تھیں اور ہونٹ جیسے مسکرانا بھول گئے تھے۔

شادی کے ابتدائی سالوں میں اس کی آنکھیں یوں ہی دمکتی رہتی تھیں اور ہونٹوں پر ہر وقت مدھم سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی ہنسی چھیننے میں ان کا بھی قصور تھا اور جب سے جہاں زیب بیگ یہاں سے ہو کر گئے تھے۔ انہیں اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا تھا۔ اختر بانو کے معاملے

میں ان سے بے حد کوتاہی ہوئی تھی۔ گزرا ہوا وقت تو واپس نہیں آسکتا تھا لیکن انہوں نے دل میں عہد کیا تھا کہ جو دکھ انہوں نے اپنی ذات سے اختر بانو کو پہنچایا تھا، اس کی تلافی کی کوشش ضرور کریں گے۔

ثمرہ نے جز بز ہوتے ہوئے انہیں دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کرسی کو پیچھے دھکیلا۔ ثوبان شاہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''صبح جو بریف کیس آپ کو دیا تھا وہ نکال کر رکھیں اور دو دن پہلے جو پیپر سیف میں رکھوائے تھے وہ بھی نکال دیجیے گا، میں آرہا ہوں۔''

انہیں سائیں مراد شاہ کے گوٹھ جانا تھا۔ کراچی میں ان کا ایک پلاٹ تھا جس کے سلسلے میں بات چیت چل رہی تھی۔ وہ ان کی مہران مل کے نزدیک تھا اس لیے زمان شاہ اسے خریدنا چاہ رہے تھے۔

ثمرہ پاؤں پٹخنے کے انداز میں تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تو انہوں نے امان سے کہا کہ وہ اکرم سے گاڑی نکالنے کا کہے۔ امان سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اختر بانو یوں ہی سرشاری بیٹھی تھیں۔

اتنے سارے دن وہ ان کے سامنے ہوگا وہ جی بھر کر اسے دیکھیں گی، اس سے باتیں کریں گی۔ اس کے شوق، اس کی دلچسپیاں، کسی کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں جانتی تھیں۔ اس کی پسند ناپسند کا انہیں علم نہ تھا۔ اتنے سارے دن اکٹھے رہیں گے تو وہ سب پوچھیں گی۔ یہاں تو وہ اس ڈر سے اس کی طرف دیکھتی تک نہ تھیں کہ ثمرہ کو برا لگے گا کہ ثوبان شاہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ شایان کو پیار کرنے اور گود میں لینے کی کوشش نہ کیا کرے، ثمرہ کو برا لگتا ہے اور جب وہ بڑا ہوا تھا تو اس سے بلاوجہ کوئی بات کرنے سے بھی منع کر دیا تھا کہ خوامخواہ ثمرہ بدگمان ہوتی ہے۔

بیتی ہوئی یادوں نے پھر آنکھیں نم کر دی تھیں۔

انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کی نمی صاف کر کے وہ بھاگی کی طرف دیکھنے لگیں جو ٹیبل صاف کر رہی تھی۔

''بھاگی! ماسی تاج سے کہو ایک کپ قہوہ بنا کر مجھے کمرے میں دے جائے۔'' ثوبان شاہ اپنے

کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئے تھے۔

''وہ، میں ابھی بنوا کر بھجواتی ہوں۔'' اختر بانو بوکھلا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ ثوبان شاہ کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد وہ ایک کپ قہوے کا پیتے تھے۔

''نہیں ماسی تاج بنا لے گی، تم آرام کرو۔ صبح سے مصروف ہو۔ مت تھکایا کرو خود کو اتنا...... ملازم ہیں، برسوں سے کام کر رہے ہیں، جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

ایک گہری نظر ان پر ڈال کر وہ واپس اپنے بیڈ روم میں چلے گئے جہاں ثمرہ بے چینی سے چکر لگاتے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی۔

''آپ منع نہیں کر سکتے تھے شانی کو لاہور جانے سے......''

ان کے اندر قدم رکھتے ہی وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھی۔ ''بھلا اسے کیا ضرورت ہے شادی میں جانے کی اور کیا رشتہ ہے اس کا جو وہ......''

''رشتہ تو ہے، یہ الگ بات کہ اسے معلوم نہ ہو......'' ثوبان شاہ بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

وہ لمحہ بھر کے لیے جیسے حیران ہوئی تھی، پھر ہولے سے سر جھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔

''جو بھی ہے، پلیز اسے منع کر دیں کہ وہ وہاں مت جائے۔''

''کیا وہ میرے منع کرنے سے رک جائے گا ثمرہ، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ جو دل میں ٹھان لے، وہی کرتا ہے۔''

انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے پیپرز اٹھا لیے اور انہیں دیکھنے لگے۔

''لیکن اگر وہاں کسی نے ذکر کر دیا یا بتا دیا اسے کہ وہ......'' اس کی آنکھوں میں خوف سا تھا۔

''اختر بانو اتنی کم ظرف نہیں ہے ثمرہ! اور نہ اس کے والد اور باقی فیملی ایسی ہے۔ اور شایان کے متعلق صرف اس کے والد اور والدہ کو ہی پتا ہے۔ باقی سب کو اختر کے صرف تین بچوں کا پتا ہے کہ امان کے وقت اس کی پیدائش کے متعلق لاہور میں نہیں بتایا گیا تھا اور اس کے لیے خود اختر بانو نے ہی منع کیا تھا البتہ اس کی والدہ کو علم تھا لیکن وہ نہیں آئی تھیں مانی کی پیدائش پر۔ جہاں تک میرا خیال ہے اختر بانو کو

اماں جان نے یا دادی جان نے ہی منع کیا ہوگا وہاں بتانے سے......"

اپنی طرف سے اسے تسلی دے کر وہ پھر ہاتھ میں پکڑے پیپرز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"پھر بھی میرا دل بہت ڈرتا ہے۔ میں شانی سے بہت محبت کرتی ہوں، وہ میرا بیٹا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ مجھ سے کسی بھی طرح دور ہو۔"

اس کے لہجے سے اب بھی خوف جھلکتا تھا۔

"کاش ہم نے شانی سے یہ نہ چھپایا ہوتا۔ میں بھی اس وقت آپ کی اور دادی جان کی باتوں میں آ گیا۔ ورنہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شانی کو آپ نے پالا تھا۔ اختر بانو نے اسے آپ کو دے دیا تھا تو وہ آپ کا ہی بیٹا ہوتا۔ لیکن یہ صورت حال نہ ہوتی کہ آپ بلاوجہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہیں کہ کہیں شایان کو علم نہ ہو جائے، بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔ اختر بانو بہت اعلاظرف ہے۔ میرے بابا جان نے اسے یوں ہی تو دادا جان کی مخالفت کے باوجود منتخب نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اگر آپ بے اعتبار ہو رہی ہیں تو ساتھ چلی جائیں۔ انوائیٹڈ تو آپ بھی ہیں نا۔"

ثوبان شاہ کی نظروں میں تاسف تھا۔

"لیکن میں بھلا کس رشتے سے جاؤں۔ اور پھر بھلا مناسب لگتا ہے میرا وہاں جانا۔" وہ ٹپٹائی۔

"اچھا ٹھیک ہے شانی چلا جائے لیکن اتنے دن پہلے تو نہ جائے۔ آپ کے اور نومی وغیرہ کے ساتھ چلا جائے۔ اتنا تو آپ اسے کہہ سکتے ہیں۔"

"ہاں کہہ سکتا ہوں۔"

وہ اس وقت ثمرہ سے بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جانتے تھے کہ شایان کی عادت ہے اپنی بات منوانے کی۔ جس طرح ثمرہ نے اس کی تربیت کی تھی، اس سے وہ ضدی اور خودسر ہو گیا تھا۔ ثمرہ کے بے جا لاڈ پیار نے کسی حد تک اسے بگاڑ دیا تھا۔ ماموں زاد بھائیوں اور ماموؤں کی محبت نے اس کے اندر چند ایسی عادات پیدا کر دی تھیں، جنہیں ثوبان شاہ پسند نہیں کرتے تھے۔

شروع میں انہوں نے ثمرہ کو منع کیا تھا کہ وہ حیدر آباد کے بجائے شایان کو یہاں ہی تعلیم دلوائے

یا پھر کراچی بھجوا دے۔ لیکن ثمرہ کو دادی اور اماں جان کی تائید حاصل تھی سو وہ خاموش ہو گئے تھے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی زیادہ تر وقت وہ حیدر آباد میں ہی گزارتا تھا کہ خود اب اس کا دل حویلی میں نہیں لگتا تھا۔ ثوبان شاہ چاہتے تھے کہ وہ کراچی یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے اور وہیں رہ کر مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے لیکن پچھلے سال گریجویشن کرنے کے بعد اس نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

''کیا کرنا ہے میں نے پڑھ کر، بڑے ماموں جلدی ہی ایک فیکٹری لگانے والے ہیں۔ سب پیپر ورک مکمل ہو چکا ہے۔ اور انہوں نے مجھے اور ہاری کو اپنے ساتھ ہی کام کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جلد ہی وہ آپ سے اس سلسلے میں بات کریں گے۔''

ثوبان شاہ خاموش ہو گئے تھے، وہ اولاد پر جبر کر کے زور زبردستی سے اپنے فیصلے صادر کرنے کے قائل نہیں تھے۔ گو ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بچوں میں سے کوئی ایک سول سروس میں جائے اور اس کے لیے انہوں نے بچپن سے ہی شایان کے لیے سوچ رکھا تھا، پر اب اس کی مرضی نہیں تھی تو انہوں نے مجبور نہیں کیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو انہوں نے ثمرہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

''بھاگی ہوگی۔ قہوے کے لیے کہا تھا میں نے......''

ثمرہ نے دروازہ کھولا اور بھاگی نے کافی ٹیبل پر پڑے رکھی۔

''چھوٹے صاحب آپ کا سٹنگ میں انتظار کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، انہیں کہو قہوہ پی کر آ رہا ہوں۔''

بھاگی سر خم کرتی ہوئی چلی گئی تو ثمرہ نے کپ اٹھا کر انہیں دیا۔ قہوہ پی کر انہوں نے پیپرز بریف کیس میں رکھے اور کھڑے ہو گئے۔

''آپ شانی کو سمجھائیں نا کہ اس کا بھلا کیا رشتہ ہے لاہور والوں سے، جو وہ اتنے دن پہلے جائے بس آپ لوگوں کے ساتھ چلا جائے۔'' ثمرہ نے جھجکتے ہوئے یاد دہانی کروائی تو انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''رشتہ تو خیر وہی ہے جو مانی کا ہے، لیکن میں سمجھاؤں گا۔''

# قسط نمبر 6

اس نے جگد (کنویں کے پاس گھڑے رکھنے کے لیے جو جگہ ہوتی ہے) پر رکھے گھڑے کو ٹھیک کر کے رکھا اور ہاتھ میں پکڑے ڈول میں سے اس میں پانی ڈالنے لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پگڈنڈی پر دھول اڑ رہی تھی۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی مٹی کے بادلوں سے وہ نمودار ہوا۔ سفید گھوڑے پر سوار کوئی ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی۔ پانی سے بھرا ڈول اس نے نیچے رکھ دیا تھا۔ کنویں سے کچھ دور سوار نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور رکاب میں پاؤں رکھ کر نیچے کودا۔ وہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ وہ مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''پانی!'' اجنبی کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔

اس نے چونک کر پاؤں کے قریب پڑے ڈول کو دیکھا اور پھر اس کی طرف نظریں ملنے پر وہ مسکرایا اور ہاتھوں کی اوک بنائی۔ بنا کچھ کہے اس نے ڈول اٹھایا اور اس کی اوک میں پانی ڈالنے لگی۔

وہ سر جھکائے پانی پی رہا تھا اور کچھ پانی اس کی انگلیوں سے نیچے گر رہا تھا۔

''بس......'' پانی پی کر اس نے سر اٹھایا۔ ''مہربانی...... شکریہ!''

پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر گھوڑے کی زین سے بندھی زنبیل سے مٹی کی چھاگل نکالی۔ اب وہ اس کے منہ پر لگا ڈھکن ہٹا کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے بغیر کچھ کہے ڈول میں موجود پانی سے اس کی چھاگل بھر دی۔

''میں نے تمہارا پانی لے لیا، اب تمہیں پھر بھرنا پڑے گا۔'' اس کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔

''کوئی بات نہیں......'' وہ بھی مسکرائی تھی۔

اس نے ڈول میں بچا پانی گڑھے میں ڈالا اور ڈول کو پھر سے کنویں میں ڈالنے کے لیے کنویں پر لگی چرخی کو گھمانے لگی۔ رسی آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھی اور ڈول نیچے جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

ڈول واپس کھینچ کر اس نے جگہ کے پاس رکھا اور اشتیاق سے اسے دیکھنے لگا۔

''کون ہو تم؟ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور یا پرستان سے آئی ہوئی کوئی مہربان پری۔''

''میں زیب النساء......'' اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور گھنی پلکیں گلابی رخساروں پر جھک گئیں۔

''اور میں......'' اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ''شہزادہ سلیم...... بہت دور سے تمہیں ہی کھوجتا ہوا آیا ہوں۔''

''مجھے......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں تمہیں میری شہزادی...... میرے ساتھ چلو گی؟''

''کہاں......؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں بھی لے چلوں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا تو اس کی پگڑی میں لگے قیمتی نگینے کی چمک ڈول میں پڑے پانی پر پڑی۔

''اور اگر میں نہ جاؤں تو......؟'' آنکھوں میں شرارت تھی اور لبوں کے گوشے میں مدھم سی مسکراہٹ......

''تو......'' اجنبی نے کنویں میں جھانکا۔ ''میری تلاش تو ختم ہو گئی ہے میری شہزادی...... میں زندگی کا سفر بھی یہاں ہی تمام کر دوں گا۔'' وہ کنویں کی طرف بڑھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''نہیں......'' اس نے مڑ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اور اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد کی۔

ماسٹر عبدالعزیز کہتے تھے میری بیٹی کے لیے تو کوئی شہزادہ ہی آئے گا۔

''تو کیا یہ وہی شہزادہ ہے؟'' اس نے جگہ پر پڑے گھڑے کو اور اس کے پاس پڑے پانی کے ڈول کو دیکھا۔ اور شہزادے نے گھوڑے کو ایڑھ لگا دی اور تیز دوڑتے گھوڑے کو ایک دم ٹھوکر لگی اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''کیا...... کیا ہوا زیب! کوئی برا خواب دیکھا ہے؟'' استانی جی اپنی چارپائی پر اس کی طرف ہی رخ کیے سوئی ہوئی تھیں۔ اس کی چیخ سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔ آیت الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک لو۔ اور میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ چاروں قل پڑھ کر سویا کرو۔''

''جی پڑھے تھے۔'' اس نے تکیے کے پاس مغل عہد کی تاریخ کو دیکھا جسے پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اتنے زور سے کہ وہ اس کی دھک دھک سنتی تھی۔ خواب برا تو نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس شہزادے کی صورت آ گئی تھی جس کی ریشمی پگڑی میں بڑا سا یاقوت تھا اور اس کے اردگرد سبز نگینے تھے، سب سے روشنی پھوٹتی تھی۔ وہ شہزادہ اسے کھوجتا ہوا مائی رکھی کے کنویں تک پہنچا تھا۔

''شہزادہ......''

اس نے تصور میں اس کے ایک ایک نقش کو سوچا۔ بلا کی خوب صورت آنکھیں، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بکھرے سلکی بال...... گداز بھرے بھرے ہونٹوں پر باریک مونچھیں۔

اور وہ چونکی۔

وہ تو...... وہ شہزادہ تو......

اس نے گھبرا کر استانی جی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ ماتھے اور چہرے پر آئے پسینے کو پونچھا۔ کھلی کھڑکی سے چاند کی روشنی اندر کمرے میں آ رہی تھی۔

''میں بہت دور سے تمہیں کھوجتا ہوا آیا ہوں میری شہزادی۔'' اس کے کانوں میں جیسے کسی نے

سرگوشی کی۔ اس کے رخسار کسی انجانی حدت سے تپ اٹھے۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ لیے اور سرگوشی کی طرح اس کے لبوں سے نکلا۔

''میری شہزادی!''

اور پھر یک دم گھبرا کر استانی جی کی طرف دیکھا۔ وہ سو چکی تھیں۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ کیسا عجیب خواب تھا اور اس سے پہلے تو اس نے ایسا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار، دور دیس سے آنے والا شہزادہ جو اسے کھوجتا ہوا مائی رکھی کے کنویں تک آیا تھا اور وہ بالکل استانی جی کے بیمار مہمان جیسا تھا۔ بالکل ویسا ہی۔ بس اس کا لباس شاہانہ تھا اور گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا تھی۔ ہاں یہ خواب والا شہزادہ تو وہی تھا، وہی استانی جی کا مہمان اور صبح کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کٹورے کی طرف بڑھتا ہاتھ اور اس کے لرزتے ہاتھوں میں پکڑے کٹورے سے چھلکتا پانی اور وارفتگی سے اس کی طرف دیکھتا وہ اجنبی۔

اس کے نوخیز دل میں ہلچل مچاتی اس کی نظریں۔ بس چند لمحوں کی بات تھی لیکن دل کی دنیا میں انوکھے اور اچھوتے سے جذبے جاگ اٹھے تھے۔ اس نے بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

''پانی......'' پیالہ اس کی طرف بڑھائے اب وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اجنبی کی نظریں اب بھی اس کے چہرے پر ٹکی تھیں اور ان نظروں کی حدت سے اس کے رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

''آپ کون؟'' اجنبی نے پیالہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''زیب النساء...... ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی۔'' بے اختیار ہی لبوں سے نکلا تھا۔

''زیب النساء......!'' اس نے بند لبوں سے دہرایا تھا اور پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ خالی پیالہ اس کو دیتے ہوئے وہ لڑکھڑایا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''بسم اللہ سنبھل کر۔''

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''شکریہ......''

اور زیب النساء نے بمشکل اس کی سحر طاری کرتی آنکھوں سے اپنی نظریں ہٹائیں اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہ اس وقت تک چوکھٹ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی اسے اپنی پشت پر اس کی نظریں محسوس ہوتی رہیں لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور کمرے میں جاکر اندر سے کنڈی لگالی تھی۔ جب تک استانی جی حکیم جی کو لے کر آئیں، وہ باہر نہیں آئی تھی۔

''استانی جی! آپ نے اتنی دیر کردی۔'' استانی جی کے دستک دینے پر اس نے دروازہ کھولا تھا۔

''نہیں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ بس حکیم صاحب دو مریض دیکھ رہے تھے کہنے لگے میں ساتھ ہی چلتا ہوں مریض کو دیکھ کر ہی دوا دوں گا۔ مریضوں کو فارغ کر کے آگئے تھے۔''

''تو پھر کیا کہا؟ دوا دی؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ہاں کہہ رہے تھے ساری علامات ملیریا والی ہیں۔ دوا بھی دے دی ہے۔'' استانی جی نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً نظریں جھکا لیں کہ کہیں استانی جی اس کی آنکھوں سے اس کے دل کا حال نہ جان لیں۔

''تم آجاؤ ادھر باورچی خانے میں ہی۔ میں دودھ گرم کر کے اسے دے آؤں۔ حکیم صاحب نے کہا ہے دودھ کے ساتھ ہی دوا دینی ہے۔ بخار کچھ کم ہو گیا تو پھر کھانے کے لیے کچھ دینا ہے۔ میں آتے ہوئے آپا صغراں سے کہہ آئی تھی، وہ گندم کا دلیہ دے جائے گی تو وہ بنالوں گی۔ اور تم دوپہر کے لیے روٹیاں پکالینا۔ آٹا تو صبح ہی میں نے گوندھ کر رکھ دیا تھا۔ دال بھی گلا کر رکھ دی تھی، بس تڑکا لگانا ہے۔''

استانی جی واپس باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو وہ بھی کمرے سے نکل کر ان کے پیچھے ہی باورچی خانے میں آگئی۔

استانی جی کا باورچی خانہ ان کے باورچی خانے کے مقابلے میں بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف مٹی کے تیل والا چولہا پڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑیوں والا چولہا بھی سیمنٹ سے بنا ہوا تھا۔ اوپر چمنی تھی۔ دیواروں میں دو بڑی الماریاں تھیں جن میں برتن پڑے تھے۔ ایک طرف حمام تھا۔ حمام کا استعمال شدہ پانی باہر گلی میں لے جانے کے لیے کھرا تھا اور نالی بنی تھی۔ بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ان کے باورچی خانے

کی طرح گدا بچھا تھا۔ چولہے کے پاس ہی دو پیڑھیاں پڑی تھیں۔ ایک چھوٹا سا نعمت خانہ بھی تھا۔ استانی جی نے نعمت خانے سے دودھ کی دیگچی نکالی اور تھوڑا سا دودھ ایک دوسری دیگچی میں ڈالا اور تیل والا چولہا جلا کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ وہ موڑھے پر بیٹھ کر استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

"روٹی کب پکانی ہے؟"

"کچھ دیر تک پکا لینا۔ ابھی تو بھوک نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہیں لگ رہی ہے تو......"

"نہیں...... میں تو ویسے بھی ابا اسکول سے آجائیں، تب کھاتی ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا یہ اوپر ٹوکری میں تھوم (لہسن) پڑا ہے، تڑکے کے لیے چھیل کر کاٹ دو۔ ہری مرچیں بھی ادھر ہی رکھی ہوں گی۔" استانی جی نے دودھ گرم کرنے کے بعد کپ میں ڈالا اور لے کر چلی گئیں۔

اسے باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے، پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس نے دال گرم کر کے تڑکا لگا لیا۔ دو چار برتن جو پڑے تھے دھو لیے۔ ٹوکری میں پڑے برتن سمیٹ لیے۔ باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے اس نے کتنی ہی بار دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ یوں ہی بے خیالی میں......

شاید دل کے اندر کہیں خواہش چھپی تھی کہ وہ نظر آ جائے، کیا خبر وہ باہر آئے۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا تھا۔ ہاں استانی جی آ گئی تھیں۔

"ارے تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو۔ کمرے میں چلی جاتیں۔ کوئی کتاب شتاب اٹھا کر پڑھ لیتیں۔ ایسے ویلے (فارغ) بیٹھے بیٹھے تو بندہ تھک ہی جاتا ہے۔ بخار بہت تیز تھا بے چارے کو۔ میں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی۔ اب جا کر بخار ذرا کم ہوا تو دوا دے کر آئی ہوں۔ تم روٹیاں ڈال لو تو کھانا کھا کر ذرا آپا صغراں سے پتا کروں، دلیہ نہیں بھیجا ابھی تک اس نے۔"

اور پھر روٹیاں پکا کر اس نے وہیں استانی جی کے ساتھ، باورچی خانے میں ہی کھانا کھایا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے کئی بار اس کا جی چاہا وہ استانی جی سے پوچھے کہ حکیم جی نے کیا کہا ہے کہ بخار کب تک اترے گا۔ لیکن پھر جھجک گئی کہ استانی جی پتا نہیں کیا سوچیں۔ لیکن استانی جی کھانا کھاتے ہوئے خود ہی بتانے لگیں۔

''حکیم جی کہہ رہے تھے ملیریا ہے، دو تین دن تو خوب زور دے کر چڑھے گا۔''

''اور اقبال بھائی کب آئیں گے شکار سے واپس؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''پتا نہیں...... کبھی تو دو تین دن بعد آ جاتا ہے اور کبھی زیادہ دن بھی لگا دیتے ہیں۔ شکار کھیلنے والوں کی مرضی ہوتی ہے کہ کتنے دن کیمپ میں رہیں گے۔ کیا خبر اس کے آنے سے پہلے ہی اس کا بخار اتر جائے تو چلا جائے واپس لیکن ابھی تو اس کی حالت نہیں ہے سفر کرنے کی۔ دو دن کے بخار میں نچڑ کر رہ گیا ہے بچہ......'' استانی جی نے صافی سے ہاتھ پونچھے اور کھڑی ہو گئیں۔

''بچہ......'' اس نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی اور استانی جی کی طرف معصومیت سے دیکھا۔

''کیا اقبال بھائی بچوں کو بھی شکار پر لے کر جاتے ہیں۔''

''ارے نہیں بیٹی......'' استانی جی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ہماری عمر کے لوگوں کے لیے تو سب جوان جہان لڑکے لڑکیاں بچے ہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی گھبرو جوان ہے اللہ اسے صحت و زندگی دے اور اس کے ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔''

وارفتگی سے اسے دیکھتا...... نظروں ہی نظروں میں اسے پیغام دیتا وہ حسین چہرہ اس کے تصور میں لہرایا تو اس نے چور نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ دال والی دیگچی اٹھا کر نعمت خانے میں رکھ رہی تھیں۔

''استانی جی! آپ رہنے دیں، میں کرلوں گی سب۔ آپ جا کر دلیہ لے آئیں۔'' اور استانی جی کے جانے کے بعد اس نے پلیٹیں دھو دیں۔ باورچی خانہ تو صاف ہی تھا۔ ایک دو چیزیں جو ادھر ادھر پڑی تھیں سنبھال کر دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ شاید اسے پیاس لگی ہو اور پانی کے لیے دروازے پر کھڑا ہو۔ لیکن فاطمہ آپا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اور کتنا اچھا ہو کہ اسے پیاس لگ جائے اور وہ پانی مانگنے کے لیے دروازے تک آئے۔ دل کے اندر کہیں اس خواہش نے چٹکی لی اور اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کتنا اچھا ہے کہ کسی کو کسی دوسرے کے دل کا حال پتا نہیں چلتا......

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا۔ استانی جی دلیہ لے کر آ گئی تھیں۔ ساتھ ہی آپا صغراں کا گھر تھا۔

استانی جی نے آ کر دلیے والا پیالہ اسے پکڑایا۔

''الماری میں دیکھو کوئی خالی ڈبا ہے تو اس میں ڈال کر رکھ دو، اس وقت آدھی پیالی ہی بناؤں گی۔ یوں تو کنک (گندم) گھر میں بھی تھی۔ تھوڑی سی بھون کر پیس کر بنا لیتی لیکن مجھے پتا تھا کہ آپا صغراں کے پاس بنا ہوا پڑا ہے۔''

''جی......'' اس نے پیالہ پکڑ لیا۔

''میں ذرا اسے دیکھ لوں، پتا نہیں کس حال میں ہے، پھر نماز پڑھ کر بنا لوں گی۔''

''میں بنا لوں گی استانی جی!'' اس اجنبی کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ پکانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، لیکن پہلے نماز پڑھ لو تم بھی۔''

''جی استانی جی۔ میں غسل خانے میں چلی جاؤں وضو کرنے؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ٹوائلٹ اور غسل خانہ صحن میں تھا اور استانی جی نے اسے صحن میں جانے سے منع کیا تھا۔ استانی جی ہنس پڑیں۔

''لو اور کہاں جاؤ گی۔ میں نے احتیاطاً منع کیا تھا کہ نامحرم ہے۔ باہر نہ نکلنا۔ اب ضرورت کے وقت تو جانا ہی ہوگا نا۔ اچھا شریف اور خاندانی لڑکا لگتا ہے۔ خاندانی نجابت جیسے پیشانی پر لکھی ہے۔ ارے اس بچے کی پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا۔ تمہارے ابا ابھی تک نہیں آئے۔ خیر ہو۔ رات تو خیر دیر ہو گئی ہوگی، لیکن اس وقت تک تو آ جانا چاہیے تھا۔''

''کیا خبر آتے ہی سیدھے اسکول چلے گئے ہوں۔ سویرے والی وین نہ ملی ہو۔ اور دیر ہو گئی ہو۔'' اس نے خیال ظاہر کیا لیکن دل میں تھوڑی سی پریشان ہو گئی تھی۔ دل کو یقین تھا کہ ابا کتنی بھی دیر ہو جاتی، پہلے اس کی طرف ہی آتے۔

''چلو اللہ خیر کرے گا۔ نماز پڑھ کر دعا کرنا۔ میں پڑوس سے کسی بچے کو تمہارے ابا کے اسکول بھیجتی ہوں۔'' استانی جی اسے تسلی دے کر فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ صحن کی طرف۔ اور ابھی وہ نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی کہ ماسٹر عبدالعزیز آ گئے۔ وہ دعا مانگ کر باہر آئی تو وہ برآمدے میں بیٹھے استانی جی سے کچھ کہہ رہے تھے۔

''ابا!'' وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''دیر کیوں لگا دی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

''ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے اسے لپٹا کر اس کے سر پر پیار کیا۔

''اے او صاحب نے میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ وہاں سے سیدھا ادھر ہی چلا گیا تھا۔ رات آ نہ سکا صبح بھی پہلی وین نکل گئی تھی۔ اب سیدھا تمہاری طرف ہی آیا ہوں۔''

''تو پھر چلیں ابا۔'' اس نے فاطمہ آپا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ صبح سے دل میں ایک ہی خواہش مچل رہی تھی کہ گھر جانے سے پہلے ایک بار پھر اسے دیکھ لے۔ وہ سحر طاری کرتی اس کی بے حد خوب صورت آنکھیں۔ وارفتگی اور حیرانی لیے اسے تکتی...... وہ ابھی تک ان آنکھوں کے سحر سے باہر ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹا درست کیا اور ایک گہری افسردگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ماسٹر عبد العزیز ابھی تک کھڑے تھے، نگاہیں جھکائے۔ استانی جی بھی کسی گہری سوچ میں تھیں۔

''ابا، کیا ہوا ہے آپ کچھ پریشان ہیں۔''

''ہاں نہیں تو......'' ماسٹر عبدالعزیز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ ماسٹر صاحب، اور تم زیب جا کر چائے بنا لو ماسٹر جی سفر کر کے آئے ہیں۔ بلکہ پتا نہیں کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ کھانا کھائیں گے آپ ماسٹر صاحب......؟'' استانی جی بھی جیسے گہری سوچ سے باہر آئی تھیں۔

''نہیں استانی جی! کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ پریشانی میں بھوک پیاس اڑ جاتی ہے میری۔''

''پریشانی کیسی ماسٹر جی...... یہ بھی تو زیب کا اپنا ہی گھر ہے۔ اس کے آجانے سے میرا وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے۔ دس کام بھی کر دیتی ہے میرے۔''

''بہت شکریہ آپا جی...... آپ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں ہے مجھے۔'' وہ بیٹھ گئے تھے۔

''میرا تو دل بیٹھا جاتا تھا کہ اکیلے گھر میں کیسے اتنے دنوں کے لیے چھوڑ کر جاؤں۔ پہلے کی

بات اور تھی لیکن ماسی نور بھری اور اسلم کی دھمکی کے بعد اب خوف آتا ہے۔ اگرچہ چوہدری صاحب نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسلم کو لیکن ابا مرحوم کہتے تھے کہ اپنی احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ کوئی نقصان ہو جائے تو بعد میں واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

''صحیح کہتے تھے آپ کے ابا جی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

''کیا...... کہاں جا رہے ہیں آپ...... اور کیوں؟'' زیب النساء ہونق سی کھڑی باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ دراصل ریفریشرز کورس ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے مجھے لاہور جانا ہے دس دن کے لیے تو میں نے استانی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ تمہیں میری واپسی تک اپنے پاس رکھ لیں۔''

ماسٹر عبدالعزیز نے بتایا تو زیب النساء کے دل میں پھلجڑی سی پھوٹی۔ اس کے دل نے تو بس اتنی ہی چاہ کی تھی کہ کاش ابا ایک روز اور اسے استانی جی کے پاس چھوڑ دیں اور وہ بس ایک بار اور اسے، اس شہزادوں کی سی آن بان والے شخص کو دیکھے اور...... دل کی چاہ پوری ہو گئی تھی۔ ابا اسے ایک دن کے لیے نہیں، نو دس دنوں کے لیے استانی جی کے پاس چھوڑ کر جا رہے تھے لیکن اتنے سارے دن وہ ابا کے بغیر کیسے رہے گی۔ وہ تو آج تک کبھی ان سے اتنے زیادہ دنوں کے لیے جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

''ایک بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کہیں آپ کو اس پر اعتراض نہ ہو۔'' استانی جی کہہ رہی تھیں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''میرے گھر میں ایک مہمان ہے۔ بیمار ہے۔'' استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کو تفصیل بتا رہی تھیں۔

''بخار اتر گیا تو چلا جائے گا۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے دو تین روز تک بخار اتر جائے گا اور اگر اقبال پہلے واپس آگیا تو پہلے ہی چلا جائے گا۔ کسی بہت اچھے خاندان کا لگتا ہے۔ آپ کو اس لیے بتایا ہے کہ بعد میں آپ کو اعتراض نہ ہو کہ گھر میں ایک اجنبی نامحرم مرد موجود تھا اور استانی جی نے زیب کو گھر میں رکھ لیا۔''

''نہیں آپا جی، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کی تیمارداری کا اجر دے گا۔ ہمارا آپ کے علاوہ اور کون ہے یہاں۔ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا کہ دو

تین دن کے لیے کہیں اور چھوڑ جاؤں۔ آپ ہوں گی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہو گی۔ آپ......" تب ہی فاطمہ آپا والے کمرے میں کچھ گرنے کی آواز آئی تو استانی جی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اللہ خیر......!" اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھیں۔

ماسٹر عبدالعزیز بھی ان کے پیچھے ہی گئے تھے۔ زیب النساء وہیں برآمدے میں پریشان سی کھڑی تھی۔

"یا اللہ سب ٹھیک ہو۔ کہیں وہ تو نہیں گرا......آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ یا اللہ اسے گرنے سے کوئی چوٹ وغیرہ نہ آئی ہو۔"

تب ہی استانی جی کمرے سے باہر آئیں۔

"زیب بیٹی! ذرا کمرے میں چلی جاؤ۔"

وہ یوں ہی پریشان سی کمرے میں چلی گئی تھی لیکن دروازے کی جھری سے دیکھنے لگی تھی۔ ابا اسے سہارا لے کر صحن کی طرف لے جا رہے تھے۔

"کیا وہ واپس جا رہا ہے۔" دل زور سے دھڑکا لیکن پھر اسے ٹوائلٹ کی طرف جاتے دیکھ کر وہ مطمئن سی ہو کر دروازے کے پاس سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد استانی جی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

"زیب بیٹی! آ جاؤ تمہارے ابا انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔" وہ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتی ہوئی باہر آ گئی۔

"اچھا آپا جی! اب اجازت دیجیے۔ صبح جانے سے پہلے زیب کو چھوڑ جاؤں گا۔ اور ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ جب جب کوئی مشکل پڑتی ہے آپ ہمیشہ کام آتی ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے لئے فاطمہ بیٹی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ کا احسان مند ہوں۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں ماسٹر صاحب! میں نے ایسا کیا کر دیا ہے، اللہ زیب بیٹی کا نصیب اچھا کرے اور آپ کا سایہ اس کے سر پر سلامت رکھے۔ مجھے فاطمہ کی طرح ہی پیاری ہے۔"

استانی جی نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا اور وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر صحن کی طرف بڑھی لیکن صحن عبور کرتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا شاید وہ دروازے میں کھڑا ادھر ہی تکتا ہو۔ لیکن دروازہ نیم وا تھا اور وہ وہاں نہیں تھا۔ استانی جی باورچی خانے کی طرف جا رہی تھیں۔

گھر آ کر اس نے جلدی سے آٹا گوندھ کر ابا کے لیے روٹی پکائی، آلو گھر میں پڑے تھے تو آلو کی بھجیا بنالی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے راستے سے دودھ اور انڈے لے لیے تھے۔ اس نے روٹی پکا کر چائے کے لیے پانی رکھ دیا تھا۔

''ابا! میں اتنے دن آپ کے بغیر کیسے رہوں گی۔ بہت یاد آئیں گے آپ نہ جائیں نا۔ کیا ضروری ہے جانا؟'' ان کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''مجبوری نہ ہوتی تو کبھی نہ جاتا بیٹی! پچھلے سال بھی نہیں جا سکا تھا۔ ایجوکیشن آفیسر صاحب نے کہا کہ حساب کے اساتذہ کے لیے ہی یہ کورسز شروع کیے ہیں تو آپ کو جانا ہی ہوگا۔ بس تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ مجھے تم پر اور استانی جی پر بہت بھروسہ ہے۔ جہاں تک اس بچے کی بات ہے۔ اس حالت میں اس کے لیے سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ ابھی بھی غسل خانے میں جانے کے لیے اٹھا تو چکر آیا اور گر گیا۔ کافی کمزوری ہے اسے۔ جانے کب سے بخار ہے۔ لیکن تم گھبراؤ مت، استانی جی کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی ڈر نہیں۔ بس خود بھی محتاط رہنا۔ دو تین روز میں بخار اتر جائے گا اور کمزوری بھی جاتی رہے گی تو چلا جائے گا۔''

انہوں نے سمجھا کہ وہ استانی جی کے گھر اس اجنبی کی موجودگی سے پریشان ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی کچھ دیر کے لیے پریشان ہو گئے تھے لیکن پھر انہوں نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ استانی جی زمانہ شناس اور سمجھ دار خاتون ہیں۔ کوئی دوسرا آپشن بھی تو نہیں تھا۔ زیب النساء نے رات کو اپنا اور ابا کا بیگ تیار کر دیا تھا۔

''دیکھو اپنی ضرورت کا سارا سامان بیگ میں رکھ لو، تاکہ پھر گھر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ پھر بھی اگر آنا پڑا تو اکیلی مت آنا، استانی جی کو ساتھ لے کر آنا۔''

یہ کیسا خوف سا بیٹھ گیا تھا دل میں، ورنہ پہلے کب یوں خوف زدہ ہوئے تھے۔ گاؤں میں تو سب ہی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ دن کے وقت کبھی کسی نے گھر کے اندر سے دروازوں کو کنڈی نہیں لگائی تھی۔

بیمار ہے دو تین دن میں چلا جائے گا۔ کون سا اس نے یہاں ہی ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جانا ہے۔ انہوں نے اپنے متذبذب دل کو سمجھا لیا تھا۔ اور زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا اور اسے استانی جی کے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن اس اجنبی کا بخار تو اتر ہی نہیں رہا تھا۔ صبح کے وقت کم ہو جاتا دن کو زور دے کر چڑھ جاتا، شام کو پھر ذرا کم ہوتا اور رات کو پھر ہو جاتا۔

''معیادی بخار ہے۔ ٹائیفائڈ......'' حکیم صاحب نے چار روز بعد جب بخار نہیں اترا تو کہا۔

''ملیریا ہوتا تو اس دوا سے اتر جاتا۔ اب پتا نہیں کتنے دن کا ہے، نو دن کا بھی ہو سکتا ہے، اکیس کا بھی۔ پرہیز بہت ضروری ہے۔ روٹی وغیرہ بالکل نہیں دینی......نہیں تو آنتوں میں زخم ہو جائیں گے۔ صرف دودھ اور ساگو دانہ دیں۔ یہ عرق وغیرہ پلاتی رہیں۔''

استانی جی بہت پریشان تھیں۔ اقبال بھی نہیں آ رہا تھا کہ اسے لے جاتا اور شہر میں کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتا۔ وہاں تو خون چیک کر کے تصدیق بھی ہو جاتی۔ پتا نہیں کب سے ہلکا بخار ہو رہا تھا اس نے پروا ہی نہیں کی اور بگڑ گیا۔ اسی لیے اتنی نقاہت ہے۔

پانچویں دن اقبال آیا تو لیکن بہت عجلت میں تھا۔

''مجھے ایک اور گروپ کو لے کر جانا ہے۔ وہ صادق آباد کے قریب ہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اور اسے تو اس قدر کمزوری ہے کہ چند قدم چلنا محال ہے اس کے لیے......آپ کو تو پتا ہے نا خالہ، یہ ہی کمائی کا وقت ہے میرے لیے۔ ورنہ میں خود اسے رحیم یار خان چھوڑ آتا وہاں اس کا دوست ہے۔ میں صادق آباد جا کر اسے فون کر کے یہاں کا سمجھا دوں گا وہ گاڑی میں لے جائے گا اور پھر اس کے گھر والوں سے رابطہ کر لے گا۔ میں تو بس کھڑے کھڑے اس کا پتا کرنے آیا تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک ہے تو ساتھ لے جاؤں شکار کے لیے......''

استانی جی اس کی اتنی لمبی بات سن کر خاموش ہوگئی تھیں۔ وہ کمزور تو بہت تھا پھر بخار ابھی تک اسی طرح تھا اور ان پانچ دنوں میں انہیں اس سے انسیت سی بھی ہوگئی تھی۔ اس کے ہونے سے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ زیب النساء زیادہ تر کمرے اور باورچی خانے میں ہی ہوتی تھی۔ اسے غسل خانے وغیرہ میں جانا ہوتا تو استانی جی کو آواز دیتا تھا اور پھر دیوار کا سہارا لیتا ہوا صحن تک جاتا، صحن سے غسل خانے تک جاتے کئی بار لڑکھڑا جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے اقبال! یاد سے فون کر دینا اس کے دوست کو۔ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ اس کی تیمارداری میرے لیے بار ہے۔ ثواب ہے کسی مریض کی دیکھ بھال کرنا اور کسی مسافر کا خیال رکھنا لیکن بیٹا، اس کا گھر ہوگا، ماں باپ ہوں گے۔ وہاں زیادہ بہتر طریقے سے اس کا علاج اور دیکھ بھال ہو سکے گی۔ یہاں گاؤں میں اب حکیم جی ہی ہیں اور جو ان کے بس میں ہے، کر رہے ہیں۔'' انہوں نے اقبال کو تاکید کی۔

''ٹھیک ہے خالہ! جاتے ہی پہلے فون کر دوں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عین اسی وقت زیب النساء باورچی خانے سے کمرے میں جانے کے لیے نکلی تو اقبال کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھی تھیں اور پھر باورچی خانے سے نکل کر کمرے تک اس کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

''اقبال بیٹا! دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اس طرح دیدے پھاڑ کر نہیں دیکھتے۔'' استانی جی نے اسے تنبیہ کی۔

''ویسے یہ ہے کون خالہ......؟'' اقبال کو جیسے ان کی تنبیہ کی پروا ہی نہیں تھی۔

''ماسٹر عبدالعزیز کی بیٹی ہے۔''

''ارے...... یہ زیبو ہے۔ اتنی بڑی ہوگئی ہے۔''

لڑکپن میں کئی بار اس نے زیب النساء کو فاطمہ کے پاس دیکھا تھا۔ جب کبھی وہ یہاں آتا تھا اور اسے زیبو زیبو کہہ کر بلاتا تو وہ بہت چڑتی تھی۔

''اقبال بھائی، میرا نام زیب النساء ہے، زیبو نہیں۔''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بچپن میں بھی یہ بہت خوب صورت ہوتی تھی، اب تو غضب ہی ڈھارہی ہے۔''

''اقبال!'' استانی جی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''چلو اب سدھارو...... اور اس کے دوست کو پیغام دینا نہ بھولنا۔'' اقبال کے جانے کے بعد انہوں نے زیب النساء کو بھی سمجھایا تھا۔

''اب جب اقبال آئے تو باہر نہ نکلنا۔ نہ تم اب چھوٹی بچی ہو اور نہ اقبال تیرہ چودہ سال کا لڑکا ہے۔ نامحرم ہے تمہارا۔''

انہیں اقبال کا اس طرح زیب النساء کو دیکھنا اور پھر بے باکی سے اس کی تعریف کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر کچھ کہتے کہتے رہ گئی تھیں کہ عقل ہی اتنی ہے۔ ماں نے بھی کچھ تہذیب نہیں سکھائی تھی۔

واپسی پر اقبال صرف چند منٹ کے لیے آیا تھا یہ بتانے کہ خود کو اس کی بات نہیں ہو سکی، اس کے دوست سے لیکن وہ ایک جاننے والے کو کہہ آیا ہے کہ اس کے دوست کو پیغام دے دے۔ سارا اتا پتا بھی سمجھا دیا ہے۔

اور وہ دوست چار دن بعد آیا تھا کہ اسے پیغام ہی دیر سے ملا تھا کہ وہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا۔ استانی جی جہاں خوش تھیں وہاں وہ بے حد افسردہ تھی۔ لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔ مسافر تھا ساری عمر تو یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن یہ دن اس کے دل کے پنوں پر رقم ہو گئے تھے کبھی نہ مٹنے کے لیے۔ آتے جاتے دن میں ایک آدھ بار سامنا ہو ہی جاتا تھا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہتا تھا لیکن اس کی نظریں باتیں کرتی تھیں۔ ان نظروں میں اسلم کی نظروں جیسی بے حیائی نہ تھی نہ ہی اقبال کی نظروں والی بے باکی تھی۔ ان نظروں میں تو وارفتگی تھی، پاکیزگی تھی۔ شفاف بے ریا آنکھوں میں ہوس نہیں تھی۔

استانی جی کسی کام سے باہر جاتیں تو وہ کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن ایک روز وہ اپنے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولے اسے صحن کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ اسے دیکھتی تھی کبھی کمرے کے دروازے کی جھری سے اور کبھی باورچی خانے کی کھڑکی سے جو صحن کی طرف کھلتی تھی۔ اس روز بھی وہ اسے دیکھ رہی تھی جب اس نے برآمدے سے باہر صحن میں قدم رکھا تو یکایک اس نے دونوں بازو پھیلائے تھے۔ شاید چکر آ گیا تھا اسے اور پھر وہ سنبھل نہیں سکا۔ برآمدہ صحن سے ذرا سا اونچا تھا۔ وہ بے

اختیار دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکی تھی۔

''آپ استانی جی کا انتظار کر لیتے۔ یہ باڑے سے دودھ لینے گئی ہیں۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

''شکریہ!''

نظریں ملیں اور پھر جیسے اردگرد سب غائب ہو گیا۔ کتنے ہی لمحے گزر گئے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ صحن کی دیوار سے بلی نے چھلانگ لگائی تو دونوں چونکے۔ زیب النساء کی نظریں جھک گئیں، رخساروں پر شفق کی سرخی بکھر گئی۔ لانبی مڑی ہوئی پلکوں کی لرزش کو اجنبی اب بھی دلچسپی اور وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مڑی تو اس نے بے اختیار آواز دی۔

''سنو......!''

اس نے برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

''تم بہت اچھی ہو زیب النساء!''

استانی جی نے کئی بار اسے کسی کام کے لیے آواز دی تھی، تو تب ہی اسے اس کا نام معلوم ہوا تھا۔ زیب النساء کے رخساروں پر بکھری شفق گہری ہوئی اور لبوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''میں اپنے ان چکروں سے سخت تنگ تھا کہ زمین آسمان سب جیسے الٹ پلٹ ہو جاتے تھے لیکن آج ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ جو چھپ چھپ کر مجھے دیکھتی تھی آج روبرو دیکھ لیا پورے ہوش و حواس میں۔''

''نہیں...... میں۔'' اور کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے تو اجنبی کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیوں...... کیا تم مجھے چھپ چھپ کر نہیں تکتی ہو؟''

وہ گھبرا گئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوئیں۔

''میں بھی تمہیں چھپ چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن تم دکھتی ہی نہیں تھیں۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''میرا بخار پوری طرح اتر نہیں رہا تھا۔ کمزوری بھی تھی اور یہ چکروں کی مصیبت بھی تھی لیکن پھر بھی اب اس قابل تھا کہ یہاں سے رحیم یار خان چلا جاتا۔ لیکن نہیں گیا۔ جانتی ہو کیوں۔ تمہیں ایک بار پورا مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی جو ایک جھلک نظر آتی تھی، اس سے تشنگی بڑھتی تھی۔ اب چلا جاؤں گا۔ لیکن پھر آؤں گا بہت جلد......''

اور زیب النساء کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگتا تھا جیسے ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آگرے گا۔ ایک بھرپور نظر اس پر ڈال کر اس نے صحن کی طرف رخ کیا اور فوراً ہی سر تھام کر رک گیا۔

''سنبھل کر......'' بے اختیار اس نے ایک قدم اٹھایا تو اجنبی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''میں چلا جاؤں گا۔ تم اب جاؤ۔ استانی جی گھر پر نہیں ہیں اور اگر کوئی آگیا تو میں نہیں چاہتا کہ کسی کی انگلی تمہاری طرف اٹھے اور استانی جی کو اپنی اس نیکی پر شرمندگی ہو۔''

وہ تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں آگئی تھی۔ دل اسی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس اجنبی کے لیے دل میں جو محبت کا احساس پیدا ہوا تھا اس میں عقیدت بھی شامل ہو گئی تھی۔

پھر دو دن بعد اس کا دوست گاڑی لے کر اسے لینے آگیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے استانی جی سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتیں...... یوں جیسے اس کے اندر تک کا حال جان لینا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ نظریں جھکا لیتی۔ یوں ہی کوئی بات چھیڑ دیتی تا کہ استانی جی کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ جائے۔ اجنبی کے جانے کے تین دن بعد ماسٹر عبدالعزیز آگئے تھے اور استانی جی کا شکریہ ادا کر کے اسے گھر لے گئے تھے۔

وہ اجنبی نو دن استانی جی کے گھر رہا تھا۔ اور زیب النساء آٹھ دن۔ ان آٹھ دنوں میں وہ چھپ چھپ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔ اور بس دو بار آمنا سامنا ہوا جب وہ اسے پانی دینے گئی تھی اور جب وہ صحن میں گرا تھا اور وہ اسے سہارا دے کر اٹھانے کے لیے گئی تھی۔ بس اس دوسری بار میں چند جملے...... وہ ان چند جملوں کو سینکڑوں بار دہرا چکی تھی۔ نہ کوئی عہد و پیمان ہوئے تھے نہ محبتوں کا دعویٰ کیا

گیا تھا پھر بھی وہ ہتھیلیوں پر انتظار کی شمع جلائے بیٹھی تھی۔

''میں پھر آؤں گا بہت جلد......'' بس یہ چند لفظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور دل میں امید کی شمع جلا گئے تھے۔ اس کا خوش گمان دل کہتا تھا کہ وہ آئے گا۔ اس پل صرف وہ ہی نہیں، وہ بھی اسیر ہوا تھا۔ وہ سوچتی ابا کہتے تھے اماں سے کہ میری بیٹی کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا۔ اور کیا یہ وہی شہزادہ ہے۔ جو میرے لیے یہاں آیا تھا اور اسے انتظار کی شمع تھما کر چلا گیا تھا اور اسے اپنا خواب یاد آجاتا، سفید گھوڑے پر سوار وہ شہزادہ سلیم......

وہ جو بالکل اس اجنبی کی طرح تھا۔

اس کا شہزادہ سلیم......

لیکن وہ اس کی انارکلی نہیں تھی۔ وہ تو اس کی نور جہاں تھی۔ اس کی ملکہ...... راج کرنے والی...... اس کے دل پر...... اور اس کی ریاست پر......

اسے نادرہ نہیں بننا تھا، ناکام نامراد...... اسے تو مہر النساء ہونا تھا۔ بامراد کامیاب...... لیکن کیا وہ واقعی کامیاب اور بامراد ہو سکتی ہے۔ اس نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ ایک جملہ تھا بس ایک چھوٹا سا جملہ...... ''میں پھر آؤں گا بہت جلد......'' چھ لفظوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا جملہ دل میں امید کی شمع جلائے ہوئے تھا لیکن کبھی کبھی وسوسوں کی تیز ہوا سے یہ شمع بھڑ کنے لگتی اور اسے لگنے لگتا کہ وہ نہیں آئے گا۔ وہ شاید کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن وہ آ گیا تھا استانی جی کے پاس...... اور وہ بے خبر تھی۔

''میں نے جانے سے پہلے آپ سے کہا تھا کہ میں پھر آؤں گا آپ سے کچھ مانگنے تو میں آ گیا ہوں استانی جی، میں زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں علم کہ اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے۔ ایک اتفاقی نظر اس پر پڑی تھی ہمیشہ سے میرے ذہن میں اپنی بیوی کے لیے ایسا ہی ایک تصور تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس کی آنکھوں میں حیا ہو چہرے پر پاکیزگی ہو اور آپ کی زیب النساء ایسی ہی ہے۔''

استانی جی نے اس کی باتوں کو تحمل سے سنا تھا۔

اور اسے ماسٹر عبدالعزیز اور زیب النساء کے متعلق بتایا۔

''تم سے بہتر زیب النساء کے لیے میری نظر میں کوئی اور رشتہ نہیں ہے لیکن بیٹا رشتہ لینے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ لڑکا خود ہی منہ اٹھا کر چلا آئے رشتہ مانگنے...... کیا تمہارے کوئی بزرگ نہیں ہیں کسی بڑے کو لاؤ رشتے کے لیے تو میں ماسٹر صاحب سے بات کرتی ہوں۔'' اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے استانی جی...... میں جلد ہی کسی بڑے کو لے کر آؤں گا۔ مجھے بس یہ اطمینان چاہیے تھا کہ اس کا رشتہ ابھی تک نہیں ہوا آپ ماسٹر جی کے کانوں میں یہ بات ڈال دیں کہ میں بھی زیب النساء سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے آنے سے پہلے وہ کسی اور کو ہاں کر دیں۔''

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اور کن لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرے۔ استانی جی اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائی تھیں۔

''لیکن دیر نہ کرنا بیٹا ماسٹر جی اس کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

اور وہ چلا گیا تھا، پھر جلدی آنے کے لیے......

اور ابھی استانی جی نے ماسٹر صاحب سے کوئی بات کی ہی نہیں تھی کہ اقبال آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح استانی جی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

''کیا آج بھی شکاریوں کے ساتھ آئے ہو؟''

''نہیں خالہ! آج تو صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔''

''جیتے رہو......''

''خالہ......'' کھانا وغیرہ کھا کر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''میں شادی کرنا چاہتا ہوں خالہ...... بہن بھائیوں کو تو میرا کوئی خیال نہیں، سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ ماں باپ ہوتے تو میرا سوچتے، اب آپ ہی میری بڑی بزرگ ہیں۔ آپ نے ہی میرے لیے کچھ کرنا ہے۔ سچ بتاؤں تو تنہا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔'' وہ ان کے گھٹنے ہی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں دیکھوں گی تمہارے لیے کوئی لڑکی...... فاطمہ سے بھی کہوں گی لیکن اقبال بیٹا! کوئی مستقل کام تو کرو پہلے...... یہ تو ہوائی روزی ہے تمہاری۔ لڑکی والے کم سے کم اتنی ڈیمانڈ تو کرتے ہیں کہ لڑکا

کام کرتا ہو۔ دس جماعتیں پڑھ رکھی ہیں کہیں کسی دفتر میں ہی کلرک وغیرہ کی نوکری دیکھ لو۔ فارغ ہوتے ہو تو ٹائپنگ وغیرہ سیکھ لو۔ نوکری ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے خالہ! میں جلد ہی کوئی مستقل کام کرلوں گا۔ یوں بھی ایک بندے نے وعدہ کیا ہے مجھ سے کہ باہر بھجوا دے گا مجھے، تو بس پھر نوٹ ہی نوٹ ہوں گے۔ عیش کرے گی میری بیوی......''

استانی جی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اس طرح کی اس کی باتیں سنتی آرہی تھیں۔

''اور خالہ......لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے استانی جی کا گھٹنا دبایا۔ ''وہ ہے نا ماسٹر جی کی بیٹی زیب النساء......اس کے لیے ماسٹر جی سے بات کریں نا۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔''

استانی جی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں پھر نرمی سے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹائے۔

''ٹھیک ہے میں ماسٹر صاحب سے بات کروں گی، آگے ان کی مرضی......'' اور اس روز جب ماسٹر صاحب زیب النساء کو اسکول جاتے ہوئے چھوڑنے آئے تو استانی جی نے دونوں رشتے ان کے سامنے رکھ دیے۔

''آپ نے کہا تھا ماسٹر صاحب کہ زیب بیٹی کے لیے کوئی رشتہ ہو تو آپ کو بتاؤں۔ آپ کو یاد ہے وہ لڑکا جو بیمار ہو کر کچھ دن میرے گھر رہا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں یوں ہی ذکر کیا کہ وہ کسی باحیا اور سادہ سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میرے ذہن میں اپنی زیب کا خیال آگیا تو میں نے اس سے کہا کہ ایک لڑکی ہے تو میری نظر میں وہ اپنے والدین کو لے کر آجائے تو پھر بات کرتی ہوں۔ لڑکے نے سی ایس ایس کا امتحان دے رکھا ہے۔ اچھا خاندان، پڑھی لکھی فیملی۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ہماری زیب کا نصیب کھل جائے۔''

استانی جی نے بڑے سبھاؤ سے بات کی تھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ماسٹر صاحب کو لڑکے کی پسندیدگی کا گمان ہو کہ وہ زیب النساء کو ان کے حوالے کر کے گئے تھے اور انہیں خیال گزرے کہ زیب النساء لڑکے کے سامنے آتی جاتی رہی ہے۔

"لڑکا اتنا پڑھا لکھا ہے اور اتنے اچھے خاندان کا ہے، وہ بھلا ہم غریبوں کے ہاں کیوں اپنے والدین کو رشتے کے لیے لائے گا۔"

انہیں لگا تھا کہ استانی جی اپنی سادگی میں یوں ہی خوش گمان ہو رہی ہیں۔

"اچھی امید رکھنی چاہیے ماسٹر صاحب، جوڑ تو اللہ ہی ملاتا ہے۔ ہم نے تو بس ایک کوشش ہی کرنی ہے۔ اقبال کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ بھی خواہش مند ہے لیکن وہ جم کر کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ گھر بھی ہے اپنا۔ پیسہ وغیرہ بھی جمع کر رکھا ہے اور کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ پہلے کوئی نوکری کرو۔ اور کچھ نہیں تو چھوٹی موٹی دکان ہی بنا لو پھر بات کروں گی۔"

"بہت شکریہ آپا جی...... آپ سے زیادہ زیب النساء کا کون خیر خواہ ہو سکتا ہے۔ دعا کیا کریں میری زیب کے لیے کہ اپنی زندگی میں اسے اپنے گھر کا کر دوں۔ میں چوہدری عبدالمالک صاحب سے بھی مشورہ کروں گا۔ اگر وہ بچہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے لایا تو، اقبال سے بھی آپ نے ٹھیک کہا، پہلے کوئی کام کاج کر لے تو سوچوں گا اس کے متعلق......" انہوں نے استانی جی سے تو کہہ دیا تھا لیکن انہیں امید نہیں تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ رشتہ مانگنے آ جائے گا۔ اسی لیے انہوں نے چوہدری عبد المالک سے بات نہیں کی تھی۔ اور ٹھیک دس دن بعد وہ آ گیا تھا لیکن اپنے والدین کے ساتھ نہیں، بلکہ اپنے کسی دوست کے والدین کے ساتھ۔ ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے ہو گئے تھے۔

"آپ کے والدین کیا اس رشتے کے لیے رضامند نہیں ہیں بیٹا؟"

"میں نے دراصل ابھی گھر میں بات ہی نہیں کی۔ مجھ سے بڑے تین بھائی ہیں میرے۔ ابھی بڑے بھائی کی شادی ہونے والی ہے اور کچھ پریشانی بھی ہے ان دنوں گھر میں تو...... میرے والدین پڑھے لکھے ہیں، زبردستی کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے جب بھی میں نے بات کی وہ انکار نہیں کریں گے۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹا، جب آپ کے بھائیوں کی شادیاں ہو جائیں اور آپ...... اپنے والدین سے بات کر لیں تو انہیں ساتھ لے کر آیئے گا۔" ماسٹر عبدالعزیز کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے کسی لڑکے کے ساتھ کر دیں جس کے والدین کی رضامندی نہ ہو۔

''لیکن کیا آپ انتظار کرلیں گے؟'' اس کے ساتھ آئی خاتون نے پوچھا تھا۔

''ہاں مجھے بھی کوئی جلدی نہیں، ابھی میری بیٹی نے ایف اے کا امتحان دینا ہے۔ پھر میں اسے بی اے کے لیے کالج میں داخل کروا دوں گا۔'' انہیں وہ بہت اچھا لگا تھا۔ سمجھدار اور تعلیم یافتہ اور خاندانی...... زیب کے لیے وہ ایسے ہی کسی شہزادے کا خواب دیکھتے تھے۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ بغیر سوچے سمجھے وہ اسے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دیتے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے والدین کا انتظار کریں گے لیکن اگر، اس دوران کوئی اچھا رشتہ آگیا تو وہ زیادہ انتظار نہ کرسکیں گے۔ یہ بات انہوں نے آنے والوں کو بھی بتادی تھی اور اس وقت اس لڑکے کی آنکھوں کی چمک ذرا سی دیر کو ماند ہوگئی تھی۔

''ان شاء اللہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد میں گھر میں بات کروں گا۔''

وہ واپس چلے گئے تھے لیکن زیب النساء کے دل میں ماند ہوتی امید کی روشنی پھر سے بڑھ گئی تھی۔

وہ آگیا تھا تو وہ پھر ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا اور ماسٹر عبدالعزیز نے بھی کئی روز تک استانی جی کی طرح اسے کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر ایک روز تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھے تھے۔

''زیب! ایک بات پوچھوں بیٹی......؟''

''جی ابا......'' وہ نظریں جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔

''استانی جی کے مہمان کی کبھی تم پر نظر پڑی تھی؟''

''جی ابا......'' اس کا سر جھک گیا۔ وہ ابا سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ ''استانی جی گھر پر نہیں تھیں اور وہ صحن میں گر گیا تھا۔ میں بے اختیار بالکل غیر ارادی طور پر اس کی مدد کرنے صحن میں آگئی تھی۔'' اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور رخساروں پر سرخی تھی۔

''میں نے استانی جی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ناراض ہوں گی کہ میں کمرے سے باہر کیوں نکلی۔ یہ غیر اختیاری طور پر ہوا تھا ابا، کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے؟'' اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں آنسو چمک رہے تھے۔

''نہیں......'' انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ گمان گزرا تھا کہ اس نے تمہیں دیکھا ہوگا تب ہی تو تمہارا رشتہ لے کر آیا ہے۔'' وہ

مسکرائے تھے اور اس نے سکون بھرا گہرا سانس لیا تھا۔ اور نم آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔ اور ماسٹر عبدالعزیز نے بے اختیار دعا کی تھی۔

"یا اللہ! اسے میری بچی کا نصیب بنا دے۔"

اور کوئی لمحہ ہوتا ہے ایسا جب دل سے نکلنے والی دعا رد نہیں ہوتی۔ اور ان کی دعا بھی رد نہیں ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

نومبر کا آغاز تھا۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی۔ لیکن صحن میں دھوپ پھیلی تھی، جس کی تپش برآمدے تک آ رہی تھی کہ برآمدے کے فرش پر بھی دھوپ کہیں کہیں بچھی ہوئی تھی۔ زمل دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھی صحن میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ تخت پر دھوپ نہیں پڑ رہی تھی لیکن دھوپ کی حدت محسوس ہو رہی تھی جو اچھی لگ رہی تھی۔ پاس ہی بی بی اماں بیٹھی اون اور سلائیوں سے الجھ رہی تھیں۔ زمل گاہے گاہے ان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بہت سارے تھکا دینے والے دنوں کے بعد آج وہ ذرا ریلیکس ہوئی تھی تو بی بی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"بی بی اماں! آج کل ہاتھ کے بنے ہوئے سوئیٹر کون پہنتا ہے؟ آپ خوامخواہ تھکتی رہتی ہیں۔"

"ارے سارا دن مجھ سے فل بازو والی کوئی نہیں پہنی جاتی۔ یہ ہاف بازو والا سوئیٹر بناؤں گی۔"

انہوں نے شاپر سے اون کا لچھا نکالا۔

"ہاف بھی تو بازار سے مل جاتا ہوگا۔ مجھے ثنا اور آنٹی کے لیے گفٹ لینے جانا ہے تو لے آؤں گی آپ کے لیے......"

ثنا ظفریاب کی بیٹی تھی۔ ظفریاب اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور دو تین روز میں واپس جانے والے تھے۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وہ شادیوں سے تو فارغ ہو گئے تھے لیکن پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ خود ان کے ہاں شانزہ کے سسرال سمیت سب کی دعوت چند دن پہلے ہوئی تھی۔ سو اس مصروفیت میں وہ مارکیٹ جا ہی نہیں سکی تھی کہ ان کے لیے گفٹ

خرید سکے۔ دادا جان نے بھی ان کے لیے سوٹ خریدنے کو کہا تھا۔

"نہ...... مجھے تم اون لا دینا بس اپنا بنا کر تمہارے لیے اسکارف بناؤں گی۔ دل لگا رہتا ہے میرا بھی ان اون سلائیوں میں......" بی بی اماں کو فارغ بیٹھنا پسند نہ تھا۔ گرمیوں میں دوپٹوں پر کڑھائی کرتیں۔ کروشیے سے لیس بناتیں اور سردیوں میں بھی جو فارغ وقت ملتا، سب کے لیے سویٹر بناتی رہتیں۔ کبھی کسی کے لیے، کبھی کسی کے لیے......

"ٹھیک ہے بی بی اماں! اون لے آؤں گی۔" زل پھر صحن کی طرف دیکھنے لگی جہاں اب چڑیاں موجود نہیں تھیں۔

"یہ شانزہ مجھے خوش نہیں لگتی زل!" بی بی اماں لچھے کو گھٹنوں پر چڑھائے گولا بنا رہی تھیں۔ "اس کے چہرے پر نئی نویلی دلہنوں والی رونق اور خوشی نہیں ہے تم نے غور کیا تھا ہمارے ہاں کی دعوت میں بھی کتنی چپ چپ لگ رہی تھی اور پھر کتنی سادا سی تھی۔ نہ کوئی زیور، نہ کام والے کپڑے، بس کان میں وہ ذرا ذرا سے ٹاپس تھے۔"

"دراصل عقیل بھائی کو یہ اس طرح کے چمک دمک والے کپڑے اور تام جھام پسند نہیں ہے بی بی اماں...... سحرش بتا رہی تھی کہ عقیل بھائی نے تو پہلے روز گھر پہنچتے ہی کپڑے تبدیل کرنے اور منہ ہاتھ دھونے کو کہہ دیا تھا۔" زل نے بتایا تو وہ حیران ہوئیں۔

"تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا......" اور پھر لمحہ بھر بعد سر ہلایا۔ "چلو بھڑ کیلے چمکیلے کپڑے پسند نہیں عقیل میاں کو نہ سہی، کئی مردوں کو نہیں پسند ہوتے پر ایسا بھی کیا کہ چار دن بھی پتا نہ چلے کہ نئی نویلی دلہن ہے۔ چہرے پر بھی خوشی کی کوئی رمق نہ تھی۔ اللہ خوش رکھے اپنی ماہ وش کو...... کیسی دمک رہی تھی، خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی تھی۔" بی بی اماں بھلے اوپر والوں سے ان کے مزاج و عادات کی وجہ سے چڑتی تھیں لیکن سب سے انسیت اور محبت تھی، سب کی خوشیوں اور اچھے نصیب کے لیے دعا گو رہتی تھیں۔

"شانے اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں گئی ہے جبکہ ماہا اپنے ہی گھر میں ہے تو شاید اس لیے کچھ وقت لگے گا شانے کو وہاں ایڈجسٹ ہونے میں تو ہو جائے گی ان شاء اللہ!"

نرمل کبھی کبھی شانزہ کو شانے اور ماہ وش کو ماہا کہہ کر بلاتی تھی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو پر سچی بات ہے موٹا اور رخسانہ نے صرف دولت ہی دیکھی ...... یوں تو بہت سیانی بنتی ہیں لیکن صرف پیسہ، گڈیاں (گاڑیاں) اور بنگلے ہی دیکھے ہیں۔ شکل کا بھی ایسا شہزادہ نہیں تھا کہ مرمٹتی ...... ہماری شانزہ لاکھوں میں ایک ہے۔ شہزادی لگتی ہے۔ چلو مرد کی شکل وصورت کوئی نہیں دیکھتا لیکن کوئی اور گن بھی تو ہوں۔ ایسا بدمزاج سا کہ ہمارے ہاں کی دعوت میں سارا وقت تیوریاں چڑھائے بیٹھا رہا۔ عمر کتنا اچھا تھا اور رقیہ کی بھی کتنی خواہش تھی۔ پڑھا لکھا تھا۔ چند سالوں میں گاڑی بھی لے لیتا پھر ایسے غریب بھی نہ تھے۔ اپنا گھر...... رقیہ ملی تھی شادی میں، کہہ رہی تھی بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اسے۔ مجھے تو پہلے روز سے ہی چھچھورے لگے تھے نودولتیے ...... خاندانی لوگوں والے طور طریقے نہیں تھے ان کے۔" بی بی اماں کو عمر کے لیے رشتے سے انکار کا ابھی بھی دکھ تھا۔

"پتا ہے وہ ولیمے میں بھی آپا کی پڑوسن ملی تھی، اس نے سب آگا پیچھا بتا دیا۔ مجھے کہہ رہی تھی عقیل کے پڑدادا کی وہاں قصور میں چھوٹی سی پرچون کی دکان ہوتی تھی۔ عقیل کا دادا کسی پارٹی سے منسلک ہوا تو پارٹی کی مدد سے بلدیاتی الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر بیٹا یعنی عقیل کا باپ صوبائی اسمبلی تک پہنچ گیا۔ بس پھر تو باپ بیٹا نوٹ چھاپنے لگے۔ حرام کی کمائی سے مل بھی لگالی۔ سو تر بنتا ہے وہاں۔ بتا رہی تھی اس کی بھانجی کو بلدیہ کے اسکول میں نوکری دلوانے کے لیے دو لاکھ رشوت مانگ لی تھی عقیل کے باپ نے۔ عقیل تو سب بہن بھائیوں سے چھوٹا ہے، سمجھو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ شاید بارہ یا چودہ جماعتیں پاس ہے۔ بڑے بہن بھائی تو کافی پڑھے لکھے ہیں۔ پارٹی والے بڑا اسپورٹ کرتے ہیں انہیں......

وہ ایک وزیر بھی تو آیا ہوا تھا ولیمے میں...... ایک ہمارے ظفریاب تھے مصیبت پڑی تو پارٹی والوں نے پوچھا تک نہیں۔ یہ تو صبوحی اتنی بھاگ دوڑ نہ کرتی تو ہمیں کہاں پتا چلنا تھا ظفریاب کا۔ پارٹی والوں نے عقیل کو کوئی بڑا ٹھیکہ دلوایا ہے۔ جانے کس چیز کا۔ یہ اسے علم نہ تھا۔ ارے باتوں باتوں میں غلط بن دیا سارا......" وہ چونک کر بنے ہوئے حصے کو دیکھنے لگیں۔

''یہ جو اتنی دیر سے آپ کر رہی ہیں بی بی اماں، کیا یہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا؟'' زمل نے انہیں دیکھا جواب بنے ہوئے حصے کو ادھیڑ رہی تھیں۔

''اللہ مجھے معاف کرے۔'' انہوں نے فوراً ہی کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''پر کیا کروں، میری آنکھوں کے سامنے سے شانزے کا چہرہ ہی نہیں جاتا ویران روکھا پھیکا سا۔ سچی بات ہے جب سے وہ ہمارے ہاں کی دعوت سے گئی ہے، میں تو اسی کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں۔ کیسی سہمی سہمی اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ پر تیری تائی کی آنکھوں کے آگے تو دولت کی پٹی بندھی ہے۔ بیٹی کا اجاڑ چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بس سمدھن کے آگے بچھی جا رہی تھی۔'' وہ اب ایک ایک خانہ سلائی پر اٹھا رہی تھیں۔ سب خانے اٹھا کر انہوں نے ایک تنقیدی نظر اس پر ڈالی اور اون سلائیاں شاپر میں رکھیں۔

''اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا ہے، بعد میں بناؤں گی۔

سنو تو! اب کے شانزہ آئے تو پوچھنا تو سہی کہ کہیں مار پیٹ تو نہیں کرتا وہ کیا کہتے ہیں آج کل، ذہنی مریض تو نہیں ہے۔''

''اللہ نہ کرے بی بی اماں! آپ تو مجھے بھی ڈرا رہی ہیں۔ مونا تائی بتا رہی تھیں بہت خوش ہے اپنے گھر میں...... ابھی گھومنے جا رہے ہیں دبئی وغیرہ......'' زمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اللہ اسے خوش رکھے۔'' بی بی اماں نے دعا دی اور تخت پر پڑا اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگیں۔ جو اون کے لچھوں اور گولوں پر مشتمل تھا۔

''سارے جہان کے کام کرنے اور انہیں سمجھانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے تم نے تو اس زین کو کیوں نہیں سمجھاتی ہو؟''

''کیا...... کیا سمجھاؤں بی بی اماں!'' وہ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''یہ ہی کہ اب باپ سے ناراضی ختم کرے۔ تقریباً دو ماہ رہ کر جا رہے ہیں ظفریاب، کبھی جو باپ سے جڑ کر بیٹھا ہو۔ سو دکھ سکھ کہنے والے ہوتے ہیں۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ ایسا کیا گناہ کر دیا ظفریاب

نے شادی کر کے...... نہ کرتا شادی تو وہی حال ہوتا جو تیرے ابا کا ہے۔ چپ لگ جاتی اسے بھی، یہ تو عارفہ نے سنبھال لیا اسے۔ ورنہ جینے کی امنگ ختم کر بیٹھا تھا۔ کہتا تھا، بی بی اماں! صبوحی کے جانے کے بعد اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ ظفریاب بھی بس جلسوں جلوسوں میں ہی تقریریں کر سکتا تھا، یہ نہیں کہ ایک تھپڑ لگا کر گلے سے لگالے اور پوچھے کان پکڑ کر صاحب زادے کیا نا قابل معافی قصور سرزد ہو گیا ہے مجھ سے کہ ابھی تک اینٹھے ہوئے ہو۔"

بی بی اماں کبھی جب بولنے پر آتی تھیں تو ایسے ہی بولتی چلی جاتی تھیں کہ انہیں اس گھر کے ہر فرد سے بہت محبت تھی۔ ظفریاب کو اداس اور حسرت سے آزین کی طرف دیکھتے پا کر، ان کا دل ان کے لیے کڑھتا تھا۔

"کتنا شوخ، پر جوش اور غصیلا ہوتا تھا ظفریاب...... اب سارا دن باپ کے کمرے میں چپ بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے تو تب سے طرح طرح کے وہم ستا رہے ہیں جب سے ظفریاب نے بڑے صاحب سے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ مکان میں اور مارکیٹ میں اپنا حصہ آزین کے نام کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کا کیا بھروسہ...... لندن والا گھر بیوی اور بیٹی کے نام کر دیں گے۔ اور یہاں کی جائیداد زین کے کہ یوکے جانے سے تو اس نے انکار کر دیا تو میرے جانے سے پہلے کاغذی کارروائی ہو جائے تو اچھا ہے۔ یہ زندگی کے میلے میں زمل! کیا خبر پھر کبھی ملاقات ہو نہ ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جیتے جی باپ کے گلے لگ جائے۔"

"اللہ نہ کرے کہ کسی کو کچھ ہو۔ ایسا تو نہ کہیں بی بی اماں۔" زمل نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ "اللہ ظفر چاچو کو لمبی زندگی دے۔" وہ پہلے ظفریاب کو تایا کہہ کر بلاتی تھی لیکن اس بار وہ انہیں چاچو کہنے لگی تھی۔

"خدانخواستہ میرا کچھ ایسا مطلب نہیں تھا، اللہ ظفریاب کو لمبی حیاتی دے۔ میں نے تو یونہی کہاوتی بات کی ہے۔" وہ اپنا شاپر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ظفریاب کی بیوی ماڑی (بری) نہیں ہے۔ بہن بھی آگے پیچھے ہی پھرتی رہتی ہے زین کے۔"

"یہ تو ہے بی بی اماں! عارفہ آنٹی بہت اچھی ہیں اور ثناء تو بہت محبت کرتی ہے زین سے۔ لیکن بی بی اماں! آپ ہی بتائیں کیسے سمجھاؤں زین کو۔ کچھ کہوں گی تو مجھ سے ہی خفا ہو جائے گا۔ کئی دن تک

بات ہی نہیں کرے گا۔ جانتی ہیں آپ اسے...... آج کل تو ویسے ہی موڈ خراب رہتا ہے اس کا۔'' زمل کو ڈر تھا کہ وہ کوئی بات کرے گی زین سے، تو وہ خفا ہو جائے گا۔

''ارے جانتی ہوں سب، کیوں ہر وقت تیوریاں چڑھائے رکھتا ہے۔ چلا جائے گا ظفریاب بھی تین چار دن میں پھر خود ہی موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بی بی اماں کو زین پر بہت غصہ تھا بلکہ وہ دل ہی دل میں اس سے کچھ خفا سی تھیں۔

یہ ولیمے کے چند دن بعد کی بات تھی سب لوگ جہاں زیب بیگ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اختر بانو اور امان کو صبح واپس جانا تھا۔ ثوبان شاہ، ریحان، نعمان اور شایان کے ساتھ ولیمے اٹینڈ کر کے چلے گئے تھے، جبکہ سب کے اصرار پر اختر بانو اور امان کو چند دنوں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں آج کل اضافی کرسیاں رکھوا دی تھیں کہ فارغ ہو کر سب جہاں زیب بیگ کے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ وہ قہوہ لے کر آئی تھی تو انہوں نے سنا جہاں زیب بیگ ظفریاب سے کہہ رہے تھے۔

''میرا ارادہ ہے کہ جیسے ہی زمل کے پیپرز ختم ہوتے ہیں میں زمل اور آزین کی شادی کر دوں، کیا تمہارے لیے دوبارہ چند ماہ بعد آنا ممکن ہو گا۔''

''کیوں نہیں ابا جان، ہم آ جائیں گے۔'' ظفریاب نے اختر بانو کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے آزین کی طرف دیکھا تھا، جو نگاہیں گود میں رکھے اخبار پر جمائے بیٹھا تھا۔

''سچ دادا جان! بھائی کی شادی ہو گی، میں مہندی پر ویسا ہی ڈریس بنواؤں گی جیسا سحرش آپا اور مہرین آپی نے پہنا تھا۔'' ثنا بے حد خوش ہوئی تھی اور آزین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیوں نہیں......'' جہاں زیب مسکرائے تھے۔ ''جیسا دل چاہے بھائی کی شادی میں کپڑے بنوانا۔''

''لیکن ابا جان! جون میں تو بہت گرمی ہو گی۔'' اختر بانو کو پتا تھا کہ زمل جون تک فارغ ہو گی۔

''آگے پیچھے کہیں کر لیں، ستمبر اکتوبر یا پھر مارچ اپریل میں موسم اچھا ہو گا تب اور اگر مارچ اپریل میں بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ پیپر دیتی رہے گی شادی کے بعد۔ کون سا زمل نے کہیں اور جانا ہے۔ اسی گھر میں تو ہو گی۔''

''لیکن دادا جان! میں ابھی سال دو سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

آزین نے اخبار سے سر اٹھایا تھا۔

''لیکن کیوں......؟'' جہاں زیب بیگ ہی نہیں، بی بی اماں بھی حیران ہوئی تھیں، جن کے سامنے رخصتی کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔

''میری ابھی جاب اسٹارٹ ہوئی ہے اور مجھے ابھی سیٹل ہونے میں وقت لگے گا۔ اس سے پہلے میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن تمہارے سیٹل ہونے تک ہم نہ رہے تو......؟'' جہاں زیب بیگ افسردہ ہو گئے تھے۔

''تم میرے ساتھ چلو زین! وہاں تمہیں اچھی جاب مل جائے گی اور اگر جاب نہ کرنا چاہو تو میرا اسٹور سنبھال لو۔ تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے۔''

ظفریاب امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ صبوحی کے ہوتے ہی اس کا برٹش پاسپورٹ بن چکا تھا کہ صبوحی خود برٹش نیشنل تھی اس کی پیدائش یو کے کی تھی۔ وہ جہاں زیب کے اصرار پر پاسپورٹ رینیو کرواتا رہتا تھا۔ اس کے لیے وہاں جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ جانا ہی نہیں چاہتا تھا سو انکار کر دیا۔

''تھینک یو! مجھے یو کے جانے اور آپ کا اسٹور سنبھالنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کسی قسم کی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جب میں سمجھوں گا کہ بیوی بچوں کا بوجھ خود اٹھا سکتا ہوں، رخصتی کروا لوں گا۔''

ظفریاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں دھندلی سی ہو گئی تھیں اور تب سے ہی بی بی اماں کو آزین پر تپ چڑھی ہوئی تھی۔

''کیا سوچتے ہوں گے ظفر کہ یہ تربیت کی ہے بی بی اماں نے ان کے بیٹے کی اور یہ سکھلایا ہے جسے جاتے ہوئے وہ ان کے سپرد کر کے گئے تھے۔''

''آپ نے بتایا نہیں بی بی اماں! کیسے سمجھاؤں؟'' زل نے پوچھا تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بتاؤں؟" ان کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی تھی۔ "پتا نہیں کتنا غصہ ہے اس کے اندر جو ختم ہی نہیں ہو رہا۔ لڑکیوں کو اتنی ادائیں آتی ہیں، منکوحہ ہو اس کی۔ اپنی ایک بات تک نہیں منوا سکتی بس اپنی اماں کی طرح ہی رہیں بدھو اور سادا......"

اور زمل کو ہنسی آ گئی۔

"آپ بھی نا بی بی اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں۔"

"ارے غلط نہیں کرتی بات...... خیر بڑے صاحب کی چائے کا وقت ہو چلا ہے تمہارے لیے بھی بنا دوں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اشا پر واپس تخت پر رکھ دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب ہی صحن کا دروازہ کھلا، سحرش اور مرتضیٰ اندر داخل ہوئے۔ مرتضیٰ آج کل ڈیوڑھی والی سیڑھیوں کے بجائے اوپر نیچے آنے جانے کے لیے صحن والی سیڑھیاں ہی استعمال کرتا تھا۔ سحرش سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے برآمدے کی طرف بڑھی تھی۔ مرتضیٰ ارباب نے پہلے پوڑے پر قدم رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تو وہ بائیک پر زین ہی تھا نا؟"

"جی زین بھائی ہی تھے۔" سحرش اس کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔

"اور وہ اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی، کیا تم اسے جانتی ہو؟ میں تو پہچان نہیں سکا، ایک تو اس نے چادر اس طرح لپیٹی ہوئی تھی کہ چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا اور دوسرے زین بھی بائیک چلا نہیں، اڑا رہا تھا۔ زن سے گزر گیا، میں تو زین کو بھی ٹھیک سے پہچان نہ پایا تھا۔ بس شک گزرا تھا کہ زین ہے، تب ہی تم سے پوچھا۔"

اس کے لبوں پر کمینی سی مسکراہٹ تھی، اب وہ پوری طرح برآمدے کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔

سحرش حیران سی مڑ کر اسے دیکھ رہی تھی، پھر اس کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"جی مرتضیٰ بھائی! آپ واقعی صحیح سے پہچان نہیں سکے۔ زین بھائی تو اکیلے تھے البتہ وہ دوسری بائیک جوان کی بائیک کے دائیں طرف سے تیزی سے گزری تھی، اس پر سیاہ چادر اوڑھے پیچھے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔"

اور مرتضٰی کا جی چاہا کہ کھینچ کر ایک تھپڑ مارے سحرش کو، اب وہ ایسا اندھا بھی نہیں تھا کہ زین اور اس کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو دیکھ نہ پاتا۔ کتنا اچھا موقع ملا تھا زمل کو بدگمان کرنے کا۔ سحرش کی گواہی سے وہ ضرور آزین سے بدگمان ہو جاتی۔ اصل مسئلہ تو بیج ڈالنے کا ہی تھا۔ ایک بار وہ اس کے دل کی زمین میں بدگمانی کا بیج ڈال دیتا تو پھر اسے پانی دینا اور نمو تک پہنچانا مشکل نہ تھا۔

''لیکن یہ سحرش کی بچی......''

اس نے دانت پیسے اور قدم صحن میں رکھا اور تیز تیز چلتا ہوا برآمدے کی دونوں سیڑھیوں کو ایک ساتھ پھلانگتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ برآمدے کا فرش صحن سے اونچا تھا۔

''کیا میں تمہیں اندھا نظر آتا ہوں جو زین کے پیچھے بیٹھی لڑکی کو دیکھ نہ پاتا......لیکن تمہاری نظر ضرور کمزور ہے۔ اپنی اس چشما ٹو سہیلی کی طرح نظر کا چشمہ لگا لو۔'' اس کی آگ برساتی نظروں نے سحرش کو اندر سے ڈرا دیا لیکن وہ بھی سحرش ارباب تھی۔ اس نے کندھے اچکائے۔

''ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو، دونوں بائیک ہی تو اتنی تیز تیز پاس سے گزری تھیں۔''

مرتضٰی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلا دبا دے۔ شادی میں کئی بار ایسے موقعے ملے تھے کہ کوئی سین کری ایٹ (create) کر کے آزین کو زمل سے بدگمان کر دیتا لیکن یہ سحرش کی بچی بوتل کے جن کی طرح ہر موقع پر آن موجود ہوتی تھی۔ اور اب تو بچ تھا۔

''کیا کہا، مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔'' اسے گھورتا ہوا ایک قدم آگے اس کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے تخت پر زمل کے پاس بیٹھ گئی۔ اور زمل جو دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی، یک دم چونکی۔

''نہیں نہیں غلط فہمی آپ کو نہیں، سحرش کو ہوئی ہے۔ زین اپنے ساتھ ماہ وش کو لے کر گیا ہے بائیک پر۔ دراصل مکس فروٹ کاٹن کاٹتے ہوئے بے دھیانی میں کٹا ہوا ڈھکن اس کی ہتھیلی میں لگ گیا تھا۔ زخم گہرا تھا اور خون بھی نہیں رک رہا تھا۔ اس لیے زین اسے ڈسپنسری لے کر گیا ہے۔ اور تو کوئی گھر میں تھا نہیں تو......''

''ہمیشہ تم ہی ٹھیک نہیں ہوتی ہو سحرش......'' وہ ایک جتاتی ہوئی نظر اس پر ڈالتا تیز تیز چلتا ہوا صحن

عبور کر کے سیڑھیوں پر اس طرح چڑھنے لگا کہ اس کے قدموں کی دھمک برآمدے تک آ رہی تھی۔

اب پتا نہیں اسے خجالت ہو رہی تھی یا اپنی کوشش کی ناکامی پر غصہ تھا لیکن وہ سحرش کی کلاس لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ زمل تو شاید کبھی بھی آزین سے بدگمان نہ ہوتی اور اگر ہو بھی جاتی تو اس کا کوئی خاص فائدہ اسے نہیں پہنچنے والا تھا۔ لیکن آزین آسان ٹارگٹ تھا کہ صبوحی کے چلے جانے کی وجہ سے وہ اعتبار کھو چکا تھا اور اسے اب صرف اور صرف آزین پر کام کرنا تھا اور اس دن کا انتظار جب آزین غصے میں آ کر زمل کو طلاق دے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا وہ بچپن سے اسے جانتا تھا۔ جب کبھی اسے غصہ آتا تھا تو اکثر اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا تھا۔ اس کے سیڑھیوں سے اوجھل ہوتے ہی سحرش نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا اور زمل کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

وہ اپنی کسی غلط یا صحیح بات پر کبھی شرمندہ نہیں ہوتی تھی۔ بس جو اس کے دل میں آتا تھا، کہہ دیتی تھی۔ اسے پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بات کا ردعمل دوسرے پر کیا ہوا ہے۔ بقول مہرین کے وہ اپنی قسم کا واحد پیس تھی، جو ارباب بیگ کے ہاں وارد ہوا تھا۔

”تم تو اپنی دوست کے گھر گئی تھیں، اتنی جلدی واپس آ گئیں۔“

زمل کو سحرش پر پیار آ رہا تھا، کئی بار اس نے نوٹ کیا تھا کہ یہ لاابالی سی سحرش، کوشش کرتی ہے کہ وہ زین سے بدگمان نہ ہو۔ بھلے اس کے لیے اسے جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔ اس کی ان چھوٹی چھوٹی بے ضرر کوششوں نے زمل کے دل میں اس کے لیے ایک خاص جگہ بنا دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی یہ ساری کوششیں زمل کے لیے نہیں، مہرین کے لیے تھیں۔

”وہ گھر پر نہیں تھی، اپنی نانو کے گھر گئی ہوئی تھی۔ غلطی میری تھی، میں جانے سے پہلے فون کر کے پوچھ لیتی۔ اتنے دنوں سے بلا رہی تھی کہ گپ شپ لگائیں گے اور مجھے اس کی منگنی کی تصویریں بھی دیکھنی تھیں۔ خیر......“ وہ کندھے اچکا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگی، پھر جیسے اچانک اسے ماہ وش کا خیال آیا۔

”یہ ماہ وش بیگم کو کیا ہوا تھا کہ صبح صبح مکس فروٹ کاٹن کاٹنے بیٹھ گئیں۔ اتنا ٹھونس کر تو ناشتہ کیا تھا۔“

”شاید کوئی ڈیزرٹ بنانا تھا اسے۔ رات کو شانزے اور عقیل بھائی آ رہے ہیں، کل یا پرسوں

انہیں دبئی جانا ہے تو تائی جان کہہ رہی تھیں کہ اب آئیں گے تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ایسے تھوڑے ہی جانے دیں گے۔'' زمل نے بتایا۔

''ہاں اگر وہ سڑیل مزاج عقیل بھائی راضی ہو گئے کھانے کے لیے رکنے پر تو...... ویسے ایک سر درد کی گولی ہے تو دے دینا رات کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' سحرش نے برا سا منہ بنایا۔

''کیا اب مستقبل کی خبر بھی ہونے لگی ہے تمہیں؟'' زمل مسکرائی۔

''ارے کبھی سنی ہوں نا تم نے ان کی لن ترانیاں...... دو دو گولیاں کھانی پڑیں۔ قسم سے سر پھٹنے لگتا ہے درد سے۔ آہ! میری نازک احساسات رکھنے والی آرٹسٹ مائنڈڈ، ادب کی دلدادہ بے چاری کزن کہاں پھنس گئی۔ زہر لگتا ہے مجھے وہ کھڑوس سا۔'' جب کوئی بندہ اسے پسند نہیں آتا تھا تو وہ ادب آداب سب بھول جاتی تھی۔

''دعا کرو زمل! وہ شوخا، گپ باز کھانے تک نہ رکے۔ ایسی عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے نظروں ہی نظروں میں ایکسرے کر رہا ہو سب کے۔ خاص کر لڑکیوں کے۔ اور یوں اکڑ کر بیٹھتا ہے جیسے فرعون بیٹھتا ہوگا۔ اس روز شاہ رخ بھائی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو دو انگلیوں سے چھو کر کے چھوڑ دیا جیسے سب غلام ہوں اس کے۔ ویسے آپس کی بات ہے یہ عقیل کی صورت میں فرعون نے ہی تو دوبارا جنم نہیں لیا۔'' وہ ہولے سے ہنسی تو زمل بھی مسکرا دی۔

''ویسے یہ تمہارے والے اینگری ینگ مین کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے آج کل...... کیا ظفر چاچو اور آنٹی کی وجہ سے؟ ویسے مجھے تو ثنا اور آنٹی بہت اچھی لگی ہیں۔ اور میں نے دل ہی دل میں پروگرام بھی بنا لیا ہے کہ رخسانہ خالہ سے کہتی ہوں کہ بلال کے لیے چاچو سے بات کرلیں۔ دو دو فائدے، ایک تو اتنی پیاری لڑکی مل جائے گی کہ انوسنٹ سی اور جھونگے میں برٹش پاسپورٹ بھی مل ہی جائے گا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ دور نزدیک کے رشتہ دار لڑکے سب ثناء کے اردگرد ہی گھوم رہے تھے کہ شاید دال گل جائے۔ لیکن یہ بلال بے وقوف گدھا اسے ذرا بھی عقل نہیں کہ اپنا ٹانکا بھی لگا لے...... بس پھر بھلا کس کو اعتراض ہوتا...... میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی...... ثناء بھی بس بونگی سی ہے۔'' وہ ایسے ہی بے

لاگ تبصرے کرتی تھی۔

"ویسے ملی! ایک بات تو بتاؤ، یہ انگلینڈ اور امریکہ پلٹ بچے اتنے بے وقوف اور سادا سے کیوں ہوتے ہیں، ہماری جیسی چالاکیاں اور ہوشیاریاں کیوں نہیں آتیں۔ میری طرح سچے کھرے......" اس نے گردن اکڑائی تو زمل کو ہنسی آ گئی۔

"پتا نہیں......لیکن سب ایسے نہیں ہوتے۔"

"ویسے تم بڑی لکی ہو ہر لحاظ سے سادا اور معصوم سی ایک نند جو ابھی سے صدقے واری ہو رہی ہے۔ بھولی بھالی سی اللہ میاں کی گائے ساس......ہاں زین تھوڑا سا کڑوا ہے لیکن جہاں اتنی مٹھاس ہو، وہاں تھوڑی سی کڑواہٹ برداشت کر لینی چاہیے، بیلنس رہتا ہے۔"

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور زین کے ساتھ ماہ وش اندر آئی۔ سحرش ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"کیا زخم زیادہ گہرا تو نہیں تھا، اسٹیچز لگے؟"

"ہاں دو اسٹیچز لگے ہیں۔" ماہ وش کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے ابھی بھی تکلیف ہو رہی ہے۔

"ہاں اب تم اپنا ہاتھ لے کر بیٹھ جانا، ظاہر ہے اس زخمی ہاتھ کے ساتھ تم سے کام تو نہیں ہو گا۔ سب مجھے اور مہرو کو ہی کرنا پڑے گا۔ یہ ہی ہتھکنڈے ہوتے ہیں بھابھیوں کے، نندوں نے گھر آنا ہو تو یوں ہی کسی نہ کسی بہانے سے کام سے جان چھڑا لیتی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"بکو مت......" ماہ وش نے اسے گھورا۔ "میں تو اماں کی بات سننے لگی تھی بے دھیانی میں کٹے ہوئے حصے پر ہاتھ لگ گیا۔"

"مجھے بتا دینا کوئی کام ہو تو......" زمل نے آفر کی تو سحرش کھل اٹھی۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ......اماں سے پوچھ کر بتاؤں گی کہ کیا مدد چاہیے۔" وہ مسکراتی ہوئی ماہ وش کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تو زمل نے خاموش کھڑے آزین کی طرف دیکھا۔

"کیا سوچ رہے ہو زین! بیٹھ جاؤ نا۔ کتنے سارے دن ہو گئے ہیں، سکون اور فراغت سے بیٹھ کر بات کیے ہوئے۔"

''نہیں پہلے تم خدمت خلق کرلو، پھر بات کرلیں گے ہم بھی......'' وہ ناراض ناراض سا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''اتنے خفا اور ناراض مت رہا کرو زین۔ پتا تو ہے تمہیں، شادی، مہمان نوازی، دعوتیں...... اتنی مصروفیات تھیں کہ فراغت ہی نہیں ملتی تھی۔ پھر یونی ورسٹی جانا، آنا...... ٹھیک سے پڑھائی بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ تم بتاؤ تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟''

''اچھی ہے...... سیلری بھی اچھی ہے لوگ بھی اچھے ہیں۔'' وہ یوں ہی ناراض ناراض سا بولا تھا۔

''آج کیا آفس نہیں جانا تھا۔ چھٹی ہے؟'' زل اس سے بات کرنا چاہتی تھی اسے لگتا تھا جیسے ان بے حد مصروف شب و روز میں ان کے درمیان اجنبیت سی در آئی تھی۔

''نہیں خود چھٹی لی ہے۔ چچا جان کو سیشن کے لیے لے کر جانا ہے۔ شینخو بابا تو آج تایا جان کے ساتھ فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ دادا جان نے شاید ان سے بات کی تھی کہ شینخو بابا کو کارخانے میں لگا لیں اور کام سیکھ جائیں تو اچھی اور مناسب تنخواہ دیں انہیں......''

''یہ تو اچھی بات ہے زین......'' وہ خوش ہو گئی تھی۔ ''ہاں شاید دادا جان نے ظفر چاچو سے بھی بات کی ہے تب ہی انہوں نے ان سے کہا ہے کہ واپس جا کر وہ رقم بھجوائیں گے تو دکانوں کے اوپر فلیٹ بنوا لیں شینخو بابا کے لیے...... دادا جان میری بات کبھی نہیں بھولتے۔''

''ہوں......'' وہ سپاٹ چہرہ لیے تخت پر پڑی اس کی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔ ظفریاب کے ذکر پر اس کے تاثرات یوں ہی سپاٹ ہو جاتے تھے۔

''زین! تم ظفر چاچو سے اپنی ناراضی ختم کر دو اب۔'' زل کو یاد تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

''میں ناراض نہیں ہوں ان سے۔'' وہ جوتے کی نوک آہستہ آہستہ زمین پر مار رہا تھا۔

''تو پھر ان کے پاس بیٹھتے کیوں نہیں ہو، بات کیوں نہیں کرتے ان سے۔''

''کیا بات کروں میں ان سے...... ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے جس پر بات کروں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بی بی اماں کہتی ہیں سو دکھ سکھ ہوتے ہیں کہنے والے۔'' زمل نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہمارے درمیان دکھ سکھ کہنے والا رشتہ بنا ہی نہیں ملی......'' وہ بے حد افسردہ سا تھا۔

''میں جب ان کے سینے میں سر چھپا کر رونا چاہتا تھا تو وہ میرے پاس نہیں تھے۔ جب میں اسکول میں کوئی انعام جیتنے پر، کلاس میں فرسٹ آنے پر اپنی خوشی ان سے شیئر کرنا چاہتا تھا تو وہ نہیں تھے۔ بس مریم چاچی تھیں، دادا جان تھے اور بی بی اماں۔ میں اپنی خوشیاں اور دکھ اپنے اندر ہی دفن کرتا آیا ہوں تو اب کیا کہوں ان سے۔''

زمل چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

''پھر بھی تم ان کے پاس بیٹھا کرو۔ کوئی نہ کوئی بات نکل ہی آئے گی کرنے کے لیے۔ اکلوتے بیٹے ہو ان کے۔ جی چاہتا ہو گا ان کا کہ تم ان کے پاس بیٹھو، باتیں کرو۔ پھر ثناء تمہاری بہن ہے کیا وہ بھی اچھی نہیں لگتی تمہیں۔ بہنیں تو بھائیوں کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔ بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔'' زمل نے سوچا تھا کہ وہ آج زین کا دل نرم کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

''وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھتی ہے، تمہارے متعلق ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ تم سے ڈھیروں باتیں کرے گی اور اپنی دلچسپیاں، شوق تمہیں بتائے گی، تم سے تمہارے شوق، دلچسپیاں پوچھے گی۔ لیکن تم اتنے سنجیدہ اور خاموش رہتے ہو کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تم سے بات کرنے کی۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ تم سے فرمائشیں کرے، تم اس کے لاڈ اٹھاؤ۔ تم اس کے بھائی ہو، اس کے لیے وہ خود کو لکی کہتی ہے۔''

''وہ مجھے بری کیوں لگے گی زمل! میری بہن ہے۔ اچھی لگتی ہے مجھے بھی۔ لیکن ہم دوسری بار ملے ہیں۔ پہلی بار جب وہ آئی تھی تو چھوٹی سی تھی تو ہمارے درمیان بے تکلفی کیسے ہو سکتی ہے۔'' آزین نے اس کی بات دھیان سے سنی تھی، زمل کو خوشی ہوئی تھی۔

''پتا ہے زین! ثناء مجھ سے تمہارے متعلق پوچھتی ہے کہ تم کیسے ہو، خوش اخلاق، نرم دل...... سخت مزاج؟''

"اور تم نے کیا بتایا کہ میں کیسا ہوں؟" وہ جو ڈل سا بیٹھا تھا، یک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔

"ظاہر ہے جیسے ہو ویسا ہی بتایا۔" زمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا کہ میں کیسا ہوں تم بتاؤ نا، میں کیسا ہوں۔ کیا کہا تھا تم نے ثنا سے۔" وہ اب بے حد دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کہا بہت اچھا، نرم دل، ہمدرد سب کا خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا اس جیسا اور کوئی نہیں......" زمل کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ زین کو صحن میں پھیلی اور برآمدے میں بکھری دھوپ جو کچھ دیر پہلے آنکھوں میں چبھ رہی تھی، اچھی لگنے لگی تھی۔ فضا میں اسے ایک خوش گوار سا احساس بکھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"کیا واقعی تم نے ثناء سے یہ کہا؟"

"ہاں تو بھلا اس میں جھوٹ کیا ہے۔ تم واقعی بہت اچھے ہو زین۔ سب کا احساس کرنے والے، سب سے محبت کرنے والے۔"

"اچھا......!" وہ یک دم چونکا۔

"ذرا میری طرف تو دیکھو۔ یہ سبق تمہیں سحرش نے تو نہیں پڑھایا کہ کبھی کبھی اپنے ہونے والے شوہر محترم کی تعریف کر دیا کرو۔"

"نہیں بھلا وہ مجھے کیوں کچھ سکھائے گی، کیا میں تمہیں نہیں جانتی کہ تم کیسے ہو۔ بلکہ میں تو تمہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔" وہ حیران ہوئی تھی۔

"دراصل چند دن پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ کبھی کبھی ہونے والی بیوی کو دو چار لفظ اظہار کے بھی دان کر دیا کریں کہ اپنے مرد کے منہ سے نکلے ہوئے یہ چند لفظ I love you (آئی لو یو) اسے مہینوں شانت رکھتے ہیں۔"

"ضرور اس نے یہ کسی کہانی سے پڑھا ہوگا۔" مدھم سی مسکراہٹ زمل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''اس نے مجھے اس طرح کی کوئی نصیحت نہیں کی، لیکن اپنی ڈائری سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا تھا مجھے کہ کبھی کبھی ایک دوسرے کو آئی لو یو کہہ کر تجدید کرتے رہنا چاہیے۔''

''ہاں تو پھر کرو ناتجدید...... آئی لو یو...... کہہ کر۔'' آزین کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

''کیا ہمیں یہ کہنے کی ضرورت ہے زین؟'' زمل لحہ بھر کو سنجیدہ ہوئی۔ ''کیا ہم نہیں جانتے......؟''

''ہاں، لیکن سحرش تو کہتی ہے ناتجدید بہت ضروری ہے، ورنہ محبت میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے۔'' وہ اسی طرح شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ سحرش بھی نا......'' زمل بے اختیار ہنس دی۔

اس کے خوب صورت ہونٹوں اور چمک دار دانتوں نے روشنی سی بکھیر دی تھی۔ وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے۔ میں نے آج تک ایسی ہنسی کسی کی نہیں دیکھی جو روشنی سی بکھیر دے اور کانوں میں جلترنگ سا بجنے لگے۔''

''کیا ہنسی کی تعریف کی تجدید کرنے کو بھی سحرش نے کہا تھا؟'' زمل کے ہونٹ ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حیا کے رنگوں کی جھلمل سی تھی اور ان رنگوں کا عکس جیسے اس کے رخساروں پر بھی پڑتا تھا کہ وہاں بھی شفق سی بکھری تھی۔

''نہیں، یہ میرا دل کہتا ہے کہ جب بھی تم یوں بے اختیار ہو کر ہنستی ہو تو میں اعتراف کروں تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے۔''

وہ کرسی کی ہتھی پر کہنی ٹکائے تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ زمل کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے کئی بار اس کی ہنسی کی تعریف کی تھی۔ آنکھوں میں بے حد اشتیاق لیے وہ کتنے دنوں بعد یوں اس طرح جذب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہیزل براؤن آنکھیں محبت کی کرنوں سے لبریز تھیں۔ برف پگھل رہی تھی۔

''تو کیا صرف میری ہنسی خوب صورت ہے، میں نہیں......؟'' زمل نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر شرارت سے اسے دیکھا۔

''صرف تمہاری ہنسی نہیں زمل، تمہاری ذات کے سارے موسم، تمہارا بولنا، سب کے کام آنا، ہر

ایک کا خیال رکھنا، تمہارا چلنا، تمہاری پلکوں کا اٹھنا اور گرنا، تمہاری مسکراہٹ، تمہارے چہرے پر بکھری یہ رنگوں کی برسات...... میں سب کا دیوانہ ہوں اور خاص طور پر تمہارا یہ خوب صورت، انمول، نایاب دل...... جس میں سب کے لیے احساس، محبت اور خلوص ہے۔"

اس طرح کا اظہار تو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ زمل کا دل معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"پتا ہے ملی، ان گزرے دنوں میں جب تم ضرورت سے زیادہ مصروف تھیں، تو کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں۔ جیسے میں تمہارے لیے اہم نہیں، بس تمہارے کام تمہارے لیے اہم ہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں تھا زین! یہ تمہارے اپنے وہم تھے۔ مصروفیت ہی بے تحاشا تھی۔ شکر ہے شانزے کے سسرال والوں کی دعوت بھی ہو گئی۔ چاچو بھی دو دن تک چلے جائیں گے تو پھر ساری مصروفیت ختم ہو جائے گی۔ لیکن میرا دل تو ابھی سے اداس ہو رہا ہے۔ چاچو اور شاء وغیرہ کی وجہ سے کتنی رونق ہے۔ گھر بھرا بھرا سا لگتا ہے۔ اب چلے جائیں گے تو کیسی بے رونقی سی ہو جائے گی نا زین......"

آزین کچھ نہیں بولا تو لمحہ بھر بعد زمل نے پوچھا۔

"زین! تم چاچو کو ایئر پورٹ چھوڑنے جاؤ گے نا؟"

"میں کیا کروں گا جا کر۔" اس کی سوالیہ نظریں زمل کی طرف اٹھیں۔

"بھنگڑا ڈالنا جا کر۔" وہ جل کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو بھنگڑا ڈالنے چلا جاؤں گا ایئر پورٹ پر۔"

"تم انہیں سی آف کرنے جاؤ گے تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ تم انہیں لینے بھی تو نہیں گئے تھے تو...... اب چلے جانا۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"کیا انہوں نے کبھی میری خوشی کا خیال کیا، جو میں ان کی خوشی کے لیے احمقوں کی طرح رخصت کرنے چلا جاؤں۔ بچے تو نہیں ہیں نا، ٹیکسی پر چلے جائیں گے۔" وہ یوں ہی اچانک تلخ ہو جاتا تھا۔ زمل نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"اچھا چلا جاؤں گا نا، اب اس طرح تو نہ دیکھو۔"

اسے احساس ہوا تھا کہ زمل کو اس کی بات سے دکھ ہوا ہے۔

"اب ان کی سزا ختم کر دو زین!" زمل کو پھر خیال آیا تھا کہ بی بی اماں نے اسے زین کو سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

"کیسی سزا زمل؟ انہیں بیوی مل گئی ہے۔ شاید پہلی بیوی سے زیادہ خوب صورت اور اچھی۔ لیکن مجھے تو ماں نہیں ملی۔ سزا تو میں کاٹ رہا ہوں ملی۔" وہ بے حد افسردہ سا تھا۔ اس نے ماتھے پر آئے سلکی بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے کیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ زمل چاہتی ہے کہ اس کے اور ظفریاب کے درمیان جو سرد مہری ہے وہ ختم ہو جائے۔ وہ خود بھی اجنبیت کی اس دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی تکلیف دہ احساس اسے ان کی طرف بڑھنے سے روک دیتا تھا۔

زمل افسردہ سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آزین کی ایسی باتیں اسے ہمیشہ دکھی کر دیتی تھیں۔ وہ اداس ہو جاتی تھی اور وہ دل ہی دل میں عہد کرتا تھا کہ اب کبھی زمل کے سامنے ایسی بات نہیں کرے گا، لیکن پھر کچھ نہ کچھ کہہ بیٹھتا۔

"زمل!" وہ ابھی تک کرسی کی ہتھی پر کہنی ٹکائے تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا تھا۔ "میں تمہاری محبت، دوستی اور خلوص پر نازاں ہوں۔ تم کیسے میری ذات کے گرد چھائے اداسی کے بادلوں کو ہٹا دیتی ہو۔ تم میرے آسمان پر چمکنے والا سب سے روشن ستارہ ہو زمل آئی لو یو...... اب تم بھی تو کہہ دو۔ لگتا ہے سحرش کی نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" وہ مسکرایا۔

"آئی لو یو زین......" وہ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی ایسا کہنا ضروری نہیں لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا وہ کہے تو اس نے کہہ دیا تھا۔

"تھینک یو زمل......" وہ سیدھا ہو گیا لیکن نگاہیں اب بھی اس پر تھیں۔ محبت لٹاتی، نثار ہوتی نگاہیں۔

"زین......!" اس کے اس طرح دیکھنے سے گھبرا کر زمل نے اسے مخاطب کیا۔

"تمہیں پتا ہے نا میں نے آج مارکیٹ جانے کے لیے چھٹی کی ہے۔ تو تم بھی گھر ہو تو بی بی اماں

کے بجائے تم ساتھ چلے چلنا۔ مجھے ثناء اور آنٹی کے لیے گفٹ خریدنا ہے۔ ویسے تو تمہیں بھی کچھ گفٹ لینا چاہیے چھوٹی بہن کے لیے......''

''او کے میم...... جو حکم۔'' اس نے سر خم کیا۔ اس کی آنکھوں میں اب وہی نرمی اور خلوص کی جگمگاہٹ تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ سرد مہری کی برف پگھل گئی تھی۔

''میں ڈاکٹر ارسلان کی طرف سے واپس آتا ہوں تو چلتے ہیں، تم تیار رہنا بلکہ مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے کل تو سب کے لیے گفٹ لینے ہیں مجھے۔''

تب ہی جہاں زیب اپنے کمرے سے باہر نکل کر ان کی طرف آئے۔

''زیبی کو آج ڈاکٹر کی طرف جانا تھا تو کب تک جانا ہے؟''

''بس دادا جان! آدھے پونے گھنٹے تک نکل جاتا ہوں۔'' اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''میں دیکھوں چچا جان جاگ گئے ہوں تو انہیں جانے کا بتاؤں۔''

شاہ زیب اب ضد نہیں کرتے تھے، خاموشی سے جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر شینو بابا کے ساتھ جاتے تھے اور کبھی کبھار زین لے جاتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر تھے۔ تھوڑا بہت کھا پی بھی لیتے تھے۔ شادی کے ہنگامے کی وجہ سے کچھ ڈسٹرب رہے تھے لیکن پھر ڈاکٹر ارسلان نے کچھ دواؤں کی ڈوز بڑھا دی تھی کچھ کم کر دی تھیں، تو اب پر سکون تھے۔

''ظفریاب کب تک واپس آئیں گے زل! کچھ بتا کر گئے ہیں؟'' ظفریاب ناشتے کے بعد عارفہ اور ثناء کے ساتھ اپنے سسرال گئے ہوئے تھے۔

''عارفہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ لنچ کر کے آئیں گے۔ بیٹھیں دادا جان، یہاں دھوپ کی ہلکی تپش ہے، اچھی لگ رہی ہے۔ آپ کے کمرے میں تو ٹھنڈ ہے بہت۔'' اس نے اپنی کتابیں سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

''پڑھائی ہو رہی تھی؟'' وہ پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔

''نہیں...... بس ارادہ تو تھا پڑھنے کا لیکن پھر دل ہی نہیں چاہا۔ ایسے ہی سکون سے بیٹھنا اچھا لگ

رہا تھا۔اور دادا جان! مجھے آج زین کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے آپ مجھے بتا دیجیے گا کیا کیا لانا ہے۔''

''بس تینوں کے لیے سوٹ ہی لانے ہیں اچھے سے ریڈی میڈ ہی لینا۔ وہاں کہاں سے سلوائیں گے۔ زین اور ظفریاب کا ناپ ایک ہی ہے۔'' وہ عید سے پہلے ظفریاب کے لیے یہاں سے ہی کپڑے بھجواتے تھے۔

''ثناء اور عارفہ سے پوچھ لیا تھا ناپ وغیرہ......''

''جی......''

''ظفریاب کے لیے کچھ کتابیں بھی میں نے منتخب کر رکھی تھیں۔ اگر وقت مل گیا تو وہ بھی لیتے آنا۔ میں نے فہرست بنا دی تھی۔''

چاروں بھائیوں میں سے صرف ظفر ہی ایسے تھے جنہیں جہاں زیب بیگ کی طرح کتابوں سے محبت تھی۔ بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے وہ......

''جی دادا جان! ہمیں مال پر بھی جانا ہے وہاں سنگ میل سے جو مل گئیں وہ لے لیں گے۔''

''وقت بھی اتنی جلدی گزر جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی ظفریاب آئے تھے اور اب جانے کا وقت بھی آ گیا۔'' وہ بے حد دل گرفتہ اور افسردہ لگ رہے تھے۔

''تو دادا جان! آپ ان سے کہیں نا وہ یہاں ہی رہ جائیں۔ کتنی رونق سی ہو گئی ہے نا ان کے آنے سے۔'' اس نے جہاں زیب بیگ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کیسے کہوں...... میں نے ہی تو اسے کہا تھا جانے کے لیے کہ موقع مل رہا ہے تو چلا جائے۔ وہ کب جانا چاہتا تھا۔ عارفہ کا بھائی تو اس کی شادی کے بعد سے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ وہاں چلے آئیں۔'' پہلی بار جہاں زیب بیگ بتا رہے تھے۔

''صبوحی کے جانے کے بعد کچھ سیاسی پارٹیاں اسے پھر اپروچ کرنے لگی تھیں۔ پارٹیوں کی ضرورت ہوتے ہیں اس طرح کے جذباتی لوگ، جنہیں قربانی کا بکرا بنا سکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم پھر کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہوں اور پھر ان دنوں میں نے کچھ مشکوک طرح کے لوگ اپنے گھر کے آس پاس دیکھے تھے۔ وہ ظفریاب کے متعلق پوچھ رہے تھے تو بس پھر میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ یو

کے جا کر سیٹل ہو جائے۔ عارفہ کے بھائی نے اسے وہاں سیٹ ہونے میں مدد دی تھی۔''

''آپ نے زین کو کبھی بتایا کہ چچا جان سے آپ نے کہا تھا جانے کو۔'' وہ کبھی انہیں چچا جان اور کبھی چاچو کہنے لگی تھی کہ اکثر کنفیوژن سا ہو جاتا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے ارباب تایا کی یا ظفریاب کی کہ وہ دونوں کو ہی چھوٹے تایا کہتی تھی۔ بی بی اماں نے ٹوکا بھی تھا کہ ظفر تمہارے تایا ہیں۔ تایا کہا کرو لیکن اسے چاچو یا چچا جان کہنا اچھا لگنے لگا تھا۔

''بتایا تھا لیکن شاید اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں باپ کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

وہ کچن کی طرف دیکھنے لگے جدھر سے بی بی اماں چائے کے دو کپ چھوٹی ٹرے میں رکھے باہر نکلی تھیں اور پھر انہیں وہاں ہی بیٹھا دیکھ کر پوچھ رہی تھیں کہ وہ چائے ادھر ہی لے آئیں۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مجھے لگتا ہے دادا جان، زین کے دل پر جمی ناراضی کی برف پگھلنے لگی ہے۔ چچا جان بھی تو سالوں بعد آتے ہیں۔ اگر ہر سال چھٹیوں میں وہ آیا کرتے تو یہ سرد مہری کی برف کب کی پگھل چکی ہوتی۔'' زمل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زمل! لیکن جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو بہت مایوس ہو کر گیا تھا۔ زین خفا خفا تھا، بھائیوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ یہ وہی بھائی تھے ظفریاب جن پر جان چھڑکتا تھا۔ اب بھی یہ ہی حال ہے۔ ظفر نے کتنی بار کہا ارباب سے کہ کسی روز جلدی کارخانے سے آ جائیں تو گپ شپ لگائیں گے پرانے دوستوں سے اکٹھے ملنے جائیں گے۔ ظفر اور ارباب اوپر تلے کے تھے تو بہت دوستی تھی ان کی۔ لیکن اب دو دن رہ گئے ہیں اس کے جانے میں اور ارباب کارخانے سے آتا ہے تو تھکا ہوا ہوتا ہے۔ سلام کر کے اوپر چلا جاتا ہے۔ کون جانے دوبارہ زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔'' آنکھوں میں نمی پھیل گئی جسے انہوں نے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے بڑے صاحب!'' بی بی اماں نے ٹرے تخت پر زمل اور جہاں زیب بیگ کے درمیان رکھا۔

"ماں کے چولھے پر جب سب بہن بھائی اکٹھے ہوتے ہیں تو بہت محبتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن جب چولھے الگ ہوتے ہیں تو محبتیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں۔ یہ ہی دستور زمانہ ہے۔ محبتیں تقسیم ہوتی ہیں، ختم نہیں ہوتیں بڑے صاحب! ارباب صبح جاتے ہوئے ظفریاب سے کہہ گئے تھے کہ آج وہ جلدی آنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

"پتا نہیں......" جہاں زیب بیگ نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"ایسا وعدہ تو کئی دنوں سے کر رہا ہے وہ۔" انہیں یقین نہیں تھا لیکن وہ شاہ رخ کو سارا کام سمجھا کر عصر سے کچھ پہلے آ ہی گئے تھے۔ اور عصر کی نماز کے بعد سے ہی سب دادا جان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ زل اور ثناء کارپٹ پر فلور کشن پر بیٹھی تھیں جو ثنا ڈرائنگ روم سے اٹھا لائی تھی۔ ظفریاب جہاں زیب بیگ کے پاس ہی ان کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ آزین، مرتضیٰ اور ارباب کرسیوں پر تھے۔ درمیانی ٹیبل پر کچھ دیر پہلے ہی بی بی اماں نے دوسری بار آکر چائے رکھی تھی۔ ارباب اپنی اور ظفریاب کی مشترکہ شرارتوں کے قصے سنا رہے تھے۔ زل نے پہلی بار ارباب تایا کو یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

"یہ ظفر تو شروع دن سے ہی انقلابی تھا۔ نئی نئی باتیں سوجھتی تھیں اسے۔" انہوں نے محبت سے ظفر کی طرف دیکھا۔

"جب میں فرسٹ ایئر میں تھا اور یہ میٹرک میں تو ایک بار اس نے تھرل کے لیے فلم کا آخری شو دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اماں جان کو اس نے اپنی سازش میں شامل کر لیا تھا کہ سونے سے پہلے وہ صحن اور ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی اندر سے کھول دیں گی۔ اب اماں جان کو بھی اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ بارہ بجے کے بعد واپسی ہو گی کہ آخری شو نو بجے سے بارہ تک تھا اور ابا جان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں رہے گا۔

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 7

''ہم ہولے ہولے دروازہ کھول رہے تھے کہ بی بی اماں نے جو کسی کام سے باہر نکلی تھیں چور چور کا شور مچا دیا۔ ابا جان، بھائی جان سب ہی جاگ گئے تھے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیں کیا ہوا۔''

''بہت مار پڑی تھی کیا......؟'' ثناء نے شرارت سے ان کی طرف دیکھا۔

''نہیں خیر تین چار تھپڑ ہی لگائے تھے میں نے۔'' جہاں زیب بیگ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''جی لیکن بھائی جان نے تو وہ مار لگائی تھی کہ ہفتوں ہڈیاں درد کرتی رہی تھیں۔'' ظفریاب کو بھی یاد آیا تھا۔

''دراصل بھائی جان کو اس بات کا دکھ تھا کہ ہم نے انہیں کیوں نہیں اپنے پروگرام میں شامل کیا۔''

ارباب بیگ نے قہقہہ لگایا تو سب ہی ہنسنے لگے۔

تب ہی دروازہ کھلا اور شاہ زیب بیگ نے اندر قدم رکھا اور ادھر ادھر متجسس نظروں سے دیکھنے لگے۔

آج جب آزین ڈاکٹر کے پاس سے انہیں لے کر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔

''آج ارسلان بھائی نے پورے یقین سے کہا ہے کہ چچا جان اب بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ انہوں نے ڈوز کم کر دی ہے اور کہا ہے کہ انہیں کہیں گھمانے کے لیے لے جائیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی بعض اوقات بہت اثر انداز ہوتی ہے۔''

''ابا!'' زل ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

''شاہ زیب بیٹا! آ جاؤ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' جہاں زیب بیگ نے کہا لیکن وہ یوں ادھر ادھر دیکھتے رہے، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔

''زیبی......!'' ظفریاب بے اختیار اٹھ کر ان کی طرف بڑھے وہ کچھ دیر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔

''ظفر بھائی! آپ آ گئے۔ کہاں تھے آپ...... کتنا ڈھونڈا ہے ہم نے آپ کو، کہاں لے گئے تھے وہ آپ کو......؟''

''زیبی میرے بھائی!'' ظفریاب نے انہیں گلے سے لگا لیا اور دونوں بازوؤں میں بھینچے کھڑے تھے۔

جہاں زیب بیگ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ زل کی آنکھیں بھی نم ہوئیں کہ جب سے ظفریاب آئے تھے ایک بار بھی شاہ زیب نے انہیں نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ گھنٹہ گھنٹہ بھر ظفریاب ان کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ کچھ دیر بعد جب ظفریاب نے انہیں الگ کیا تھا تو ان کی آنکھیں پھر سپاٹ تھیں۔ ان میں پہچان کے کوئی رنگ نہ تھے۔ اور وہ ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے جیسے کسی کو تلاش کرتے ہوں۔

''کچھ چاہیے آپ کو؟'' زل نے قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے۔

''یہ شینخو بابا کو ڈھونڈ رہے ہیں۔'' زل نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

''لیکن ابھی اس نے مجھے تو پہچان لیا تھا اور پھر......'' ظفریاب ابھی تک کھڑے تھے۔

''ڈاکٹر ارسلان نے کہا تھا کہ کبھی کبھی انہیں ماضی کا کوئی واقعہ کوئی بات اچانک یاد آ جائے گی لیکن کچھ دیر بعد بھول جائے گی لیکن ایک وقت آئے گا جب سب یاد آ جائے گا۔ یہ آہستہ آہستہ بہتری کی طرف آ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے سات سال بعد جب آپ آئیں گے تو یہ بالکل ٹھیک ہوں گے۔''

ظفریاب نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

وہ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن بس بے اختیار ہی یہ جملہ اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔

''سات سال کیوں بھئی، ابھی تو اگلے سال مرتضیٰ اور مہرین کی شادی ہو رہی ہے اور ظفریاب نے وعدہ کیا ہے ارباب سے کہ وہ ضرور آئے گا شادی پر۔'' جہاں زیب بیگ نے ظفریاب کی آنکھوں

میں پھیلتے کرب کو محسوس کیا تھا۔

''ہاں ہاں ظفر نے وعدہ کیا ہے مجھ سے اور میں تو کہتا ہوں ابا جان، آپ مرتضٰی اور مہرین کی شادی کے ساتھ ہی زمل اور آزین کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دیں۔ مونا کہہ رہی تھی کہ ستمبر اکتوبر کی کوئی تاریخ رکھیں گے، موسم اچھا ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' مرتضٰی نے جو حیران حیران سا ارباب بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا، یک دم پوچھا۔''کیا اماں جان نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''ہاں تو ہم کون سا ابھی کر رہے ہیں برخوردار! اگلے سال کی بات ہو رہی ہے۔ تب تک مہرین کا ہاؤس جاب بھی ہو جائے گا۔'' آج ارباب بیگ کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

''لیکن مجھے مہرین سے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ نہ آج، نہ پھر کبھی۔''

ارباب بیگ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اس وقت اورنگ زیب یہاں نہیں تھے۔

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ بچپن سے بات طے ہے تمہاری اور مہرین......''

''میں بچپن کے طے کیے ہوئے رشتوں کو نہیں مانتا۔'' وہ ان کی بات کاٹتا ہوا کھڑا ہو گیا۔''مجھے مہرین سے شادی نہیں کرنی۔ ہر گز نہیں...... اماں کو بھی یہ بتا دیں، نہیں ہے پسند وہ مجھے......''

''تم......!'' ارباب غصے سے سرخ ہوتے ہوئے اٹھے تو ظفریاب نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ زمل پر ایک نظر ڈالتا ہوا جو ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی، تیزی سے باہر نکلا اور دروازے کے باہر کھڑی سحرش سے ٹکرا گیا جو زمل کو بلانے آئی تھی۔

ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالتا دھم دھم کرتا ہوا وہ صحن عبور کر کے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

کئی دنوں کے بادلوں اور مسلسل رم جھم کے بعد آج سورج نکلا تھا۔ سرما کی نرم گرم سی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ اس لیے ناشتے کے بعد سب ہی صحن میں آ گئے تھے۔ رات ہی ثوبان شاہ کئی ہفتوں

کے بعد کراچی سے آئے تھے۔ وہاں مہران مل کے عقب میں کچھ زمین تھی جسے وہ خریدنا چاہتے تھے کہ یہ ان کی بھی خواہش تھی اور نومی کی بھی کہ وہ اور ریحان مل کر الگ سے کوئی فیکٹری لگالیں لیکن ریحان نے صاف منع کر دیا تھا کہ اس وقت وہ ساری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف دینا چاہتا ہے۔ پارٹ ون کے بعد اس کا ارادہ باہر جانے کا ہے۔ چند سالوں بعد واپس آ کر بھی وہ دو طرفہ توجہ نہیں دے پائے گا اس لیے بہتر ہے کہ شایان اور نومی ہی مل کر کام کریں۔

''میں نے جو اتنی محنت کی ہے میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ میرا ارادہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے علاقے میں ایک چھوٹا سا اسپتال بنانے کا ہے۔''

اور وہ خاموش ہو گئے تھے حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ بزنس کرے۔ میڈیکل میں جانا اس کا شوق تھا سو پورا کر لیا اب نوکریوں کے چکر میں نہ پڑے۔ لیکن جانتے تھے کہ وہ نہیں مانے گا۔ زمین کے سودے کا کام کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا۔ ابھی رجسٹری وغیرہ ہونی تھی کہ تایا جان نے ہنگامی بنیادوں پر سب کو بلا لیا تھا۔ سو وہ اکیلے نہیں آئے تھے ریحان اور مہران شاہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

اختر بانو ان کی اچانک آمد پر جہاں حیران ہوئی تھیں، وہاں ریحان کو دیکھ کر خوش بھی ہو گئی تھیں۔

''نومی کو بھی لے آتے۔'' وہ بے اختیار کہہ بیٹھی تھیں کہ لاہور سے واپس آنے کے بعد ابھی تک وہ کراچی نہیں آیا تھا۔

''نومی کو ایک آرڈر مکمل کروانا تھا۔ مہران بھی بمشکل نکلا ہے۔ مہران واپس جائے گا تو اس سے کہوں گا کہ کچھ دنوں کے لیے اسے بھیج دے۔ اگر تایا جان نے یوں اچانک نہ بلا لیا ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ زمین کا انتقال ہوتے ہی ہم کچھ دنوں کے لیے آئیں گے۔'' ان کے لہجے میں وہی ابتدائی دنوں والی نرمی تھی۔

اختر بانو کا من بھیگنے لگا تھا۔

''تایا جان نے اس طرح اچانک کیوں بلایا ہے سب کو......؟'' اختر بانو نے پوچھا تھا۔

''کچھ اندازہ نہیں ہے مجھے۔ شاید زمان کو پتا ہو۔'' اور اس وقت صحن میں دھوپ سے لطف اندوز

ہوتے ہوئے یہ ہی موضوع زیر بحث تھا جب اختر بانو بھاگی اور اس کی بیٹی کے ساتھ مالٹوں کا تازہ جوس نکلوا کر لائی تھیں۔

ثوبان شاہ کو موسم سرما کی دھوپ میں بیٹھ کر کینو اور مالٹے کھانا اور ان کا فریش جوس پینا بہت پسند تھا۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی ان کے دوست نے سرگودھا سے مالٹے بھجوائے تھے، جس کے بھلوال کے گردونواح میں اپنے باغات تھے۔

اختر بانو کے اشارے پر بھاگی اور سنہری نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دیے تھے اور اختر بانو سب کو گلاس پکڑانے لگیں۔ اختر بانو کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے ثوبان شاہ مسکرائے۔

”تھینک یو بانو......“ سامنے بیٹھی ثمینہ سے ہولے ہولے باتیں کرتی ثمرہ نے اس مسکراہٹ کو دیکھا اور ایک تیز چبھتی ہوئی نظر اختر بانو پر ڈالی۔ اسے ان دنوں ثوبان کا معمولی سا التفات بھی اختر بانو کے لیے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اختر بانو سب کو جوس سرو کرنے کے بعد واپس جانے کے لیے مڑیں تو امان نے روکا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟ آ جائیں ادھر آپ بھی۔“ اس نے ثوبان شاہ کے دائیں طرف والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر سے ابھی ابھی شایان اٹھ کر گیا تھا۔

”وہ رات مہران بھائی نے بریانی کی فرمائش کی تھی تو میں ذرا اس کی تیاری کر لوں۔“

”تو پیاری والدہ، مہران چاچو کی فرمائش تو ان کی بیگم کو پوری کرنا چاہیے نا۔“ امان کا دل چاہا تھا کہ جب سب یہاں اتنے دوستانہ ماحول میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں تو اس کی ماں بھی اس دوستانہ ماحول کا حصہ بنے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں اپنی نگرانی میں بنوا لوں گی بریانی۔“ صفورا جز بز ہوئی تھیں۔ امان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ہاں...... ہاں آ جاؤ اختر بانو!“ ثوبان شاہ نے اپنی قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور زمان شاہ کی طرف دیکھا۔

”تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ تایا جان نے اس طرح کیوں ہم سب کو بلایا ہے۔“

''میرا خیال ہے الیکشن نزدیک آرہے ہیں تو اسی سلسلے میں کچھ مشورے وغیرہ کرنے ہیں انہوں نے......''

''لیکن اس کے لیے بطور خاص ہم سب کو ہنگامی حالات میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی الیکشن تو دور ہیں اور ظاہر ہے ہم نے تایا جان اور دلاور بھائی کو ہی سپورٹ کرنا ہے۔ الیکشن کمپین شروع ہونے پر ہم آجاتے ہیں یہاں۔''

مہران شاہ کا اس وقت کراچی ہونا ضروری تھا انہیں احساس تھا کہ نومی پر کام کا بوجھ ہوگا۔

''میرا اندازہ ہے اور جو مجھے ادھر ادھر سے سن گن ملی ہے، تایا جان بیدار بخت کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کے لیے ہم میں سے کسی کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بار دلاور کو کھڑا کرنے کا ان کا ارادہ نہیں ہے۔''

زمان شاہ علاقے میں رہتے تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ جانتے تھے۔

''لیکن کیوں، یہ سیٹ تو کئی سالوں سے دلاور بھائی کی ہے۔'' مہران شاہ کو حیرت ہوئی تھی۔

''دراصل آپ کے تایا جان چاہتے ہیں کہ سیٹ ان کے خاندان میں ہی رہے کہ دلاور چچا کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے، انہوں نے اپنے علاقے کے لیے کوئی کام نہیں کیا جبکہ بیدار بخت نے اسمبلی میں نہ ہوتے ہوئے بھی علاقے کے لوگوں کی فلاح کے لیے کافی کام کیا ہے۔ لوگوں کو مسئلہ ہو کوئی تو بیدار بخت یا زمان چچا کے پاس جاتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بیدار بخت کے مقابلے میں کھڑا ہوگا تو جیتنے کا زیادہ امکان ہے علاقے کے لوگ آپ لوگوں کی عزت کرتے ہیں ایک نام ہے سب کا۔ دلاور چاچو کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

امان شاہ بھی یہاں ہی رہتا تھا اور علاقے کے لوگوں سے ملتا جلتا رہتا تھا اس لیے اندازہ تھا اسے۔

''کیوں میرے بھائی نے کیا ظلم توڑے ہیں علاقے والوں پر کہ وہ پسند نہیں کرتے انہیں...... اور ان کی عزت کیوں نہیں ہوگی۔ انہوں نے کوئی کسی کی......'' وہ مردوں کی موجودگی کا خیال کر کے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔

''اس لیے چھوٹی امی! کہ وہ سال کے گیارہ مہینے تو حیدر آباد میں رہتے ہیں سب اور ان گیارہ مہینوں میں چھ سات مہینے دلاور چچا اسلام آباد ہوتے ہیں۔ فصل کٹنے اور پھل اترتے وقت ملا جلا کر وہ ایک ماہ یہاں رہتے ہیں اور علاقے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے ایک خیال ظاہر کیا تھا آپ کو برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔'' امان نے ماں کی طرف دیکھا جو گھبرائی گھبرائی سی بیٹھی تھیں اس لیے معذرت کر لی۔

اس کے اس خیال سے دل ہی دل میں سب متفق تھے، لیکن ثمرہ کی دل آزاری نہ ہو، اس خیال سے مہران شاہ نے کہا۔

''امان نے ایک سنی سنائی بات کی ہے بھابھی! اس کا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اور مجھے تو یوں بھی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم پہلے کی طرح اس بار بھی دلاور بھائی کو سپورٹ کریں گے اور کیا تایا جان یہاں آ گئے ہیں؟''

ثمرہ کے ماتھے کے بل کچھ کم ہوئے تھے لیکن وہ اب بھی ناراضی سے امان کو دیکھ رہی تھی۔

''میری بابا جان سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ اور دلاور بھائی دو دن سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے اپنی پارٹی کی میٹنگ میں اور مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ یہاں آ گئے ہیں یا اسلام آباد سے حیدر آباد واپس آئے ہیں۔''

''میری صبح ان سے بات ہوئی تھی وہ کچھ دیر تک پہنچ جائیں گے یہاں۔ مغرب کے بعد ہی انہوں نے سب کو بلایا ہے۔ آس پاس کے علاقوں کے کچھ معززین بھی ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ جو بات چیت بھی ہو گی وہ الیکشن کے حوالے سے ہی ہو گی۔'' زمان شاہ کھڑے ہو گئے تھے۔

''باغات کے ٹھیکے کے لیے کچھ لوگوں نے آج ڈیرے پر آنا ہے۔ میں ان سے بات چیت کر کے گھر آ جاؤں گا۔'' ثوبان شاہ نے سر ہلاتے ہوئے پاس پڑی کین کی چھوٹی سی ٹیبل سے اخبار اٹھایا۔

''مہران! یہ جواد احمد کے کالم پڑھتے ہو کیا۔ بہت زبردست لکھتا ہے۔ بہت گہری نظر ہے اس کی اور بہت عمیق مشاہدہ ہے۔''

''نہیں بھائی جان! مجھے کہاں وقت ملتا ہے کچھ پڑھنے کا۔'' مہران شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''چچا جان تو بس ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی مل کا سوتر دنیا کا سب سے بہترین سوتر ہو۔'' ریحان نے جو خاموش بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا، مسکرا کر مہران شاہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

''ہاں میری اور نومی کی ایسی ہی خواہش ہے کہ پوری دنیا میں ہمارے سوتر کی مانگ ہو۔''

''کبھی فرصت ملے تو پڑھنا جواد احمد کے کالم کو۔ بہت بے باک اور نڈر ہے۔ سنا ہے ینگ ہی ہے۔'' ثوبان شاہ کی نظریں اخبار پر ہی تھیں۔

ثمینہ اور صفورا بور ہو کر اٹھ گئی تھیں۔ ثمرہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی تھی کہ شایان جو کچھ دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا واپس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

''یہ کہاں سے لیا ہے؟'' ثوبان شاہ کی نظریں اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل پر تھیں۔

''ہادی بھائی سے لیا ہے۔'' اس نے دلاور شاہ کے بیٹے کا نام لیا۔ اسے مختلف قسم کا اسلحہ جمع کرنے کا شوق تھا۔

''لائسنس ہے تمہارے پاس؟'' ثوبان شاہ نہیں چاہتے تھے کہ شایان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ ہو، وہ جذباتی، غصیلا اور تیکھے مزاج کا تھا۔

''ہادی بھائی بنوا دیں گے۔ کیسا ہے؟'' اس نے مہران شاہ کی طرف بڑھایا۔ ''میں یہ آپ کو دکھانے کے لیے لایا ہوں۔''

''اچھا ہے۔'' مہران شاہ نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ کراچی جانے سے پہلے انہیں بھی اس قسم کی گن رکھنے کا شوق تھا۔

''اس میں گولیاں ہیں بھائی۔'' امان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''گولیوں کے بغیر تو یہ محض لوہے کا ٹکڑا ہی ہے نا۔'' وہ مسکرایا۔

''پتا ہے چچا جان وہاں لاہور میں امان کے نانا جان کے پاس اسٹیفن سن کی بہت خوب صورت

گن تھی چھروں والی۔ وہ بتا رہے تھے کہ ینگ ایج میں انہیں شکار کا شوق تھا تو اپنے کسی دوست کے والد سے خریدی تھی اور پتا ہے وہ بتا رہے تھے ان کے ابا جان کے پاس تھری ناٹ تھری کی گن بھی تھی۔ جو کہیں ادھر ادھر اسٹور میں پڑی ہو گی۔ میں نے ہادی بھائی کو بتایا تو وہ تو تڑپ ہی اٹھے دونوں گنز دیکھنے کے لیے۔'' اس نے مہران شاہ کے ہاتھ سے اپنا ماؤزر لیا اور الٹ پلٹ کر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

''بڑی امی جب بھی آپ لاہور جائیں اور نانا جان کو وہ گن مل جائے تو لے آیئے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا وہ بی بی اماں سے کہیں گے ڈھونڈنے کے لیے۔'' بے دھیانی میں اس کے منہ سے نانا جان نکل گیا تھا کہ لاہور قیام کے دوران جہاں زیب بیگ کے کہنے پر وہ انہیں نانا جان ہی کہنے لگا۔

ثمرہ تڑپ اٹھی تھیں اور اختر بانو کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''لے آؤں گی۔ لیکن اسے تو رکھو نا، الجھن ہو رہی ہے مجھے۔''

''لیجیے رکھ دیتا ہوں۔'' اس نے ماؤزر ٹیبل پر رکھ دیا۔

لاہور سے واپس آنے کے بعد اس کا رویہ اختر بانو کے ساتھ بدل گیا تھا۔ وہ جو پہلے ان سے کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا اب باتیں کرنے لگا تھا۔

''ویسے بڑی امی! میں کئی دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارے گھر میں بھی شادی کے شادیانے بجنے چاہئیں۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کی شادی کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟''

''ہاں اب نومی اور ریحان کی شادی ہو جانی چاہیے۔'' مہران شاہ نے بھی تائید کی تو ریحان نے یک دم ہاتھ جوڑے۔

''مجھے تو ابھی معاف ہی رکھیں۔ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ہاں نومی بھائی کی شادی کا آئیڈیا اچھا ہے۔''

''ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ فریضہ اب ادا ہو جائے تو اچھا ہے۔'' ثوبان شاہ نے اخبار واپس رکھ دیا۔

''میرے ذہن میں سلطانہ کی بیٹی ہے۔ بی اے کر چکی ہے۔ سلطانہ کے سسرالی عزیزوں میں

سے رشتے آ رہے ہیں اس کے۔ سلطانہ نے پچھلے ہفتے بات کی تھی مجھ سے ان رشتوں کے متعلق لیکن میں نے کوئی بات نہیں کی ابھی نومی کے متعلق اگرچہ دل میں کافی عرصے سے خیال تھا کہ سلطانہ کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہاری مرضی ہو تو سلطانہ سے باقاعدہ رشتے کی بات کریں۔'' انہوں نے اختر بانو سے پوچھا۔

''میں...... میں کیا کہوں جو آپ کی مرضی......'' اختر بانو جیسے کسی خیال سے چونکی تھیں۔

''تم ماں ہو اختر بانو! تمہاری مرضی کے بغیر تو تمہارے بیٹے کا رشتہ طے نہیں کریں گے ہم۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔'' ثوبان شاہ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''نہیں......'' اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بھلا کیوں اعتراض ہو گا۔ آپ نومی سے پوچھ لیجیے گا۔''

''اور نومی بھائی کو میرے خیال میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا کہ وہ تو یوں بھی پھپھو اور ان کی فیملی سے بہت اٹیچڈ ہیں۔'' ریحان نومی کے دل کی بات جانتا تھا۔ اسے سلطانہ پھپھو کی بیٹی زارا پسند تھی۔

اختر بانو کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''پھر بھی نومی کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ اتنے عرصہ سے کراچی میں رہ رہا ہے۔ سلطانہ کے ہاں بھی کم ہی جانا ہوتا ہے۔ کیا پتا اپنی شادی کے متعلق اس کی کیا سوچ ہے۔ کیسی بیوی چاہتا ہے۔''

''یہاں سے واپس جا کر میں نومی سے بات کر لوں گا۔'' ثوبان شاہ کو اختر بانو کی بات صحیح لگی تھی۔

''تو بس پھر جلدی شادی کیجیے گا۔ خوب مزا آئے گا۔ آپ کے میکے سے بھی سب آئیں گے نا۔ ہم ساری رسمیں کریں گے تاکہ ان کو بھی ہماری رسموں کا پتا چلے۔ ہمارے ہاں کی شادی کی کچھ رسمیں مختلف ہیں۔''

شایان نے بات کرتے کرتے پھر ماؤزر اٹھا لیا تھا اور اسے مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یک دم ہی اس نے اس کا رخ امان کی طرف کیا۔

''اگر اس وقت میں اس کا ٹریگر دبا دوں تو......؟'' وہ شرارت سے امان کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا حماقت ہے شایان، رکھو اسے اب۔'' مہران جو اپنے فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے اٹھے تھے، انہوں نے اسے ڈپٹا اور نمبر ملنے پر بات کرتے ہوئے صحن کی طرف چلے گئے۔

''تو امان میرے بھائی۔ اگر میں تم سے کہوں کہ میں تم پر گولی چلانے والا ہوں تو تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی۔'' وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔

اختر بانو کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' امان نے کندھے اچکائے۔

ثوبان شاہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

''شانی! یہ کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''بے فکر رہیں بابا جان! میں کبھی امان کو مار نہیں سکتا۔'' اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ نیچے کر لیا۔ ''اگرچہ یہ سوتیلا بھائی ہے۔ ہماری تاریخ میں تو بادشاہوں نے اپنے سگے بھائیوں اور بیٹوں کو مروایا ہے۔''

اسے الٹا سیدھا ہانکنے کی عادت تھی لیکن ثوبان شاہ کو غصہ آ گیا تھا جس پر انہوں نے قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک خفگی بھری ناراض نظر اس پر ڈالی تھی۔ لیکن وہ بھی شایان شاہ تھا اسے کسی کی ناراضی اور خفگی کی کم ہی پروا ہوتی تھی۔

''ویسے بابا جان، آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔ مطالعہ بھی آپ کا بہت ہے تو یہ بتائیں کہ اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو مارنا ضروری کیوں تھا۔ اور بھی تو طریقے ہو سکتے تھے۔ ان سے جان چھڑانے کے۔ کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرتے کہ سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔''

''شایان! تم اپنے نانا جان سے کہو اس بار وہ تمہیں صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا کریں، کامیاب رہو گے۔'' ریحان نے ثوبان شاہ کی خفگی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''ضرور کھڑا ہو جاتا ریحان بھائی! لیکن ابھی تو دو سال کے لیے میں لاہور جا رہا ہوں پڑھنے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا ہے میں نے......''

''گڈ!'' ریحان نے خوشی کا اظہار کیا۔

''لیکن میں نے تمہیں منع کیا تھا شانی، کہ تمہیں لاہور میں ایڈمیشن نہیں لینا۔'' ثمرہ کا خیال تھا کہ اس کے منع کرنے سے اس نے ارادہ بدل لیا ہوگا۔

''لیکن کیوں؟'' وہ ثمرہ کی طرف مڑ گیا تھا۔

''بس میں نے کہہ دیا ہے نہیں تو بس نہیں۔'' ثمرہ کا انداز حتمی تھا۔''اگر تمہیں ایسا ہی ماسٹر کا شوق چرایا ہے تو کراچی سے کرلو۔ یا حیدر آباد سے ہی...... اتنی دور لاہور جانے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ میرے لاہور جانے سے اتنی خوف زدہ کیوں ہیں۔ کیا آپ کو ڈر ہے کہ بابا جان کی طرح مجھے بھی پنجاب کی کوئی کڑی (لڑکی) پسند آجائے گی۔''

سوچ سمجھ کے بولنے کی تو اسے عادت ہی نہیں تھی۔ جہاں ثوبان شاہ کا رنگ سرخ ہوا تھا وہاں اختر بانو کے چہرے کی رنگت بھی بدلی تھی۔ لیکن وہ ثمرہ کی طرف متوجہ تھا۔

ببیبیب ''لیکن بے فکر رہیں۔ شادی میں گل رعنا سے ہی کروں گا۔ میرے لیے گل رعنا سے زیادہ حسین اور کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔ چاہیں تو لاہور جانے سے پہلے نکاح کر دیں میرا۔''

ثوبان شاہ کی موجودگی سے بے پروا ہو کر وہ ثمرہ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اور ثوبان شاہ کو لگا تھا کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ شخصیت کی اٹھان میں ماحول بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے ثمرہ کو اسے حیدر آباد جانے کی اجازت دی تھی۔ ریحان، تومی، امان کوئی بھی اس کی طرح منہ پھٹ اور بے باک نہیں تھے۔

''فضول بولے جا رہے ہو تم۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' ثمرہ کو برا لگا تھا کہ اس کی شادی گل رعنا سے کرنے کا خیال ان کے اور ان کے میکے کے درمیان تھا۔ ابھی تک تو انہوں نے اپنا ارادہ ثوبان شاہ پر بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور یہ شانی کا بچہ......

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لاہور کے بجائے کراچی میں ہی پڑھو۔''

''اوہ اب سمجھا...... آپ کو بڑی امی کے میکے والوں کا خوف ہے کہ میں کہیں ادھر جا کر ان کی محبتوں کا اسیر نہ ہو جاؤں کیونکہ آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ سب بہت پیارے، محبت کرنے والے مخلص

لوگ ہیں۔'' وہ بھی ایک کائیاں تھا۔

''لیکن آپ بے فکر رہیں، میرا نانا جان مطلب امان کے نانا جان کے گھر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال تو ہاسٹل میں رہنے کا تھا لیکن بابا جان کہہ رہے ہیں کہ دو بیڈ کا اپنا اپارٹمنٹ لے لو۔ ایک ملازم یہاں سے ساتھ چلا جائے گا۔ اور مجھے بابا جان کی بات پسند آئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اپارٹمنٹ ٹھیک رہے گا یا ہاسٹل؟'' وہ آنکھوں میں شرارت کی چمک لیے تھوڑا سا ثمرہ کی طرف جھکا۔

غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں ثمرہ کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''بس شایان! بہت ہو گیا۔'' انہوں نے دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر تنبیہ کی۔

''تم لاہور نہیں جاؤ گے۔ اور اگر گئے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھنا۔''

شایان لمحہ بھر انہیں دیکھتا رہا پھر زور سے ہنس دیا۔

''میں اب بڑا ہو گیا ہوں ڈیئر مدر! اس طرح کی ایموشنل بلیک میلنگ نہیں چلے گی۔ میں بچہ تھا تب آپ کی اس طرح کی دھمکیوں سے ڈر جاتا تھا۔''

ثمرہ کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی بات منوانی ہوتی تو یوں ہی مر جانے کی دھمکی سے ڈراتی تھیں اسے اور وہ مان بھی جاتا تھا۔

اختر بانو ہاتھ گود میں رکھے، سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ امان نے دیکھا گود میں رکھے ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے دکھ ہوا۔ حویلی کی بڑی بہو اور حویلی کا سارا انتظام سنبھالنے والی، تین جوان بیٹوں کی اس کی ماں آج بھی سہمی سہمی سی تھی۔ اس نے تاسف سے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا جو اختر بانو کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے تھے۔

''ثمرہ! ختم کرو اس تماشے کو اب۔'' ثوبان شاہ کو لگا تھا کہ اب ان کا بولنا ضروری ہو گیا ہے۔

ثمرہ کے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ سب کی موجودگی میں انہیں بے حد سبکی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک دم اٹھیں۔

''تو ٹھیک ہے دیکھ لو تم بھی، اس بار صرف دھمکی نہیں دے رہی میں۔''

''اوں ہوں......'' بائیں ہاتھ سے شایان نے ثمرہ کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ''آپ جیتیں، میں ہارا۔ میں لاہور نہیں جاؤں گا لیکن ایک شرط پر...... میرے قبرستان جانے پر آپ کو اب اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے یک دم دایاں ہاتھ اونچا کر کے ماؤزر اپنی کنپٹی پر رکھا۔ اور مسکرایا۔ ''دادا جان کے دائیں طرف والی خالی جگہ میں بابا......''

''نہیں......'' اختر بانو کے لبوں سے چیخ کی طرح نکلا تھا۔ اور وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

''شا...... نی!'' ٹوٹ کر ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''نہیں......!''

اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ماؤزر لینے کے لیے ہاتھ اونچا کیا اور پھر لہرا کر گرنے لگی تھیں کہ شایان نے ماؤزر نیچے پھینک کر دونوں بازوؤں میں انہیں سنبھالا۔

ثوبان شاہ، امان شاہ اور ریحان جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

''بڑی امی...... بڑی امی! میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' وہ انہیں بازوؤں میں سنبھالے کہہ رہا تھا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ امان نے قریب آ کر انہیں شایان سے لے لیا۔ دبلی پتلی نازک سی اختر بانو کو بازوؤں میں سنبھالے وہ تیز تیز چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور وہاں موجود پلنگ پر لٹایا۔ اور بے چینی سے آواز دی۔

''اماں جان! اماں جان...... پلیز آنکھیں کھولیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔''

''ریحان بیٹا! اپنی ماں کو دیکھو۔'' ثوبان شاہ اور ریحان بھی اس کے ساتھ ہی برآمدے میں آئے تھے۔

''مانی حوصلہ!'' ریحان نے امان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ہٹا کر خود اختر بانو کی نبض چیک کرنے لگا جو بہت مدھم تھی۔

''بھاگی!'' ثوبان شاہ نے بلند آواز میں پکارا۔ ''بی پی چیک کرنے والا آلہ لے کے آؤ۔ صفورا بھابھی کے کمرے سے۔''

''ریلیکس بابا!'' ریحان نے مڑ کر دیکھا۔اس کا ہاتھ ابھی بھی ان کی کلائی پر تھا۔نبض بہت مدھم تھی۔امان اب ان کے ہاتھ مل رہا تھا اور اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

شایان اور ثمرہ صحن میں اکیلے رہ گئے تھے۔شایان کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر اس نے ثمرہ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ریحان بی پی چیک کر رہا تھا۔

''بہت لو ہے۔'' اس نے بی پی آپریٹس ایک طرف رکھا اور ثوبان شاہ کو بتایا۔

''پانی میں تھوڑا سا نمک اور لیموں ڈال کر لے آؤ'' ثوبان شاہ نے بھاگی سے کہا جو ابھی تک وہاں ہی کھڑی تشویش سے اختر بانو کو دیکھ رہی تھی۔

''اماں جان کا دل بہت کمزور ہے۔شاید وہ شانی کی اس اچانک حرکت کو برداشت نہیں کر سکیں۔شاید خوف زدہ ہو گئی تھیں۔''

امان اب ان کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا تھا اور ریحان چمچ سے انہیں پانی پلا رہا تھا۔وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولتی پھر بند کر لیتی تھیں۔

''میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تھا اختر......''

انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ثوبان شاہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا لیکن ثوبان شاہ کی طرف دیکھنے کے بجائے ان کی نظریں ان کے قریب کھڑے شایان پر پڑی تھیں۔جس کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔اور ایک اطمینان بھرا سانس لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو امان نے انہیں اٹھنے میں مدد دی تھی۔

''آپ کے ساتھ پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟'' ریحان پریشان سا انہیں دیکھ رہا تھا۔''کبھی دل بہت گھبرایا ہو،لگا ہو کہ ہارٹ بیٹ مس ہو رہی ہے۔''

''دل تو اکثر گھبرایا ہی رہتا ہے لیکن جب ہارٹ بیٹ مس ہوتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ایک لمحے سے بھی کم وقت کے لیے لگتا ہے کہ بس دل بند ہو گیا ہے۔''

وہ ہاتھوں کی پشت سے پسینے کے قطرے پونچھ رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے مانی بیٹے! اپنی اماں جان کو کمرے میں لے چلو۔یہاں یہ بے آرام سی ہیں۔''

ثوبان شاہ نے کہا تو امان نے سر ہلایا اور اختر بانو کے منع کرنے کے باوجود ایک بازو ان کے گرد حمائل کیے سہارا دیتا بیڈروم میں آ گیا۔ ثوبان شاہ اور ریحان اور شایان بھی ساتھ ہی کمرے میں آئے تھے۔ اور روم چیئرز پر بیٹھ گئے تھے جبکہ امان ان کے بیڈ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔ آپ سب پریشان نہ ہوں۔'' اختر بانو نادم سی تھیں کہ ان کی وجہ سے سب پریشان ہیں۔

''آپ نے پہلے کبھی کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھایا؟'' ریحان کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

''نہیں......'' اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی ایسی خاص تکلیف تو نہیں تھی کہ ڈاکٹر کو دکھاتی۔ بس یہ ہارٹ بیٹ کا ہی تھوڑا سا مسئلہ تھا۔ پندرہ سولہ دھڑکنوں کے بعد لگتا تھا جیسے ایک دھڑکن مس ہو گئی ہو۔ وہاں لاہور میں مہرین سے ذکر کیا تھا کہ دل بہت گھبراتا ہے تو اس نے کہا تھا کہ آپ کو کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہیے۔ آپ کی ہارٹ بیٹ ارریگولر ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ رخسانہ تائی کو بھی یہ پرابلم ہے لیکن پھر بھی آپ چیک کروالیں۔''

''آپ نے مجھ سے وہاں ذکر کیوں نہیں کیا۔ شاہ زیب کا جو ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں، ان کے ایک کزن پنجاب کارڈیالوجی میں ہیں۔ زین بھائی بتا رہے تھے مجھے ایک دن کہ ان کے دوست کے علاوہ اس کے خاندان میں سب ہی ڈاکٹر ہیں۔''

امان اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''زین نے کہا تھا کہ وہ مجھے لے چلے گا۔ لیکن بس شادی کی مصروفیت میں خیال ہی نہیں رہا۔ پھر شادیاں بھی تو ایک نہیں تین تھیں۔'' اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''خیر اب زین کی شادی پر جاؤں گی یا شاید مرتضیٰ کی شادی ہی پہلے ہو جائے تو پھر چیک کروا لوں گی۔ تم پریشان مت ہو بیٹا۔''

''کیوں کیا یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے کہ آپ ایک سال انتظار کریں گی۔''

ریحان کی کشادہ پیشانی پر شکن نمودار ہوئی اور پھر اس نے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔

''بابا! صبح میں اماں جان کو حیدر آباد لے کر جا رہا ہوں۔ وہاں میرے دوست کے فادر کا اپنا چھوٹا سا ہاسپٹل ہے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔ امریکہ سے ڈگری لے کر آئے ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تو کراچی لے جائیں گے۔''

ثوبان شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا اختر! کہ تمہیں کوئی تکلیف ہے۔''

اختر بانو نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

ثوبان شاہ دل ہی دل میں نادم سے ہو گئے۔ کتنے سال ہو گئے تھے کہ ان کے درمیان رسمی ہاں ہوں کے سوا کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ نادم سے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں ذرا زمان اور مہران کی طرف جا رہا ہوں۔ رات ڈیرے پر جانے سے پہلے آپس میں بھی کچھ طے کرنا ہے کہ ہمارا کیا جواب ہو۔ اور اختر اب آرام کرو۔ اٹھ کر کچن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھاگی اور تاج کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیسے اور کیا کرنا ہے۔''

وہ کمرے سے نکلے تو ریحان بھی ان کے پیچھے ہی گیا تھا۔

''بابا! آپ کو اماں جان کا خیال رکھنا چاہیے۔ کتنی کمزور ہو رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کا ایچ بی بھی بہت کم ہے۔ گو ہارٹ بیٹ کا مس ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی وین وغیرہ نہ بند ہو۔''

''اس نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں ریحان کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ اسے بتانا چاہیے تھا مجھے۔ اگر بتاتی تو کیا میں اسے کسی ڈاکٹر کی طرف نہ لے کر جاتا۔ اب مجھے خواب تو نہیں آنا تھا کہ اسے کچھ تکلیف ہے۔'' غیر ارادی طور پر ان کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

ریحان نے حیران ہو کر انہیں دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ بھلا میں کیوں تلخ ہوا۔ صحیح ہی تو کہہ رہا ہے ریحان مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہے کم گو اور اپنی تکلیف کا اظہار نہ کرنے والی۔

انہیں یاد آیا تھا کہ شادی کے چند ماہ بعد کی بات تھی اسے بخار تھا اور اس نے انہیں بتایا ہی نہیں۔ اور کچن میں ماسی تاج وغیرہ کو ہدایات دینے اور ان کی مدد کرنے چلی گئی۔ بلکہ ان کی فرمائش پر ایک دو ڈشز خود بھی بنائیں کہ اس روز انہوں نے کچھ دوستوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا لیکن جب وہ کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئیں تو وہ تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لے رہے تھے۔ مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا لال بھبو کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ پہلا خیال جو ان کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید دادی جان نے کچھ کہا ہے کہ دادی اور دادا جان اس شادی کے لیے دل سے رضامند نہ تھے۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کے قریب آئے تھے اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً ہی اٹھا لیا تھا۔

''اوہ میرے خدا! تمہیں تو بخار ہے۔''

''گلے میں تکلیف ہے۔ شاید گلے میں انفیکشن ہے، اسی لیے بخار ہو گیا ہے۔ جب کبھی گھر میں بھی کھٹی چیز کھاتی تھی تو ہو جاتا تھا۔''

''تو بتانا تھا نا یار! میں آج دوستوں کی دعوت نہ کرتا۔ بلکہ تم بتا دیتیں تو میں تم سے فرمائش نہ کرتا خود کچھ پکانے کی۔''

''میں نے سوچا تھا، آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔'' وہ سادگی سے کہہ رہی تھیں۔

''کیا مجھے الہام ہونا تھا؟'' وہ جھنجلائے تھے۔

''کیا اب الہام ہوا ہے؟'' وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے مسکراتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''تم بھی نا اختر......'' وہ بے اختیار ہنس پڑے تھے لیکن بخار چیک کیا تو وہ ایک سو تین تھا۔ وہ گھبرا کر فوراً ہی اسے ڈاکٹر کی طرف لے گئے تھے اور زمان سے کہہ گئے تھے کہ وہ ان کے دوستوں کا استقبال کر لے۔ وہ اختر کو ڈاکٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور اس روز کے بعد سے وہ خود ہی اس کا خیال رکھنے لگے تھے۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

انہوں نے ریحان سے کہنا چاہا کہ وہ آئندہ خیال رکھیں گے لیکن ریحان واپس جا رہا تھا۔ وہ

بھی لیونگ کی طرف چلے گئے جہاں مہران اور زمان موجود تھے۔ ریحان کمرے میں واپس آیا تو سب خاموش تھے۔ شایان بیڈ کے نزدیک کرسی پر بیٹھا تھا۔

''سوری بڑی امی! میری وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی۔'' اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

''سوری مت کرو بیٹا! میں بس ڈر گئی تھی کہ تمہیں کچھ ہو گیا تو ثمرہ آپا کیا کریں گی۔ وہ تو ایک پل تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔'' اس نے شایان کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں نے سب کو ہی پریشان کر دیا۔'' اس نے امان اور ریحان کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا تو امان مسکرایا۔

''کوئی بات نہیں یار! ویسے ہمیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تم اگر وہ حرکت نہ کرتے تو ہمیں کیسے پتا چلتا کہ ہماری اماں جان کا دل اتنا کمزور ہے اور وہ اسے کوئی روگ لگائے بیٹھی ہیں۔''

''ماؤں کے دل اپنی اولاد کے معاملے میں کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں کانٹا بھی چبھے تو ان کے دل پر قیامت گزر جاتی ہے۔''

''لیکن میں تو آپ کی اولاد نہیں ہوں بڑی امی۔'' بے اختیار ہی شایان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں بیٹا چاہے امان کی ماں ہو چاہے تمہاری۔'' اختر بانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھایا تو شایان چونکا۔

یہ ہاتھ جو ابھی اس کے ہاتھ پر رکھا تھا اس لمس میں کیا تھا؟

ممتا کی شفقت، محبت اور اخلاص......

وہ دل ہی دل میں اپنی کہی بات پر شرمندہ ہوا۔

صحیح ہی تو کہہ رہی تھیں وہ کہ ماں تو ماں ہوتی ہے بھلے وہ کسی کی بھی ہو۔ لیکن اگر امان اس طرح کی حرکت کرتا تو کیا ثمرہ کا ردعمل بھی ایسا ہی ہوتا جیسے اختر بانو کا تھا......

شاید نہیں......

شاید سب مائیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ثمرہ بھی مختلف ماں تھی۔

وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اختر بانو اسے گاہے گاہے نظر اٹھا کر دیکھ لیتی تھیں۔

''ایک بات کہوں بیٹا۔ مانو گے؟''

''جی بڑی امی! آپ کہیں۔''

''اپنی بات منوانے کے لیے پھر کبھی یہ طریقہ اختیار نہ کرنا۔ آپ اپنی بات پیار سے، لاڈ سے اور ضد کر کے بھی منوا سکتے ہو۔ ماں ہیں تمہاری، مان ہی جاتیں آخر......''

''بات منوانے کا یہ طریقہ مجھے انہوں نے ہی تو سکھایا ہے بڑی امی! بچپن سے یہ ہی تو کرتی آ رہی ہیں میرے ساتھ۔ یہ نہیں کرو گے تو مر جاؤں گی۔ وہ نہیں کرو گے تو چھت سے چھلانگ لگا دوں گی، پھر روتے رہنا ساری زندگی وغیرہ وغیرہ...... میں نے تو پہلی بار ان کا پڑھایا سبق دہرایا ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''یہ آپ مائیں بڑی بلیک میلر ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح بلیک میل کرتی تھیں۔ دھمکی دے کر اور آپ نے اس طرح عملی مظاہرہ کر کے کر لیا۔ بہر حال پرامس اب ایسا کبھی نہیں کروں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔ شایان ثوبان شاہ کا اپنی بڑی امی سے......''

وہ ذرا سا مسکرایا تو اختر بانو کی نظریں کتنی ہی دیر اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں شاہ زیب کی مسکراہٹ کی جھلک تھی۔ حالانکہ امان کی زیادہ مشابہت تھی۔ شاہ زیب سے...... لیکن وہ بھی کہیں نہ کہیں کچھ مشابہت رکھتا تھا شاہ زیب سے اور اس طرح اتنے غور اور دھیان سے پہلے کب اس نے شایان کو دیکھا تھا۔

''تھینک یو بیٹا!'' وہ ممنون ہوئی تھیں۔

''تھینک یو کا کیا مطلب ہے بڑی امی......'' اس نے مصنوعی ناراضی سے انہیں دیکھا۔ ''ماؤں کو تو حکم دینا چاہیے۔ یہ تھینک یو تو غیروں سے کہا جاتا ہے بڑی امی۔''

اختر بانو نے محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔

''ماں ہونے کا جو مان تم نے دیا ہے اس کے لیے اب شکریہ نہیں کہوں گی۔ اب جاؤ ثمرہ آپا تمہارے یہاں اتنی دیر ٹھہرنے سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ماں ہے نا۔ دل دہل گیا ہوگا۔ اور یہ آخر تم لاہور ہی کیوں جانا چاہتے ہو۔ ماں کا دل دکھا کر مت جانا۔ ان کی خوشی اور رضامندی سے ہی جانا۔''

''کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے البتہ کوشش کروں گا کہ امی جان مان جائیں۔ ویسے کیا آپ بھی چاہتی ہیں کہ میں لاہور نہ جاؤں۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''نہیں، میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی۔ میں تو خوش تھی کہ چلو دونوں بھائی اکٹھے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے بڑی امی! آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ ایک نظر تینوں پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ باہر برآمدے میں آ کر وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ سوچا اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر سو جائے۔ رات دیر سے سویا تھا اور صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی لیکن پھر وہ ثمرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ وہ غصے میں ہوں گی اور ایسا ہی تھا۔

''آ گئے ہو اپنی بڑی امی کی خدمت کر کے۔'' اسے دیکھتے ہی وہ بولیں۔

''میں نے بھلا کیا خدمت کرنی تھی ان کی۔ ان کے دو جوان بیٹے اور شوہر نامدار موجود تھے وہاں۔'' اس نے ثمرہ کے لہجے کو نظر انداز کیا۔ ''میں تو معذرت کرنے گیا تھا کہ میری وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہوئی۔''

''طبیعت خراب ہو گئی تھی یا ڈرامہ کیا تھا اس نے؟'' طنز کرتا ہوا تلخ لہجہ...... اس بار شایان نظر انداز نہ کر سکا۔

''آپ وضاحت کریں گی کہ انہیں ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور تمہیں یہ احساس دلانے کے لیے کہ اسے تمہاری بہت فکر ہے۔''

ثمرہ سٹپٹا گئی تھی۔

''اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی وہ سب کی توجہ میں ہوتی ہیں۔'' وہ سنجیدہ سا

کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ''اور وہ ایک فوری ردعمل تھا۔ اور وہ مجھ سے زیادہ آپ کے لیے پریشان ہو گئی تھیں۔ ماں تھیں تو ایک ماں کے احساسات کو سمجھتی تھیں۔''

ثمرہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اگر اس وقت اس نے اختر بانو کے خلاف کوئی بات کہ تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ لیکن وہ اختر بانو کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ وہ شایان کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لے۔ تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''غیر ہو کر اس نے میرا احساس کیا اور تم نے بیٹا ہو کر میرے متعلق نہیں سوچا۔ جھٹ کنپٹی پر پستول رکھ لیا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں نے اسی پستول سے دوسری گولی خود کو مار لینی تھی۔ میں تو سکتے میں تھی اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکی۔ وہ ماں نہیں تھی تمہاری اس لیے اس کے دل پر اس طرح اثر نہیں ہوا تھا۔ جس طرح میرے دل پر ہوا تھا اسی لیے وہ بھاگ کر تم تک پہنچی تھی۔ تمہارے بابا، بھائی جن کا تم سے خونی رشتہ تھا وہ سب تو میری طرح ہی سکتے میں تھے۔ جہاں تک بے ہوش ہونے کی بات ہے تو شاید دل کمزور ہو۔''

ثمرہ نے بہت ہوشیاری سے پتے کھیلے تھے۔

وہ بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

''سوری امی! لیکن آپ بھی تو خوامخواہ ضد کر رہی تھیں۔ آخر میرے وہاں پڑھنے سے آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو باہر پڑھنے بھیج دیتے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ایبٹ آباد اور مری بھیج دیتے ہیں۔ چچا جان کا بھی تو اکلوتا بیٹا ہے فاران اور اسے انہوں نے ایبٹ آباد بھیج رکھا ہے۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کو بھی بابا نے بھیجا تھا نا۔''

''ہاں لیکن میرا اتنا جگرا نہیں ہے اختر بانو کی طرح۔'' انجانے میں سچ ہی کہا تھا ثمرہ نے۔ ''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں شانی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہتے ہو، میرا دل گھبرایا رہتا ہے۔'' ثمرہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''آپ بھی بڑی امی کی طرح بہادر بنیں امی۔ نومی بھائی اور ریحان بھائی مہینوں بعد حویلی آتے

ہیں۔ اور اب ریحان بھائی جہاں تک میرا خیال ہے چھ سات سال کے لیے باہر چلے جائیں گے۔ مانی بھی تین ماہ تک لاہور چلا جائے گا لیکن بڑی امی نے مانی کو منع نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی محبت کا پتھر اس کے شوق کے راستے میں رکھ کر راہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتی ہیں۔ پرندوں کو ایک وقت پر اپنے گھونسلوں سے اڑان بھرنا ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح نئی منزلوں کی تلاش میں وقت آنے پر انسان بھی پرندوں کی طرح اپنے آشیانوں سے نکل جاتے ہیں۔'' وہ ہولے ہولے بولتا ہوا جوتے کی ٹو زمین پر مار رہا تھا۔

''میں اختر بانو کی طرح بہادر نہیں ہوں اور شاید اسے اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی مجھے ہے۔ اسے اللہ نے بن مانگے اولاد دی۔ میں نے منتیں مان مان کر اللہ سے رو رو کر تمہیں مانگا شایان......'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''یا شاید وہ ان ماؤں میں سے ہیں جو اپنی اولاد کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ ان کے بہتر مستقبل کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھ لیتی ہیں۔ اپنی خواہش، آرزوئیں پس پشت ڈال کر ان کی خواہش پوری کرتی ہیں۔ مائیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں امی، سب کو ہی اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ کوئی اظہار کر دیتی ہے کوئی نہیں کرتی۔ بڑی امی کہتی ہیں ماں تو ماں ہوتی ہے۔ چاہے وہ امان کی ماں ہو چاہے شایان کی۔''

وہ کھڑا ہو گیا۔ ثمرہ نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔

''چند دن لاہور میں اس کے ساتھ کیا رہ کر آ گیا ہے کہ اس کی باتوں کو اس طرح رٹا ہوا ہے جیسے قائد اعظم کے اقوال ہوں۔'' دل ہی دل میں کہتے ہوئے ثمرہ نے شایان کی طرف دیکھا۔

''اگر تم چاہتے ہو میں بھی تمہارے لیے قربانی دوں۔ اپنے دل پر تمہاری جدائی کا پتھر رکھ لوں تو ٹھیک ہے۔ تم اپنا شوق پورا کر لو۔'' آواز پھر بھرا گئی تھی۔

''تھینک یو امی......'' اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور وہ چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔

اسے یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے کبھی شایان نے اس کے ہاتھوں کو اس طرح محبت اور عقیدت

سے چوما ہو۔ اس کی آنکھیں جگ مگ جگ مگ کرنے لگی تھیں۔ خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی تھی۔ اس نے ثمرہ کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

''آپ دنیا کی ساری ماؤں سے اچھی ماں ہیں۔''

اور یہ بات بھی اس نے پہلی بار ہی کہی تھی تو کیا لاہور میں کوئی ایسی کشش ہے کہ اجازت ملنے پر وہ اتنا خوش ہو رہا ہے۔ ثمرہ نے صرف سوچا ہی نہیں، پوچھ بھی لیا۔

''آخر لاہور میں ایسا کیا ہے جو تم لاہور جانے کے لیے اتاؤلے ہو رہے ہو؟''

''لاہور میں کیا ہے......'' وہ مسکرایا اور آنکھوں کے سامنے زل شاہ زیب کا سراپا لہرایا تھا۔

گرین اور یلو کے امتزاج والا ڈریس پہنے گجروں سے سجی کلائیاں...... ہاتھوں میں گرین اور یلو چوڑیوں والی ٹوکری لیے سج سج سیڑھیوں سے اترتی زل شاہ زیب کا وہ روپ تو جیسے آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ اس وقت اگر صحن کا دروازہ کھول کر مرتضیٰ ارباب نہ آ جاتا تو وہ اس سے اس وقت کچھ اور بھی کہہ دیتا، شاید یہ کہ اس وقت کوئی اپسرا لگ رہی ہے۔ کسی دوسری دنیا سے آئی کوئی حسین شہزادی......

اچھا ہی تھا وہ آ گیا تھا ورنہ اس کے ایک ہی جملے پر اس کی آنکھوں کا وہ حیران سا...... ناگوار تاثر جنہیں باقی کے دنوں میں وہ زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

''لاہور بذات خود بہت بڑی کشش ہے سویٹ مام......''

''کیا کوئی لڑکی ہے وہاں؟ کوئی رانگ نمبر کا چکر تو نہیں ہے؟''

ثمرہ جانتی تھیں کہ وہ رانگ نمبر پر لڑکیوں سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہادی اور رضی وغیرہ بھی رانگ نمبر پر دوستیاں کرتے رہتے تھے۔ اور جب سب مل کر بیٹھتے تو ان بے وقوف لڑکیوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ ثمرہ نے کبھی منع نہیں کیا تھا۔

''ارے نہیں ڈیئر والدہ......'' وہ بے اختیار ہنس دیا۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کا بیٹا رانگ نمبر پر بات کرنے والی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو کر اس کی خاطر کہیں جائے گا۔ لڑکیاں آپ کے بیٹے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔''

لہجے میں خود بخود ایک غرور سا آ گیا تھا۔ اسے وہ کراچی سے آنے والی لڑکی یاد آ گئی تھی جسے رضی اور ہادی نے بمشکل واپس کراچی بھجوایا تھا۔

"میری زندگی میں تو بس ایک ہی لڑکی ہے جسے میری امی جان نے میرے لیے پسند کیا ہے۔ گل رعنا......"

ثمرہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"گل رعنا جیسی کوئی لڑکی ہے بھی نہیں......"

"شایان ثوبان شاہ جیسا بھی کوئی نہیں ہے۔" مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

ہاں واقعی شایان جیسا کوئی نہیں تھا۔ اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ کھڑا ہوا وہ سب سے حسین لگتا تھا۔ ثمرہ نے دل ہی دل میں نظر کی دعا پڑھ کر پھونکا اور وہ ایک بار پھر ثمرہ کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو نظر ریحان پر پڑی جو برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ آنکھیں موندے پشت پر سر ٹکائے، ٹانگیں پھیلائے وہ اسے کچھ پریشان سا لگا تھا۔

"کیا بڑی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" اسے خیال آیا اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ریحان کے پاس آ گیا۔

"ریحان بھائی! بڑی امی کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"ہاں......" وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ٹھیک ہیں، سو گئی تھیں۔ اس لیے باہر چلا آیا۔ اماں ان کے پاس ہی ہے۔"

"کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے؟ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"میرے خیال میں تو نہیں، لیکن صحیح تو ڈاکٹر ہی بتائے گا چیک اپ کے بعد، میں تو سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی ہمیں کچھ باتوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اگر وقت پر احساس ہو جائے تو شاید بہت سے دل ٹوٹنے سے بچ جائیں اور بہت سارے دلوں کو اس اذیت سے نہ گزرنا پڑے جس سے وہ گزرتے ہیں۔"

''ہاں یہ تو ہے ریحان بھائی! بہت ساری باتیں وقت گزرنے کے بعد اپنے معنی کھو دیتی ہیں۔''
شایان نے اس کی تائید کی۔
''میری زندگی میں بہت سے پچھتاوے ہوں گے لیکن یہ پچھتاوا شاید آخری سانس تک رہے گا کہ ہم یعنی میں نے اور نومی نے اماں جان کو دوری کا عذاب دیا۔ ایک ماں کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہوگا اپنے بچوں سے دور رہنا۔ تمہاری امی سے تمہارا کچھ عرصہ کے لیے لاہور جانا برداشت نہیں ہوا اور ہماری ماں کا جگرا دیکھو، سالوں سے ہماری جدائی کا زہر پی رہی ہیں لیکن کبھی شکوہ نہیں کیا۔ ہم مہینوں بعد حویلی آتے ہیں اور چند دن رہ کر چلے جاتے ہیں اور ان چند دنوں میں بھی صرف کھانے کی میز پر ان سے ملاقات ہوتی ہے۔
آج احساس ہوا ہے کہ ہمارے آنے پر ان کی جو آنکھیں نم ہوتی تھیں، ہمارے جانے تک وہ نم ہی کیوں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لمحہ ایسا جو آدمی کو جھنجھوڑ کر گہری نیند سے جگا دیتا ہے۔
آج کے دن وہ لمحہ دو بار مجھ پر وارد ہوا۔ ایک لمحہ وہ تھا جب وہ بے ہوش ہو کر گری تھیں۔ مجھے لگا تھا جیسے میری کائنات اجڑ گئی ہو۔ زندگی میرے لیے مر جائے گی، اگر میری ماں نہیں رہے گی۔ وہ ماں جسے کبھی میں نے دھیان سے دیکھا بھی نہیں تھا، جس کے پاس بیٹھ کر کبھی اپنے دل کی باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی ان کے دل کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ ماں جو بنا کہے حویلی کے بیرونی گیٹ تک رخصت کرنے آتی تھیں اور ان کے لب مسلسل ہلتے رہتے تھے، جو اپنی دعاؤں کے حصار میں ہمیں رخصت کرتی تھیں اور اللہ کے سپرد کرتی تھیں۔ ہمارا سفر بخیر و خوبی گزر جاتا تھا۔ اب اس ماں کی دعاؤں کا حصار ہمارے گرد نہیں ہوگا تو جانے کتنے حادثے راہوں میں ہمارے منتظر ہوں گے۔ مجھے تب لگا تھا وہ نہیں رہیں گی تو بابا جان اور بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی میں تنہا اور اکیلا ہو جاؤں گا۔''
وہ ہولے ہولے بول رہا تھا اور شایان بہت دھیان اور خاموشی سے اس کے ایک ایک لفظ کو سن رہا تھا۔
''اور دوسرا لمحہ جب مجھ پر وارد ہوا تو اس نے مجھے جو ادراک دیا، وہ ادراک میرے دل کو نوچتا

اور اذیت دیتا ہے۔ پہلے لمحے نے مجھے صرف اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں کتنا اکیلا ہو جاؤں گا۔ کون مجھے دعاؤں کے حصار میں رخصت کرے گا۔ مجھے تب صرف اپنی فکر تھی۔ اپنے نقصان کا احساس تھا لیکن دوسرے لمحے نے مجھ پر ندامتوں اور پچھتاووں کے پہاڑ گرا دیے۔

جب اماں جان تم سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ثمرہ آپا کیا کرتیں۔ تمہاری جدائی وہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے وہ تمہیں لاہور جانے سے منع کرتی ہیں۔ ایک ماں کے لیے اپنے بچوں کو خود سے جدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ تمہیں سمجھا رہی تھیں اور میں ندامتوں میں بھیگا جاتا تھا کہ یہ بھی تو ایک ماں ہی ہے جسے ہم نے اپنی دوری اور جدائی کا عذاب دیا ہے۔ مجھے ان کی پیشانی اور چہرے کی ایک ایک لکیر میں جدائیوں کی اذیت نظر آتی۔ وہ اذیت جو مجھے کبھی نظر نہیں آئی تھی، اب آ رہی تھی۔

ہم جب چھوٹے تھے تو زیادہ تر بڑی دادی جان اور چھوٹی دادی جان کے پاس رہتے تھے یا پھر سلطانہ پھپھو کے پاس...... شاید ہم پہلے پوتے تھے تو وہ ہم سے زیادہ پیار کرتی تھیں یا پھر پتا نہیں کیوں لیکن اب سوچتا ہوں وہ ہمیں اماں جان کے پاس جانے نہیں دیتی تھیں۔ خود میں ہی الجھائے رکھتی تھیں اور ہم نے بھی کبھی ان کے پاس جانے کی خواہش نہیں کی۔

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب چھٹیوں میں ہم گھر آتے تھے تو وہ حسرت سے ہمیں دیکھا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال رکھتی تھیں۔ ہمارے کھانے پینے کا، لباس کا، کھیلنے کا، پڑھائی کا، ہر چیز کا۔ ہمارے بتائے بغیر ہی وہ ہماری پسند ناپسند کے متعلق جانتی تھیں۔ انہیں پتا تھا ہمیں کھانے میں کیا پسند ہے، کیا ناپسند ہے۔ جب ہم گھر پر ہوتے تو ہماری پسند کے کھانے پکواتیں۔

اور ہم سب کچھ حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ اور کبھی نہیں سوچا کہ ہمارا بھی تو فرض ہے کچھ۔ وہ میرے اور نومی کے لیے ایسی ہی تھیں جیسے ثمینہ اور صفورا چچی اور ثمرہ امی۔ الگ سے کبھی کوئی خاص فیلنگ نہیں تھی ان کے لیے لیکن آج دل میں ان کے لیے جو فیلنگز پیدا ہوئی ہیں وہ بالکل مختلف اور الگ ہیں۔ انہوں نے ہمیں جنم دیا۔ ہمارے لیے تکلیف اٹھائی۔

وہ ہماری ماں ہیں۔ آج مجھے ان کی آنکھوں میں جو پیاس اور تشنگی نظر آئی اپنے لیے وہ اس سے

پہلے کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ ہم کبھی آتے جاتے ان کے اس طرح گلے نہیں لگے جیسے مانی لگتا ہے۔ ہم نے کبھی اس طرح ان کے ہاتھ نہیں چومے جیسے وہ چومتا ہے۔ آنکھوں سے لگاتا ہے۔ مانی صحیح کہتا ہے شایان! ہمیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے خاص طور پر مجھے کہ تمہاری وجہ سے مجھے اس رشتے سے آگاہی ہوئی، جسے ساری زندگی میں فار گرانٹڈ لیتا رہا۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"میری ماں ایک دکھی عورت ہے۔ یہ میں نے آج جانا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان دکھوں کو پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی جو ان کی آنکھوں میں رقم تھے۔ لیکن آج جب میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا اور وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز سی مجھے دیکھ رہی تھیں تو میں نے ان کی آنکھوں میں رقم دکھوں کی وہ بے شمار کہانیاں پڑھیں جو پہلے کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ میکے سے جدائی کا دکھ، اولاد کی دوری کا دکھ اور سب سے بڑھ کر بابا جان کی بے اعتنائی کا دکھ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں نہیں جانتا شانی! کہ بابا جان نے دوسری شادی کیوں کی۔ میری ماں میں کیا کمی تھی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عورت کے لیے اپنے مرد کو تقسیم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہماری ایک پروفیسر تھیں۔ دو بچے تھے، پڑھی لکھی تھیں خوب صورت تھیں۔ ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی تو انہیں نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ کئی ہفتوں کے بعد جب وہ کومے سے باہر نکلیں تو ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔

آج پہلی بار میں نے اپنی ماں کے متعلق سوچا کہ وہ بھی تو ایسے ہی تڑپتی ہوں گی کہ وہ بھی تو میڈم کی طرح بہترین شریک حیات تھیں۔ تب ہم بہت چھوٹے تھے جب بابا جان نے دوسری شادی کی لیکن بڑے ہونے کے بعد بھی کبھی ہم نے ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اپنے تسلی بھرے لفظوں سے ان کے دکھوں پر مرہم نہیں رکھا۔ کبھی اس قیمتی اور انمول رشتے کی قدر نہیں کی۔ تم ایسا نہ کرنا شانی! کبھی اپنی امی کو دکھ مت دینا۔ خواہش اور آرزوئیں تو پوری ہو ہی جاتی ہیں کبھی نہ کبھی لیکن یہ رشتے پھر نہیں ملتے۔"

"ریحان بھائی! جو گزر گیا وہ پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن ابھی بہت دیر تو نہیں ہوئی۔ آپ تلافی کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت ہے تلافی کرنے کا۔ کچھ لوگوں کے پاس تو تلافی کا وقت بھی نہیں ہوتا۔"

شایان، جو ہمیشہ ہی ریحان کو لا ابالی اور لاپروا سا لگتا تھا، اس وقت بڑا سیانا اور سمجھدار سا لگا تھا۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

"ٹھیک کہتے ہو یار! جو وقت گزر گیا وہ تو پلٹ نہیں سکتا لیکن وقت ہے اس میں تلافی تو کی جا سکتی ہے کچھ نہ کچھ......"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ذرا ڈیرے تک جانا ہے۔ چلو گے۔ نظام دین کو اس کے بھتیجے نے کچھ رقم بھجوائی ہے۔ وہ دینی ہے۔ وہ ہماری مل میں کام کرتا ہے۔ نظام دین چاچا کیا ابھی تک ڈیرے کا سارا کام سنبھالتا ہے؟ اب تو بوڑھا ہو گیا ہو گا۔"

"ہاں ڈیرے پر تو نظام دین چاچا کا ہی سکہ چلتا ہے۔" شایان مسکرایا۔ "بابا جان اور زمان چچا اسے جانے ہی نہیں دیتے۔ سارا دن بس بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا ہے اور دوسرے ملازموں پر حکم چلاتا ہے۔"

شایان کی نیند اڑ گئی تھی، وہ ریحان کے ساتھ ہی گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی ڈیرے کی طرف جا رہے تھے جب چراغ سائیں ڈیرے کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں سی بنی ہوئی تھیں۔ شاید میلے ہاتھوں سے وہ آنسو پونچھتا رہا تھا۔ بغل میں میلی سی کپڑے کی گڑیا تھی۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اس کی پرسوز آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھار (گھر) رہ گیاں......

دنیا دے سونڑیاں رباں اے توں کھیڈ بنائی......

کچھ وقفے کے بعد پھر اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔

لکھیاں نصیباں دیاں جھولی دے وچ پے گیاں

بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھار......

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا جان اس نیم پاگل شخص کو حویلی سے کیوں نہیں نکال دیتے۔ ہر وقت اپنی منحوس آواز میں ایک ہی گانا گاتا رہتا ہے۔''

شایان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

ریحان نے رک کر اسے دیکھا اور پھر چلنے لگا۔

''دکھی اور مسکین آدمی ہے یار! سال ہا سال سے اس کے خاندان کے لوگ ہی باڑے کا کام سنبھالتے آ رہے ہیں۔ جانور بھی جس طرح ان سے مانوس ہیں، دوسروں سے نہیں ہوتے۔''

''لیکن یہ پاگل شخص بھلا کیا خیال رکھتا ہوگا جانوروں کا، جسے اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ پچھلے دنوں نانا جان اور دلاور ماموں اپنی حویلی میں آئے ہوئے تھے۔ دلاور ماموں، زمان چچا سے ملنے ہمارے ڈیرے کی طرف آ رہے تھے کہ یہ نہ جانے کہاں سے نکل آیا اور انہیں پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے لگا۔ نظام دین چاچا نے آ کر پکڑا اور ڈیرے سے ہٹا لے گیا۔ دلاور ماموں تو بہت غصے میں تھے اور انہوں نے بابا جان سے شاید بات بھی کی تھی لیکن بابا جان نے ابھی تک اسے نکالا ہی نہیں۔''

شایان کو بلاوجہ ہی چراغ سائیں سے چڑ ہو گئی تھی۔

''بابا بہتر سمجھتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے یا کیا نہیں۔ بہر حال میں ان سے بات کروں گا کہ کسی ڈاکٹر سے چیک کروالیں۔ کہیں اس کی ذہنی حالت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی جو یہ مالکوں کو پتھر مارنے لگا ہے۔''

اب وہ ڈیرے پر پہنچ گیا تھا جیسا کہ شایان نے کہا تھا۔ نظام دین احاطے میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''اپنے ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔''

وہ ہمیشہ ریحان کو ڈاکٹر صاحب ہی کہتا تھا تب سے جب سے اس نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ریحان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آج تو بڑے ڈیرے پر بھی خوب رونقیں ہیں۔ صبح سے ہی صفائی وغیرہ ہو رہی تھی۔ ایک دو گاڑیاں کچھ دیر پہلے ادھر سے گزر کر گئی ہیں۔'' وہ بیٹھا نہیں تھا۔

''ہاں آج نانا جان نے سب کو بلا رکھا ہے۔ مہران چچا اور ریحان بھائی بھی اسی لیے آئے ہیں۔''
شایان کو ایک دم بے زاری سی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ریحان نظام دین کو رقم دے تو وہ واپس حویلی جائیں۔

''کرسیاں منگواؤں یا اندر چل کر بیٹھیں گے؟'' نظام دین نے پوچھا۔

''بیٹھیں گے نہیں نظام چاچا!'' ریحان نے احاطے میں بچھی چارپائیوں پر نظر دوڑائی۔ ''بیٹھنے کے لیے کرسیوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ چارپائیاں کس لیے ہیں؟'' اس نے روپے نظام دین کو پکڑائے اور بتایا کہ ان دنوں کام زیادہ ہے اس لیے وہ ابھی نہیں آسکا۔

نظام دین کی اپنی اولاد نہیں تھی، بھتیجے کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔

''سنا ہے ڈاکٹر صاحب! اس بار بیدار شاہ بھی الیکشن میں حصہ لیں گے۔'' نظام دین کی عادت تھی جب ریحان یا کوئی اور ڈیرے پر آتا تو آس پاس کی ساری خبریں بغیر پوچھے بتا دیتا تھا۔

''اور اگر ایسا ہوا مطلب وہ کھڑے ہوئے تو اپنے دلاور شاہ جی نہیں جیت سکیں گے۔ لوگ بہت پسند کرتے ہیں بیدار شاہ کو......''

''وقت آیا تو دیکھا جائے گا۔ آپ بے پر کی نہ اڑایا کریں۔'' شایان کو برا لگا تھا۔

''میں تو بس یوں ہی اندازہ بتا رہا تھا بیٹا! عوامی رائے بیدار شاہ کے حق میں ہے۔''

نظام دین ثوبان شاہ کا منہ چڑھا رہا تھا اور ان کے سامنے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا اور وہ بھی دھیان سے سنتے تھے۔

اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رات کو جب سب بڑے ڈیرے پر اکٹھے ہوئے تو سب کا یہ ہی خیال تھا کہ بیدار شاہ آس پاس کے علاقوں میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ڈیرے پر آنے والے معززین کی بھی یہ ہی رائے تھی کہ اس بار کسی اور کو کھڑا کیا جائے۔ کچھ نے تو زمان شاہ اور ثوبان شاہ کا نام بھی لیا

لیکن چونکہ دونوں نے ہی انکار کر دیا تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ تایا جان اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کے نام پارٹی کو دے دیں اور پارٹی جس کو بھی ٹکٹ دے دے۔اور سب لوگ پوری سپورٹ کریں گے اس کی۔

ریحان اور شایان جی بھر کر بور ہوئے تھے سو فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔دلاور شاہ اپنی حویلی میں تو موجود تھے لیکن ڈیرے پر نہیں آئے تھے۔شایان کا خیال تھا کہ وہ ان سے ملنے جائے گا لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ ریحان کے ساتھ ہی حویلی واپس آ گیا تھا کہ اسے نیند پوری کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ آج بھی اسے یہ موقع نہیں ملنے والا تھا۔بڑی حویلی اور ڈیرہ ان کے گھر سے دور نہیں تھا اس لیے وہ پیدل ہی حویلی آئے تھے۔اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ رکا۔

''بڑی امی کو لے کر آپ کب حیدر آباد جائیں گے؟''

''ناشتے کے بعد ہی نکلیں گے۔اپائنمنٹ تو لے لیا ہوگا میرے دوست نے۔'' ریحان بھی اختر بانو کے بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں ریحان بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں یار! اس کی ضرورت نہیں ہے۔میں اور مانی ہوں گے۔شاید بابا جان بھی چلیں ساتھ۔'' ریحان نے جواب دیا تھا اور اختر بانو کے کمرے کی طرف بڑھا۔

''تو میرا خیال ہے...... میں بڑی امی کو سلام کر لوں کہ میں تو اب لمبی تان کر سو جاؤں گا اور دس گیارہ سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔'' شایان بھی اس کے ہم قدم ہوا۔

ریحان نے ناب پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے ثمرہ کی آواز آئی۔

ثمرہ کی عادت تھی اونچی آواز میں بولنے کی۔

''تم کیا سمجھتی ہو اختر بانو! کہ اپنی نرم نرم اور میٹھی باتوں سے شانی کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لو گی۔وہاں لاہور میں جانے کیا کیا پٹیاں پڑھاتی رہی ہو اسے...... اس نے ایک بار شادی پر جانے کی بات کی تو فوراً تیار ہو گئیں۔اسے ساتھ لے کر جانے کو کیا سمجھتی ہو تم...... ہیں۔وہ میرا بیٹا ہے۔میں نے اسے پالا پوسا، بڑا کیا ہے۔راتوں کو اس کے لیے جاگی ہوں اور اب تم......''

''نہیں ثمرہ آپا......! میں بھلا کیوں اسے پٹیاں پڑھاؤں گی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اختر بانو کی آواز میں لرزش تھی۔

ناب گھماتے ہوئے ریحان نے شایان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''میں سب سمجھتی ہوں اختر بانو تمہارے چلتر، اگر آئندہ شانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تمہارا وہ حشر کروں گی کہ......''

شایان نے ریحان کا ہاتھ ناب سے ہٹا کر جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

دونوں ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ سامنے اختر بانو بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔ ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے، جبکہ ثمرہ کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

''چھوٹی امی بس!'' ریحان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ''یہ آپ میری اماں جان سے کس لہجے میں بات کر رہی ہیں؟''

ثمرہ کے آدھے لفظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر پہلے ریحان اور پھر شایان کی طرف دیکھا جو خونخوار نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

ریحان کی نظریں بھی ثمرہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جبکہ اختر بانو نے سہارے کے لیے ہاتھ ادھر ادھر مارے اور پھر لہرا کر گر گئی۔ گرتے ہوئے ان کا سر بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔

''اماں جان!'' ریحان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور زمین پر بیٹھتے ہوئے ان کا سر گود میں رکھا۔

دائیں آنکھ کے اوپر سے ماتھے کی کھال تھوڑی سی پھٹ گئی تھی جس سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ اختر بانو کے دوپٹے سے ہی ریحان نے ان کی پیشانی پونچھی اور کلائی پر ہاتھ رکھا۔ نبض رک رک کر چل رہی تھی۔

''شانی! امان سے کہو گاڑی نکالے۔'' وہ چیخا تھا۔

شایان بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔

ثمرہ حیران اور پریشان سی کھڑی تھیں۔ یہ بازی کیسے پلٹ گئی تھی۔ وہ تو آج تک ثوبان شاہ

سے شادی سے لے کر اب تک ہر بازی کامیابی سے کھیلتی آ رہی تھیں اور اب پتا نہیں شایان نے کیا اور کتنا سنا تھا،

کیا وہ جان گیا تھا کہ......

انہیں گاڑی احاطے میں داخل ہونے کا پتا کیوں نہیں چلا تھا اور ثوبان شاہ کہاں تھے۔

کیا انہوں نے بھی سنا ہوگا کچھ...... نہیں جانتی تھیں کہ وہ لوگ پیدل آئے تھے اور ثوبان شاہ ابھی ڈیرے پر ہی تھے۔ ان کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ سب کے چلے جانے کے بعد ہی اختر بانو سے بات کریں گی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیں گی تا کہ آئندہ وہ شایان سے دور رہے۔ لیکن پھر ان سے صبر نہ ہو سکا تھا اور امان کے کمرے سے نکلتے ہی وہ دل کی بھڑاس نکالنے آ گئی تھیں۔

''اماں جان! اماں جان! آنکھیں کھولیں۔'' ریحان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور ہاتھ نبض پر تھا تب ہی دروازے پر شایان نظر آیا۔

''امان گاڑی نکال رہا ہے۔''

اور دھان پان سی اختر بانو کو دونوں بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے ریحان تیزی سے باہر نکلا تھا۔ ثمرہ ایسے ہی کھڑی تھی۔ شایان نے ایک تیز نظر ان پر ڈالی اور ریحان کے پیچھے لپکا۔

امان کی مدد سے ریحان اختر بانو کو لے کر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک بازو اختر بانو کے گرد حمائل کیے ان کا سر سینے سے لگائے اور دوسرا ہاتھ ان کی کلائی پر رکھے وہ مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔

''اماں جان...... اماں جان! ایسا مت کریں۔''

شایان پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھا تو امان نے گاڑی گیٹ سے نکالی۔

''اماں جان کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے مانی۔ قریب ترین کوئی کلینک جہاں آکسیجن بھی ہو۔''

ریحان کی آنسوؤں میں بھیگی آواز نے شایان کو بھی تڑپا دیا۔

''انکل بیدار شاہ کے علاقے میں چلو مانی...... انہوں نے حال ہی میں چھوٹا سا ہاسپٹل بنوایا ہے۔ وہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں ہیں اور میل فی میل ڈاکٹر ہائر کیے ہیں انہوں نے۔''

"ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

امان جانتا تھا اکثر جاتا رہتا تھا ان کے علاقے میں۔

شایان پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا اور ریحان اختر بانو کی ڈوبتی نبض پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کیا تلافی کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ اور اختر بانو کی نبض لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اجنبی دوبارہ اپنے والدین کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا لیکن ماسٹر عبدالعزیز کے دل میں امید کی ایک جوت جلا گیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی ہم سفر کے خواب دیکھے تھے اور اس روز کے بعد بھی انہوں نے سینکڑوں بار دعا کی تھی۔

"یا اللہ! تو بہتر جانتا ہے کہ کیا کس کے لیے اچھا ہے اور کیا برا...... اگر وہ اجنبی میری زیب النساء کے لیے اچھا ہے تو اسے اس کا نصیب بنا دے۔"

جب جب انہوں نے زیب النساء کو خاموش بیٹھے کچھ سوچتے دیکھا تھا تب تب ان کے لبوں سے یہ ہی دعا نکلی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم، کبھی اس کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں، کبھی لبوں پر ایک پیاری سی مسکان آ کر ٹھہر جاتی اور کبھی یکدم آنکھوں کی چمک بجھ جاتی، مسکان پھیکی پڑ جاتی اور وہ بے چین سے ہو جاتے تھے۔

اور جب گلی میں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا نور بھری اور اسلم سے ہو جاتا اور ان کی اپنی طرف اٹھتی کینہ توز نظریں ان کے اندر خوف کی ایک لہر سی دوڑا دیتیں اور ان کی نظریں بے اختیار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔

"یا اللہ! میری بچی کا نصیب کسی نیک بندے سے جوڑنا۔"

ہر روز زیب النساء کو استانی جی کے گھر لے کر جاتے ہوئے راستے بھر سوچتے رہتے شاید آج

استانی جی بتائیں کہ ان کا مہمان اپنے والدین کو لا رہا ہے لیکن ہر روز امید کی شمعیں بجھ جاتیں۔ ہر روز وہ سوچتے کہ آج خود استانی جی سے پوچھیں گے کہ ان کے مہمان کی طرف سے کوئی خط، کوئی خبر آئی لیکن پھر ہمت نہ پڑتی اور انہیں سلام کر کے خاموشی سے اسکول چلے جاتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے اندر زہرا کی روح حلول کر گئی ہے۔

وہ بھی تو یوں ہی بے چین رہنے لگی تھی اپنے آخری دنوں میں زیب النساء کے رشتے کے لیے......

تو کیا ان کا وقت بھی پورا ہونے والا ہے؟

''اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو زیب النساء اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی عزیز، رشتہ دار بھی نہیں قریبی جو میرے بعد اس کی ذمہ داری اٹھالیں گے۔''

زیب النساء کی فکر انہیں اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ بی پی اکثر ہائی رہنے لگا تھا۔ بی پی کا مسئلہ تو انہیں پچھلے کئی ماہ سے تھا۔ بلکہ شاید زہرا کی وفات کے بعد سے ہی یہ مسئلہ شروع ہو گیا تھا۔ تاہم چند ماہ پہلے انہوں نے صادق آباد ڈاکٹر کو دکھایا تھا اور اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ بی پی کی گولی ہر روز باقاعدگی سے کھانی ہے۔ ناغہ بالکل نہیں کرنا لیکن اب یہ ان کی سستی تھی یا کوتاہی کہ اکثر گولی کھانا بھول جاتے اور اگر کبھی یاد بھی آجاتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ لو اب کیا ہر روز گولیاں پھانکتے رہو۔ کبھی سر میں درد محسوس ہوتا تو پھر لے لیتے تھے۔

اس روز چوہدری عبد المالک کے بچوں کو پڑھا کر اٹھے تو سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ انہیں ابھی استانی جی کے گھر سے زیب النساء کو لینے جانا تھا لیکن گلی میں چند قدم چلے ہی تھے کہ دل گھبرانے لگا۔ کبھی یک دم ڈوبنے لگتا اور کبھی یوں لگتا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔

''شاید بی پی ہائی ہو رہا ہے۔''

وہ استانی جی کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ کہ پہلے جا کر بی پی کی گولی کھا لوں۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو پھر جاؤں گا۔ یوں بھی سر درد کی وجہ سے وہ چوہدری عبد المالک کے گھر سے جلدی نکل آئے تھے۔

ماسی نور بھری کے گھر کے قریب پہنچے تو انہیں لگا جیسے ابھی گر جائیں گے۔ انہوں نے دیوار سے ٹیک لگائی کہ قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ یہ چند قدم پر تو ان کے گھر کا دروازہ تھا۔ ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لیے اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب باقاعدگی سے گولی کھائیں گے۔ انہیں زیب النساء کے لیے زندہ رہنا ہے۔

''یا اللہ! مجھے اتنی مہلت ضرور دینا کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں دے سکوں۔''

وہ سیدھے ہوئے اور اس سے پہلے کہ چند قدم چل کر اپنے گھر جاتے، ماسی نور بھری کے نیم وا دروازے سے اس کی آواز آئی تھی۔ ایک تو اس کی آواز تھی ہی بلند اور کچھ اسے عادت بھی تھی بلند آواز میں بات کرنے کی۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے۔ تمہارے چاچا نے کیا کہا ہے؟''

''کتنی دفعہ بتاؤں اماں! چاچا کہہ رہا تھا سال دو سال تک ریٹائر ہو جاؤں گا تو اس سے پہلے ہم اپنا گھر ٹھیک ٹھاک کر لیں۔ ظاہر ہے اسے واپس اپنے گاؤں آنا ہی ہے۔''

نور بھری کا دیور ریلوے کے محکمے میں ملازم تھا اور گاؤں جانے سے پہلے وہ اپنے گھر میں نور بھری اور اسلم کو چھوڑ گیا تھا اس کا گھر پکا تھا جبکہ نور بھری اور اسلم کا گھر کچا تھا۔

''جب تک میری نوکری ہے تم لوگ ادھر ہی رہ لو اور تھوڑے پیسے اکٹھے کر کے اپنے گھر کو پکا کروالو۔'' اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گھر بند نہیں ہو گا ورنہ بند گھر تو خود ہی ڈھے جاتے ہیں۔

''ہاں بھئی، اس کو اب کیا پتا کہ اپنا گھر تو اس کا نالائق بھتیجا بیچ باچ کر کھا گیا ہے۔'' نور بھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''تو اب تم بھی مجھے طعنے دو گی۔ میں نے کوئی عیاشی کی ہے۔ سب پیسہ تو مقدمے اور وکیلوں کی فیسوں میں کھپ گیا تھا۔'' اسلم جھلائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''کہا بھی تھا چاچا سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لے میرے لیے پھر گھر کی فکر نہیں رہے گی۔''

''ہاں وہ تو جیسے تمہیں اپنی پڑھی لکھی بیٹی کا رشتہ دے ہی دیتا۔ سب جانتا ہے تیرے کرتوت اور

وہ تیرے چاچا کی بیٹی اتنی نخریلی ہے تجھ سے ہی شادی کرے گی جیسے......"

ماسٹر عبدالعزیز نے ایک بار پھر دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔ دم جیسے سینے میں بار بار الجھتا تھا۔

"پر خیر تو گھر کی فکر نہ کر۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد نور بھری کی آواز سنائی دی تھی۔ "تیرے چاچے کے واپس آنے سے پہلے گھر خالی کر دیں گے۔"

"کیا؟" اسلم کی آواز قدرے بلند تھی۔ "کچھ مال چھپا کے رکھا ہوا ہے کیا؟ میں تو جب مانگتا ہوں چٹا جواب دے دیتی ہو کہ دھیلا تک نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"لو...... میرے پاس کہاں سے آیا مال...... یہ اپنے ماسٹر عبدالعزیز کا گھر ہے نا۔ آخر یہ ہمارا ہی ہونا ہے۔" نور بھری کی آواز میں مسرت کی چہچہاہٹ تھی۔

"کیا مطلب؟ ہمارا کیسے ہوا؟" اسلم کی آواز میں حیرت تھی۔

"تو اب مطلب بھی میں سمجھاؤں۔ تم نے دیکھا ہے نا ماسٹر کو، دو گھڑی کا مہمان لگتا ہے۔ جھل جھل کر تو چلتا ہے۔ بے چارہ، چار چھ ماہ سے زیادہ نہیں جینے والا۔ لکھ لو کہیں...... پھر زیبو بھی تمہاری اور گھر بھی تمہارا۔" وہ ہنسی تھی۔

"تیرا بھی جواب نہیں اماں! دور کی سوجھتی ہے تجھے۔"

اسلم کا قہقہہ ان کے دل پر کسی بھاری پتھر کی طرح لگا تھا اور انہیں لگا جیسے اب کے جو دل ڈوبا تو پھر ابھرے گا نہیں۔ بمشکل دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ چند قدم چل کر گھر کے دروازے تک آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے تالے میں چابی لگائی اور کتنی ہی دیر تک برآمدے میں پڑی چارپائی پر گرے گہرے گہرے سانس لیتے رہے۔ پھر اٹھ کر بی پی کی گولی کھائی۔ دو تین ہی گولیاں رہ گئی تھیں۔

"کل ہی نیاز کو شہر بھیج کر منگوا لوں گا۔ اب ناغہ نہیں کرنا۔" وہ دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے۔

پھر وہ اٹھے اور دودھ نعمت خانے سے نکالا اور اس میں پانی ملا کر "کچی" بنائی۔ ان کے ابا کہتے تھے اس سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں آم کھانے کے بعد یہ "کچی" ضرور پی جاتی تھی کہ بقول ان کے آم کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور "کچی" اس گرم تاثیر کو کم کر دیتی ہے۔

دودھ میں پانی اور چینی ملا کر جو شربت بنایا جاتا ہے دیہات میں اسے کچی کہتے ہیں۔

ایک گلاس پی کر وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔ واقعی کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ذرا مزید بہتر محسوس کیا تو زیب النساء کو لینے کے لیے استانی جی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ انہیں اب کیا کرنا چاہیے، یہ خیال انہیں پریشان کرتا رہا۔ نور بھری کی وہ زہریلی ہنسی اور اسلم کے قہقہے ان کے کانوں میں گونجتے رہے۔ استانی جی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

دروازہ استانی جی نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر زیب النساء کو آواز دی تھی۔

''زیب بیٹی! آجاؤ۔ تمہارے ابا لینے آگئے ہیں۔''

''آپا جی! مجھے آپ سے ایک بات عرض کرنی تھی، اگر اجازت ہو تو کچھ دیر بیٹھ کر بات کر لیں؟'' نگاہیں جھکائے انہوں نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں، آجائیں اندر۔''

استانی جی نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھے سر جھکائے دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دیتے رہے تھے۔ پھر سوچ کر بات شروع کی۔ پھر ماسی نور بھری کی باتیں سن کر دل اور پریشان ہو گیا۔

''آپا جی! آج میری طبیعت بہت خراب تھی۔'' انہوں نے استانی جی کو نور بھری اور اسلم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو بتائی تو بے ساختہ استانی جی کے لبوں سے نکلا۔

''بڑی ہی پلید عورت ہے یہ نور بھری۔ میں تو اسے ایسا نہیں سمجھتی تھی۔''

''انسانوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے آپا جی...... ساری زندگی زہرا اسے ماں کی طرح سمجھتی رہی۔ گھر میں کچھ اچھا پکتا تو ضرور بھیجتی اور یہ...... اس کی نیت تو دیکھیں آپا جی۔ گھر اور زیب النساء پر نظر لگا کر بیٹھی ہوئی ہے کہ کب میں مروں تو یہ قبضہ کر لے۔ میرے گھر پر بھی...... سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپا جی وہ آپ کا مہمان کیا پھر کبھی نہیں آیا؟ کہتا تھا نا کہ والدین کو لے کر آئے گا جلد ہی......''

بالآخر انہوں نے ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو کہنا چاہتے تھے۔

''آیا تھا ایک روز ملنے۔ دس بارہ دن پہلے...... کھڑے کھڑے ہی آ کر چلا گیا۔ بتا رہا تھا چند دنوں بعد بڑے بھائی کی شادی ہے۔ دعوت دینے آیا تھا مجھے۔ اب بھلا میں کہاں اتنا لمبا سفر کر سکتی ہوں۔ فاطمہ بھی بلاتی رہتی ہے لیکن میں منع کر دیتی ہوں کہ خود ہی آ جایا کرو۔ بہت اچھا بچہ ہے ماسٹر صاحب۔ کیا بتاؤں چند دن رہا ہے ادھر تو انسیت ہو گئی ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔ کہتا تھا کہ آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔''

''رشتے کی بات کی پھر کوئی؟'' استانی جی کی بات سن کر ماسٹر عبدالعزیز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''نہیں...... اب تو کوئی بات نہیں کی۔ وہی بات ہی کر کے گیا تھا اس روز جب آپ کی طرف آیا تھا کہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد ماں باپ کو لے کر آئے گا۔ اب تو کوئی بات نہیں کی اس نے۔ دوست کے ساتھ آیا تھا شادی کی دعوت دے کر چلا گیا۔''

استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کی بات سن کر کچھ حیران ہوئی تھیں کہ پہلے تو خود ہی کہا تھا کہ جب تک وہ اپنے والدین کو لے کر نہیں آئے گا بات آگے نہیں چل سکے گی۔

''کوئی پتا ٹھکانہ، فون نمبر ہے اس کا آپ کے پاس؟''

ماسٹر صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے، استانی جی نے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ لیکن آپ کیا سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟''

''زندگی بڑی بے اعتبار سی شے ہے آپا جی! ایک لمحے کا بھروسا نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کل مجھے کچھ ہو گیا تو میری زیب کا کیا ہوگا؟ ماسی نور بھری اور اسلم تو بھوکے گدھوں کی طرح میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں آپا جی......''

ان کی نظریں جھک گئیں۔

''کہ اگر اس کا کچھ اتا پتا مل جائے تو جا کر اس سے کہوں کہ مجھے اس کا رشتہ منظور ہے۔ بھلے اس کے ماں باپ راضی نہ بھی ہوئے تب بھی...... میں ڈر گیا ہوں ماسی نور بھری کی باتیں سن کر اور اپنی زندگی میں ہی اپنی زیب کو رخصت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لڑکا بہت بھلا اور اچھا لگا تھا مجھے۔ میری زیب کے جوڑ کا

ہے۔ میں نے اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی لڑکے کے خواب دیکھے ہیں آپا جی۔ میرا دل کہتا ہے میری زیب النساء بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ماسٹر جی لیکن مجھے تو کوئی اتا پتا نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس کا گھر لاہور میں ہے۔ ادھر رحیم یار خان میں اس کا کوئی دوست ہے۔ جس کے پاس آتا رہتا ہے۔ شاید اقبال کو پتا ہو۔ میں اقبال کو پیغام بھجواتی ہوں کہ میری بات سن جائے یا پھر میں خود ہی جاتی ہوں کل اس کی طرف......"

استانی جی کو ماسٹر عبدالعزیز کی پریشانی کا احساس تھا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپا جی لیکن اگر......

اگر اس کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکے تو آپ نے اقبال کے متعلق بھی بات کی تھی نا تو پھر اقبال سے ہی بات طے کر دیجیے گا۔ میری طرف سے اختیار ہے آپ کو۔ اچھا لڑکا ہے، نیک اور شریف ہے۔ بھلے میری زیب کے جوڑ کا نہیں ہے لیکن اسے خوش تو رکھے گا نا۔ میں جلد از جلد زیب النساء کی شادی کرنا چاہتا ہوں آپا جی۔ آپ اگر مہربانی کر کے کل صبح ہی چلی جائیں اقبال کی طرف تو میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو آپ ماسٹر جی۔ زیب النساء مجھے اپنی فاطمہ کی طرح ہی عزیز ہے۔"

استانی جی نے کچن کی طرف دیکھا۔

زیب النساء ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے باہر آ رہی تھی۔

ماسٹر عبدالعزیز کے اندر آتے ہی انہوں نے زیب النساء کو چائے بنانے بھیج دیا تھا۔

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 8

''میں آپ سے اتنا کہوں گی کچھ دن اور انتظار کر لیں۔ کیا خبر وہ اپنے والدین کو لے کر آ جائے۔ اب تک اس کے بھائی کی شادی تو ہو چکی ہو گی۔ لیکن اگر وہ نہیں آتا تو اقبال کے متعلق جتنا میں جانتی تھی، آپ کو بتا دیا تھا۔ باہر وہ کیا کرتا ہے، کیسا ہے، اس کے متعلق تو آپ کو خود ہی پتا کروانا پڑے گا۔''

''میں ماسٹر عبدالوحید سے کہوں گا ادھر ہی کے ہیں۔ اور اگر انہوں نے اچھی رپورٹ دی تو پھر میری طرف سے ہاں ہے۔''

ماسٹر عبدالعزیز کو لگا تھا جیسے دل پر کسی بھاری پتھر کا بوجھ آ پڑا ہو۔

''ابا! چائے!'' زیب النساء قریب آ چکی تھی اس نے چائے ان کی طرف بڑھائی۔

''آپ نے خوامخواہ تکلف کیا آپا جی! گھر جا کر چائے ہی پینی تھی۔'' انہوں نے چائے پکڑ لی تھی۔

''گھر میں بھی تو زیب بیٹی نے ہی چائے بنانی تھی، یہاں بھی اس نے ہی بنائی ہے۔''

استانی جی نے زیب النساء کے ہاتھ سے دوسرا کپ لے لیا۔ زیب النساء شام کو چائے نہیں پیتی تھی۔

''اچھا آپا جی! اب اجازت۔'' چائے پی کر خالی کپ انہوں نے سامنے پڑی چھوٹی سی لکڑی کی تپائی پر رکھا۔

''آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن اگر آپ کل ہی چلی جائیں تو......'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میں کل جاؤں گی اقبال کی طرف۔ ویسے بھی مجھے ایک دو روز تک جانا تو تھا ڈاکٹر کی طرف۔ فاطمہ ہر خط میں لکھتی ہے کہ جا کر ایک بار ڈاکٹر صاحب کو چیک کروا لیں۔ کیا خبر کوئی دوائی وغیرہ تبدیل کرنی ہو۔''

دو سال قبل انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا تب سے مسلسل دوائیاں استعمال کرتی تھیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔ میں صالحہ آپا کے پوتے کو ساتھ لے جاؤں گی۔ ناشتے کے بعد ہی گھر سے نکل جائیں گے۔ پرسوں تک واپس آجاؤں گی۔"

انہیں جب بھی شہر جانا ہوتا وہ صالحہ کے پوتے کو ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ جو ان کی پڑوسن تھیں۔

"بہت شکریہ آپا جی! میں دو تین روز کی چھٹی لے لوں گا۔ یوں بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔"

"کیا ہوا ہے آپ کو؟" زیب النساء نے خالی کپ اٹھائے تھے تا کہ دھو کر باورچی خانے میں رکھ دے لیکن اب پریشان سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹی، بس کچھ بی پی کی شکایت ہے۔ دو تین روز آرام کروں گا گھر میں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔ "اب جاؤ شاباش کپ رکھ آؤ تو گھر چلیں۔"

وہ الجھی ہوئی تھی۔

استانی جی اور ابا کی گفتگو سے وہ کچھ اخذ نہیں کر سکی تھی۔ ابا انہیں کیوں بھیج رہے تھے اقبال بھائی کی طرف۔ استانی جی نے اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں تک جائیں گی لیکن ابا اب انہیں کل ہی جانے کا کہہ رہے ہیں اور وہ پریشان بھی ہیں۔

باورچی خانہ دور ہونے کی وجہ سے وہ ماسٹر عبدالعزیز اور استانی جی کی پہلے ہونے والی گفتگو نہیں سن سکی تھی۔ لیکن گھر آ کر اس کی یہ الجھن کسی حد تک تو دور ہو گئی تھی لیکن ابا نے کھل کر بات نہیں کی تھی اس لیے وہ بہت پریشان تھی۔ مغرب کے بعد جب وہ کھانا لے کر ماسٹر عبدالعزیز کے کمرے میں آئی تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چند لقمے لے کر انہوں نے پلیٹ کھسکا دی۔

"بس زیب! بھوک نہیں ہے اور......"

"کیوں کیا سالن اچھا نہیں بنا؟"

"اچھا ہے۔ بس جی نہیں چاہ رہا۔ تم تو کھالو۔"

لیکن اس سے بھی کچھ نہیں کھایا گیا تھا۔

''ابا! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں آخر کیا ہوا ہے۔ کیا ماسی نور بھری نے کچھ کہا ہے؟''

اس نے خود ہی اندازہ لگایا تھا کہ ضرور ماسی نور بھری نے ہی کچھ کہا ہوگا۔

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے۔

''زیب النساء میری بچی! اگر میں تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کروں، کوئی ایسا فیصلہ جسے تمہارا دل قبول نہ کرے تو ایک مجبور باپ سمجھ کر معاف کر دینا۔'' انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

''ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اب بس چند دنوں کا مہمان ہوں۔ میں چلا گیا تو اس بھری دنیا میں تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ میں اپنی زندگی میں تمہیں اپنے گھر کا کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ رو پڑے تھے۔

''ابا! مت روئیں۔ کیوں رو رہے ہیں آپ۔ کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔ آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔

''میں کب تمہیں چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنی سانسوں پر یقین نہیں ہے۔ جانے کب کوئی سانس آخری سانس ہو۔ لیکن اس آخری سانس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تمہارے محرم کی حفاظت میں دے جاؤں۔

میں نے استانی جی سے کہا ہے کہ وہ اس کا پتا کروائیں۔ وہ مجھے تمہارے لیے اچھا لگا تھا۔ پڑھا لکھا، خوب صورت، مہذب اور خاندانی۔ میں نے ہر نماز میں اللہ سے دعا کی ہے کہ وہ اسے تمہارا نصیب بنا دے۔ لیکن یہ تو میرا رب ہی جانتا ہے کہ تمہارے نصیب میں اس نے کیا لکھا ہے لیکن......'' انہوں نے اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے پونچھا۔ ''اگر اس کا پتا نہ مل سکا زیب تو میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔''

''مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے ابا! بس آپ پریشان نہ ہوں۔''

اور انہوں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

ان کے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے۔

''آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے ابا۔ مت روئیں۔ ایسا نہ کریں۔'' ان سے الگ ہو کر اس نے اپنے دوپٹے سے ان کے آنسو صاف کیے۔

''یہ نہیں پوچھو گی میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ بے حد تھکے ہوئے اور نڈھال سے لگ رہے تھے۔

''کیا کروں گی پوچھ کر ابا؟ آپ نے میرے لیے بہتر ہی سوچا ہو گا۔''

''تمہیں پتا ہے استانی جی نے اقبال کا رشتہ بھی دیا تھا تمہارے لیے۔ لیکن تب میں نے منع کر دیا تھا لیکن اب میں نے استانی جی سے کہا ہے کہ اگر وہ نہیں آتا تو ایک ہفتے کے اندر اندر اقبال کو ہاں کہہ دیں میری طرف سے۔''

''جی ابا!''

اس نے سر جھکا لیا تھا کہ کہیں ابا اس کی آنکھوں میں وہ کرب نہ دیکھ لیں جو دل سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔

اسے یقین تھا وہ آئے گا لیکن ابا کو اپنی سانسوں پر یقین نہ تھا۔ ابا اس کی وجہ سے تکلیف میں تھے اس کی طرف سے مطمئن ہو جاتے تو شاید ان کی طبیعت بھی ٹھیک ہو جاتی اور وہ ابا کو سکون دینا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے دل سے اٹھنے والی آواز کو دبا دیا تھا۔

''جہاں تک میں جانتا ہوں اقبال اچھا لڑکا ہے۔ سمجھدار اور شریف۔'' وہ پتا نہیں اسے تسلی دے رہے تھے یا خود کو۔

''استانی جی بتا رہی تھیں کہ وہ کچھ روز پہلے ان سے ملنے آیا تھا۔'' ماسٹر عبدالعزیز کو اچانک خیال آیا تھا کیا پتا اس نے زیب النساء سے کوئی بات کی ہو۔ کچھ بتایا ہو اپنے متعلق۔

''جی ابا!'' زیب النساء نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا تھا۔ ''استانی جی نے بتایا تھا مجھے۔ میں اس روز استانی جی کے گھر نہیں گئی تھی۔ آپ کو اسکول سے چھٹی تھی تو جب گئی دوسرے دن تو استانی جی نے بتایا تھا اس کے آنے کا۔''

شاید ابا یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں اس سے ملی تھی یا نہیں۔ اس نے سوچا تھا کاش اس روز ابا کو چھٹی نہ ہوتی تو میں اسے دیکھ لیتی۔ آخری بار ہمیشہ کے لیے اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں مقید کر لیتی۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے اس کے تصور کو خوابوں میں سجائے۔ اس کے ساتھ کی آرزو کے پودے پر تو ابھی پھول کھلنے اور چٹکنے شروع ہی ہوئے تھے۔

''میں نے سوچا تھا تم ایف اے کر لو گی تو تمہیں کالج میں داخل کروا دوں گا۔ وہ اتنا پڑھا لکھا ہے تو تم بھی کچھ پڑھ لو۔ شہر میں رہ کر پڑھو گی تو کچھ شہری طور طریقے بھی سیکھ لو گی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ انتظار کر لے گا۔ دو سال تین سال جتنا بھی کرنا پڑا۔ تب تک اس کے بڑے بھائیوں کی شادیاں بھی ہو جائیں گی۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بھی جانتے تھے کہ وہ کس دکھ سے گزر رہی ہے۔

''لیکن میں ڈر گیا ہوں زیب، بہت خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ آج چوہدری صاحب کے گھر سے آتے ہوئے میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میرا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا اور لگتا تھا جیسے اگلا سانس نہ لے سکوں گا۔''

وہ اسے نور بھری اور اسلم کی گفتگو کے متعلق بتاتے بتاتے رک گئے تھے۔ کاش وہ اس وقت نور بھری اور اسلم کی بدنیتی کے متعلق سب کچھ بتا دیتے تو وہ ان کے بعد نور بھری کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد نہ سمجھتی۔

لیکن انہوں نے سوچا کہ چڑیا جیسے دل والی ان کی بیٹی خوف زدہ ہو جائے گی۔

''میں تمہیں بھیڑیوں کے اس جنگل میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا زیب النساء میری مجبوری کو سمجھنا بیٹی اور مجھے معاف کر دینا۔'' چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے اپنی بات پوری کی تھی۔

''ایسی باتیں نہ کریں ابا۔ آپ میرا اگلا بھی گھونٹ دیں تو میں یہ ہی سمجھوں گی کہ آپ نے میری بہتری کے لیے ایسا کیا ہے۔'' وہ برتن اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ بھی کچھ دیر لیٹ جائیں ابا۔ ابھی کچھ دیر تک عشاء کی اذان ہو جائے گی میں بھی اتنی دیر میں باورچی خانہ سمیٹ لوں۔ دو چار برتن ہیں دھونے والے، وہ بھی دھو لوں گی۔''

اندر آنسو ابل رہے تھے جنہیں روکتے روکتے وہ تھک گئی تھی۔ سو باورچی خانے میں آتے ہی وہ

رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔ برتن دھوتے باورچی خانہ سمیٹتے یہ آنسو خاموشی سے رخساروں کو بھگوتے جا رہے تھے۔

"کیا تھا اللہ میاں جی جو استانی جی کے گھر یہ شہزادہ نہ آتا اور اگر آیا بھی تھا تو میرے دل میں اس کا خیال پیدا نہ ہوتا۔ میں تو تیری رضا میں راضی اور خوش تھی۔ میں نے کبھی اپنی اوقات سے بڑھ کر خواہش نہیں کی۔ پھر یہ کیوں ساری فصیلیں ڈھا کر میرے دل پر قابض ہو گیا۔ جب اسے میرا نہیں ہونا تھا تو اس کا خیال کیوں میرے دل میں پیدا کیا اللہ جی۔"

وہ کام کرتے اور آنسو بہاتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے شکوہ بھی کرتی جاتی تھی۔ وہ کوئی بہت سمجھ دار نہ تھی۔ صرف اٹھارہ سال کی ہی تو تھی۔ خواب دیکھنے کی عمر میں وہ خواب ٹوٹنے کی اذیت سے گزر رہی تھی۔ وہ بکھر رہی تھی ٹوٹ رہی تھی اور خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے کام ختم کرنے کے بعد بھی باورچی خانے میں ہی بیٹھی رہی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے بھی اسے آواز نہیں دی تھی۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی روتی رہی اور ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں چنتی رہی۔ اتنے تھوڑے سے دنوں میں اس نے ڈھیروں خواب دیکھ ڈالے تھے۔

اسیر کرتی نظریں، چند لمحے، چند لفظ......

بس اتنا سا ہی تو اثاثہ تھا اور اس اتنے سے اثاثے پر اس نے محل کھڑے کر لیے تھے۔

جب رو رو کر تھک گئی تو خود ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دعا کی۔

"یا اللہ! مجھے یہ چند لفظ، چند لمحے اور یہ نظریں کبھی یاد نہ آئیں۔ میرے ابا نے میرے لیے جو بھی فیصلہ کیا مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ یا اللہ انہیں میری پریشانی سے نکال دے۔ میں جانتی ہوں میری وجہ سے وہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ یا اللہ! انہیں کچھ نہ ہو، میرا ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

نہ جانے کتنی دیر تک وہ دعا مانگتی رہی۔ یہاں تک کہ عشاء کی اذان ہو گئی۔ نماز پڑھ کر وہ کمرے میں گئی تو ماسٹر عبدالعزیز جاء نماز پر بیٹھے تھے اور ان کے آنسو ان کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ وہ ایک طرف خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

دعا مانگ کر انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کے لیے دودھ لے آؤں آپ نے دن کو کھانا بھی ٹھیک نہیں کھایا۔''

''نہیں، جی نہیں چاہ رہا۔'' وہ اٹھ کر جاء نماز تہ کرنے لگے تھے۔

''تم نے بھی تو تھوڑا سا ہی کھایا تھا۔ تم دودھ پی لو۔ ایسے خالی پیٹ نہیں سوتے۔''

''میں نے تو دن میں استانی جی کے گھر بھی کھا لیا تھا۔ اس وقت اتنی ہی بھوک تھی۔ آپ نے تو بس چکھا ہی ہے۔ آپ ایک پیالی دودھ پی لیں۔ میں لے آتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑی تو انہوں نے پھر منع کر دیا۔

''نہیں، مت لانا۔ ایک گھونٹ پینے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ بس سو جاؤں گا اب۔''

وہ جاء نماز میز پر رکھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ زیب النساء بھی اپنی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ جب سے نور بھری نے دھمکیاں دی تھیں، وہ رات کو ذرا سے کھٹکے سے بھی ڈر جاتی تھی۔ بلی چھت پر کودتی تو اسے لگتا جیسے کوئی چھت پر دبے قدموں چل رہا ہے تب ابا سے پوچھ کر وہ ان کے کمرے میں ہی سونے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ان کی طرف دیکھتی رہی جو لیٹ کر تسبیح پڑھ رہے تھے پھر وہ بھی لیٹ گئی اور چادر اوڑھ کر رخ دیوار کی طرف کر لیا۔

آج رات دونوں پر ہی بھاری تھی۔ زیب النساء کی آنکھیں بار بار بھیگ جاتیں اور وہ بار بار انہیں صاف کرتی۔ ماسٹر عبدالعزیز نے بھی تسبیح پڑھنے کے بعد دیوار کی طرف رخ کر لیا تھا۔ انہیں زہرا یاد آ رہی تھی، حامد کا خیال آ رہا تھا۔ انہوں نے کبھی اللہ سے حامد کے چلے جانے کا شکوہ نہیں کیا تھا، وہ اللہ کی رضا میں راضی رہنے والوں میں سے تھے۔ کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں کی تھی۔ زہرا کہتی بھی تو اسے سمجھاتے تھے۔

''تمہاری زیب النساء ہے نا ہماری بیٹی بھی اور بیٹا بھی۔ اگر کوئی اپنی چیز ہمیں دے کر ہم سے واپس لے لے تو ہم اس سے جھگڑا تو نہیں کر سکتے نا۔ حامد بھی تو اسی کا تھا۔ اس نے دیا تھا اور اس نے ہی لے لیا تو پھر ناراضی کیسی اور شکوہ کیا۔''

لیکن آج وہ اللہ سے شکوہ کر رہے تھے۔

"کیا تھا اللہ جی اگر حامد زندہ رہتا۔ وہ ہوتا تو آج نور بھری اور اسلم کو ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ مجھے بھی زیب النساء کی فکر نہ ہوتی۔ سکون سے مر جاتا۔ وہ ہوتا نا اپنی بہن کا محافظ تو میں اس کے دل کا خون نہ کرتا۔ کیا میں نہیں جانتا کہ میری زیب کی آنکھوں میں وہ اجنبی بس گیا ہے۔ بھلے اس نے ایک نظر ہی اسے دیکھا ہو لیکن جب سے اس کا رشتہ آیا تھا تب سے ہی زیب کی آنکھوں میں، آسمان کے سارے تاروں کی جگمگاہٹ اتر آئی تھی۔ لیکن آج میں نے ان آنکھوں میں تاروں کی روشنی کو ماند ہوتے دیکھا ہے۔ یا اللہ! اسے بھیج دے میری بچی کا نصیب بنا دے۔ تا کہ مجھے وہ فیصلہ نہ کرنا پڑے جو میری بیٹی کو تکلیف دے۔"

وہ نہ جانے یوں ہی لیٹے لیٹے کب تک دعائیں مانگتے رہے اور زیب النساء کے آنسو کب تک تکیہ بھگوتے رہے۔ صبح اٹھے تو دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے ستے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ خاموشی سے اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی اور ماسٹر عبدالعزیز برآمدے میں چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگا کر کوئی پرانا اخبار دیکھنے لگے تھے۔

انہیں آج اسکول نہیں جانا تھا اور اسے استانی جی کے گھر۔ چولہے پر ہانڈی چڑھا کر وہ کپڑے دھونے لگی جو وہ چھٹی والے دن دھوتی تھی۔ اپنے اور ماسٹر جی کے کپڑے دھونے کے بعد اس نے بستر کی چادریں بھی دھو ڈالیں۔

ماسٹر عبدالعزیز چارپائی پر نیم دراز اخبار گود میں رکھے، اسے کام کرتے دیکھتے رہے۔ آج نہ تو خود بخود اس کے لبوں پر مسکان آئی تھی نہ آنکھوں میں جگمگاہٹ اتری تھی لیکن کام کرتے ہوئے وہ معمول کی طرح ان سے باتیں بھی کرتی رہی۔

وہی پہلے جیسی باتیں...... زہرا کی، استانی جی کی...... فاطمہ کی۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی تھا لیکن جب بھی ماسٹر صاحب اس کی طرف دیکھتے ان کے اندر کن من

ہونے لگتی تھی اور زیب النساء کی نظر جب ان پر پڑتی وہ ڈر جاتی۔ چہرے کی رنگت ایسے ہو رہی تھی جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ کام چھوڑ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ مسکرا کر انہیں دیکھتی، تسلی دیتی۔

''ان شاء اللہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا ابا...... اللہ پر بھروسا رکھیں۔''

''اللہ پر ہی بھروسا ہے بیٹی۔'' ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

''استانی جی آ جائیں تو آپ نیاز چاچا کو لے کر رحیم یار خان چلے جائیں کسی اچھے ڈاکٹر کو چیک کروائیں۔'' اس کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں۔

''آپ کو پتا ہے نا ابا۔ میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ تو آپ کو میرے لیے اپنا خیال رکھنا ہے۔''

''ہاں میں جاؤں گا ڈاکٹر کے پاس۔ استانی جی آ جائیں تو کسی روز ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کر کے ایک چھٹی اور لے لوں گا۔''

وہ خود بھی سوچ رہے تھے کہ انہیں ایک بار ڈاکٹر کو چیک کروانا چاہیے۔ سال بھر پہلے ڈاکٹر نے بی پی کے لیے جو گولی لکھ کر دی تھی ہو سکتا ہے وہ اب اثر نہ کرتی ہو۔

اگلے دو دن بھی یہی روٹین رہی تھی۔ اس نے ماسٹر عبدالعزیز کے اسکول والے کپڑے استری کر کے رکھ دیے تھے۔ دھلے ہوئے کپڑے اور چادریں تہ کر کے الماری میں رکھ دی تھیں۔

استانی جی کے دوپٹے پر کروشیے کی لیس بنائی۔

باورچی خانے کی الماری میں سجے سارے برتن نکال کر دھوئے۔ پھر بھی جیسے وقت ٹھہرا ہوا سا لگتا تھا۔ وہ کام کرتی رہتی اور ماسٹر عبدالعزیز چارپائی پر لیٹے اسے دیکھتے رہتے تھے۔ من بھیگتا رہتا تھا۔

اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا، یہ ہی خواب تو دیکھا تھا انہوں نے......

کیا یہ خواب دیکھنا جرم تھا؟

کیا ہر باپ اپنی بیٹی کے لیے ایسے ہی خواب نہیں دیکھتا۔ جیسا انہوں نے دیکھا تھا۔ وہ کسی سچ مچ کے شہزادے کا تو انتظار نہیں کر رہے تھے۔

بس شہزادوں جیسا پڑھا لکھا مہذب......

شاید انہوں نے اپنی اوقات سے اونچا خواب دیکھ لیا تھا۔ زہرا کو رسولاں آپا کا بیٹا کتنا پسند تھا۔ خوش شکل، شریف، سرکاری نوکری۔ جب وہ اپنی سائیکل کی گھنٹی بجاتا ہوا ان کے گھر کے پاس سے گزرتا یا اسکول میں سرکاری ڈاک لے کر آتا تو انہیں پچھتاوا سا ہونے لگتا۔ کتنا اچھا ہوتا وہ زہرا کی بات مان لیتے۔ تو آج اسلم اور نور بھری کی جرأت نہ ہوتی زیب النساء کے متعلق بات کرنے کی۔ لیکن شاید اللہ ہی کو نہیں منظور تھا۔

''ابا! کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ فارغ ہو کر ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''کچھ نہیں، تیری اماں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ بڑی سمجھ دار تھی۔ صحیح کہتی تھی میں ہی جھلا سمجھ نہ سکا۔''

''کیا کہتی تھی اماں......؟'' ماں کے متعلق ابا کی ہر بات وہ بہت شوق اور دھیان سے سنتی تھی۔

''کیا بتاؤں زیب النساء پر جو کہتی تھی صحیح کہتی تھی۔ خیر میرے رب کو جو منظور ہو۔''

وہ یکدم شاکر ہو جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر بے چین ہو جاتے۔ دو دن انہوں نے ایسے ہی گزار دیے تھے۔ گھر سے بھی صرف دودھ لینے کے لیے باہر نکلے تھے اور فوراً ہی دودھ لے کر آ گئے تھے۔

استانی جی تیسرے دن واپس آئی تھیں۔ دل میں ایک امید سی تھی کہ شاید وہ کوئی اچھی خبر لے کر آئی ہوں۔ شاید اقبال نے انہیں اس کا پتا بتا دیا ہو۔ انہوں نے استانی جی کو تاکید کی تھی کہ اگر اقبال کے پاس اس کا کوئی فون نمبر ہو تو وہ لے آئیں، وہ خود شہر جا کر اسے فون کر لیں گے۔ اور اگر اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو پھر اقبال سے ہی......

لیکن استانی جی کی اقبال سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہفتہ دس دن کے لیے ملتان گیا ہوا ہے، کسی کام سے...... میں نے اس کی بھرجائی کو پیغام دے دیا ہے کہ جیسے ہی وہ ملتان سے آئے، اسے یہاں میرے پاس بھیج دینا، بہت ضروری کام ہے۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی ماسٹر جی، آپ پریشان نہ ہوں۔'' استانی جی نے انہیں پریشان دیکھ کر تسلی دی۔

''اللہ اپنی مصلحتیں خود ہی جانتا ہے آپا جی! جو اس کو منظور ہو۔ ہم انسان تو بس کوشش ہی کر سکتے ہیں۔'' وہ بہت دل گرفتہ سے تھے۔

''میں نے وہاں سے فاطمہ کو بھی فون کیا تھا۔ کہہ رہی تھی، اس کی ایک سہیلی ہے، اپنے بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہے۔ اس سے بات کرے گی۔ اپنے علاقے کی ہے۔ صادق آباد میں رہتے ہیں وہ لوگ......''

ماسٹر عبدالعزیز خاموش ہی رہے۔ آج صبح سے ہی ان کی طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیسے پورے جسم میں ہلکا سا درد محسوس ہوتا تھا۔

''ٹھیک ہے آپا جی۔ میں چوہدری صاحب کے بچوں کو پڑھانے جا رہا ہوں۔ دو دن سے نہیں گیا۔ واپسی پر زیب کو لیتا جاؤں گا۔ تین چھٹیاں لی تھیں اسکول سے۔ کل سے اسکول بھی جانا ہے تو اسکول جاتے ہوئے زیب کو چھوڑتا جایا کروں گا۔''

وہ استانی جی کے واپس آنے کا سن کر زیب النساء کو ساتھ ہی لے کر ملنے آ گئے تھے۔ استانی جی نے کسی بچے کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ واپس آ گئی ہیں۔

''اللہ سے اچھی امید رکھیں ماسٹر جی۔ اور فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ، اللہ ہماری زیب النساء کا نصیب اچھا کرے گا۔''

وہ اٹھے تو استانی جی نے ان کو فکر مند دیکھ کر پھر تسلی دی۔ وہ دو قدم چل کر پھر مڑے تھے۔

''آپا جی! اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میری زیب النساء آپ کے حوالے......''

''کیسی باتیں کرتے ہیں ماسٹر جی، ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا آپ کو اور آپ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کریں گے اور اسے اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہتا بستا دیکھیں گے۔''

''ان شاء اللہ!'' زیر لب کہتے ہوئے وہ استانی جی کے گھر سے نکل کر، چوہدری عبدالمالک کے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔

چوہدری عبدالمالک انہیں دیکھ کر حیران ہوئے۔

''ارے ماسٹر صاحب! میں تو آپ کی مزاج پرسی کے لیے آ رہا تھا۔ بچوں نے بتایا تھا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دن آرام کرتے۔''

"مجھے بچوں کی فکر تھی کہ ان کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں تو مشکل نہ ہو کچھ......" وہ بیٹھ گئے۔

"کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ بڑا بھائی آیا ہوا ہے ان کا۔ ساری تیاری کروادی تھی۔ آپ کی طبیعت مجھے اب بھی ٹھیک نہیں لگتی، آپ ان کی فکر نہ کریں اور ریسٹ کریں کچھ دن۔"

چوہدری عبدالمالک کو ان کے چہرے سے لگا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"ہاں کچھ بی پی کا مسئلہ ہے۔ سال بھر پہلے چیک کروایا تھا۔ ڈاکٹر نے ہر روز گولی لینے کو کہا تھا۔ بس میں نے سستی کی وجہ سے باقاعدگی سے دوا نہیں لی تو اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یک دم بے حد گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔"

انہوں نے پیشانی پر آئے پسینے کو ہاتھوں کی پشت سے پونچھا۔

"میرا خیال ہے آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کروانا چاہیے بلکہ ایسا کرتے ہیں، پرسوں میں شہر جا رہا ہوں آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہاں ڈاکٹر خان ہیں میرے اچھے دوست اور بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ ان سے مکمل چیک کروالیں اپنا۔" چوہدری عبدالمالک انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

"جی، میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایک دو روز تک شہر جا کر کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔" ماسٹر عبدالعزیز کو یک دم گھبراہٹ شروع ہو گئی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے، آپ پرسوں میرے ساتھ چلیں۔"

"بہت شکریہ چوہدری جی! آپ بچوں کو بلوادیں۔"

"نہیں، آج رہنے دیں، آپ گھر جا کر آرام کریں۔"

چوہدری عبدالمالک کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور یہ محض ان کی فرض شناسی ہے کہ وہ اس حالت میں بھی آ گئے ہیں۔

ماسٹر عبدالعزیز ایک بار پھر شکریہ ادا کر کے کھڑے ہوئے لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گئے۔ بائیں بازو میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی تھی شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے لیے لیکن پھر جیسے درد پورے جسم میں پھیل گیا تھا۔ پیشانی سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور وہ صوفے پر لڑھک گئے تھے۔ چوہدری عبد

الما لک نے ملازم کو آواز دی اور خود ان کی ٹانگیں اٹھا کر صوفے پر رکھیں۔ اور ملازم سے کہا کہ ”ڈرائیور سے کہو فوراً بڑی گاڑی نکالے، ماسٹر صاحب کو شہر لے کر جانا ہے۔ ہارٹ اٹیک لگتا ہے۔ منشی باہر احاطے میں ہوگا، وہ بھی میرے ساتھ جائے گا۔“

ملازم کے جانے کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ ”ابھی استانی جی کے گھر جاؤ اور انہیں ماسٹر صاحب کا بتاؤ کہ میں انہیں شہر لے کر جا رہا ہوں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب کی بیٹی بھی استانی جی کے گھر ہی ہوگی۔“

ان کے چاروں بچوں نے قرآن شریف استانی جی سے ہی پڑھا تھا۔

”آپ زیب النساء آپا کو بھی ساتھ ہی لے جائیں نا، وہ پیچھے سے روتی رہیں گی۔“

وہ استانی جی کے گھر جب پڑھنے جاتا تھا تو زیب النساء بھی وہاں ہوتی تھی۔ اور بڑی بہنوں کی طرح ہی لگتی بھی اسے اور کبھی کبھار استانی جی کے کہنے پر وہ ان کا سبق سن لیتی تھی۔

”ٹھیک ہے اگر اس نے کہا تو استانی جی اور زیب النساء کو دوسری گاڑی میں شہر بھجوا دینا۔ اشرف ڈرائیو کر لے گا۔“ انہوں نے اپنے ایک ملازم کا نام لیا جو بوقت ضرورت ڈرائیونگ بھی کر لیتا تھا۔

وہ ایسے ہی تھے ہمدرد اور مخلص......

”ہوا کیا ہے؟“ ان کے بیٹے نے جاتے جاتے پوچھا۔

”صحیح تو ڈاکٹر ہی بتائیں گے لیکن مجھے ہارٹ اٹیک لگتا ہے۔“

اور ان کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ ڈاکٹر نے ای سی جی وغیرہ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ ہارٹ اٹیک ہے۔ انہیں فوری طور پر ایڈمٹ کر کے ٹریٹمنٹ دی جا رہی تھی۔ چوہدری عبد الما لک کی وجہ سے خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی جب انہیں آئی سی یو میں منتقل کیا گیا تو چوہدری عبد الما لک زیب النساء اور استانی جی کے پاس آئے۔ زیب النساء جب سے آئی تھی، ایمرجنسی کے باہر استانی جی کے ساتھ بیٹھی مسلسل روتے ہوئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ چوہدری عبد الما لک کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔

''ابا!'' ہونٹ لرزنے لگے۔ آنسو پہلے سے زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔ چوہدری عبد المالک نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''حوصلہ کرو بیٹا! ماسٹر جی پہلے سے بہتر ہیں۔ خطرے سے نکل آئے ہیں لیکن ابھی آئی سی یو میں ہی رکھیں گے۔ سانس کا تھوڑا مسئلہ ہے۔ آکسیجن لگی ہوئی ہے۔ منشی کو میں یہاں ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جس ڈاکٹر کی آج رات آئی سی یو میں ڈیوٹی ہے، وہ بھی جاننے والا ہے۔ ہر طرح کا خیال رکھے گا۔ صبح سویرے ہم آجائیں گے۔ اب چلیں۔''

زیب النساء نے گھبرا کر استانی جی کی طرف دیکھا۔

''میں...... میں یہاں ہی رہوں گی ابا کے پاس۔''

''اکیلے تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ استانی جی کیسے رات بھر یہاں اس عمر میں بیٹھ سکیں گی۔''

انہوں نے سیاہ چادر کے ہالے میں چھپے اس کے چاند چہرے پر ایک نظر ڈالی تھی۔ ''ابھی تو وہ آئی سی یو میں ہیں۔ اگر کسی وقت انہیں وارڈ میں منتقل بھی کر دیا گیا وہاں مردانہ وارڈ میں تمہیں میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میری بیٹیوں جیسی ہو اور اس وقت میری ذمہ داری ہو۔ کل میں کوشش کروں گا کمرہ مل جائے۔ ابھی کوئی خالی نہیں ہے۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ استانی جی نے ان کی تائید کی لیکن واپس گاؤں جانے کے بجائے انہوں نے اپنی بہن کے گھر رات رہنے کا فیصلہ کیا۔

''یہاں قریب ہی میرے بھانجے رہتے ہیں۔ ہم رات ادھر چلے جاتے ہیں۔ صبح آجائیں گے ہاسپٹل۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہے۔ مجھے آنے میں دیر سویر ہو گئی تو گھبرایئے گا مت۔ منشی کو میں نے سب سمجھا دیا ہے۔ ابھی منشی آپ کے ساتھ ہی جائے گا، گھر دیکھ لے گا۔ کوئی ضرورت پڑی تو آپ کو بلا لے گا لیکن ان شاء اللہ خیر ہو گی۔'' چوہدری عبد المالک نے ایک بار پھر زیب النساء کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''گھبرانا نہیں بیٹی، اللہ نے چاہا تو ماسٹر صاحب صبح تک بھلے چنگے ہو جائیں گے۔''

''وہ چوہدری صاحب میں کچھ رقم ساتھ لے آئی تھی، منشی کو دے دیں دوائیوں وغیرہ کے لیے ضرورت ہوگی۔'' استانی جی نے ہینڈ بیگ کی زپ کھولی تو چوہدری عبدالمالک نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں استانی جی، ماسٹر جی کا مجھ پر بھی حق ہے۔''

''وہ میں ابا کو دیکھ لوں......''

زیب النساء نے آنسو بھری آنکھوں سے چوہدری عبدالمالک کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں بات کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب سے۔''

چوہدری عبدالمالک نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ آئی سی یو کے باہر ایک طرف پڑی کرسیوں میں سے ایک پر منشی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چوہدری عبدالمالک کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بات کرنے کے بعد وہ آئی سی یو میں چلے گئے تھے اور ڈاکٹر سے بات کر کے اسے آئی سی یو کے دروازے کے اندر پڑے جوتے پہن کر اندر آنے کو کہا۔ وہ کچھ دیر ان کے بیڈ کے پاس کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ رنگت ہلدی کی طرح ہو رہی تھی۔ زیادہ دیر وہ انہیں دیکھ نہ سکی اور باہر آ گئی۔

''اللہ سے دعا کرو بیٹا! وہ تمہاری دعا ضرور سنے گا۔'' استانی جی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

اور اس نے ساری رات جاگ کر نفل پڑھے تھے۔ جب تھک جاتی تو دعا مانگنے لگتی۔ اور وہ رب کریم اپنے بندوں کی دعا سنتا ہے۔ اس نے اس کی دعا بھی سن لی تھی۔ اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی دی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

''ابھی مکمل یقین دہانی سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کسی بھی وقت آکسیجن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

فجر کے وقت بھی دوبارہ آکسیجن لگانی پڑی تھی۔ اور چوہدری عبدالمالک کے کہنے پر انہیں وارڈ کے بجائے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہر آتے جاتے کی نظر زیب النساء پر پڑے اور اس کی نیت میں خرابی پیدا ہو۔ گاؤں میں لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے اور خیال رکھتے تھے لیکن نور بھری اور اس کے بیٹے نے برسوں کی ہمسائیگی کا بھی خیال نہیں کیا تھا تو یہاں وارڈ میں تو ہر

طرح کے لوگ آجا رہے تھے۔ انہیں استانی جی کا بھی خیال تھا کہ اپنی محبت اور مروت میں وہ آتو گئی تھیں لیکن یہاں ہاسپٹل میں دن رات رہنا آسان نہیں تھا ان کے لیے۔ اس لیے وہ صبح آتے ہوئے منشی کی بیوی کو بھی لے آئے تھے۔ وہ تھی تو ادھیڑ عمر کی لیکن چاق و چوبند تھی۔

''کینٹین سے کچھ لینا یا کوئی میڈیسن لینی ہو تو یہ صوباں کو تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اسے ہی بھیجنا، خود باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ منشی بھی شام تک آجائے گا۔ رات ادھر ہی رہے گا۔'' انہوں نے زیب النساء کو تاکید کی تھی۔

''اور استانی جی آپ میرے ساتھ چلیں گاؤں ہی جا رہا ہوں۔ اور زیب بیٹی کی فکر نہ کریں۔ ماسٹر صاحب کے لیے بھی ڈاکٹر نے اطمینان دلایا ہے۔''

''نہیں بیٹا! میں یہاں اپنے بھانجوں کے گھر ہی رہوں گی۔ خیر خبر لیتی رہوں گی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

استانی جی نے دعا دی اور سوچا شاید دنیا چوہدری عبد المالک جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے۔ ورنہ کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔

''ابا کو کتنے دن یہاں رکھیں گے؟'' چوہدری عبد المالک جانے لگے تو زیب النساء نے بے اختیار پوچھا۔

''میں ابھی ڈاکٹر صاحب سے مل کر ہی جاؤں گا اور تفصیل پوچھ لوں گا اور تمہیں بتا کر ہی جاؤں گا۔ ابھی وہ وارڈ کے وزٹ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اور اگر ڈاکٹر خان مجھے آج مل جاتے ہیں تو ان سے بھی ماسٹر جی کے متعلق ڈسکس کروں گا۔ ان شاء اللہ تمہارے ابا جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے باہر نکلے تو استانی جی بھی کھڑی ہو گئیں۔

''میں بھی چلتی ہوں زیب۔ ظہر کے بعد آؤں گی۔ اور تم دونوں کا کھانا بھی لے آؤں گی اور کسی چیز کی بھی ضرورت ہو تو لے آؤں گی۔''

''آپ اکیلی چلی جائیں گی؟'' زیب النساء نے پوچھا تو وہ مسکرائیں۔

''آدھی عمر تو اسی شہر میں گزری ہے اور پھر آپا کا گھر یہ دو قدم پر ہے۔''

وہ سر ہلا کر ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھنے لگی تھی جو دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ استانی جی اسے تسلی دے کر باہر نکلیں ابھی کوریڈور میں ہی تھیں کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

''استانی جی!'' انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ اور چند لمحوں کے لیے ساکت کھڑی رہ گئیں۔

''آپ یہاں......؟ خیریت ہے نا سب؟'' وہ ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

انہوں نے چونک کر اپنے سامنے کھڑے شہزادوں جیسی صورت والے کو دیکھا، جو چند دن ان کے ہاں مہمان رہا تھا اور انہیں بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہو گیا تھا اور پچھلے دو دنوں میں انہوں نے اس کے آنے کی ماسٹر عبدالعزیز کی طرح ہی دعا مانگی تھی۔

انہیں اقبال زیب النساء جیسی معصوم اور سادہ دل لڑکی کے لیے پسند نہ تھا۔ اس کی کچھ عادتیں انہیں پسند نہ تھیں جس کی تصدیق اس کی بھرجائی نے بھی کی تھی۔

''ہاں وہ ماسٹر صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ زیب النساء بیٹی کے ساتھ آئی ہوں۔ اور تم یہاں کیسے آئے ہو؟''

''میرے دوست کے والد یہاں ایڈمٹ ہیں۔ چھوٹی سی سرجری ہوئی ہے ان کی، ان کی عیادت کے لیے آیا تھا۔''

چار سال پر محیط دوستی میں وہ صرف دو بار آیا تھا۔ ایک بار اس کے بھائی کی شادی میں اور ایک بار سب دوستوں کے ساتھ چند ماہ پہلے شکار کے لیے۔ لیکن اب تو جیسے وہ یہاں آنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ پہلے بڑے بھائی کی شادی کی دعوت دینے کا بہانا تھا۔ استانی جی کی طرف اس خیال سے گیا تھا کہ وہ جو زبردستی دل کی مکین بن بیٹھی تھی اسے ایک نظر دیکھ لے گا۔ لیکن خیال ہی نہیں رہا تھا کہ چھٹی والے دن وہ استانی جی کے گھر نہیں آتی تھی۔ اور اب دوست نے فون پر اپنے والد کے متعلق بتایا تو وہ دوڑا چلا آیا تھا کہ اس بار تو وہ صرف ایک جھلک دیکھے گا نہیں بات بھی کرے گا۔ کچھ وعدے کرے گا۔ کچھ وعدے لے گا کہ دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ماسٹر جی اس کا انتظار نہ کر سکیں اور......

''ماسٹر صاحب ادھر کمرے میں ہیں۔'' استانی جی واپس مڑی تھیں۔ ''آ جاؤ بیٹا!''

اور جوں ہی اس نے استانی جی کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا، عین اسی وقت ماسٹر جی نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہیں ابا، مت اٹھیں۔''

بیڈ کے پاس اسٹول پر بیٹھی زیب النساء نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا لیکن وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''لیٹے رہیں ماسٹر صاحب!'' وہ تیزی سے بیڈ کے قریب آیا تھا اور ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

ماسٹر عبدالعزیز کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

کیا دعائیں یوں بھی قبول ہو جاتی ہیں؟

چوہدری عبدالمالک کے گھر ہوش کھونے سے پہلے ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا، یا اللہ! وہ میری بیٹی کے دل کی خوشی ہے، اسے اس کا نصیب بنا دے۔ اور پھر ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ زیب النساء اپنی حیرت چھپائے پیچھے ہٹ گئی تو وہ ان کا ہاتھ تھامے تھامے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ اچانک کیا ہو گیا آپ کو؟''

''زیب النساء کی فکر مجھے کھائے جاتی ہے۔''

انہوں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کے علاوہ کمرے میں زیب النساء اور استانی جی تھیں۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم اب بھی میری بیٹی سے شادی کے خواہش مند ہو۔ کیا تم نے گھر میں بات کی؟'' بغیر تمہید کے انہوں نے پوچھا۔

وہ کیا کہتا کہ وہ تو اس کے دل کی اولین خواہش ہے۔ وہ ابھی تک اس ایک نظر کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا جو پانی کا پیالہ پکڑتے ہوئے اس کی طرف اٹھی تھی۔

''میرے والدین دو دن قبل ہی حج کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ جیسے ہی ان کی واپسی ہوئی، لے

کر حاضر ہو جاؤں گا۔'' اس نے سر جھکا لیا تھا۔

ان کے جانے سے پہلے وہ اماں سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی چھوٹی بہن کی بے وقت موت کی وجہ سے پریشان تھیں، وہ اپنی بات کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اور تمہارے والدین کی واپسی تک زندگی مجھے دھوکا دے گئی تو......؟ میں مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں تھمانا چاہتا ہوں۔ کیا تم آج ہی میری بیٹی سے نکاح کر سکتے ہو؟'' وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''میرے بعد میری بیٹی اس بھری دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ نہ بھائی، نہ چاچا، نہ ماما...... کوئی محرم رشتہ نہیں ہے اس کا اس دنیا میں۔''

''جی!'' وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

بڑے بھائی اماں ابا کو چھوڑنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ انہیں بحری جہاز سے جانا تھا اور وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے ورنہ وہ اپنے بڑے بھائی کو تو بلا ہی لیتا نکاح کے لیے۔ دوستی بھی تھی۔ سوچ رہا تھا اماں ابا سے بات کرنے سے پہلے بھائی کو ہم راز بنائے گا لیکن وہ اپنی طرف، آس بھری نظروں سے دیکھتے ماسٹر صاحب کو مایوس نہیں کر سکتا تھا اور پھر یہ بھی تو تھا کہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ اس کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھما دیتے تو......

ماسٹر عبد العزیز نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ ان کا نکاح بھی تو زہرا سے اچانک ہوا تھا ایمرجنسی میں اور بہترین زندگی گزاری تھی انہوں نے۔ زیب النساء بھی بہترین زندگی گزارے گی، انہیں یقین تھا۔

چوہدری عبد المالک ڈاکٹر سے مل کر اندر آئے تو ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر حیران ہوئے جس کے ہاتھ میں اب بھی ماسٹر صاحب کا ہاتھ تھا۔ وہ السلام علیکم کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

شاید ماسٹر صاحب کا کوئی اسٹوڈنٹ ہوگا۔ سلام کا جواب دے کر انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔

”یہ استانی جی کا عزیز ہے۔ چند ماہ پہلے استانی جی اس کا رشتہ لائی تھیں، زیب النساء کے لیے۔ میں نے سوچنے کا وقت لیا تھا کہ دور بھیجنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں یہاں اپنے علاقے میں ہی زیب کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں رہا۔ اس لیے میں نے زیب النساء کے نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے سی ایس ایس کا امتحان دے رکھا ہے۔“

وہ اس کے متعلق تفصیل سے بتانے لگے۔

چوہدری عبدالمالک نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔ خود ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کے چاروں بیٹوں میں سے کوئی ایک سول سروس میں جائے۔

”چوہدری صاحب! آپ نے اتنے احسان کیے ہیں آج ایک اور احسان کر دیں۔ میری زیب النساء کے نکاح کا انتظام کر دیں۔ آج ہی یہاں ہاسپٹل میں۔“ ان کا سانس سینے میں الجھ رہا تھا۔

”ارے ماسٹر صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی احسان نہیں کیا میں نے آپ پر۔ آپ میرے بچوں کے استاد ہیں احسان مند تو میں ہوں آپ کا...... اور جہاں تک زیب النساء بیٹی کے نکاح کی بات ہے تو ان شاء اللہ گاؤں جا کر دھوم دھام سے نکاح کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے دو دن بعد ڈسچارج کر دیں گے۔“

انہیں وہ لڑکا اچھا لگا تھا۔ خاندانی شرافت و نجابت کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

”لیکن چوہدری صاحب! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا ہے۔ اس کا نکاح ہو جائے تو سکون سے مر جاؤں گا۔“

ملتجی نظریں، چوہدری عبدالمالک کی طرف اٹھیں اور انہوں نے بے چینی سے سینہ مسلا۔ دم گھٹ رہا تھا اور سانس الجھ رہی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں، میں بندوبست کرتا ہوں نکاح کا۔“

اور وہ ماسٹر عبدالعزیز کی رک رک کر آتی سانس کو دیکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ماسٹر عبدالعزیز نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے چوہدری عبدالمالک کی طرف دیکھا اور دو تشکر بھرے آنسو ان کی

آنکھوں سے نکل کر آنکھوں کے کونوں پر ٹھہر گئے تھے۔ کچھ کہنے کی کوشش میں ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ چوہدری عبدالمالک نے ان کا ہاتھ دبایا۔ تب ہی ایک نرس تیز تیز چلتی ہوئی اندر آئی۔ انہیں چیک کیا اور وہاں موجود آکسیجن سلینڈر بیڈ کے قریب کیا اور انہیں آکسیجن لگا دی۔ تب ہی وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا۔ ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا، اور تسلی دی۔

''ابھی کچھ دیر میں طبیعت بحال ہو جائے گی۔''

اور ان کی طبیعت کے بحال ہوتے ہی چوہدری عبدالمالک اور وہ دونوں ہی چلے گئے تھے۔ اور اسی رات ہاسپٹل کے اس کمرے میں زیب النساء کا نکاح ہو گیا تھا۔ اور ماسٹر عبدالعزیز کو یوں لگا تھا جیسے ان کے سینے پر رکھا بوجھ کم ہو گیا ہو اور وہ بھلے چنگے ہو گئے ہوں۔

☆......☆......☆

گرم شال اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے زل اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ابھی عصر ہونے میں کافی وقت تھا لیکن جنوری کے ان آخری دنوں میں دھوپ دیواروں پر سکڑی سمٹی پر سمیٹے جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ یہ ہی دھوپ گرمیوں میں مغرب تک صحن میں اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔

زل آج یونی سے کچھ جلدی آ گئی تھی۔ موسم بھی سرد تھا، کھانا کھا کر جو کمبل میں گھسی تو آنکھ لگ گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آنکھ کھلی تھی۔ کمرہ ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا تو وہ دھوپ کی تلاش میں باہر آ گئی لیکن دھوپ تو بس غائب ہونے ہی والی تھی۔

وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن کی دیوار کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دھوپ اس کے سر اور چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر اوپر ٹیرس کی طرف دیکھا۔ ٹیرس خالی پڑا تھا۔ ہر طرف خاموشیوں کا راج تھا۔ بی بی اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ سونے سے پہلے انہوں نے اسے بتایا تھا۔ پتا نہیں وہ واپس آئی ہیں یا نہیں۔ اس نے کچن اور پھر ان کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ اوپر بھی کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ شاید سب ہی اس سردی میں اپنے کمروں میں گھسے ہوئے تھے۔ سحرش بھی اب ہر وقت ٹیرس سے جھانکتی نظر نہ آتی تھی۔

جب سے مرتضیٰ نے مہرین سے شادی سے انکار کیا تھا اوپر ماحول میں بہت تناؤ تھا۔ سحرش اور مہرین اپنی پڑھائی میں مصروف رہتیں۔

مونا اور رخسانہ تائی دونوں ہی خاموش اور چپ چپ تھیں۔ حالانکہ اورنگ زیب تایا نے کہہ دیا تھا کہ اگر مرتضیٰ مہرین سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو اس پر دباؤ مت ڈالا جائے۔ وہ زبردستی کے رشتے کے قائل نہیں ہیں۔ مہرین کے لیے رشتوں کی کمی نہیں لیکن مہرین کے دل کا کیا جو بچپن سے ہی مرتضیٰ کا نام اپنے نام کے ساتھ سنتی آئی تھی۔ لیکن بظاہر اس نے خود کو کتابوں میں گم کر دیا تھا۔

ایک سحرش تھی جو اس کے دل کا حال جانتی تھی اور دکھی ہوتی رہتی۔ کتاب سامنے رکھے وہ ترکیبیں سوچتی رہتی تھی کہ ایسا کیا کرے جو مرتضیٰ کا دل مہرین کی طرف پھیر دے۔

زل ان سارے گزرے دنوں میں تین چار بار ہی اوپر گئی تھی اور کچھ دیر بیٹھ کر آ گئی تھی، نہ تو مونا تائی کو اس سے کوئی کام پڑا تھا نہ رخسانہ تائی کو کسی مشورے کی ضرورت پڑی تھی۔ ماہ وش البتہ اس کے اوپر جانے پر کچھ دیر اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ان دنوں اسے کوکنگ کا شوق چڑھا تھا تو اس سے مختلف کھانوں کی تراکیب پوچھتی رہتی تھی۔

کل شام بھی اس نے پسندے بنانے تھے تو اسے بلایا تھا۔ وہ کچن سے ہی واپس آ گئی تھی۔ ماہ وش سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ مرتضیٰ کراچی گیا ہوا ہے اپنی چھوٹی خالہ کے گھر۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں ہی تھے۔ سحرش نے بھی باہر جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ماہ وش کی مدد کر کے نیچے آ گئی تھی۔ عجیب بوریت بھرے دن تھے۔ آزین اپنی جاب پر چلا جاتا تھا اور عموماً اس کے یونی ورسٹی سے آنے کے بعد ہی آتا تھا۔ بے حد چپ چپ اور خاموش سا کسی سوچ میں گم...... بہت کم بات کرتا تھا۔

رات کو کھانا وہ دادا جان کے ساتھ ہی کھاتا تھا لیکن ان سے بھی اس کی بہت کم بات ہوتی تھی۔ دھوپ اب اس کے سر پر سے بھی غائب ہو گئی تھی۔ فضا میں یکدم خنکی بڑھ گئی تھی۔ شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو اپنے سویٹر کی جیبوں میں ڈالا اور سوچا پہلے ابا کو دیکھ لے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ پھر دادا جان کی طرف چلی جائے۔ آزین کے آنے تک ان سے ہی

باتیں کر کے وقت گزارے۔ تب ہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر بی اماں اندر داخل ہوئیں۔ صحن میں اسے کھڑے دیکھ کر بے اختیار پوچھا۔

''یہ تم سردی میں باہر کیوں کھڑی ہو؟''

''تھوڑی سی دھوپ تھی، وہ ہی سینک رہی تھی۔''

وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی برامدے میں آئی تو بی اماں بھی برآمدے کے تخت پر سانس لینے کو بیٹھ چکی تھیں۔

''بڑی دیر لگا دی آپ نے۔ میں سمجھ رہی تھی آپ اپنے کمرے میں ہیں۔''

''سلمیٰ کے پاس سے اٹھی تو راستے میں رقیہ مل گئی۔'' انہوں نے اپنی پڑوسن کا نام لیا۔'' رقیہ اپنے ساتھ ہی گھر لے گئی تو بس پھر باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ بتا رہی تھی کہ عمر کراچی سے آ گیا ہے اور آج کل اپنے آزین کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔ زین نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا کہ عمر بھی اسی کمپنی میں کام کر رہا ہے۔''

''وہ کب ہم سے اب کوئی بات کرتا ہے بی بی اماں......''

وہ کبھی کسی کا گلہ شکوہ نہیں کرتی تھی لیکن آزین کسی نہیں تھا، اسے آزین کا رویہ ڈسٹرب کر رہا تھا۔ پہلے بھی وہ کوئی بہت باتونی نہیں تھا لیکن وہ ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی باتیں شیئر کرتے تھے لیکن ان تین چار ماہ میں وہ جیسے اس سے دور ہو گیا تھا۔

''اللہ جانے اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ باپ نے جاتے جاتے کچھ کہہ دیا یا سوتیلی ماں کی کوئی بات بری لگ گئی کہ منہ سیئے بیٹھا ہے۔''

''تین شادیاں اکٹھی ہوئیں، لگتا ہے نظر ہی لگ گئی ہے کسی کی، اوپر ایسی خاموشی جیسے ایک نہیں تینوں لڑکیاں رخصت کر دیں۔ وہ جاسوس بیگم بھی اب ہر وقت اوپر تنگی نظر نہیں آتیں۔''

بی بی اماں بے شک اوپر والوں سے نالاں رہتی تھیں لیکن یہ خاموشی انہیں بھی کھل رہی تھی۔

''چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں بی بی اماں، سب اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئے ہیں۔ سردی ہے تو

آتے ہی سب اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے ہیں۔ زین بھی تھک جاتا ہے شاید۔ کیا خبر کتنی ٹف جاب ہے۔ بتایا ہی نہیں کبھی اس نے۔ ظفر چاچو یا آنٹی نے بھلا کیا کہنا تھا اسے۔'' وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''لو، اتنی سردی میں یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو۔ میں تو بس ذرا سانس لینے کو بیٹھ گئی تھی۔ پوری اٹھارہ سیڑھیاں چڑھ کر رقیہ کے گھر گئی اور آئی ہوں اتر کر۔''

رقیہ نے گھر کا گراؤنڈ فلور کرائے پر چڑھا رکھا تھا۔

''اندر کمرے ٹھنڈے یخ ہو رہے ہیں۔ بی بی اماں! یہاں دن میں دھوپ تھی تو اندر کی نسبت کچھ گرمائش ہے۔''

زمل کو اپنا کمرہ باہر کی نسبت زیادہ ٹھنڈا لگا تھا۔

''ادھر تو دھڑا دھڑ ہیٹر چل رہے تھے سلمٰی اور اس کی دیورانی کی طرف جیسے گیس مفت میں آتی ہو۔ جس بے دردی سے اس کا استعمال کر رہے ہیں لوگ، سالوں میں ختم ہو جائے گی۔''

زکی دروازے میں جس روز گیس کے پائپ لگے تھے سب سے زیادہ خوشی بی بی اماں کو ہوئی تھی۔

''اتنی جلدی ختم نہیں ہو گی گیس بی بی اماں، کہتے ہیں سو سال تک کا ذخیرہ ہے۔'' زمل نے اخبار میں پڑھا تھا ایک بار۔

''سو سال کا ذخیرہ ہو یا ہزار سال کا۔ سلیقے، قرینے سے استعمال کریں گے تو جلدی ختم نہ ہو گی، یہاں تو کئی گھروں میں دیکھا ہے میں نے ماچس کی ایک تیلی بچانے کے لیے سارا دن گیس کا ایک چولھا جلتا رہتا ہے۔''

بی بی اماں کو پانی کا زیاں ہو یا بجلی کا یا اب گیس کا، سخت برا لگتا تھا وہ اکثر کہتی تھیں۔

''قدر نہیں ہے ہمارے لوگوں کو کسی چیز کی، میری دادی بتاتی تھیں کہ جس گاؤں میں وہ لوگ رہتے تھے انہیں پانی بھرنے کے لیے دو دو میل پیدل جانا پڑتا تھا۔''

''بی بی اماں! کیا سچ میں لوگ ماچس کی ایک تیلی کے لیے چولھا جلائے رکھتے ہیں؟'' اسے

حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں تو کیا جھوٹ بولوں گی خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے۔ خیر چھوڑو۔ رات مجھے پوچھنا یاد نہیں رہا۔ تم اوپر گئی تھیں۔ کچھ منہ سے پھوٹا یہ مرتضیٰ کیوں مہرین سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مہرین کتنی سادا دل اور معصوم سی ہے اپنے گھر کی بچی ہے۔ حیا نہ آئی اسے منہ بھر کر انکار کرتے ہوئے۔''

بی بی اماں کو مرتضیٰ پر بہت غصہ تھا اور ان تین چار ماہ میں کتنی ہی بار وہ اسے برا بھلا کہہ چکی تھیں۔

''پتا نہیں بی بی اماں، ماہ وش کہہ رہی تھی کہ وہ آج کل کراچی گئے ہوئے ہیں اپنی چھوٹی خالہ کی طرف۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ چھوٹی خالہ کی بیٹی میں انٹرسٹڈ ہیں۔ خالہ جب سے شادی میں شریک ہو کر واپس گئی ہیں تقریباً روز ہی وہاں فون کرتے تھے۔ ورنہ پہلے تو اس طرح کبھی فون نہیں کیا تھا۔ مہینوں بعد خالہ کا فون آتا تو خیر خیریت پوچھ لیتے تھے۔''

''اے لو، شبانہ کی بیٹی تو بہت چھوٹی ہے مرتضیٰ سے، ابھی سولہ سترہ کی ہوگی۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ یہاں ہی کسی کو پسند کر رکھا ہوگا۔ کوئی ساتھ پڑھنے والی لڑکی ہوگی۔'' بی بی اماں کو ماہ وش کے خیال سے اتفاق نہیں تھا۔

''تایا جان نے تو کہہ دیا ہے کہ مرتضیٰ جہاں چاہتا ہے وہاں ہی اس کی شادی کر دیں۔ لیکن مونا تائی نہیں مان رہیں۔ وہ ہر صورت مرتضیٰ بھائی کی شادی مہرین سے ہی کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اگر مرتضیٰ بھائی کی شادی مہرین کے بجائے کسی اور سے ہوئی تو ماہ وش کی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑ سکتا ہے۔ بھلے رخسانہ آنٹی ان کی بہن اور تایا جان ارباب تایا کے بھائی ہیں۔''

''کہتی تو وہ بھی کچھ غلط نہیں ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مرتضیٰ ماں کی بات مان لے گا۔ بچپن سے ہی ضدی اور ہٹیلا ہے۔ اور پھر اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے مونا نے بھی اس کے بے جا لاڈ اٹھا کر اسے اپنی من مانی کرنے والا بنا دیا ہے۔'' وہ اٹھیں۔

''میں ذرا ایک کپ چائے بنا کر شینو کو دے دوں۔ سر میں درد کا بتا رہا تھا اسے کہہ کر آئی تھی، ابھی چائے دے جاتی ہوں اور تمہارے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔''

''میں بنا لیتی ہوں بی بی اماں!'' اس نے سوچا ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے چولھے کے پاس گرم ہو جائیں گے۔

''روز ہی بغیر چائے کے چلا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے اسے، تمہیں پہلے بنا دیا کروں گی۔ باقی سب تو عصر کے بعد ہی پیتے ہیں۔ جو لوگ چائے کے عادی ہوتے ہیں اگر نہ پئیں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔''

شینو بابا ہفتہ بھر سے جاب پر جا رہے تھے۔ شینو بابا کو جہاں زیب بیگ کے کہنے پر تایا جان کچھ دن تو کارخانے لے کر جاتے رہے پھر ہاتھ اٹھا لیے۔

''شینو کے بس کا کام نہیں ہے یہ۔ اس کا ذہن نہیں ہے۔''

جہاں زیب بیگ جانتے تھے کہ اس کے پیچھے تائی جان کا ہاتھ ہے۔ شینو بابا کے کارخانے جانے سے ان کے تو جیسے سارے کام ہی رہ جاتے تھے، ڈاکٹر ارسلان کے ایک دوست ڈاکٹر نے اپنا ذاتی کلینک بنایا تھا۔ دن کو سرکاری ہاسپٹل میں ہوتے اور شام کو اپنے کلینک میں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے شینو بابا کو وہاں جاب دلوا دی تھی۔ وہ وہاں ریسیپشن پر مریضوں کو نمبر وغیرہ دیتے تھے۔

وہ عموماً عصر سے ذرا پہلے گھر سے نکلتے تھے۔ عصر کی نماز پڑھ کر نکل جاتے تھے اور رات نو بجے تک گھر آتے تھے۔ یوں دن میں اوپر والوں کے کام بھی سرانجام دے دیتے تھے۔ تنخواہ مناسب ہی مقرر کی ہوئی تھی ڈاکٹر زبیر نے۔ شینو بابا کی جاب کی صحیح خوشی زل اور بی بی اماں کو ہوئی تھی۔

''نہیں، تم رہنے دو۔ میں کچن میں تو جا ہی رہی ہوں۔ زین کے آنے کا وقت بھی ہے۔ دو پھلکے بنا لوں اور سالن دھیمی آنچ پر گرم کرنے کے لیے رکھ دوں۔ صبح دو سلائس کھا کر نکل گیا تھا۔ آج جلدی آنے کا کہا تھا۔''

بی بی اماں کی عادت تھی کہ زین کے آنے پر ہی روٹی بناتی تھیں جب تک وہ فریش ہوتا، روٹی تیار ہوتی۔

''تم ذرا اپنے ابا کو ایک نظر دیکھ آؤ۔ کیا کر رہے ہیں اور پھر بڑے صاحب کی بھی خبر لے لینا۔''

وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ شاہ زیب کی طرف جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ آزین اندر داخل ہوا تو وہ جاتے جاتے رک گئی۔

''تم یہاں سردی میں کیا کر رہی ہو؟'' وہ قریب آیا تھا۔

''تمہارا انتظار۔'' مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ ''ویسے تو تم نظر نہیں آتے۔ کھانا کھایا اور کمرے میں بند۔''

''کوئی کام تھا کیا؟'' اجنبی سا لہجہ زمل کو اذیت دے گیا۔

اور اس اذیت کا تاثر اس کی آنکھوں سے چھلکتا آزین کو اپنے لہجے کا احساس ہوا۔

''نہیں۔'' آنکھوں کی سطح پر نمی چمکی تو وہ نگاہیں جھکا کر جانے لگی۔

آزین نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''ابا کی طرف۔''

زمل نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے اندر ایک برقی سی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''انتظار کر رہی تھیں تو پھر بھاگ کیوں رہی ہو؟''

اس کے ہاتھ کے لمس سے آزین کے اندر بھی کچھ پگھلا تھا۔ اس نے ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

''بیٹھو۔''

اور وہ زمل شاہ زیب تھی۔ زیادہ دیر کسی سے بھی ناراض نہیں رہ سکتی تھی اور یہ تو آزین ظفر یاب تھا۔ گو اس کے سپاٹ لہجے اور سرد مہری نے اسے تکلیف تو دی تھی لیکن وہ آزین تھا، وہ اسے قتل بھی کر دیتا تو وہ اس سے ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا ہاتھ اب بھی آزین کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اور اندر چھپا غبار چھٹتا جا رہا تھا۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے تخت پر بیٹھ گیا۔

''سوری ملی...... پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے، کبھی کبھی مجھے شاید تھک جاتا ہوں۔'' ہر بار وہ سوچتا تھا کہ زمل سے کبھی بدگمان نہیں ہوگا اور ہر بار بدگمان ہو جاتا تھا۔ شاید یہ اس کے اندر کے خوف اور ڈر تھے جو فوراً ہی اسے واہموں میں مبتلا کر دیتے تھے۔

''بہت تھکا دینے والی جاب ہے کیا؟'' وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

لمحوں میں وہ اس کا کچھ دیر پہلے والا رویہ اور انداز بھول گئی تھی۔ جہاں زیب بیگ اسے ماہ الملوک یوں ہی تو نہیں کہتے تھے۔ ساری ناراضیاں، غصہ اور خفگیاں لمحوں میں گھل مل جاتی تھیں اور اس کا دل پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانی کی طرح صاف شفاف ہو جاتا تھا۔

''نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ اچھی ہے مجھے پسند ہے۔'' وہ اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

''تو پھر کچھ پریشان ہو کیا؟ کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے زین؟'' زمل سمجھتی تھی کہ کچھ تو تھا جو اسے ڈسٹرب کیے ہوئے تھے۔

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی بات پریشان نہیں کر رہی۔''

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ ان گزرے چند ماہ میں وہ اس کے متعلق کیا کیا سوچتا رہا ہے اور وہ اس ڈر سے اس کے پاس نہیں بیٹھتا، دیکھتا نہیں اس کی طرف کہ کل اگر اس نے اسے چھوڑ دیا تو وہ کیسے اس زیاں کو برداشت کر پائے گا۔

مرتضیٰ نے بات ہی ایسی کی تھی کہ ہر آن اسے اپنی دنیا مٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا خوف مجسم ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ اماں کی طرح ایک روز وہ بھی اسے چھوڑ جائے گی۔ مرتضیٰ کہتا تھا۔

''مرد کی زندگی میں آنے والی ساری عورتیں کاغذ پر لکھی تحریروں جیسی ہوتی ہیں۔ بے رنگ اور بے فیض۔ چچا جان نے صبوحی چچی کو کتنا چاہا تھا۔''

مرتضیٰ یوں ہی کبھی کبھی اماں کا ذکر کر کے اسے زخمی کرتا تھا۔ وہ خوف کی اس دھند اور کہر سے نکلنا چاہتا تھا اس لیے اس سے دور رہ کر خود کو آزما رہا تھا لیکن ہر رات جب وہ بیڈ پر لیٹتا تو وہ اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں اتر آتی اور خود کو اس سے دور رکھنے کی ساری کوشش مٹی میں مل جاتی۔

وہ خود سے اعتراف کرتا کہ وہ زمل کے بغیر جی نہ پائے گا۔ صرف سانسوں کے چلنے کا نام زندگی تو نہیں ہے۔ اور ہر صبح اس کی طرف توجہ دیے بغیر آدھا ادھورا ناشتہ کر کے نکل جاتا اور پورا دن خود کو یقین دلاتا کہ وہ زمل کے بغیر بھی پورے ٹھاٹ اور شان سے جی سکتا ہے۔ لیکن خود کو یقین دلانے کے باوجود خوف کے عفریت اسے نگلتے رہتے۔ لیکن اس وقت اپنی طرف پریشانی سے دیکھتی زمل اس کے سارے خوف اور خدشے ختم کر رہی تھی۔

''بس بلاوجہ ہی الجھا رہتا ہوں۔ ارسلان بھائی کہتے ہیں کبھی کبھی ماضی کے دکھ انسان کو الجھا دیتے ہیں۔ اسے اردگرد سے بے خبر کر دیتے ہیں۔ میں بھی آج کل اماں ابا کے متعلق زیادہ سوچنے لگا ہوں۔'' اس نے آدھا سچ بتایا۔

اور اس آدھے سچ نے زمل کا دل گداز کر دیا اور اس کی خوش نما آنکھوں میں بدلیاں تیرنے لگیں۔

''تم بھول کیوں نہیں جاتے سب زین۔ ان کی کوئی مجبوریاں رہی ہوں گی۔ ظفر چچا نے تو کبھی صبوحی چچی کے لیے کچھ برا نہیں کیا۔''

''جب کوشش کرتا ہوں بھولنے کی تو زیادہ یاد آتا ہے سب، سارے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔'' زخمی نظریں زمل کی طرف اٹھی تھیں۔

''کیا میری محبت اور میرا ہونا بھی ان زخموں کو نہیں بھرتا زین؟''

اس کی سوالیہ نظروں سے محبت کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ جن کی حیات بخش حدت ساری دھند اور ساری کہر کو ختم کرتی تھی۔

''تمہارا ہونا اور تمہاری محبت ہی تو ان زخموں کو بھرے گی جان زین۔'' اس کے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی۔

''یہ ہی تو سکینہ ہے۔ میں شدت سے اس روز کے متعلق سوچتا ہوں جب تم میرے پاس ہو گی۔ تمہارے ہونے سے میرے شب و روز میں چاندنیاں، ستارے اور کرنیں بکھر جائیں گی۔ ماضی کے وہ سارے بے درد لمحے جو کبھی کبھی میرے دل کو دبوچ لیتے ہیں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں گے۔ تم

میرے لیے حاصل زندگی ہو ملی! میری ذات کا کوئی کھویا ہوا حصہ۔ جب تم مجھ سے آملو گی تو میں مکمل ہو جاؤں گا میری جان۔"

شدت جذبات سے اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی اور اس کے ہاتھ میں دبا ملی کا ہاتھ، اس سردی میں بھی پسینے سے بھیگ رہا تھا اور رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

"تمہارے ہاتھ بہت نرم اور ملائم ہیں زمل! جیسے سنبل کی نرمی اور ملائمت ہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھوڑا سا اونچا کر کے دیکھ رہا تھا اور اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

آزین کا ذرا سا التفات اس کے دل میں یوں ہی ہلچل مچا دیتا تھا۔ دھڑکنیں بے قابو ہو جاتی تھیں۔

"میں ان لمحوں کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں ملی، جب تم میرے شب و روز مجھ سے چھین کر مجھ پر قابض ہو جاؤ گی۔ مجھے اس مدو جزر سے نکال کر میرے ہر پل کی نگران بن جاؤ گی۔ میرے خوف، میرے ڈر، میری سوچوں اور میرے دل کی اداسی اور بے چینی کو نوچ کر کہیں دور پھینک دو گی۔ مجھے اس پت جھڑ کے موسم سے نجات دلا دو گی جو بار بار میرے دل کے آنگن میں خزاں پھیلا دیتا ہے۔"

ایک ہاتھ میں اس کا ہاتھ لیے وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ہولے ہولے اس کی نرم ہتھیلی پر پھیر رہا تھا۔

"کوئی دیکھ لے گا زین۔ اب ہاتھ چھوڑ دو نا۔" زمل نے دل کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"کون دیکھے گا۔ یہاں برآمدے میں بیٹھے تو ہم کسی کو نظر نہیں آتے اور وہ ہماری جاسوس بیگم بھی نہ جانے آج کل کہاں غائب ہے۔" وہ اب مسکرا کر دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بی بی اماں کچن میں شیخو بابا کے لیے چائے بنانے گئی ہیں۔ آتی ہوں گی۔" اس نے کچن کی طرف دیکھا۔

"تو ان کو پتا ہے نا ہم میاں بیوی ہیں اور پھر یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا جان عزیز!"

"یہ آج کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" زمل کی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔

"تمہاری موجودگی کا سحر ہے زمل۔ ایسے ہی سحر طاری کر کے بے خود کر دیتی ہو۔ سوچتا ہوں

جب ہر وقت میرے سامنے ہو گی۔ میرے شبستان میں اجالے بکھیرو گی تو میں تو بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ دیوانہ کر دو گی مجھے۔''

زل نے محجوب ہو کر ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔

''اوں ہوں...... مجھے یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوڑنا۔ اور اگر تم نے کبھی چھڑانے کی کوشش کی تو تمہیں مار کر خود کو بھی مار لوں گا۔'' اس کی ہیزل براؤن آنکھوں میں تپش تھی۔

''فضول باتیں کرنے کا بہت شوق ہے نا تمہیں؟'' زل نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''فضول نہیں زندگی، سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ وہ اسی طرح خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا اب نظروں کے تیروں سے قتل کرو گی؟'' اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''تم بھی نا زین......'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''میں بھی کیا؟'' ہمیشہ کی طرح اس کی ہنسی میں گم ہوتے ہوئے آزین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

تب ہی بی بی اماں کچن کا دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹی ٹرے تھی جس میں چائے کا کپ اور بسکٹ تھے۔

''السلام علیکم بی بی اماں!''

''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔''

اس کے چہرے پر بکھرے خوش گوار سے تاثر کو انہوں نے دور سے ہی محسوس کر لیا تھا۔

''میں شیخو کو چائے دے کر کمر سیدھی کروں گی زل بچے! تم سالن گرم کر کے زین کو کھانا دے دو، میں نے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھ دی ہیں۔''

وہ چاہتی تھی کہ اگر کوئی تھوڑا بہت غبار آزین کے دل میں رہ گیا ہے تو وہ بھی بات چیت سے دور کر لے۔

''تم فریش ہو کر کچن میں آجاؤ زین! میں اتنے میں سالن گرم کرتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو زین

نے اسے منع کیا۔

''مجھے ابھی بھوک نہیں ہے زمل۔ ابھی کچھ دیر ادھر ہی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ کتنے سارے دن ہو گئے ہیں نا اس طرح فراغت سے بیٹھے باتیں کرتے۔''

کچھ دیر پہلے جو سردی کا احساس ہو رہا تھا وہ ایک خوش گوار سے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ اب یہ خنکی اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کی ناک ٹھنڈی یخ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی خاموشی سے بیٹھے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کرتے رہے پھر آزین نے اچانک پوچھا۔

''زمل، یہ شایان جو پھپھو کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے آیا تھا، تمہیں اسے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ہمارا تو اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا پھر۔''

زمل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ شادی کے تقریباً چار ماہ بعد پوچھ رہا تھا کہ شایان کیوں آیا تھا۔

''یہ تم آج پوچھ رہے ہو۔ اتنے دنوں بعد کیسے خیال آ گیا۔''

''خیال تو پہلے بھی آیا تھا جب وہ پھپھو کے ساتھ آیا تھا کہ اس کا ڈائریکٹ ہمارے ساتھ تو کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں آیا۔ دیکھا جائے تو اس کا آنا بنتا نہیں تھا۔ سوتیلی ماں کے رشتے داروں کی شادی میں آنے کا۔ حیرت ہوئی تھی مجھے لیکن تم سے ذکر نہیں کیا تھا۔ مصروفیت ہی اتنی رہی ان دنوں۔ آج اچانک ہی خیال آ گیا کہ تم بھی حیران تو ہوئی ہو گی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''ہاں تھوڑی سی حیرت تو ہوئی تھی کہ بھاگی بتا رہی تھی کہ شایان کی امی پھپھو کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں کرتیں لیکن پھر پھپھو نے بتایا کہ اسے پنجاب کی شادی اور لاہور دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ دادا جان نے چونکہ سب کو ہی دعوت دی تھی تو وہ بھی پھپھو کی اجازت سے چلا آیا۔''

سادگی سے کہتے ہوئے وہ بی بی اماں کی طرف دیکھنے لگی جو شیخو بابا کو چائے دے کر واپس آ رہی تھیں۔

''تمہاری ملاقات ہوئی تھی شایان کی امی سے، میں جب امان کے ساتھ گیا ہوا تھا وہ شاید آ گئی تھیں۔ کیسی تھیں؟ کیا ہماری پھپھو سے اچھی تھیں وہ؟'' آزین کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''نہیں...... دور سے دیکھا تھا میں نے۔ ہماری پھپھو کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں تھیں۔

پھپھوتو اتنی گریس فل، اتنی باوقار اور خوب صورت لگتی ہیں۔ وہ تو عام سی شکل وصورت کی تھیں۔ بھاگی نے ہی بتایا تھا مجھے، عمر میں بھی پھپھو سے بڑی ہیں۔ اکڑوسی اور کچھ مغروری سی لگی تھیں وہ۔''

''لیکن شایان تو بہت خوب صورت ہے۔ اماں سے بھی زیادہ۔'' بے اختیار آزین کے لبوں سے نکلا۔

''تو ثوبان انکل پر چلا گیا ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔ ''ویسے میں نے دھیان سے نہیں دیکھا۔ شادی کی اتنی تو مصروفیت تھی۔''

''تو کیا وہاں بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی تمہاری اس سے؟'' اس نے بالآخر وہ کانٹا نکال کر پھینک دیا جو پھانس بن کر اٹکا ہوا تھا اور مسلسل اذیت دے رہا تھا۔

اس روز وہ بے حد خوش گوار موڈ میں زل کے ساتھ سب کے لیے گفٹ لے کر آیا تھا۔

بہت سارے مصروف دنوں کے بعد آج زل سے اتنی دیر تک بات ہوئی تھی۔ کئی دنوں سے دل پر چھایا غبار چھٹ گیا تھا۔ وہ ایک وہم سا جو مرتضیٰ کی باتوں سے دل میں بار بار آ جاتا تھا معدوم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اور اس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ مرتضیٰ کی تو عادت ہے ادھر ادھر کی ہانکنے کی اور فضول اندازے لگانے کی۔ میں بھی خوامخواہ اس کی باتوں میں آ کر موڈ خراب کر لیتا ہوں۔ بھلا زل کسی دوسرے کے متعلق کیوں سوچے گی۔

لیکن ایک بار پھر وہ مرتضیٰ کی باتوں میں آ گیا تھا۔ زل گفٹ لے کر چلی گئی تھی۔ بی بی اماں نے بتایا تھا سب جہاں زیب بیگ کے کمرے میں ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بھی فریش ہو کر ادھر ہی آ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا تو سیڑھیوں سے اترتے مرتضیٰ نے اسے روک لیا۔

''اتنے لدے پھندے کہاں سے آ رہے تھے تم دونوں؟''

''میں زل کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا تھا۔ اسے ثناء وغیرہ کے لیے گفٹ لینے تھے۔ سب دادا جان کے کمرے میں ہیں۔ تم بھی آ جاؤ نا۔ تایا جان بھی آج جلدی آ گئے تھے۔ بی بی اماں نے بتایا ہے وہ بھی ادھر ہی ہیں۔''

''میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔ پھر آتا ہوں۔'' کچھ عرصہ پہلے اس نے سگریٹ پینے شروع کیے تھے لیکن باہر ہی باہر اپنا شوق پورا کر لیتا تھا۔

''لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ دو چار دن ذرا شغل میں پی لیے ہیں، چھوڑ دوں گا۔''

آزین کا خیال تھا کہ ایک دو بار دوستوں کے ساتھ مل کر پی لیے ہوں گے۔ اب چھوڑ چکا ہوگا۔ ایک بار فرسٹ ایئر میں سگریٹ پینے پر ارباب تایا نے اسے خوب مارا تھا۔

''میں اب سترہ اٹھارہ سال کا بچہ تو ہوں نہیں کہ ابا جان سے ڈر کر چھوڑ دوں گا۔ یوں ہی کبھی کبھی دل چاہتا ہے۔ عادت نہیں ہے۔'' مرتضٰی بے زار ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر آ جانا ادھر ہی۔'' آزین دادا جان کے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑا تو مرتضٰی نے اسے روکا۔

''ہاں سنو، وہ شایان کا فون آیا تھا۔ تمہیں سلام کہہ رہا تھا۔ جلد ہی لاہور آئے گا۔ وہ اور امان یہاں پنجاب یونی ورسٹی میں ہی ایڈمیشن لینے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔''

''مانی کا تو پتا تھا مجھے لیکن شایان کا نہیں۔''

آزین سے شایان نے اس طرح کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا حالانکہ جتنے دن وہ یہاں رہا تھا اس کا زیادہ وقت اس کے ساتھ ہی گزرا تھا۔

''کہہ رہا تھا، اس نے تو تب ہی پروگرام بنا لیا تھا، یہاں ایڈمیشن لینے کا جب تم لوگ حویلی گئے تھے پھپھو کی طرف۔''

مرتضٰی نے شایان کا فون نمبر لیا تھا اور کل خود ہی اسے فون کر کے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تھا اور باتوں باتوں میں شایان نے اپنے ایڈمیشن کا ذکر کیا تھا۔

''اچھا، میری ملاقات نہیں ہوئی تھی وہاں اس سے اور یہاں شادی کی مصروفیت میں اس طرح کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔'' وہ یکدم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''زُلل اور دادا جان کی تو ملاقات ہوئی ہو گی نا۔ تب ہی تو اس نے یہاں ایڈمیشن لینے کا پروگرام بنایا۔''

مرتضٰی بات کر کے رکا نہیں تھا لیکن وہ وہاں ہی صحن میں سیڑھیوں کے پاس کھڑا اسے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔

وہ مایوں والی رات تھی۔ فنکشن ختم ہو گیا تھا۔ لوگ رخصت ہو رہے تھے وہ ایک طرف کھڑا تھا جب مرتضٰی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''یہ شایان، یار اس کا ہمارے ہاں شادی میں آنا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پھپھو کا سوتیلا بیٹا ہے ہمارے ساتھ تو اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''دادا جان نے تو سب کو ہی دعوت دی تھی پھر تایا جان نے سب کو ہی کارڈ بھجوائے تھے۔ ثوبان انکل کا تو بیٹا ہے۔ اور پھپھو تو سگے سے زیادہ اس پر صدقے واری ہو رہی ہیں۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''ہاں دعوت تو سب کو ہی تھی لیکن اور تو کوئی نہیں آیا پھر اس کا آنا۔'' مرتضٰی سامنے دیکھ رہا تھا اس کی نظروں کے تعاقب میں اس نے دیکھا۔ سامنے ہی زل اور سحرش کسی بات پر ہنس رہی تھیں اور دائیں طرف ذرا فاصلے پر پلر پر ہاتھ رکھے کھڑا شایان مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

وہ اپنی نظریں زل پر سے ہٹا نہ سکا۔ وہ اتنی ہی دل کش لگ رہی تھی......

پھر اس کی وہ ہنسی......

''کچھ خاص نہیں۔'' مرتضٰی بعض اوقات کچھ نہ کہتے ہوئے بہت کچھ کہہ دیتا تھا۔

''ویسے میں نے اسے باتوں باتوں میں بتا دیا تھا کہ یہاں سحرش اور بلال کے سوا سب ہی انگیجڈ ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ زل کے لیے آیا ہے؟''

آزین کو پہیلیاں پسند نہ تھیں۔

''مے بی......!'' مرتضٰی نے کندھے اچکائے تھے۔ ''میں تو یوں ہی اندازہ لگا رہا تھا کہ آخر شایان اپنی سوتیلی ماں کے میکے کی شادی میں شرکت کے لیے کیوں آ گیا اور اس کی ماں نے منع بھی نہیں

کیا، یہ جاگیردار ٹائپ لوگ ایسے ہی تو ہوتے ہیں دل پھینک سے۔ کیا خبر زمل کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا ہو اور بھاگا چلا آیا شادی کے بہانے۔ ورنہ تک نہیں بنتی اس کے آنے کی۔"

آزین کو اس کا یوں صاف زمل کا نام لینا اچھا نہیں لگا تھا۔ تاہم اس نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں یار! شایان ایسا نہیں ہے دل پھینک ٹائپ اور پھر اگر اس کے دل میں زمل کے لیے کوئی خیال آیا بھی ہو گا تو تم نے بتا تو دیا اسے کہ زمل انگیجڈ ہے۔"

"ہاں مجھے بھی اس طرح کا تو نہیں لگتا۔"

مرتضٰی نے تائید کی لیکن وہ آزین کو جو باور کرانا چاہتا تھا وہ کروا چکا تھا۔ سو اب وہ بھلے اپنی بات کی تردید بھی کر دیتا تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ آزین کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے وہ دل ہی دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسے آزین پر کام کرنا ہو گا۔ زمل پر خوامخواہ اپنی انرجی ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن سا وہاں سے چلا گیا تھا لیکن آزین کا اطمینان ساتھ ہی لے گیا تھا۔

باقی کے سارے دن اس کی نظریں شایان کو ہی کھوجتی رہی تھیں۔ اس نے چند بار ہی اسے زمل سے بات کرتے دیکھا تھا لیکن دل کے اندر کہیں گرہ سی تو پڑ ہی گئی تھی کہ اتنے سارے دن غیر ارادی طور پر وہ زمل سے باتیں کر کے دل پر چھائی دھند چھٹی تھی کہ مرتضٰی کی باتوں سے پھر گھرے بادل چھا گئے تھے۔

"ارے زین بیٹا! وہاں کیوں کھڑے ہو؟" بی بی اماں کچن سے نکل کر جہاں زیب بیگ کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ "آ جاؤ تم بھی بڑے صاحب کے کمرے میں سب ہی بیٹھے ہیں۔ خوب رونق لگی ہے۔"

"آ رہا ہوں بی بی اماں!" مرتضٰی جا چکا تھا اور اس کے دل پر بھاری بوجھ آ گرا تھا۔

"وہاں...... نہیں تو۔ شاید وہ اپنی امی کے ساتھ نہیں آیا ہو گا۔ میں نے تو بس اس کی امی کو ہی

لاؤنج میں بیٹھے دیکھا تھا۔ان سے بھی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور ہمارے آنے تک وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھیں۔'' زمل اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے چونک کر ایک گہرا سانس لیا۔

''تم بھی احمق ہی ہو آزین ظفریاب۔ بلکہ احمق عظیم......'' اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

''مرتضٰی کو تو ہوا میں تیر چھوڑنے کی عادت ہے۔ بچپن سے میں اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہوں۔ جب وہاں اس کی شایان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی تو پھر بھلا زمل کی ملاقات کیسے ہوتی۔ صرف کچھ دیر کے لیے ہی تو وہ امان کے ساتھ گیا تھا۔

ہمیشہ سادہ سی رہنے والی زمل ذرا سا کاجل لگا کر ہی اتنی دلربا لگنے لگتی تھی کہ وہ فوراً اس سے نظریں چرا لیتا تھا۔ وہ اس مایوں والے روز بھی اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس گرین اور یلو کے امتزاج والے ڈریس میں اتنی خوب صورت لگ رہی ہے کہ سیدھی دل میں اتری جا رہی ہے اور دل بے ایمان ہو رہا ہے کہ ابھی دادا جان سے جا کر کہوں کہ میری بیوی کو بھی ساتھ ہی رخصت کر دیں۔ لیکن لمحے ہاتھوں سے پھسل گئے تھے اور باقی کے سارے فنکشن اس نے جلتے کڑھتے ہی بھگتائے تھے۔

اور اس روز جو اتنے دنوں کا بگڑا ہوا موڈ ٹھیک ہوا تھا، پھر خراب ہو گیا تھا اور اتنا سارا وقت اس نے اس خراب موڈ کے ساتھ ہی گزار دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ظفریاب کو سی آف کرنے بھی نہیں گیا تھا۔

''یہ تم ابھی تک سردی میں یہاں ہی بیٹھے ہو۔'' بی بی اماں جاتے جاتے ان کے سامنے رکی تھیں۔ ''اور زمل! میں نے تم سے کہا تھا زین کو کھانا گرم کر دو۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے بی بی اماں! رات کو ہی سب کے ساتھ کھاؤں گا۔'' ماں کی طرح فکر کرتی بی بی اماں کا وہ دل سے قدردان تھا۔

''تو پھر چائے کے ساتھ کچھ کباب وغیرہ بنا لینا۔ دن میں کہاں کچھ کھایا ہو گا آفس میں۔''

بی بی اماں کی عادت تھی کہ شامی کباب، سیخ کباب اور کچے قیمے کے دم والے کباب ہمیشہ فریز کر کے رکھتی تھیں۔ شاہ زیب اور ظفریاب کے دوست وقت بے وقت چلے آتے تھے تو تب سے ہی کچھ

نہ کچھ فریز کر کے رکھنے کی عادت تھی ان کی۔

''اور ہاں......'' اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ مڑیں۔ ''زین تمہارے دوستوں نے آج ہی آنا ہے۔ آج کا ہی کہا تھا ناتم نے؟''

''جی!'' آزین نے سر ہلایا۔ ''لیکن آج وہ عشاء کے بعد ہی آئیں گے۔ دن بہت چھوٹے ہیں ناتو مرسل کہہ رہا تھا کہ عشاء کے بعد ہی آئیں گے تا کہ سکون سے کسی معاملے کو ڈسکس کیا جاسکے۔''

''میں نے صبح ساجدہ سے ڈرائنگ روم کی ڈسٹنگ وغیرہ کروا کے فالتو کشن بھی رکھوا دیے تھے اور ڈرائنگ روم کا ہیٹر بھی ٹھیک کروا دیا تھا آج۔''

اس ایک حبس بھری شام کو جب لائٹ نہیں تھی تو بی بی اماں نے جہاں زیب بیگ سے اجازت لے کر صحن میں آزین کے دوستوں کے لیے کرسیاں لگوائی تھیں، وہ پہلی اور آخری شام نہیں تھی جب آزین کے دوستوں کے بیٹھنے کا انتظام بی بی اماں نے صحن میں نہ کیا ہوا۔

ایک تو اگست کے وہ دن بے حد حبس بھرے تھے پنکھے کے نیچے بھی کپڑے پسینے سے چپکے رہتے تھے تو بی بی اماں صحن میں پیڈسٹل فین لگا کر کرسیاں بچھا دیتی تھیں۔ سردیاں شروع ہوئیں تو پہلے برآمدے میں اور پھر ڈرائنگ روم میں ہی سب بیٹھنے لگے تھے۔ بقول سحرش کے کہ یہ تو عرب کے خیمے اور اونٹ والا معاملہ ہے کہ ہولے ہولے آزین کے دوست تو اندر گھر میں ہی گھس آئے ہیں۔ لیکن یہ سب اتنے پیارے، مخلص اور اچھے لوگ تھے کہ ہولے ہولے گھر کے افراد کی سی حیثیت اختیار کر لی تھی انہوں نے۔

شروع میں تو مرسل، اسد، طیب اور عمار ہی تھے لیکن بعد میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن میں مرسل کی کزن ثوبیہ اور اس کی سہیلی سمیرا بھی تھی۔

یہ سب مل کر بہت کام کرتے تھے۔ ثوبیہ چونکہ زمل کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی گو اس کا ڈپارٹمنٹ الگ تھا لیکن اچھی سلام دعا تھی۔ سو ثوبیہ کی وجہ سے زمل بھی اکثر ان کے ساتھ شامل ہو جاتی تھی۔ دو تین بار سحرش اور مرتضیٰ بھی شامل ہوئے تھے۔ جہاں زیب بیگ بھی ذرا سی دیر کے لیے ان کی گفتگو میں شریک ہوئے تھے۔

سب کی خواہش ہوتی تھی کہ جہاں زیب انہیں کچھ وقت دیں تا کہ وہ ان کے مشوروں اور علم سے مستفید ہوسکیں۔ بی بی اماں کو سب سے ہی اپنائیت محسوس ہوتی تھی اور وہ ان کے لیے چائے وغیرہ کا انتظام کر کے بہت خوش ہوتی تھیں۔ آزین انہیں کچھ اہتمام کرنے سے منع کرتا تو وہ ناراض ہوتی تھیں۔

''لو میں نے یہاں کون سی دیگیں پکوالی ہیں۔ اتنا ثواب کا کام کر رہے ہیں یہ بچے تو ان کی خدمت خاطر کر کے کیا خبر تھوڑا سا اجر ہمیں بھی مل جائے۔''

اور آزین ہنس کر چپ ہو جاتا تھا۔

سب ہی بی بی اماں کا احترام کرتے تھے۔ اور بی بی اماں کو گزرے دن یاد آ جاتے تھے جب مریم اور صبوحی کے ساتھ مل کر وہ شاہ زیب اور ظفریاب کے دوستوں کے لیے چائے اور اسنیکس بنا بنا کر بھیجا کرتی تھیں۔

''اور زل بچے! تم بھی ذرا اپنے ابا کو دیکھ لینا۔ میں سلمٰی کے ہاں جانے سے پہلے گئی تھی تو سو رہے تھے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

''جی بی بی اماں!'' وہ اٹھی تو لیکن آزین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اوں ہوں...... بیٹھو نا کچھ دیر۔''

''ابا کو دیکھ کر آ جاتی ہوں۔ ابھی کیا خبر جاگے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر ارسلان نے کہا تھا نا کہ انہیں زیادہ دیر اکیلا نہ چھوڑا کریں۔ مصروف رکھا کریں۔'' وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی تھی۔

''وہ جاگ رہے ہوتے تو ضرور دروازے کے پاس آ کر شینخو بابا کو آواز دیتے۔ تم نے دیکھا نہیں اب آج کل ایسا ہی تو کرتے ہیں وہ۔ اور ہماری طرح شینخو نہیں، شہزادے کہہ کر بلاتے ہیں اسے۔'' آزین کے ہاتھ میں ابھی تک اس کا ہاتھ تھا۔

''ہاں بی بی اماں بتا رہی تھیں کہ جب ہم گھر نہیں ہوتے تو شینخو بابا کو ڈھونڈتے ہوئے ڈیوڑھی کے دروازے تک چلے جاتے ہیں۔ ایک دو بار تو ڈیوڑھی میں جا کر ان کے پاس بیٹھے بھی رہے۔'' زل کو بھی خیال آیا تھا۔

''شینخو بابا ان کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ یہ سب، ان کا یہ ردعمل بہت خوش آئند ہے۔ دیکھنا ایک روز وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

جس طرح کی مثبت تبدیلیاں ان میں ہو رہی تھیں ڈاکٹر ارسلان کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد نارمل ہو جائیں گے۔ اور آزین کا بھی یہی خیال تھا۔

''ان شاء اللہ!''

زمل شاہ زیب کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ جب چھوٹی تھی اور شاہ زیب اس کے لیے کوئی گفٹ لاتے، اس کی سالگرہ پر یا یوں ہی...... یا اس کے سر ہاتھ پھیر کر مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر کوئی بات کر لیتے تھے وہ ہفتوں، مہینوں خوش رہتی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک ان کا اتنا ہی التفات اس کا سرمایہ تھا۔ پھر اماں کے بعد تھوڑے سے عرصہ پر مشتمل ان کی وہ بے تحاشا توجہ اور پیار لیکن کتنے مختصر سے عرصے کے لیے تھا وہ سب۔ اماں کے بعد وہ گھر آتے تو اسے پاس بٹھا کر کتنی ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کی تعلیم، اس کی دلچسپیاں، اس کے شوق سب کے متعلق ہی بات کرتے تھے۔ شاید انہیں احساس ہوتا ہوگا کہ اس کی ماں نہیں رہی۔ اب وہ اکیلی ہو گئی ہے تو وہ اسے وقت دینے لگے تھے۔ لیکن پھر سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پہلے وہ کھو گئے اور پھر ملے تو اس سے کیا خود سے ہی بیگانہ ہو چکے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' آزین بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یوں ہی ابا کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب وہ ٹھیک ہو جائیں گے تو کیسا لگے گا۔ وہ مجھے پہچان تو لیں گے نا زین؟ اب تو کبھی کبھی وہ بہت اجنبی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔

''بہت اچھا لگے گا زمل۔ اور وہ وقت ان شاء اللہ بہت جلد آئے گا۔ اور وہ تمہیں بھلا کیوں نہیں پہچانیں گے اور پہچان کر حیران ہی رہ جائیں گے کہ یہ اتنی پیاری اور حسین لڑکی ان کی بیٹی ہے۔ اور یاد ہے نا پھپھو نے کہا تھا تم بالکل مریم چچی کی طرح ہو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انگلی کی پور سے آنکھوں کے کونوں میں موجود نمی کو صاف کیا۔

''پتا ہے زمل! میں بہت دنوں سے تمہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ تم شادی کے ہر فنکشن میں بہت خوب صورت اور دلکش لگ رہی تھیں جب بھی تمہاری طرف دیکھتا تھا دل بے ایمان ہو جاتا تھا کہ تمہاری رخصتی بھی ساتھ کے ساتھ ہی کروالوں۔'' محبت کی کرنوں سے لبریز نظریں اس پر ٹکی تھیں۔

''اور یہ بات تمہیں اب یاد آئی ہے زین؟'' سب نے اسے سراہا تھا اور جسے سراہنا تھا وہ آج اتنے مہینوں بعد اسے بتارہا تھا کہ وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ سادہ سے انداز میں چھپے شکوے کو آزین نے محسوس کیا۔

''سوری زمل!''

''میں نے گلہ تو نہیں کیا جو سوری کر رہے ہو۔ مجھے پتا ہے تم بتاؤ یا نہ بتاؤ میں تمہیں اچھی ہی لگ رہی ہوں گی۔ حالانکہ وہاں مہمانوں میں مجھ سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں تھیں اور وہ شانزہ کے سسرالی رشتہ داروں میں ایک لڑکی شاید عقیل بھائی کی کزن تھی بلا کی خوب صورت تھی وہ۔''

وہ زمل شاہ زیب تھی۔ اسے آزین کی آنکھوں میں موجود ندامت اور اس کا سوری کہنا اسے ہی نادم کر گیا تھا۔

بھلا یہ ایک جملہ کہنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ آزین تو شروع سے ایسا ہی تھا لاپرواسا اسے تو کبھی اس کی سالگرہ یا کامیابی پر وقت سے وش کرنا یاد نہیں رہتا تھا۔

''لیکن تم جیسی کوئی نہیں تھی ملی...... تم تو آزین کے دل کی ملکہ ہو۔ نہ پوچھو کیسے تمہیں دیکھ دیکھ کر دل بے ایمان ہو رہا تھا لیکن آہ!'' اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

''جانے ہمارا انتظار کب ختم ہوگا۔''

''کم از کم دو سال بعد۔'' زمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہرگز نہیں۔ میں نہیں کرنے والا اتنا انتظار۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''بھول گئے ہو تم نے خود ہی دادا جان سے دو سال کا وقت لیا ہے۔'' مسکراہٹ اب بھی زمل کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

''اوہ ہاں......!'' اس نے جھینپتے ہوئے کان کی لو مروڑی۔

''وہ تو بس میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا تب مجھے لیکن میں بتا رہا ہوں بس تمہارے امتحان تک ہی انتظار کروں گا میں۔''

''میں بتاؤں، تمہیں کیا ہو گیا تھا زین؟'' زمل سنجیدہ ہوئی۔ ''تم نے چچا جان کی وجہ سے کہا تھا نا کہ تمہارا دو سال تک شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ ثنا، چچی جان اور ظفر چچا سب ہی کتنا خوش ہو رہے تھے۔ تمہاری شادی کے پلان بنا رہے تھے۔ خاص طور پر چچا جان کو دکھ دینے کے لیے تم نے کہا تھا نا وہ۔''

''نہیں......'' وہ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ اس سے بدگمان ہو گیا تھا۔ مرتضیٰ نے کچھ دیر پہلے جو کچھ کہا تھا، اسی سے اس کے دل میں ہزاروں وہم آ رہے تھے کہ شایان کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ عمر میں زمل سے شاید سال ڈیڑھ سال چھوٹا تھا لیکن شاید مرتضیٰ نے ہی جانے کس بات پر کہا تھا کہ عمر کی چھوٹائی بڑائی سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر بات پسندیدگی کی ہو وہ جب اپنا اور شایان کا موازنہ کرتا تو اسے اپنا پلڑا زمین سے لگتا ہوا محسوس ہوتا۔

شایان خوب صورت تھا۔ دولت مند تھا۔ وہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر رخصتی کے بعد زمل کو اس کی ماما کی طرح احساس ہوا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا اور وہ بھی شایان کی دولت اور جائیداد سے متاثر ہو گئی تو......

آخر ایسا کیا تھا ابرار شاہ میں جو ظفر یاب میں نہیں تھا۔ سوائے دولت کے بس۔

جب جب مرتضیٰ کوئی بات کرتا ایسے ہی منفی خیالات دل و دماغ پر یلغار کر دیتے تھے اور وہ بے بس سا ہو جاتا تھا۔ اس روز بھی جب اس کی شادی کی بات ہو رہی تھی ایسے ہی منفی خیالات نے اسے گھیر لیا تھا اور اسے لگا جیسے اسے کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لیے وقت چاہیے۔

''زین!'' زمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ جو تم خود ساختہ ناراضی دل میں لیے بیٹھے ہو یہ تمہیں خود کو ہی نقصان پہنچا رہی ہے۔ اب کرو دو سال انتظار۔''

''میں نہیں کرنے والا دو سال انتظار۔'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''دادا جان سے معافی مانگ لوں گا

کہ بندہ بشر ہوں، غلطی ہوگئی ہے۔ اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے میری امانت میرے حوالے کریں۔"

"دادا جان نہیں مانیں گے۔" وہ شریر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم تو مان لوگی نا؟" وہ مسکرا رہا تھا۔ فی الحال دھند چھٹ گئی تھی۔ منظر صاف تھا لیکن کون جانے کب وہ پھر سے وہموں اور شکوک میں پڑ جائے ایسا ہی تو تھا وہ باوجود کوشش کے وہ اپنا یقین پختہ نہ کر پاتا تھا۔ ذرا سی بات سے یقین متزلزل ہو جاتا تھا بلکہ یقین کی عمارت ڈھے جاتی تھی۔

"بولو نا تم تو مان لوگی نا؟"

اور زمل کی نظریں جھک گئیں۔

"میں نے پہلے کب منع کیا تھا؟"

"تھینک یو ملی! تم ہمیشہ میرا مان بڑھا دیتی ہو۔" اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"ہمیشہ ایسے ہی رہنا، اتنی پیور، اتنی خالص، کبھی کبھی مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے کہ تم میری زندگی کی شریک ہو لیکن پھر ڈر جاتا ہوں کہ کہیں مجھے خود میری ہی نظر نہ لگ جائے۔

اللہ نے تمہیں میرا نصیب بنایا اس کے لیے میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا ملی کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ میری رگوں میں دوڑتا لہو، میرے سینے میں چلتا سانس جو تمہارے نہ ہونے سے بند ہو جائے گا۔"

وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی نظروں کی حدت سے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اذان ہونے والی ہے۔ میں ابا کو دیکھ لوں۔ آج کل اتنی دیر تک نہیں سوتے وہ۔ تم بھی آفس سے آ کر یہاں ہی بیٹھ گئے۔ فریش ہو کر اور نماز پڑھ کر دادا جان کے کمرے میں ہی آ جانا۔ چائے ادھر ہی پئیں گے۔"

"جو حکم سرکار کا۔" وہ ہلکا سا سر خم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"جی تو نہیں چاہ رہا لیکن آفس سے آتے جاتے جو دھول مٹی پڑی ہے اس سے الجھن ہو رہی ہے۔ ایک عمارت گرائی جا رہی تھی راستے میں۔ باتھ لوں گا۔ پانی تو گرم ہے نا؟"

''ہاں۔ تمہارے کپڑے استری کر کے ہینگ کر دیے تھے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور شاہ زیب کے کمرے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھایا تو آزین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''تھینک یو ملی......''

''کس لیے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہر اس چیز کے لیے جو تم میرے لیے کرتی ہو۔ اور میرے اندر چھائے جالے اور گرد اتارنے کے لیے۔'' اس کی نظروں میں ممنونیت تھی۔ محبت تھی۔ وارفتگی تھی۔

''اگر تم تھینک یو کہنا ضروری سمجھتے ہو تو تمہارا تھینک یو قبول کیا۔'' لبوں کے کونوں میں مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی اور آنکھوں میں ستارا سا دمکا۔

والہانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آزین نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چند لمحے یوں ہی کھڑی اپنے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی حدت اور لمس محسوس کرتی رہی، پھر شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حسب عادت دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھولا۔ شاہ زیب دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے ٹہل رہے تھے۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر۔

''السلام علیکم ابا! کب جاگے آپ؟''

انہوں نے رک کر اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں اتنی اجنبیت تھی کہ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

کہیں ابا کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تو نہیں ہو رہی۔ دوا نے الٹا اثر تو نہیں کر دیا۔ پہلے وہ خاموش رہتے تھے، بات نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ میں گم رہتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں اس طرح اجنبیت تو نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ زحل ہے۔ ان کی بیٹی۔ وہ دادا جان ہیں۔ وہ آزین ہے۔ وہ کھانا کھلاتے ہوئے، الماری میں ان کے کپڑے تہ کر کے رکھتے ہوئے یوں ہی ان کے پاس بیٹھے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اپنی، اماں کی، دادا جان کی، آزین کی اور بی بی اماں کی۔

وہ جواب نہیں دیتے تھے لیکن سن رہے ہوتے تھے۔ کبھی اس کی کسی بات پر ان کے لبوں کے

کونے پر مدھم سی مسکراہٹ بھی آ کر معدوم ہو جاتی تھی۔ لیکن ایسی پتھریلی سی اجنبیت تو کبھی بھی ان کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے نہیں دیکھی تھی جیسے اب اس وقت نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ اسے جانتے ہی نہ ہوں اور جیسے انہیں اس کا اپنے کمرے میں آنا ناگوار گزر رہا ہو۔

شاہ زیب نے جو رک کر اسے دیکھ رہے تھے، انگلی کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ اسے باہر جانے کا اشارہ کر کے وہ پہلے کے سے انداز میں ٹہلنے لگے تھے۔ ہاتھ پیچھے باندھے اس کی طرف دیکھے بغیر۔ وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی کہ انہوں نے ایک بار پھر رک کر اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ماتھے پر بل سے پڑ گئے۔

''کھڑی کیوں ہو، جاؤ اب۔'' وہ سیدھی ہوئی اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

''سنو! اماں جان جب فارغ ہوں تو مجھے بتانا۔''

وہ جی کہتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ منہ ہی منہ کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ شاید وہ ماضی کے کسی لمحے میں اٹکے ہوئے تھے۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ افسردہ سی باہر آئی تو مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے درختوں کے پتے ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے آزین کی موجودگی میں یہاں سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن اب یکدم جیسے ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو رگڑا۔ دو انگلیوں سے ناک کو چٹکی میں پکڑ کر چھوا جو ہاتھ کی طرح ہی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

''پتا نہیں ابا بہتری کی طرف جا رہے ہیں یا تنزلی کی طرف......'' اسے ڈر لگا۔ ''پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے تو......؟ آزین سے کہوں گی آج رات اگر ڈاکٹر ارسلان آئیں تو ان سے ابا کی موجودہ حالت ضرور ڈسکس کرے۔''

وہ اس سے بات نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی آنکھوں میں اس کے لیے ایسی اجنبیت نہیں ہوتی تھی جیسی ان دنوں کبھی کبھی نظر آنے لگتی تھی۔

وہ شاہ زیب کے متعلق سوچتی ہوئی کمرے میں آئی اور ابھی نماز پڑھ کر اٹھی ہی تھی کہ باہر

برآمدے میں بی بی اماں کی آواز آئی جو کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔

''شاید سحرش آئی ہے۔ کتنے ہی دنوں سے اس نے نیچے چکر نہیں لگایا تھا۔'' اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھولا لیکن بی بی اماں کے ساتھ سمیرا شاہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سمیرا اسے دیکھ کر مسکرائی اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''حیران ہو رہی ہو مجھے یوں اچانک دیکھ کر......''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب بھلا وہ جھوٹ کیسے بولتی کہ وہ حیران نہیں ہوئی۔

''وجدان احمد نے بتایا تھا مجھے کہ آج عشاء کے بعد میٹنگ ہے۔ لیکن میں ادھر کسی دوست سے ملنے آئی تھی تو سوچا تم سے ملتی چلوں۔ کبھی آرام سے بیٹھ کر تم سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میرا دل چاہتا تھا تم سے بہت ساری باتیں کرنے کو۔ بیا مطلب ثوبیہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ تمہیں برا تو نہیں لگا میرے اس طرح آنے کا۔''

وجدان احمد بھی سمیرا کے ساتھ ہی آئے تھے پہلی بار۔ سمیرا تو ثوبیہ کے ساتھ باقاعدگی سے ہر میٹنگ میں شریک ہوتی رہی تھی لیکن وجدان احمد اس سے پہلے شاید دو بار ہی آئے تھے۔ آزین نے بتایا تھا اسے کہ ان کی اس فلاحی تنظیم کی سب سے زیادہ مالی مدد وہ ہی کرتے ہیں۔

''نہیں تو، مجھے بھلا برا کیوں لگے گا؟'' زِل مسکرائی۔ ''آئیں اندر آجائیں۔'' وہ ایک طرف ہوئی۔

''تم لوگ باتیں کرو، میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔'' بی بی اماں نے زِل سے کہا تو زِل نے منع کیا۔

''نہیں بی بی اماں، اپ کچھ دیر بیٹھیں سمیرا کے پاس، میں چائے وغیرہ بنا لیتی ہوں۔''

زِل کو احساس تھا کہ وہ یونی میں ہوتی ہے تو دن میں بھی کچن کا سارا کام بی بی اماں کو اکیلے کرنا پڑتا ہے۔

''یہ بے چاری تم سے ملنے آئی ہے اور تم کچن میں گھس جاؤ گی، بیٹھ کر آرام سے گپ شپ لگاؤ۔''

سمیرا نے دلچسپی سے بی بی اماں کو دیکھا۔

''میں کوئی خاص ایسی شوقین نہیں ہوں چائے کی۔ اگر میرے لیے بنانے جا رہی ہیں تو مت بنائیں۔''

''چائے کا وقت ہے بی بی، سب کے لیے بنتی ہے۔ جی چاہے تو تم بھی دو گھونٹ پی لینا۔''

بی بی اماں کو سمیرا پہلے دن ہی کوئی خاص پسند نہیں آئی تھی۔ ورنہ باقی سب سے ان کو بہت انسیت ہوگئی تھی۔ ثوبیہ تو اکثر ان کی مدد کے لیے کچن میں چلی آتی تھی۔ ناپسندیدگی کی وجہ شاید سمیرا کا لباس ہوتا تھا۔ آج بھی وہ جینز پر لانگ سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں سیاہ رنگ کا لمبا مفلر تھا جس کے کنارے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔

''ایک بات بتاؤ بی بی! تمہارے اماں باوا نے کبھی نہیں کہا تمہیں روکا ٹوکا نہیں؟''

سمیرا حیران ہوئی۔

''یہ جو پہناوا تم پہنے پھرتی ہو۔ اس پر۔'' انہوں نے اس کے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں تو......'' سمیرا نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔

''کیا یہ لباس مجھ پر برا لگ رہا ہے؟''

''نہیں خیر برا تو کیا لگتا ہے لیکن ہم ٹھہرے پرانے زمانے کے لوگ، ہمیں لڑکیوں کے لیے ایسا لباس پسند نہیں۔ چلو جی اللہ رسول ﷺ کے فرمان کا علم نہیں ہوگا تمہیں لیکن سردی سے بچنے کے لیے ہی سر کان لپیٹ لو اچھی طرح۔'' بی بی اماں زیادہ عرصہ تک دل کی بات دل میں نہیں رکھتی تھیں۔

''باوا میرے ملک سے باہر ہوتے ہیں اور اماں انہیں اپنے ہی غموں سے فرصت نہیں ملتی کہ اپنی بے چاری اولادوں کی طرف توجہ دیں۔ خیر مجھے سردی نہیں لگ رہی۔''

بی بی اماں کا نرم دل اس کی بات پر گداز ہوا۔ اگر انہیں آزین کی فکر نہ ہوتی تو ضرور وہ اس سے اس کے اماں ابا کے متعلق تفصیل معلوم کرتیں کہ کون سے ایسے غم لگے ہیں اس کی اماں کو کہ اولاد خودرو بوٹیوں کی طرح بڑھ رہی ہے، اچھے برے کی تمیز بتانے والا کوئی نہیں۔ لیکن آزین صبح دو سلائس چائے کے ساتھ کھا کر چلا گیا تھا اور انہیں چین نہیں آ رہا تھا سو وہ مزید کوئی بات کیے بغیر چلی گئیں۔

"سوری سمیرا! اگر بی اماں کی بات بری لگی ہو تو......" زمل نے معذرت کی۔ جانتی تھی کہ سمیرا کا جس طبقے سے تعلق ہے وہاں ان باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔

"بالکل بھی بری نہیں لگی۔ انٹرسٹنگ......! میں کسی روز تمہاری ان بی بی اماں کے پاس کچھ وقت گزارنا چاہوں گی تا کہ کچھ سیکھ سکوں۔"

وہ اب کمرے کے وسط میں کھڑی چاروں طرف تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سادہ سے کمرے میں کچھ بھی اضافی نہیں تھا۔

"ویسے بی بی اماں سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"دیکھا جائے تو خون کا کوئی رشتہ نہیں لیکن سب رشتے ان سے ہی ہیں۔ مجھے اور زین کو ایک طرح سے انہوں نے ہی پالا ہے۔" زمل کمرے میں موجود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"مطلب تمہاری ملازمہ ہیں۔" سمیرا نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے پائنتی پڑا کمبل اپنے گھٹنوں پر پھیلا لیا۔

"نہیں، ہم نے کبھی انہیں ملازمہ نہیں سمجھا۔ ہمارے لیے ہماری ماں جیسی ہیں۔" زمل کو برا لگا تھا اس کا انہیں ملازمہ کہنا۔

"سوری یار! تمہیں شاید برا لگا میرا انہیں ملازمہ کہنا۔" سمیرا نے بھانپ لیا تھا کہ زمل کو اچھا نہیں لگا۔

"وہ ہم سب کے لیے گھر کے فرد کے جیسی ہیں۔" زمل نے وضاحت کی۔

"اوکے......آئندہ خیال رکھوں گی اور یہ تم وہاں سردی میں کرسی پر اکڑ کر بیٹھی رہو گی، ادھر ہی آ جاؤ یار!" وہ بے تکلفی سے کہتی ہوئی تھوڑا سا دیوار کی طرف کھسکی۔ زمل کو بھی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کمبل ان پر پھیلایا۔

"پتا ہے زمل! پہلی بار جب میں نے تمہیں بیا کے ساتھ یونی میں دیکھا تھا تو تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ دھیمے لہجے میں ہولے ہولے بولتی ہوئی اور میں نے سوچا تھا تمہیں دوست بناؤں گی۔ بیا نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کوئی خاص دوست نہیں ہے یونی میں اور اس سے بھی بس سلام دعا ہے۔ تمہارا

کزن اس کے کزن مرسل کا دوست ہے۔ اور وہ مل کر کسی فلاحی تنظیم کے لیے کام کرتے ہیں۔ میرا ارادہ کبھی بھی اس تنظیم میں شمولیت کا نہیں تھا۔ بس ثوبیہ کے کہنے پر کبھی کبھی مالی مدد کر دیتی تھی۔ دراصل مجھے کسی بھی قسم کی تنظیموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ چاہے وہ سیاسی تنظیمیں ہوں چاہے فلاحی...... سب اپنا مطلب پورا کرتے ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر تنظیمیں بناتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا بینک بیلنس بڑھاتے رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔" بے اختیار ہی زل کے لبوں سے نکلا تھا۔ "انہوں نے کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں بنائی ہوئی۔ نہ اس تنظیم کا کوئی نام ہے۔ بس یہ چند دوست مل کر کام کرتے ہیں۔"

"ہوں۔ جانتی ہوں تب ہی تو مالی مدد کر دیتی تھی۔ میں خود کو صرف اسی حد تک محدود رکھنا چاہتی تھی لیکن پھر جب بیا نے بتایا کہ اس تنظیم کی میٹنگز تمہارے گھر میں ہوتی ہیں تو میں پہلی بار صرف تم سے ملنے کے لیے بیا کے ساتھ آئی تھی۔ پھر......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور زل کی طرف دیکھنے لگی جو حیران سی اسے دیکھ رہی تھی کہ اس میں ایسا کیا تھا بھلا۔ عام سی لڑکی تھی جو یہ اتنی امیر کبیر لڑکی اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے تو سوچا آج ایک دوسرے سے تعارف ہو جائے۔ تمہیں برا تو نہیں لگا نا میرا آنا؟"

"نہیں......!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے برا نہیں لگا تھا، وہ بس حیران تھی۔

"تو چلو، پہلے میں اپنا تعارف کرواتی ہوں۔" وہ ذرا سا رخ اس کی طرف کیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ ایک بہن کی شادی ہو چکی ہے۔ دونوں بھائی پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ایک کی پڑھائی تو ختم ہو چکی، دوسرا پڑھ رہا ہے۔ دوسرے نمبر والی بہن بھی اپنی پڑھائی ختم کر کے گھر میں ہے۔ پہلے دو بہنیں، پھر دو بھائی پھر میں۔ ڈیڈ پہلے یو ایس اے میں تھے، آج کل یو کے میں ہیں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ۔ میں بھی اپنے ڈیڈ کی بہت لاڈلی تھی لیکن ان کی دوسری شادی کے بعد سے میرے تعلقات ان کے ساتھ کچھ گڑبڑ سے ہیں۔

میں تقریباً چھ سال کی تھی جب ڈیڈ نے شادی کی لیکن اس شادی کا انکشاف میری مما اور ہم سب پر تین سال بعد ہوا۔ تو بس تب سے ہی میں ان سے بات نہیں کرتی زیادہ...... ویسے ہر سال آتے ہیں ایک ماہ کے لیے پاکستان۔ میرے اکاؤنٹ میں بھی پیسے بھجواتے رہتے ہیں۔ خیر تم اپنے متعلق بتاؤ اب۔''

وہ ہولے سے ہنسی تھی لیکن اس ہنسی میں زل کو ٹوٹے کانچ کی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ لمحہ بھر وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''کچھ مت کہو یار!'' وہ جیسے اس کی الجھن جان گئی تھی۔ ''یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔ کئی گھروں میں ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ تم بتاؤ نا تم کتنے بہن بھائی ہو؟''

''میں اکلوتی ہوں۔ میری اماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں بارہ سال کی تھی تب...... اور میرے ابا ان کے بعد مینٹلی ڈسٹرب ہو گئے۔ اپنے آپ میں گم ہوتے چلے گئے۔'' ابا کا ذکر کرتے ہوئے وہ افسردہ ہوئی۔ ''آج کل ڈاکٹر ارسلان ان کا علاج کر رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ ابا بہت جلد اس ڈپریشن سے نکل آئیں گے۔''

''اور آزین...... وہ تمہارا کون ہے؟'' سمیرا کی نظروں میں تجسس تھا۔

''آزین میرا کزن ہے۔ میرے ابا چار بھائی ہیں۔ میرے بڑے دونوں تایا اپنی فیملی کے ساتھ اوپر والے پورشن میں رہتے ہیں۔ میرے اور آزین کے والدین یہاں گراؤنڈ فلور پر دادا جان اور دادی جان کے ساتھ رہتے تھے۔ دادی جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور آزین کے ابا آج کل یو کے میں ہیں۔ تمہارے ڈیڈ کی طرح انہوں نے بھی دوسری شادی کر لی تھی اور آزین کے تعلقات بھی تمہاری طرح اپنے ابا کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ ناراض ہی رہتا ہے ان سے۔'' زل نے سادگی سے تفصیل بتائی۔

''اوہ اچھا......!'' سمیرا ہولے سے ہنسی۔ ''یعنی آزین کا دماغ بھی کچھ کچھ میری طرح خراب ہے۔ ورنہ میرے سب بہن بھائیوں کے ڈیڈ کے ساتھ بہت اچھے ریلیشن ہیں۔ میرے بھائی تو جب امریکہ میں تھے تو ان کے پاس ہی رہتے تھے اور اپنی اسٹیپ مدر کے ساتھ بھی ان کے ٹھیک ٹھاک دوستانہ تعلقات ہیں۔ اور زین کی مدر کیا وہ بھی میری مما کی طرح اس شادی کو قبول نہیں کر سکیں۔ میری

مما یا تو روتی ہیں یا ڈیڈ کو برا بھلا کہتی رہتی ہیں اور جب ان کاموں سے تھک جاتی ہیں تو پھر کلب یا کہیں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ غم غلط کرنے چلی جاتی ہیں۔'' وہ پھر ہنسی تھی۔

''نہیں۔زین کی اماں نہیں ہیں۔'' زمل سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ صبوحی چچی کے متعلق اسے بتائے یا نہیں۔شاید زین کو اچھا نہ لگے۔

''مطلب ان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' اس کے لہجے کی بناوٹ اور مصنوعی پن پر زمل نے غور نہیں کیا تھا، غیر ارادی طور پر اس کا سر نفی میں ہلا۔

''نہیں۔انہوں نے طلاق لے لی تھی۔ظفر چچا نے بعد میں شادی کی۔''

''پھر تو اپنے ابا سے ناراض ہونے کی تک نہیں بنتی۔اماں سے ناراض ہونا چاہیے زین کو۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

''خیر مجھے کیا بھئی، وہ اپنے ابا سے ناراض ہو یا اماں سے۔''

''خیر'' شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

''ویسے زین کی اماں نے طلاق کیوں لی تھی؟''

''پتا نہیں۔'' زمل کو اب اس کے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

''کوئی پرانی محبت وحبت کا چکر ہوگا تب ہی بیٹے کو چھوڑ کر چلی گئیں۔''

''صبوحی چچی ایسی نہیں تھیں۔'' زمل کو ناگوار گزرا تھا۔

''چلو خیر۔کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' سمیرا نے اس کی ناگواری محسوس کر لی تھی۔بہت تیز اور گہری نظر تھی اس کی۔

''تمہارے کیا ارادے ہیں ماسٹرز کے بعد؟''

''ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔''

''میں نے تو ماسٹرز کے بعد دنیا گھومنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ساری دنیا میں...... پہلے کچھ عرصہ بڑے بھائی کے پاس امریکہ جاؤں گی وہاں سے پھر اٹلی آپی کے پاس اور آخر میں لندن اپنی

اسٹیپ مدر کے درشن کرنے جاؤں گی۔ ڈیڈ کے گھر رہوں گی نہیں، بس ذرا ان کی مسز کا دیدار کروں گی، رہائش اپنی خالہ کے گھر۔" وہ بلاوجہ ہی ہنسی۔ اور پھر فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا خیر، اب چلتی ہوں۔ رات نہیں آؤں گی۔ مما کے ساتھ کہیں جانا ہے مجھے۔ یاد ہی نہیں رہا۔ مما تو مجھے کوس رہی ہوں گی خیر منالوں گی انہیں۔" وہ اپنے جوگر پہننے لگی تھی۔

"کہاں جارہی ہو۔ بیٹھو نا پلیز۔ بی بی اماں چائے لارہی ہوں گی۔ کباب وغیرہ تل رہی ہوں گی اس لیے کچھ دیر ہوگئی ہے۔"

"نہیں یار! چائے کا بتایا تو تھا میں نے زیادہ شوق نہیں ہے مجھے اور تمہارے کباب وغیرہ ادھار رہے، پھر کبھی۔"

وہ اپنے جوگر کے تسمے باندھ کر سیدھی ہوئی اور نظر کارنر میں بنے بک ریک پر پڑی تصویر کی طرف اٹھی۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سرسری نظر سے اس تصویر کو دیکھا تھا لیکن اب آگے بڑھ کر تصویر اٹھالی تھی۔

"یہ غالباً تم ہو۔" اس نے تصویر میں موجود بچی پر انگلی رکھی۔

"ہاں......!" زل مسکرائی۔

یہ تصویر ظفریاب نے اپنی قید سے چند دن پہلے بنائی تھی۔ انہیں فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ اکثر سب کی تصویریں بناتے رہتے تھے۔ اس تصویر میں وہ، آزین، اس کی اماں اور صبوحی چچی تھیں۔ درمیان میں اماں اور صبوحی چچی......اور دونوں طرف وہ اور آزین۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اس تصویر کو دادا جان سے کہہ کر بڑا کروایا تھا۔

"یہ زین ہے اور یہ میری اماں اور ان کے ساتھ صبوحی چچی۔" وہ بتانے لگی۔

"صبوحی چچی یعنی آزین کی والدہ؟" سمیرا بہت غور سے صبوحی چچی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ "کیا بہت خوب صورت تھیں؟"

"بی بی اماں بتاتی ہیں کہ بہت پیاری تھیں، نازک سی۔"

"خیر ہمیں کیا، ان کی خوب صورتی سے۔" اس نے فریم زل کو پکڑایا۔

زل فریم رکھ کر مڑی تو وہ دونوں ہاتھ اپنے سوئیٹر کی جیبوں میں ڈالے آنکھیں تھوڑا سا میچے جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔

"سمیرا پلیز! کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں چائے تیار ہی ہوگی، لے کر آتی ہوں۔"

"ہاں!" وہ چونکی اور گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ "کھانا پھر کبھی سہی۔" اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ آزین کے ابا کا کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"ظفریاب!" زل اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آئی۔ اس کی آنکھوں میں یکدم چمک سی نمودار ہوئی۔ عجیب سی چمک......

"وہی نا جو سیاسی پارٹی کے بڑے سرگرم رکن تھے اور پھر برسر اقتدار پارٹی نے انہیں اٹھوالیا تھا۔"

اس نے ہاتھ جیب سے نکالا جس میں چند کاجو بے تھے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ اور نکال کر ایک منہ میں ڈالا۔ زل حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم تو تب بہت چھوٹی ہوگی۔ تمہیں کیسے پتا؟"

"دراصل ہمارے گھر میں میری مما اور ان کے بھائیوں کو، مطلب میرے ماماؤں کو سیاست سے کافی دلچسپی ہیں تو گھر میں ذکر ہوا تھا ایک دوبار......"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے باقی ماندہ کاجو ایک ساتھ منہ میں ڈالے اور پھر اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑی۔ باہر سارے میں پکوڑے تلنے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"لگتا ہے تمہاری بی بی اماں پکوڑے تل رہی ہیں۔ چلو ذرا جانے سے پہلے انہیں ہیلو ہائے کر لوں۔ کچن ادھر ہے نا؟" اس نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔

زل اثبات میں سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھی۔ بی بی اماں ٹرالی میں چائے کا سامان رکھ رہی تھیں۔

"اچھا بی بی اماں! اللہ حافظ!"

اس نے ٹرالی میں سجے کبابوں اور پکوڑوں پر نظر ڈالی۔

''اے لڑکی! کہاں جا رہی ہو۔ میں ذرا پکوڑے تلنے لگی تھی دیر ہو گئی چائے میں۔ ذہن میں ہی نہیں رہا تھا۔ صبح بیسن تیار کر کے فریج میں رکھا تھا، فریج سے دودھ نکالنے لگی تو دکھائی دے گیا۔ اب دو گھڑی رک جاؤ، کچھ کھا پی کر جانا۔''

بی بی اماں نے خالی پلیٹیں اور چٹنی کا پیالہ ٹرالی میں رکھا۔

''اب آنا جانا لگا ہی رہے گا بی بی اماں! آپ کی زمل کو دوست بنا لیا ہے میں نے۔'' اس نے پکوڑوں کی پلیٹ میں سے ایک پکوڑا اٹھا لیا اور کچن سے باہر نکل گئی۔ زمل اسے ڈیوڑھی کے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

''تمہارا گھر کافی بڑا ہے یونیک سا۔'' دروازے کے پاس رک کر اس نے صحن میں نظر دوڑائی۔

''ہاں دو پورشن اوپر نیچے ہیں۔'' زمل نے بتایا۔

''میرے دادا جان کے دادا نے بنوایا تھا۔ موروں والی حویلی کہتے ہیں اسے۔''

''کسی روز فرصت میں آ کر سارا گھر دیکھوں گی۔'' اس نے باقی کا بچا ہوا پکوڑا منہ میں ڈالا۔

''کیسے جاؤ گی، شام ہو رہی ہے۔ زین کو کہتی ہوں ٹیکسی لا دیتا ہے۔'' زمل کو فکر ہوئی تھی کہ جانے وین یا بس کے انتظار میں کتنی دیر ہو جائے۔

''تھینک یو زمل! گاڑی ہے یہ پیچھے جو مارکیٹ ہے اس کی پارکنگ میں ہے۔ میرا ڈرائیور اور گاڑی۔ خیر تم سے ملنا اور تم سے باتیں کرنا بہت اچھا لگا ہے مجھے۔ اگر مجھے بھی اپنے دوستوں میں شمار کرو گی تو اچھا لگے گا۔''
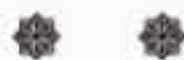
ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 9

''زمل!'' وہ بڑبڑائے، کچھ دیر الجھے الجھے سے کھڑے رہے۔ پھر آنکھیں سکیڑ کر بی اماں اور جہاں زیب بیگ کو دیکھا۔

''یہ آپ دونوں اتنے کمزور اور بوڑھے کیوں ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ ٹھیک سے کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ لڑکی!'' اب وہ زمل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔''

زمل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

وہ آزین کو بھی اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئے اور زمل کے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

''ابا اب مجھے بھی نہیں پہچانتے زین! یہ ڈاکٹر ارسلان کیسی دوائی دے رہے ہیں انہیں، پوچھو نا ان سے۔'' وہ رونے لگی تھی۔

بی بی اماں نے اسے ساتھ لگا لیا۔

زین ایک نظر اسے دیکھ کر شاہ زیب بیگ کو دیکھنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا کہ کہیں وہ باہر نہ نکل جائیں۔ شیخو بابا بھی نہیں تھے ڈیوڑھی میں۔ پھر انہیں اپنے کمرے میں جاتے دیکھ کر پلٹ آیا۔

زمل ابھی تک بی بی اماں کے گلے لگی رو رہی تھی اور بی بی اماں اس سے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

اختر بانو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔ امان پاس بیڈ پر بیٹھا تھا جب کہ ریحان اور شایان سامنے ہی روم چیئرز پر بیٹھے تھے۔ آج صبح ہی وہ گھر آئے تھے۔ اختر بانو کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ بروقت طبی امداد مل جانے سے ان کی طبیعت جلدی بحال ہوگئی تھی۔ تاہم ایک دن مزید انہیں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا۔ ریحان سائیڈ ٹیبل پر پڑی دوائیاں دیکھ رہا تھا۔

''اب یہ دوائی تو آپ کو مستقل استعمال کرنی ہوگی۔''

ریحان نے دوائیاں واپس میز پر رکھیں۔

''لیکن میں اب ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ وہ بھی ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر مستقل دوائی کیوں کھانی پڑے گی؟'' اختر بانو نے سوالیہ نظروں سے ریحان کو دیکھا۔

''ہارٹ پیشنٹ کو مستقل کھانی پڑتی ہے اماں جان اور امان!'' بات کرتے کرتے اس نے امان کو مخاطب کیا۔ ''یہ دھیان تمہیں رکھنا ہے اب کہ اماں جان باقاعدگی سے دوا لیں۔''

امان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جب تک میں یہاں ہوں میں خود خیال رکھوں گا۔ آپ بے فکر رہیں اور بعد میں بڑی امی کی روٹین بن جائے گی تو یہ خود ہی کھا لیا کریں گی جیسے میرے ماموں کھاتے ہیں۔''

شایان نے کہا تو اختر بانو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''تمہارے ماموں کیا ابھی تک دوائیں کھاتے ہیں؟''

کافی سال پہلے دلاور شاہ کو دل کی تکلیف ہوئی تھی۔

''ہوں! کھانی پڑتی ہیں، ریحان بھائی نے بتایا تو ہے، کیوں بھائی، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' شایان اب ریحان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ مہران چاچو کے ساتھ واپس نہیں گئے بھائی؟''

''دو تین روز تک اماں جان کی طبیعت کچھ بہتر ہو جائے تو انہیں ساتھ لے کر ہی کراچی جاؤں گا۔ وہاں کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو بھی دکھا لیں۔ مہران چچا کراچی جا کر اپائنٹمنٹ لے لیں گے۔''

"لیکن بیٹا! تم چلے جاتے، تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ تم نے پیپرز بھی تو دینے ہیں نا۔ میں اب بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" اختر بانو نے محبت پاش نظروں سے ریحان کو دیکھا۔

انہیں ہمیشہ یہ خیال اذیت دیتا تھا کہ ریحان اور نعمان ان سے دور دور رہتے ہیں۔ وہ اس طرح ان کے قریب نہیں ہیں جیسے بچے ماں کے قریب ہوتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے دکھ سکھ، اپنی خوشیاں، اپنے غم اختر بانو سے نہیں کہے تھے اور نہ ہی کبھی ان سے ان کے دکھ سکھ پوچھے تھے۔ رسمی سی ملاقات، رسمی سی بات......

ہر بار جب وہ حویلی سے ہو کر جاتے تو تشنگی بڑھ جاتی تھی لیکن جس طرح تین دن ریحان اماں کے ساتھ اسپتال میں ان کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا، اس نے ان کی وہ اذیت کم کر دی تھی۔

ریحان اور اماں تو اسپتال ہی میں رہے تھے جبکہ ثوبان شاہ اور شایان، بیدار بخت کے مہمان خانے میں ٹھہرے تھے۔ مہران شاہ کو ثوبان نے واپس بھجوا دیا تھا۔ جب تینوں بھائی تایا جان کے ڈیرے سے واپس آئے تو انہیں اختر بانو کا پتا چلا کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور فوراً ہی بچے انہیں بیدار بخت کے اسپتال میں لے گئے ہیں تو وہ بھی فوراً ہی ان کے پیچھے اسپتال پہنچ گئے تھے۔

"پیپرز کا کوئی ایشو نہیں ہے اماں جان! جب میری تیاری ہو گی تو میں تب ہی اپلائی کروں گا اور امتحان کی تاریخ مل جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ریحان نے تسلی دی۔ "آپ کا ایک بار مکمل چیک اپ بہت ضروری ہے۔ یہاں بھی ڈاکٹر بہت اچھے تھے پھر بھی اپنی تسلی کے لیے میں آپ کو کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

ریحان جدید سہولتوں سے آراستہ اس ہاسپٹل کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ رات کے وقت وہاں ایک ڈاکٹر موجود تھا فوراً ہی ای سی جی ہو گئی۔ آکسیجن لگ گئی۔ ایک اور ڈاکٹر کو بھی (رائے) کے لیے بلوالیا گیا۔ جس کی رہائش ہاسپٹل میں ہی تھی۔ باہر سے آنے والے ڈاکٹروں کے لیے رہائشی بلڈنگز ہاسپٹل کے اندر ہی بنائی گئی تھیں۔

بیدار بخت نے بہترین سیلری اور دوسری سہولتوں کے ساتھ دوسرے شہروں سے ڈاکٹر ہائر کیے

تھے۔ ریحان بہت حیران ہوا تھا اس علاقے میں یہ ہاسپٹل دیکھ کر۔ امان اور ثوبان شاہ تو آتے رہتے تھے ادھر لیکن ریحان پہلی بار آیا تھا اور شایان دوسری بار اور دونوں نے سوچا تھا کہ اگر لوگ بیدار بخت کو پسند کرتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کرتے۔

دلاور شاہ یا تایا جان نے سیٹ جیتنے کے باوجود کبھی علاقے کی بہتری کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

''آپ کو اگر ضروری جانا ہے تو آپ چلے جائیں بھائی، پڑھائی کا حرج نہ کریں۔ جب بڑی امی کی طبیعت ٹھیک ہوگی تو میں اور مانی انہیں کراچی لے آئیں گے ویسے تو حیدر آباد میں بھی آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے دوست کے والد ہیں۔''

شایان نے ریحان کی طرف ذرا سا رخ موڑا تب ہی نیم وا دروازے سے ثوبان شاہ شایان کی بات سنتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''بھئی آپ تینوں فکر نہ کریں میں اپنی بیگم کو خود کراچی لے کر آؤں گا۔''

اختر بانو یکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ یہ لہجہ، یہ التفات، کتنے برسوں بعد سماعتوں میں پڑا اور دل نے محسوس کیا تھا۔

اندر کہیں نمی سی پھیلی تھی۔

''تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا اختر بانو! اچانک کیا ہو گیا تھا؟ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے۔ واپس آئے تو گیٹ پر ہی بخشو نے بتایا تو دل ڈوبنے لگا تھا۔''

اسپتال میں تو وہ تفصیل نہیں پوچھ سکے تھے سو اب پوچھ رہے تھے کہ پتا نہیں کیوں انہیں گمان گزرا تھا کہ شاید شایان نے پھر کوئی بات کر دی ہو ایسی حماقت کی جیسے پہلے کی تھی سو شایان پر ایک نظر ڈال کر پھر اختر بانو کی طرف دیکھنے لگے تھے جو اختر بانو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''پتا نہیں اٹھی تھی تو اچانک چکر آیا اور گر گئی۔ شاید بی پی لو ہو گیا تھا۔ پلنگ کی پٹی گرتے ہوئے لگی تو شاید اسی لیے حواس جاتے رہے۔''

شایان نے ایک تشکر بھرا سانس لیا اور ممنون نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا۔ اسے ثمرہ پر

غصہ تھا لیکن اندر سے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ثوبان شاہ کو ثمرہ کے متعلق پتا چلے اور ثوبان کی نظروں میں ان کا مقام گرے۔ بہر حال وہ اس کی ماں تھیں۔

اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اختر بانو بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں تو وہ بھی مسکرا دیا۔ ثوبان شاہ ابھی تک کھڑے تھے اور ان کی نظریں اختر بانو پر تھیں۔

''وہاں ہاسپٹل میں تمہیں آکسیجن لگے دیکھ کر مجھے لگا تھا جیسے ہم تمہیں کھونے والے ہیں۔ اب ایسے نہ کرنا، تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے، ہم میں۔''

اور اختر بانو کا من بھیگنے لگا تھا۔

''بابا جان! ادھر آ جائیں۔'' ریحان اٹھا تو انہوں نے کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب کی۔

''اور یہ مانی...... اس کی حالت تو بری ہو رہی تھی۔'' انہوں نے امان کی طرف اشارہ کیا جو ریحان کے باہر نکل جانے کے بعد خود بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''لگتا تھا اسے کچھ ہو جائے گا اگر تمہیں کچھ ہوا تو......''

امان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آپ بابا جان سے گپ لگائیں۔ ہم ابھی آتے ہیں پھر......''

وہ جانتا تھا ان دوریوں کو جو بابا جان اور اماں جان میں تھیں۔ اور کیا خبر اماں جان کی یہ بیماری ان دوریوں کو ختم کرنے کی وجہ بن جائے کہ اسے محسوس ہوا تھا کہ ثوبان شاہ اپنے گزشتہ رویے پر پشیمان سے ہیں۔ سو وہ شایان کو ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر آیا، باہر آتے آتے اس نے سنا، اختر بانو ثوبان شاہ سے پوچھ رہی تھیں۔

''آپ کو تو حیدر آباد جانا تھا۔ ثمینہ بھابھی بتا رہی تھیں کہ تایا جان کی طبیعت خراب ہے، آپ اور ثمرہ آپا جا رہے ہیں تایا جان کی مزاج پرسی کے لیے......''

''میں نہیں جا رہا۔ شانی چلا جائے گا ثمرہ کے ساتھ۔ میرے لیے اس وقت تمہاری بیماری زیادہ پریشان کن ہے۔''

امان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہوگئی تھی۔

اس نے اپنے ہوش میں پہلی بار ثوبان شاہ کو اختر بانو کے لیے پریشان ہوتے دیکھا تھا۔ ورنہ اماں جان کتنی بھی بیمار ہوتیں، ثوبان شاہ کو پروا نہیں ہوتی تھی۔

ریحان لیونگ میں بیٹھا اختر بانو کی ہاسپٹل سے ملنے والی فائل دیکھ رہا تھا۔

''تو تم حیدر آباد جا رہے ہو چھوٹی امی کے ساتھ......؟'' ریحان کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے شایان کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں......'' اس نے کندھے اچکائے۔

اس کا ارادہ نہیں تھا حیدر آباد جانے کا اور نہ ہی ابھی ثمرہ نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

''ہوسکتا ہے ان کا ارادہ بدل چکا ہو۔'' اس نے سوچا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے ثمرہ کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور سامنے ہی ثمرہ بیڈ پر بیٹھی بیگ میں کپڑے تہ کر کے رکھ رہی تھیں۔

ان کی عادت تھی کہ جب انہیں کچھ سن گن لینی ہوتی تو دروازہ کھلا رکھتیں تاکہ باہر ہونے والی سرگرمی کی خبر ہوتی رہے۔ جوں ہی شایان نے کمرے میں قدم رکھا بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا۔

''آ گئے اپنی بڑی امی کی خدمتیں کر کے۔''

''آپ بھول رہی ہیں امی جان کہ ان کی خدمت کے لیے ان کے دو جوان بیٹے موجود ہیں۔'' وہ بھی شایان تھا۔ دل میں آئی بات دل میں نہیں رکھتا تھا۔ ''اور اس وقت تو ان کے شوہر نامدار بھی ان کی خدمت کے لیے وہاں موجود ہیں۔''

بیگ کی زپ بند کرتے کرتے ان کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے رکے۔ دل کا خوف آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

''اور وہ تمہاری بڑی امی خوب جھوٹی سچی شکایتیں لگا رہی ہوں گی، میں نے تو سچی بات کی تھی، اب مجھے کیا خبر تھی کہ سچی بات برداشت نہیں ہوگی اور بے ہوش ہو جائے گی۔''

شایان دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بابا جان کہتے ہیں کہ بڑی امی بڑے ظرف اور بڑے دل والی ہیں اور وہ غلط نہیں کہتے۔ سو مطمئن رہیں انہوں نے آپ کی کوئی شکایت نہیں لگائی بلکہ کہا ہے کہ چکر آنے سے گر گئی تھیں۔"

ثمرہ نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔

"سو اگر آپ اس ڈر سے جا رہی ہیں کہ بابا جان آپ پر خفا ہوں گے تو نہ جائیں۔"

"ڈرتی ہے میری جوتی!" ثمرہ نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا۔ "وہ تو ابا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ رات بڑی بھرجائی (بھابھی) کا فون آیا تھا کہ اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔" وہ فوراً ہی آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھیں۔

انہیں یہ کمال حاصل تھا کہ آنکھوں میں فوراً ہی آنسو لے آتیں اور اسی کمال نے ثوبان شاہ کو ہولے ہولے اختر بانو سے دور کیا تھا۔

"اگر تم نے نہیں جانا تو نہ جاؤ، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" جانتی تھیں کہ ان کے خاندان کی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ اکیلے کہیں نہیں جاتی تھیں۔

لیکن شایان کے پاس بھی حل موجود تھا۔

"بھاگی یا منیرا کو ساتھ لے جائیں۔"

"تم نے نہیں جانا نہ جاؤ، میری فکر مت کرو چلی جاؤں گی کسی کے ساتھ بھی۔ تمہیں ساتھ لے کر جانے کے لیے تمہارے بابا جان نے ہی کہا تھا کہ ان کی بیگم کو دل کا دورہ جو پڑا تھا تو اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھنا تھا۔ بہت فکر ہو رہی تھی اس کی۔" ثمرہ نے بیگ بیڈ سے اٹھا کر نیچے رکھا۔

شایان نے ایک ناگوار نظر ان پر ڈالی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ بابا بڑی امی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتے میں نے تو آج تک انہیں بڑی امی کی فکر کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں آپ کو فلو بھی ہو جائے تو ان کی جان پر بن آتی ہے۔ آپ اصرار کرتیں ساتھ چلنے پر تو انہوں نے انکار نہیں کرنا تھا۔"

دل ہی دل میں مغرور ہوتے ہوئے ثمرہ مسکرائیں۔

''یہ تو ہے۔ میں اصرار کرتی تو چلے جاتے۔ لیکن میں نے اصرار نہیں کیا کہ تم اپنی خالہ اور گل رعنا سے بھی مل لو گے۔ تمہاری خالہ بھی تمہیں یاد کر رہی تھیں، رات بھر جائی نے بات کروائی تھی اس سے۔''

''اچھا!'' وہ چونکا۔ ''خالہ اور گل رعنا کب آئیں حیدر آباد؟''

''دو دن ہو گئے ہیں شاید۔''

ثمرہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ جانتی تھیں کہ گل رعنا کے آنے کا سن کر وہ رہ نہیں سکے گا کہ اس کے دل کا حال جانتی تھیں اور ایسا ہی تھا۔ شایان اب حیدر آباد جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چھ ماہ سے تو زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اسے گل رعنا سے ملے تو دل بے اختیار اسے دیکھنے کو چاہنے لگا تھا کہ بچپن سے ہی ثمرہ نے اسے باور کروا دیا تھا کہ گل رعنا اس کی منگ ہے اور پھر وہ تھی بھی بہت خوب صورت اور اس سے انسیت یا محبت ہو جانا فطری بات تھی۔

وہ خود بہت کم کراچی جاتا تھا البتہ چھ سات ماہ بعد خالہ اور گل رعنا کا چکر حیدر آباد لگتا تو اس کی بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔

''جانا کب ہے؟''

''جب تم تیار ہو جاؤ، نکل چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہو کر آپ کو بتاتا ہوں۔''

اب گل رعنا بھی آئی ہوئی تھی تو دو تین دن تو ٹھہرے گا ہی بلکہ جب تک اس کا پروگرام ہوا حیدر آباد رہنے کا وہ بھی ادھر ہی رہ جائے گا۔

ثمرہ نے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھیں کہ گل رعنا کا سن کر وہ جانے سے انکار نہیں کرے گا۔ وہاں جا کر اختر بانو سے ہمدردی کا بخار اتر جائے گا تب ہی انہوں نے خود ثوبان شاہ سے کہا تھا کہ وہ شانی کے ساتھ چلی جائیں گی۔

ثوبان شاہ نے کہا بھی تھا کہ وہ تایا جان کی مزاج پرسی بھی کر لیں گے اور انہیں چھوڑ کر واپس آ

جائیں گے انہوں نے جب تک رہنا ہو رہ لیں۔

شایان کمرے سے باہر نکلا تو ریحان اور امان ابھی تک لیونگ میں ہی بیٹھے اور موضوع گفتگو بیدار بخت کا علاقہ اور اس کی ترقی تھی۔

''یار! میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ تمہارے ماموؤں کو سپورٹ کرنے کے بجائے اس بار بیدار بخت کو سپورٹ کروں۔'' ریحان نے اپنے قریب آتے شایان کی طرف دیکھا۔

''ضرور...... آدمی کو آزادی رائے کا حق ہونا چاہیے۔ ویسے آپ کے یہ روشن خیالات میں نانا جان اور دلاور ماموں تک پہنچادوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی تو امان نے ذرا سا ہاتھ بلند کیا۔

''نہ نہ ایسا نہ کرنا، تمہارے نانا جان ہماری سات پشتوں کو بھی معاف نہیں کریں گے۔'' امان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو شایان ہنس دیا۔

''چلو نہیں بتاتا کیا یاد کرو گے۔'' اس سے پہلے وہ امان سے اتنا بے تکلف بھی نہیں رہا تھا۔ یہ بے تکلفی لاہور قیام کے دوران ہوئی تھی۔

''حیدرآباد کب جانا ہے؟'' ریحان نے پوچھا۔

''کچھ دیر تک نکلوں گا۔ بڑی امی کی فکر رہے گی۔ بھائی کراچی جانے سے پہلے مجھے فون ضرور کیجیے گا۔''

ریحان کو اختر بانو کے لیے اس کا فکر مند ہونا اچھا لگا تھا۔ آج سے پہلے تک وہ اسے خود پسند اور مغرور سمجھتا تھا۔ دلاور شاہ اور ان کے بیٹوں کی طرح......

''میرا خیال ہے ابھی اماں جان کو سفر نہیں کرنا چاہیے۔ اگلے سنڈے تک نکلیں گے تم اطمینان سے چھ سات دن وہاں رہ لو۔''

''تین چار دن رہنے کا پروگرام ہے۔ امید ہے میری واپسی تک آپ ادھر ہی ہوں گے۔''

''ہاں ان شاء اللہ!'' ریحان مسکرایا۔ ''بے فکر ہو کر جاؤ۔''

اور وہ مطمئن سا تیار ہونے چل دیا۔ دراصل وہ کراچی جانے سے پہلے اختر بانو کا شکریہ ادا کرنا

چاہتا تھا اور ثمرہ کی طرف سے معافی بھی مانگنا چاہتا تھا۔ جس کا موقع اسے اب تک نہیں مل سکا تھا کہ جب سے وہ ہاسپٹل سے آئی تھیں کوئی نہ کوئی ان کے پاس تھا اور وہ اکیلے میں ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔ خیر حیدر آباد سے واپس آ کر بات کرلوں گا۔

وہ مطمئن ہوا تو گل رعنا کے متعلق سوچنے لگا اور گل رعنا کے متعلق سوچتے ہوئے خود بخود ہی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس مسکراہٹ نے ثمرہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ گل رعنا کی موجودگی میں چند دن حیدر آباد رہ کر آئے گا تو اختر بانو کی بیماری اور بے ہوشی کا خیال اس کے ذہن سے نکل چکا ہوگا۔ ان کے خیال میں وہ لاپروا اور لاابالی سا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ اگر کوئی بات اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی تو نکلتی نہیں تھی۔ ثمرہ کا یقین بھی اس وقت ٹوٹ گیا، جب چار دن حیدر آباد رہ کر واپس آئے تو گاڑی سے اترتے ہی پورچ میں ثوبان شاہ کی گاڑی اور امان کی جیپ نہ پا کر پریشان سا ہو کر اس نے وہاں ہی بخشو سے کوئی بات کرتی منیرا سے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ بابا کہاں گئے ہیں۔ بڑی امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا، وہ کراچی تو نہیں چلے گئے۔''

ثمرہ کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑے۔

''جی بڑی بی بی تو آج ٹھیک ہیں۔ پرسوں رات کو تھوڑی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اور شاہ جی ڈیرے پر گئے ہیں۔ اور امان بھائی پتا نہیں کہاں گئے ہیں۔ بڑی بی بی جی لیونگ میں ہیں ریحان صاحب کے ساتھ۔''

امان شاہ نے سب سے کہہ رکھا تھا کہ اسے صاحب جی بلانے کے بجائے امان بھائی بلایا کریں۔

''اوہ! میں تو بابا کی گاڑی نہ دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا کہ بڑی امی کی طبیعت اچانک زیادہ خراب نہ ہوگئی ہو۔''

اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے شایان نے ثمرہ کی طرف دیکھا، وہ اسے نظرانداز کر کے منیرا کو سامان اندر لانے کا کہہ کر تیز تیز چلتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ سر کو ہولے سے جھٹک کر شایان بھی ان کے پیچھے ہی اندر کی طرف بڑھا اور ثمرہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا لیونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

سامنے ہی صوفے پر اختر بانو بیٹھی تھیں اور ان کے پاس ہی ریحان بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

''السلام علیکم بڑی امی!'' وہ ان کی طرف بڑھا۔

''وعلیکم السلام! آپ لوگ آ گئے ہیں۔'' اختر بانو نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تایا جان کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور سیاسی جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔

جیسا کہ اس کا خیال تھا وہ کچھ ایسے سیریس بیمار نہ تھے۔ وہ لوگ جب حیدر آباد پہنچے تو وہ گھر پر ہی نہ تھے۔ بڑی مامی سے پتا چلا تھا کہ کسی پارٹی ممبر سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔

''ہوا کیا تھا اچانک؟'' اختر بانو اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

''کچھ نہیں بس بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ کھانے پینے میں احتیاط نہیں کرتے، خوب مرچ مسالے والے کھانے کھاتے ہیں حالانکہ ڈاکٹر نے نمک وغیرہ منع کر رکھا ہے۔ مامی بتا رہی تھیں کہ دوا بھی باقاعدگی سے نہیں لیتے اور پرہیز بھی نہیں کرتے تو اکثر بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔''

''بی پی کا ہائی ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے شایان...... تمہارے نانا جان کو احتیاط کرنی چاہیے۔'' ریحان نے کتاب بند کر کے صوفے پر رکھی۔

''جب بی پی ہائی ہوتا ہے تو خوب واویلا کرتے ہیں کہ بس اب ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔'' شایان مسکرایا۔

''ایسا ہی محسوس ہوتا ہے بھائی۔ بندے کو اتنی گھبراہٹ اور بے چینی ہوتی ہے کہ دیوار سے سر ٹکرانے اور رونے کو جی چاہتا ہے۔'' ریحان اٹھا۔ ''تم اماں جان سے باتیں کرو، مجھے کراچی ضروری فون کرنا ہے، آتا ہوں ابھی۔''

''منیر ا بتا رہی تھی دو دن پہلے آپ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔'' ریحان کے جانے کے بعد وہ اختر بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کیا ہوا تھا۔ بی پی کا کوئی پرابلم تھا؟''

''نہیں، بی پی کا مسئلہ تو نہیں تھا بس ایک خواب دیکھا تھا جس سے آنکھ کھلنے پر سخت گھبراہٹ

ہونے لگی تھی۔ تو ریحان پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں پھر تو انجائنا کا اٹیک نہیں ہو گیا۔''

خواب کا منظر یاد کرتے ہی اختر بانو نے جھرجھری سی لی۔

''کیا کوئی خوف ناک خواب تھا بڑی امی! کوئی جن بھوت تو نہیں دیکھ لیا تھا۔'' شایان مسکرایا۔

''میں بچپن میں ڈراؤنے خواب بہت دیکھتا تھا جیسے کسی جادوگر نے پکڑ لیا ہے اور میری گردن مروڑ رہا ہے یا پھر کوئی جن مجھے اڑا کر لے جا رہا ہے اور پھر کسی کھائی میں پھینک دیتا ہے۔''

''خوف ناک ہی سمجھ لو بیٹا!'' اختر بانو لمحہ بھر اسے دیکھتی رہیں۔ پھر ہولے سے بولیں۔

''تمہارے متعلق خواب دیکھا تھا کہ تم سڑک پر چل رہے ہو اور کہیں سے ایک موٹر سائیکل آتی ہے اور تمہیں ٹکر مار کر چلی جاتی ہے، تم گر جاتے ہو اور سڑک پر خون پھیلتا جا رہا ہے۔ بس میری آنکھ کھل گئی۔ دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور سارا جسم پسینے میں ڈوب رہا تھا۔ تمہارے بابا گھبرا کر ریحان کو اٹھا لائے تھے۔ شکر اللہ کا تم ٹھیک ہو بالکل، میں بہت ڈر گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی اللہ بخش کو بلوا کر صدقہ دیا تب ذرا دل کو چین آیا ورنہ بہت گھبراہٹ تھی۔ ریحان تو کہتا تھا ابھی چلتے ہیں کراچی لیکن میں نے منع کر دیا۔''

شایان جیسے سن سا بیٹھا تھا۔

رضی کو ہیوی بائیک کا شوق تھا اور وہ جب بھی حیدرآباد جاتا تو ایک دو بار تو وہ ضرور اس کی بائیک پر حیدرآباد کے گلی کوچوں کا چکر لگاتے تھے اور یہ کل دوپہر کی بات تھی وہ اس کے ساتھ اس کی نئی بائیک پر گھوم رہا تھا کہ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے رضی دائیں طرف کی گلی سے آنے والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی بائیک سے ٹکرایا۔

ٹکراؤ تو بہت شدت کا تھا لیکن بچت ہو گئی تھی۔ وہ دونوں نیچے دائیں طرف گرے تھے اور بائیک تقریباً ان کے اوپر ہی گر گئی تھی۔ اس کے بازو اور دائیں ٹانگ پر خراشیں آئی تھیں جب کہ رضوان کے پاؤں میں کافی چوٹ لگی تھی۔ ایکسرے سے پتا چلا کہ فریکچر ہے۔ ٹخنے کی ہڈی میں ہلکی سی لکیر تھی جبکہ دوسری بائیک والے لڑکے کی کنپٹی پر اور سر پر زخم آیا تھا۔

''تو کیا بڑی امی کے دیے گئے صدقے نے اس کی بلا ٹال دی تھی؟''

لیکن بڑی امی کے ساتھ اس کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا پھر بڑی امی کا اس کے متعلق خواب دیکھنا اسے حیران کر رہا تھا۔

''کمال ہے بڑی امی! آپ کا خواب تھوڑا سچ ہی تھا۔ کل دوپہر کو ہماری بائیک الٹ گئی تھی، میں اور رضی گر گئے تھے لیکن بچت ہی رہی۔ شاید آپ کا دیا صدقہ کام آ گیا۔''

''اللہ ہمیشہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔'' بے اختیار ہی اختر بانو کے لبوں سے نکلا تھا۔ دل کی دھڑکن اس کے گرنے کا سن کر کچھ دیر کو بے ترتیب سی ہوئی لیکن انہوں نے دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

''تمہارے بابا بتا رہے تھے کہ تمہاری خالہ اور گل رعنا بھی آئی ہوئی ہیں حیدر آباد۔''

''ہاں وہ دو دن پہلے ہی آئی تھیں۔''

شایان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیسی تھی گل؟'' اختر بانو کو پتا تھا کہ بچپن سے ہی ثمرہ نے گل رعنا کے ساتھ اس کا رشتہ طے کر رکھا ہے۔

''پہلے جیسی ہی، تھوڑی نخریلی سی۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

دونوں کو کم عمری سے پتا تھا کہ دونوں کے درمیان کیا رشتہ ہے کہ دونوں کی مائیں وقتاً فوقتاً ان کے سامنے ذکر کرتی رہتی تھیں کہ دونوں بہنوں نے آپس میں کیا طے کر رکھا ہے۔ کم عمری میں تو خیر اس رشتے کی نزاکت کا احساس نہ تھا لیکن باشعور ہونے اور احساس ہونے کے بعد بھی دونوں کے درمیان اس رشتے کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بس وہی رسمی سی باتیں جو باقی کزنز سے ہوتی تھیں۔

کیا حال ہے، کیسی ہو، کیا مصروفیت ہے وغیرہ وغیرہ......

لیکن اس بار حیدر آباد جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ گل رعنا کو بتائے گا کہ اس کے لیے وہ کتنی اہم ہے۔ اور یہ کہ وہ کتنی خوب صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار رضی نے اس سے کہا تھا۔

''یہ جولڑکیاں ہوتی ہیں، یہ چاہتی ہیں کہ ان کے منگیتران کی تعریف کریں اور کبھی کبھی اپنی محبت کا اظہار بھی کریں۔''

دراصل اس کی ایک گرل فرینڈ تھی۔ رانگ نمبر پر ہی دوستی ہوئی تھی اس کی، وہ ہمیشہ رضی سے کہتی رہتی تھی کہ اس کا کزن پلس منگیتر انتہائی خشک مزاج اور بے حس ہے۔ چار سال منگنی کو ہو چکے کبھی میری تعریف نہیں کی۔ چلو تعریف نہ سہی، اتنا ہی کہہ دے کہ میں اس منگنی سے بہت خوش ہوں لیکن اس نے تو ایک بار بھی ان چار سالوں میں ایسی بات نہیں کی جس سے وہ سمجھتی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ کہتی تھی کہ وہ ایسے کھڑوس بندے سے کبھی شادی نہیں کرے گی اور اس نے ایسے ہی کیا تھا، منگنی توڑ دی تھی۔

''بھلا کوئی اتنی سی بات پر بھی منگنی توڑتا ہے؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''لڑکیوں کے لیے یہ اتنی سی بات نہیں ہوتی یار!'' رضی ہنسا تھا۔

اس کے یہ دونوں ماموں زاد بھائی ہادی اور رضی عمر میں اس سے بڑے تھے لیکن اس کی ان کے ساتھ کافی بے تکلفی اور دوستی تھی۔ جب وہ تعلیم کے سلسلے میں حیدر آباد میں رہ رہا تھا تب سے ہی یہ بے تکلفی اور دوستی چلی آ رہی تھی۔ ہادی اور رضی دونوں ہی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ہادی اور رضی میں چند ماہ کا ہی فرق تھا سو ان دونوں میں بھی گہری دوستی تھی۔ ہادی بڑے ماموں کا اور رضی چھوٹے ماموں کا بیٹا تھا۔

''تم بھی کبھی کبھار گل رعنا کو بتاتے رہا کرو کہ تم اس رشتے سے خوش ہو۔'' وہ اپنے خاندان کی بیٹی تھی، اس لیے ہادی نے بہت سوچ سمجھ کر الفاظ کا انتخاب کیا تھا۔

اور تب سے ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اس بار جب اس کی گل رعنا سے ملاقات ہوئی تو وہ ضرور اس سے کچھ نہ کچھ کہے گا۔ لیکن کیا کہے، یہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ جو لفظوں کا کھلاڑی تھا نہ جانے کتنی ہی لڑکیوں کو اپنے خوب صورت لفظوں کے جال میں پھنسا چکا تھا، اب الجھ رہا تھا کہ بھلا وہ کیا کہے گل رعنا سے۔

''میری نظروں نے تو ہمیشہ ہی اسے بتایا ہے کہ وہ مجھے پسند ہے اور وہ بھی جانتی ہے پھر اب زبان سے کیا ضروری ہے؟''

حیدر آباد آئے ہوئے اسے دو دن ہو گئے تھے۔ پہلے روز بس رسمی بات ہوئی تھی۔

کھانے کی ٹیبل پر دو تین بار نظروں کا تبادلہ بھی ہوا تھا اور وہ لبوں پر مسکان سجائے اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی۔ لیکن دوسرے دن وہ اسے ٹیرس پر دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر پاؤں رکھے دوسری کرسی کی پشت پر سر ٹکائے اوپر آسمان پر اڑتے ہوئے سفید کونجوں کے جھنڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے کھنکارا تو اس نے چونک کر پاؤں نیچے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''کیسی ہو گل؟''

''فائن......اور آپ کیسے ہیں؟''

''میں بھی فائن!'' وہ مسکرایا۔

''جانتی ہو، کتنے ماہ بعد چکر لگایا ہے تم نے ادھر کا۔''

''چھ ماہ اٹھارہ دن بعد......'' بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر وہ خود ہی محجوب سی ہو گئی تھی۔ نظریں جھک گئی تھیں۔

''یعنی تم بھی حساب رکھتی ہو۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں گل۔'' وہ بے اختیار کہہ گیا تھا۔

''اور کیا میں......میں خوب صورت نہیں ہوں۔'' اس بار بھی بے ساختہ لبوں سے نکلا تھا۔

''تم!'' وہ ہولے سے ہنسا۔

رضی صحیح ہی کہتا تھا کہ لڑکیوں کو چاہ ہوتی ہے کہ ان کے فیانسی، ان کی تعریف کریں چاہے ایک چھوٹا سا جملہ ہی کیوں نہ کہیں......

''تم بہت خوب صورت ہو گل، قوس قزح جیسی ہفت رنگ جب میرے دل میں لہراؤ گی تو میری چمک سوا ہو جائے گی۔ میرے گھر میں اترو گی تو اپنی خوشبو سے میرا گھر ہی نہیں، دل بھی مہکا دو گی۔''

گل رعنا کی پلکیں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر شفق پھوٹ پڑی تھی۔
اس نے دلچسپی سے اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھا۔
''اب تم بھی تو کچھ کہونا۔''
''کیا کہوں؟'' اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائی تھیں اور پھر گرالی تھیں۔
''یہ ہی کہہ دو کہ شایان ثوبان شاہ تم بہت اچھے ہو اور میں تمہارے ساتھ جڑے اس رشتے سے بہت خوش ہوں۔''
''یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے، کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' اس کے رخساروں سے پھوٹتی شفق گہری ہوئی تھی۔
''کیوں کیا کوئی غلط بات کر دی ہے میں نے۔'' وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
''نہیں، لیکن پہلے تو آپ نے اس طرح کی بات کبھی نہیں کی۔''
''تو اب ہم بڑے ہو گئے ہیں نا تو میں نے سوچا تمہیں بتا دوں کہ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ سانس کی طرح ضروری ہو۔''
چند لمحے وہ یوں ہی سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتی رہی پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔
''خالہ بتا رہی تھیں کہ آپ پڑھنے کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟ پڑھائی تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔''
اور وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔
''لگتا ہے امی جان نے اپنا ٹاسک تمہارے حوالے کیا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' اس نے حیران آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔
''کچھ نہیں...... اور میں لاہور جا کر اس لیے پڑھنا چاہتا ہوں کہ میرا وہاں جا کر پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ تم بتاؤ تم لوگ کب تک یہاں رہو گے؟'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔
''ہم بس تین چار دن کے لیے ہی آئے ہیں۔ نانو بہت اداس ہو رہی تھیں ماما کے لیے۔ انہوں

نے فون کیا تھا کہ چند دن کے لیے آ کر مل جاؤ۔ پاپا کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی، فلو ہو رہا تھا انہیں اور پھر انہوں نے بھایان کی گریجویشن کی تقریب میں شرکت کے لیے مانچسٹر جانا تھا تو ہمارا پروگرام تھا، جب وہ جائیں گے تو ہم تب دس پندرہ دن آ کر رہیں گے ادھر لیکن پھر نانو کی وجہ سے آنا پڑا۔"

وہ اپنے بڑے بھائی کو جو مانچسٹر میں پڑھ رہا تھا بھایان کہتی تھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے، تب میں بھی آ جاؤں گا حیدر آباد۔" وہ خوش ہوا تھا۔

"لیکن آپ تو تب لاہور جا چکے ہوں گے۔ ایسا کریں آپ کراچی میں ہی ایڈمیشن لے لیں۔ آپ کراچی میں ہوں گے تو پھر آپ کو شکوہ بھی نہیں ہوگا کہ چھ چھ ماہ بعد ملاقات ہوتی ہے۔ پھر روز ہی مل سکتے ہیں آپ۔"

وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یقیناً امی نے اسے اچھی طرح فیڈ کیا ہوگا کہ شایان کو کسی طرح لاہور جانے سے روک لو۔

"یہ امی بھی...... نا جانے انہیں میرے لاہور جانے سے کیا مسئلہ ہے۔"

دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے گل رعنا کی طرف دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب اس طرح دیکھو گی تو لاہور تو کیا، جنت میں بھی نہیں جاؤں گا۔" وہ شوخ ہوا تھا۔ "ویسے ایک اور آپشن بھی ہو سکتا ہے۔ دن رات ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"وہ کیا......؟" اس کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں۔

"تمہاری رخصتی کروا لوں تو پھر دن رات......"

"نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ "ابھی تو پہلے بھایان اور پھر بھائی جی کی شادی ہے۔" اور تب ہی ملازمہ نے ٹیرس کا دروازہ کھولا تھا۔

"شایان صاحب کو ہادی صاحب مردانے میں بلا رہے ہیں۔"

"اچھا آ رہا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو شایان......؟" اختر بانو نے پوچھا تو وہ چونکا۔

"کچھ نہیں...... یہ بابا اور امان کہاں گئے ہیں اس وقت؟"

"امان تو کسی دوست کی طرف گیا ہے ساتھ والے گوٹھ میں اور تمہارے بابا ڈیرے پر گئے ہیں۔ ادھر سے بندہ آیا تھا بتانے کہ چراغ سائیں اور تایا جان کے ڈیرے کے کسی ملازم کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ چراغ سائیں کا سر پھٹ گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ پہلے چراغ سائیں نے ہی اسے پتھر مارا تھا جو اسے نہیں لگا تھا پھر وہی پتھر اٹھا کر اس نے چراغ سائیں کو مار دیا تو اس کا سر پھٹ گیا۔ تمہارے بابا نے اسے ڈسپنسری لے کر جانا تھا۔"

انہوں نے بات مکمل کر کے منیرا کی طرف دیکھا جو جوس لے کر آئی تھی۔

منیرا نے ٹرے کافی ٹیبل پر رکھی اور پلیٹ میں جوس کا گلاس رکھ کر شایان کو دیا۔

"زمان چچا کیا نہیں تھے ڈیرے پر؟" شایان نے گلاس اٹھایا۔

"زمان بھائی کو تو بھابی کے ساتھ کراچی جانا تھا، وہ کل چلے گئے تھے۔"

"بابا چراغ سائیں کو کسی پاگل خانے میں کیوں نہیں بھیج دیتے بڑی امی! کسی دن کوئی بڑا نقصان کر بیٹھا تو......" شایان نے جوس کا گھونٹ بھرا۔

"نہیں، وہ پاگل نہیں ہے بیٹا۔ بیٹی کا غم برداشت نہیں ہو رہا اس سے چونکہ لاش بھی ادھر تایا جان کے ڈیرے کے پچھلے طرف والے کھیتوں سے ملی تھی تو ڈیرے کے لوگوں کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اللہ ظالموں کی پکڑ ضرور کرے گا اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔" اختر بانو نے منیرا کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیا۔

"ثمرہ آپا اپنے کمرے میں ہوں گی۔ انہیں وہاں ہی جوس دے آؤ اور چائے کا بھی پوچھ لینا۔"

"وہ تو میں دے آئی تھی انہیں، یہ تو ریحان صاحب کے لیے لائی تھی اور چائے کا بھی پوچھ لیا تھا۔ بھاگی بنا رہی ہے۔"

منیرا اختر بانو کو بتا کر کچھ سوچتی ہوئی باہر چلی گئی تھی تو شایان نے جوس پی کر خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اور اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''بڑی امی! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔''

''کس بات کا شکریہ؟'' اختر بانو کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''آپ نے بابا کو امی کے متعلق نہیں بتایا کہ انہوں نے آپ سے زیادتی کی۔ اور مجھے آپ سے امی کی طرف سے معافی بھی مانگنی ہے۔ انہیں دراصل مجھ پر کسی بات کا غصہ تھا تو وہ آپ پر اتارا انہوں نے، ورنہ دل کی بری نہیں ہیں وہ۔''

شایان چاہتا تھا کہ بڑی امی کا دل اس کی امی کی طرف سے صاف ہو جائے۔

''میں نے ثمرہ آپا کی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ میری طبیعت ویسے ہی خراب تھی اور شکریے کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہماری اماں جان کہتی تھیں کہ گھر کی عورتوں کو چھوٹی چھوٹی باتیں مردوں کے کانوں میں نہیں ڈالنی چاہئیں۔ وہ خود تو بھول جاتی ہیں لیکن مردوں کے دلوں میں گرہ پڑ جاتی ہے اور گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ پھر ایسا کیا کہہ دیا تھا ثمرہ آپا نے جو میں تمہارے بابا سے شکایت لگاتی۔'' وہ مسکرائیں تاکہ شایان کا احساس ندامت کم ہو۔

''بابا صحیح کہتے ہیں کہ آپ بڑے ظرف اور بڑے دل کی مالک ہیں۔'' بے اختیار ہی شایان کے لبوں سے نکلا اور اختر بانو کو لگا جیسے کسی نے اندر موجود زخموں پر پھاہے رکھ دیے ہوں۔

''اور آپ کی اماں جان کی تربیت بھی اچھی ہے۔ ایک ہماری نانو ہیں کبھی اپنی اولاد کو صحیح مشورے نہیں دیتیں۔''

اس روز ہادی کے بلانے پر وہ نیچے آیا تو لاؤنج میں سب عورتوں کی محفل جمی تھی۔ خالہ، نانو، دونوں ممانیاں ان کی ایک بہو، موضوع گفتگو اختر بانو کی بیماری تھی۔

''بڑی مکار ہے تمہاری سوکن......'' اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے سنا، نانو کہہ رہی تھیں۔

''جب دیکھا کہ شوہر اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تو بیماری کا ڈھونگ رچا بیٹھی۔ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں پوری جادوگر ہوتی ہیں ثمرہ اور تو یہاں آ گئی۔ وہاں ہی رہتی۔ مٹھی میں کر لے گی چند دنوں میں تیرے خاوند کو۔''

”تو میں کیا کرتی۔ نہیں برداشت ہو رہا تھا مجھ سے، باپ بیٹا دونوں ہی اس کی فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ بھرجائی نے ابا جان کی بیماری کا بتایا تو میں چلی آئی، شایان کو لے کر......“ ثمرہ روہانسی ہو رہی تھی۔

”میری جھلی بہن! تیرا بیٹا تو تیرا ہی رہنا تھا۔ اپنے خاوند کو بچا کر لے آنا تھا سوکن سے۔“ بڑی مامی نے قہقہہ لگایا تھا۔

”شایان بیٹا! سفر کر کے آئے ہو، جا کر آرام کرو، میں بھی کچھ دیر آرام کروں گی۔ ناشتے کے بعد سے ادھر ہی بیٹھی ریحان سے باتیں کر رہی تھی۔ اب تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔“

اختر بانو کو احساس تھا کہ وہ اتنی دیر سے ان کے پاس بیٹھا ہے تو ثمرہ کو بے چینی ہو رہی ہوگی۔

”جی!“

وہ اٹھا اور نظریں اختر بانو کی طرف اٹھیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں اور کیا تھا ان کی آنکھوں میں۔ ممتا، شفقت......

وہ عجیب سی کیفیت میں گھرا اپنے کمرے میں چلا گیا تو اختر بانو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے باورچی خانے کی طرف گئیں تاکہ منیرا یا بھاگی سے کہیں کہ وہ خالی گلاس اور ٹرے اٹھا لے۔

منیرا باورچی خانے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور سامنے ہی چائے کا پیالہ رکھا تھا۔

”ایک بات پوچھوں ماسی تاج!“ اس نے دونوں ہاتھوں میں پیالہ لے کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

”ہاں پوچھو!“ ماسی تاج کاؤنٹر صاف کر رہی تھی۔

”بڑی بی بی کہتی ہیں کہ ظالم کی پکڑ ضرور ہوتی ہے۔ چراغ سائیں کی بیٹی پر جس نے ظلم کیا ہے وہ اس کی سزا اس دنیا میں ضرور پائے گا۔ کیا سب ظلم کرنے والوں کو اس دنیا میں ہی سزا مل جاتی ہے۔“ منیرا ماسی تاج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اللہ کے کام اللہ ہی جانے بیٹی، کبھی اس دنیا میں پکڑ ہو جاتی ہے اور کبھی وہ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے اور اُس دنیا میں ظلم کا بدلہ مل جاتا ہے لیکن ظالم کو اس کے ظلم کی سزا تو ملتی ہی ہے، چاہے اِس دنیا میں ملے چاہے اُس دنیا میں۔“ ماسی تاج کاؤنٹر صاف کرنے والا کپڑا ہاتھ میں لیے اس کی طرف مڑی تھی۔

"تو کیا اس کے ابا کو بھی سزا ملے گی؟" اس نے چائے کا پیالہ نیچے رکھتے ہوئے سوچا۔

اس نے بھی تو ظلم کیا تھا تب ہی تو اتنا بیمار رہنے لگا ہے۔ کل ہی تو بھا فضل کا خط آیا تھا کہ ابا بہت بیمار ہے۔ وہ تو تب پانچ چھ سال کی ہوگی لیکن اماں اکثر اپنی سہیلی اور اس کے بیٹے کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ سہیلی نے مرنے سے پہلے اپنا بیٹا اس کے حوالے کیا تھا۔ جو اس کے بھا فضل کی عمر کا تھا۔ نو دس سال کا تھا جب اماں کی سہیلی مری تھی اور اماں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا اپنے فضل کی طرح ہی خیال رکھے گی لیکن ابا لالچ میں آ گیا تھا ان سونے کے زیورات کا جو اماں کی سہیلی نے اماں کے حوالے کیے تھے۔ اپنے بیٹے کی امانت کے طور پر کہ جب وہ بڑا ہوگا تو اس کو دے دینا، لیکن ابا ایک روز اسے گھر سے لے جا کر کہیں چھوڑ آیا تھا۔

اماں بہت روتی تھی اور اس سے کہتی تھی "منیرا! میں کیا کروں گی جب روز محشر میری سہیلی میرا گریبان پکڑے گی۔ تیرے ابا نے بڑا ظلم کیا۔ یتیم بچے کے ساتھ۔ بخشش نہیں ہوگی اس کی، تو دعا کیا کر اپنے ابا کے لیے......"

اور وہ دعا کرتی تھی کہ اللہ اس کے ابا کو معاف کر دے لیکن کیا اس کے دعا کرنے سے اللہ ابا کو معاف کر دے گا۔ بھا فضل نے لکھا تھا ابا بہت تکلیف میں ہے۔ ساری ساری رات جاگتا ہے۔ اسے ابا سے بہت محبت تھی اور ابا بھی تو اس سے بہت محبت کرتا تھا جبکہ بھا فضل اماں کا لاڈلا تھا۔

اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اختر بانو نے ان کی گفتگو میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا اور کچھ کہے بنا واپس پلٹ گئیں۔ ماسی تاج اسے خاموش دیکھ کر پھر سے کاؤنٹر صاف کرنے لگی۔

وہ نم آنکھوں کے ساتھ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگی حالانکہ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن اس کا تصور اسے اپنے گھر کے اس کچے آنگن میں لے گیا تھا جہاں وہ بھا فضل سے کبھی کبھی کھیلنے آتا تھا۔ اسے وہ ٹھیک سے یاد نہیں تھا لیکن اماں کہتی تھیں۔ وہ بہت خوب صورت تھا بالکل شہزادوں جیسا اور اماں کی سہیلی اسے شہزادہ ہی کہتی تھی۔ ماسی تاج نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اپنے خیالوں میں گم وہ خالی پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

”آج تیری ساس بھی نہیں آئی، سارا کام تجھے اکیلے کرنا ہے لیکن تو جانے کن گھمن گھیریوں میں پڑی ہوئی ہے۔“

اور وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پیالہ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

ماسٹر عبدالعزیز برآمدے میں کرسی پر بیٹھے تھے اور چارپائی پر سوئے چھ سات ماہ کے حامد کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر زیب النساء کو بھی دیکھ لیتے تھے جو صحن میں حمام کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ برتن دھو کر اس نے برتنوں والا ٹوکرا چبوترے پر رکھا اور کھرا دھونے لگی۔

”زیب النساء بیٹی! ادھر تو آنا میرے پاس۔“

زیب النساء جھاڑو رکھ کر باورچی خانے کی طرف جارہی تھی کہ انہوں نے اسے بلالیا اور وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آکر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”تجھ سے ایک بات کرنی تھی بیٹی، کئی دنوں سے ذہن میں خیال آرہا ہے۔ زندگی کا کیا بھروسا کب وقت پورا ہوجائے اور سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے۔“

”ابا!“ زیب النساء پریشان ہوگئی تھی۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہوں......ٹھیک ہوں۔“ ماسٹر عبدالعزیز مسکرائے۔ ”لیکن کچھ باتیں ہیں ضروری جو تم سے کرنی ہیں۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ آج یا کل۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے سے ڈرتا ہوں۔ اب استانی جی کو ہی دیکھ لو، اچھی بھلی لاہور گئی تھیں بیٹی کے پاس اور وہاں فرشتہ اجل انتظار کررہا تھا ان کا۔“

زیب النساء کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اسے استانی جی کی موت کا بہت دکھ تھا۔

”مجھے اگر کبھی کچھ ہوجائے تو یہاں نہ رہنا اکیلے۔ آپا جنتاں کے پاس چک مرادشاہ چلی جانا۔ تمہیں یاد ہے نا تمہاری اماں کی موت پر آئی تھیں اور ہفتہ بھر ٹھہری تھیں ادھر۔“

زیب النساء نے سر ہلایا۔

''میں نے آپا جنتاں کو خط لکھا تھا کہ وہ ادھر ہمارے پاس ہی آجائے ویسے بھی اکیلی جان ہے۔ اولاد کوئی ہے نہیں، شوہر بھی سال ہوا، وفات پا گیا لیکن اپنا گھر چھوڑنا آسان کہاں ہوتا ہے اور بوڑھے لوگوں کے لیے تو اور بھی مشکل ہوتا ہے تو آپا نے بھی خط بھجوایا ہے کہ وہ اس عمر میں اب اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں، استانی جی ہوتیں تو مجھے تمہاری فکر نہیں تھی۔ آپا نے کہا ہے کوئی پریشانی ہے تو تمہیں ان کے پاس چھوڑ جاؤں۔''

جنت بی بی ماسٹر عبدالعزیز کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں لیکن ماسٹر عبدالعزیز کی اماں کے ساتھ ان کی اماں کا بہت بہناپا تھا۔ جب تک ان کی والدہ زندہ رہیں، جنت بی بی اپنی اماں کے ساتھ دو تین ماہ بعد چکر لگاتی تھیں اور ہفتہ دو ہفتے ان کے پاس رہتی تھیں۔ پھر پہلے جنت بی بی کی والدہ فوت ہوئیں اور پھر ماسٹر عبدالعزیز کی اماں رخصت ہو گئیں۔ جنت بی بی کی شادی ہو گئی اور سالوں بعد ہی آنا ہوتا۔ آخری بار جنت بی بی زہرا بتول کی موت پر آئی تھیں۔

''نہیں ابا! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' زیب النساء نے وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں ابھی جانے کا نہیں کہہ رہا۔'' ماسٹر عبدالعزیز مسکرائے۔ ''میں تو بعد کی بات کر رہا ہوں، جب میں نہ رہا تو......''

''آپ کو کچھ نہیں ہوگا ابا! ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کو زندہ رہنا ہے۔ میرے لیے، حامد کے لیے......'' زیب النساء نے سوئے ہوئے حامد کو دیکھا جو سوتے میں مسکرا رہا تھا۔

''دعا تو یہ ہی کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اتنی زندگی دے کہ حامد جوان ہو جائے لیکن آدمی کی مرضی کہاں چلتی ہے جب وقت پورا ہو جائے گا تو جانا ہی ہے۔ زندگی و موت تو اس کے اختیار میں ہے۔ بس میری بات یاد رکھنا میرے بعد آپا جنتاں کے پاس چلی جانا۔ مجھے ماسی نور بھری اور اسلم پر اعتبار نہیں ہے زیب! بھلے وہ پڑوس سے چلے گئے ہیں لیکن رہتے تو اسی گاؤں میں ہیں نا۔''

''جی ابا!'' زیب النساء اپنے آنسو چھپانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں ہانڈی چڑھا آؤں، آپ حامد کا خیال رکھیے گا۔''

ماسٹر عبدالعزیز حامد کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگے، انسان کیا اور اس کے ارادے کیا۔

انہوں نے بھی سوچا تھا، زیب النساء رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جائے گی اور نور بھری کو چین آ جائے گا۔ اسی لیے تو انہوں نے جب ہاسپٹل میں انہیں لگا تھا کہ بس اب زندگی ختم ہونے والی ہے۔ زیب النساء کا نکاح کر دیا تھا کہ زندگی ہوئی تو جب اس کے والدین حج سے واپس آ جائیں گے تو دھوم دھام سے اپنی بیٹی کو رخصت کر دیں گے اور اگر اس سے پہلے ہی موت آ گئی تو انہوں نے نکاح کے بعد اس سے کہا تھا۔

”بیٹا! اگر میں تمہارے والدین کے آنیفقفقز سے پہلے ہی دنیا سے چلا گیا تو یہ تمہاری بیوی اور تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جانا۔ اور یہاں کی خیر خبر لیتے رہنا۔ استانی جی کو اپنا کوئی فون نمبر دے جانا کہ مجھے اچانک کچھ ہو جائے تو تمہیں خبر کر دیں اور تم اپنی امانت لے جاؤ۔“

اور اس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ زیب النساء اب اس کی ذمہ داری اور اس کی عزت ہے۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

لیکن نور بھری نے ایک بار پھر انہیں پریشان کر دیا تھا۔

یہ ان کے اسپتال سے آنے کے تین دن بعد کی بات تھی، وہ برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جب نور بھری صحن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اس روز کے بعد وہ کبھی ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ راستے میں بھی سامنا ہوتا تو منہ پھیر لیتی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آئے ہائے ماسٹر جی، سنا ہے بیٹی کا نکاح کر دیا ہے۔ ایسی بھی کیا آفت تھی کہ چپ چپاتے اسپتال میں ہی نکاح کر دیا۔“

ماسی نور بھری بیٹھتے ہی اپنی پاٹ دار آواز میں بولنے لگی تھی۔

”بس ماسی! میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی سوچا جیتے جی بیٹی کو اپنے گھر کا کر دوں۔“
گاؤں میں چھوٹے بڑے سب ہی اسے ماسی کہتے تھے۔

”پر بیٹی تو ابھی گھر ہی بیٹھی ہوئی ہے۔“ وہ دوپٹے کا پلو ہونٹوں پر رکھ کر عجیب طرح سے ہنسی تھی۔

”کچھ دنوں تک رخصتی بھی کر دوں گا ماسی! تم بے فکر رہو۔“

”لو مجھے کس لیے فکر ہو گی۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ پر ایک ہی دن میں رشتہ کہاں سے ٹپک

پڑا۔ کہیں وہاں ہی کسی ڈاکٹر کو پکڑ کر تو نکاح نہیں کر دیا بیٹی کا۔'' وہ پھر ہنسی......وہی زہریلی ہنسی......

''رشتہ تو بہت دنوں سے آیا ہوا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ ذرا طبیعت بحال ہو جائے تو دھوم دھام سے بیٹی کی شادی کروں۔'' انہوں نے بمشکل اپنی ناگواری کو چھپایا تھا۔

''پر ہے کون یہ تیرا داماد؟'' ماسی نور بھری تجسس سے مری جاتی تھی۔

وہ تو کچھ اور ہی سوچ بیٹھی تھی اور یہاں ماسٹر عبدالعزیز ہاتھ کر گیا تھا اس سے۔

''استانی جی کی بیٹی کا سسرالی رشتہ دار ہے۔ وہ ہی رشتہ لائی تھی اس کا۔ بڑا افسر بننے والا ہے۔''

استانی جی نے گاؤں میں یہ ہی بتایا تھا اور انہیں بھی ایسا ہی بتانے کو کہا تھا کہ انہیں عورتوں کی لمبی زبانوں کا پتا تھا۔

''خیر میں تو سمجھ رہی تھی کہ کسی راہ چلتے بندے کے ساتھ نکاح کر دیا ہے زیبو کا۔ زہرا کے ساتھ بہت پیار تھا میرا اس لیے پوچھنے چلی آئی۔ مبارک ہو۔'' وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

''خیر مبارک ماسی!'' ماسٹر عبدالعزیز نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ جا رہی ہے ورنہ جتنی دیر بیٹھی رہتی کوئی نہ کوئی تیر چلاتی رہتی۔

''ویسے ماسٹر جی! میرا اسلم کہہ رہا تھا کہ کوئی نکاح شکاح نہیں کیا ماسٹر نے بیٹی کا......یوں ہی شوشا چھوڑا ہے۔'' وہ جاتے جاتے رکی تھی۔ ''میرا اسلم بڑا سیانا ہے ماسٹر جی، اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہے۔ نہ کوئی سسرال سے آیا، نہ چھوہارے بتاشے آئے زیبو کے سسرال سے۔''

ایک طنزیہ سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ چلی گئی لیکن ماسٹر عبدالعزیز سوچ میں پڑ گئے تھے اور پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ کر انہوں نے زیب النساء کو آواز دی۔

''جی ابا!''

زیب النساء باورچی خانے میں ہی تھی فوراً باہر آئی۔ جھکی جھکی نگاہیں، رخساروں پر حیا کی سرخی۔ جب سے نکاح ہوا تھا وہ ان کے سامنے یوں ہی نگاہیں جھکائے رکھتی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا وہ زیب النساء کو بھیج کر استانی جی کو گھر بلواتے ہیں لیکن پھر ارادہ بدل دیا اور اٹھتے ہوئے بولے۔

''میں ذرا استانی جی کی طرف جا رہا ہوں، تم دروازے کی کنڈی لگا لو۔''

''لیکن ابا، آپ کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں کسی کو بھیج کر انہیں بلوا لیتی ہوں۔ گلی میں دیکھتی ہوں شاید کوئی بچہ نظر آ جائے۔''

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور استانی جی اندر داخل ہوئیں۔

''آپ کی بڑی عمر ہے آپا جی...... میں ابھی آپ کی طرف ہی آ رہا تھا۔''

''خیریت تو ہے نا ماسٹر جی!'' استانی جی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

''جی آپا جی! خیریت ہے۔ دراصل میں زیب النساء کی فوری رخصتی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے والدین کے واپس آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اس نے کب آنے کا کہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا کسی کام سے جانا ہے اسے ہفتہ دس دن تک آپ کی خیریت معلوم کرنے آئے گا۔'' استانی جی نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''آپ کو فون نمبر دیا تھا نا اس نے تو اسے فون کروا کے بلا دیں پلیز، میں اس سے خود بات کروں گا۔''

استانی جی نے سر ہلایا تھا لیکن وہ اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے پتا ہے آپا جی کہ آپ کو میری بات سن کر حیرت ہوئی ہے لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے زیب کی رخصتی کر دوں۔''

''لیکن ماسٹر جی، نکاح بھی اس کے ماں باپ کے بغیر ہو گیا تو کیا رخصتی بھی اس کے ماں باپ کے بغیر کر دیں گے۔ اس نے بتایا تو تھا کہ وہ دونوں حج پر گئے ہوئے ہیں اور بڑے بھائی اور بھابھی سے ابھی وہ ان کی عدم موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔''

استانی جی کی حیرت بجا تھی، کہاں تو وہ اس کے والدین کے بغیر رشتے کے لیے بھی ہاں نہیں کر رہے تھے، کہاں اب نکاح بھی ان کے بغیر ہو گیا اور اب رخصتی بھی کرنا چاہتے ہیں۔

''ماں باپ کی موجودگی اور رضامندی ضروری ہے ماسٹر جی، یہ ایک طرح سے سیکورٹی ہے لڑکی کے

لیے بھی اور لڑکے کے لیے بھی...... کل کو خدانخواستہ کوئی بات ہو جائے تو والدین سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔"

"آپ کی بات بالکل صحیح ہے آپا جی!" ماسٹر عبدالعزیز کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ "میں ایسا ہی چاہتا تھا، جانتا ہوں کہ جب لڑکا والدین کی رضامندی کے بغیر شادی کرتا ہے تو اس کی بیوی کو سسرال میں نہ عزت ملتی ہے نہ محبت اور ایسی شادیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میری بھی خواہش تھی کہ میری بیٹی کو سسرال میں عزت و محبت ملے لیکن آپ سے کچھ چھپا تو نہیں ہے آپا جی! کتنا مجبور ہو گیا تھا میں سمجھتا تھا کہ نکاح ہو جائے گا تو میری بیٹی محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن یہاں تو ماسی نور بھری جیسے لوگوں کو نکاح کا ہی اعتبار نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہے جھوٹ بولا ہے میں نے۔

اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ایک دفعہ اپنی بیٹی کو دھوم دھام کے ساتھ رخصت کر دوں۔ سب گاؤں والوں کو پتا چل جائے کہ زیب النساء کی شادی ہو گئی ہے کوئی اسے جھوٹ اور ڈھونگ نہ کہے۔"

"آپ ماسی نور بھری کی باتوں میں آ کر جلدی نہ کریں ماسٹر جی!" استانی جی نے سمجھانا ضروری سمجھا۔ "وہ بھی خاندانی لڑکا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی ہیں۔ ان کے بغیر اس کے لیے بھی آسان نہیں ہو گا زیب بیٹی کو رخصت کروا کے لے جانا۔ میں نے تو فاطمہ کو بھی خط لکھ دیا تھا کہ بڑی عید کے بعد جب آئے تو زیادہ دنوں کے لیے آئے، مل جل کر زیب کی شادی کی تیاری کر لیں گے۔ تب تک اس کے ماں باپ بھی حج کر کے آ جائیں گے۔"

"مجھے تو لگتا ہے آپا جی میں ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ سانس جو ابھی چل رہا ہے اس کے بعد دوسرا سانس آئے یا نہ آئے۔"

انہوں نے ماسی نور بھری کی آمد اور اس کی ساری گفتگو استانی جی کو بتا دی اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اب آپ ہی بتائیں اس صورت حال میں کیا کروں میں۔"

"یہ نور بھری بھی بڑی ہی خبیث عورت ہے۔" استانی جی کو اس پر غصہ آیا۔ "میں جا کر بات کرتی ہوں اس سے، آپ پریشان نہ ہوں اور ان شاء اللہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے پچھلے آٹھ سال سے انجانا

کی تکلیف ہے، دیکھ لیں ابھی تک ہٹی کٹی ہوں۔ آپ بس اپنی دوا باقاعدگی سے کھاتے رہیں۔''

''نہیں آپا جی رہنے دیں ماسی نور بھری کو کچھ کہنے کا کیا فائدہ۔ منہ پر سو باتیں سنا کر گئی ہے، ہم کیا لوگوں کی زبان بند کر سکتے ہیں۔ آپ بس کسی طرح اسے بلوا دیں۔ آپ کو فون نمبر تو دیا تھا نا اس نے، بلکہ مجھے اس کا نمبر دے دیں، میں کل شہر جا کر اسے فون کر کے بلاتا ہوں پھر بات کر کے دیکھتا ہوں۔ ویسے تو اس نے کہا تھا کہ ہفتہ دس دن بعد وہ چکر لگائے گا لیکن آج دس دن سے زیادہ ہی ہو گئے، چکر نہیں لگایا۔''

ماسٹر عبدالعزیز نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب جلد از جلد زیب النساء کی رخصتی کر دیں گے۔

''وہاں اسپتال میں اس نے نمبر چھوٹے سے کاغذ کے پرزے پر لکھ کر دیا تھا کہ آپ کو بھی دے دوں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کہہ رہا تھا اس کے گھر کا نمبر ہے۔ بٹوے میں رکھا تھا۔ دس دفعہ وہاں بٹوا کھولا، جانے کہاں گر گیا۔ ابھی آپ کی طرف آنے سے پہلے بہت ڈھونڈا کہ آپ کو دے دوں گی۔ ملا ہی نہیں۔ خیر میں اقبال کی طرف جاتی ہوں۔ اب تک آ گیا ہوگا ملتان سے۔ اس سے پوچھتی ہوں اسے سب پتا ہوگا۔ اس کا نمبر بھی اور یہاں رحیم یار خان میں اس کا جو دوست رہتا ہے اس کا بھی۔''

استانی جی نے ماسٹر عبدالعزیز کو تسلی دی۔

''میں کل دن کو چلی جاؤں گی شہر کسی بچے کو ساتھ لے جاؤں گی۔''

''آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر آپا جی۔ آپ کو زحمت ہوگی۔ آپ مجھے اقبال کے گھر کا پتا سمجھا دیں، میں خود کل چلا جاؤں گا۔''

ماسٹر عبدالعزیز کو احساس تھا کہ استانی جی ابھی ان کی بیماری کے دنوں میں بھی زیب النساء کے ساتھ اسپتال میں تھیں۔

''زحمت کیسی ماسٹر جی! ویسے بھی مجھے ایک دو روز تک جانا ہی تھا قرآن پڑھنے والی بچیوں کے لیے سپارے اور کچھ دوسری چیزیں لینی تھیں اور آپ غیروں جیسی باتیں نہ کریں۔ زیب میرے لیے فاطمہ جیسی ہی ہے۔''

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے بھئی آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔'' ماسٹر عبدالعزیز نے وہاں سے ہی آواز دی تھی۔

''میں ہوں ماسٹر جی۔''

اور ساتھ ہی دروازہ کھلا تھا اور آنے والے کو دیکھ کر ماسٹر عبدالعزیز بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

''آؤ آؤ بیٹا، ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔'' انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔

''بڑی لمبی عمر ہے بیٹا تمہاری، جیتے رہو۔''

ماسٹر عبدالعزیز سے گلے مل کر وہ استانی جی کے سامنے جھکا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرائیں۔

''سب خیریت تو ہے نا؟ ماسٹر صاحب تو ٹھیک ہیں نا؟'' اس کی متلاشی نظروں نے کسی کو دیکھنے کی چاہ میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر جھک گئیں۔

''ہاں ہاں سب ٹھیک ہے بیٹا بیٹھو۔'' استانی جی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''تم اب ہمارے داماد ہو تو ہم تمہیں بغیر خیریت کے کیا یاد نہیں کر سکتے۔'' استانی جی مسکرائیں۔

''کیوں نہیں۔'' وہ بھی مسکراتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔

''اور میں داماد نہیں ہوں بیٹا ہوں آپ کا بھی اور ماسٹر جی کا بھی۔''

''تو پھر یہ ماسٹر جی مت کہو اجنبیوں کی طرح۔'' بے اختیار ہی ماسٹر عبدالعزیز کے لبوں سے نکلا تھا۔

''جی چچا جان! اب بتائیں کیوں یاد کیا جا رہا تھا مجھے؟'' اس نے ان کی طرف دیکھا جیسے اسے گمان ہو کہ اسے بلاوجہ یاد نہیں کیا جا رہا تھا۔

لیکن جو ماسٹر عبدالعزیز نے کہا تھا وہ کم از کم اس کے گمان میں نہیں تھا۔ وہ حیران سا تھا۔

''لیکن ابھی ابا جان اور اماں جان تو واپس نہیں آئے۔ اور یہ ہی طے ہوا تھا کہ رخصتی ان کے آنے کے بعد ہو گی۔''

''ہاں میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا بیٹا کہ میری بیٹی کو تمہارے والدین عزت کے ساتھ رخصت کروا

کر لے جائیں۔ میرے نزدیک بھی ان کی موجودگی ضروری تھی لیکن مجھے اپنی بے اعتبار سانسوں سے ڈر لگنے لگا ہے، جانے کب ساتھ چھوڑ جائیں اور یہاں گاؤں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس نکاح کا اعتبار ہی نہیں کیا۔

میں تو سمجھتا تھا کہ نکاح ہو جائے گا تو میری زیب محفوظ ہو جائے گی لیکن شاید میں غلط تھا۔ میں چاہتا ہوں بیٹا! تم بارات لے کر آؤ، بھلے چند بندوں پر مشتمل ہی سہی لیکن اسے رخصت کروا کر لے جاؤ۔ میں اسے اسی طرح تمہارے ساتھ رخصت کر دوں جیسے باپ بیٹیوں کو رخصت کرتے ہیں۔ سارے گاؤں والوں کو پتا چل جائے کہ میری بیٹی کا محافظ کون ہے۔" وہ سانس لینے کو ذرا دیر کے لیے رکے تھے۔

"اللہ حفاظت کرنے والا ہے ماسٹر جی!" استانی جی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ہاں اللہ ہی ہے حفاظت کرنے والا لیکن ہم انسان بہت کمزور ہیں نا، میں چاہتا ہوں اپنی بیٹی کی شادی اپنی زندگی میں ہی کر دوں مجھے اپنی آتی جاتی سانسوں پر بھروسا نہیں ہے آپا جی۔" ماسٹر عبد العزیز نے استانی جی سے بات کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! میں نے اپنی مجبوری اور پریشانی تمہیں بتا دی ہے۔ زیب النساء اب تمہاری بیوی ہے۔ آج رخصت کروا کر لے جاؤ یا اپنے والدین کے آنے پر تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا، بس درخواست ہی کر سکتا ہوں۔ اگر جلدی کروا کر لے جاؤ گے تو شاید میں سکون سے مر سکوں گا۔ ورنہ شاید مرنے کے بعد بھی بے سکون رہوں گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ چچا جان۔ آپ کو ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ میں جلد ہی زیب کو رخصت کروا کر لے جاتا ہوں۔"

اس نے ان کی مجبوری اور بے بسی کو محسوس کر لیا تھا۔ اگرچہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اماں جان اور ابا جان کی مرضی اور رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی زیب کو رخصت کروا کر لے جائے گا لیکن جیسے نکاح کے وقت وہ ماسٹر صاحب کی حالت دیکھ کر مجبور ہو گیا تھا آج بھی خود کو مجبور پا رہا تھا۔

آنے والے ایک لمحے کی بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی، کیا خبر ماسٹر صاحب کی زندگی کتنی ہے۔

''آج جمعرات ہے تو اس سنڈے کو تو نہیں، اگلے سنڈے کو بارات لے کر آ جاؤں گا۔ میں لاہور جا کر اپنے بڑے بھائی سے بات کرتا ہوں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

''کیا تمہارے بڑے بھائی مان جائیں گے بیٹا؟ جب کہ تمہارے والدین بھی یہاں نہیں ہیں۔'' ماسٹر عبدالعزیز پریشان ہوئے تھے۔

''مجھ سے بڑے میرے یہ بھائی میرے ساتھ دوستوں کی طرح ہیں۔ میں ان سے ہر وہ بات کہہ سکتا ہوں جو کسی سے نہیں کہہ سکتا۔'' وہ مسکرایا تھا۔ ''اماں جان اور ابا جان کو بھی یہ ہی منائیں گے۔ یوں میرے والدین کوئی سخت والدین نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی دقیانوسی سوچ رکھتے ہیں۔ انہیں میری پسند کی شادی پر اعتراض نہیں ہوگا۔ ہاں اس بات پر ضرور دکھی ہوں گے کہ میں نے ان کی واپسی کا انتظار نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے جب میں ساری صورت حال کی وضاحت کروں گا تو ان کی خفگی ختم ہو جائے گی۔ تو ان شاء اللہ اگلے سنڈے کو......''

''بہت شکریہ بیٹا!'' ماسٹر عبدالعزیز کی آواز میں نمی سی گھل گئی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ چچا جان، شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اپنی بیٹی کے قابل سمجھا۔ ان شاء اللہ آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے تسلی دینے کے انداز میں ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ مدھم سا مسکرائے تھے۔

''یہ سب فیصلے اوپر ہوتے ہیں بیٹا! اللہ کی رضا یہ ہی تھی کہ تم میری بیٹی کا نصیب بنتے یہ کہیں اوپر کتاب میں لکھا جا چکا تھا ورنہ میں تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا کہ اللہ نے تمہیں بھیج دیا۔''

''آپا جی......!'' ان کی ملتجی نظریں استانی جی کی طرف اٹھی تھیں۔ ''اگر اگلے اتوار تک میں نہ رہا تو آپا جی، یہ آپ کی ذمہ داری ہوگی کہ میری بیٹی کو اس طرح رخصت کریں گی جیسے میں اپنی زندگی میں کرتا۔ آپ نے ملتوی نہیں کرنا آپا جی...... بھلے میری موت کو دو ہی دن ہوئے ہوں۔ بس مقررہ تاریخ پر رخصت کر دینا ہے۔''

''آپ آخر اس طرح کی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہیں ماسٹر جی!'' استانی جی کو اچھا نہیں لگا

تھا۔ ”اللہ تعالیٰ کو مایوسی پسند نہیں ہے۔ ہم آپ لاکھ کوشش کریں ہونا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہے۔ اللہ پر چھوڑ دیں سب۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں، ہونا تو وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوگا۔ میں ہی کمزور بے یقین ہو گیا ہوں۔ اللہ مجھے معاف فرمائے۔ مجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے جیسے چاہا تھا جیسے سوچا تھا اللہ نے میری بچی کے نصیب میں ایسا ہی شخص لکھ دیا تھا۔ بس ہم انسان ہی کمزور اور تھڑ دلے ہیں۔“

اور پھر سب کچھ ایسے ہی ہو گیا تھا جیسا وہ چاہتے تھے۔ استانی جی نے فاطمہ کو بلوا لیا تھا۔ فاطمہ دو تین ریڈی میڈ کام والے سوٹ لاہور سے لے آئی تھی۔ استانی جی کے ساتھ مل کر شادی کی تیاری اس نے ہی کی تھی۔ گو اس نے کسی بھی قسم کا جہیز بنانے سے منع کر دیا تھا لیکن کپڑے تو ابتدائی دنوں میں پہننے کے لیے چاہیے ہی تھے۔ نفیس، ہلکے پھلکے کام والے چند جوڑے لے لیے گئے تھے۔ زیور زہرا کا رکھا ہوا تھا۔

میکے سے تو زہرا کو زیور نہیں ملا تھا۔ لیکن ابا نے اماں کا سارا زیور سنبھال کر رکھا ہوا تھا جو انہوں نے زہرا کو دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ چھ چوڑیاں نئی بنوائی تھیں۔ زہرا نے تو بس صرف چوڑیاں ہی پہنیں۔ اور کانوں میں وہ چھوٹے جھمکے پہنے رکھتی تھی بس، ماسٹر عبدالعزیز نے سارا زیور استانی جی کے حوالے کر دیا تھا۔

”آپ دیکھ لیں آپا جی! اسے دے کر نیا لینا ہے یا یہ ہی ٹھیک ہے۔“

”اس میں تو نقصان بہت ہوتا ہے ماسٹر جی اور پھر یہ ایسا کون سا پرانا ہو گیا ہے۔ شہر جا کر دھلوا لوں گی۔ یہ جھمکے، ان پر پالش کروا لیں گے۔“

یوں فاطمہ کے ساتھ مل کر استانی جی نے زیب النساء کی شادی کی تیاری کر لی تھی۔ زہرا کو یاد کر کے ماسٹر عبدالعزیز اور زیب کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپاتے پھر رہے تھے۔

فاطمہ نے ایک دن پہلے ڈھولکی بھی رکھ لی تھی، پاس پڑوس سے لڑکیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ زیب النساء کی مہندی فاطمہ استانی جی کے گھر سے لے کر آئی تھی اور پھر سات کاروں پر تقریباً سولہ سترہ افراد پر

مشتمل بارات جب گاؤں میں آئی تو سب نے ہی زیب النساء کی قسمت پر رشک کیا تھا۔

بارات کے بیٹھنے کا انتظام چوہدری عبدالمالک کی حویلی میں کیا گیا تھا۔ کھانے کا انتظام احاطے میں تھا۔ ماسٹر عبدالعزیز کے جاننے والے ملا کر تقریباً پچاس ساٹھ بندوں کا انتظام تھا، کھانا بہترین تھا۔ بری شان دار تھی۔

نکاح کا جوڑا اتنا بھاری اور خوب صورت تھا کہ کتنے ہی ہفتوں تک گاؤں میں زیب النساء کی شادی، اس کے شان دار دولہا اور زیور کے خوب صورت سیٹ کا ذکر ہوتا رہا۔ سب کچھ بہت اچھے طریقے سے ہو گیا تھا۔ آج تک یوں اتنی شان دار کاروں میں بارات یہاں نہ آئی تھی۔ جب لوگ کہتے تو ماسٹر عبدالعزیز بے اختیار دعا کرتے کہ یا اللہ میری بیٹی کو نظر بد سے بچانا۔

''اتنی دیر سے کیا سوچ رہے ہیں ابا؟'' زیب النساء جانے کب سے برتن دھو کر ان کے سامنے آ کر بیٹھی ہوئی انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

''اوہ...... ہاں کچھ نہیں۔'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بس ایسے ہی سوچ رہا تھا کہ ہم انسان کیا اور ہمارے ارادے کیا۔ کتنے بڑے بڑے خواب دیکھتے ہیں ہم تصور ہی تصور میں نہ جانے کتنی منزلہ عمارتیں کھڑی کر لیتے ہیں جو ہوا کے ایک ہی جھونکے سے زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

میں نے کبھی کیا سوچا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ میں نے اپنی بیٹی کو مضبوط محافظ کے سپرد کیا ہے۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں ہو گا اس کا نگہبان اس کا محافظ ہو گا نا اس کا شوہر لیکن کتنا غلط کرتے ہیں نا ہم اللہ پر بھروسا کرنے کے بجائے اس کی مخلوق پر بھروسا کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''انسان تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتا نا ابا! میری تقدیر میں ایسا ہی ہونا لکھا تھا اور مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

زیب النساء نے ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا جو حد سے زیادہ ملول اور اداس نظر آ رہے تھے۔ اب وہ ان سے کیسے کہتی کہ اس نے ان پندرہ دنوں میں جو اس کے ساتھ گزارے تھے پوری ایک زندگی جی لی تھی۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے اسے اتنی محبتیں دی تھیں کہ وہ ساری زندگی ان محبتوں کی شیرینی کو

جرعہ جرعہ کر کے پیتی رہتی۔

وہ پندرہ دن اس کے لیے حاصل زندگی تھے۔ وہ اس کا شہزادہ اسے بہت شان وشوکت سے رخصت کروا کے لے گیا تھا۔ باراتیوں میں گو اس کا اپنا سگا کوئی نہیں تھا۔ سب دوست احباب اور ان کے گھر والے تھے پھر بھی اس نے ابا سے گلے ملتے ہوئے دیکھا تھا، وہ مطمئن اور پرسکون تھے۔

ایک رات وہ رحیم یار خان میں اس کے دوست کے گھر ٹھہرے تھے۔ یہ اظہار اور اعتراف کی رات تھی۔ اس نے دل کھول کر اظہار کیا تھا اور اس نے بھی اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

''پتا ہے زیب النساء!'' شہزادے نے اس کا گھونگٹ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں تو آج تک اس لمحے کی قید سے نکل ہی نہیں سکا۔ جب تم دونوں ہاتھوں میں کٹورا تھامے میری طرف بڑھا رہی تھیں اور میرے ہاتھ جیسے فضا میں ہی معلق ہو گئے تھے۔ نظریں تمہاری طرف اٹھی تھیں اور دل جیسے پہلو سے نکل کر تمہارے قدموں میں گر گیا تھا۔

سچ بتانا زیب النساء! کیا تمہیں بھی اس لمحے کے سحر نے اپنے حصار میں لیا تھا؟ کیا تم نے بھی میری طرح ہر رات اس لمحے میں خود کو قید پایا؟ گو مجھے یقین ہے کہ تم بھی خود کو اس لمحے کے سحر سے نہ بچا سکی ہو گی پھر بھی تم خود بتاؤ۔''

''ہاں میں بھی......'' اس نے اعتراف کیا تھا۔ ''میں بھی آج تک اسی لمحے کی قید میں ہوں۔ اور اس رات جب میں سوئی تو میں نے خواب دیکھا تھا۔ ایک شہزادہ کنویں پر آیا تھا۔''

اس نے اپنا خواب سنایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

''میں شہزادہ نہیں ہوں زیب النساء! ایک عام انسان ہوں لیکن تم میری رانی ہو، میرے دل کی ملکہ، میری شہزادی......''

''میرے لیے تو آپ شہزادے ہی ہیں۔ میں تو آپ کو شہزادہ ہی کہوں گی۔ میرے ابا دعا کرتے تھے کہ میری بیٹی کے لیے اللہ کوئی شہزادہ بھیج دے اور جب میں نے خواب میں گھوڑے پر بیٹھے شہزادے کو دیکھا تو مجھے لگا تھا کہ اللہ نے میرے ابا کی دعا سن لی ہے اور جب میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو

شہزادے کے روپ میں وہ آپ تھے۔''

''تم بہت معصوم ہو زیب النساء!'' وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''تمہیں پتا ہے شہزادہ سلیم کون تھا؟''

''ہاں پتا ہے مغل بادشاہ اکبر کا بیٹا تھا۔''

''اور جس کی وجہ سے بے چاری انارکلی کو دیوار میں چنا گیا۔'' وہ ہنسا تھا۔

''لیکن میں نے تو اللہ میاں سے دعا مانگی تھی اس روز کہ مجھے (انارکلی) نہ بنانا، مجھے مہر النساء (نور جہاں) بنانا، جس نے شہزادہ سلیم کے دل پر حکومت کی تھی۔''

''اور مجھے تمہاری غلامی منظور ہے زیب النساء! تم بھی ساری عمر میرے دل پر حکومت کرنا جیسے نور جہاں نے جہانگیر کے دل پر حکومت کی۔''

وہ اس کی معلومات پر حیران ہوا تھا تب اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ فارغ اوقات میں استانی جی کے گھر سے کتابیں لا کر پڑھا کرتی تھی۔ تاریخی اور ادبی ہر طرح کی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرے دل کی رانی بس معصوم سی سیدھی سادی سی ہے۔''

ملن کی اس رات اس نے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ بار بار اپنی محبتوں کا اعتراف کیا تھا۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ آج بھی اس کے دل پر لکھا تھا۔

اس نے کہا تھا۔

''پتا ہے زیب النساء پہلی بار تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے ہر روز اپنے اللہ سے تمہیں مانگا اور دیکھو اللہ کتنا مہربان ہے کہ اس نے مجھے کس طرح تم سے ملا دیا۔ کیسے اچانک، کیسے غیر متوقع طور پر۔

دوسرے دن وہ ماسٹر عبدالعزیز اور استانی جی سے مل کر ناران چلے آئے تھے۔ جہاں اس نے ایک اچھے ہوٹل میں کمرا پہلے سے ہی بک کروا رکھا تھا۔ اور وہاں وہ تقریباً پندرہ دن رہے تھے اور یہ پندرہ دن ہی اس کی زندگی کا حاصل تھے۔

وہ اپنی اس اٹھارہ سالہ زندگی میں پہلی بار اپنے گاؤں سے باہر نکلی تھی۔ بالاکوٹ میں ایک رات ٹھہر کر وہ کرائے کی جیپ میں ناران آئے تھے۔ پیچ در پیچ خم کھاتے راستے...... ایک طرف اونچے پہاڑ دوسری طرف گہری کھائیاں۔

اپنی بے حد خوب صورت آنکھوں میں حیرت سموئے اس نے انہیں دیکھا تھا اور نہ جانے کتنی ہی بار خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ سب اس کے لیے بہت خوب صورت اور انوکھا تھا۔ اور اس نے بے اختیار اظہار بھی کر دیا تھا جب راستے میں وہ کچھ دیر کے لیے کاغان کے چھوٹے سے گاؤں میں رکے تھے اور اس نے اسے بتایا تھا کہ اس وادی کا نام اسی گاؤں کے نام پر وادی کاغان رکھا گیا ہے۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ دنیا میں اتنی خوب صورت جگہیں بھی ہیں۔'' وہ ایک باغ کے قریب سیبوں سے لدے ہوئے درختوں کو خوشی اور حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''دنیا میں اس سے بھی زیادہ خوب صورت جگہیں ہیں زیب النساء! اور وعدہ رہا کہ جب بھی وقت ملا ہم اپنے وطن کی ہر خوب صورت جگہ پر جائیں گے۔ گلگت کے برف زاروں اور کشمیر کے لالہ زاروں میں تمہارے سنگ جانے کا خواب ابھی ابھی میں نے اپنی آنکھوں میں سجا لیا ہے۔ اور ان شاء اللہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔''

اور اس نے بھی اس سمے اس خواب کو اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا۔ پھر وہاں سے ناران تک کے سفر میں ڈھیروں حیرتوں نے اس کے اندر بسیرا کیا تھا۔

دائیں طرف اونچے پہاڑ، بائیں طرف نیچے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا دریائے کنہار، اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے مناظر کبھی اپنی آنکھوں سے سچ مچ دیکھے گی اور اس کی والہانہ نظریں اس کی ان حیرت بھری آنکھوں اور چہرے پر بکھری خوشی کو جیسے اپنے اندر مقید کرتی تھیں۔

''ابھی تو اور بہت سی حیرتیں تمہاری منتظر ہیں میری زیب النساء، میری شہزادی، میری رانی......''

اس نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی اور اس نے گھبرا کر جیپ میں موجود دوسری فیملی کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ سب اپنی باتوں میں مگن تھے کسی کا دھیان ان کی طرف نہیں تھا۔ اور اس نے پچ

ہی کہا تھا۔ جب ناران میں اپنے کمرے سے باہر ٹیرس پر کھڑے ہو کر برف سے ڈھکے پہاڑوں کو دیکھا تھا، جن پر ڈوبتے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''اگر بابر یہاں آتا تو یقیناً یہاں کے لیے بھی وہ ضرور کہتا......

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است''

اور وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

تاریخ کے حوالے سے اس کی معلومات اسے حیران بھی کرتی تھیں اور وہ خوش بھی ہوتا تھا۔ وہ پندرہ دن ناران میں رہے تھے۔ ابھی سیزن شروع نہیں ہوا تھا تو زیادہ رش نہیں تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ سیزن میں تو یہاں اتنا رش ہو جاتا ہے کہ کسی ہوٹل میں کمرہ نہیں ملتا۔ لوگ ہوٹل کی راہداریوں میں بھی بستر بچھا لیتے ہیں۔

ان پندرہ دنوں کا لمحہ اس کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ تھا۔ وہ صبح ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکلتے اور گھومتے پھرتے رہتے۔ گھنٹوں دریائے کنہار کے کنارے بیٹھے، وہ ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کرتے رہتے تھے۔

ان پندرہ دنوں میں وہ ایک روز جھیل سیف المُلوک دیکھنے بھی گئے تھے اور ایک روز لالہ زار بھی۔ باقی کے سارے دن انہوں نے ناران میں ہی گزارے تھے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر بنے سیڑھیوں کی شکل میں چھوٹے چھوٹے کھیت اور چھوٹے چھوٹے گھر ان کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں سب کو وہ خوش گوار سی حیرت سے دیکھتی تھی۔

کبھی کبھی وہ کسی پتھر، کسی ٹیلے پر بیٹھ جاتے اور باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا وہ مبہوت سی اس کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ کبھی اسے لگتا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ خواب والا شہزادہ اسے اپنے ساتھ اس خوب صورت دیس میں لے آیا ہے جہاں برف سے ڈھکے پہاڑ ہیں۔ خوب صورت جھرنے ہیں۔ سر سبز وادی ہے۔

وہ اپنے ہوٹل سے نکل کر اکثر دریائے کنہار پر بیٹھ جاتے، جو دور کہیں پہاڑوں سے بہہ کر آتا ہوا کسی ندی کی سی شکل میں پتھروں پر اچھلتا شور کرتا گزر جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے تھے۔

وہاں ہی ایک روز بیٹھے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے اچانک کسی روز کسی سے محبت ہو جائے گی۔ محبت بھی ایسی جو میرے دن رات کا چین چھین لے گی جو مجھے میرا نہیں رہنے دے گی۔ میں تو بس ایک ہی خواب دیکھتا تھا سی ایس ایس کے امتحان میں شان دار کامیابی حاصل کرنا۔ تم بھی میرے لیے دعا کیا کرو کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''اور وہاں ابا نے ماسی نور بھری سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرا داماد بڑا افسر ہے۔'' وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا کر ہنسی تھی اور وہ مبہوت سا اسے دیکھنے لگا تھا۔

''تم بہت خوب صورت ہو، بہت پاکیزہ، معصوم...... پہاڑوں پر اترنے والی سورج کی پہلی کرن جیسی......''

اور وہ شرما گئی تھی، پلکیں جھک گئی تھیں۔

''افسر بننے میں ابھی کئی مراحل ہیں۔ ابھی تو صرف تحریری امتحان دیا ہے۔ پھر زبانی امتحان، نفسیاتی ٹیسٹ انٹرویو اور پھر سول سروس اکیڈمی میں ٹریننگ وغیرہ...... لیکن تم دعا کرو گی نا تو سب امتحان پاس کرلوں گا۔ اللہ تمہاری دعا ضرور سنے گا۔ پہلے بھی تو اللہ نے تمہاری دعا قبول کی تھی۔''

وہ شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''پہلے کون سی دعا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''یہ ہی کہ میں تمہیں مل جاؤں۔ تمہارا شہزادہ سلیم جو تمہارے خواب میں گھوڑے پر سوار ہو کر تمہیں کھوجتا ہوا کنویں تک چلا آیا تھا۔''

اور وہ جھینپ گئی تھی۔

''کیا آپ نے دعا نہیں کی تھی کہ میں......''

''تم سے ملنے کے بعد سے تم سے شادی تک کے دن تک اس ایک دعا کے علاوہ اور کوئی دعا کی ہی نہیں۔ مجھے ذرا سی بھی امید نہیں تھی کہ تم مجھے مل جاؤ گی۔ مجھے لگتا تھا جیسے ماسٹر صاحب ایک اجنبی اور غیر شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دیں گے تو میں دعا کرتا تھا اور اللہ نے میری دعا قبول کر لی۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع سا ہوا ہے کہ مجھے اب تک یقین نہیں آتا۔ اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ ڈر سا جاتا ہوں کہ کہیں مجھے خود میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ تم اتنی خوب صورت ہو کہ میرے پاس تمہارے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے لفظ نہیں ہیں۔ حسن اور دلکشی تمہارے در کی باندیاں ہیں زیب النساء! دل چاہتا ہے تمہیں ساری دنیا سے چھپا کر کہیں دل کے اندر بند کر لوں تا کہ تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ تمہیں نظر نہ لگا دے۔''

وہ اتنی خوب صورت باتیں کرتا تھا کہ وہ مسحور سی ہو جاتی تھی۔ اس کا کہا ہر لفظ جیسے دل کی کتاب پر کندہ ہو گیا تھا کبھی نہ مٹنے کے لیے......

''تم بھی تو کچھ بولا کرو نا۔ کچھ کہو......بس میں ہی بولتا رہتا ہوں۔'' ایک روز اس نے کہا تھا۔

''میں کیا کہوں؟ مجھے آپ کی طرح خوب صورت باتیں کرنا نہیں آتیں۔''

اور وہ مسکرایا تھا۔

''اچھا......تمہارا تو پورا وجود بولتا ہے زیب! تمہاری خوب صورت آنکھیں، تمہارے یہ گلابی ہونٹ، یہ گل رنگ رخسار سب بولتے ہیں میری جان! مجھے بتاتے ہیں کہ اکیلا میں ہی تمہاری رفاقت پر نازاں نہیں ہوں تم نے بھی میری رفاقت کی خواہش کی تھی۔''

اور اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے اعتراف کیا تھا کہ اسے بھی اپنے نصیب کی بلندی پر یقین نہیں آتا اور اس نے بھی راتوں کی خاموشی میں اس کی رفاقت کی دعا مانگی ہے۔

''پتا ہے زیب النساء! جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا اپنے کالج کے ٹرپ پر تو یہاں بالکل اسی جگہ بیٹھ کر یوں ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ میں اپنا ہنی مون یہاں اس شہر میں مناؤں گا۔ جب کہ تب ہمارے سب جاننے والے مری نتھیا گلی وغیرہ جاتے تھے، اس جگہ کے سحر نے مجھے جکڑ لیا تھا تب

دور دور تک میری شادی کا امکان نہیں تھا اور دیکھو ٹھیک تین سال بعد میں یہاں تمہارے ساتھ اپنے ہنی مون ٹرپ پر آیا ہوا ہوں۔ چلو ہاتھ اٹھاؤ، دعا کرتے ہیں ہم ہر سال یہاں آیا کریں گے۔ تجدید محبت کے لیے...... اور یہاں اسی جگہ بیٹھ کر اپنے بچوں کو ان بچوں کی طرح بھاگتے دوڑتے اور خوش ہوتے دیکھیں گے۔''

اس نے وہاں آئے ایک فیملی کے بچوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ شرما گئی تھی۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا پھر ہنس پڑا تھا۔

''اس میں اتنا شرمانے کی کیا بات ہے جب شادی ہوئی تو بچے بھی تو ہوں گے۔''

''اس خوب صورت وادی میں کیا ہمیشہ نہیں رہا جا سکتا؟ چھوٹا سا گھر، اس کی چمنی سے اٹھتا دھواں، گھر کے ساتھ کھیت......'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں......'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''یہاں زندگی بہت سخت ہے۔ ہم میدانی علاقوں کے رہنے والے چند دن یا چند ہفتے تو خوش خوش گزار لیتے ہیں لیکن ہمیشہ یہاں نہیں رہ سکتے۔ تم نہیں جانتی ہو یہاں جب برف باری ہوتی ہے تو یہاں کے رہنے والے بھی پہاڑوں سے نیچے اتر کر ایبٹ آباد وغیرہ چلے جاتے ہیں۔''

اور تب اس سے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ صرف خواب دیکھنے والا شخص نہیں ہے، ایک حقیقت پسند پریکٹیکل بندہ ہے۔ استانی جی کہتی تھیں کہ اگر خواب دیکھنے والا پریکٹیکل نہ ہو تو ساری زندگی صرف خواب دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔

اور پھر وہ زندگی کا حاصل پندرہ دن بیت گئے۔ واپسی پر وہ ایک دن شوگراں بھی ٹھہرے تھے۔

''کاش کچھ ایسا جادو ہوتا کہ خوب صورت لمحوں کو قید کر کے رکھا جا سکتا کہیں کسی ڈبیا میں کسی صندوق میں اور جب دل چاہتا ایک ایک لمحہ نکال کر دیکھ کر پھر محفوظ کر دیا جاتا۔'' اسے خود ہی اپنی سوچ پر دل ہی دل میں ہنسی آئی۔

''کیا سوچ رہی ہو زیب النساء؟''

دیر سے ماسٹر عبدالعزیز اسے دوپٹے کے کونے کو بار بار انگلی پر لپیٹتے اور کھولتے دیکھ رہے تھے۔

''کچھ نہیں، بس یوں ہی...... کچھ خاص نہیں۔'' اس نے چونک کر ماسٹر عبدالعزیز کی طرف دیکھا۔

''آپ کہیں، کیا کہنا ہے آپ کو...... آپ نے بلایا تھا نا۔''

''ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں؟ کیا کہنا تھا، شاید...... ہاں وہ میں کہہ رہا تھا کہ اگر کبھی مجھے کچھ ہو جائے تو تم یہاں نہ رہنا۔ آپا جھناں کے پاس چلی جانا اس کے گاؤں...... تمہیں پتا ہے نا، آپا جنت اماں کی خالہ زاد بہن کی بیٹی ہے۔ بڑی محبتی اور مخلص۔ زہرا کے مرنے پر آئی تھی آخری بار، یاد ہے نا تمہیں؟'' انہوں نے اپنی بات دہرائی تھی۔

''آپا جھناں کی اماں اور میری اماں میں بڑی محبت تھی۔ جب تک اماں زندہ تھیں وہ مہینے دو مہینے بعد چکر لگاتی تھیں، پھر پہلے اماں فوت ہوئیں پھر وہ۔ آپا کی شادی ہوگئی تو بس غمی خوشی پر ہی آنا جانا رہ گیا۔ میں نے آپا کے خاوند کے مرنے کے بعد خط لکھا تھا انہیں کہ وہ یہاں ہمارے پاس ہی آکر رہنے لگیں۔ میں بھی تمہاری طرف سے بے فکر ہو جاؤں گا۔ زہرا کے مرنے کے سات ماہ بعد وہ بھی بیوہ ہوگئی تھیں۔ پر منع کر دیا کہتی تھیں جس گھر میں ڈولی آئی تھی وہاں سے ہی جنازہ اٹھے گا۔ اولاد بھی اللہ نے نہیں دی لیکن جس گھر میں بیاہ کر گئیں، اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔''

''ٹھیک ہی تو کہتی ہیں وہ۔'' زیب النساء نے کئی بار سنی ہوئی بات کو دھیان سے سنا تھا۔

آج کل ماسٹر عبدالعزیز بات کر کے بھول جاتے تھے کہ وہ پہلے بھی کر چکے ہیں۔

''اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر میں جا کر رہنا آسان نہیں ہوتا ابا! اور مجھے بھی اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہیے۔ کچھ بھی ہو جائے میں یہاں ہی رہوں گی اپنے اسی گھر میں اور آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو زندہ رہنا ہے۔ میرے لیے...... حامد کے لیے۔'' وہ ایک بار پھر دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹنے لگی تھی۔

''میں کب جانا چاہتا ہوں زیب النساء! میں تو ہر روز اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے اتنی زندگی ضرور دے کہ تمہارا حامد جوان ہو جائے لیکن آدمی کی مرضی کہاں چلتی ہے۔ جب وقت پورا ہو جائے جانا ہی ہوتا ہے۔ زندگی اور موت کا اختیار تو اسی کے پاس ہے۔ ہم عاجز بندے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

میں بیمار آدمی ہوں۔ ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس لیے بار بار تم سے کہتا ہوں کہ اگر میں نہ رہوں تو تم بس یہاں اکیلے نہ رہنا۔ حامد کو ساتھ لے کر آپا جنتاں کی طرف چلی جانا۔ اگر استانی جی زندہ ہوتیں تو میں کبھی بھی تمہیں اپنا گاؤں چھوڑ کر جانے کو نہ کہتا بلکہ استانی جی کی منت کرتا کہ وہ یہاں تمہارے پاس آ کر رہنے لگیں یا تم ان کی طرف چلی جانا۔''

استانی جی کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا تھا۔ پہلے انہیں فالج کا اٹیک آیا تو فاطمہ آ کر انہیں لاہور لے گئی تھی اور پھر وہاں جانے کے پندرہ بیس دن بعد لاہور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

''لیکن ابا! میں اب کوئی بچی نہیں ہوں۔ بیٹے کی ماں ہوں۔ مجھے بھلا اپنے ہی گاؤں، اپنے ہی گھر میں کیا ڈر ہو سکتا ہے۔'' وہ اپنا گھر کبھی بھی چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔

''جھلی ہو تم زیب النساء! بیٹے کی ماں بن جانے سے تم بوڑھی ہو گئی ہو کیا۔ ابھی پورے بیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہو۔''

وہ اسے سمجھانے لگے تھے کہ اگر کبھی اسے ماسی جنتاں کے گاؤں جانا پڑے تو کیسے جائے گی۔ کہاں سے اسے سواری ملے گی۔ کہاں پھر سے اس نے گاڑی بدلنی ہو گی۔

وہ یوں ہی سر جھکائے، بے دھیانی سے سنتی رہی۔ گاہے بگاہے سر اٹھا کر ان کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی اور اپنی طرف دیکھتی اداس ملول زیب النساء کو دیکھتے ہوئے ان کا دل کٹنے لگا تھا۔ آنکھیں کتنی بجھی بجھی اور چہرہ کیسا بے رنگ سا ہو رہا تھا پھیکا، مرجھایا ہوا سا......

''اتنی اداس اور خاموش نہ رہا کرو زیب النساء! میرے دل میں ہول اٹھنے لگتے ہیں۔ اللہ کی رضا پر راضی ہونا تو پھر اس کی رضا پر خوش رہنا بھی سیکھ لو بیٹی!''

وہ بے اختیار ہی کہہ بیٹھے تھے اور پھر جیسے خود ہی انہیں اپنے لفظوں کی رائیگانی کا احساس ہوا تھا۔

وہ بھلا خوش کیسے رہ سکتی ہے۔ ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔ ابھی تو زخموں پر کھرنڈ بھی نہیں جما ہو گا۔

وہ سر جھکائے ایک بار پھر دوپٹے کے کونے کو انگلی پر لپیٹنے لگی تھی۔

اس روز بھی تو وہ یوں ہی دوپٹے کے کونے کو اپنی انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں

ہوا تھا۔ شاید دو...... نہیں ایک سال آٹھ ماہ یا سات پہلے...... وہ تو جیسے وقت کی گنتی بھی بھول جاتے تھے۔ لیکن اس روز اس کے رخساروں پر گلاب کھلتے تھے اور لحہ لحہ بعد جیسے کوئی خیال رخساروں پر سرخی بکھیر دیتا تھا۔

نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی تو ہزاروں جگنوؤں کی جگمگاہٹ ہوتی۔ وہ ایک دن پہلے ہی اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

”میں نے تحریری امتحان پاس کر لیا ہے، کل ہی میرا رزلٹ آیا ہے۔ مجھے اب دوستوں کے ساتھ مل کر زبانی امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ لیکن میں جب تک ابا جان اور اماں جان واپس نہیں آ جاتے، چکر لگاتا رہوں گا اور ان کے آنے کے بعد ان شاءاللہ زیب کو ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“

”تم بے فکر ہو کر جاؤ بیٹا! اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تیاری کرو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“

وہ خود بھی اس کے لیے بے حد اداس ہو رہے تھے۔ پھر تو اس نے چلے ہی جانا تھا، اچھا ہے کچھ دن اس کے والدین کے آنے تک ان کے پاس رہ لے گی۔

”بلکہ چچا جان! جب میری کہیں پوسٹنگ ہو جائے گی تو ہم آپ کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ یہاں اکیلے رہ کر کیا کریں گے۔“ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

”اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا! میں جاب کرنے والا بندہ ہوں، کہاں نوکری چھوڑ کر تمہارے ساتھ جا سکتا ہوں۔ ملنے آتے رہنا...... اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔“

”جاب بہت کر لی آپ نے، بس میڈیکل بیس پر ریٹائرمنٹ لے لیجیے گا اور ہم نے آپ کو یہاں اکیلا ہرگز نہیں رہنے دینا۔“

وہ اس سمے کتنا اپنا اپنا لگا تھا۔ اور انہوں نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنی بار اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اللہ نے ان کی بیٹی کے نصیب میں اس جیسا شخص لکھا تھا۔ خوب صورت، پڑھا لکھا، خاندانی اور اتنا اچھا۔

”تم خوش ہو نا بیٹی؟“ انہوں نے اس روز اپنے سامنے نگاہیں جھکائے دوپٹے کے پلو سے کھیلتی، زیب النساء سے پوچھا تھا۔

''تمہارے ساتھ ٹھیک رہانا؟ گاؤں کی سیدھی سادی دیہاتی لڑکی سمجھ کر کمتر تو نہیں جانا خود سے؟''

''نہیں ابا! انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ بہت عزت دی اور میں بہت خوش ہوں۔''

''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بس ایک وہم سا ستاتا ہے کبھی کبھی کہ اگر اس کے والدین نہ مانے تو......کیا اس کے متعلق کچھ کہا اس نے تم سے۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ کہیں چھوڑ تو نہیں دے گا؟''

پتا نہیں آج صبح سے یہ وہم اور خدشہ کیوں دل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سب کچھ بہت جلدی جلدی ایسے ہی ہو گیا تھا جیسے انہوں نے چاہا تھا تو پھر اب جانے کیوں یہ وہم ستانے لگا تھا۔

''نہیں ابا! بھلا وہ کیوں چھوڑیں گے مجھے۔ انہیں آپ نے مجھ سے شادی پر مجبور تو نہیں کیا تھا، ان کی مرضی نہ ہوتی تو وہ انکار کر دیتے۔''

اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تھی۔

''اور وہ کہتے ہیں ان کے والدین کو کبھی بھی ان کی پسند پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ وہ دوستانہ مزاج کے ہیں اور اپنے بچوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے قائل نہیں ہیں۔''

اس کے لہجے میں ہی نہیں، اس کی آنکھوں میں بھی یقین کی روشنی تھی۔

''بس یوں ہی خیال آ گیا کہ بارات کے ساتھ اس کا بھائی نہیں آیا تھا تو اس نے کہا تھا نا کہ وہ بھائی کو لائے گا۔''

انہوں نے اپنے وہم کی وجہ بتائی تھی۔

''جی ابا! انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے وہ بھائی اپنی یونی ورسٹی کے طلبا کے ساتھ کسی تعلیمی ٹرپ پر گئے ہوئے تھے۔ اور بڑے بھائی اور بھابھی سے ابھی وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' وہ اچھی بیویوں کی طرح اپنے شوہر کا دفاع کر رہی تھی۔

ماسٹر عبدالعزیز کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''خوش رہو بیٹا!''

''ابا! میں خوش ہوں، آپ نے میری بالکل فکر نہیں کرنی۔ بس اپنا دھیان رکھنا ہے...... اپنی

صحت کا، آپ کو پتا ہے نا، میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

اور انہوں نے اس کی دائمی خوشیوں کی دعا کی تھی لیکن کچھ دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور ان کی یہ دعا بھی قبول نہیں ہوئی تھی۔ مصروفیت کے باوجود اس نے اپنے والدین کی واپسی سے پہلے گاؤں کے دو چکر لگائے تھے اور ایک دن رات رہ کر چلا گیا تھا۔

"اگلی بار آؤں گا تو زیب النساء کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے جانے سے پہلے ماسٹر عبد العزیز سے کہا تھا۔

"آنے سے پہلے خط لکھ دوں گا کہ اماں جان اور ابا جان کو ساتھ ہی لے کر آؤں گا۔ آپ زیب النساء کی رخصتی کی تیاری رکھیے گا۔ ویسے کا فنکشن لاہور میں ہی ہوگا۔"

اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس کا خط آیا تھا ماسٹر عبد العزیز کی طرف۔

"اماں جان اور ابا جان واپس آ گئے ہیں۔ پہلے چند دن تو لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ رہا، پھر میری خالہ جان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ کچھ عرصہ سے وہ بیمار تھیں۔ اماں جان ان کے پاس ہاسپٹل میں ہیں، مجھے وہاں ان سے شادی کی بات کرنا مناسب نہیں لگا۔ جیسے ہی خالہ جان کی طبیعت ٹھیک ہوتی ہے، وہ گھر آتی ہیں تو میں ان سے بات کر کے آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔ دراصل میں پہلے اماں جان سے ہی بات کرنا چاہتا ہوں، وہ سارا معاملہ سنبھال لیں گی۔"

☆......☆......☆

اور پھر کتنے سارے دن گزر گئے۔ نہ وہ خود آیا نہ اس کا کوئی خط آیا۔ اسکول جا کر سب سے پہلے وہ کلرک آفس میں جاتے کہ شاید ان کے اسکول سے چلے جانے کے بعد ڈاک آئی ہو۔

لیکن ہر روز مایوسی ہوتی......

گھبرا کر وہ استانی جی سے کہتے۔

"آپا جی! اتنے دن گزر گئے۔ نہ وہ خود آیا، نہ اس کا کوئی خط ہی آیا ہے۔ کہیں اس کے والدین نے اسے منع تو نہیں کر دیا۔"

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے ماسٹر جی، کہ اس کی خالہ زیادہ بیمار ہوگئی ہوں یا پھر خدانخواستہ......

کیا اس نے اپنا کوئی اتا پتا فون نمبر نہیں دیا تھا زیب بیٹی کو شہر جا کر فون کر لیں۔'' استانی جی نے انہیں تسلی دی تھی۔

''نمبر تو دیا تھا اس نے زیب النساء کو اپنے گھر کا بھی اور اپنے دوست کے گھر کا بھی کہ اگر کبھی کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو فون کر لیں۔ لیکن زیب النساء نے کاغذ کا وہ پرزہ اپنے دوپٹے کے کونے میں باندھ دیا تھا کہ بعد میں ڈائری میں لکھ لے گی اور دوپٹا دھل گیا اور نمبر والا کاغذ بھی دھل کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔'' وہ نادم سے ہوئے تھے، جیسے یہ ان کی غلطی ہو۔

''تو پھر کچھ دن اور انتظار کر لیں، میں اقبال سے پتا کرواتی ہوں۔'' استانی جی نے انہیں حوصلہ دیا تھا۔

''وہ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں لگتا تھا ضرور کسی پریشانی میں ہوگا۔ چند دن دیکھ لیتے ہیں۔ اقبال نے ادھر آنا تو تھا، نہ آیا تو میں خود شہر جا کر اقبال سے ساری معلومات لے کر آتی ہوں۔''

لیکن استانی جی کے جانے سے پہلے ہی اقبال آ گیا تھا اور اس کے پاس کچھ اچھی خبر نہ تھی۔

استانی جی کو کتنی دیر یقین نہیں آیا تھا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے اقبال!''

''ایسا ہو گیا ہے خالہ اور اللہ کی مرضی......''

اقبال کا موڈ پتا نہیں کیوں اتنا خراب تھا پھر بھی وہ ان کے کہنے پر ان کے ساتھ ماسٹر عبدالعزیز کے گھر چلا آیا تھا۔

''تم میرے ساتھ چلو اقبال، مجھ میں ہمت نہیں ہے ماسٹر صاحب کو یہ بتانے کی۔''

ماسٹر صاحب برآمدے میں چارپائی پر لیٹے تھے۔ زیب النساء ان کا بازو دبا رہی تھی اور وہ اسے بہت محبت سے دیکھ رہے تھے۔

ان دنوں زیب النساء جیسے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ انہیں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے سے روشنی سی پھوٹتی ہو۔

''زیب! تم پریشان تو نہیں ہونا اس کے نہ آنے سے......''

''نہیں ابا! مجھے یقین ہے وہ مصروف ہوں گے۔ شاید ان کا امتحان یا انٹرویو ہو رہا ہو۔ یا کسی اور وجہ سے نہ آپا رہے ہوں۔''

''پر اسے خط تو لکھنا چاہیے تھا نا زیب النساء...... امتحان تو مجھے یقین ہے اس نے سب پاس کر لیے ہوں گے۔''

❁ ❁

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 10

وہ اپنی پریشانی اس سے چھپا نہیں پا رہے تھے۔

''جی ابا! جب آئیں گے تو میں ضرور ان سے پوچھوں گی کہ خط کیوں نہیں لکھا، ابا اتنے پریشان تھے۔''

''تم وہاں جا کر اس بڑے شہر میں رہ کر اپنے ابا کو بھول نہ جانا۔'' وہ یوں ہی دل بہلانے کو باتیں کر رہے تھے، دل جو واہموں اور اندیشوں میں گھرا تھا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں ابا! میں بھلا آپ کو بھول سکتی ہوں۔'' اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

''کیا خبر نئے رشتہ داروں میں جا کر تمہیں اپنا یہ غریب ماسٹر ابا یاد ہی نہ آئے۔''

تب ہی دروازہ کھلا تھا اور استانی جی کچھ گھبرائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے ساتھ آنے والا اقبال دروازے کے پاس ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

''میرے ساتھ اقبال بھی آیا ہے ماسٹر صاحب!'' وہ بوکھلائی سی تھیں۔ انہوں نے زیب النساء کی طرف دیکھا تھا جو اپنا دوپٹا درست کرتی کمرے میں چلی گئی تھی۔

''آ جاؤ اقبال بیٹا!'' انہوں نے اقبال کو بلا لیا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر چارپائی کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ استانی جی پریشان سی ایک طرف کھڑی تھیں۔

''بیٹھ جائیں آپا جی!'' انہوں نے ذرا فاصلے پر دائیں طرف پڑے موڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

''سب ٹھیک ہے نا، خیریت ہے نا؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔''

''ہاں وہ ماسٹر صاحب، خیریت تو نہیں ہے۔ یہ اقبال......'' وہ اقبال کی طرف دیکھنے لگیں۔ آنکھوں میں نمی سی پھیلنے لگی تھی۔

ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''وہ ماسٹر صاحب!'' اقبال کھنکارا۔ ''میں لاہور گیا تھا دس بارہ دن پہلے تو مجھے آپ کے داماد کی موت کا پتا چلا تھا۔ بے چارے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، جگہ پر ہی مر گیا۔''

''نہیں۔'' وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے، جس کی آنکھوں میں عجیب سی سفا کی تھی۔

''میں تو سمجھا تھا آپ لوگوں کو علم ہوگا۔ زیب کو تو وہ ساتھ ہی لے کر گیا ہوگا۔ بیوی تھی، بھلا یہاں کیوں چھوڑ کر جاتا۔ یہ تو خالہ نے بتایا کہ اسے آنا تھا لیکن پھر نہ وہ آیا اور نہ ہی کوئی خیر خبر آئی اس کی۔ میں تو جی حیران ہی رہ گیا۔ اس کی تو موت کو بھی بیس پچیس دن ہو گئے ہوں گے۔ صحیح سے تو مجھے پتا نہیں، مجھے تو وہاں لاہور میں اس کا دوست ملا تھا، وہ ہی جس کے ساتھ وہ شکار کے لیے آیا تھا، اس نے ہی بتایا تھا کہ کسی دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا، ٹرک نے کچل دیا دونوں کو۔''

وہ دل پر ہاتھ رکھے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اخبار میں بھی خبر چھپی تھی۔ آپ نے شاید دھیان نہیں دیا ہوگا۔'' وہ اب گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ کہاں روز اخبار پڑھتے تھے۔ نیاز شہر جاتا تو لے آتا تھا۔

استانی جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ انہیں بھی تو کتنا عزیز ہو گیا تھا۔ کتنا مہذب اور ادب و احترام کرنے والا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' بڑی دیر بعد ان کے لبوں سے ٹوٹے ٹوٹے سے لفظ نکلے تھے۔

''ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا ماسٹر صاحب، یہ بھی ہو سکتا ہے ابھی ہم یہاں بیٹھے بیٹھے اگلے جہان روانہ ہو جائیں۔'' وہ عجیب طرح سے مسکرایا تھا۔

''میری زیب النساء کی خوشیوں کی عمر اتنی مختصر تھی۔''

آنسوؤں نے ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں نرمی پیدا کی اور پھر وہ رخساروں پر پھسل آئے تو اقبال اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور ایک بازو ان کے گرد حمائل کر کے انہیں اپنے

ماسٹر عبدالعزیز پریشان سے باری باری دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''وہ ماسٹر صاحب!'' اقبال کھنکارا۔ ''میں لاہور گیا تھا دس بارہ دن پہلے تو مجھے آپ کے داماد کی موت کا پتا چلا تھا۔ بے چارے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا، جگہ پر ہی مر گیا۔''

''نہیں۔'' وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے، جس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی تھی۔

''میں تو سمجھا تھا آپ لوگوں کو علم ہوگا۔ زیب کو تو وہ ساتھ ہی لے کر گیا ہوگا۔ بیوی تھی، بھلا یہاں کیوں چھوڑ کر جاتا۔ یہ تو خالہ نے بتایا کہ اسے آنا تھا لیکن پھر نہ وہ آیا اور نہ ہی کوئی خیر خبر آئی اس کی۔ میں تو جی حیران ہی رہ گیا۔ اس کی تو موت کو بھی بیس پچیس دن ہو گئے ہوں گے۔ صحیح سے تو مجھے پتا نہیں، مجھے تو وہاں لاہور میں اس کا دوست ملا تھا، وہ ہی جس کے ساتھ وہ شکار کے لیے آیا تھا، اس نے ہی بتایا تھا کہ کسی دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا، ٹرک نے کچل دیا دونوں کو۔''

وہ دل پر ہاتھ رکھے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اخبار میں بھی خبر چھپی تھی۔ آپ نے شاید دھیان نہیں دیا ہوگا۔'' وہ اب گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ کہاں روز اخبار پڑھتے تھے۔ نیاز شہر جاتا تو لے آتا تھا۔

استانی جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ انہیں بھی تو کتنا عزیز ہوگیا تھا۔ کتنا مہذب اور ادب واحترام کرنے والا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟'' بڑی دیر بعد ان کے لبوں سے ٹوٹے ٹوٹے سے لفظ نکلے تھے۔

''ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا ماسٹر صاحب، یہ بھی ہوسکتا ہے ابھی ہم یہاں بیٹھے بیٹھے اگلے جہاں روانہ ہوجائیں۔'' وہ عجیب طرح سے مسکرایا تھا۔

''میری زیب النساء کی خوشیوں کی عمر اتنی مختصر تھی۔''

آنسوؤں نے ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں نرمی پیدا کی اور پھر وہ رخساروں پر پھسل آئے تو اقبال اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور ایک بازو ان کے گرد حمائل کر کے انہیں اپنے

ساتھ لگا لیا۔ وہ اس کا سہارا پاتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ استانی جی دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر زیب النساء کے پاس چلی گئی تھیں۔

حامد نیند میں کسمسایا، ذرا سی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تو وہ چونک کر اسے تھپکنے لگے۔

زیب النساء کچھ دیر سوئے ہوئے حامد کو دیکھتی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ابھی کچھ دیر سوتا رہے گا، نیند پوری نہیں ہوئی اس کی، میں ذرا ہانڈی چڑھا دوں اور آٹا گوندھ کر رکھ دوں۔ جاگ گیا تو پھر گود سے اترے گا ہی نہیں۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

''کاش میں جلد بازی نہ کرتا۔ اس کی عمر کی لڑکیاں تو ابھی گھروں میں بیٹھی ہیں۔ لیکن میرے واہموں اور خوف نے مجھ سے جلد بازی کروائی۔ کیا تھا اگر میں اس کی شادی نہ کرتا۔ پڑھتی رہتی۔ بارہ کر لیتی تو شہر جا کر ہوسٹل میں داخل کروا دیتا۔ یہ میرا ڈر، ساری غلطی میری ہے۔ لیکن نہیں۔ میں کیا اور میرے ارادے کیا......

تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا۔ یہ آزمائش آنی ہی تھی۔ یہ دکھ جھیلنا نصیب میں لکھا تھا۔ وہ بدنصیب اتنی ہی عمر لکھوا کر لایا تھا۔ پتا نہیں بے چارے کے ماں باپ کا کیا حال ہوگا بیٹے کی جواں مرگی پر کیسے تڑپتے ہوں گے۔ میرا حامد چھوٹی عمر میں ہی چلا گیا تھا لیکن کیسے تڑپتے تھے ہم دونوں مہینوں تک راتوں کو ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی، آدھی رات کو اٹھ کر رونے لگتے تھے۔''

کچھ دنوں بعد وہ ذرا سا سنبھلے تو انہیں خیال آیا تھا کہ انہیں زیب النساء کو لے کر اس کے سسرال میں جانا چاہیے۔ بہو ہے ان کی اور پھر ماں بننے والی ہے۔ اگر اس نے ابھی تک اپنے والدین سے ذکر نہیں کیا ہوگا تب بھی بیٹے کی نشانی کا سن کر ضرور بہو کو گلے سے لگا لیں گے۔ بیٹے کی ہونے والی اولاد کے متعلق جان کر شاید ان کی تڑپ میں کچھ کمی آ جائے۔ وہ کتنی تعریف کرتا تھا اپنے ماں باپ کی۔

☆......☆......☆

اس روز استانی جی اور اقبال ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ استانی جی تو ان دنوں ہر روز ہی گھر

کے کاموں سے فارغ ہو کر آ جاتی تھیں۔ انہیں زیب النساء کی حالت ٹھیک نہیں لگتی تھی، کبھی تو وہ سارا دن خاموش بیٹھی رہتی، کھانے پینے کا بھی ہوش نہ ہوتا۔ استانی جی زبردستی منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالتیں اور کبھی بیٹھے بیٹھے جو رونے لگتی تو پھر روئے ہی چلی جاتی۔

استانی جی آس پاس کی کچھ بچیوں کو بلا کر قرآن پڑھنے بیٹھتیں تو اس کے ہاتھ میں بھی سپارہ پکڑا دیتیں لیکن وہ سپارہ گود میں رکھے بس خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ اس روز بھی استانی جی آئی ہوئی تھیں۔ ماسٹر عبدالعزیز بھی گھر پر ہی تھے کہ اقبال جو اپنے کسی کام سے ان سے ملنے آیا تھا، ان کے گھر تالا دیکھ کر ادھر ہی چلا آیا تھا اور ماسٹر عبدالعزیز نے اسے اندر ہی بلا لیا تھا۔ اور وہ جو کل سے سوچ رہے تھے کہ انہیں زیب النساء کو لے کر ایک بار تو اس کے سسرال ضرور جانا چاہیے، اپنی سوچ کا اظہار استانی جی اور اقبال کے سامنے کیا تاکہ ان کی رائے بھی معلوم ہو سکے۔ استانی جی کو ان کی بات صحیح لگی تھی۔

''آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب! ایک بار تو آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ زیب النساء کے لیے نہ سہی، اس کے ہونے والے بچے کے لیے۔ تمہارا کیا خیال ہے اقبال، تمہیں کچھ اتا پتا ہے اس کے گھر کا۔'' استانی جی اب اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں، مجھے تو کچھ علم نہیں۔'' وہ جیسے چونکا تھا۔ ''اور ماسٹر صاحب اتنے بڑے شہر میں بھلا کہاں اس کا گھر تلاش کریں گے۔''

''اور وہ جو اس کا دوست رحیم یار خان میں رہتا ہے، جس کے گھر وہ آ کر ٹھہرا کرتا تھا، اس کو تو پتا معلوم ہوگا نا۔'' استانی جی کو اچانک خیال آیا تھا۔ ''اس نے بتایا تھا وہ لاہور میں اکٹھے پڑھتے تھے۔''

''ہاں وہ......'' اقبال نے ایک اطمینان بھری سانس لی تھی۔ ''اسے یقیناً پتا ہوگا لیکن ملتان سے واپس آ کر جب میں اپنے کسی کام سے اسے ملنے گیا تو پتا چلا کہ وہ تو اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو گیا ہے۔ وہاں ہی جاب کر لی ہے اس نے پھر بھی میں وہاں جاؤں گا تو آس پاس سے پتا کروں گا۔ شاید کسی کو اس کا کراچی کا پتا وغیرہ معلوم ہو۔''

''ایڈریس کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے آپا جی! نکاح نامے کی کاپی ہے نا میرے پاس، اس میں پتا

لکھا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔''

ماسٹر عبدالعزیز کے ذہن میں اچانک ہی آیا تھا کہ نکاح نامے میں پتا لکھا ہوتا ہے۔ دولہا کا بھی اور گواہوں کا بھی۔

''ٹھیک ہے، میں آج ہی فاطمہ کو خط لکھ دیتی ہوں۔ ہم پہلے اسی کے گھر جائیں گے۔ پھر اس کے میاں کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ لاہور اس کا شہر ہے، سب گلی کوچوں کا پتا ہوگا۔'' استانی نے انکار نہیں کیا تھا۔ اقبال نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا تھا۔

''پتا نہیں اس نے اپنی شادی کے متعلق گھر میں بتایا بھی تھا یا نہیں اور آپ لوگوں کے جانے پر جانے ان کا کیا ردعمل ہو۔ آپ کی بات پر یقین بھی کریں گے یا نہیں۔''

''یقین نہ کرنے والی کیا بات ہے بیٹا! نکاح نامے کی کاپی ساتھ لے جائیں گے۔ ان کا حق ہے کہ انہیں اپنے بیٹے کی ہونے والی اولاد کے متعلق علم ہو۔ ہم اپنا فرض ادا کریں گے۔ آگے ان کی مرضی قبول کریں یا نہ کریں۔''

ماسٹر عبدالعزیز فیصلہ کر چکے تھے کہ ہونے والے بچے کو اس کے سگے رشتوں سے محروم کرنے کا گناہ وہ اپنے سر نہیں لیں گے۔ ایک بار کوشش کرنا ان کا فرض بنتا ہے۔ آگے جو اللہ کی مرضی ہو۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ماسٹر جی! لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔ میں کل لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے آپ وہ پتا دیں جو نکاح نامے میں ہے۔ میں پہلے ان لوگوں سے مل کر آتا ہوں کہ کیسے اور کس طرح کے لوگ ہیں۔ پھر آپ زیب النساء کو لے کر خالہ جان کے ساتھ چلے جایئے گا۔ مناسب ہوا تو میں اس کی تعزیت کے بعد شادی کا ذکر بھی کر دوں گا۔ مجھے اپنے کام سے لاہور جانا ہے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ میں آج خالہ سے اپنی رقم لینے آیا ہوں تو آپ کا ارادہ بھی پتا چل گیا۔ ساری معلومات لیتا آؤں گا۔''

اس نے اپنی بچت استانی جی کے پاس ہی رکھوائی ہوئی تھی۔ اپنے بھائیوں اور بھابیوں پر زیادہ اعتبار نہیں تھا اسے۔

''کیا لاہور میں کوئی کاروبار شروع کرنے والے ہو؟''

اس نے کئی بار لاہور میں کوئی چھوٹی موٹی دکان کھولنے کا ارادہ استانی جی کے سامنے ظاہر کیا تھا۔

''نہیں میں باہر جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک بندے سے بات ہوئی ہے۔ آدھے پیسے ابھی لے گا، آدھے بعد میں وہاں پہنچ کر۔'' اس نے استانی جی کو بتایا تو ماسٹر عبدالعزیز جو نکاح نامے کی کاپی لینے کمرے کی طرف جا رہے تھے، جاتے جاتے رک گئے تھے۔

''میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ پیسے لے کر اکثر غائب ہو جاتے ہیں۔ اپنے وطن میں ہی کوئی چھوٹا موٹا کام بنا لو۔''

''اعتباری بندہ ہے ماسٹر جی!'' اقبال مسکرایا تھا۔ ''اور میں بہت عرصے سے باہر جانے کے لیے پیسے جمع کر رہا تھا ماسٹر جی، باہر جانے کی بڑی چاہ ہے مجھے۔''

ماسٹر جی نے مزید کچھ کہے بغیر اسے نکاح نامے کی کاپی لا کر دکھا دی تھی۔ وہ پتا نوٹ کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کب تک واپس آؤ گے بیٹا؟'' انہوں نے نکاح نامے کی کاپی اس کے ہاتھ سے پکڑی۔

''پرسوں تک آ جاؤں گا ماسٹر جی۔ میرا اور تو کوئی کام نہیں ہے، بس رقم پکڑانی ہے اور زیب کے سسرال والوں سے ملنا ہے۔''

وہ چلا گیا تو ماسٹر عبدالعزیز جیسے اسی لمحے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے تھے۔

''تم ایک بیگ میں دو تین جوڑے کپڑے رکھ لینا اپنے اور ایک میرا بھی، کیا پتا وہ لوگ تمہیں روک لیں۔ عدت تک وہاں ہی رکنے کو کہیں یا پھر...... خیر تم تیاری رکھنا۔ ایک بار تو جانا ہی ہے اقبال آئے گا تو کیا پتا وہ ساتھ ہی چلنے کو کہے۔'' انہوں نے زیب النساء سے کہا تھا۔

اقبال کے آنے تک انہوں نے نہ جانے کیا کیا سوچ لیا تھا۔ خود ہی سوچتے خود ہی رد کر دیتے۔

''نہ قبول کیا انہوں نے میری بیٹی اور اس کے ہونے والے بچے کو تو نہ سہی۔ مجھ پر بار نہیں ہے میری بیٹی، میں تو بس اپنا فرض پورا کرنے جاؤں گا۔''

انہوں نے نہ جانے کتنی باتیں سوچ ڈالی تھیں لیکن جو کچھ اقبال نے آ کر بتایا وہ تو ان کے تصور

میں بھی دور دور تک کہیں نہیں تھا۔

"یہ پتا جو نکاح نامے میں لکھا ہے، نہ جانے کس کا ہے۔ میں گیا تھا اس پتے پر وہاں جو لوگ رہتے تھے وہ تو اسے جانتے بھی نہیں تھے۔ میں نے اس محلے میں چند اور لوگوں سے بھی پتا کیا تو انہوں نے کہا اس پوری گلی میں اس نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ نہ ہی پچھلے چند ماہ میں کسی کے جوان بیٹے کا ایکسیڈنٹ وغیرہ ہوا ہے۔ مجھے آپ کی پریشانی کا خیال تھا اس لیے ڈھونڈ کر مشکل سے اس لڑکے سے ملا جس کے ساتھ وہ شکار پر آیا تھا، مجھے کچھ اندازہ تھا کہ جہاں وہ مجھے ملا تھا وہاں ہی آس پاس کہیں جاب کرتا ہے، اس نے تو اور ہی کہانی سنائی۔ کہہ رہا تھا وہ لاہور کا رہنے والا نہیں تھا، سیالکوٹ کے قریب کسی گاؤں سے آیا تھا۔ یہاں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے رشتہ دار اس کی میت اس کے گاؤں لے گئے تھے۔"

"لیکن اسے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی بیٹا!" وہ بے حد حیران تھے۔

"اب یہ تو وہ خود ہی جانتا ہوگا۔ آپ نے بھی تو بغیر سوچے سمجھے ایک اجنبی کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما دیا۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی اور پیشانی پر بل پڑے تھے۔

"میرے آنے کا ہی انتظار کر لیتے تو میں کہیں نہ کہیں سے اس کے متعلق تحقیق کروا لیتا۔ اب پتا نہیں کیا ارادے تھے اس کے۔ آپ یہاں اس چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر باہر کیا ہو رہا ہے۔ شکر کریں مر گیا وہ جانے زیب النساء کو ساتھ لے جا کر کہاں بیچ باچ آتا۔"

"نہیں، وہ ایسا نہیں تھا بیٹا!" استانی جی کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"رہنے دیں خالہ! آپ بس شکل اور حلیہ دیکھ کر بہت شریف سمجھ بیٹھی تھیں اسے۔ کم از کم آپ تو مشورہ دے سکتی تھیں نا ماسٹر صاحب کو کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دیں، جس کے آگے پیچھے کا پتا ہو نہیں، گھر بار، خاندان سب کا۔"

ماسٹر عبدالعزیز کو لگا تھا جیسے اس کے ہونٹوں سے لفظ نہیں نکل رہے تھے، زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں جو ان کے دل میں پیوست ہوئے جاتے تھے۔

حامد جاگ کر رونے لگا تو وہ چونک کر چند لمحے تو یوں ہی بے خیالی میں اسے دیکھے گئے پھر گود میں اٹھالیا۔

''نہ......نہ! رونا نہیں میری جان! اماں ابھی آ رہی ہیں۔'' وہ اسے اٹھا کر کھڑے ہو گئے تھے، تب ہی اس کے رونے کی آواز سن کر زیب النساء باورچی خانے سے باہر آئی۔

''لو تم اسے سنبھالو بھوک لگی ہو گی اسے میں ہانڈی دیکھ لیتا ہوں۔'' انہوں نے حامد کو زیب النساء کے حوالے کیا جو ماں کی طرف لپک رہا تھا۔

''دال پکنے کے لیے دھیمی آنچ پر رکھ دی ہے، دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' زیب النساء نے حامد کو لیتے ہوئے اس کی آنکھوں کو اور رخساروں کو چوما تھا۔ آنکھیں جو بالکل اس کے جیسی تھیں۔ خوب صورت، سحر طاری کرتی مغل شہزادوں جیسی آنکھیں۔

اور پھر اسے لے کر کمرے میں چلی گئی۔ ماسٹر عبدالعزیز کچھ دیر کھڑے رہے پھر واپس چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''شکر ہے اللہ کا کہ اس نے زیب النساء کو حامد دے دیا۔ زندگی گزارنے کا آسرا اور جواز مل گیا ہے اسے۔''

ورنہ انہیں تو لگتا تھا جیسے وہ جی نہ پائے گی، کسی روز اچانک آنکھیں بند کر لے گی۔ سارا دن خاموش چپ چاپ پڑی رہتی تھی۔ استانی جی نے سگی ماں کی طرح ہی اس کا خیال رکھا تھا۔ جب حامد پیدا ہوا تھا وہ اسے اپنے ساتھ ہی گھر لے گئی تھیں۔ اور پورا ایک ماہ اپنے گھر ہی رکھا تھا۔

''کمزور ہے ابھی اسے دیکھ بھال کی ضرورت ہے ماسٹر صاحب! پھر ابھی اسے بچے کو سنبھالنا بھی ٹھیک طرح سے نہیں آتا۔ اسے ہر وقت کسی کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی طرف وقت کے وقت آتی ہوں، گھر میں بچیاں دو وقت قرآن پڑھنے آتی ہیں۔ آپ بھی اب کیسے ہر روز اسکول جاتے ہوئے اسے چھوڑ کر جائیں اور پھر رات کو لینے آئیں تو بہتر ہے کہ میں اسے گھر ہی لے جاؤں۔''

اور وہ ان کے بے حد ممنون ہوئے تھے۔

''میں عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا آپا جی۔ آپ نے زہرا کے بعد میری بچی کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں ماسٹر صاحب میرے لیے زیب النساء فاطمہ جیسی ہی ہے۔ پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔''

اور انہوں نے حامد کی پیدائش پر پہلی بار اتنے دنوں کے بعد اسے پرسکون دیکھا تھا اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور زیب النساء سے پوچھ کر ہی اس کا نام حامد رکھا تھا۔

''اگر تم نے کوئی نام نہیں سوچا تو تمہارے بھائی کے نام پر اس کا نام رکھ دیں۔''

''جی ابا!'' اس نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

حامد کی پیدائش کے بعد اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ گو بہت زیادہ نہیں لیکن کرتی تھی۔ گھر کے کام بھی پہلے کی طرح کرنے لگی تھی۔ نور بھری کی طرف سے بھی ان دنوں وہ مطمئن تھے کہ وہ گھر خالی کر کے اپنے بیٹے کے ساتھ راجن پور چلی گئی تھی۔ استانی جی بھی دن میں ایک آدھ چکر لگا لیتی تھیں تو وہ اسکول چلے جاتے تھے۔ اپنے طور پر انہوں نے رحیم یار خان جا کر خود بھی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ نکاح نامے میں اس کے گواہوں کا پتا موجود تھا۔ ایک تو اس کا وہی دوست تھا اور دوسرے اس کے والد تھے۔ اقبال نے صحیح بتایا تھا کہ وہ لوگ رحیم یار خان سے چلے گئے ہیں۔ ایک پڑوسی نے بتایا تھا کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ لیکن زیب النساء کو پتا نہیں کیوں اقبال کی بات کا یقین نہیں تھا۔

''میرا دل کہتا ہے ابا کہ وہ زندہ ہیں۔ اقبال بھائی نے جھوٹ بولا ہے۔''

''لیکن اقبال جھوٹ کیوں بولے گا؟'' پہلی بار جب اس نے کہا تو وہ حیران ہوئے تھے۔

''پتا نہیں لیکن بس کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وہ ہیں۔'' وہ خود وضاحت نہیں کر پاتی تھی کہ کیوں لیکن اس کے اندر اس کے آ جانے کی امید ختم نہیں ہوئی تھی۔

''فرض کرو اقبال نے غلط بیانی کی ہو تو کیا وہ تمہیں لینے نہ آتا، وعدہ کیا تھا نا اس نے کہ وہ جلد

ہی اپنے ماں باپ کو لے کر آئے گا۔ تو کیا تمہیں لگتا ہے زیب النساء کہ اس نے ہم سے جھوٹ بولا، دھوکا کیا۔ وہ ایسا نہیں تھا بیٹی۔ وہ تو شکل وصورت اور اطوار سے اعلیٰ خاندان کا لگتا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور آتا۔"

وہ اسے سمجھاتے تو وہ چپ ہو جاتی تھی لیکن چند دنوں بعد وہ پھر ایسی ہی کوئی بات کر دیتی تھی۔

اب تو حامد بھی آٹھ ماہ کا ہو گیا تھا اور ایک بار پھر وہ اس کے لیے پریشان رہنے لگے تھے کہ ماسی نور بھری ایک بار پھر گاؤں واپس آ گئی تھی اور دیور سے جانے کیا رونا رویا تھا کہ اس نے اپنا گھر اسے ہی رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ خود تو وہ چند دن بھی گاؤں میں نہیں رہا تھا کہ بیٹی نے ادھر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے راہ چلتے ادھر ادھر سے سنا تھا کہ بہو سے لڑ جھگڑ کر آ گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اسلم نے راجن پور میں کسی سے شادی کر لی تھی اور وہاں ہی رہ رہا تھا۔ انہیں ایک دن راستے میں ہی روک کر افسوس کرنے لگی تھی۔

"بڑا افسوس ہوا ماسٹر جی تمہارے داماد کی موت کا سن کر۔ تم نے تو بڑا افسر ڈھونڈا تھا پر تیری بیٹی کے نصیب میں نہیں تھا۔ بڑے افسر کی بیوی بن کر عیش کرنا۔ اللہ کی مرضی۔"

اور کتنے ہی دن تک اس کا طنزیہ لہجہ انہیں تکلیف دیتا رہا تھا۔ استانی جی نہیں تھیں جن سے دل کا حال کہہ کر وہ مطمئن ہو جاتے، سو ایک روز وہ چوہدری عبدالمالک کی طرف چلے گئے تھے جن کے بچوں کو اب وہ نہیں پڑھاتے تھے۔

چوہدری عبدالمالک نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر زیب النساء کی شادی کر دیں۔ وہ ابھی کم عمر ہے۔ جوان ہے، اتنی لمبی زندگی تنہا کیسے گزارے گی۔ پھر ہمارے دین میں بھی بیوہ کی شادی کر دینے کو کہا گیا ہے۔ تب سب سے پہلے انہیں اقبال کا ہی خیال آیا تھا۔ وہ خواہش مند تھا، اس کے متعلق وہ جانتے تھے۔ خاندان، گھر بار سب کا پتا تھا۔ سو وہ ایک روز اس کے گھر چلے گئے تو اس کے بھائیوں کو خود اس کی خبر نہیں تھی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ کسی ایجنٹ کو رقم دے کر جرمنی جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن پھر جرمنی پہنچا نہیں پہنچا، انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔ اس نے نہ کوئی خط لکھا تھا نہ ہی ڈیڑھ

سالوں میں کسی اور ذریعے سے کوئی رابطہ کیا تھا۔

اقبال کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے اپنے دو کولیگز سے بھی کہہ رکھا تھا۔لیکن ابھی تک کسی نے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں بتایا تھا۔اور اگر کوئی رشتہ مل بھی جاتا تو زیب النساء کسی بھی صورت شادی کے لیے تیار نہ ہوتی کہ انہوں نے ایک روز یوں ہی شادی کا سرسری ساذکر کیا تھا تو اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی۔

''لیکن تنہا زندگی کیسے گزاروگی؟'' انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میرا بیٹا ہے نا، میرا حامد، میرا شہزادہ۔''

''یہ ابھی بہت چھوٹا ہے زیب النساء۔'' وہ چاہتے تھے جلد از جلد اس کی شادی کر دیں۔

''آپ ہیں نا۔بس آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ مجھے کبھی شادی کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔''

اور وہ خاموش ہو گئے تھے کہ شاید کچھ وقت گزر جائے تو اسے سمجھ آجائے لیکن اندر سے ان کا دل کمزور پڑتا جا رہا تھا۔موت کے قدموں کی چاپ اپنے آس پاس سنائی دینے لگی تھی۔

اس پر نور بھری کا پھر واپس آ کر پڑوس میں رہنے لگنا......

پچھلے دنوں انہوں نے اسلم کو بھی دیکھا تو گھبرا کر زیب النساء سے کہہ دیا تھا کہ انہیں اگر کچھ ہو جائے تو وہ آپا جنتاں کے پاس چلی جائے اور وقتاً فوقتاً اپنی بات دہراتے رہتے۔

انہوں نے رخ موڑ کر کمرے کی طرف دیکھا۔زیب النساء کمرے میں ہی تھی اور کمرے سے حامد کی قلقاریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔چند لمحے وہ یونہی بے خیالی میں دیکھتے رہے، پھر چارپائی پر لیٹتے ہوئے رخ دیوار کی طرف کر لیا۔آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

''یا اللہ! مجھے اتنی حیاتی دینا کہ میرا حامد اتنا بڑا ہو جائے کہ مجھے دنیا سے جاتے ہوئے بیٹی کے تنہا رہ جانے کا دکھ نہ ہو۔میری بیٹی بہت معصوم ہے اسے بل چھل نہیں آتے۔یہ دنیا کی مکاریوں کو نہیں سمجھ سکتی میرے اللہ!'' آنسو ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیہ بھگونے لگے تھے۔انہوں نے کبھی شکوہ نہیں کیا تھا، ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہے تھے لیکن اس وقت وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے تو کبھی کسی کے

ساتھ کچھ برا نہیں کیا، بلکہ کسی کے لیے برا سوچا تک نہیں۔ زہرا بھی تو ایسی تھی۔ سب کے ساتھ بہت اچھی پھر ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔اور انہیں یاد آیا کہ ایک بار استانی جی نے کہا تھا۔

''ماسٹر صاحب! اللہ کے بے حد پیارے اور نیک بندوں پر بھی مصیبتیں آتی ہیں۔شاید یہ ان کی آزمائش ہوتی ہے۔''

''یا اللہ! یہ اگر آزمائش ہے تو اب اور نہ آزمانا ہمیں، ہم تیرے بہت کمزور بندے ہیں۔ برداشت کی طاقت نہیں رکھتے۔ہمیں ہماری ہمت سے زیادہ نہ آزمانا۔'' انہوں نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے اور ایک بار پھر اللہ سے اپنی صحت و زندگی کے لیے دعا کرنے لگے لیکن سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں، کچھ دعاؤں کا اجر آخرت کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

جب وہ یہ سوچ کر مطمئن سے ہو گئے تھے کہ اب انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ اور سکون سا آ گیا تھا۔ان کے اصرار پر زیب النساء ایک بار پھر ایف اے کا امتحان دینے کے لیے پڑھنے لگی تھی کہ فرشتہ اجل آ پہنچا۔ وقت پورا ہو گیا تھا۔ حامد دو سال کا ہو گیا تھا۔ وہ اسکول سے آتے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں باہر لے جانے کا کہتا، اور وہ بھی بغیر سانس لیے اسے اٹھا کر باہر گلی کا ایک چکر لگانے لے جاتے تھے اور اس روز بھی وہ اسکول سے آ کر چارپائی پر بیٹھے تھے اور حامد ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

''زیب بیٹی! میں ذرا حامد کو باہر لے جا رہا ہوں، تم دروازے کو کنڈی لگا لو۔'' وہ جھک کر حامد کے جوتوں کے تسمے باندھنے لگے تھے۔

''ابا آپ اسکول سے تھکے ہوئے آتے ہیں، اسے تو سمجھ نہیں ہے، آپ کچھ دیر آرام کر لیا کریں۔''

زیب النساء باورچی خانے سے باہر نکلی اور دوپٹے کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی کہ یکدم وہ سیدھے ہوئے اور پیچھے گر گئے۔

''ابا......ابا کیا ہوا؟'' وہ بھاگ کر برآمدے میں آئی، ان کی آنکھیں بند تھیں۔لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

''ابا!''

اس نے ان کی ٹانگیں اٹھا کر چارپائی پر رکھیں اور انہیں سیدھا کر کے لٹایا تو انہوں نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ایک ہچکی آئی اور آنکھیں ہولے ہولے بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے کونے پر ننھا سا آنسو آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔

زیب النساء پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ستمبر کا وسط تھا اور موسم بے حد خوش گوار......

ابھی کچھ دیر پہلے فضا میں ہلکی حدت تھی لیکن عصر کے فوراً ہی بعد موسم بے حد اچھا ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور پر نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔ وہ اپنی مخصوص سیڑھیوں پر بیٹھی بی بی اماں کو صحن میں کرسیاں لگاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سحرش بیٹھی ہوئی تھی۔

''میرے خیال میں اتنی کرسیاں کافی ہوں گی۔''

بی بی اماں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور انہیں کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی اور پھر خاموش بیٹھی سحرش کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہاری یونی ورسٹی کیسی چل رہی ہے؟''

''چل تو نہیں رہی، اپنی جگہ کھڑی ہے۔ اسی وقار اور شان کے ساتھ۔'' وہ مسکرائی۔ ''ویسے اگر تمہاری مراد میری پڑھائی سے ہے تو اے ون ایک کے سوا سب اساتذہ بہت عالم و فاضل ہیں، کچھ کے لیکچر تو میرے سر کے اوپر سے گزر جاتے ہیں لیکن خیر آہستہ آہستہ سمجھ آ جائے گی۔''

وہ بی ایس سی کر کے یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے چکی تھی اور ان دنوں اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ وہ اکثر نیچے زمل کے پاس آنے لگی تھی اور پچھلے تین چار ماہ سے وہ مرسل کی بے نام تنظیم کی میٹنگز میں بھی شامل ہونے لگی تھی بلکہ پچھلے ماہ اس نے اپنی پاکٹ منی میں سے کچھ رقم بچا کر تنظیم کے فنڈ میں بھی جمع کروائی تھی۔ اور صرف وہی نہیں کبھی کبھی مرتضیٰ، ماہ وش اور مہرین بھی نیچے آ جاتے تھے اور خلوص دل سے مشورے دیتے تھے جبکہ میمونہ اور رخسانہ کو بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا ان کا نیچے جانا۔

میٹنگز میں صرف مسائل کا ہی ذکر نہیں ہوتا تھا بلکہ اب وہ ایک طرح کی ادبی بیٹھک ہی بن گئی تھی۔ خاص طور پر جب سے وجدان احمد اور عمر اعجاز نے آنا شروع کیا تھا۔ میٹنگز کا ایجنڈا ختم ہونے کے بعد ہر طرح کے موضوعات زیر بحث آتے تھے۔ کبھی کبھار جہاں زیب بیگ اور بی بی اماں بھی آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

جہاں زیب بیگ جب کسی موضوع پر بات کرتے تو جیسے علم کا دریا تھا جو بہتا چلا جاتا۔ امان اور شایان نے بھی جب سے یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا وہ بھی باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ بے حد بور اور اکتا دینے والے دنوں کے بعد یہ دن زمل کو ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح لگتا تھا۔ اور اگلے کئی دن تک وہ اس کی خوش گواریت کو محسوس کرتی تھی۔

جہاں زیب بیگ کے بے حد اصرار کے باوجود شایان اور امان ان کے ہاں نہیں ٹھہرے تھے بلکہ انہوں نے ایک فرنشڈ فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔

جہاں زیب نے اختر بانو سے گلہ کیا تو انہوں نے وضاحت کی کہ اگر صرف امان ہوتا تو اسے تو آپ کے پاس ہی ٹھہرنا تھا۔ لیکن ثمرہ آپا کو پسند نہیں ہے کہ شایان ہماری حویلی میں رہے۔ ان کی وجہ سے ہی امان کے بابا جان نے الگ فلیٹ لے کر دیا ہے۔ یہاں سے ایک ملازم بھی ساتھ کر دیا ہے۔

''لیکن ثمرہ اور ثوبان کو تو پتا ہے نا کہ وہ بھی ہمارا ہی ہے، پھر بھی......'' جہاں زیب بیگ افسردہ ہوئے تھے۔

''ثمرہ آپا کے اپنے ڈر اور خوف ہیں ابا جان! آپ افسردہ نہ ہوں میں نے مانی سے کہا ہے وہ ہر ویک اینڈ پر آ جایا کرے گا۔ شانی موڈی ہے۔ اگر اس کا موڈ ہوا تو وہ بھی آ جایا کرے گا اس کے ساتھ۔''

اور وہ دونوں ہی ہر ویک اینڈ پر آ جاتے تھے اور ان کے آنے سے زمل کی زندگی میں ایک اور اچھے دن کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ امان اسے بڑی بہن کا سا مان دیتا تھا اور وہ بھی اسے اپنا چھوٹا بھائی ہی سمجھتی تھی۔

''زندگی میں ایک بہن کی کمی تھی سو آپ نے پوری کر دی۔'' اس روز کھانے کے ٹیبل پر نہ جانے کس بات پر اس نے کہا تھا۔

''اور مجھے بھی تمہارے روپ میں چھوٹا بھائی مل گیا ہے۔'' وہ بے حد خوش ہوئی تھی، امان اسے بہت اچھا لگا تھا سلجھا ہوا اور ہر ایک کا خیال اور احترام کرنے والا۔

''اب مجھے بڑا بھائی نہ بنا لینا، مجھے خوامخواہ رشتے جوڑنے پسند نہیں ہیں۔'' شایان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''آپ یوں بھی عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔''

شایان کی بات اسے ناگوار محسوس ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی ناگواری چھپالی تھی اور شایان بی بی اماں اور آزین کے سامنے بے اختیار یوں بولنے پر دل ہی دل میں نادم ہوا تھا اس لیے اس نے فوراً سوری کر لیا تھا۔

وہ بس مدھم سا مسکرا دی تھی۔ اختر بانو نے اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ خود سر، خود پسند اور مغرور سا ہے۔ ثمرہ آپا کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے اگر کبھی اس کی بات بری لگے تو نظر انداز کر دیا کریں۔

اور جہاں زیب بیگ نے انہیں تسلی دی تھی۔

''ہمارے لیے تو وہ بچہ ہی ہے اختر بانو، اور بچوں کی باتوں کا کیا برا ماننا۔''

اور اس نے بھی کئی بار اس کی باتوں کو نظر انداز کیا تھا۔

''کیا میرا مذاق برا لگا؟'' سحر بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں تو......''

وہ سحرش کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔ سحرش کو پہلے تو کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کی بات کسی کو بری لگی ہے یا اچھی۔ اسے جو کہنا ہوتا تھا کہہ دیتی تھی۔

''بھلا اس میں برا لگنے والی کیا بات تھی؟''

''ہاں برا لگنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے بھی بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ تم بتاؤ تمہارے آزین صاحب کے کیا ارادے ہیں۔ پڑھائی تمہاری ختم ہو چکی ہے اور آزین صاحب منہ سیئے بیٹھے ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ ادھر تمہارا آخری پیپر ہوا ادھر گھر میں شادیانے بجنے لگیں گے۔ دادا جان تو کہتے

تھے کہ وہ جلد از جلد تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ پھر؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پتا نہیں......'' زمل افسردہ ہوئی۔

آزین تو ایسا ہی تھا ہمیشہ کی طرح کبھی یکدم اتنا مہربان اور محبتیں لٹاتا ہوا کہ اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آتا اور کبھی یکدم گم صم، خاموش اپنے آپ میں مگن، اردگرد سے بے خبر۔ سوائے سلام دعا کے کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ نہ جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔ ظفریاب کے ساتھ بھی اس کا رویہ پہلے جیسے ہی تھا۔ کبھی ان کا فون آتا تو جہاں زیب بیگ کے اصرار پر ہیلو ہائے کر لیتا اور کبھی صاف انکار کر دیتا بات کرنے سے۔

پتا نہیں کب وہ بالکل نارمل ہوگا اور اپنی ناراضی ختم کر دے گا۔

''یہ دادا جان اس سے کہتے کیوں نہیں ہیں کہ اب تمہاری رخصتی کروا لے اور نہ ہی چچا جان کچھ کہتے ہیں اسے۔ ہماری میم (میڈم) کہتی تھیں کہ نکاح کے بعد زیادہ عرصہ تک لڑکی کو گھر نہیں بٹھانا چاہیے۔ جلدی رخصتی کر دینا چاہیے سو طرح کے پرابلم ہو سکتے ہیں۔''

''مثلاً کیا پرابلمز......؟'' زمل نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''لڑکے اور لڑکی کا دل کہیں کسی اور جگہ اٹک سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے لڑکا انکار کر دے یا ہو سکتا ہے لڑکی منع کر دے تو یہ اچھی بات تو نہ ہوئی نا۔'' سحرش کے دل میں جو بات آتی تھی، کہہ دیتی تھی۔

''تم بے فکر رہو، یہاں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ لڑکا، لڑکی دونوں کو ہی اپنے دلوں پر پورا اختیار ہے۔ بے قابو نہیں ہونے دیں گے۔'' وہ پورے یقین سے مسکرائی تھی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو ڈیئر زمل! لیکن آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا اس لیے میں خود دادا جان اور بلکہ آزین سے کہتی ہوں کہ اب گھر میں کوئی رونق شونق لگنی چاہیے۔ بور ہو رہے ہیں۔ شانے اور ماہا کی شادی پر سلوائے گئے کپڑے جلد ہی اولڈ فیشن کے ہو جائیں گے۔ جلدی شادی ہو گی تمہاری اور آزین کی تو ایک دو تو وہ ہی چل جائیں گے۔'' وہ بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدگی سے کہہ رہی

تھی۔ زمل کو ہنسی آ گئی۔

''گھر میں رونق شونق چاہیے تو مرتضیٰ بھائی بھی تو ہیں نا۔ ان کو راضی کرو نا شادی کے لیے۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں اپنی پسند کے متعلق وہ جو ماما تمہاری کراچی والی کزن کا ذکر کر رہی تھیں اس کے متعلق پوچھا تائی اماں نے ان سے؟''

''وہ بہت کم عمر تھی لیکن اماں نے کہا مرتضیٰ کو پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ لڑکیاں کتنی بھی کم عمر ہوں، شادی کے بعد خود ہی سمجھدار اور میچور ہو جاتی ہیں لیکن جب انہوں نے مرتضیٰ بھائی سے بات کی تو وہ اچھل ہی پڑے کہ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ کیا میں نے اسے گود کھلانا ہے اور ایسی ہی فضول باتیں کیں۔ اماں بے چاری تو حیران ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی تھیں۔ یہاں تو سب یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ کراچی والی کزن میں انٹرسٹڈ ہیں۔ لیکن......'' سحرش نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''اگر وہ وہاں انٹرسٹڈ نہیں تھے تو پھر انہوں نے مہرو کے ساتھ شادی سے انکار کیوں کیا؟'' زمل کو حیرت ہوئی تھی۔

''ہماری مہرو کتنی اچھی ہے۔ کتنا شفاف اور پاکیزہ دل ہے اس کا اور پھر کتنی پیاری ہے وہ۔ تم بات کرو نا ان سے مہرو جیسی لڑکی کہیں نہیں ملے گی۔ کیا پتا انکار کر کے پچھتا رہے ہوں اور خود سے کہتے ہوئے انا آڑے آتی ہو۔ تم تو کہہ سکتی ہو نا ہر بات ان سے۔''

''ہاں کہہ سکتی ہوں لیکن تم ابھی مرتضیٰ بھائی کو نہیں جانتی ہو۔ وہ اپنی بات سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ اور مہرو سے تو انہیں ہمیشہ سے ہی چڑ رہی ہے۔ عینکو چار چشمی اور جانے کیا کیا کہتے تھے اسے، بس اماں اور ہم لوگ ہی نہیں سمجھے۔ پھر اب اگر انہیں کسی طرح منا بھی لیا جائے تو نہ تایا جان مانیں گے نہ مہرین۔ وہ بہت ہرٹ ہوئی ہے یار۔ بچپن سے ہی اپنے نام کے ساتھ ان کا نام سنتی آئی ہے تو محبت، انسیت، لگاؤ کچھ بھی کہہ لو کہ پیدا ہو جانا فطری ہے۔'' سحرش یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''خیر ہماری مہرین کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں ہے۔ آج کل کے دور میں ایسی ہیرا لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں۔ صاف دل، بے ریا، مخلص۔'' زمل دل سے اس کی ان خوبیوں کا اعتراف کرتی تھی۔

''ہاں وہ بالکل تمہارے جیسی ہے۔ ورنہ آج کل زیادہ تر لڑکیاں تو ہمارے جیسی ہوتی ہیں چالاک، ہوشیار اور تھوڑی منافق۔''

بظاہر وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی۔

''یہ تم میری تعریف کر رہی ہو یا اپنی برائی۔'' زمل کو اپنی باتوں سے وہ ہمیشہ ہی حیران کرتی تھی۔

''یہ تم اپنے بھائی کے لیے کہہ رہی ہو سحرش۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی چالاکو ماسی بقول تمہارے ان کی زندگی میں آئے۔ اکلوتا بھائی ہے تمہارا۔ کوئی چالاک لڑکی آ گئی نا تو کہیں تم لوگوں کی ہی چھٹی نہ کروا دے۔'' اس نے مذاق کیا۔

''ہم تو خیر اپنے اپنے گھروں کو سدھار جائیں گی پیچھے رہ گئیں موناماں تو تم کیا اپنی پیاری تائی اماں کو نہیں جانتی ہو۔ انہوں نے اس کی ہی چھٹی کروا دینی ہے۔ جب کہ ان کی مددگار رخسانہ خالہ پلس تائی بھی موجود ہوں گی۔'' وہ اپنی اماں جان کو بھی نہیں بخشتی تھی۔

''تم بھی نا سحرش!'' زمل مدھم سا مسکرائی۔ ''جلدی سے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لو مرتضٰی بھائی کے لیے ورنہ وہ کوئی ایسی ویسی ہی پسند نہ کر لیں۔''

''اچھی لڑکیاں تو پہلے ہی بک ہو جاتی ہیں۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی اور سوچا۔ ''ویسے اماں اور رخسانہ خالہ کہتی تو صحیح ہی تھیں کہ دادا جان نے سوچا سمجھا کچھ نہیں اور لے کے نکاح کر دیا آزین کا زمل کے ساتھ، ورنہ گھر کی لڑکیاں گھر میں ہی نمٹ جاتیں۔ مہرین یا شانزے کا آزین سے اور زمل کا مرتضٰی سے ہو جاتا تو......''

اس نے موناماں کے بنائے ہوئے جوڑوں میں خود ہی ترمیم کر لی تھی کہ جو وہ سمجھتی تھی وہ میمونہ نہیں سمجھتی تھیں۔

''کیا کہا؟'' زمل اس کی بات نہ سن سکی تھی۔

''تمہاری نظر میں ہے کوئی ایسی لڑکی جسے مرتضٰی بھائی بھی پسند کر لیں۔''

''ہوں۔'' اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔

''میں نے نوٹ کیا ہے کہ مرتضیٰ بھائی کا جھکاؤ سمیرا کی طرف ہے۔ تم آج ذرا غور کرنا مرتضیٰ بھائی عموماً سمیرا کے قریب ہی بیٹھتے ہیں اور ایک بار میں مارکیٹ گئی تھی ساجدہ کے ساتھ تو میں نے دونوں کو ایک شاپ سے نکلتے دیکھا تھا تب میرا خیال تھا کہ محض اتفاق ہے کہ دونوں ایک ہی جگہ شاپنگ کرنے گئے ہوں لیکن ہوسکتا ہے یہ اتفاق نہ ہو اور......''

''کون سمیرا؟ وہ ثوبیہ کی دوست؟ اگر ایسی بات ہوئی تو اماں تو بے حد خوش ہوں گی کہ جب سے شانزہ کی شادی ہوئی ہے، وہ میرے لیے بھی شانزہ کے سسرال کی ٹکر کا سسرال ملنے کی حسرت میں مری جا رہی ہیں کہ میرے لیے بھی عقیل بھائی جیسا کوئی امیر کبیر بندہ ڈھونڈ لیں۔ تو میرے لیے نہ سہی، مرتضیٰ بھائی کے لیے ایسا سسرال مل جائے تو خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گی وہ۔ یہ سمیرا لوگ تو جدی پشتی رئیس ہیں۔''

''لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی سحرش! بعض اوقات دولت کے ڈھیر پر بھی آدمی ناآسودہ رہتا ہے۔ دولت اسے خوشی اور سکون نہیں دے سکتی۔ تم نے کبھی شانے کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ مجھے کبھی خوش نہیں لگی۔ وہ جب بھی آتی ہے مجھے بے حد مضطرب اور بے چین سی لگتی ہے اور اس کی آنکھیں کتنی بجھی بجھی سی لگتی ہیں۔''

''ہاں ایسا ہی ہے، شانزہ شادی کے بعد بہت خاموش ہوگئی ہے۔ ورنہ پہلے تو ہم سب کے نہ نہ کرنے کے باوجود اپنے پڑھے گئے ناولوں کی کہانی ضرور سناتی تھی۔ لیکن اب کہہ رہی تھی اس نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے لیکن تم میری اماں کو نہیں جانتی ہو۔ وہ کتنی مادہ پرست ہیں۔ دولت دیکھ کر تو وہ کسی مراثی سے بھی مجھے بیاہنے کو تیار ہو جائیں۔'' اس نے زمل کی تائید کرتے ہوئے کہا تو زمل مسکرائی۔

''تم اپنی ماں کو بھی نہیں بخشتی ہو سحرش!''

''ہاں تو غلط تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے وہ پھپھو پر رشک کرتی تھیں۔ یہ اتنی بڑی حویلی، اتنے نوکر چاکر، اتنے باغات، اتنی زمینیں...... اور اب ان کے رشک کا رخ شانزہ کی طرف مڑ گیا ہے اور یہ عقیل بھائی بھی اس قدر شوخ کہ جب بھی آئیں گے اپنی دولت کی نمائش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے

نہیں دیں گے۔ مثلاً دبئی گیا تھا شانزے کے لیے ڈائمنڈ کا سیٹ لایا ہوں اور یہ کنگن سعودیہ سے منگوائے ہیں میں نے خالص چوبیس کیرٹ کا سونا ہے وغیرہ وغیرہ۔اوران محترمہ کو شوق ہی نہیں ہے زیورات کا۔زبردستی میری ممانے پہنائے ہیں اسے اوراماں کا بس نہیں چلتا کہ کنوؤں میں بانس ڈلوا کر میرے لیے بھی کوئی ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ لیں۔مرتضٰی بھائی اگر سمیرا کے لیے سیریس ہوں تو مجھ پر سے تو اماں کی نظر کرم ہٹ جائے گی کم از کم ...... گو مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔مرتضٰی بھائی کی عادت ہے لڑکیوں سے فری ہونے کی۔"

بات کرتے کرتے اس کی نظر اوپر اٹھی تو مرتضٰی ٹیرس کے پاس کھڑا تھا، اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا تو اس نے برا سا منہ بنایا اور زل کی طرف دیکھا جو پاؤں چپل سے باہر نکالے پتا نہیں جھک کر کیا دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارے آزین صاحب کہاں ہیں؟ کب سے آئی ہوئی ہوں نیچے نظر نہیں آرہے۔"

"ابا کو لے کر گئے ہیں ڈاکٹر ارسلان کی طرف......ان کے پاس آج باہر سے کوئی سائیکاٹرسٹ آئے ہوئے ہیں غالباً امریکہ سے تو ڈاکٹر ارسلان نے زین سے کہا تھا وہ ابا کو لے آئیں ان سے بھی ایک میٹنگ ہو جائے گی۔" زل نے بتایا۔

"ویسے چچا جان پہلے سے بہت بہتر لگتے ہیں۔" سحرش کی نظریں ٹیرس کی طرف تھیں لیکن مرتضٰی سامنے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے ابا تیزی سے امپروو کر رہے ہیں۔شیخو بابا کا بھی بہت ہاتھ ہے اس میں، ابا کی ان سے بہت دوستی ہوگئی ہے۔پتا نہیں ابا اور وہ چپکے چپکے کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

زل کے لہجے میں شاہ زیب کے ذکر سے خود بخود ہی خوش گواریت آگئی تھی۔اب وہ اکثر ماضی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات کرنے لگے تھے۔ایک روز تو وہ کچن میں تھی کہ کچن کے دروازے پر آکر اسے مریم کہہ کر بلایا تھا۔

"مریم! آج شام کو میرے کچھ مہمان آرہے ہیں، چائے پر کچھ اہتمام کر لینا۔"

اور اس کے مڑ کر دیکھنے سے پہلے ہی وہ تیز تیز چلتے ہوئے واپس چلے گئے تھے۔ ایسے ہی کوئی نہ کوئی بات ہر دوسرے یا تیسرے روز ہو جاتی تھی۔

ایک روز وہ صبوحی چچی کو سارے میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ کبھی وہ ظفریاب چچا کو تلاش کر رہے ہوتے۔ یہ ساری تبدیلیاں بہت خوش گوار تھیں۔ خوش آئند تھیں۔ اب جب وہ ماضی میں سفر کرتے ہوئے زمل کو اجنبی نظروں سے دیکھتے تو وہ پہلے کی طرح ہرٹ نہیں ہوتی تھی۔ سمجھتی تھی کہ وہ ہولے ہولے نارمل ہو رہے ہیں۔ اب ان کی خوراک بھی پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اور صحت بھی۔

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور امان دائیں کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے اندر داخل ہوا۔ یقیناً وہ آج ہونے والی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا۔ وہ مرسل کی تنظیم کے کام کو بہت پسند کرتا تھا اور ان کی کاوشوں کو بہت سراہتا تھا اور فنڈ میں بھی حصہ ڈالتا رہتا تھا۔

"یہ امان اکیلا ہی آ رہا ہے، شایان نہیں ہے اس کے ساتھ؟" شایان ہمیشہ اس کے ساتھ ہی آتا تھا۔

"وہ تو دو تین دن پہلے واپس گھر چلا گیا ہے، تمہیں نہیں معلوم......" سحرش کو حیرت ہوئی تھی۔

"میرا خیال تھا وہ دادا جان سے ملنے آیا ہو گا۔ کہہ رہا تھا یہاں دل نہیں لگ رہا، بہت بوریت ہو رہی ہے۔"

"کیا پڑھائی چھوڑ کر چلا گیا ہے یا کچھ دنوں کے لیے گیا ہے؟" زمل نے پوچھا۔

"معلوم نہیں، مجھے تو امان نے بتایا تھا۔ اسے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ پھر آئے گا یا نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ اتنی ضد کر کے بمشکل چھوٹی امی کو راضی کیا تھا اس نے یہاں آ کر پڑھنے کے لیے۔ ورنہ گریجویشن کے بعد اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر یکا یک ہی شوق چڑھا یہاں آ کر پڑھنے کا۔ موڈی ہے، اب موڈ نہیں رہا ہو گا۔"

سحرش کی یونیورسٹی میں تقریباً روز ہی امان سے ملاقات ہوتی تھی۔ گو ڈپارٹمنٹ الگ الگ تھے۔

"ہاں پھپھو نے بھی بتایا تھا کہ ثمرہ آنٹی تو اسے بالکل یہاں آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں لیکن اکلوتا ہے تو بات منوا لی اپنی۔" زمل کو شایان کی بے باکی ناگوار گزرتی تھی۔ وہ بے دھڑک اس کی

تعریف کر دیتا تھا اور وہ محض پھپھو کی وجہ سے اس کا لحاظ کرتی تھی ورنہ اگر سحرش کی طرح ہوتی تو پہلی بار ہی جب اس نے اس کی ہنسی کی تعریف کی تھی تو ٹوک دیتی۔

''السلام علیکم سسٹرز!'' امان سیڑھیوں کے پاس آ کر رکا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو؟'' زمل نے فوراً ہی جواب دیا جب کہ سحرش نے برا سا منہ بنایا تھا۔

''سنو مسٹر امان! مجھے اپنے نام کے ساتھ اس طرح کے لاحقے سابقے پسند نہیں ہیں۔ بھائی میرا ایک ہی ہے اور وہی رہے گا تم مجھے میرا نام لے کر بلا سکتے ہو۔''

''او کے میم!'' امان نے ذرا سا سر خم کیا اور مسکرایا اور پھر مڑ کر صحن میں پڑی خالی کرسیوں کو دیکھا۔ ''ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ میں ذرا نانا جان سے مل لوں۔'' اس نے بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کیا۔ اس میں اس کی کتابیں اور نائٹ ڈریس تھا۔

صبح جہاں زیب بیگ سے فون پر اس کی بات ہوئی تھی تو انہوں نے اسے ادھر ہی رکنے کے لیے کہا تھا۔

''عموماً تو سب لوگ ان دنوں عصر کے فوراً بعد آ جاتے تھے لیکن آج ہو سکتا ہے کچھ لیٹ آنا ہو۔'' زمل نے سوچا۔

آزین نے بتایا نہیں تھا اور ایسا ہی تھا آزین کو بتانا یاد نہیں رہا تھا۔ وہ جب شاہ زیب بیگ کو لے کر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اسے یاد نہیں رہا تھا بتانا کہ آج سب لیٹ آئیں گے۔ مرسل اور رضا تنظیم کے ہی کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ اس لیے مغرب کے بعد اکٹھا ہونے کا پروگرام بنا تھا۔ شاہ زیب کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر آزین جہاں زیب بیگ کے کمرے میں چلا گیا۔ امان کے ساتھ اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔

وہ اس سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ سحرش پھر آنے کا کہہ کر اوپر چلی گئی تو وہ کچھ دیر یوں ہی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ سحرش یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ مہرین کا ہاؤس جاب

اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ جب کبھی اس کی نائٹ ہوتی تو وہ وہاں ہوسٹل میں اپنی دوست کے پاس رہ جاتی تھی۔ ایک بس وہی تھی فارغ، رزلٹ کے بعد اس نے سوچا تھا کہیں جاب کرلے۔ کسی اسکول یا کالج میں، اسے دادا جان کی طرح پڑھانا پسند تھا، لیکن دادا جان نے ایک بار کہا تھا کہ اگر اسے ٹیچنگ کرنی ہے تو بہتر ہے کہ ایم فل کرلے پھر کسی اچھے ادارے میں جاب مل جائے گی ورنہ سمپل ماسٹر کر کے تو کسی پرائیوٹ کالج یا اسکول میں چند ہزار تنخواہ ہی ملے گی لیکن اس کا ایم فل یا ڈاکٹریٹ کر کے جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آزین کو بلاوجہ خواتین کا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔

ایک بار اس نے نہ جانے کس بات پر کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں آفس سے تھکا ہارا گھر آؤں تو میری بیوی فریش اور تروتازہ سی میرا استقبال کرے اور اسے دیکھ کر میری دن بھر کی تھکن دور ہو جائے نہ کہ اپنی جاب سے تھک کر آئی ہوئی اس لیے اس نے سوچا تھا کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔ لیکن اب گزرتی گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر بھی تھک چکی تھی۔

کتابیں پڑھنا، بی بی اماں سے باتیں کرنا، ساجدہ سے کام کروانا اور بس سارا دن فارغ، آج کل اوپر بھی وہ کم ہی جاتی تھی۔ ہاں اگر شانزہ اور عقیل نے آنا ہوتا تو رخسانہ تائی اسے بلوا لیتی تھیں ورنہ آج کل انہیں ایک فل ٹائم ملازمہ مل گئی تھی جو کچن کے کام دیکھ لیتی تھی۔ باقی کا کام تو وہی ساجدہ کی بھابھی ہی کر رہی تھی۔ اور ایسے بوریت بھرے دنوں میں اسے وجدان احمد کا مشورہ اچھا لگا تھا۔

دس پندرہ دن پہلے وجدان احمد سمیرا کے ساتھ آیا تھا، اسے آزین سے کوئی کام تھا۔ آزین اس روز کچھ لیٹ ہو گیا تھا سو اس کا انتظار کرتے اور چائے پیتے ہوئے اس نے اس کا ارادہ پوچھا تھا کہ وہ اب پڑھائی کے بعد کیا کرنے کا سوچ رہی ہے۔ مزید پڑھنا یا جاب وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے۔

”کچھ نہیں...... نہ جاب کرنے کا موڈ ہے نہ مزید پڑھنے کا۔“

اس نے بسکٹ کی پلیٹ سمیرا کی طرف بڑھائی تھی جو خاموش بیٹھی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تو آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کچھ وقت نابینا بچوں کو دے دیں۔ یہ چند قدم کی دوری پر تو

اسکول ہے ان کا۔ رضا کارانہ طور پر یا کچھ سیلری لینا چاہیں گی تو وہ بھی مل جائے گی۔"

وجدان احمد خود اس اسکول میں رضا کارانہ طور پر کام کرتا تھا اور اسکول کو کافی ڈونیشن بھی دیتا تھا۔

"لیکن مجھے تو نابینا بچوں کو پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" وہ خود بھی کچھ کرنا چاہتی تھی کوئی مثبت کام۔ ایسا کام جس سے دل کو سکون ملے۔

"وہ تو کچھ مشکل نہیں ہے اسکول کے ساتھ ہی اکیڈمی ہے جہاں بریل وغیرہ کی ٹریننگ دیتے ہیں۔ اگر آپ اکیڈمی نہ جانا چاہیں تو اسکول میں بھی انتظام ہے۔" اس نے بتایا تھا لیکن وہ ابھی تک جہاں زیب بیگ سے بات نہیں کر سکی تھی۔

خیر میں بات کروں گی۔ اگر دادا جان نے اجازت دے دی تو پھر آزین سے بھی پوچھ لوں گی۔ پتا نہیں اسے اچھا لگے گا یا نہیں۔ وہ آج کل بہت پوزیسو ہو رہا تھا یا ہمیشہ سے ایسا ہی تھا لیکن اس نے اب غور کیا تھا کہ وہ شایان یا مرتضیٰ سے بھی بات کرتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ اگر آزین کو برا لگا تو وہ پھر گھر میں ہی کچھ نہ کچھ کرلے گی۔

کیا کرے گی...... یہ ابھی اس نے سوچا نہیں تھا۔

وہ اٹھی تا کہ کوئی کتاب ہی دیکھ لے مغرب تک۔ رات ہی وہ دادا جان سے دو تین کتابیں لے کر آئی تھی، تب ہی دروازہ کھول کر بی بی اماں نے اندر جھانکا۔

"میں نے کہا دیکھ لوں سو تو نہیں گئی ہو۔ اذان بس ہونے ہی والی ہے۔ تم نماز پڑھ کر ذرا کچن میں چلی جانا۔ میں نے آنچ دھیمی کر دی ہے۔ ذرا سی کسر تھی گوشت گلنے میں۔ ویسے تو ارادہ تھا صبح ہی نہاری تیار کروں گی لیکن امان اور آزین کو چائے دینے گئی تو آزین نے بتایا کہ آج سب نے دیر سے آنا ہے تو میں نے سوچا پھر سب کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ویسے بھی وہ تمہاری سمیرا بی بی کہہ رہی تھی اس روز کہ بہت دن ہو گئے آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کچھ نہیں کھایا۔ نان بازار سے آ جائیں گے۔ چھ سات بندے ہی فالتو ہوں گے۔"

وہ مغرب کے بعد نفل وغیرہ پڑھتی تھیں اس لیے زمل سے کہا تھا کہ وہ کچن میں چلی جائے۔

''جی بی بی اماں دیکھ لوں گی آپ فکر نہ کریں۔''زمل نے کہا تو بی بی اماں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، گوشت اچھا گل گیا تو چولہا بند کر دینا۔ باقی میں پھر خود تیار کر لوں گی اور ہاں کاؤنٹر پر کھیر کے باؤل رکھے ہیں۔ ٹھنڈے ہو گئے ہوں تو فریج میں رکھ دینا۔ اختر بتاتی تھی کہ اس کے بچوں کو بادام والی کھیر بہت پسند ہے تو امان نے آنا تھا تو میں نے بنا دی۔ کافی دودھ پڑا تھا زیادہ ہی بنا دی۔'' وہ دروازے سے ہی واپس چلی گئیں۔

اذان شروع ہو گئی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر کچن میں آئی۔ گوشت تقریباً گل ہی چکا تھا۔ بی بی اماں نہاری اور پائے ککر میں نہیں گلاتی تھیں بلکہ دھیمی آنچ پر رکھ دیتی تھیں۔ سارا دن دھیمی آنچ پر گلتے رہتے تھے۔ وہ کچھ دیر کچن میں ہی بیٹھی رہی۔ جب اسے لگا کہ اب گوشت بالکل گل چکا ہے تو چولہا بند کر کے باہر آئی۔ بی بی اماں مغرب کے وقت ایک لائٹ جلا دیتی تھیں اس نے باقی کی دو لائٹیں بھی جلا دیں جس سے پورے صحن میں بھی روشنی پھیل گئی تھی۔ لائٹ جلا کر وہ تخت پر بیٹھی ہی تھی کہ صحن کا دروازہ کھلا۔ وجدان احمد اور سمیرا ساتھ ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

''السلام علیکم!'' وہ برآمدے میں ہی چلے آئے تھے۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

سلام کرنے اور خیریت پوچھنے میں وجدان نے ہی پہل کی تھی جب کہ سمیرا جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ آج اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور بڑا سا دوپٹا بھی اوڑھا ہوا تھا جس کا ایک کونا زمین کو چھو رہا تھا۔ آج بی بی اماں اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہونے والی تھیں۔

''اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیں پلیز امان اور آزین دادا جان کے کمرے میں ہیں۔ آتے ہوں گے۔''

اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وجدان نے زمین پر لٹکتا ہوا سمیرا کے دوپٹے کا کونا اٹھا کر اس کے کندھے پر ڈالا۔

''یار کیا اب میں ساری زندگی تمہارا دوپٹا ہی اٹھاتا رہوں گا۔ بہتر ہے کہ تم بقول بی بی اماں کے وہ دو انچ چوڑا مفلر ہی گلے میں لٹکا لیا کرو۔''

زمل کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ وہ اور وجدان احمد دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میری بہن کی شادی کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر وہ مجھے پروپوز کرے گا۔

''لوگ تو نہ جانے کیا کیا کچھ نہیں کرتے اپنی بیویوں کے لیے، تم اتنا سا کام نہیں کر سکتے۔'' سمیرا کرسی کو تخت کے قریب کھینچتے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔

''اب اپنے والد محترم کو ہی دیکھ لو۔ کیسے ہاتھ باندھے حکم کی تعمیل کے لیے کھڑے رہتے ہیں آنٹی کے سامنے۔''

''جو حکم سرکار کا۔ ہم بھی غلاموں کی طرح آپ کا دوپٹا اٹھائے آپ کے پیچھے پیچھے چلتے رہیں گے ساری عمر۔''

ذرا سا سر کو خم کرتا ہوا وہ بھی اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ زمل نے اٹھ کر پنکھا آن کیا۔

''میں آزین کو بتاتی ہوں آپ کے آنے کا۔''

''رہنے دو یار! آ جائے گا خود ہی۔ ابھی آنے سے پہلے تو بات ہوئی تھی آزین کی وجدان سے۔ وجدان نے بتایا تھا اسے کہ ہم گھر سے نکل رہے ہیں۔'' سمیرا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اتنے سارے دن ہو گئے ہیں پھر آرام سے بیٹھ کر تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔ کہا بھی تھا تم سے کسی روز میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ پورا دن میرے ساتھ اسپینڈ کرو۔ میرے گھر ماما اور میری بہن کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ بتایا تھا نا تمہیں بھائی اور ڈیڈ تو باہر ہوتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں سمیرا! میں اس طرح اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔ آزین سے کہوں گی کسی روز ایک دو گھنٹے کے لیے تمہارے گھر چھوڑ جائے گا مجھے۔ اور پھر لے بھی جائے گا۔''

وہ سمیرا کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ بی بی اماں کہتی تھیں ''بڑے لوگوں سے دوستی رکھنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے بھی بڑے بنوانے پڑتے ہیں۔ ہم متوسط طبقے کے ہیں اتنے امیر کبیر لوگوں سے دوستی نہیں نبھا پاؤ گی تم۔''

لیکن سمیرا نے اتنی بار اصرار کیا تھا کہ آج وہ انکار نہیں کر سکی تھی اور اس نے تھوڑی دیر کے لیے اس کے گھر جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

''ارے آزین کیوں...... میں خود ہی آ کر تمہیں لے بھی جاؤں گی اور واپس بھی پہنچا دوں گی۔'' سمیرا خوش ہو گئی۔

''پتا ہے میں نے گھر میں تمہاری اتنی تعریفیں کی ہیں کہ میری ماما اور بہن روز کہتی ہیں کہ کسی روز اپنی فرینڈ کو گھر لے کر آؤ۔''

''تو تم لے آتیں نا کسی روز اپنے ساتھ انہیں ہمارے گھر۔ میرا تو یوں بھی گھر سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ پہلے یونی جاتی تھی بس اور اب تو سارا وقت گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ مقصد تو ملاقات ہی ہے نا۔''

''نہیں یار! تم میری مما کو نہیں جانتیں۔ وہ کم ہی کسی کے گھر جاتی ہیں۔ ان کا اپنا ایک حلقہ احباب ہے بس وہاں ہی ان کا آنا جانا رہتا ہے۔'' سمیرا مسکرائی۔ ''بس تم جلدی پروگرام بنا کر مجھے بتاؤ۔''

''خود کو اس حویلی تک محدود نہ کریں مس زمل! باہر نکلیں گی تو سوچ اور فکر میں وسعت پیدا ہو گی۔ لوگوں سے ملیں جلیں گی تو لوگوں کو پہچاننے کی صلاحیت بھی بڑھے گی۔ لوگ بڑے منافق ہوتے ہیں۔ چہروں پر اچھائی کا نقاب چڑھائے اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔ کہیں دھوکا کھائیں گی کسی کو سمجھنے میں تو کہیں پھر سمجھ میں بھی آ جائے گی لوگوں کی۔'' وجدان احمد نے پر خلوص مشورہ دیا۔

''اسی لیے آپ کو اس نابینا بچوں کے اسکول کے لیے کام کرنے کو کہا۔''

''میں نے ابھی دادا جان سے بات نہیں کی، اگر انہوں نے اجازت دے دی تو......'' اس کی نظر سامنے سیڑھیوں پر سے اترتے مرتضیٰ پر پڑی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''وہ مرتضیٰ بھائی آ رہے ہیں۔ وہ آپ کو کمپنی دیتے ہیں۔ میں ذرا ابا کو دیکھ آؤں کیا کر رہے ہیں۔ آج آزین انہیں ڈاکٹر ارسلان کی طرف لے کر گیا تھا۔''

ایک یکدم ہی شاہ زیب کا خیال آیا تھا اور پھر مرتضیٰ کے آنے سے پہلے ہی وہ شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا یہ تم مجھے سنا رہے تھے وجدان؟" سمیرا کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔
"میرا خاص تمہاری طرف اشارہ نہیں تھا۔ میں نے ایک عام بات کی تھی۔"
وجدان احمد نے بغور اس کے بگڑے تیور دیکھے تھے۔ سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن پھر مرتضیٰ کو قریب آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ مرتضیٰ نے بہت خوش دلی کے ساتھ سلام کیا اور تخت پر سمیرا کے مقابل بیٹھ گیا۔
"اور سنائیں سمیرا جی اور وجدان احمد! کیا چل رہا ہے آج کل؟"
"کچھ خاص نہیں، وہی پرانی روٹین ہے۔"
سمیرا نے بی بی اماں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سر پر سے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو درست کیا۔
وہ بی بی اماں کی گڈ بک میں آنے کی ان دنوں پوری کوشش کر رہی تھی۔ وجدان احمد ہمیشہ کی طرح بی بی اماں کے قریب آنے پر احتراماً کھڑے ہوئے تھے اور ان کی تقلید میں سمیرا بھی کھڑی ہوئی تھی۔
"جیتے رہو۔" سلام کا جواب دے کر بی بی اماں نے ستائشی نظروں سے سمیرا کو دیکھا۔
"تم لوگ آج ادھر برآمدے میں ہی بیٹھو گے یا صحن میں آزین سے کہہ کر پیڈسٹل رکھوا دوں۔"
"صحن میں بی بی اماں اتنی اچھی ہوا ہے۔ مجھے کھلی فضاؤں میں بیٹھنا پسند ہے۔"
جواب سمیرا نے دیا تھا جس کی تائید مرتضیٰ اور وجدان احمد نے بھی کی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ میں آزین سے کہتی ہوں وہ اسٹور سے پنکھا نکال کر صحن میں رکھ دے۔"
"ابھی تو خیر کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سمیرا نے سامنے ہوا سے جھومتے درختوں کے پتوں کو دیکھا۔
"سورج ڈوبنے کے بعد ویسے ہی تھوڑی خنکی ہو جاتی ہے آج کل...... لیکن احتیاطاً نکلوا ہی دیجیے گا۔"
بی بی اماں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جہاں زیب بیگ کے کمرے کی طرف جانے لگیں لیکن پھر جاتے جاتے پلٹ آئیں۔
"پہلے ذرا شاہ زیب کو دیکھ آؤں، جب سے واپس آئے ہیں دیکھا ہی نہیں۔"
سب بہن بھائیوں میں سے انہیں شاہ زیب سے زیادہ محبت تھی۔

''زمل بھی ادھر ہی ہے۔''

سمیرا نے بی بی اماں کو بتایا اور مرتضیٰ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ بی بی اماں نے شاہ زیب کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے ہی بیڈ کے پاس زمل کرسی پر بیٹھی شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی اور شاہ زیب سو رہے تھے۔

''سو رہے ہیں؟'' بی بی اماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی پوچھا تھا۔

''جی میں آئی تو سو رہے تھے۔'' زمل نے ان کی طرف دیکھا۔

''تھک گیا ہوگا۔ تین چار گھنٹے تو لگ گئے وہاں۔ لیکن اچھا ہوا باہر کے ڈاکٹروں نے بھی دیکھ لیا۔ زین بتا رہا تھا کہ بہت تسلی دی ہے انہوں نے۔ دوا کی خوراک مزید کم کر دی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ وقت پر ہمیں سمجھ آ جاتی تو بروقت علاج ہو جاتا۔ ہم تو یہ ہی سمجھتے رہے کہ مریم کے غم میں چپ سادھ لی ہے خیر جو میرے اللہ کو منظور ہو۔''

وہ واپس چلی گئیں لیکن زمل پھر مڑ کر شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کا ابھی باہر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ابا اب بھی کتنے شاندار اور خوب صورت ہیں۔ اور وہ دن کتنا خوب صورت ہوگا جب بابا بالکل پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گے۔ تب میں ان سے بہت ساری باتیں کروں گی۔

وہ ساری باتیں جو گزرے سالوں میں مجھے ان سے کرنی تھیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اپنے چھوٹے چھوٹے غم سب شیئر کروں گی ان سے۔ اماں کے بعد اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ ان سے اماں کی باتیں کرے۔ وہ ساری باتیں انہیں بتائے جو اماں نے اپنے آخری دنوں میں اس سے کی تھیں۔

وہ ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے سوچوں میں گم تھی کہ باہر ہلکا سا شور سنائی دیا۔ اس شور میں ثوبیہ کی آواز واضح تھی۔

یعنی سب آ گئے تھے۔ اس نے چونک کر شاہ زیب کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے کمرا کچھ بے ترتیب سا لگا۔ روم چیئرز اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھیں۔ کافی ٹیبل پر موجود نامعلوم سی گرد کو صاف کیا اور شیلف پر پڑی کتابوں کو بلاوجہ ہی آگے پیچھے کیا۔ پھر وارڈ روب کھولا تو وہاں واقعی بے ترتیبی سی تھی۔

ساجدہ نے دھلے ہوئے کپڑے یوں ہی بے ڈھنگے طریقے سے تہ کر کے رکھ دیے تھے۔ ابھی یہ سب استری ہونے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے بنیانیں موزے الگ کیے، کپڑوں کو صحیح طرح سے تہ کیا۔ دو تین جوڑے ساجدہ نے ہینگ کر دیے تھے۔ انہیں چیک کیا کہ صحیح استری کیے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ابا کتنے نفاست پسند تھے۔ کپڑوں پر ایک شکن بھی رہ جاتی تو ناراض ہوتے تھے۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ اب بھی سو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی وارڈ روب سے ٹیک لگا کر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

کیا اس کے ذہن میں کوئی الجھن تھی۔ کچھ تھا جو اسے ڈسٹرب کر رہا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سر کو ہولے سے جھٹک کر وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ آزین نے پیڈسٹل فین لگا دیا تھا۔ برآمدے کی اضافی لائٹ بھی جل رہی تھی اور وہ سب صحن کے درمیان گول دائرے کی شکل میں کرسیاں رکھے بیٹھے تھے۔ مرسل، عمر، وجدان، مرتضیٰ، امان اور آزین...... اس نے ایک نظر ان پر ڈال کر پھر سامنے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ دوسرے پوڑے پر سمیرا اور ثوبیہ بیٹھی تھیں۔ ثوبیہ نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا لیکن وہ اوپر سے آتی شانزہ اور سحرش کو دیکھ رہی تھی۔

''شانے! تم کب آئیں؟'' وہ تیزی سے صحن عبور کر کے سیڑھیوں کے قریب آئی تھی۔ اس کی آواز سن کر عمر اعجاز نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی رخ موڑ لیا تھا۔

''کچھ دیر پہلے عقیل چھوڑ کر گئے ہیں۔''

وہ وہاں ہی بیٹھ گئی۔

''بہت دنوں بعد چکر لگایا تم نے۔ پتا نہیں کیوں اتنا یاد آ رہی تھیں تم۔'' زل کو اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔

''ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔'' ثوبیہ نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''سوری اتنے دنوں بعد شانزے کو دیکھا تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر معذرت طلب نظروں سے ثوبیہ کو دیکھا تب ہی وجدان احمد نے سمیرا کو آواز دی۔

"ادھر تو آنا یار!" سمیرا کے ساتھ ثوبیہ بھی اٹھ گئی تھی۔ سحرش جو ابھی تک کھڑی تھی اس نے اپنی ناک سکیڑی۔

"لگتا ہے بی بی اماں کچھ خاص پکار رہی ہیں۔ دیکھوں تو......"

اس سے پہلے کہ زمل اسے کچھ بتاتی، وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر کچن کی طرف چلی گئی تو وہ شانزے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور اس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"خوش ہو نا؟ عقیل بھائی تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہیں نا؟ سحرش کہتی ہے وہ بہت کھڑوس سے ہیں۔"

شانزہ کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تم ہر بار مجھ سے یہ کیوں پوچھتی ہو کہ تم خوش ہو یا نہیں۔" شانزے نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔ جیسے تائی جان نے تمہاری زندگی کا فیصلہ کرنے میں کہیں کوئی غلطی کر دی ہو۔" زمل نے بغور اسے دیکھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے زمل؟ میں خوش ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔" اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

"بس میرا دل کہتا ہے۔" وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کتنی عجیب بات ہے زمل، ہمارے درمیان کبھی بہت بے تکلفی نہیں رہی نہ ہی زیادہ دوستی پھر بھی تمہارا دل میرے متعلق کچھ کہتا ہے جب کہ میری اماں کا دل تو نہیں میرے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔"

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ زمل کا دل گداز ہوا۔ اس نے شانزے کے ہاتھ کو دبایا۔

"دوستی اور بے تکلفی بے شک نہیں تھی لیکن خون کا رشتہ تو ہے نا شانے...... تو شاید اسی لیے میرا دل تمہارے متعلق سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد تم وہ پہلے والی شانزہ نہیں رہی ہو۔ وہ جو

ناول اور رسالے پڑھتے ہوئے خود بخود مسکراتی اور خود بخود افسردہ ہو جاتی تھی۔ تمہاری آنکھوں کی وہ چمک کہاں گئی شانزے......"

"خون کا رشتہ...... وہ تو اور بھی لوگوں سے تم سے زیادہ گہرا ہے۔ دراصل تم بہت حساس ہو۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ جب تم اوپر آتی تھیں تو مجھے اتنے غور سے دیکھتی تھیں۔ مجھے کتابوں کی دنیا میں رہنا اچھا لگتا تھا زمل! کہانیوں کے کرداروں کے ساتھ جینا ان کی خوشیوں پر خوش ہونا اور ان کے دکھوں پر افسردہ ہونا لیکن......"

اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر گود میں رکھا۔

"کہانی اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں کہانیوں کی دنیا سے نکل کر اب حقیقت کی دنیا میں جی رہی ہوں تو کچھ تبدیلی تو آنی تھی نا۔"

"ایک بات کہوں شانزہ!" زمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"اگر کبھی تمہیں لگے کہ تمہیں کسی کی ضرورت ہے تو بلا تکلف مجھ سے کہنا۔ میں کوئی مدد نہ بھی کر سکی تو مشورہ تو دے ہی سکتی ہوں۔ اور اگر مشورہ بھی نہ دے سکی تو تم مجھ سے شیئر کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔ وہ سب جو تم تنہا جھیل رہی ہو اور کسی سے کچھ کہنا نہیں چاہتیں۔"

"مہرین زمل کے متعلق صحیح ہی کہتی ہے۔ ہر ایک کا دکھ درد محسوس کرنے والی۔" شانزے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"اوکے اگر کبھی مجھے ضرورت پڑی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی تو تم سے ہی کہوں گی۔"

وہ پھر سامنے دیکھنے لگی تھی۔ گو وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن پھر بھی کنپٹی کے پاس ہلکا سا نیل زمل کو نظر آ گیا تھا۔

"یہ...... یہ کیا ہوا شانزہ؟" زمل نے انگلی اس کے نیل پر رکھی۔

"یہ سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا تھا تو معمولی سی چوٹ لگی تھی۔ ویسے حیرت ہے تمہیں اندھیرے میں یہ نیل نظر آ گیا جب کہ اوپر تیز روشنیوں میں میری اماں کو نظر نہیں آیا۔"

وہ ہولے سے ہنسی۔ ایسی ہنسی جس میں زمل کو ٹوٹے کانچ کی چبھن محسوس ہوئی تھی لیکن وہ خاموشی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ بنا کچھ کہے......

کچھ تو تھا جو شانزہ چھپا رہی تھی۔

''باقی سب تو ٹھیک ہے ڈسپنسری بھی بن جائے گی، دوائیاں بھی آجائیں گی۔ وجدان اور میں سارا خرچ اٹھالیں گے لیکن ڈاکٹر کہاں سے آئے گا؟'' سمیرا کی بلند آواز پر وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی۔

سمیرا وجدان احمد کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جبکہ ثوبیہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

''رضا کا بھائی ہے۔ ابھی پچھلے سال ہی اس نے ہاؤس جاب مکمل کیا ہے۔ ایک پرائیوٹ ہسپتال میں حال ہی میں جاب کی ہے۔ اس نے ہفتے میں ایک دن جانے کا کہا ہے وہاں۔'' مرسل نے بتایا۔

''اور باقی کے دن کے لیے کیا ہوگا۔ ڈسپنسری بند رہے گی کیا؟'' وجدان احمد نے پوچھا تھا۔

''نہیں ہمارے گھر کے پاس ایک ڈاکٹر صاحب کا کلینک تھا۔ ان کے پاس ایک صاحب کام کرتے تھے۔ دوائیاں دینا، انجکشن لگانا وغیرہ...... ہم سب انہیں کمپاؤنڈر صاحب کہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً سال بھر پہلے کلینک بند کر کے کہیں باہر چلے گئے تھے تو تب سے یہ فارغ ہی ہیں۔ محلے میں کسی کو انجیکشن لگانا ہو۔ ڈرپ لگنی ہو یا کوئی اور چھوٹی موٹی تکلیف ہو تو یہ کمپاؤنڈر صاحب ہی کام آتے ہیں۔ میں نے ان سے بات کرلی ہے۔ اکیلے آدمی ہیں۔ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، اولاد کوئی ہے نہیں۔ وہاں ڈسپنسری کے ساتھ ہی رہائش کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تنخواہ فنڈ میں سے دے دیں گے، اس طرح ڈسپنسری پورا ہفتہ کھلی رہے گی۔ چھوٹی موٹی بیماری زکام بخار وغیرہ کی دوا تو دے ہی دیں گے۔ بیس پچیس سال کام کیا ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔ بہت تجربہ کار ہیں۔'' مرسل نے تفصیل بتائی۔

''گاؤں والوں کا تو کام ہو جائے گا لیکن ہم لوگوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وقت بے وقت آدھی رات کو بھی ضرورت پڑتی تھی تو بلا لیتے تھے۔'' مرتضٰی نے بے اختیار کہا تھا۔

''کتنے خود غرض ہو تم۔'' سمیرا نے مرتضٰی سے کہا تو وجدان ہنسا۔

"یہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے، خود غرض سا...... تمہیں آج پتا چلا۔" وجدان احمد یونیورسٹی کے زمانے سے اسے جانتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مرتضیٰ کچھ کہتا، کچن سے بی بی اماں اور سحرش باہر نکلیں۔ بی بی اماں کے ہاتھ میں شکنجبین کا بھرا ہوا جگ تھا جب کہ سحرش کے ہاتھ میں گلاسوں والا ٹرے تھا جو انہوں نے ان سب کے درمیان پڑی گول میز پر آ کر رکھے۔

"تھینک یو بی بی اماں۔ میرا پسندیدہ مشروب......" مرسل نے میز پر پڑی فائل اٹھائی۔

"چائے کا تم نے منع کر دیا تو میں نے کہا لیموں پڑے ہیں، یہ ہی بنا لوں۔"

تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور مہرین دائیں کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے، تھکی تھکی سی داخل ہوئی۔

"مہرین آ گئی۔"

سحرش گلاسوں میں مشروب ڈال رہی تھی اس نے اشارے سے مہرین کو ادھر ہی آنے کا کہا تھا۔

مہرین نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ سمیرا کی بات سن کر رک گئی۔

"باقی مسئلے تو حل ہو گئے لیکن عورتوں کا زیادہ مسئلہ ہے وہاں، ہم نے سروے کے دوران دیکھا تھا۔ عورتیں بیمار ہوتی ہیں تو بس گھر میں ہی علاج کر لیا جاتا ہے کسی حکیم سیانے سے پوچھ کر، مرد تو پھر شہر جا کر ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔"

"ایک خاتون ڈاکٹر کا انتظام ہو جائے تو سمجھو پھر اس گاؤں کا علاج معالجے کا مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا۔"

"کیا بات ہے؟" مہرین نے سوالیہ نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھا تو اس نے تفصیل بتائی۔

"تو میں ہر سنڈے کو چلی جایا کروں گی۔" مہرین نے فوراً کہا۔

"اتنی تھکی ہوئی ہوتی ہو تم ڈیوٹیاں بھگتا بھگتا کر، ایک ہی تو دن ہوتا ہے آرام کا۔" سحرش کو ہمیشہ ہی مہرین کا خیال رہتا تھا۔

"ہفتے کو اگر نائٹ وغیرہ لگی تو کسی کے ساتھ ڈیوٹی چینج کر لوں گی۔" مہرین جیسے فیصلہ کر چکی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں سے اس گاؤں تک ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ آنا جانا آسان نہیں ہو گا۔ لوکل بس یا سوزوکی پر اکیلے سفر کرنا۔'' آزین پریشان سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ ذمہ داری میری...... میں اور میرا ڈرائیور حاضر...... یہ مریض دیکھے گی اور میں وہاں کی عورتوں کے مسئلے جان کر اپنے کالم کا پیٹ بھروں گی۔''

وہ کسی اخبار میں کالم لکھتی تھی۔ اس نے اور وجدان احمد نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا۔

''اور وہ بات کمپاؤنڈر صاحب والی تو درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔'' عمر اعجاز نے سحرش کے ہاتھ سے گلاس لیا۔

''ان کی تنخواہ جو بھی مقرر کی آپ نے میں ادا کروں گا۔ فنڈ کو دوسرے کاموں کے لیے ہی مختص رہنے دیں۔''

بی بی اماں واپس کچن کی طرف جاتے جاتے مڑی تھیں۔

''زین بیٹا! شینو آئے تو نان منگوالینا...... اور ہاں بچو! میں نے نہاری بنائی ہے آج تم کھانا کھا کر ہی جانا۔''

''واؤ...... اتنے دن ہو گئے تھے آپ کے ہاتھ کا کچھ کھائے ہوئے۔ جئیں بی بی اماں! ہزاروں سال۔''

سمیرا خوش ہوئی تھی اور زل کو ایک دم یاد آیا کہ بی بی اماں نے کہا تھا کہ اپنے ابا کو جگا کر پہلے کھانا دے دینا، پھر دوا کھانی ہوتی ہے انہوں نے۔

''یخنی میں نے ان کے لیے بنا دی تھی، پتا نہیں نہاری کھائیں گے یا نہیں۔ روٹی تم بنا لینا۔''

''میں ابھی ابا کو کھانا دے کر آتی ہوں شانزہ۔''

وہ تیزی سے دو تین سیڑھیاں اتر کر کچن کی طرف چلی گئی۔ بی بی اماں توا چولھے پر رکھ رہی تھیں۔

''میں بنا لیتی ہوں بی بی اماں، آپ ہٹیں...... شانزہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا! اتنے دنوں بعد وہ آئی ہے۔ ٹھیک تو ہے نا؟''

''جی!''

"تم یہ ادرک، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں وغیرہ کاٹ دو۔" انہوں نے کچن ٹیبل پر پڑی سبزی کی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا۔ "اتنے میں روٹی بن جاتی ہے۔ ایک پھلکا ہی تو بنانا ہے۔" وہ روٹی بیلنے لگی تھیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ٹوکری میں سے ادرک کا ٹکڑا اٹھایا۔

"لیموں فریج میں ہیں، اس وقت نکال لینا۔ آٹا ڈالنے سے پہلے میں نے تری (گھی) نکال کر یہ ادھر باؤل میں رکھ دی ہے۔ شینو نان لے آیا تو میں اگر عشاء پڑھ رہی ہوئی تو سحرش کے ساتھ مل کر کھانا لگا دینا۔ نان ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

انہوں نے روٹی توے سے اتار کر دستر خوان میں لپیٹی اور ٹرے تیار کرنے لگیں۔

"یہ اب تم لے جاؤ شاہ زیب کی طرف...... سو رہے ہوں تو جگا لینا۔ دوپہر کو بھی دو نوالے کھائے تھے۔"

زمل اٹھی اور کاؤنٹر پر سے ٹرے اٹھا کر مڑی ہی تھی کہ آزین خالی جگ اٹھائے اندر داخل ہوا۔ زمل کی نظریں اس کی نظروں سے ملیں۔ سپاٹ سرد مہری سی نظریں۔ وہ کتنا بھی خاموش اور اپنے آپ میں گم ہوتا، اس کی نظروں میں اتنی پتھریلی سی سرد مہری اور اجنبیت نہیں ہوتی تھی۔ بقول بی بی اماں کے وہ خود سے ہی خفا ہو جاتا تھا۔ لیکن زمل کو تب بھی اس کی نظریں جذبے لٹاتی محسوس ہوتی تھیں۔ تو کیا وہ نامعلوم سی الجھن اور پریشانی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس لیے تھی کہ ایک دو دن سے آزین کی نظروں میں اس کے لیے سرد مہری در آئی تھی۔

وہ ٹرے ہاتھ میں لیے ساکت کھڑی تھی۔ وہ جگ کاؤنٹر پر رکھ کر اس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کیا آزین ہمیشہ اسے صبوحی چچی کے تناظر میں دیکھے گا؟ کیا وہ اس کی نظر میں کبھی معتبر نہ ہو پائے گی؟" اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا زمل؟" بی بی اماں اسے یوں بیٹھتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

"وہ چکر آ گیا ہے بی بی اماں!" آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی جسے چھپانے کے لیے اس نے

سر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''چکر تو آئیں گے نا، بتاؤ بھلا صبح سے کیا کھایا پیا ہے تم نے۔ ناشتے میں خالی خولی چائے کے دو کپ اور آدھا سلائس اور دوپہر میں بھی دو نوالے لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں کہ بھوک نہیں ہے۔ نہ تم اپنا خیال رکھ رہی ہو اور نہ زین، یہ تم دونوں نے آج کل ڈائٹنگ شروع کر رکھی ہے کیا؟''

بی بی اماں نے بڑبڑاتے ہوئے فریج میں سے بچی ہوئی شکنجبین کا گلاس نکالا جو انہوں نے فریج میں رکھ دیا تھا۔

''یہ پی لو...... بی پی لو ہو گیا ہو گا۔'' انہوں نے گلاس ٹیبل پر رکھا اور کاؤنٹر سے ٹرے اٹھائی۔ ''میں شاہ زیب کا کھانا لے کر جا رہی ہوں۔''

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ یوں ہی ٹیبل پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ جب بی بی اماں چلی گئیں تو اس نے سر اٹھایا۔ نم آنکھوں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

''آزین اس طرح کیوں کر رہا ہے؟''

بہت سوچنے کے بعد بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات ہوئی تھی جس نے آزین کا موڈ خراب کر دیا تھا بلکہ آنکھوں میں بھی پتھریلی سی اجنبیت اور سپاٹ پن تھا۔ اگر اسے میری کوئی بات بری لگی ہے تو اسے بتانا چاہیے تھا مجھے، آخر اتنی بے تکلفی تو ہے نا ہمارے درمیان۔ اگر اس نے نہیں بتایا تو مجھے پوچھ لینا چاہیے۔ اس نے سوچا جب سب چلے جائیں گے تو پوچھ لوں گی۔ لیکن دل پھر بھی مضطرب اور بے چین سا تھا۔ اگر اس نے کہا کوئی بات نہیں، وہم ہے تمہارا تو...... اگر اسے کچھ نہ بتانا ہوتا تو وہ یوں ہی کہتا تھا۔

اس نے ٹیبل پر پڑے گلاس کو دیکھا اور بی بی اماں نے آ کر دیکھا کہ یہ اسی طرح پڑا ہے تو ناراض ہوں گی۔ اس نے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا، تب ہی کچن کے دروازے کو کسی نے انگلی سے بجایا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ شینو بابا ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے کھڑے تھے۔

''آ جائیں، ابا نے کھانا کھا لیا؟''

''جی!'' شینخو بابا نے ٹرے کاؤنٹر پر رکھی۔ ''میں نے دوائی بھی دے دی تھی۔''

''اور اب کیا کر رہے ہیں وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''شیلف سے کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔'' شینخو بابا ہمیشہ کی طرح نگاہیں جھکائے کھڑے تھے۔

''یہ تو اچھی بات ہے ورنہ اتنے سالوں سے انہوں نے کبھی کتابوں میں دلچسپی نہیں لی۔'' وہ خوش ہوئی تھی۔

وہ جانے کے لیے مڑے تو اسے ایک دم یاد آیا۔

''شینخو بابا! آپ نے اپنا اکاؤنٹ کھلوا لیا ہے؟''

''نہیں......'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل رات بھی دادا جان کے پاس ظفر چاچو کا فون آیا تھا۔ وہ بہت تاکید کر رہے تھے۔''

''میں کیا کروں گا اکاؤنٹ کھلوا کر، میری کون سی ایسی ضروریات ہیں جن کے لیے پیسے چاہئیں، سب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔'' وہ دروازے کے پاس رک گئے تھے۔

ظفریاب نے جہاں زیب بیگ سے کہا تھا کہ مارکیٹ کے اوپر فلیٹ بنوانے کے علاوہ وہ چاہتے ہیں کہ مارکیٹ کی دکانوں میں سے ایک دکان خالی کروا کر شینخو بابا اس میں کوئی کاروبار شروع کر دیں۔ جس کے لیے وہ رقم بھجوانا چاہتے تھے۔ وہ بہت شرمندہ تھے کہ وہ جب مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے شینخو بابا کو گھر لائے تھے تو انہوں نے امام مسجد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح ہی رکھیں گے جب امام صاحب نے کہا تھا کہ آپ کا تو ایک بیٹا ہے، میں سوچ رہا تھا کہ اس بچے کو کسی بے اولاد شخص کے حوالے کر دوں اور وہ ان سے کیا وعدہ نبھا نہ سکے تھے اور اب تلافی کرنا چاہتے تھے۔

''کچھ تلافیاں بعد از وقت ہوتی ہیں دادا جان! لیکن شاید ابا یہ بات نہیں جانتے۔'' تب دادا جان کی بات سن کر آزین نے کہا تھا۔

اور اسے تو عادت تھی ظفریاب کے حوالے سے جلی کٹی بات کرنے کی، جہاں زیب بیگ نے پروا نہیں کی تھی اور ظفریاب سے کہہ دیا تھا کہ وہ شینخو بابا کا اکاؤنٹ کھلوا دیتے ہیں اور وہ ان کے

اکاؤنٹ میں رقم بھیج دیں۔

''صرف کھانا پینا اور کپڑے جوتے ہی زندگی کی ضروریات میں شامل نہیں ہیں ناں، جب آپ کی شادی ہوگی تو خاندان کی ذمہ داریاں اس معمولی ملازمت میں آپ نہیں اٹھا پائیں گے اسی لیے تو چچا جان چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی کاروبار سیٹ کردیں۔ میں زین سے کہوں گی وہ خود آپ کے ساتھ جا کر آپ کا اکاؤنٹ کھلوادے گا۔''

تھوڑی دیر کے لیے اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ آزین کا موڈ کتنا خراب ہے۔

شینو بابا کچھ کہتے کہتے رک گئے اور ''جی اچھا'' کہہ کر چلے گئے کہ بی بی اماں نے انہیں نان لانے کے لیے کہا تھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا اور خالی گلاس دھو کر ریک میں رکھا پھر کیبنٹ سے برتن نکالنے لگی۔ ڈونگیں، پلیٹیں، باؤل وغیرہ نکال کر ٹوکرے میں رکھے۔ اب کیا کرے، باہر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی کچن کے نیم وا دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ دل یک دم جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اس نے ایک نظر برتنوں پر ڈالی کہ ایک بار انہیں ''کھنگال'' کر رکھ دے۔

بی بی اماں کی عادت تھی کہ الماری سے برتن نکال کر دھوئے بغیر استعمال نہیں کرتی تھیں۔ صاف پانی سے دھو کر صافی سے خشک کرتی تھیں۔ لیکن وہ یوں ہی سستی سے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔

''دوسروں کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے زندگی کو آسان بھی تو بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن پتا نہیں ہم زندگی کو خود اپنے لیے کیوں مشکل بنا لیتے ہیں محض کسی چھوٹی سی بات کو لے کر......

اب یقیناً کوئی معمولی سی بات ہوگی جسے لے کر آزین نے اپنا موڈ بھی خراب کر رکھا ہے اور مجھے بھی تکلیف دے رہا ہے۔''

وہ ایک بار پھر سوچنے لگی تھی کہ ان گزرے دنوں میں ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے آزین ناراض لگ رہا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے تو وہ مری جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

''لانگ ویک اینڈ ہے اور میں کچھ چھٹیاں لے لوں گا تو مری چلتے ہیں سب۔ ماحول کی تبدیلی

سے چچا جان پر اچھا اثر پڑے گا۔نتھیا گلی میں ایک کولیگ کا اپنا کاٹیج ہے۔اس نے کہا ہے ہم لوگ وہاں رہ سکتے ہیں۔گھومیں پھریں گے،انجوائے کریں گے اور دادا جان وہاں آپ کتابوں کا ڈھیر ساتھ اٹھا کر مت لے جایئے گا۔''

''نہیں یار!ایک دو کتابیں تو ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی نا۔'' جہاں زیب بیگ مسکرائے تھے۔

''چلیں ایک دو کی اجازت ہے۔'' وہ بے حد خوش لگ رہا تھا۔

''اور تم زمل بی بی تم بھی ساتھ کتابوں کا ڈھیر نہ اٹھا کر لے جانا۔تمہاری بھی عادت دادا جان جیسی ہی ہے۔''

اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔

''پتا ہے زین!ایک بار یونی میں ایک لڑکی مری کا ذکر کر رہی تھی تو میں نے کہا کہ میں تو کبھی مری نہیں گئی تو وہ اتنی حیران ہوئی۔بار بار پوچھتی تھی کہ تم نے ابھی تک مری نہیں دیکھا۔''

''چلو اب مری سے آکر بتا دینا کہ تم نے مری دیکھ لیا ہے۔'' وہ ہنسا تھا۔

''لیکن اب تو یونی ختم اور وہ لڑکی پتا نہیں کہاں ہوگی۔'' اسے جیسے افسوس ہوا تھا کہ وہ اب یونی نہیں جاتی۔''

''چلو اب کسی نے پوچھا تو بتا دینا کہ تم نے مری دیکھ رکھا ہے۔''

اور یہ ہفتہ بھر پہلے کی ہی تو بات تھی تب وہ کتنا خوش تھا اور اس روز وہ اس کے کہنے پر ساجدہ کے ساتھ جا کر مارکیٹ سے جوگر بھی لے کر آئی تھی۔جو کچھ تھا اسی ایک ہفتے میں ہوا تھا۔

وہ اس ایک ہفتے میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات کے متعلق سوچنے لگی۔تین بار مونا تائی کے بلانے پر وہ اوپر گئی تھی۔ایک بار ماہ وش کی طبیعت خراب تھی تو وہ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی جس پر آزین نے تھوڑا ناراضی کا اظہار کیا تھا کہ ماہ وش کے ساتھ رخسانہ تائی یا میمونہ کو جانا چاہیے تھا لیکن جب اس نے بتایا کہ مونا تائی کو سخت فلو ہو رہا تھا اور رخسانہ تائی کے پاؤں میں موچ آگئی تھی جب کہ ماہ وش نے ٹائم لے رکھا تھا ڈاکٹر زبیدہ سے......

تب وہ خاموش ہو گیا تھا بلکہ اس روز تو انہوں نے بہت دیر تک باتیں کی تھیں۔ پھر رات کو وہ اسے اپنے ساتھ باہر آئس کریم کھلانے بھی لے کر گیا تھا۔

پھر چار دن پہلے اسے ایک دم کلک ہوا۔

جس رات وہ آئس کریم کھا کر آئے تھے اس سے اگلے روز صبح آزین کا موڈ بہت خوش گوار تھا اور اس نے ناشتے کی ٹیبل پر بی بی اماں سے کہا تھا اگلے ہفتے ان شاء اللہ ہم مری جائیں گے۔ شیخو بابا کو بتا دیجیے گا۔ وہ چھٹی کی بات کر لیں۔ چچا جان ان کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہیں تو وہ بھی ساتھ ہی جائیں گے۔

اور آزین کی نظریں جب بھی اس کی طرف اٹھتیں جذبے لٹاتی تھیں۔ اور جب وہ صحن کا دروازہ بند کرنے گئی تھی تو اس نے بے حد شوخی سے کہا تھا۔

''اچھی بیویاں ہمیشہ اسی طرح مسکراتے ہوئے صبح صبح اپنے شوہروں کو آفس جاتے وقت رخصت کرتی ہیں۔''

اس کے رخساروں پر ہمیشہ کی طرح لالی بکھر گئی تھی۔

''میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ اسی طرح مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرتی رہو۔ اور جب میں آفس سے واپس آؤں تو سج سنور کر مسکراتے ہوئے میرا استقبال کرو اور تمہاری مسکراہٹ میری دن بھر کی تھکن ختم کر دے۔''

اور پھر اسی روز سمیرا آئی تھی۔

وہ ہفتہ دس دن بعد چکر لگاتی تھی۔ اب تو بی بی اماں سے بھی اس کی دوستی ہو گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے زنل! ستمبر میں الحمرا آرٹس کونسل میں فن و ثقافت کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ مطلب آرٹسٹ آتے ہیں۔ آج موسیقی کا پروگرام ہے، بڑے بڑے فن کار ہوں گے۔ چلو آج میرے ساتھ۔''

''نہیں سمیرا! میں تو کبھی کہیں نہیں گئی، میں کیا کروں گی جا کر۔''

''یہ کیا کبھی نہیں گئی تو کیا ساری عمر نہیں جاؤ گی۔'' سمیرا نے برا سا منہ بنایا تھا۔ ''گھر میں پڑے پڑے سڑتی رہنا۔ باہر نکلا کرو یار، کبھی شاپنگ کے لیے، کبھی یوں ہی کسی پارک میں، جناح باغ چلی

جاؤ، اور نہیں تو چڑیا گھر ہی دیکھنے چلی جاؤ۔'' وہ ہنسی تھی۔

''ویسے کیا چڑیا گھر کبھی دیکھا ہے؟''

''ہاں بچپن میں ایک بار ظفر چاچو لے گئے تھے ہم سب بچوں کو۔ صبوحی چچی، اماں، میں، زین...... سب ہی گئے تھے۔ بہت مزا آیا تھا۔ ہم نے وہاں قلفی کھائی تھی۔ گول گپے کھائے تھے اور پتا نہیں کیا کیا۔'' وہ مسکرائی تھی۔

''اور گھر آ کر میرا اور زین کا گلا خراب ہو گیا تھا املی والا کھٹا پانی پینے سے...... پھر سب کچھ ختم ہو گیا سمیرا! خوشیاں اپنے پر پھیلائے ہمارے آنگن سے اڑ گئیں۔ اور آنسوؤں نے سب کی آنکھوں سے دوستی کر لی۔ اماں، صبوحی چچی، دادی جان، سب کی آنکھیں ہر لحہ آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں۔ پھر کبھی کوئی خواہش گھومنے پھرنے کہیں جانے کی پیدا ہی نہیں ہوئی۔''

''زندگی کسی ایک جگہ ٹھہرتی نہیں ہے زمل! اسے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی اب تک وہاں نہیں ٹھہری ہوئی ہے۔ تم ایک چھوٹی بچی سے ایک جوان، خوب صورت، حسین لڑکی کے روپ میں ڈھل چکی ہو تو یار زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرو، یہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ایک دن ختم ہو جائے گی۔ چلو آج نہ سہی، کل میرے ساتھ چلنا۔ میں آ کر لے جاؤں گی۔ کلینڈر آف ایونٹ پورے تین ماہ کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کالجز سے بھی طلبا شرکت کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کل کیا پروگرام ہے۔ شاید مشاعرہ ہو یا پھر اور کوئی ثقافتی پروگرام، لیکن کل میں انکار نہیں سنوں گی۔''

''میں وہاں جا کر کیا کروں گی سمیرا......''

''جو میں کروں گی۔'' سمیرا مسکرا رہی تھی۔

''بی بی اماں!'' اس نے مدد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''چلی جانا، جب سے یونی ورسٹی چھٹی ہے، گھر میں ہی رہتی ہو۔ اچھا ہے دل بہل جائے گا۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ خود بھی تو کہہ رہی تھیں، بوریت ہو رہی ہے۔'' بی بی اماں نے سمیرا کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

''لیکن بی بی اماں!''

"لیکن ویکن کچھ نہیں بس بی بی اماں نے اجازت دے دی ہے نا تو میں کل لینے آ جاؤں گی۔فون کر کے بتا دوں گی کب جانا ہے۔"

سمیرا کی عادت تھی یوں ہی فیصلہ سنانے کی اور وہ فیصلہ سنا کر چلی گئی تھی۔اور جاتے جاتے وہ اسے یقین دلا گئی تھی کہ وہاں جا کر وہ ہرگز بور نہیں ہوگی بلکہ اسے خوش گواری کا احساس ہوگا۔ایسے ہی جیسے کوئی بند کمرے کی گھٹن سے باہر کھلی ہوا میں آ جائے اور ایسا ہی ہوا تھا۔وہاں دو تین یونی ورسٹی فیلو بھی مل گئی تھیں۔دادا جان نے بھی اجازت دے دی تھی اور آزین نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے، چلی جاؤ لیکن سمیرا سے کہنا، خود گھر چھوڑ کر جائے، یہ نہ ہو کہ واپسی پر کسی رکشے یا ٹیکسی میں بٹھا دے۔"

آزین بہت جلدی میں تھا اسے مرسل اور رضا کے ساتھ کہیں جانا تھا سو اس نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی تھی۔بس آفس سے آ کر اپنا کیمرہ اٹھایا تھا اور چلا گیا تھا۔

اس روز چاروں صوبوں کا ثقافتی پروگرام تھا۔وہاں کے لوک گیت فنکاروں نے سنائے تھے اور مختلف صوبوں کے لباس اور لوک داستانوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے خاکوں میں بتایا جا رہا تھا اس نے بہت انجوائے کیا تھا اور بہت خوش گوار موڈ کے ساتھ وہ الحمرا آرٹس کونسل کی عمارت سے باہر آئی تھی۔وہاں وجدان احمد کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

"ارے آپ بھی آئے ہوئے ہیں۔سمیرا نے تو نہیں بتایا تھا۔"

"ہم صحافی لوگ ہیں، ایسی جگہوں پر ہمارا پایا جانا ہرگز حیرت انگیز نہیں ہے۔آخر اپنے کالم کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے نا۔" وہ سمیرا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"آپ کالم لکھتے ہیں، کس اخبار میں؟ ہمارے ہاں تو نوائے وقت آتا ہے اور......" لیکن سمیرا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی اور ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔

"تم دومنٹ یہاں رکو زل، میں وہ کارنر سے دو کوک پکڑ لاؤں، تم بھی پیو گے نا وجدان؟"

"تمہارے ہاتھوں سے تو زہر بھی پی لوں گا۔" وجدان اب سمیرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تب ہی کچن کا نیم وا دروازہ کھلا اور ساجدہ اندر داخل ہوئی۔

''ارے ساجدہ تم اس وقت خیریت ہے نا۔ بچے تو ٹھیک ہیں نا تمہارے؟'' وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

''ہاں سب خیریت ہے بی بی! بچے باپ کے ساتھ پارک گئے ہوئے ہیں۔ شیخو بابا آئے تھے بلانے کہ بی بی اماں بلا رہی ہیں۔''

ساجدہ دوگلیاں چھوڑ کر رہتی تھی۔ تین چار رشتہ داروں نے مل کر گھر کرائے پر لیا ہوا تھا۔ وقت بے وقت ضرورت پڑتی تو اسے بلا لیا جاتا تھا اور اضافی پیسے دے دیے جاتے تھے۔

اس سے پہلے کہ زل کچھ کہتی، بی بی اماں ہاتھ میں تسبیح لیے اندر آئیں۔

''میں نے بلوایا ہے اسے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ کھانا وغیرہ لگا دے گی اور بعد میں برتن دھو کر کچن بھی سمیٹ کر چلی جائے گی۔''

بی بی اماں کو صبح ناشتے کے وقت کچن صاف ستھرا چاہیے ہوتا تھا، سو رات کو کتنی بھی دیر ہو جاتی، وہ یا زل رات کے برتن دھو کر اور کچن سمیٹ کر ہی سوتی تھیں۔

زل نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔ واقعی آج اس میں ہمت نہیں تھی اور بی بی اماں بھی سارا دن مصروف رہی تھیں۔

''شکریہ بی بی اماں!'' اسے بی بی اماں پر پیار آیا تھا جو ماں سے بڑھ کر خیال رکھنے والی تھیں۔

''اور یہ تم اندر گرمی میں گھس کر کیوں بیٹھی ہو۔ باہر جا کر بیٹھو، تازہ ہوا سے طبیعت ٹھیک ہو گی۔''

اور وہ سر ہلاتی ہوئی باہر آ گئی۔ کچن سے باہر چند لمحے رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ثوبیہ اور سمیرا تخت پر بیٹھی تھیں سیڑھیوں میں شانزہ اب بھی وہاں ہی بیٹھی تھی۔ سحرش اور مہرین شاید اوپر چلی گئی تھیں۔ مہرین تو ڈیوٹی دے کر آئی تھی یقیناً تھکی ہوئی ہو گی۔ اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ امان کے ساتھ والی کرسی پر جہاں زیب بیگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھار ان کے ساتھ آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی شانزہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''تو سر......!'' وجدان احمد شاید اس کے آنے سے پہلے کوئی بات کر رہا تھا سو اس نے بات وہاں سے ہی شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔

''میں نے جو کچھ کہا، غلط نہیں کہا۔ پچاس سالوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، کیلنڈر تبدیل ہوتے رہے لیکن اس ملک کی تقدیر تبدیل نہیں ہوئی۔ پچاس سالوں سے طاقت اور اختیار ان لوگوں کو مل رہا ہے جنہوں نے اس ملک کے لیے کچھ نہیں کیا۔ صرف اپنی جیبیں بھری ہیں۔ اور قوم کو کیا دیا ہے۔ غربت، مہنگائی، ناانصافی، رشوت، سفارش، اقربا پروری، ناخواندگی...... پینے کا صاف پانی تک تو میسر نہیں ہے سب کو۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔

''پچاس سالوں سے یہ سیاست دان عوام کی امیدوں سے کھیل رہے ہیں۔ اقبال کے اشعار اور قائد کے اقوال سنا کر بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اور بے چارے عوام ہر نئے آنے والے کے دکھائے ہوئے خوابوں پر یقین کر کے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ اس کے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں۔ جانیں قربان کرتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے، وہی عوام کا استحصال، انسانیت کا زوال، خود غرضی، بے حسی......''

''تمہارا تعلق کس اپوزیشن پارٹی سے ہے اور تم کسے لیڈر مانتے ہو؟'' رضا جو کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا، اور عمر کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے ایک دم پوچھا تو وجدان احمد نے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا تعلق کسی پارٹی سے نہیں ہے اور لیڈر صرف ایک ہی تھا اور وہ قائداعظم محمد علی جناح۔ قائد کے بعد اس ملک کو کوئی لیڈر نہیں ملا، باقی سب سیاست دان تھے، اچھے برے بھلے جیسے بھی تھے لیکن لیڈر نہیں تھے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر، بلٹ پروف گاڑیوں میں سفر کرنے والے غریبوں کے مسائل پر لمبی لمبی تقریریں...... ابھی دو ماہ پہلے آنے والے سیلاب سے متاثر ہونے والوں کے لیے کیا کیا ہے انہوں نے۔ اپنے شیش محلوں کے جھروکوں سے جھانک کر صرف تسلیاں ہی دی ہیں۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر سیلاب زدہ علاقے کا سروے کر کے بس ان کا فرض ادا ہو گیا؟ سیلاب زدگان تو اب بھی کھلے آسمان تلے پڑے ہیں۔ انہیں صرف اپنے اقتدار سے مطلب ہے۔ عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرنے والے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔''

''وجدان احمد!'' جہاں زیب بیگ نے جو بے حد خاموشی سے اور دھیان سے اسے سن رہے تھے یک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جو شاید ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا، یکدم بوکھلا کر بولا۔

''جی سر!''

''آپ شاید نہیں جانتے کہ 1947ء میں جب پاکستان بنا تو یہاں کیا حالات تھے۔ دفاتر میں کامن پنیں تک نہیں تھیں۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے 1947ء کے پاکستان اور آج کے پاکستان کا موازنہ کریں تو آپ کو ادراک ہوگا کہ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ پچاس اکیاون سالوں میں یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

جہاں زیب بیگ اس طبقہ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو پاکستان سے اندھی محبت کرتے ہیں اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے۔

''سر مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے۔ تب لوگوں کے دلوں میں جذبہ تھا اس نئے وطن کو خوش حال بنانے کا، لوگوں نے انفرادی طور پر صنعتیں لگائیں۔ ملک میں آج جو ترقی نظر آ رہی ہے۔ وہ ان ہی محب وطن لوگوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ میں نہیں جانتا اس میں اس دور کے حکمرانوں کا کتنا ہاتھ تھا۔ کچھ تعاون تو بہر حال ضرور کیا ہوگا۔ میرے دادا اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے، انہیں جنون تھا کہ ایسا کچھ کریں کہ پاکستان معاشی لحاظ سے سارے ملکوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔ انہوں نے چند لومز لگا کر چھوٹے سے کارخانے سے کام شروع کیا تھا۔ آج میرے والد ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ حالانکہ بہت رکاوٹیں بھی آئیں تاہم ایک عزم تھا، ولولہ تھا کہ وہ ہر رکاوٹ عبور کرتے گئے۔''

''یعنی......'' جہاں زیب بیگ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا قصور سیاست دانوں اور حکمرانوں کا نہیں، عوام نے بھی ملک کی ترقی کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ ہر فرد اپنا مفاد سوچتا ہے اور اسے صرف اپنے ذاتی نفع و نقصان کی فکر ہے۔ ایک بات یاد رکھیں وجدان احمد! جب قومیں بصیرت و بصارت کھو دیتی ہیں تو حکمران ان سے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں کا محاسبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا احتساب بھی کریں کہ آپ نے ذاتی طور پر اس ملک کے لیے کیا کیا، سوائے لیڈروں کے پیچھے کھوکھلے نعرے لگانے کے۔''

''جی۔ جی سر!'' وجدان احمد نے پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطروں کو دائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھا۔

''وجدان احمد! آپ ہمیشہ سے جذباتی اور پر جوش ہیں۔ یاد ہے آپ کو اپنی ان پر جوش تقریروں اور انقلابی فطرت کی وجہ سے ایک بار آپ یونی ورسٹی سے نکلتے نکلتے بچے تھے۔''

پہلی بار جب وہ مرسل کے ساتھ آیا تھا تو انہوں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ ایک پر جوش اور انقلابی اسٹوڈنٹ لیڈر کے طور پر پہچانا جاتا تھا اور وہ بھی انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

''سر! آپ آزین کے......؟''

''دادا ہوں۔'' وہ مسکرائے تھے اور اس کے جانے کے بعد انہوں نے خاص طور پر اس کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے تو نہیں اور آزین نے کہا تھا کہ وہ ایک صنعت کار کا بیٹا اور خود بھی صنعت کار ہے۔ بھلا ایک صنعت کار کا سیاست دانوں سے کیا مطلب؟''

اور تب وہ آزین کی سادگی پر مسکرا دیے تھے۔

''تمہیں کیا خبر یہ صنعت کار سیاست دانوں سے کتنے فائدے اٹھاتے ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صنعت کاران کی سیاست چمکانے کے لیے پیسہ خرچ کرتے ہیں اور سیاست دان برسر اقتدار آ کر انہیں مراعات دیتے ہیں۔ ان میں ایسی مراعات بھی ہوتی ہیں جن کے وہ حق دار نہیں ہوتے۔''

''آپ یقیناً صحیح کہہ رہے ہیں دادا جان لیکن وجدان ایسا نہیں ہے۔ نہ اس کا مزاج سیاست دانوں جیسا ہے اور نہ ہی اس کے اندر صنعت کاروں والا غرور و تکبر ہے۔ مرسل اور رضا کالج کے زمانے سے اس کے دوست ہیں۔ میری ملاقات چند ماہ پہلے ہی مرسل کے گھر ہوئی تھی، وہ مجھ سے سینئر تھا میں جس سال یونی میں گیا اس نے اسی سال شاید یونی کو خیر باد کہا تھا۔''

''بہر حال! تم اسے بتا دینا کہ تم سب لوگ مل جل کر فلاحی کام کرتے ہو اور کسی قسم کی سیاست یا سیاسی پارٹی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔'' لیکن اس کے باوجود آج جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر شاہ زیب بیگ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر وہ ان کی طرف چلے آئے تھے۔ موضوع گفتگو ملکی حالات تھے۔

''بہر حال!'' وہ اٹھے۔ ''کیا آپ کو آزین نے بتایا نہیں وجدان احمد! کہ یہاں پر سب فلاحی کاموں کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، سیاسی بحث کے لیے نہیں۔''

''لیکن سر! میں سیاسی بحث تو نہیں کر رہا۔'' وہ جہاں زیب بیگ کا بہت احترام کرتا تھا ان کے علم و فضل کا مداح تھا، لیکن وہ وجدان احمد تھا، اپنا مؤقف بیان کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

''میں تو ایک دردمند شہری کی حیثیت سے اپنے وطن کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے لوگ بھی خوش حال ہوں، میرا وطن بھی ترقی کرے۔ لیکن جب میں اپنے حکمرانوں کو دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ میرے دادا نے ہماری تربیت کی بنیادوں میں وطن سے محبت کی اینٹ بھی رکھ دی تھی۔ میرا تعلق کسی سیاسی پارٹی یا لیڈر سے نہیں ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر عوام کو سیاست کا شعور نہیں ہوگا تو پھر آمریت کا تسلط ہوگا، میں جو کچھ کہتا ہوں، یہ میرا سیاسی شعور ہے، کسی پارٹی یا لیڈر کی حمایت نہیں ہے۔ آپ بھی تو کہا کرتے تھے......

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی......''

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن جہاں زیب بیگ نے جو مشکل وقت دیکھا تھا، اس نے انہیں محتاط کر دیا تھا کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔

''تو سیاست دانوں اور حکمرانوں پر تنقید کرنے کے بجائے عملی طور پر کچھ کریں وجدان احمد! یہ بچے اور آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ بھی وطن سے محبت ہی ہے۔ بے سہارا اور ضرورت مندوں کے لیے کچھ کر کے، اور ان کے کام آ کر بھی آپ وطن کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔''

''سوری سر! آئندہ احتیاط کروں گا کہ یہاں سیاست اور سیاست دانوں کے حوالے سے کوئی بات نہ کروں۔''

وہ سر ہلا کر شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو وجدان احمد نے پریشان سا ہو کر آزین سے پوچھا۔

''کیا سر ناراض ہو گئے ہیں؟''

''نہیں۔'' آزین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس دادا جان نہیں چاہتے کہ میرا ربط ضبط ان لوگوں سے ہو جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہوں۔''

''تھینک گاڈ! سر ہمیشہ سے میرے آئیڈیل رہے ہیں۔'' اس نے مطمئن سا ہو کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

''چھوڑو یار اس سیاست اور سیاست دانوں کا ذکر، عمر سے اس کی غزل سنتے ہیں کوئی۔''

رضا نے کہا تھا، سب نے ہی اس کی تائید کی۔

’’چھوڑ دیا سب......‘‘ وجدان نے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا اور گنگنانے لگا۔

سکھ کے پھول

بدی کے کانٹے

دکھ کی گھاس

سب بکواس، سب بکواس

مرتضیٰ، مرسل، رضا، امان سب اس کے ہم آواز ہو کر گانے لگے تھے۔

سکھ کے پھول

بدی کے کانٹے

سب بکواس، سب بکواس

سمیرا بھی تالیاں بجاتی ہوئی تخت سے اٹھ کر صحن میں آ گئی تھی۔

اب سب یہ بول دہراتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔

1947ء میں جب وجدان احمد کے چچا یونیورسٹی میں تھے تو زاہد ڈار کے یہ بول ہر طالب علم کی زبان پر تھے۔

سیڑھیوں پر لان میں گروپ کی صورت کھڑے طلباء گاتے نظر آتے تھے۔ ایک روز اس کے چچا نے اپنی یونی ورسٹی کی باتیں سناتے ہوئے بتایا تھا تب سے یہ بول وجدان احمد کی زبان پر بھی رہنے لگے تھے اور اب تو اکثر یہ سب بھی جب تھک جاتے تو کورس میں گانے لگتے تھے۔
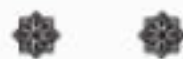
ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 11

دکھ کی گھاس، سکھ کے پھول
سب بکواس......سب بکواس

ہولے ہولے ان کی آواز بلند ہونے لگی تو مرسل نے ٹوک دیا۔

"یار یہاں اوپر بھی کچھ لوگ رہتے ہیں اور انکل شاہ زیب بھی ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔"

"اوہ ہاں......!" سب خاموش ہو گئے تو رضا نے عمر کی طرف دیکھا۔

"تو عمر اعجاز جب تک ہمارے شیخو بابا نان لے کر نہیں آتے، آپ ہمیں اپنی خوب صورت شاعری سے مستفید کریں۔"

"شاعری کیا یوں ہی کبھی کبھی تک بندی کر لیتا تھا اب تو کچھ خاص یاد بھی نہیں۔"

عمر نے انکار کیا تو رضا نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا۔

"میرے سامنے تو یہ کسر نفسی نہ کریں، جب آپ مدثر بھائی کو اپنی غزلیں اور نظمیں سناتے تھے تو میں بھی وہاں ہی بیٹھک میں ایک طرف بیٹھا بظاہر پڑھ رہا ہوتا تھا۔"

عمر، رضا کے بڑے بھائی کا ہم جماعت اور دوست تھا لیکن عمر میں ایک دو سال بڑا ہونے باوجود اب سب ایک دوسرے کے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

"اور وہ خوابیدہ آنکھوں والی لڑکی جو آپ کی اکثر نظموں میں ہوتی تھی، کیا وہ ملی؟"

عمر کی نظریں بے اختیار سیڑھیوں کی طرف اٹھیں لیکن اس نے فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں۔

"وہ ایک تخیل تھا بس۔ یوں ہی شاعر بننے کے شوق میں تراش لیا تھا۔"

''تو عمر یار اب کچھ سنا ہی دو۔''

سب ہی اصرار کرنے لگے تو عمر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک آزاد نظم ہے، اس وقت یہ ہی ذہن میں آرہی ہے۔''

''ارشاد......ارشاد......''

سمیرا کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ اب وجدان کی کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر جہاں زیب والی خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ زل نے ذرا سا رخ موڑ کر شانزہ کی طرف دیکھا۔ وہ گھٹنوں پر رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ زل کو پتا نہیں کیوں محسوس ہوا کہ اس کی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

نظم کا عنوان ہے ''سب ہوائیں ہیں ناموافق''

تمہاری چاہت، تمہارے خوابوں

تمہارے جذبوں کی چاندنی

زادِ راہ لے کر

سفر پہ نکلے ہیں ساتھ لیکن

میں سوچتا ہوں

نہ جانے کب تک سفر ہمارا

یہ چل سکے

نہ جانے کب تک یہ ہاتھ

ہاتھوں میں رہ سکے گا

اس کی آواز گمبھیر اور پر اثر تھی۔ سب بہت خاموشی سے سن رہے تھے۔ وہ ہولے ہولے بڑے جذب سے بول رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی آواز اتنی دھیمی ہو جاتی کہ زل کی سماعتوں تک نہ پہنچ پاتی۔

''سحرش سے کہوں گی عمر بھائی سے یہ نظم لکھوا دے مجھے، اپنی ڈائری میں لکھوں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے نظم کو ایک بار پھر سننے کی کوشش کی۔ اب کے عمر کی آواز قدرے صاف

سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

نہ جانے کب راستوں میں تھک کے

تو بچھڑ جائے، میں ہار جاؤں

کہ میری کشتی کے بادباں سب پھٹے ہوئے ہیں

اوراس کے پتوار گر چکے ہیں

پھٹے ہوئے میں یہ بادباں کب تلک سیوں گا

یہ خوف اندر سے کاٹتا ہے

شانزہ ایک دم اٹھی تھی اور اوپر سے آتی سحرش سے آدھے راستے میں رک کر کچھ کہا تھا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ سحرش بہت خاموشی سے آکر اس کی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔ اب عمر کہہ رہا تھا۔

نہ جانے کب تک سفر ہمارا یہ چل سکے گا

کہ سب ہوائیں ہیں ناموافق

وہ خاموش ہوا تو سب نے تالیاں بجا کر داد دی۔

''یہ اکثر دو محبت کرنے والوں کے لیے ہوائیں ناموافق کیوں ہو جاتی ہیں؟'' سحرش نے سرگوشی کی تھی جیسے......

''کیا سب محبت کرنے والوں کے لیے ہوائیں ناموافق ہو جاتی ہیں سحرچ؟'' زل کا دل سینے کے اندر بہت شدت سے کانپا تھا۔

''پتا نہیں......'' سحرچ نے کندھے اچکائے تھے۔ ''لیکن کسی کسی کے لیے جیسے مہرو اور جیسے شا......'' اس نے نام لیتے لیتے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ سحرش نے عمر اور شانزہ کی پسندیدگی اور عمر کے پروپوزل کے متعلق تو اسے بتایا تھا لیکن کیا وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس کے متعلق اس نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ سحرش اس موروں والی حویلی کی سب سے باخبر فرد تھی۔ وہ کچھ پوچھنا ہی چاہتی

تھی کہ صحن کا دروازہ کھلا اور شینخو بابا اندر داخل ہوئے۔

''نان آگئے......'' سمیرا کی آواز حسب معمول بلند تھی۔

''اتنی دیر لگادی شینخو بابا...... آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔''

''رش بہت تھاجی......''

''چلو زمل ٹیبل لگائیں ورنہ یہ سمیرا بیگم مارے بھوک کے فوت ہی نہ ہو جائیں۔''

''ساجدہ کرلے گی سب...... بی بی اماں نے اسے بلالیا تھا۔''

''یار! یہ تم کتنی لکی ہو نا۔ بی بی اماں، ساجدہ......'' سحرش نے حسرت سے کہا۔ ''ہماری تو وہ سرمہ ستارا بیگم مجال ہے کہ کبھی ذرا سا بھی فالتو کام کردیں۔''

''سحرش! میں ذرا شانزہ کو بلالوں۔ اسے بی بی اماں کے ہاتھ کی نہاری بہت پسند ہے۔''

''رہنے دو، عقیل بھائی آرہے ہیں اسے لینے...... فون آیا تھا۔ وہ جو مسٹر کھڑوس ہیں نا، ان کا موڈ خراب ہو جانا اسے نیچے دیکھ کر، بے چاری رخسانہ خالہ ملازمہ کے ساتھ مل کر کب سے کچن میں نہ جانے کیا کیا تیار کررہی ہیں، ان حضرت کے لیے تم ایک ڈونگا بھجوادینا اوپر......''

''وہ تو خیر بھجوانا ہی ہے۔'' وہ اٹھی۔ ''چلو کچن میں چل کر دیکھتے ہیں کہ ساجدہ کیا کررہی ہے۔ ویسے بی بی اماں تو ہیں اسے گائیڈ کرنے کے لیے۔''

تب ہی عقیل احمد نے صحن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

''السلام علیکم عقیل بھائی!'' سحرش نے ایک ساتھ دو سیڑھیاں پھلانگی تھیں۔

عقیل نے ہمیشہ کی طرح سر کے اشارے سے جواب دیا۔

''میں تو باہر ڈیوڑھی سے ہی اوپر جارہا تھا لیکن باتوں کی آواز سن کر اندر آگیا کہ ضرور قوم کے غم میں دبلے ہونے والوں کی محفل جمی ہے۔''

لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا تھا۔ پچھلے چند ماہ میں دو تین بار سب سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی اور

مرسل نے اپنے کاز کے متعلق اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

''ویسے یہ آج کی گول میز کانفرنس کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟'' وہ اب ان کے قریب آ گیا تھا۔

مرسل نے مختصراً بتایا۔

''گڈ! اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو......''

''شکریہ عقیل صاحب! اس بار تو کام بن گیا ہے، پھر کبھی ضرورت پڑی تو آپ سے رابطہ کریں گے۔''

''موسٹ ویلکم!''

اس نے اس طرح سے کہا کہ سحرش نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر نیچے کر لیا۔

''بیٹھ جائیں پلیز عقیل بھائی! کھانا لگ رہا ہے، کھا کر جائیے گا۔'' آزین نے وضع داری نبھائی۔

''اور وہ جو اوپر میری ساس صاحبہ نہ جانے کب سے کچن میں گھسی جان کھپا رہی ہیں، طرح طرح کے کھانے بنانے میں، ان کا کیا ہو گا۔ حالاں کہ جانتی ہیں کھانے کے معاملے میں بہت چوزی ہوں میں۔ کم ہی کچھ پسند آتا ہے۔''

''خیر ان کھانوں کی فکر نہ کریں آپ، ضائع نہیں ہوں گے۔ اگلے دو دن تک ہم ان سے ہی کام چلائیں گے۔''

سحرش کی زبان کو کھجلی ہوئی تھی۔ مرتضیٰ نے گھور کر اسے دیکھا۔

''اس کا اندازہ ہے مجھے۔'' ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری۔

''خیر اب اتنے عرصے میں خالہ جان کو آپ کی پسند کا پتا چل ہی گیا ہو گا۔'' مرتضیٰ نے اس کے طنز کو نظر انداز کیا۔

عقیل نے مرتضیٰ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور سب پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور انگلی سے امان کی طرف اشارہ کیا۔

''تم امان ہو نا......ثوبان شاہ کے بیٹے......''

امان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سنا ہے وہ تمہارے بابا کے کزن اس بار الیکشن میں حصہ نہیں لے رہے، وہ کیا نام ہے ان کا......دلاور شاہ!''

''ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ دلاور چچا اگر الیکشن میں نہ بھی کھڑے ہوئے تو ان کی فیملی میں سے کوئی نہ کوئی اور ضرور کھڑا ہوگا۔'' امان شاہ نے مختصر جواب دیا۔

اسے یہ شخص پہلی ملاقات میں ہی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اس کے متعلق پہلی ملاقات میں ہی اچھی طرح جان گیا تھا لیکن ہر بار یوں ظاہر کرتا، جیسے اچھی طرح سے پہچانتا نہ ہو۔

''کیا مطلب ہے تمہارا امان۔ دلاور شاہ تمہارے بابا کے کزن ہیں؟'' وجدان احمد صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ آزین کا کزن ہے۔

''تمہارے جاگیر دار فیملی کے لوگ تو عرصہ سے اسمبلی میں بیٹھتے آرہے ہیں پھر تم یہاں جرنلزم میں کیا کرنے آئے ہو؟''

''بس آ گیا ہوں۔'' وہ سادگی سے مسکرایا۔

''میرے بابا جان، میرے دونوں چچا جان اور دونوں بڑے بھائی سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ البتہ شایان ہوسکتا ہے کبھی سیاست میں چلا جائے۔''

''ہاں......اس کا مزاج ویسے سیاست دانوں جیسا ہی ہے۔'' وجدان احمد ہنسا۔

''میرے بابا جان کھری اور سچی سیاست کے قائل ہیں۔ آج کل وہ جواد احمد کا کالم ''کہنی سنی'' بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جواد احمد کے قلم میں بڑی کاٹ ہے، کھرا اور سچا صحافی ہے۔''

''ریئلی؟'' وجدان احمد کو حیرت ہوئی۔ ''لیکن پچھلے دنوں تو اس نے دلاور شاہ پر بڑی تنقید کی تھی، اور بیدار بخت شاہ کے کاموں کو سراہا تھا۔''

سمیرا نے مسکراتی نظروں سے وجدان احمد کو دیکھا۔

''بابا جان خود بھی بیدار بخت کو پسند کرتے ہیں۔ اور انہیں دلاور چچا کی کئی باتوں پر اعتراض ہوتا ہے۔'' امان نے اسی سادگی سے کہا تو خود کو نظر انداز کیے جانے پر عقیل احمد نے جز بز ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''کون جواد احمد وہ دو ٹکے کا صحافی، بلاوجہ جھوٹ سچ بول کر سب پر تنقید کرتا رہتا ہے۔ بلیک میلر ہے۔ پیسے وصولنے کے لیے سب کرتا ہے۔''

وجدان احمد کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی سمیرا بول پڑی تھی۔

''کیوں کیا اس نے آپ کے ڈیڈ کے خلاف بھی کچھ لکھ دیا ہے؟''

لیکن وہ جواب دیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''اللہ خیر! مزاج گرامی برہم ہو گیا ہے۔''

سمیرا نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تب ہی ساجدہ نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

دکھ کی گھاس

بدی کے کانٹے

سکھ کے پھول

سب بکواس، سب بکواس

وہ یک زبان ہو کر گاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے جس کے ایک حصے میں آٹھ کرسیوں والی ٹیبل تھی۔

''اور آپ کے لیے کچن میں کھانا لگا دوں یا یہاں باہر؟''

ساجدہ نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

ہمیشہ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ کھانا لگتا تھا۔ کچن میں ایک گول ٹیبل تھی۔

''یہاں برآمدے میں ہی لگا دو یار، اس گرمی میں کچن میں کون جائے۔'' سمیرا اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ ساجدہ نے جلدی سے تخت پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا اور صحن سے کرسیاں اٹھا کر تینوں اطراف رکھ دیں۔ سمیرا نے حسب معمول تعریف کی۔

''یار! جی چاہتا ہے تمہاری بی بی اماں کو اغوا کر کے لے جاؤں۔''

کچھ دیر بعد ہی ساجدہ نے ٹھنڈی ٹھنڈی کھیر کا باؤل لا کر رکھ دیا۔ سحرش جلدی ہی اٹھ کر چلی گئی

تھی لیکن جاتے جاتے بی بی اماں کو آواز دے کر نہاری اوپر بھجوانے کا کہنا نہ بھولی تھی جو بی بی اماں نے ساجدہ کے ہاتھ بھجوادی تھی۔

''زندگی کے بہت سارے یادگار دنوں میں آج ایک اور یادگار دن کا اضافہ ہوا۔''

ثوبیہ نے مرسل کے بلانے پر اٹھتے ہوئے جیسے خود سے کہا تھا۔زل ساجدہ کی مدد کے خیال سے کچن میں جا چکی تھی۔ثوبیہ کے جانے کے بعد سمیرا اکیلی بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی جب وجدان احمد اور رضا باہر آئے۔رضا فوراً ہی چلا گیا تھا۔

''وہ تینوں کیا ابھی تک کھا رہے ہیں؟''

سمیرا کا اشارہ مرتضیٰ، آزین اور امان کی طرف تھا۔

''نہیں، مرتضیٰ نے یوں ہی فضول سی بحث چھیڑ دی ہے، اسی میں الجھے ہوئے ہیں۔اب چلیں تمہیں پتا ہے نا میرے ابو اور امی جب تک میں گھر نہ پہنچ جاؤں جاگتے رہتے ہیں۔''

''ہاں چلتے ہیں۔'' پرسوچ انداز میں ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم رکو میں ذرا زل کو خدا حافظ کہہ دوں۔بلکہ تم بھی چلو، تمہیں بھی خدا حافظ کہنا چاہیے اسے اور بی بی اماں کا شکریہ تو بنتا ہے نا اتنی مزیدار نہاری کھلانے پر......وہ کچن میں ہوں گی۔''

''ہاں نہاری واقعی مزیدار تھی۔''

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ کچھ الجھا سا تھا۔سمیرا کی اور بات تھی، لیکن کیا اس کا کچن تک جانا بنتا تھا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہا سمیرا تم کیا کرنا چاہ رہی ہو۔تمہارے ذہن میں کیا ہے۔اس روز بھی وہاں الحمرا میں......''

''وقت آنے پر سب بتا دوں گی۔بس ایک ایڈونچر سمجھ لو۔''

''لیکن اس ایڈونچر میں کہیں کسی کا دل نہ پامال کر دینا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''تم مجھے ایسا سمجھتے ہو کہ میں کسی کو دکھ دوں گی۔''

''نہیں! لیکن ان دنوں تم جو حرکتیں کر رہی ہو، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ میں تمہارے ہر غلط صحیح میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن مجھے یوں اندھیرے میں نہ رکھو پلیز سمو......''

''او کے، جلد بتا دوں گی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

وہ بے باک صحافی وجدان احمد جو ساری دنیا سے آرگو کر سکتا تھا لیکن سمیرا سے نہیں۔ اس نے ہلکا سا سر خم کیا۔ وہ کچن تک پہنچ چکے تھے۔ ساجدہ برتن دھو کر خشک کر رہی تھی اور زمل خشک کیے ہوئے برتن سمیٹ رہی تھی۔

''ہیلو زمل! ہم جا رہے تھے تو سوچا تمہیں خدا حافظ کہہ دوں۔''

سمیرا دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی اور وجدان احمد دروازے سے باہر تھا۔ زمل نے مڑ کر دیکھا۔

''باقی سب لوگ چلے گئے کیا؟'' وہ کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ کر دروازے کے قریب آئی۔

''ہاں سب چلے گئے اور بی بی اماں کہاں ہیں؟ ہمیں بطور خاص ان کا شکریہ ادا کرنا تھا اتنی مزیدار نہاری اور کھیر کھلانے پر۔''

جواب وجدان احمد نے دیا تھا۔

''جی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔''

''او مائی گاڈ! مجھے سحرش سے ایک ضروری بات کرنی تھی، تم ایک منٹ رکو وجدان، میں ابھی آئی۔'' وہ تیز تیز چلتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ زمل حیران سی کھڑی تھی۔

وجدان احمد کو سمیرا پر غصہ آتا۔ وہ وہاں یوں کچن کے باہر کھڑا خود کو بڑا آکورڈ محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے واپس مڑتا، ڈرائنگ روم سے آزین اور مرتضیٰ باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے۔ امان بھی ان کے ساتھ تھا۔

زمل کی نظریں لمحہ بھر کے لیے آزین کی نظروں سے ملیں اور اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلے ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ شیخو بابا کو بلاتا ہوا صحن کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

شایان شاہ ٹی وی لاؤنج میں صوفہ کم بیڈ پر سر کے نیچے کشن رکھے لیٹا ہوا تھا۔ سامنے ٹی وی لگا ہوا تھا لیکن آواز بند تھی اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے آنکھیں موندے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اختر بانو نے لاؤنج سے گزر کر کچن کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے وہاں سے گزر گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ماسی تاج کو ہدایات دے کر اپنے بیڈ روم کی طرف جانے کے لیے دوبارہ لاؤنج سے گزریں تو تب بھی اسی طرح اسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔ اختر بانو نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''تم ٹھیک تو ہونا اس طرح کیوں لیٹے ہو؟''

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''جی بڑی امی!''

''پھر اس طرح کیوں لیٹے ہو؟'' وہ قریب کھڑی تشویش سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ٹی وی پر بھی کچھ خاص پروگرام نہیں تھا اور کچھ کرنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا تو بس یہاں ہی لیٹ گیا۔ عجیب سستی سی ہو رہی ہے۔''

''رات کو دیر تک تو نہیں جاگتے رہے۔ اکثر نیند کی کمی سے بھی سستی ہو جاتی ہے۔''

انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح فریش نہیں لگ رہا تھا اور جب یہاں حویلی میں ہوتا تو کبھی یوں ٹک کر گھر نہیں بیٹھتا تھا کبھی ڈیرے پر، کبھی تایا جان کی حویلی میں کبھی یوں ہی ادھر ادھر گاڑی بھگاتا پھرتا تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ تر حیدرآباد ہی رہتا تھا۔

''جی رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی بلکہ کئی راتوں سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔'' اسے اختر بانو کے صحیح اندازہ لگانے پر حیرت ہوئی تھی۔

''اکثر وقت گزر جانے پر نیند نہیں آتی۔ وقت پر سونے کے لیے لیٹ جایا کرو۔'' اختر بانو اب دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

''لیٹتا تو وقت پر ہی ہوں، لیکن پتا نہیں کیوں آج کل نیند نہیں آتی۔''

اس ایک چھوٹے سے حادثے نے شایان کے دل میں اختر بانو کے لیے احترام پیدا کر دیا تھا۔

''تو کیا کوئی پریشانی ہے بیٹا؟'' اختر بانو پریشان ہو گئی تھیں۔

''نہیں بڑی امی!''

اسے اب اپنے لیے اختر بانو کا پریشان ہونا حیران نہیں کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اختر بانو ایسی ہی ہیں۔ محبتوں کی مٹی سے گندھی ہوئی۔ اس نے انہیں سنہری اور بھاگی کے لیے بھی پریشان ہوتے دیکھا تھا۔

''تو پھر دماغ میں خشکی ہو گئی ہو گی۔'' وہ مدھم سا مسکرائیں۔

''ہماری اماں جان ہم سب پڑھنے والے بچوں کو سونے سے پہلے دودھ میں بادام اور ہلکا سا گھی ڈال کر دیتی تھیں۔ میں بھاگی سے کہوں گی کہ رات دودھ میں بادام پیس کر ڈال کر تمہیں دے۔ تم دیکھنا بڑی اچھی نیند آئے گی۔''

''میں کہاں اتنا پڑھتا ہوں بڑی امی!'' وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

''جتنا بھی پڑھتے ہو...... خشکی تو ہو جاتی ہے۔''

سادگی سے کہتی ہوئی وہ اسے بہت اچھی لگیں۔

''اور کتنی چھٹیاں لے کر آئے ہو، واپس کب جانا ہے؟''

''واپس نہیں جانا اب!'' وہ لاہور سے آتے ہوئے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے واپس نہیں جانا اور اس کا اظہار اس نے امان سے بھی کر دیا تھا۔

''لیکن کیوں بیٹا؟'' اختر بانو کو حیرت ہوئی۔

''اتنی ضد کر کے اور ایک طرح سے ثمرہ آپا کی مرضی کے خلاف وہاں گئے تھے۔ یاد ہے نا کتنی مشکل سے اجازت لی تھی۔''

''بس میرا دل نہیں لگا وہاں۔ عجیب بور سی زندگی تھی۔ یونی جاؤ، پروفیسر کے لیکچر سنو۔ پھر تھک کر گھر آ جاؤ اور گھر آ کر بھی کوئی دلچسپی نہیں...... پڑھو، لیٹو، کھاؤ، پیو اور بس...... ایک وہ مانی کتابی

کیڑا...... یونی میں دماغ کھپا کر آتا ہے تو پھر گھر آ کر بھی یہ موٹی موٹی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ پڑھ رہا ہے، نوٹس بنا رہا ہے۔ سچ بڑی امی میرا تو گھر آ کر کتابیں دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔"

یہ سچ تھا کہ اسے پڑھائی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کند ذہن تھا بلکہ کافی ذہین تھا۔ دراصل وہاں ثمرہ کے میکے میں پڑھائی کا کچھ خاص رجحان نہ تھا۔ سو اس نے بھی بی اے کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کے ماموں زاد بھائی ہادی اور رضی وغیرہ نے بھی بی اے ہی کیا تھا۔ البتہ چھوٹے ماموں کے چھوٹے بچے کراچی میں پڑھ رہے تھے۔ وہاں حیدر آباد میں اس کی دلچسپیاں اور طرح کی تھیں۔ شکار کے لیے جانا، گھومنا پھرنا، رانگ نمبر پر لڑکیوں سے باتیں کرنا اور ایسی ہی دلچسپیاں تھیں۔ پھر بھلا لاہور میں اس کا دل کیسے لگتا۔ اور جب وہ مقصد ہی اس نے ترک کر دیا تھا جس کے لیے لاہور گیا تھا پھر رہنے کا فائدہ کیا تھا وہاں، سو چلا آیا تھا۔

"تو پھر خوامخواہ ہی ثمرہ آپا کا دل دکھایا تم نے......" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"خیر خوامخواہ تو نہیں......" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اگر بڑی امی کو پتا چل جائے کہ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیوں کیا تھا تو وہ جو اتنی محبت اور شفقت سے مجھے دیکھ رہی ہیں، شاید مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔"

وہ اندر ہی اندر نادم سا ہو گیا تھا۔

"بس بڑی امی! تب مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ مجھے بس لاہور جانا ہے۔ ہر صورت لیکن وہاں کی زندگی بہت بورنگ تھی میرے لیے......"

"حالانکہ لوگ کہتے ہیں جو ایک بار لاہور جاتا ہے، وہ لاہور کا ہی ہو جاتا ہے۔ لاہور اسے باندھ لیتا ہے۔" ممتا کے جذبے سے لبریز آنکھیں اس پر جمی تھیں۔

"اور اس سے پہلے کہ آپ کا لاہور مجھے باندھ لیتا، میں بھاگ آیا۔" وہ ہنسا۔

"چلو ثمرہ آپا خوش ہو جائیں گی لیکن بیٹا آج کل کے دور میں بی اے تک کی تعلیم تو کچھ بھی نہیں

ہے۔ کم از کم اپنے پسندیدہ مضمون میں ادھر سے ہی ماسٹر کرلو۔"

اختر بانو چاہتی تھیں کہ وہ تعلیمی میدان میں اپنے بھائیوں سے پیچھے نہ ہو۔

"رضی بھائی اور ماموں کہتے ہیں ہم نے کون سا نوکری کرنا ہے۔ جو اتنا زیادہ پڑھیں۔ اتنی تعلیم کافی ہے جو حاصل کر لی ہے۔ اب اگر لاہور میں دل لگ جاتا تو پڑھ ہی لیتا۔ لیکن دل ہی نہیں لگا وہاں۔" اس نے پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔

"پتا نہیں تمہارا دل کیوں نہیں لگا وہاں اگر ادھر ابا جان کی طرف رہتے تو شاید وہاں سب کے ساتھ دل لگ جاتا۔ یوں گھر سے دور پہلی بار اکیلے رہے ہو شاید اس لیے وہاں حیدر آباد میں تو اتنے سارے لوگ تھے۔" اختر بانو نے خیال ظاہر کیا۔

وہ خاموش ہی رہا۔ کیا بتاتا کہ کیوں دل نہیں لگا۔ وہ کومل سی لڑکی زرمل شاہ زیب جس کی ہنسی سن کر وہ اسے اپنا اسیر بنانے کے لیے ثمرہ کی ناگواری کے باوجود شادی میں شرکت کے لیے بڑی امی کے میکے چلا آیا تھا اور شادی کی مصروفیت میں ادھر ادھر کام کرتے ہوئے اس نے اسے کوئی خصوصی توجہ نہیں دی تھی۔ جب کہ اس نے ہمیشہ لڑکیوں کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش دیکھی تھی۔ اس کی بے نیازی نے اس کا ارادہ پختہ کیا تھا۔ اسے ہر صورت لاہور آنا ہے۔ اور اسے اسیر کرنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ذرا سی کوشش کرتا تو شادی کے دنوں میں ہی اسے پٹا لیتا لیکن اسے اختر بانو کا لحاظ تھا جن کی شفقت و محبت کو وہ پہلی بار محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ ثمرہ کی وجہ سے وہ ہمیشہ اختر بانو سے دور ہی رہا تھا۔

لیکن اس کی انا اپنے نظر انداز کیے جانے پر اسے اندر ہی اندر اکساتی رہتی تھی کہ وہ اس لڑکی کو اپنا اسیر کر لے۔ جو جب اس کی طرف دیکھتی ہے تو اس کی نظروں میں کچھ خاص نہیں ہوتا۔ وہ اسے ایسے ہی دیکھتی ہے جیسے وہ کوئی عام آدمی ہو جیسے اس میں کچھ خاص نہ ہو۔ لیکن وہ عام نہیں تھا وہ تو بہت خاص تھا اپنے سارے کزنوں اور بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور شاندار پرسنالٹی والا۔ وہ جس کالج میں پڑھتا رہا تھا وہاں کو ایجوکیشن تھی اور لڑکیاں اس کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتی تھیں۔ لیکن یہ زرمل شاہ زیب...... اس نے انجانے میں اس کی انا کو چیلنج کیا تھا۔ لیکن اسے خود پر یقین تھا کہ جب بھی

اس نے اس پر ذرا سی بھی توجہ دی تو وہ اس کی مقناطیسی شخصیت کے سامنے لوہا ہو جائے گی۔ اور تب وہ اس کی ان گھور سیاہ خوش نما آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے انتظار سونپ کر آجائے گا۔

وہ ایک اور دل پر فتح کے جھنڈے گاڑ آئے گا لیکن جب وہ ہر ویک اینڈ پر امان کے ساتھ جھوٹی محبت کا ڈرامہ کر کے اس کے دل کے ساتھ کھلواڑ کر کے چلا آئے تو کیا وہ پھر کبھی زندگی بھر بڑی امی سے نظر ملا سکے گا۔ شاید کبھی نہیں۔ بڑی امی کو اس کی حرکت کا علم نہ بھی ہوا تب بھی نہیں...... وہ جتنی دیر وہاں رہتا، کشمکش میں مبتلا رہتا تھا۔

اسی کشمکش میں اس نے دو تین بار اس کی تعریف بھی کر دی تھی۔ شاید اس کی ہنسی کی یا شاید اس کی آنکھوں کی۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے بتایا تھا کہ اسے برا لگا تھا۔ رضی کہتا تھا کہ لڑکیوں کو جال میں پھنسانے کے لیے جھوٹی سچی تعریف کا دانہ ڈالنا پڑتا ہے۔ پھر جب وہ اس دانے کو چگ لیتی ہیں تو پھر محبت کا دانہ ڈالو اور جب وہ اسے بھی چگ لیں تو سمجھو لڑکی تمہارے جال میں پھنس گئی۔ کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں جو شروع میں یہ دانہ نہیں چگتیں۔ لیکن اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ جلد یا بدیر وہ بھی اس جال میں پھنس جاتی ہیں۔

زمل بھی شاید ایسی ہی لڑکی تھی اسے اس پر محنت کرنی تھی کچھ اور پھر کچھ دیر ضرور لگتی لیکن بہر حال وہ اسے فتح کر لیتا، اسے یقین تھا ابھی تو وہ اس کے دھیان سے دیکھنے پر وہاں سے ہٹ جاتی یا رخ موڑ لیتی تھی اور یہاں سب لوگ کتنے اچھے تھے، کتنے محبت کرنے والے۔ وہ ان کا کچھ نہیں لگتا تھا لیکن وہ بالکل امان کی طرح اسے ٹریٹ کرتے تھے اور امان کے نانا جان کتنی محبت کرتے تھے اس سے گھر کے ایک فرد کی طرح ہی اس پر اعتبار کیا جاتا تھا اور وہ بڑی امی کے خاندان کی ایک لڑکی کے ساتھ کیسے فلرٹ کر سکتا تھا اب جب کہ بڑی امی کے لیے وہ اپنے دل میں ایک احترام اور محبت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔ وہ زمل کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اسے خیال آتا تھا کہ وہ زمل کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی فطرت اسے اکساتی کہ وہ زمل شاہ زیب کو اسیر کر لے اور جب وہ اس کی محبت میں پور پور ڈوب جائے تو اس کو چھوڑ دے۔

وہ اس کے لیے تڑپے، روئے لیکن زمل کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ بڑی امی کی بھتیجی تھی۔ اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا تھا تب اس کشمکش سے تنگ آ کر اس نے لاہور سے واپس آنے فیصلہ کر لیا تھا۔ ورنہ وہ اپنا ماسٹر مکمل کر کے ہی واپس آتا۔ دل تو بہر حال لگ ہی گیا تھا خاص طور پر یونی میں کئی لڑکے لڑکیاں دوست بن گئے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اختر بانو کی نظریں اسی پر تھیں۔

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ چونکا۔

''اور تم نے اپنے بابا جان کو بتایا، وہ ناراض تو نہیں ہوئے تمہارے واپس آنے پر۔'' اختر بانو ابھی تک اس کے لاہور سے پڑھائی چھوڑ کر چلے آنے کے متعلق سوچ رہی تھیں۔

''نہیں تو......'' وہ کھل کر مسکرایا۔ وہ جانتا تھا اسے اپنے پتے کیسے کھیلنے ہیں۔ اس نے ثمرہ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی تھی۔

''جب بھی فون کرتی تھیں، ایک ہی بات اداس ہوں۔ ہر وقت روتی رہتی ہوں تو بس میں آ گیا۔''

''بابا جان نے بس اتنی سی بات ہی کی کہ چلو اب دوبارہ سے پڑھائی شروع کر دی تھی تو پھر یہاں ہی رہ کر اپنا ماسٹر کمپلیٹ کر لو۔ بالکل آپ جیسی باتیں، کافی خیالات ملتے ہیں آپ کے ان سے۔''

وہ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبائے شرارت سے اختر بانو کو دیکھ رہا تھا۔

''اور تمہارے خیالات ہم دونوں سے کتنے ملتے ہیں؟'' اختر بانو کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ففٹی ففٹی......''

اس نے بہت کم اختر بانو کو مسکراتے دیکھا تھا اور اس وقت اپنی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی اختر بانو اسے بہت اچھی لگی تھیں۔

''دراصل میری امی جان کے خیالات مجھ پر زیادہ حاوی ہیں۔ اور وہ میرے واپس آنے سے بہت خوش ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ میں نے بابا سے کیا کہا ہے۔''

لاپروائی سے کندھے اچکاتا ہوا وہ اختر بانو کو اس وقت بالکل سحرش کی طرح لگا۔ بات کرنے کا

انداز بالکل سحرش جیسا ہی تھا۔

''کبھی کبھی تم کوئی بات بالکل سحرش کی طرح کرتے ہو، اسی انداز میں......''

''سحرش کون؟'' اس کی سوالیہ نظریں اختر بانو کی طرف اٹھیں۔

''سحرش ارباب...... میری بھتیجی۔ اس کی اماں اسے منہ پھٹ کہتی ہے لیکن مجھے وہ بہت خالص لگتی ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتی، جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔''

اختر بانو نے بتایا تو اس نے سر ہلایا۔

''اچھا وہ سحرش ارباب، بعض اوقات مزے کی باتیں کرتی ہے، امان کے ساتھ اس کی کافی گپ شپ ہے لیکن مجھے تو پہلی ملاقات میں ہی ہری جھنڈی دکھا دی تھی یہ کہہ کر آپ سے میرا بے تکلفی کا کوئی رشتہ نہیں ہے کیونکہ آپ میری پھپھو کے سوتیلے بیٹے ہیں۔''

''ہاں وہ ایسی ہی ہے۔'' اختر بانو مسکرائیں۔ ''بات کرتے کرتے اکثر ہی پٹڑی سے اتر جاتی ہے۔ ماں کی کوئی بات اچھی نہ لگے تو بڑے مزے سے اس پر بھی تنقید کر دیتی ہے۔ میں تم سے ابا جان کے متعلق پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن پوچھ ہی نہیں سکی کیسے ہیں وہ۔''

ثمرہ کچھ دیر پہلے ہی ماروی کو ساتھ لے کر دوسری حویلی میں گئی تھی کہ تایا جان اور دلاور شاہ آئے ہوئے تھے۔ اس لیے اختر بانو لاؤنج میں اطمینان سے بیٹھی شایان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ورنہ ثمرہ کے سامنے وہ شایان سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں لیکن شایان اب پہلے کی طرح انہیں نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اگر آمنا سامنا ہو جاتا تو ادب سے سلام کرتا حال چال پوچھتا اگر ثمرہ کہیں آس پاس ہوتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ اس لیے اختر بانو بدمزگی سے بچنے کے لیے پوری کوشش کرتی تھیں کہ ثمرہ کے سامنے شایان سے بات نہ ہی کریں۔ اسی لیے آج اس کے لاہور سے آنے کے اتنے دنوں بعد وہ جہاں زیب بیگ کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔

''نانا جان بالکل ٹھیک ہیں۔ بی بی اماں اور آزین وغیرہ بھی ٹھیک ہیں۔ آپ نے ہمیں اپنی بیماری کے متعلق بتانے سے منع کیا تھا تو ہم نے نہیں بتایا کچھ بھی لیکن وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

آپ کی بات کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ آپ ایک چکر کیوں نہیں لگا لیتیں لاہور کا، اب کے امان آئے تو ساتھ ہی چلی جائیں۔"

اس نے مشورہ دیا تو اختر بانو کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

"ابھی تو گئی تھی شادی میں۔"

"اور اس ابھی کو بھی کتنے مہینے گزر چکے۔ امی جان تو اس دوران نہ جانے کتنے چکر لگا چکی ہیں حیدر آباد کے بلکہ اب تو وہ خالہ کی طرف کراچی جانے کا بھی پروگرام بنا رہی ہیں۔" وہ اب بڑے اطمینان سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ساری سستی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

اختر بانو خاموش رہیں وہ جیسے عادی ہو گئی تھیں۔ سالوں بعد میکے جانے کی۔

"امی جان اور ثمینہ چچی، صفورا چچی سے ہی سیکھ لیں کیسے بہانے بنا بنا کر ہر دس پندرہ دن بعد جا رہی ہوتی ہیں۔ ویسے اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو میں کوئی بہانا بنا دیتا ہوں۔ قسم سے ایسا تگڑا بہانا ہو گا کہ بابا نے فوراً ہی سیٹ بک کروا دینی ہے لاہور کی۔" وہ ہنسا تو اختر بانو کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"اللہ کرے تم ہمیشہ یوں ہی ہنستے رہا۔ کوئی دکھ تمہارے قریب سے بھی نہ گزرے۔"

"تھینک یو بڑی امی......!" اسے یوں ان کا بے اختیار دعا دینا اچھا لگا تھا۔

"تو پھر کب جانا ہے لاہور جب دل چاہے مجھے بتا دیجیے گا۔ بس پھر میں یوں منٹوں میں بابا جان سے کہہ کر آپ کی سیٹ بک کرواتا ہوں۔"

"پتا نہیں کب...... شاید آزین اور زل کی شادی ہو جائے جلد ہی تو تب تو جانا ہی ہے نا۔ زل بھی پڑھ چکی اور آزین بھی اب جاب کر رہا ہے۔ ویسے تو پہلے مرتضیٰ کی شادی کا پروگرام تھا سب کا لیکن اب اس نے منع کر دیا۔ دیکھو ابا جان سے پوچھتی ہوں کیا پروگرام ہے ان کا۔" وہ ہولے ہولے کچھ سوچتی ہوئی بول رہی تھیں۔

"مرتضیٰ کو شاید ابھی تک کوئی لڑکی پسند نہیں آئی ورنہ آپ کی فیملی میں بھی کئی لڑکیاں ہیں۔"

وہ ان کے خاندان کے اندر کے معاملات کو نہیں جانتا تھا لیکن اس نے اندازہ لگایا تھا کہ مرتضیٰ

زمل کو پسند کرتا ہے۔ کئی بار اس نے مرتضیٰ ارباب کو بہت گہری نظروں سے زمل کو دیکھتے پایا تھا۔ اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا مرتضیٰ کی شادی زمل سے ہونی طے پائی تھی، اسی لیے اس نے اس طرح کی بات کی تھی، وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ زمل کا نکاح آزین سے ہو چکا ہے۔

''ہاں شاید ایسی ہی کوئی بات ہے۔'' اختر بانو افسردہ ہو گئی تھیں۔

''ورنہ رخسانہ بھابھی اور مونا بھابھی نے تو جب مرتضیٰ اور مہرین چھوٹے سے تھے، تب سے دونوں کی شادی کا سوچ رکھا تھا۔''

''اوہ!'' اس نے ہونٹ سکیڑے۔

''مہرین...... وہ جو ڈاکٹر بن رہی ہے یا بن چکی ہے۔''

اختر بانو نے سر ہلایا۔

''ابا جان کو بھی بہت دکھ ہے مرتضیٰ کے انکار سے...... اتنی اچھی ہے مہرو۔''

''تو گولی ماریں مرتضیٰ کو، آپ ریحان بھائی سے مہرین کی شادی کر دیں۔ یہ بھی ڈاکٹر، وہ بھی ڈاکٹر...... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

اس نے مفت مشورہ دیا۔ ویسے بھی مرتضیٰ اسے کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔ خود پسند اور اکڑو سا لگا تھا اسے۔

''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' اختر بانو نے افسردگی سے سوچا۔

ان کی شادی ثوبان شاہ سے ہونے میں سارا ہاتھ سلطان شاہ کا تھا ورنہ یہ لوگ غیر سیدوں میں کہاں شادیاں کرتے تھے۔

''میری بات اگر بری لگی ہو تو سوری بڑی امی۔''

شایان کو لگا تھا کہ اختر بانو کو اس کی بات بری لگی ہے۔

''ارے نہیں بالکل بری نہیں لگی۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں ہے بیٹا۔ اور یوں بھی پہلے تو ابھی نومی کی شادی کرنی ہے۔''

ابھی تین ماہ پہلے ہی نومی کا رشتہ اپنی پھپھو سلطانہ کے گھر ہو گیا تھا۔ سب ہی اس رشتے سے خوش تھے۔ نومی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنی پھپھو کا لاڈلا تھا۔

''ارے کب ہو رہی ہے نومی بھائی کی شادی؟'' وہ خوش ہوا تھا۔ ''اتنی بوریت ہو رہی ہے گھر میں رونق لگے گی، خوب مزا آئے گا۔''

''ریحان باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ امتحان دینے اور مزید پڑھنے کے لیے تو اس کے جانے سے پہلے ہی نعمان کی شادی کا ارادہ ہے۔ تمہارے بابا جان آ جائیں تو پھر تمہاری پھپھو سے بات کریں گے۔''

ثوبان شاہ ان دنوں کسی کام کے سلسلے میں دبئی گئے ہوئے تھے۔

تب ہی ثمرہ نے لاؤنج میں قدم رکھا اور اختر بانو کو شایان سے باتیں کرتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

''جادوگر عورت ہولے ہولے اپنی میٹھی باتوں سے میرے بیٹے کو مجھ سے دور کر دے گی۔''

''ارے امی جان! آپ اتنی جلدی آ گئیں۔'' شایان نے اختر بانو سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا نانا جان اور دلاور ماموں نہیں آئے؟''

''آئے ہوئے ہیں لیکن انہیں عبدالرزاق سومرو سے ملنے جانا تھا اس وقت۔'' ثمرہ نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا۔

''لیکن ابھی کچھ دن وہ یہاں حویلی میں ہی رہیں گے۔ کل صبح باقی سب بھی آ جائیں گے تمہاری نانو، مامیاں، رضی، ہادی وغیرہ۔''

''ارے واہ! پھر تو مزا آئے گا اتنا بور ہو رہا ہوں میں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں ذرا شاور لے لوں پھر رضی بھائی کو فون کر کے ان کا پروگرام پوچھتا ہوں۔ اور بڑی امی! نومی بھائی کی شادی کو پھر ڈسکس کرتے ہیں کسی وقت۔''

اس نے اختر بانو کی طرف دیکھ کر ہلکا سا سر خم کیا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ثمرہ نے ایک تیز چبھتی ہوئی نظر اختر بانو پر ڈالی اور پھر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''یہ اختر بانو تو میرے بچے پر حاوی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ اور یہ شایان کیسا خوش سا بیٹھا مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ نعمان کی شادی کا پروگرام ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ واہ بھئی واہ! دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔''

اس نے چادر اتار کر گول مول کر کے بیڈ پر پھینکی۔

''راتوں کو میں اس کے لیے جاگی، پالا پوسا میں نے...... تھکی میں اس کے لیے، ایسا ضدی تھا کہ رونے پر آتا تو چپ ہی نہ کرتا تھا۔ ایک ٹانگ پر کھڑی رہتی اور پلے پلائے بیٹے پر یہ اختر بانو قبضہ جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی اس طرح بیٹھ کر ہنس ہنس کر باتیں نہیں کیں۔''

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے شایان کے چہرے پر بکھری خوشی اور مسرت کو محسوس کر لیا تھا اور اختر بانو کے چہرے پر پھیلا سکون اور آنکھوں میں اطمینان دیکھ کر وہ جل کر راکھ ہوئی تھی۔ شایان کا اختر بانو سے لگاؤ تو وہ پھر بھی کسی حد تک برداشت کر رہی تھی لیکن ثوبان شاہ کا اس کی طرف بڑھتا جھکاؤ وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ جب سے اختر بانو بیمار ہوئی، ثوبان شاہ اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ باہر سے آتے تو پہلے اس کے بیڈ روم میں جا کر اس کا احوال پوچھتے۔ جن دنوں ان کا قیام حویلی میں ہوتا تو دونوں کو برابر کا وقت دیتے تھے۔ انہوں نے ثمرہ سے کہا تھا۔

''گزرے سالوں میں اختر بانو کے ساتھ میں نے بہت ناانصافی کی ہے۔ جو وقت گزر گیا وہ واپس نہیں آ سکتا۔ میں تلافی نہیں کر سکتا اس ناانصافی کی جو ہو چکی۔ روز محشر ضرور میری پرسش ہو گی لیکن اب مزید ناانصافی نہیں کروں گا۔ اور چاہتا ہوں تم اس کو خوش دلی سے قبول کرو اللہ مجھے معاف کرے۔''

اس نے ثوبان شاہ سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ جیسے ہر لمحہ انگاروں پر لوٹتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اختر بانو کو گولی سے اڑا دے۔ وہ اول روز سے ہی اختر بانو سے نفرت کرتی تھی کہ اس نے بچپن سے ہی ثوبان شاہ کی ہمراہی کا خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ وہ عمر میں اس سے چھوٹا تھا لیکن چچا زاد تھا اور خاندان میں شادیاں ہوتیں تو دو چار سال کی چھوٹائی بڑائی کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے

بھی یقین تھا کہ اس کے اور ثوبان شاہ کے رشتے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

بچپن کے بہت سارے دن انہوں نے ایک ہی حویلی میں ایک ساتھ کھیلتے کودتے گزارے تھے۔

مہران اور زمان شاہ عمر میں اس سے کافی چھوٹے تھے اور بڑے چچا کے بیٹے اکھڑ مزاج اور مغرور...... ثوبان شاہ دھیمے مزاج کا اور نرم دل تھا، سو اس نے ثوبان شاہ کو اپنے من مندر کا دیوتا بنالیا تھا۔ اور اس نے اپنے دل کی بات اپنی اماں جان کو بھی بتادی تھی لیکن پھر کیا ہوا کہ سلطان شاہ نے ثوبان شاہ کا رشتہ اپنے دوست کی بیٹی سے کردیا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ اور بڑے چچا اپنی اپنی الگ حویلیوں میں شفٹ ہوچکے تھے اور ثوبان شاہ اختر بانو کو بیاہ کرلے آیا تھا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھی۔ خانقاہوں اور درگاہوں پر جاکر منتیں مانتی، دیے جلاتی، دعائیں کرتی کہ اختر بانو کو موت آجائے۔

اختر بانو تو زندہ رہی لیکن سلطان شاہ وفات پاگئے اور اس کے لیے راستے آسان ہوگئے۔

وہ ثوبان شاہ کی دوسری بیوی بن کر حویلی میں آگئی تھی اور پھر اس نے ثوبان شاہ کو اختر بانو سے دور رکھنے کے لیے ہر حربہ، ہر ادا آزمائی۔ تعویز گنڈوں سے بھی کام لیا اور ثوبان شاہ کو اختر بانو سے دور کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ مہینوں اختر بانو کے روم میں نہ جاتے تھے لیکن اب ایک بار پھر وہ اس کی طرف ملتفت ہوگئے تھے بلکہ انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ ان سے ناانصافی ہوئی ہے۔ اب وہ ایسا کیا کرے کہ ثوبان شاہ ایک بار پھر اختر بانو سے دور ہوجائے۔ اس نے کمرے میں بے بسی سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے سوچا۔

وہ بی بی حاجن جن سے وہ تعویز لیا کرتی تھی، ثوبان شاہ کے لیے...... وہ بھی اب اس دنیا میں نہ تھی۔ اب بی بی حاجن کے دیے گئے تعویزوں کا اثر تھا یا اس کی اپنی مکاریاں اور ہوشیاریاں تھیں کہ اتنے سالوں تک اس نے ثوبان شاہ سے اپنی ہر بات منوائی تھی لیکن اب......

اس نے مٹھیاں بھینچیں۔

''اس کا ایک ہی حل ہے کہ یہ اختر بانو کم بخت مرجائے۔ دل کے دو والو بند ہیں پھر بھی ہٹی کٹی

چاق و چو بند ہے۔ جیسے ابھی پچاس سال اور جیے گی۔"

"تو......تو......اسے مارا بھی تو جا سکتا ہے نا۔" شیطان نے کان میں سرگوشی کی تو وہ ٹھٹکی۔ ہاتھ میں لرزش ہوئی۔

"یہ......یہ تو قتل ہو گا نا۔"

"تو پھر اب ساری زندگی انتظار کرتی رہو اس کی موت کا اور وہ تمہارے بیٹے اور شوہر پر قبضہ جما لے گی ایک دن کیا خبر کسی روز دیکھنے کو بھی ترس جاؤ، بیٹا تو اس کا ہی ہے، لاکھ تم اپنا اپنا کہو......"

"اس نے صرف جنم دیا ہے، پالا میں نے ہے۔" اس کے ماتھے کی رگیں پھڑکنے لگیں۔

"تو کیسے......؟ کیا کھانے میں زہر؟"

اب وہ سوچ رہی تھی۔ شیطان مسکرایا، اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"اس طرح تو پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ پولیس والے بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے سوتن پر ہی شک کریں گے۔"

"بیمار ہے۔ دل کی مریض، کسی روز مر جائے گی خود ہی۔ اپنے سر قتل کیوں لیتی ہو؟" دل نے کمزور سا احتجاج کیا۔ "بے ضرر سی تو ہے۔ ثوبان شاہ تمہاری حق تلفی تو نہیں کرتا، نہ کرے گا۔ اس کے تایا کی بیٹی بھی تو ہو نا۔ خود بھی جیو، اسے بھی جینے دو۔"

لیکن اس نے دل کی آواز نہیں سنی۔

"وہ ایک چانن بابا ہوتا تھا۔ کالا جادو کرتا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کہاں چلا گیا ورنہ اس سے ہی کالا جادو کروا کر اس اختر بانو کا پتا صاف کروا لیتی۔ شاید بھارت چلا گیا۔ وہاں سے ہی تو آیا تھا۔" ماروی نے ایک بار اسے بتایا تھا۔

"پھر کیا کروں؟" وہ بیڈ پر بیٹھ گئی اور اضطراب سے ٹانگیں ہلانے لگی۔

"اختر بانو کو مرنا ہے ہر صورت لیکن ایسی موت جو طبعی محسوس ہو......کرنٹ......اس کے کمرے کی تار ننگی کر دوں۔" وہ منصوبے بناتی رہی اور ریجیکٹ کرتی رہی۔ اسے ہر پلان میں جھول محسوس ہوتا

تھا۔ بالآخر ایک خیال سے وہ چونکی۔ دو تین بار غور کیا اور پھر مطمئن ہو کر انٹر کام اٹھایا۔ ملازمین کے کوارٹروں میں انٹر کام تھا تاکہ بوقت ضرورت انہیں بلایا جاسکے۔ اس نے میکے سے اپنے ساتھ آنے والی اپنی ذاتی ملازمہ کو بلایا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ماروی اس کے بیڈروم میں نیچے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔

''وہ تم نے بتایا تھا تمہارے باپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیسا ہے وہ اب؟'' لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

''کیسا ہونا ہے جی...... بیمار ہی رہتا ہے۔ ایک بار سائیں بیدار بخت کے گوٹھ میں جا کر وہاں کے اسپتال میں دکھایا تھا۔ دوائی لے کر آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، دوائی ختم ہو جائے تو دوبارہ آ جانا، کچھ ٹیسٹ بھی ہوں گے لیکن پھر بڑے شاہ جی نے منع کر دیا کہ ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے، کراچی لے جاؤ لیکن اتنے پیسے نہیں ہیں ادا کے پاس، اوپر سے چھوٹی کی شادی بھی سر پر ہے۔''

ماروی نے ہمدرد جان کر ساری بات تفصیل سے بتا دی۔

''تم فکر نہ کرو ماروی...... میں پیسے دوں گی...... اتنے کہ تم اپنے ابا کا کراچی جا کر علاج بھی کروا لینا اور چھوٹی کی شادی بھی ہو جائے گی۔ لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ کام ہو گیا تو تم مجھ سے رقم لے کر اپنے بھائی کو دے دینا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک پراسراری چمک تھی۔

''لیکن مجھے کرنا کیا ہے بی بی جی!'' ماروی اندر سے ڈر گئی تھی کہ آخر ایسا کون سا کام ہے۔ جس کے لیے ثمرہ بی بی مجھے اتنے پیسے دیں گی۔ وہ تو مالکن ہیں بغیر پیسوں کے بھی حکم دے سکتی ہیں۔

''کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ بس تھوڑے سے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ کر لو گی نا؟'' ثمرہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''جی بی بی جی، کہیں...... کیا کرنا ہے؟'' ماروی اب سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ثمرہ نے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا اور اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ماروی کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ غیر ارادی طور پر نفی میں سر ہلانے لگی۔

''تم یہ کر لو گی ماروی! بس چند منٹ لگیں گے، تم تو بہت بہادر ہو۔ ایک بار تم نے کتنا بڑا سانپ

مارا تھا، یاد ہے نا تم نے خود بتایا تھا تمہارے گھر میں گھس آیا تھا۔"

ماروی کے بازو پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ ماروی کو لگ رہا تھا جیسے ثمرہ کی انگلیاں اس کے بازو کے گوشت میں پیوست ہو گئی ہوں۔

"لیکن وہ سانپ تھا بی بی! انسان اور سانپ بھلا ایک برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔" اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔

"نہیں بی بی جی! میں بھلا ایک جیتے جاگتے انسان کو کیسے مار سکتی ہوں؟"

"بہت آسانی کے ساتھ ماروی......! وہ دن کے وقت دوائی کھا کر سو جاتی ہے۔ شاید دوائی میں نیند ہوتی ہے۔ نہ امان یہاں ہے نہ ثوبان شاہ، اپنے کمرے میں اکیلی سو رہی ہوتی ہے۔" تم نے بس اتنا کرنا ہے کہ احتیاط سے اندر جا کر اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اس وقت تک دبائے رکھنا ہے جب تک اس کی سانس کی ڈور ٹوٹ نہ جائے۔ اس کا دل کمزور ہے۔ سانس کی بھی تکلیف ہے۔ بس چند منٹ لگیں گے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ سب سمجھیں گے دل بند ہو گیا۔"

وہ تھوڑا سا جھکی، جیسے اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔ ماروی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"میں یہ نہیں کر سکتی مجھے معاف کر دیں بی بی جی!"

"اور یہ تم ہی کرو گی ماروی......!" اب کے ثمرہ بولی نہیں پھنکاری تھی جیسے......

"تمہیں اپنی پھپھو یاد ہے نا، جسے کاری کیا گیا تھا۔"

ماروی نے سر ہلایا۔

"وہ بے قصور تھی۔ وہ تو چھوٹی بی بی......" بات کرتے کرتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"تم بھی بے قصور ہی ہو گی ماروی!"

ثمرہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے بازو سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ماروی کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے تھے۔

''تمہیں کچھ دن صرف جائزہ لینا ہے کہ وہ کتنے بجے اپنے کمرے میں جاتی ہے۔ دوا کھانے کے بعد کتنی دیر گہری نیند سو جاتی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر احتیاط سے کام کرنا ہے۔ بلکہ ہاتھ پاؤں دبانے کے بہانے اس کے کمرے میں ہی چلی جایا کرو۔ آج کل وہ ویسے بھی جسم میں درد کی شکایت کرتی رہتی ہے اور کبھی کبھی سنہری کو بلا لیتی ہے۔ دبوانے کے لیے...... تمہیں یہ کام اس وقت کرنا ہے جب گھر میں شانی بھی نہ ہو اور میں بھی نہ ہوں۔ اگلے ڈیڑھ دو ہفتے ابا جان وغیرہ ادھر ہی ہیں۔ میں سویرے ہی ادھر چلی جایا کروں گی۔ یہ کام تمہیں میری عدم موجودگی میں کرنا ہے، یاد رکھنا ان ڈیڑھ دو ہفتوں میں......''

ثمرہ کو یقین تھا کہ اب ماروی انکار نہیں کر سکے گی۔

''اب جاؤ اور ہاں تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو انگارے رکھوا دوں گی زبان پر بلکہ بابا جان کے ڈیرے پر جو شکاری کتے ہیں نا، ان کے آگے زندہ پھینکوا دوں گی بوٹی بوٹی کر دیں گے تمہاری۔''

وہ اٹھی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی۔ ثمرہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے گردن اکڑائے بیٹھی تھی۔ جب خوشبو میں بسا فریش اور تازہ کی ہوئی شیو کے ساتھ شایان کمرے میں داخل ہوا۔

''ماشاء اللہ! نظر بد سے بچائے کہاں جا رہے ہو؟''

دل ہی دل میں کچھ پڑھ کر ثمرہ نے پھونکا۔

''نانا جان کے ڈیرے کی طرف جا رہا ہوں۔ رضی بھائی سے بات ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ باقی لوگ تو کل آئیں گے، کھانے پر میرا انتظار نہ کیجیے گا۔ دیر سے آؤں گا اور ہاں یہ ماروی کو کیا ہوا ہے، آپ نے کچھ کہا ہے؟''

اس نے ادھر آتے ہوئے ماروی کو ثمرہ کے کمرے سے روتے ہوئے باہر آتے دیکھا تھا۔

''لو بھلا میں نے کیا کہنا تھا۔'' ثمرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''رو رہی تھی اس لیے پوچھا ہے۔''

اسے یقین تھا ضرور ثمرہ نے ہی اسے برا بھلا کہا ہوگا۔

''اوہ ہاں، وہ اس کا باپ بیمار ہے نا اس لیے رو رہی تھی۔'' ثمرہ کو بروقت سوجھا تھا۔

''تو اسے کچھ دنوں کے لیے اس کے گھر بھجوادیں۔ یہاں اور کتنی ملازمائیں ہیں۔ کسی اور سے اپنا کام کروالیا کریں۔'' وہ اپنے کف کے بٹن بند کر رہا تھا۔

''وہاں میں نے اماں کے نانا جان کے گھر دیکھا، وہ لوگ اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔اور عزت کرتے ہیں۔ مجھے تو کافی دنوں تک پتا ہی نہیں چلا تھا کہ بی بی اماں اور شینخو بابا ملازم ہیں۔''

''نہ جانے یہ کب تک ان کی تعریفوں کے راگ الاپتا رہے گا۔ یہ کانٹا اب نکالنا ہی ہے۔ جب تک رہے گا، تکلیف دیتا رہے گا۔''

ثمرہ کا ارادہ اور پختہ ہوا۔

''بس بہت ہوگیا۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔''ماروی کو یہ کام کرنا ہی ہوگا، ہر قیمت پر......

ابھی یک دم سن کر شاک میں آگئی، جب سکون سے بیٹھ کر غور کرے گی تو تیار ہو جائے گی، یہ کام کرنے کے لیے جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں ذلت اور بے عزتی کی موت اور ماروی بے وقوف ہرگز نہیں ہے۔'' اسے یقین تھا۔

''اللہ حافظ امی جان!'' شایان خدا حافظ کہنے ہی آیا تھا۔

''اللہ حافظ!'' وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔

''ڈنر تو گھر پر ہی کرو گے نا؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر چلا گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی باہر آئی۔ اس کا ارادہ ماروی کی طرف جانے کا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کہیں سوہنی سے تو کچھ نہیں کہہ دیا اس نے۔ گو جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی زبان بند ہی رکھے گی۔

وہ لاؤنج سے نکل کر برآمدے اور پھر صحن میں آئی۔ اندرون صحن میں کام سے فارغ ہو کر نوراں اور منیرا بیٹھی ہوئی تھیں۔ منیرا کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''ایک تو یہ ان روتی صورتوں کے دکھڑے ہی ختم نہیں ہوتے۔'' وہ وہاں سے ہی واپس پلٹ

گئی۔ ”ضرور کوئی رونا ڈالے گی، کوئی بیمار ہو گیا ہو گا یا اور کوئی بکھیڑا......“

اور اس وقت وہ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ذہن میں ہزاروں طرح کے خیالات آرہے تھے۔ دور سے چراغ سائیں کی آواز آرہی تھی۔ وہ باڑے سے دودھ کی بالٹی لے کر آرہا تھا۔

”اور اب اس منحوس کی آواز بھی سنو۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی تیز تیز چلتی ہوئی صحن سے نکل کر برآمدے سے ہوتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

زیب النساء نے عصر کی نماز پڑھ کر جانماز تہ کر کے چوکی پر رکھی اور تکیے کے پاس پڑی تسبیح اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔ مارچ کا آخری ہفتہ تھا۔ صحن میں مختلف پھولوں کی ملی جلی مہک تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ دھوپ صحن سے رخصت ہو چکی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن میں آئی اور تسبیح کے دانے گراتے ہوئے صحن کے درمیان میں کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

یہ ایک ایسا ہی گھر تھا جیسے عام طور پر دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ صحن کافی بڑا لیکن کچا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ دیوار کے ساتھ کیاریاں تھیں جن میں موسمی سبزیاں لگی ہوئی تھیں جن کی بیلوں نے دیوار کو ڈھک رکھا تھا۔ دو تین کیاریوں میں اس نے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ ایک کونے میں چھپر سا بنا ہوا تھا جس کے اندر مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف خشک لکڑیوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ چھپر کے اندر ہی ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا جس پر مٹی کی ہانڈیاں اور ایسی ہی دوسری چیزیں تھیں۔

چھپر کے باہر دھریک کے دو درخت ساتھ ساتھ تھے۔ برآمدے کا فرش پکی اینٹوں کا تھا۔ برآمدے میں دائیں طرف دیوار میں ریک بنے ہوئے تھے۔ جس میں نمک مرچ مسالوں والے ڈبے رکھے تھے۔ ساتھ ہی چھوٹا سا نعمت خانہ تھا۔ فرش پر مٹی کے تیل کا ایک گول چولہا پڑا تھا۔ دو تین رنگین پایوں والی پیڑھیاں تھیں۔

اس گھر میں الگ سے کوئی باورچی خانہ نہیں تھا۔ برآمدے کا ایک حصہ باورچی خانے کے طور پر

استعمال ہوتا تھا۔ برآمدے میں دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے اور دونوں کمروں کی درمیانی دیوار کے ساتھ لکڑی کا تخت پڑا تھا جس پر دری بچھی ہوئی تھی اور حامد کا بستہ رکھا ہوا تھا۔ حامد اسی تخت پر بیٹھ کر اپنا اسکول کا کام کرتا تھا۔ یہ لکڑی کا تخت یا چوکی عام تخت کے مقابلے میں لمبائی اور چوڑائی میں کم تھی۔

وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑی لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ پھر دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانکا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ حامد ظہر کے بعد مسجد میں قرآن پڑھنے جاتا تھا پھر عصر کی نماز کے بعد ہی آتا تھا۔ وہ یوں ہی کنڈی کھلی چھوڑ کر واپس برآمدے میں آئی اور تخت پر بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگی۔

یہ ماسی جنتاں کا گھر تھا۔ دونوں کمروں میں سے ایک کمرہ ان کے زیر استعمال تھا جب کہ دوسرے کمرے میں بستروں والی جستی پیٹی اور دوسرا سامان تھا۔

تسبیح پڑھتے پڑھتے اسے اپنا گھر یاد آ گیا۔ وہ گھر جو ابا نے بہت شوق سے بنوایا تھا۔ جس کا فرش سرخ سیمنٹ کا تھا اور چاروں طرف سبز حاشیہ تھا اور جسے زہرا صبح و شام پوچھا لگا کر چمکاتی تھی۔ وہ کمرے ایک بیٹھک، باورچی خانہ بھی بڑا اور کشادہ تھا۔ سردیوں میں زہرا انگیٹھی دہکا کر رکھ دیتی تھی۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ گدا بچھا تھا جس پر کالا چار خانے والا کھیس بچھا ہوتا تھا۔ سردیوں میں وہ وہاں ہی بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ کھانا بھی وہیں کھایا جاتا تھا۔

ماسٹر عبدالعزیز اسکول سے آتے تو زہرا توا چولہے پر رکھتیں اور گرم گرم روٹیاں اتار کر چنگیر میں رکھتی جاتی تھیں۔ اگر کبھی لکڑیاں گیلی ہوتیں تو ان کا دھواں آنکھوں میں کڑواہٹ پیدا کر دیتا تھا تب ماسٹر عبدالعزیز زہرا کے کہے بغیر ہی شہر سے تیل والا ڈبل چولہا لے آئے تھے اور لکڑیاں تو صرف اب صحن والے چولہے میں ہی جلائی جاتی تھیں۔ پانی گرم کرنے یا کبھی کبھار روٹی پکانے کے لیے۔

اس کی آنکھیں جلنے لگیں جیسے صحن میں کڑوا دھواں ہو، وہ بے چین سی ہو کر اٹھی۔

حامد نے آج دیر کر دی تھی۔ شاید فضل کے ساتھ چلا گیا ہوگا اس کے گھر حالانکہ ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر بیٹھ گئی۔ تسبیح اٹھائی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کیا پڑھنا ہے۔ کچھ دیر مضطرب سی ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ عجیب سی

بے چینی تھی اس کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ کبھی کبھی بہت بے چین ہو جاتی، ہفتوں مضطرب رہتی۔ راتوں کو ٹھیک سے نیند نہ آتی اور کبھی سب کچھ اللہ کی رضا جان کر پرسکون ہو جاتی۔ دل کو سمجھاتی کہ میرے مولا نے میرا نصیب ایسے ہی لکھا تھا۔

یہاں کسی طرح کا ڈر یا خوف نہیں تھا۔ ماسٹر عبدالعزیز نے کہا تھا کہ میرے بعد ماسی جنتاں کے پاس چلی جانا۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس گھر میں اس نے اپنی زندگی کے اب تک کے سارے سال گزارے تھے یہاں اس گھر میں اماں ابا کی خوشبو تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ یہیں کہیں ہی ہوں۔ ماسٹر عبدالعزیز کے یوں اچانک چلے جانے کے بعد وہ کئی دن تک نہیں سنبھلی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ابا اسے یوں اس طرح چھوڑ کر چلے جائیں گے حالانکہ پچھلے دو سال سے وہ اس سے یہ ہی کہہ رہے تھے کہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔

انہیں لگتا تھا جیسے وہ زیادہ دیر جی نہ پائیں گے۔ لیکن اب جب کہ وہ اپنی صحت کی طرف سے کچھ مطمئن سے تھے اور اکثر کہنے لگے تھے کہ حامد اب بڑا ہو گیا ہے۔ چند ماہ تک اور بڑا ہو جائے گا میں اسے سنبھال لوں گا۔ اور تمہیں جب داخلے کھلیں گے تو کالج میں داخل کروا دوں گا۔ ہوسٹل میں رہنا۔ دن کے وقت حامد کو نیاز کی بیوی سنبھال لے گی میں نے بات کر لی ہے اس سے اور اسکول سے آ کر میں۔ بس تم نے پڑھنا ہے، یاد ہے نا استانی جی کیا کہتی تھیں کہ پڑھائی بہت ضروری ہے۔ پچھلے سال ہی تو ان کے اصرار پر اس نے ایف اے کا امتحان دیا تھا اور تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی پاس ہو گئی تھی۔

حامد بڑا ہو کر کیا سوچے گا کہ اس کا باپ اتنا پڑھا لکھا تھا اور ماں صرف بارہ جماعتیں پاس۔ تم ایم اے کرنا۔ میں جب ریٹائر ہو جاؤں گا تو شہر چلے جائیں گے اپنے حامد کو اچھے انگریزی اسکول میں داخل کروائیں گے۔

وہ جو موت کی باتیں کرتے تھے، اب زندگی کی باتیں کرنے لگے تھے۔ مستقبل کے پروگرام بنانے لگے تھے کہ موت نے چپکے سے آ کر انہیں دبوچ لیا تھا۔ کئی دن تک گاؤں کی عورتیں آتی رہیں۔ سپارہ پڑھتی تھیں، تسلی دیتی تھیں اور چلی جاتی تھیں۔ بس ایک ماسی نور بھری تھی جو دن بھر اور رات کو بھی

اس کے پاس ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھی۔

"ماسی تم چلی جاؤ اپنے گھر، کب تک ساتھ دو گی۔"

اور وہ کہتی تھی۔

"لو گھر میں میرے کون سے بچے رو رہے ہیں۔ وہاں بھی پڑ کر سو رہنا ہے۔ یہاں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی تو تسلی رہے گی کہ اکیلی نہیں ہو۔ زہرا مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ہی عزیز تھی۔ بہت محبت تھی ہم میں...... بس ماسٹر جی خوامخواہ ہی ناراض ہو گئے تھے۔ جس گھر میں بیری ہوتی ہے اس گھر میں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ میں نے بھی تو بس اپنے اسلم کا رشتہ ہی مانگا تھا نا۔ چلو اس کی بھی شادی ہو گئی۔ تمہاری بھی ہو گئی تھی۔"

اور وہ سوچتی ماسی نور بھری صحیح تو کہتی تھی۔ رشتہ ہی تو مانگا تھا اس نے۔ ہر ماں کی طرح اس کو بھی اپنا بیٹا ساری دنیا سے اچھا لگتا ہو گا اور وہ اس کے لیے خوب صورت اور اچھی لڑکی لانا چاہتی ہو گی۔ اب استانی جی نہیں تھیں۔ نہ فاطمہ آپا......

گاؤں کی عورتیں اس سے ہمدردی رکھتی تھیں۔ نیاز چچا دو تین دن بعد ضرور پوچھنے آتا کہ اسے کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔ بس نور بھری تھی جو سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ کھانا پکا دیتی، اس کا کھانے کو جی نہ چاہتا تو نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالتی۔ حامد کو نہلا دھلا دیتی۔

وہ جو اندر کہیں نور بھری کے حوالے سے اس کے دل میں کہیں ہلکا سا خوف تھا وہ خود ہی ختم ہو گیا تھا۔ یوں بھی اسلم تو اپنی بیوی کے ساتھ راجن پور میں رہتا تھا۔ ماسی نور بھری نے ہی اسے بتایا تھا کہ اس کی ایک بیٹی اور بیٹا بھی ہے اور اس کی بہو ایسی ہوشیار چالاک کہ اسے گاؤں میرے پاس آنے ہی نہیں دیتی۔ اور سارا مسئلہ ہی تو اسلم کا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

اسے نور بھری سے زیادہ کوئی اپنا ہمدرد نظر نہ آتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے گھر جاتی تو وہ گھبرا جاتی تھی۔ اب اس کے لیے سب کچھ ماسی نور بھری ہی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز کی وفات کے دو ماہ بعد وہ سنبھلی تھی۔ چاچا نیاز اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کے بقایا جات دلوانے میں بہت مدد

کی تھی۔ کچھ رہتے تھے، کچھ مل گئے تھے سو گزارا ہو رہا تھا۔

ماسٹر عبدالعزیز نے تھوڑی بہت بچت بھی کر رکھی تھی۔ حق مہر کی رقم بھی اس کے پاس تھی لیکن ساری زندگی یہ رقم اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اسے خود بھی کچھ کرنا چاہیے۔ ابا اسی لیے چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے۔ لیکن اب وہ صرف بارہ جماعت پاس تھی، کسی اسکول میں بھی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔

چاچا نیاز نے مشورہ دیا تھا کہ وہ سی ٹی کر لے۔ سی ٹی یہاں گاؤں میں تو نہیں ہوتی تھی کہ وہ کر لیتی۔ حامد ابھی چھوٹا تھا اور گورنمنٹ کے پرائمری اسکول میں بھی نوکری کے لیے ایسی ہی ڈگری کی ضرورت تھی۔ اور اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ سی ٹی کہاں سے ہوگی اور وہاں ایڈمیشن کب ہوں گے۔

خیر اس کے متعلق وہ چاچا نیاز سے کہے گی وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے پتا کرلیں گے لیکن حامد کتنا چھوٹا ہے۔ وہ اسے بھلا کہاں چھوڑ کے جائے گی۔

تب اس نے ماسی نور بھری سے کہا کہ استانی جی کے پاس لڑکیاں پڑھنے آتی تھیں حساب انگلش اور سپارہ پڑھنے والی لڑکیوں کے علاوہ بھی یہ لڑکیاں ایک طرح سے ٹیوشن پڑھتی تھیں۔ کچھ فیس بھی دیتی تھیں تو اگر وہ سب گھروں میں جا کر یہ کہہ آئے کہ کسی نے اگر پڑھنا ہو تو میں پڑھا دوں گی۔ کچھ آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا۔ پھر جب حامد کچھ اور بڑا ہو جائے گا تو وہ سوچے گی کچھ اور، اس دوران چاچا نیاز سے کتابیں منگوا کر پرائیوٹ بی اے کر لے گی۔

"تم تو ماسی زمین داروں کے گھروں میں جاتی رہتی ہو نا تو کوئی اور کام سلائی کڑھائی کا جو بھی گھر میں بیٹھ کر ہو سکے پتا کر لینا کرلوں گی۔"

"کیوں نہیں ضرور......" ماسی نور بھری نے یقین دلایا تھا لیکن دس پندرہ دن گزرنے کے بعد بھی ماسی نور بھری نے کوئی کام لا کر نہ دیا تھا، نہ ہی کوئی لڑکی اس کے پاس پڑھنے آئی تھی۔

تب اسے چوہدری عبدالمالک کا خیال آیا تھا۔ ماسٹر عبدالعزیز کی وفات کے بعد وہ ایک بار آئے تھے اور انہوں نے تعزیت کے بعد اسے کہا تھا کہ وہ ان کی بیٹی جیسی ہے۔ اسے جب بھی کوئی کام

ہو یا کسی مدد کی ضرورت ہو تو انہیں بتائے۔ اس نے سوچا تھا وہ ضرور اسے اچھا مشورہ دیں گے۔ ابا کا کتنا خیال رکھا تھا انہوں نے اسپتال لے کر جانا، اس کا نکاح شادی سب میں ابا کا ساتھ دیا تھا۔

''لو، تمہیں نہیں پتا وہ تو ماسٹر جی کی وفات کے چھ سات دن بعد ہی باہر ملک چلے گئے تھے۔ ادھر ان کا جو بیٹا پڑھنے گیا تھا اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، اسپتال میں پڑا تھا بے ہوش...... ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ادھر جو بیٹے ہیں لفنگے آوارہ...... سارا دن تو ادھر ہماری گلی میں چکر لگاتے ہیں۔''

''لیکن بھلا چوہدری صاحب کے بیٹے ایسے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ وہ تو بڑے مؤدب اور اچھے بچے تھے۔ استانی جی کے گھر سپارہ پڑھنے آتے تھے۔ استانی جی بھی بہت تعریف کرتی تھیں۔''

''تو بھی نا زیب النساء! بہت سادی ہے۔ تب بچے تھے نا۔ یہ چوہدریوں زمین داروں کے بچے جوان ہوتے ہی رنگ نکالتے ہیں اپنا۔ ماں بہن ہے نہیں اور باپ گھر پر نہیں۔''

اور پھر یہ اسی روز کی بات تھی حامد رو رہا تھا وہ اسے لے کر باہر نکلی تھی کہ کوئی بسکٹ وغیرہ لے دے۔ ماسی نور بھری کچھ دیر پہلے ہی کہیں گئی تھی۔ اس نے گلی میں چوہدری عبد المالک کے دونوں چھوٹے بیٹوں کو دیکھا تھا۔ حالانکہ پہلے تو وہ کبھی اس طرف نہیں آئے تھے۔ چوہدری صاحب کی حویلی یہاں سے کافی دور تھی۔

''تو کیا ماسی نور بھری سچ کہہ رہی تھی؟''

وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ اس کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ تیزی سے واپس مڑی اور گھر میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

پھر ایک روز رات کے وقت اس نے چھت پر سے دیکھا تھا، وہ اسی وقت گلی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی تھی اور وہ ایک بار پھر خوف زدہ ڈری رہنے لگی تھی۔

اس پر ماسی نور بھری اسے مزید ڈراتی رہتی تھی کہ تمہاری عزت یہاں محفوظ نہیں ہے۔ میں ہر وقت یہاں تمہارا پہرا نہیں دے سکتی۔ کام سے بھی نکلنا پڑتا ہے۔ اسلم کی بیوی کی طبیعت خراب ہے، وہ بھی راجن پور بلاتا ہے۔ لیکن تمہیں اکیلے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ تمہارا کوئی عزیز رشتہ دار ہے تو کچھ دنوں

کے لیے اس کے پاس چلی جاؤ۔

چوہدری عبدالمالک واپس آئے گا تو سب کو نکیل ڈال دے گا۔ اور اس کا تو کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ نانا اس دنیا میں نہیں تھے۔ سگے ماموں کو اماں خود ساری زندگی یاد کرتی رہیں۔ اور اماں کے سوتیلے بھائی اماں کو بھی نہیں جانتے تھے......

بس ماسی جنتاں تھیں۔ ابا کی اماں کی رشتہ دار، اور ابا نے کہا تھا میرے بعد یہاں نہ رہنا، ماسی جنتاں کے پاس چلی جانا۔

''ہاں تو بس ٹھیک ہے۔''

ماسی نور بھری نے اس کی بات سن کر کہا تھا۔

''بس تو ماسی جنتاں کے پاس چلی جا۔ اتا پتا تو ہے نا تیرے پاس یہاں کی فکر نہ کر بالکل میں تیرے گھر کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔ جیسے ہی چوہدری عبدالمالک آئیں گے واپس تمہیں بلا لوں گی۔ اکیلی جوان لڑکی کو دیکھ کر سب ہی شیر ہو رہے ہیں۔ دوسرے زمین داروں کے لونڈے لپاڑے اور وہ مراثیوں کے آوارہ لڑکے بھی اس گلی میں منڈلاتے رہتے ہیں۔''

وہ اپنا گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن ماسی نور بھری نے اسے اتنا ڈرایا کہ ایک روز اس نے گھر چھوڑ دیا۔ نور بھری نے ہی اسے ماسی جنتاں کے پاس بھجوانے کا انتظام کیا تھا۔ اور یقین دلایا تھا کہ جلد ہی چوہدری صاحب کے آنے کے بعد بلا لے گی لیکن چھ سال ہو گئے تھے اسے یہاں آئے۔ پچھلے سال ماسی جنتاں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے، تب ہی صحن کا دروازہ کھلا۔

''میرا راجا آ گیا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''زیبو...... زیبو...... کہاں ہو؟''

یہ تو زیتون تھی جو اسے بلا رہی تھی۔ پھر وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے کمرے کے دروازے تک آئی اور نیم وا دروازہ کھول کر اندر آئی۔

"یہ اس وقت یہاں کیوں بیٹھی ہو اندر کمرے میں، باہر کتنا اچھا موسم ہے اور یہاں کتنی گھٹن ہے اور اندھیرا سا بھی ہو رہا ہے۔ چل باہر صحن میں چل کر بیٹھتے ہیں اور یہ دروازے میں کنڈی بھی نہیں لگی تھی۔ کتنی دفعہ تمہیں سمجھایا ہے، کنڈی لگا کر رکھا کر، یہ ٹھیک ہے کہ سب آس پاس اچھے اور لحاظ کرنے والے لوگ ہیں پر نیت بدلتے دیر تھوڑی ہی لگتی ہے۔ اتنی سوہنی ہے تو احتیاط کیا کر۔"

"وہ حامد کا انتظار کر رہی تھی، آج ابھی تک مسجد سے نہیں آیا اس کے لیے ہی کنڈی کھولی تھی کہ آتا ہی ہوگا۔"

وہ چپل پہن کر زیتون کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"میں نے اسے اور فضل کو گلو حلوائی سے جلیبیاں لینے بھیجا ہے۔"

اس نے اپنے بیٹے فضل کا نام لیا جو حامد کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔ دونوں مسجد میں بھی اکٹھے ہی جاتے تھے۔ اور زیتون بھی اس وقت ایک چکر ضرور لگاتی تھی۔

"دونوں یار تیسری جماعت سے پاس ہو کر چوتھی میں آگئے ہیں تو جلیبیاں کھانا تو بنتا ہے نا۔"

زیتون ہنسی۔

"اور تجھے تو بہت مبارک ہو۔ تیرا لعل تو فرسٹ آیا ہے۔ فضل بتا رہا تھا ماسٹر صاحب بہت تعریف کر رہے تھے۔"

"خیر مبارک زیتون! تجھے بھی مبارک ہو۔"

وہ دونوں برآمدے سے نکل کر صحن میں آگئی تھیں۔ زیب النساء نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی بچھائی اور زیتون نے برآمدے میں جا کر تخت پر رکھے کھیسوں میں سے ایک کھیس اٹھا کر چارپائی پر بچھا دیا۔

"گھر سے سوجی اور میدے کی زیرے والی نمکین ٹکیاں بھی لے کر آئی ہوں۔ صبح افضل کی فرمائش پر بنائی تھیں۔ وہاں تخت پر ڈونگا رکھا ہے۔"

افضل اس کا بڑا بیٹا تھا۔

اسے زیتون کا بڑا سہارا تھا۔ ہر اوکھے سوکھے ویلے کام آتی تھی۔ دن میں دو تین چکر تو لگاتی ہی تھی۔

زیب النساء برآمدے کی طرف بڑھ گئی اور تیل کا چولہا جلا کر چائے کے لیے پانی رکھا۔ زیتون بھی بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے ہی برآمدے تک آئی۔

''دودھ تو ہے نا؟''

''ہاں!'' زیب النساء نے ریک سے چائے کی پتی اور چینی کا ڈبہ اٹھایا۔

''ایک بات تو بتا زیبو......!'' زیتون دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

''وہ تو نہیں آیا اب تک جس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ آٹھ برس تو ہو گئے۔''

''ہاں آٹھ سال نو ماہ اور دس دن۔''

وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ انتظار کا ایک ایک دن دل پر لکھا تھا۔

''تو کب تک اس کا انتظار کرو گی؟ میں تو کہتی ہوں چھوڑ اس کا انتظار۔ فضل کے ابا سے کہتی ہوں کہ اب کے شہر جائے تو بڑی مسجد کے مولوی صاحب سے فتویٰ لے آئے کہ جب شوہر آٹھ نو سال سے لاپتا ہو تو ایسی صورت میں اسلام میں کیا حکم ہے۔ یا پھر ایسا کر کہ عدالت سے جا کر خلع لے لے۔ جیسے اپنی حوالدارنی نے کیا ہے۔ اس سے کسی روز جا کر ساری معلومات لے لیں گے کہ کیسے خلع لی جاتی ہے۔''

حوالدارنی کو اس کے شوہر حوالدار کی نسبت سے سب ہی حوالدارنی کہتے تھے۔ حوالدار اسے بہت مارتا پیٹتا تھا تو بس وہ باپ بھائی کے ساتھ جا کر عدالت میں کیس کر آئی تھی اور خلع لے کر اب محنت مزدوری کرتی تھی۔

''سچی زیبو! ایسا ہو جائے نا تو پھر میں تیری شادی کروا دوں گی۔ میرا مسیر (خالہ زاد بھائی) ہے ایک دو سال کا بیٹا ہے۔ پچھلے سال اس کی بیوی مر گئی تھی۔ پار والے گاؤں میں رہتا ہے۔ سچی زیبو بہت ہی اچھا ہے۔ اور رج کے سوہنا گبھرو جوان ہے۔ تیرے بیٹے کو بھی قبول کر لے گا۔''

''دیکھ زیتونی! تو نے آج ایسی بات کی ہے، پھر نہ کرنا۔'' اس نے مڑ کر زیتون کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرہ جیسے تپ رہا تھا۔

''میں اپنی آخری سانس تک اس کا انتظار کروں گی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ وہ ہمیں تلاشتا ہوا یہاں آئے گا۔''

اور سوچنے لگی کہ فاطمہ آپا کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا ہوگا۔ وہ ہی ہوگا جسے انہوں نے دیکھا ہوگا۔

اس صبح جب وہ ماسی نور بھری کے ساتھ گھر سے ماسی جنتاں کے گھر جانے کے لیے نکلی تھی تو ماسی رسولاں کے ڈاکیے بیٹے نے اسے خط دیا تھا۔ جو صبح صبح تحصیل کے ڈاک خانے جا رہا تھا۔

''یہ خط کل آیا تھا، تھیلے میں ہی رہ گیا تھا۔''

اس نے خط لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ یہ فاطمہ آپا کا خط تھا اور بڑے دنوں کے بعد آیا تھا۔ انہیں تو شاید ماسٹر عبدالعزیز کے انتقال کا بھی نہیں پتا تھا۔ پڑھنے کا وقت نہیں تھا ماسی نور بھری نے جلدی مچائی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی کو اس کے جانے کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

''ان لفنگوں کو پتا چل گیا نا جو تیرے پیچھے پڑے ہیں تو انہوں نے راستے میں ہی اغوا کر لینا ہے تجھے۔''

اور وہ چاچا نیاز تک کو نہ بتا سکی تھی۔ ماسی نور بھری خود اسے ویگنوں کے اڈے تک چھوڑ کر آئی تھی۔ وہاں ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا۔ جس کے متعلق ماسی نور بھری نے اسے بتایا تھا کہ میرے مولیر (ماموں کا بیٹا) کا پتر ہے۔ تجھے ماسی جنتاں کے گھر چھوڑ کر آئے گا۔ چھوٹے بچے کا ساتھ اور جوان جہان ہے تو اکیلے کیسے بھیج دوں۔ دل نہیں مانا تو مولیر کی منتیں کیں کہ اپنے بچے کو ساتھ کر دو۔ اب اطمینان رہے گا یہ تمہیں خیر خیریت سے پہنچا دے گا۔ بہت ہوشیار ہے۔ بے فکر ہو کر جاؤ۔''

اور اس نے اسے ماسی جنتاں کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اور جب رات کو وہ بستر پر لیٹی تو اسے خط کا خیال آیا تھا جو ماسی رسولاں کے ڈاکیے بیٹے نے اسے دیا تھا۔

اس نے فوراً اٹھ کر خط نکالا تھا۔ لفافے پر لکھا تھا۔ ''دختر ماسٹر عبدالعزیز'' فاطمہ آپا ہمیشہ ایسے ہی پتا لکھتی تھیں۔ اس نے بے چینی سے لفافہ کھولا۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔

''یہ کل شام کی بات ہے میں انارکلی کچھ چیزیں خریدنے گئی تھی۔ واپسی پر سڑک کے کنارے کھڑی سواری کا انتظار کر رہی تھی کہ مجھے لگا کہ دوسری طرف ایک بڑی دکان سے نکل کر گاڑی کا دروازہ

کھولتا ہوا وہ شخص تمہارا شہزادہ ہے۔ میں نے آواز دی اور جلدی سے سڑک عبور کر کے دوسری طرف جانے لگی تھی لیکن وہ تو فوراً گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا تھا۔

اقبال بھائی نے بتایا تھا کہ اس کا حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اماں جب تک زندہ رہیں اسے یاد کر کے روتی تھیں۔ تمہارے لیے بھی اس کے لیے بھی۔ ایک طرف میرا دل کہتا ہے کہ یہ وہی تھا۔ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ دوسری طرف دل یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو تمہاری خبر نہ لیتا۔ وہ ایسا تو نہیں لگتا تھا دھوکے باز بس جو بھی ہے۔ زیب! تم ماسٹر صاحب کو نکاح نامے کی کاپی دے کر لاہور بھیجو۔

اگر وہ نہیں آسکتے بیماری کی وجہ سے تو اس کے گھر کا پتا لکھ کر بھیجو میں خود اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گی کہ اگر وہ زندہ ہے تو اقبال بھائی نے جھوٹ کیوں بولا اور اگر انہوں نے جھوٹ بولا تھا وہ خود کیوں نہیں تمہیں لینے گیا۔"

اور اس کے دل نے بھی گواہی دی تھی کہ فاطمہ آپا کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ وہ وہی ہوگا اور تب سے ہی وہ انتظار کی شمعیں جلائے اس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنے ماہ و سال گزر گئے تھے نہ پھر فاطمہ آپا کا کوئی خط آیا تھا۔ اس نے کتنے ہی خط انہیں لکھ ڈالے تھے لیکن انتظار تھا کہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ امید تھی کہ ٹوٹتی نہیں تھی۔ اور اس امید کی روشنی نے اس وقت اس کی آنکھوں کی چمک بڑھا دی تھی۔ چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ زیتون مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ کیا تھا اس کی آنکھوں سے جھلکتا اس کے چہرے پہ بکھرا۔ یہ یقین تھا، عشق تھا، وفا تھی یا عشق سے بھی اوپر کچھ۔

"تم اس سے بہت محبت کرتی تھیں زیبو!" زیتون کی آواز مدھم تھی۔

"پتا نہیں کتنی محبت کرتی تھی میں اس سے لیکن جب وہ استانی جی کے گھر بیمار ہو کر آیا تھا تو ان چھ سات دنوں میں ہی مجھے لگا تھا کہ وہ میرے دل کا مکین ہو گیا ہے۔ ایسا مکین جو استانی جی کے گھر سے جانے کے باوجود میرے دل میں ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ پتا ہے زیتونی......" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"یہ محبت بھی نا کبھی کبھی بڑی خود غرض ہو جاتی ہے۔ ایک بار جب وہ بیمار تھا تو میں نے دعا کی تھی کہ وہ کبھی ٹھیک نہ ہو، یوں ہی بیمار رہے، میں اس کے لیے دودھ گرم کر کے استانی جی کو دیتی رہوں۔ اس کے لیے پرہیزی کھانا بناتی رہوں اور وہ ادھر ادھر جاتے ہوئے گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہے۔ اس نے زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی نظریں باتیں کرتی تھیں۔ اس نے زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ بس ایک بار کہا تھا، تم بہت اچھی ہو زیب النساء! لیکن جاتے ہوئے وہ استانی جی سے میرے رشتے کی بات کر گیا تھا۔ اور وہ سب کچھ جو اس نے تب مجھ سے نہیں کہا، شادی کے بعد اپنے جذبوں کے اظہار سے میری جھولی بھر دی تھی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ کتنے خوب صورت دن تھے وہ جو اس کی ہم راہی میں گزرے تھے۔"

وہ جیسے ان گزرے دنوں کے تصور میں کھو گئی تھی۔

"پانی ابل رہا ہے زیبو! پتی ڈال دو۔" زیتونی نے اس وقت اس کے چہرے اور آنکھوں میں جو کچھ دیکھا تھا اسے احساس ہوا کہ وہ اب کبھی اس سے ایسی بات نہ کہہ سکے گی حالانکہ کتنی چاہ تھی اسے کہ زیب النساء کو اپنے مسیر کے ساتھ بیاہ کر دونوں کی زندگی سنوار دے۔

زیب النساء نے پانی میں پتی ڈالی تب ہی دروازہ کھلا اور فضل ہاتھ میں جلیبیوں کا لفافہ لیے اندر داخل ہوا اور اس کے ساتھ ہی حامد بھی تھا۔

"یہ لے اماں!" فضل نے زیتون کے پاس آ کر لفافہ اسے پکڑایا اور حامد کے پیچھے چلا گیا جو کمرے میں چلا گیا تھا۔

زیتون نے نعمت خانے سے دو پلیٹیں نکالیں اور زیب النساء سے کہا کہ وہ چائے لے کر ادھر تخت کے پاس ہی آ جائے۔ اس نے جلیبیاں اور تخت پر پڑے ڈونگے سے ٹکیاں نکال کر پلیٹوں میں ڈالیں اور دونوں بچوں کو آواز دی۔

"فضل، حامد! جلدی آ جاؤ، جلیبیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔"

دونوں بچے کمرے سے نکل آئے تھے۔ حامد کے ہاتھ میں ایک چوکور ڈبا تھا۔ دونوں بچے تخت پر

ہی بیٹھ گئے تھے۔ درمیان میں پلیٹیں رکھی تھیں خود وہ موڑھے پر بیٹھ گئی تھی۔ زیب النساء بھی چائے کے دو کپ لے کر آ گئی تھی اور دوسرے موڑھے پر بیٹھ گئی تھی۔

''کھاؤ!'' زیتون نے بچوں اور زیب النساء کو ایک ساتھ کہا۔

حامد نے ایک جلیبی اٹھائی اور ذرا ذرا سا کتر کر کھانے لگا۔

''اللہ تمہیں زندگی میں بہت ساری کامیابیاں دے۔ ہر امتحان میں کامیابیاں عطا کرے اور میں ہر سال تمہیں یوں ہی جلیبیاں کھلاتی رہوں۔''

''پر اماں! ہماری پڑھائی کے تو صرف دو سال ہی رہ گئے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں کے صرف دو سال ہی تو ہیں یہاں......'' فضل بھی ماں کی طرح ہی تھا شرارتی اور چلبلا سا۔

''تو کیا ہوا، پانچویں کے بعد تمہیں قصبے کے اسکول میں بھیج دوں گی۔ وہاں پڑھنا بہت سارا اور ایک دن بڑا افسر بن کر بڑی ساری گاڑی میں آنا۔''

گاؤں میں صرف پرائمری تک اسکول تھا۔

''پر اماں! شہر میں ہم رہیں گے کہاں؟ کیا پانچویں کے بعد ہم افسر نہیں بن سکتے؟'' فضل کو عادت تھی سوال کرنے کی...... بعض اوقات تو وہ زچ ہو جاتی تھی۔

''یہ تب سوچ لیں گے، پہلے پانچویں تو پاس کر لے میرے پتر!'' زیتون نے اس کے بازو پر تھپکی دی۔

''دودھ پیو گے تم دونوں؟'' زیب النساء نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

''نہیں۔'' دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔

بچے چائے نہیں پیتے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''

زیب النساء کی نظر چوکور ڈبے پر پڑی تھی۔

''کنچے ہیں اماں! ظفری نے میرے پاس رکھوائے تھے، اس نے کہا تھا سپارہ پڑھنے آؤ تو لیتے

آنا۔ مجھے یاد نہیں رہے۔ اب دے آؤں اسے۔'' حامد کھڑا ہو گیا تھا۔

''اچھا دے آؤ۔ لیکن جلدی آجانا، اندھیرے سے پہلے ہی۔'' زیب النساء نے تاکید کی۔

''تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں حامد! یہ ٹکی تو لے لو نا۔ تمہیں تو پسند ہیں۔'' زیتون دیکھ رہی تھی کہ حامد نے صرف ایک جلیبی ہی لی تھی۔

''جی نہیں چاہ رہا خالہ!'' وہ بے حد سنجیدہ اور خاموش لگ رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا، کسی نے کچھ کہا ہے؟'' زیتون نے پوچھا۔

''نہیں خالہ، کسی نے کیا کہنا ہے۔'' اس نے کنچوں والا ڈبا اٹھایا۔ فضل نے اٹھتے اٹھتے دو جلیبیاں اور اٹھالی تھیں۔

''ہاں اماں! وہ ظفری بے چارہ تو فیل ہو گیا۔ ہر وقت کنچے جو کھیلتا رہتا تھا۔''

''ہائے بے چارہ!'' زیتون نے افسوس کا اظہار کیا۔

فضل نے جھک کر ایک ٹکی اٹھائی اور گھڑے پہ گلاس رکھا۔ فیل کوئی پاس گاتا ہوا صحن کی طرف بڑھا۔ حامد بھی اس کے ساتھ تھا۔

زیب النساء کی نظروں نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا، وہ دروازہ کھول کر باہر چلے گئے تو چائے گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

''اپنے راجے بیٹے اور میرے فضل کے پاس ہونے کی خوشی میں یہ جلیبی تو کھالو۔''

زیتون نے ایک جلیبی اٹھا کر اس کے منہ میں ڈالی۔

''اور یہ رونی شکل بنا کر کیوں بیٹھی ہو۔ آج ہمارے بیٹوں نے تین جماعتیں پاس کی ہیں۔ کل سولہ بھی کرلیں گے۔''

''ان شاءاللہ!'' زیب النساء نے آہستہ سے کہا۔

''وہ صفدر بھائی نے کچھ بتایا ماسی نور بھری کے متعلق کچھ پتا چلا؟''

''فضل کے ابا نے جس بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی ماسی نور بھری کا پتا کرنے کے لیے اس نے بتایا

ہے کہ نور بھری پہلے تو تیرا گھر فروخت کر کے صادق آباد چلی گئی تھی۔ پھر وہاں سے بھی کہیں چلی گئی، کہاں یہ پتا نہیں چلا......لیکن اس نے فضل کے ابا سے کہا ہے وہ جلد پتا لگا لے گا۔"

زیتون نے تخت پر رکھا اپنا کپ اٹھایا اور موڑھے سے اٹھ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اب زیب النساء اس کے سامنے تھی۔ سر جھکائے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی۔

"میرا تو ایمان ہے زیبو! حرام کسی کو ہضم نہیں ہوتا اور پھر یتیم کا مال، دیکھنا دگنا ہو کر نکلے گا۔ یہ تیری ماسی نور بھری ذلیل و خوار ہو کر مرے گی۔"

"میں اس لیے تو ماسی نور بھری کو نہیں ڈھونڈنا چاہتی کہ مجھے اپنے مکان کے پیسے وصول کرنے ہیں۔ مجھے تو اس سے اس آدمی کا پتا کرنا ہے۔ وہ ماسی رسولاں نے بتایا تھا نا کہ جو دو سال پہلے وہاں آیا تھا اور ماسٹر عبدالعزیز کا پوچھ رہا تھا۔ کیا پتا وہ حامد کا باپ ہی ہو۔"

زیب النساء نے خالی کپ تخت پر رکھا۔

"لیکن تم بھول گئی ہو ماسی رسولاں نے کہا تھا وہ حامد کا ابا نہیں تھا۔ اسے اس کی شکل یاد ہے جب وہ دولہا بن کر آیا تھا۔ سب نے ہی تو اسے دیکھا تھا۔"

لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں مایوسی سی نظر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہاں پھر امید کی لو دمک رہی تھی۔

"بارات کے ساتھ آتے ذرا کی ذرا تو دیکھا ہوگا ماسی رسولاں نے اسے۔ بھلا اب تک اس کی شکل کہاں یاد ہو گی اسے۔ ایک بار اس کا پتا چل جائے تو اس کی امانت اس کے حوالے کر دوں۔"

"تیری ماسی نور بھری نے بھی تیرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تیری ماں کے ساتھ اچھا بہناپا نبھایا۔ تجھے گھر سے بے گھر کیا اور پھر گھر بیچ باچ کر چلی بھی گئی منافق عورت۔" زیتون نے بھی آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ تخت پر رکھ دیا۔

زیب النساء خاموش رہی۔ اس نے پانچ سال اماں جنتاں کے گھر ماسی نور بھری کے اس خط کا انتظار کرتے ہوئے گزار دیے، جس میں ماسی نور بھری اسے واپس آنے کے لیے لکھے یا یہ لکھے کہ تیرا شہزادہ آیا تھا تجھے ڈھونڈتا ہوا۔ لیکن ایسا کوئی خط نہیں آیا تھا۔

مہینوں بعد اس کے کئی خطوط کے جواب میں چند سطروں کا خط آتا۔

''ابھی واپس آنے کا نہ سوچنا، وہ زمین داروں اور چوہدری مالک کے بیٹے کتوں کی طرح سونگھتے پھرتے ہیں۔ چوہدری تو مڑ کر وطن واپس ہی نہیں آیا۔ اور نہ ہی تیرا خاوند آیا ہے تجھے ڈھونڈتا ہوا۔ حقیقت تو یہ ہی ہے کہ وہ مر چکا ہے، تم ویسے ہی آس لگائے بیٹھی ہو۔''

پھر چار سال بعد اس کے یہ خط آنے بھی بند ہو گئے تھے۔ پورا ایک سال اس نے ماسی نور بھری کے خط کا انتظار کیا تھا پھر زیتون نے ہی مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ خود جا کر پتا کر آئیں۔ کیا پتا تیری ماسی نور بھری مر کھپ گئی ہو۔ صفدر کو جانا ہے اس طرف ہم بھی اس کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔'' ماسی جنتاں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ تب وہ زندہ تھی۔

''اور صفدر ساتھ ہوگا ہمیں کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی کی جرأت نہیں ہوگی کہ آنکھ اٹھا کر بھی تمہاری طرف دیکھے۔ میرا بندہ کوئی ایسا گیا گزرا نہیں ہے۔ دو تین بندوں کو تو منٹوں میں پھڑکا کر رکھ دے۔''

صفدر اونچا لمبا گبھرو جوان تھا۔

''بھرا گھر چھوڑ کر آ گئی ہے۔ رات ہونے سے پہلے واپس شہر آ جائیں گے اور رات شہر میں رہ جائیں گے۔ میری ایک رشتے کی ماسی ہے وہاں شہر میں۔ اس کے گھر رہ لیں گے، تم ضروری سامان بھی لے لینا۔ اپنے اماں ابا کی قبر پر فاتحہ پڑھ لینا اور اپنے گھر کو کسی سے کہہ سن کر کرائے پر چڑھا آنا۔ ایک دو ہزار تو مل ہی جائیں گے تیرے بیٹے کے کام آئیں گے۔''

''گاؤں میں بھلا کون گھر کرائے پر لے گا۔''

زیب النساء نے کہا تھا لیکن وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی، زیتون کو قائل کرنا آتا تھا لیکن وہاں جا کر جو انکشاف ہوا اس نے ششدر کر دیا تھا۔ آس پڑوس سے پتا چلا تھا کہ نور بھری تو سال بھر پہلے گھر اور گھر کا سامان فروخت کر کے چلی گئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ تم نے ہی کہا ہے۔ فروخت کر کے پیسے بھجوانے کا۔

وہ لوگ جنہوں نے گھر خریدا تھا اسی گاؤں کے تھے، ان سے اجازت لے کر وہ گھر کے اندر گئی تھی۔ ایک ایک دیوار کو چھو کر دیکھا تھا۔

''تیرا گھر تو بڑا سوہنا تھا زیبو...... اللہ اس نور بھری بلکہ زہر بھری کا کبھی بھلا نہ کرے۔'' زیتون کو نور بھری پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

پھر وہ قبرستان گئی تھی اور کتنی ہی دیر اماں ابا کی قبر کے پاس بیٹھی رہی تھی اور جب زیتون کے احساس دلانے پر کہ دیر ہو گئی ہے تو وہ اٹھی تو اس کی نظر قبرستان میں آتے چوہدری عبدالمالک پر پڑی تھی وہ بھی اسے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

''زیب النساء بیٹی! اچانک کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں آیا تو پتا چلا کہ تم اچانک کہیں چلی گئی ہو۔ یہاں کسی کو پتا نہیں تھا کہ تم کہاں چلی گئی ہو۔ ماسی نور بھری کو بھی نہیں جو تمہیں خود اڈے پر چھوڑ کر آئی تھی، میں نے ماسی نور بھری کو بلا کر پوچھا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اسے کیا علم کہ تم کہاں اور کیوں گئی ہو۔''

زیب النساء نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''مجبور ہو کر گئی تھی چوہدری صاحب! ورنہ اپنا گھر کون چھوڑتا ہے۔ ابا کہتے تھے کہ میرے بعد اگر مشکل ہو جائے اکیلا رہنا تو میری آپا جنت کے پاس چلی جانا۔''

''لیکن بیٹا! کیوں مشکل ہو گیا تھا یہاں رہنا۔ اس گاؤں میں تو سب ہی ماسٹر صاحب کی عزت کرتے تھے اور وہ ماسی نور بھری میں نے سنا تھا اس نے تمہارا بہت ساتھ دیا۔ اور اس کا بیٹا بھی یہاں سے چلا گیا تھا راجن پور۔''

''اس کا بیٹا تو چلا گیا تھا لیکن چوہدری عبدالمالک اور زمین داروں کے بیٹے تو تھے نا آوارہ لفنگے......''

زیتون کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ بارعب سا معزز آدمی ضرور چوہدری عبدالمالک ہو گا لیکن وہ لگی لپٹی نہیں رکھتی تھی۔ بات منہ پر مارنے کی عادت تھی اسے، حالانکہ صفدر نے اسے گھور کر دیکھا بھی تھا لیکن وہ بولتی چلی گئی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم بیٹی؟'' چوہدری عبدالمالک اس کی بات سن کر حیران ہوئے تھے۔

''چلو گھر چلو میرے ساتھ، وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

اور جب انہیں ساری بات معلوم ہوئی تو ان کا رنگ سرخ ہو گیا۔

''استانی جی صحیح کہتی تھیں، یہ ماسی نور بھری بڑی خبیث عورت ہے۔ تمہارا گھر ہتھیانے کے لیے

تمہیں ڈراتی رہی۔ ماسٹر صاحب میرے بچوں کے استاد تھے، میں ہی نہیں، میرے بچے بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ میں نے انہیں خود اسلم کی وجہ سے کہا تھا کہ ایک دو بار تمہاری گلی کا چکر لگا لیا کریں کہ کہیں ماسٹر صاحب کے بعد وہ تمہیں تنگ نہ کرے۔ ان کی زندگی میں ہی ماں بیٹے نے تمہارا گھر ہتھیانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خود ماسٹر صاحب نے مجھے بتایا تھا اور زمین دار کے بیٹے مدارس کے پڑھے ہوئے حافظ قرآن نیک بچے...... گلی میں بھی نگاہ جھکا کر گزرتے ہیں۔''

''توبہ ہے یہ ماسی نور بھری بھی کیسی مکار عورت تھی، جھوٹی، جہنم میں سڑے گی ایک روز۔''

زیتون کو ساری بات سن کر بہت غصہ آیا تھا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی تھی۔

چوہدری عبدالمالک نے اس سے کہا تھا کہ ماسی نور بھری تمہارا گھر فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ میں ان لوگوں کو بلا کر بات کرتا ہوں اور انہوں نے جو رقم دی ہے وہ انہیں دے کر گھر تمہیں واپس لے دیتا ہوں۔ لیکن اس نے کہا تھا وہ اب یہاں آ کر کیا کرے گی۔

❋ ❋

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 12

استانی جی بھی نہیں ہیں اور وہ بھی اسلام آباد شفٹ ہو رہے ہیں چوہدری عبدالمالک نے بتایا تھا کہ دونوں چھوٹے بیٹے ضد کر رہے ہیں کہ میں اب ان کے ساتھ ہی رہوں اسلام آباد میں......اور وہاں ماسی جنتاں ہے، جس نے اس کو اپنے گھر رکھا، سہارا دیا، ماں جیسی محبت دی......اب وہ بیمار رہنے لگی ہے۔اسے خدمت کی ضرورت ہے تو وہ اسے چھوڑ کر یہاں کیسے آ جائے۔ ماسی نور بھری چلی گئی ہے لیکن تن تنہا لڑکی کے لیے اکیلے رہنا آسان نہیں ہے۔ نہ جانے کوئی اور نور بھری اور اسلم اس کے پیچھے پڑ جائے۔تب چوہدری عبدالمالک خاموش ہو گئے تھے۔انہوں نے کہا تھا جب بھی کوئی مشکل ہوا سے خط لکھ دے وہ جا رہے ہیں لیکن گھر میں دیکھ بھال کے لیے نوکر ملازم تو ہوں گے نا، اس کا خط انہیں مل جائے گا۔اور پھر ان کے اصرار کے باوجود وہ وہاں نہیں رکے تھے کہ حامد کو وہ ماسی جنتاں کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر چوہدری عبدالمالک نے خود اپنی گاڑی پر انہیں شہر بھجوایا تھا۔

اور وعدہ کیا تھا کہ وہ نور بھری کو تلاش کروانے کی کوشش کریں گے۔

''تو اب اس کا انتظار کرنا چھوڑ دے زیبو! وہ نہیں آنے والا۔ اتنے سال گزر گئے نہیں آیا تو اب کہاں آئے گا۔اور حامد کو اس کے حوالے کیوں کرے گی بھلا......آج آٹھ سال کا ہے کچھ سالوں میں جوان ہو کر تیرا سہارا بنے گا۔اس کا کیا حق ہے بھلا حامد پر جو تجھے بیوی بنا کر وقت گزار کر چلا گیا۔ یہ شہری بابو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ کبھی اس نے ایک معصوم لڑکی کی جھولی میں وعدے کے سکے پھینکے تھے اور وہ جھلی ابھی تک وہ جھوٹے سکے سنبھالے اس کی راہ تکتی ہے۔''

''نہ ایسا نہ کہہ زیتونی!'' زیب النساء نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔''وہ ایسا نہیں تھا، وہ تو......''

''چل ایویں ہی وکالت نہ کر اس کی، اگر تو اسے ایسے ہی مل جاتی تو نکاح بھی نہ کرتا تجھ سے۔''

زیتون پتا نہیں کیوں آج تلخ ہو گئی تھی۔ ورنہ اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں جس سے زیب النساء کا دل دکھے۔ اور آج اس نے زیب النساء کا دل دکھایا تھا۔ جو مسلسل نہیں نہیں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کرب تھا، اذیت تھی۔ اس نے زیتون کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''اس نے ابا سے کہا تھا وہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو لے کر آئے گا اور لے جائے گا۔ لیکن نہیں آیا اور اقبال بھائی نے کہا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ اس حادثے میں مر گیا۔ اقبال بھائی، استانی جی کے بھانجے تھے۔'' پہلی بار وہ زیتون کو بتا رہی تھی اس کے متعلق ورنہ ہمیشہ ہی کہتی تھی کہ وہ آئے گا۔

''اور پھر بھی تو اس کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی ہے زیبو!'' زیتون حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں......!'' اس نے بے بسی سے زیتون کی طرف دیکھا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

زیتون نے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے خالی کپ اٹھائے اور کھڑی ہو گئی۔

''یہ میں دھو کر رکھ دیتی ہوں، چائے والے برتن اور ٹکیاں نعمت خانے میں حامد کے لیے رکھ دیتی ہوں۔ شوق سے کھاتا ہے۔''

دوسری پلیٹ میں پڑی آخری جلیبی اس نے اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔

''اس پر تو چونٹیاں آ جائیں گی۔''

''زیتونی! سن، صفدر بھائی سے کہو مجھے اقبال بھائی کا پتا کروا دیں۔ مجھے استانی جی کے بھانجوں کا گھر پتا ہے۔ جب ابا اسپتال میں تھے تو استانی جی کے ساتھ میں ان کے گھر گئی تھی۔ وہ تب دوسرے ملک چلے گئے تھے۔ ابا کئی بار گئے تھے پتا کرنے۔''

''لے اب اقبال بھائی کا پتا کر کے کیا کرے گی۔'' زیتون نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''تصدیق......قرآن پر ہاتھ رکھ کر تصدیق۔''

''کس بات کی تصدیق......؟'' زیتون حیران سی کھڑی تھی۔

''یہ کہ انہوں نے حادثے کے متعلق جو کچھ کہا تھا، سچ کہا تھا۔'' زیب النساء کا دل جیسے لہولہو ہوا تھا۔

''لیکن وہ تمہارے اقبال بھائی جھوٹ کیوں بولیں گے بھلا؟'' زیتون کپ ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھی۔

''پتا نہیں۔'' اس نے بے بسی سے زیتون کی طرف دیکھا۔

''لیکن جب سے فاطمہ آپا کا خط آیا ہے تب سے بار بار ذہن میں خیال آتا ہے کہ ہوسکتا ہے اقبال بھائی نے جھوٹ بولا ہو۔ یا انہیں جس نے ان کے حادثے کا بتایا ہو اس نے جھوٹ بولا ہو اور فاطمہ آپا نے اسے ہی دیکھا ہو۔''

''ہاں یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ وہ بھلا اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولیں گے۔'' زیتون نے اپنی بات دہرائی۔

''انہوں نے بھی استانی جی سے میرے رشتے کی بات کی تھی۔ حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا میری شادی کا سن کر ان کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا اور انہوں نے ابا سے بھی اس روز اونچی آواز میں بات کی تھی۔ جب ابا نے انہیں کہا تھا کہ وہ اس کے متعلق پتا کروا دیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

''چلو مان لیا زیبو کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا لیکن بھلا جھوٹ بولنے سے انہیں کیا فائدہ ہونا تھا۔ وہ تجھ سے شادی تو نہیں کر سکتے تھے نا کہ نکاح پر نکاح تو نہیں ہوسکتا کہ انہیں تو پتا تھا کہ تمہارا شوہر زندہ ہے۔ اور اگر کچھ غلط مقصد ہوتا تو وہ کیا بار بار تمہارے گھر نہ آتے۔'' زیتون پتا نہیں کیوں اس وقت بحث کر رہی تھی۔

''ہاں وہ آخری بار تب ہی آئے تھے اس کے متعلق بتانے پھر وہ ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ ابا کئی بار گئے تھے ان کے گھر لیکن انہیں اقبال بھائی نہیں ملے تھے۔''

''تو مطلب یہ کہ تمہاری فاطمہ آپا کو ضرور دھوکا ہوا ہوگا اور پھر تمہاری فاطمہ آپا نے بھی تو تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کتنے ہی خط تو تم نے لکھے تھے انہیں۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے زیبو!

یہاں کوئی کسی کا نہیں ہے۔ سب خود غرض اور مطلبی ہیں۔"

"نہیں......" زیب النساء نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ "فاطمہ آپا اور استانی جی ایسی نہیں تھیں۔ ہو سکتا ہے میرے خط انہیں ملے ہوں اور انہوں نے مجھے جو بھی خط لکھے ہوں۔ وہ ابا کے گھر والے پتے پر ہی لکھے ہوں گے تو ماسی نور بھری نے انہیں پھاڑ کر پھینک دیا ہو۔ میں تو اپنے ہر خط میں ماسی نور بھری سے بھی پوچھتی تھی کہ میرا کوئی خط آیا اور جب بھی اس کا جواب آتا یہ ہی لکھا ہوتا کہ کوئی خط نہیں آیا۔"

"چلو فاطمہ آپا ایسی نہیں ہیں۔ مان لیا...... میں نے تو بس یوں ہی ایک عام بات کی تھی کہ آج کل کوئی کسی کا نہیں ہے۔ تمہیں برا لگا ہے نا تو معاف کر دو لیکن میری جھلی بہن...... یہ اب اقبال بھائی کو ڈھونڈنے کا خیال چھوڑ دے۔ بھلا تصدیق کر بھی لی تم نے تو کیا فائدہ اس تصدیق کا۔" زیتون اس وقت بڑی سمجھ دار لگ رہی تھی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو زیتون۔ لیکن میں بس ایک بار تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔ پتا ہے مجھے بھی ابا کی طرح لگنے لگا ہے کہ جیسے میں بھی اب بہت سارے دن زندہ نہیں رہوں گی، جیسے میرے اندر سے زندگی ہولے ہولے ختم ہو رہی ہے اور جیسے کسی روز اچانک موت کا فرشتہ اچک کر لے جائے گا اور میرا حامد اکیلا رہ جائے گا۔ اگر وہ زندہ ہوا تو اقبال بھائی سے کہوں گی کہ اس کے بیٹے کو اس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہے تو وعدہ کر زیتونی...... میرے بیٹے کا خیال اپنے بیٹے کی طرح ہی رکھے گی۔"

اس کی ملتجی نظریں زیتون کی طرف اٹھیں تو زیتون نے اسے ڈانٹا۔

"شام کے وقت منہ سے فضول باتیں نہ نکال...... کچھ نہیں ہوگا تجھے اپنے حامد کا خود ہی خیال رکھے گی۔"

"نہیں وعدہ کر زیتونی......!" اس کی ملتجی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

"اچھا وعدہ تیرے حامد کا خیال اپنے بچوں سے بڑھ کر کروں گی۔ وہ تو یوں بھی مجھے اپنے فضل سے کم پیارا نہیں ہے۔ اتنا من موہنا سا تو ہے۔ دشمن بھی دیکھ لے تو اس پر پیار آئے اور آج ہی صفدر سے بھی کہوں گی کہ اقبال کا پتا کروائے۔ بس اب تو نے کوئی فضول بات نہیں سوچنی۔ بڑی آئی پیرنی......"

”زیتون برتن اٹھا کر دھونے چلی گئی۔ ٹکیاں نعمت خانے میں رکھیں۔ صحن میں پڑے حمام کے پاس بیٹھ کر برتن دھوئے اور نعمت خانے کے اوپر پڑے ٹوکرے میں رکھے۔ زیب النساء اسی طرح بیٹھی گہری سوچ میں ڈوبی اسے دیکھتی رہی۔ برتن رکھ کر وہ اس کے پاس آئی۔

”اچھا سنو! میں اب چلتی ہوں۔ کل خود ہی آ کر صفدر کو اپنے اقبال بھائی کا حدود اربعہ بتا دینا۔ ادھر رحیم یار خان میں وہ ہے نا اس کا سنگی...... پہلے اسے خط لکھ کر پتا کروالیں گے اگر وہاں ہی ہوا اپنے گھر تو پھر ہم چل کر خود بات کرلیں گے اس اقبال کے بچے سے قرآن پر ہاتھ رکھ کر تصدیق کروالینا۔“

زیتون کا دل، خاموش اداس بیٹھی زیب النساء کے لیے دکھی ہوا۔

”ویسے یہ اقبال کیسے جانتا تھا اسے؟“ زیتون کو تجسس ہوا۔

”شکار کے لیے لے کر جاتا تھا لوگوں کو۔ اسے بھی وہ شکار کے لیے ہی لے کر جا رہا تھا اور بیمار ہونے پر استانی جی کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ اور ہاں زیتونی! آج صفدر بھائی سے بات ضرور کر لینا یاد سے۔“ ملتجی نظریں زیتون کی طرف اٹھیں۔

”میرے دل کو دیمک لگ گئی ہے زیتونی۔ کسی روز اچانک یہ دیمک زدہ دل بند ہو جائے گا۔ یقین کر میرا وہم سچ ہو جائے گا کسی روز اور میرے بعد میرا بیٹا میرا راجہ رل جائے گا۔“

”پھر وہی مغرب ویلے فضول باتیں۔“

زیتون نے اسے گھر کا اور برآمدے کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں مٹی کے تیل والا چولھا پڑا تھا۔ ماچس اٹھائی اور آنکڑے میں لٹکی لالٹین اتاری۔

”تیل ہے نا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے زیب النساء کی طرف دیکھا تو زیب النساء نے سر ہلا دیا۔

”پتا ہے نا ماسی جنتاں مغرب کی اذان ہوتے ہی لالٹین جلا دیتی تھیں اور تو نے ایسے ہی اندھیرے میں بیٹھے رہنا تھا حامد کے آنے تک۔ اندھیرا بس ہونے ہی والا ہے۔“

زیتون نے لالٹین جلا کر پھر لٹکا دی۔ پورے برآمدے میں مٹی کے تیل کی بو پھیل گئی تھی۔

''اور ہاں سن میں جب ادھر آ رہی تھی تو ماسی (اس کی ساس) تندور میں بالن ڈال رہی تھی۔ تیرے لیے بھی دو روٹیاں لگا دوں گی۔ اور میں نے آج آلو گوشت پکایا ہے۔ صفدر قصبہ سے بکرے کا گوشت لایا تھا۔ بڑا ہی سوادی بنا تھا۔ میں نے تیرے راجے کے لیے پلیٹ میں ڈال کر رکھ دیا تھا وہ بھی بھیج دوں گی اور اب زیادہ مت سوچنا۔ ہونا تو وہی ہے نا جو اللہ کو منظور ہوا۔'' وہ اسے تسلی دیتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ کچھ یاد کر کے مڑی۔

''ہاں وہ جو آپا جی صدیقہ ہیں نا انہوں نے گھر میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا ہے۔ ابھی سے دس بارہ لڑکیاں ہو گئی ہیں۔ میں بھی کل اپنی منی کو چھوڑ آئی تھی ادھر۔ میں نے تیرے لیے بھی بات کی تھی ان سے کہ تجھے بھی استانی رکھ لیں۔ پورے گاؤں میں بس آپا صدیقہ، باجی سعادت اور تم ہی پڑھی لکھی ہو اتنی۔''

گاؤں میں لڑکیوں کا الگ سے کوئی اسکول نہیں تھا۔ جو دو تین لڑکیاں پڑھنے کی شوقین ہوتیں، وہ لڑکوں کے اسکول میں ہی جاتی تھیں۔

''تمہارا دل بھی لگ جائے گا۔ شروع میں تو آپا صدیقہ کہہ رہی تھیں تنخواہ نہیں دیں گی۔ لڑکیوں کی فیس کے پیسوں سے اسکول کے لیے سامان خریدیں گی۔ بلیک بورڈ اور ڈیسک وغیرہ۔ بعد میں جب لڑکیاں زیادہ ہو جائیں گی تو تنخواہ بھی ملے گی۔ چار پیسے ہاتھ آ جائیں گے تو تیرے کام ہی آئیں گے۔ تم آپا صدیقہ کو جانتی ہو نا۔ ماسی جنتاں کے پاس آتی رہتی تھیں۔ کل لے جاؤں گی تمہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ماسی جنتاں کے بعد جب حامد اسکول چلا جاتا تھا تو وہ بور ہی ہوتی تھی۔ ماسی جنتاں کی تھوڑی، بہت زرعی زمین تھی، جس سے سال بھر کا اناج مل جاتا تھا۔ جو فالتو ہوتا وہ ماسی جنتاں اپنی زندگی میں بھی فروخت کر دیتی تھیں۔ اور ان کے بعد بھی وہ لوگ جنہیں ماسی نے اپنی زمین دے رکھی تھی اس کے حصے کی گندم اور پیسے وغیرہ دے جاتے تھے۔ ایمان دار اور اچھے لوگ تھے۔ جو فصل بھی اگاتے اس کا حصہ اسے مل جاتا تھا۔

ابا کی بچت اور ان کا ملنے والا پیسہ بھی تھا جو اسی طرح پڑا تھا۔ ماسی جنتاں نے کبھی اسے ایک پیسہ تک خرچ نہیں کرنے دیا تھا۔

''سنبھال کر رکھ۔ تیرے بچے کی تعلیم کے کام آئے گا۔''

اس دنیا میں ماسی جنتاں جیسے اچھے لوگ بھی تھے اور ماسی نور بھری جیسے بھی...... کتنی کوشش کی تھی ماسی نور بھری نے کہ وہ اپنا زیور وغیرہ ساتھ نہ لے کر جائے۔ بار بار سمجھاتی تھی۔

''سن زیب النساء! کوئی پیسہ دھیلا اور گہنا شہنا (زیور وغیرہ) ہے تو اسے ساتھ لے کر نہ جانا ادھر ہی رکھ جانا۔ راستے میں سو مسئلے ہو جاتے ہیں۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور پھر کون سا تو نے ساری عمر ادھر رہنا ہے۔ اللہ کرے گا تین چار ماہ تک اپنے چوہدری صاحب آ جائیں گے تو ان سب کو تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے۔ ساری بدمعاشی ختم ہو جائے گی۔''

اور وہ ہر بار کہتی۔

''ٹھیک ہے ماسی ادھر ہی سب پڑا ہے میں تو بس ضرورت کا کچھ اپنا اور کچھ حامد کا سامان لے کر جاؤں گی کہ پھر واپس اپنے گھر ہی آنا ہے۔''

یہ تو محض اتفاق ہی تھا کہ اس نے اپنے اس اٹیچی کیس میں جس میں اس کی بری کے کپڑے آئے تھے، اپنی ضرورت کی چیزیں اور کپڑے رکھتے ہوئے الماری میں سے ابا کا وہ چھوٹا سا سفری بیگ بھی رکھ لیا تھا، جس میں ابا کے ضروری کاغذات اور ان کے استعمال کی دوسری چیزیں ہوتی تھیں۔ ابا کا نکاح نامہ، ان کی تعلیمی اسناد، اس کی اپنی تعلیمی اسناد اور نکاح نامہ وغیرہ سب اس میں ہی تھے۔ زیور کے ڈبے تو ہمیشہ ابا کی الماری میں ہی رہتے تھے اور اب بھی وہاں ہی تھے۔ ابا کے جو واجبات ملے تھے وہ اس کے پاس ہی تھے۔ چھوٹے بچے کا ساتھ تھا، کیا خبر کب کیا ضرورت پڑ جائے۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی تھی۔ ابا کا سیاہ وسفید خانوں والا بڑا سا رومال اوپر ہی تہہ کیا ہوا پڑا تھا جو دادا کو ان کے کسی دوست نے حج سے آ کر دیا تھا اور ابا گرمیوں میں سر پر لپیٹ لیتے تھے دھوپ سے بچنے کے لیے......

ابا کے کچھ کاغذات وغیرہ، ان کی پرانی گھڑی، قلم، ایک کاپی، دادا کی جناح کیپ شاپر میں تہہ کی ہوئی پڑی تھی، اس نے اپنا ایگل کا پن، ایک دو کتابیں، ابا کی نئی گھڑی جو موت کے بعد ان کی کلائی سے اتار کر کسی نے اسے دی تھی، ان کے سادہ سے کف لنکس، حامد کے اپنے دور بڑے کے کھلونے بھی اس

میں رکھ لیے تھے۔ ماسی نور بھری کی حریص نظریں تو بار بار اٹیچی کیس کی طرف بھی اٹھتی تھیں۔

''لو بھلا اتنا بڑا سا بکسا ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آدھا تو خالی پڑا ہے۔ خوامخواہ کا بھار (بوجھ) اٹھا کر لے جا رہی ہو۔ یہ چھوٹا والا لے جاؤ ساتھ۔''

وہ جست کے بکس کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ لیکن اس نے ماسی نور بھری کی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ اور سوچ سوچ کر وہ چیزیں اس میں رکھتی رہی تھی جن کی اس کے خیال میں اگلے چند ماہ میں ضرورت ہو سکتی تھی۔

اب یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا کہ ابا نے کب زیور ڈبوں سے نکال کر ایک رومال میں باندھ کر اس بیگ میں رکھ دیا تھا۔

اس روز وہ اس بیگ کی ایک ایک چیز نکال کر دیکھ رہی تھی جب اس نے رومال اٹھایا تو نیچے زیورات کی پوٹلی اور ایک رومال میں بندھے بیس ہزار روپے تھے۔ شاید ان کی بچت۔ وہ ابا کے رومال کو کتنی دیر تک چہرے پر رکھے ان کی خوشبو کو محسوس کرتی رہی تھی۔ اور پھر اسی طرح سب چیزیں بیگ میں رکھ کر اٹیچی کیس میں رکھ دی تھیں۔ یوں یہ زیور ماسی نور بھری کی دسترس میں جانے سے بچ گیا تھا۔

''یہ کس سوچ میں پڑ گئی ہے۔ اٹھ آ کر دروازے کی کنڈی لگا لے۔ حامد تو اب مغرب پڑھ کر ہی آئے گا۔''

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ زیتون صحن کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن کے دروازے تک آئی۔

''سن! حامد سے کہنا نماز پڑھ کر سیدھا گھر آئے۔ اس وقت اکیلے دل بہت گھبراتا ہے۔''

''اچھا!'' زیتون سر ہلاتی ہوئی صحن کا دروازہ کھول کر چلی گئی تو وہ کنڈی لگا کر واپس تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔

''تو میرے شاہ...... میرے دل کے مکین! اب تو لوٹ آؤ کہ تھکنے لگی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں مانتا کہ تم نے بے وفائی کی اور صرف وقت گزارا۔

وہ تمہاری وارفتگی، وہ والہانہ انداز...... وہ لفظ جو تمہارے لبوں سے ادا ہوتے تھے۔ وہ سارے لفظ میرے دل کی کتاب پر کبھی نہ مٹنے کے لیے کھدے ہوئے ہیں۔ گو وہ بہت تھوڑے ہیں میرے شہزادے...... پر میں ان لفظوں کے سہارے پوری زندگی گزار دوں گی۔ بس ایک بار صرف ایک بار آ کر کہہ دو کہ تم نے بے وفائی نہیں کی۔"

وہ دل ہی دل میں لفظ ترتیب دے رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد یہ لفظ کاغذ پر منتقل ہو جانے تھے۔ وہ جب سے ماسی جنتاں کے گھر آئی تھی، اسے خط لکھنے لگی تھی۔ خط جو کبھی سپرد ڈاک نہیں کیے گئے تھے، نہ کبھی آئندہ ایسا ہونا تھا۔ پھر بھی جب وہ اس کی یاد سے مغلوب ہو جاتی تو اسے خط لکھتی تھی۔

"پتا نہیں تمہاری نظروں سے میری کوئی تحریر گزرے گی بھی یا نہیں، اگر گزرے تو پتا نہیں تم کیا سوچو گے۔ شاید تمہیں دکھ ہو، شاید تم پچھتاؤ۔"

اس نے پاس پڑے حامد کے بستے سے رجسٹر نکالا اور اس میں سے ایک ورق نکالا۔ لیکن حامد نے تو ابھی کچھ دن پہلے ہی ہولڈر سے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ سیاہی کی دوات میں ہولڈر کی نب ڈبو کر لکھتا تھا۔ اس کے پاس اردو کی کاپی پر خوش خط لکھنے کے لیے زیڈ کی نب تھی اور باقی کاپیوں کے لیے وہ آئی کی نب استعمال کرتا تھا لیکن وہ ان دونوں نبوں سے نہیں لکھ سکتی تھی۔

وہ اٹھی اور کمرے میں آ کر الماری سے اپنا ایگل کا قلم نکالا اور باہر آ گئی کہ کمرے میں اندھیرا تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہوئے رجسٹر کو گود میں رکھ کر اس نے دیوار سے ٹیک لگالی اور رجسٹر میں سے نکالا ہوا ورق بند رجسٹر پر رکھا۔

"میرے شہزادے...... میرے شاہ دل! اس وقت جی چاہ رہا ہے دھاڑیں مار مار کر روؤں...... جب کوئی کہتا ہے تم بے وفا تھے، کھلاڑی تھے۔ میرے دل سے کھلواڑ کر کے چلے گئے تو میرا دل کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے اور اس سے خون رسنے لگتا ہے۔ تم کہیں سے آ جاؤ میرے شاہ اور میرے یقین پر مہر لگا دو کہ تم ایسے نہیں ہو۔ ایسے نہیں تھے میرے بادشاہ میرے ہمدم۔ پتا نہیں تم کہاں ہو۔ ہو بھی یا نہیں۔ میں نہیں جانتی تم میرے یہ خط کبھی پڑھو گے بھی یا نہیں لیکن پھر بھی میں لکھتی رہتی ہوں اپنے ہر پل کا احوال کہ

تمہارے بعد تمہاری رانی پر کیا گزری۔ کیسے اس نے تمہارا انتظار کیا۔ اذیت کے کیسے کیسے بھالے اس کی رگوں میں اتارے گئے شاید تم کبھی لوٹ کر آؤ اور وہ سب جان سکو جو مجھ پر گزرا۔ ابا تھے تو حوصلہ بڑھاتے تھے امید دلاتے تھے۔ میری طرف آنے والے تیروں کو اپنے کمزور سینے پر لیتے تھے۔

پتا ہے میرے ہم سفر! ابا کے بعد زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ ماسی نور بھری کہتی تھی لوگ ایسی لڑکیوں کو جن کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو، مفت کا مال سمجھ لیتے ہیں۔ وہ کہتی تھی اس نے خود سنا زمین داروں کے لفنگے لڑکوں کو کہتے کہ نکاح کا ڈرامہ رچا کر ایک شہری لڑکے کا دل بہلایا تو ہمارا حق زیادہ بنتا ہے۔ ابا تھے تو کسی کو جرأت نہ تھی ایسی بات کرنے کی اور تم نے تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی کہ وہ جس کو ایک مقدس بندھن میں باندھ کر چلے گئے ہو وہ کس حال میں ہے۔ اور تنہا بھی نہیں، تمہاری نشانی ایک ننھی سی جان بھی ہے اس کے ساتھ...... میں تمہیں کہاں سے ڈھونڈوں میرے ہم سفر...... شاید تم ساری قسمیں سارے وعدے بھول گئے ہو۔ تم نے تو زیست کے آخری لمحے تک ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ تمہیں اتنا تو یاد ہوگا ناشہزادے کہ اللہ کو حاظر ناظر جان کر کسی کو شریک زندگی کیا تھا۔ میرے شریک حیات! میں وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی جہاں تم مجھے بیاہنے آئے تھے۔ سب کہتے تھے گاؤں میں ایسا دولہا ایسی بارات کبھی نہیں آئی تھی۔ شاید مجھے نظر ہی لگ گئی کسی کی تو میں کہہ رہی تھی کہ مجھے تو وہاں ہی رہنا تھا۔

اسی گھر میں کہ شاید تم اچانک کسی روز آ جاؤ۔ اس سب کو غلط ثابت کر دو جو لوگ کہتے تھے بے چاری زیب النساء اتنی کم عمری میں بیوہ ہو گئی۔ میں تو ایسے ہی جھوٹے خوابوں کے ساتھ آخری سانس تک اپنے ابا کے گھر کی دہلیز پر بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہتی لیکن ماسی نور بھری کہتی تھی۔

یہ گھر تمہارے جانے کے بعد بھاگ تھوڑا ہی جائے گا۔ میں دیکھ بھال کرتی رہوں گی بس جب حالات ٹھیک ہوں گے آ جانا اور اگر تمہارے راجے کا باپ جیسا کہ تیرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے آ گیا تو پھر بھلا کس کی مجال ہوگی کہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ حالانکہ پہلے جب میں کہتی تھی دیکھنا ماسی بھری ایک روز وہ آ جائے گا مجھے لینے۔ مجھے یقین ہے وہ زندہ ہے تو وہ منہ نیچے کر کے مسکراتی تھی اور میری طرف ایسے دیکھتی جیسے میں پاگل یا جھلی ہوں لیکن اب وہ خود ہی مجھے تمہارے جینے کی امید تھما رہی

تھی اور میں دل ہی دل میں ہنستی تھی کہ وہ اگر آ گیا تو پھر بھلا وہ مجھے یہاں رہنے ہی کیوں دے گا اپنے ساتھ ہی لے جائے گا۔ تم بھی کہو گے راجہ کون۔ راجہ ہمارا بیٹا۔ ہمارا شہزادہ...... ابا نے تو اس کا نام حامد رکھا تھا پر میں نے تو اس کے کئی نام رکھ چھوڑے تھے۔ کبھی راجہ کہتی ہوں۔ یاد ہے نا میں نے جب تمہیں شہزادہ سلیم کہا تھا تو تم کتنا ہنسے تھے۔ پتا نہیں ایک ہی بات کتنی بار لکھ جاتی ہوں۔ شاید میں نے تمہیں پہلے کسی خط میں لکھا تھا کہ ماسی نور بھری نے مجھے ماسی جنتاں کے پاس بھجوا دیا تھا۔

تین بسیں بدل کر ہم یہاں پہنچے تھے۔ میری دادی کا یہ میکہ گاؤں ہمارے گاؤں سے بہت دور تھا۔ میں اکیلی تو کبھی بھی نہ آ سکتی۔ یہاں آ کر مجھے لگتا تھا میں محفوظ ہو گئی ہوں۔ اب راتوں کو خوف سے جاگتی نہیں رہتی تھی۔ نہ ہی گہری نیند میں ڈر کر اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ماسی جنتاں بہت خیال رکھتی تھی میرا اور ہمارے شہزادے کے تو بہت لاڈ اٹھاتی تھی۔ نہلاتی دھلاتی۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی اور گود میں اٹھائے پھرتی۔

وہ جو ابا کے بعد بہت چڑچڑا ہو گیا تھا، ماسی جنتاں کا پیار پا کر پہلے جیسا ہو گیا تھا ہر وقت نانو نانو کرتا اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ یہ ہم سے پیار کرنے والے اتنی جلدی جدا کیوں ہو جاتے ہیں شہزادے؟"

لکھتے لکھتے وہ جیسے تھک سی گئی تھی۔

"اچھا میرے شاہ دل! اب بس کرتی ہوں۔ تم بھی کہو گے کیسی بے ربط باتیں کرتی ہے یہ زیب النساء بھی۔ پر کیا کروں پرانی اور ابھی کی باتیں سب گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ مجھے تو تمہیں یہ بتانا تھا کہ آج ہمارے شہزادے نے تیسری جماعت کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ بہت لائق ہے تمہاری طرح ہی اور پتا ہے اس کی آنکھیں، اس کی ناک اور پیشانی بالکل تمہارے جیسی ہے۔

اور کیا لکھوں میرے ہم سفر! اب تو تمہارے آنے کی امید بھی مرتی جا رہی ہے۔ لیکن میں اس امید کو مرنے نہیں دینا چاہتی۔ فاطمہ آپا کا لکھا وہ جملہ میری امید کے بجھتے ہوئے دیے میں تیل کا کام دیتا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا۔ میرا دل کہتا ہے، وہ وہی تھا۔ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا زیب!

اور جب میں فاطمہ آپا کے اس خط کے متعلق سوچتی ہوں تو امید کے دیے کی بجھتی لو پھر سے

بھڑک اٹھتی ہے۔ اور اس لو کو بجھنے نہیں دینا میں نے اب اپنے لیے نہیں، اپنے شہزادے کے لیے۔ میں چاہتی ہوں یہ امید زندہ رہے اور ایک دن تم لوٹ آؤ۔ پہلے میں اپنے لیے روتی تھی، اپنے لیے تمہارے لوٹ آنے کی دعا کرتی تھی لیکن اب اپنے شہزادے کے لیے دعا کرتی ہوں کہ بس ایک بار تم آ جاؤ میرے ہم دم تو تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دوں کہ میرے بعد میرا شہزادہ رُل جائے گا میرے بادشاہ، میرے اجنبی! تمہیں کیا کہوں کہ میرے اندر سے زندگی ہولے ہولے مرتی جا رہی ہے۔ تو میرے اجنبی آ جاؤ...... میرے لیے نہیں اپنے شہزادے کے لیے۔

تم بھی کیا کہو گے کہ یہ آج زیب النساء نے تمہارے لیے نیا خطاب ڈھونڈ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم تو کبھی ایک دن بھی مجھے اجنبی نہیں لگے۔ تم تو روز اول سے ہی اپنے لگے تھے جیسے برسوں کا ناتا ہو۔ یہ تو بس یوں ہی لفظ زبان پر آ گیا۔ دراصل کل رجبہ دال لے کر آیا تو دال ڈبے میں ڈالتے ہوئے میں نے عادتاً اخبار سے بنے ہوئے لفافے کو کھولا اور پڑھنے لگی وہاں ایک نظم لکھی تھی۔ مجھے حسب حال لگی ایک دو مصرعے ذہن میں رہ گئے۔ اب تو دماغ بھی کام نہیں کرتا پہلے تو اقبال اور فیض کی نہ جانے کتنی ہی نظمیں غزلیں زبانی یاد تھیں۔ لیکن اب تو بس یہ دو تین لائنیں ہی ذہن میں رہ گئی ہیں۔

اے میرے اجنبی!

ہجر راتوں کے دکھ اوڑھ کر

میں غنی ہو گئی ہوں

اور اب میری خواہش کے کاسے میں

ایک پل کی طلب بھی نہیں ہے

(نگہت سیما)

تو بس اے میرے اجنبی ہمسفر میں بھی ہجر راتوں کے دکھ اوڑھ کر غنی ہو گئی ہوں۔ لیکن صرف اپنے لیے۔ اپنے شہزادے کے لیے نہیں۔ اپنے لیے میں نے تمہیں معاف کیا اپنے شہزادے کے لیے کیسے غنی ہو جاؤں۔ کیسے تمہارے آنے کی دعا نہ کروں کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے اس کی آنکھیں تمہارے

متعلق سوال کرتی ہیں۔ تو لوٹ آؤ میرے ہمدم...... اپنے شہزادے بیٹے کے لیے......

تمہاری رانی، تمہاری زیب النساء!''

اس نے قلم بند کیا۔ کاغذ تہہ کر کے اٹھی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ کھلے دروازے سے برآمدے میں لٹکے لالٹین کی مدھم روشنی نے کمرے کے اندھیرے کو کم کر دیا تھا۔ لکڑی کی دیوار گیر الماری کھولی، کپڑے کا ایک تھیلا نکالا جس میں ایک بھورا لفافہ تھا، جس میں اس کی اسناد اور نکاح نامے کی کاپی تھی اور موم جامے میں لپٹے رجسٹر اور کاپی سے نکالے گئے تہہ کیے ہوئے کچھ کاغذات تھے، اس نے یہ تہہ کیا ہوا کاغذ بھی ان اوراق کے ساتھ رکھ کر تھیلا الماری میں رکھا، تالا لگایا اور چابی اپنی چارپائی پر گدے کے نیچے رکھی۔ طاق میں پڑی لالٹین اٹھائی اور باہر آ کر تخت پر بیٹھ گئی تاکہ اسے جلا کر کمرے میں رکھ دے۔ لیکن پھر سوچا پہلے اس کا شیشہ صاف کر دے۔ تھوڑا میلا ہو رہا تھا تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر کنڈی کھولی۔ حامد تھا اور اس کے ساتھ فضل بھی جو اسے دروازے تک چھوڑ کر وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ اس نے حامد کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی دیر لگا دی، میرا دل گھبرا رہا تھا۔''

''مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔ قاری صاحب کہتے ہیں کہ جماعت کی نماز افضل ہے پھر فضل کے ساتھ ہی اس کے گھر گیا، خالہ نے کہا تھا ادھر سے ہو کر گھر جانا۔ پھر خود ہی کہہ دیا تمہاری اماں کا دل گھبرائے گا۔ تم چلے جاؤ فضل کے ساتھ...... روٹی بھجوا دوں گی۔''

''مغرب کی نماز!'' وہ چونکی۔ یہ کیا ہوا تھا۔ اس نے نماز قضا کر دی تھی۔ کیسے بے وقت خط لکھنے بیٹھ گئی تھی کہ پھر ہوش ہی نہ رہا۔ ایسا ہی تو ہوتا تھا خط لکھنے بیٹھتی تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

وہ افسردہ سی تخت پر آ کر بیٹھ گئی اور تخت پر پڑا رجسٹر اٹھا کر حامد کے بستر میں رکھا اور حامد کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور خاموش سا لگ رہا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

''ادھر بیٹھ جاؤ حامد! کھڑے کیوں ہو؟'' وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ زیب النساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوما۔

''کیا بات ہے میرے شہزادے...... اتنے چپ چپ کیوں ہو؟ آج تو تم اپنی جماعت میں فرسٹ آئے ہو۔ ماسٹر صاحب نے تمہاری تعریف کی ہے۔ پھر بھی خوش نہیں نظر آ رہے۔ فضل کو دیکھا کتنا خوش ہے۔''

''اماں! ایک بات پوچھوں؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا تھا۔

''میرے ابا کی قبر کہاں ہے؟ ہم ان کی قبر پر کیوں نہیں جاتے۔ وہ صابر ہے نا، ظفری کی پھوپھی کا بیٹا، روز اپنے چاچا کے ساتھ اپنے ابا کی قبر پر جاتا ہے۔''

''نہ...... نہ ایسا نہ کہہ شہزادے...... اللہ تیرے ابا کو لمبی حیاتی دے۔ میری عمر بھی اسے لگ جائے۔'' وہ پوری جان سے لرز گئی تھی۔ حامد نے شاید خود ہی فرض کر لیا تھا کہ اس کے ابا نہیں ہیں تو وہ فوت ہو چکے ہوں گے۔

''وہ زندہ ہیں تو پھر ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟'' آج حامد کے پاس بہت سے سوال تھے کرنے کو۔

''وہ کہیں کھو گئے ہیں شہزادے، میری جان!''

''کیا جو کھو جاتے ہیں وہ کبھی نہیں ملتے اماں؟''

''کبھی کبھی نہیں ملتے اور کبھی مل جاتے ہیں۔ تم دعا کیا کرو نا کہ وہ مل جائیں۔''

''اچھا میں دعا کروں گا اماں! اللہ میری دعا سنے گا۔'' اس کی آنکھیں پر امید ہوئی تھیں۔

''کیوں نہیں میری جان!'' زیب النساء نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''اللہ اپنے بندوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔''

''اللہ نے آپ کی دعا کیوں نہیں سنی اماں؟ کیا آپ نے ابا کے ملنے کی دعا نہیں کی تھی۔''

''کی تھی، بہت دعائیں کیں...... لیکن شاید میری دعا میں اثر نہیں تھا۔ اب تم کرو گے دعا تو دیکھنا اللہ تمہاری دعا ضرور سنے گا۔''

''اچھا میں روز دعا کروں گا۔ ہر نماز کے بعد۔''

اس کے چہرے پر بکھری جامد چپ ٹوٹ گئی تھی۔اور آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی تھی۔

''اماں! وہ کہاں گم ہوئے تھے؟ کیا ہم انہیں وہاں ڈھونڈنے نہیں جاسکتے۔''

''وہ لاہور میں گم ہوئے تھے میری جان اور وہ اتنا بڑا شہر ہے کہ ہم تو خود وہاں گم ہوجائیں گے۔''

''ہاں ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے لاہور کے متعلق وہاں علامہ اقبال کا مزار ہے نا اور شاہی مسجد بھی۔'' وہ ذرا سا پرجوش ہوا تھا۔

''ہاں......!''

''اماں! ابا وہاں کیسے گم ہوگئے تھے؟ وہ کوئی چھوٹے بچے تو نہیں تھے نا۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے پھر پوچھا تھا۔

''ہاں چھوٹے بچے تو نہیں تھے پر گم ہوگئے وہ......'' زیب النساء اب اس کے سوالوں سے پریشان ہورہی تھی۔

''ابا گم ہوگئے تھے آپ کو ان کا پتا نہیں تھا لیکن ان کو تو نانا کا گھر پتا تھا نا...... وہ خود وہاں کیوں نہیں آگئے؟''

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''فضل ہوگا۔روٹی اور سالن لایا ہوگا۔''

زیب النساء نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ اس کے سوال کا جواب دینے سے بچ گئی ہے۔

حامد اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔فضل ہی تھا۔تندور کی روٹیاں اور آلو گوشت کا سالن لایا تھا۔

''پہلے جلدی سے کھانا کھالو، باقی باتیں پھر......'' زیب النساء نے چنگیر میں روٹیاں رکھیں۔اور حامد کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

حامد ہاتھ دھونے چلا گیا تو زیب النساء سوچنے لگی کہ کیا وہ اس کے سوالوں کا جواب دے سکے گی اور کیا وہ اسے مطمئن کرسکے گی، لیکن اس کے پاس خود اس سوال کا جواب نہ تھا۔

☆......☆......☆

''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

وجدان احمد نے گاڑی ذکی دروازے کی طرف لے جانے کے بجائے کیفے ذوق والی سڑک پہ ڈالی تو سمیرا چونکی۔ ''ہمیں تو آزین کے گھر جانا تھا۔ وہاں پر آج......''

''ہاں......!'' وجدان احمد نے اس کی بات کاٹی۔ ''ہمیں ادھر ہی جانا ہے لیکن پہلے مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''لیکن ہم تو پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔ ثوبیہ اور مرسل تو کب کے گھر سے نکل چکے ہیں۔ میری گاڑی ورکشاپ میں تھی اس لیے میں نے ثوبیہ سے کہا کہ وہ مرسل کے ساتھ چلی جائے۔ میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

جب بھی آزین کے ہاں جانا ہوتا تو وہ ثوبیہ کو پک کر کے ساتھ لے جاتی تھی۔

''کیا ہم راستے میں بات نہیں کر سکتے تھے؟''

''نہیں! میں کہیں سکون سے بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہاں کون سی سرکاری میٹنگ چل رہی ہے کہ دیر سویر سے فرق پڑے گا۔'' وجدان احمد بے حد سنجیدہ سا تھا۔

''اگر شادی کی بات کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ جب تک میری بہن (حمیرا) کی شادی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا میں گھر میں اپنی شادی کی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے اپنی بڑی بہن حمیرا کی بات کی۔

''جانتا ہوں۔'' وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے کچھ اور بات کرنی ہے۔''

''کچھ اور بات کیا؟'' وہ سمیرا کو آج سے پہلے اتنا سنجیدہ کبھی نہیں لگا تھا۔ ''کیا ابھی کرنا بہت ضروری ہے؟''

''ہاں!'' وجدان احمد نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ بے حد بے چین اور مضطرب سی ہو گئی تھی۔

''وہاں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ سب اپنا اپنا حصہ کارِ خیر میں ڈال کر ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو

جاتے ہیں۔ جو بعد میں آئے وہ بعد میں ڈال دیتا ہے۔''

وجدان احمد نے گاڑی کیفے کی پارکنگ میں کھڑی کی۔ اور اسے اترنے کا اشارہ کیا۔

''لیکن میرا اس وقت کافی پینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پھر بی اماں کے ہاتھ کی چائے اور پکوڑوں کے سامنے بھلا اس کیفے کی کافی اور پیسٹریاں کیا ہیں۔ میں نے بی بی اماں سے فرمائش کی تھی کہ وہ اگلی بار اپنے آلوؤں والے پکوڑے ضرور بنائیں۔ ایسے مزے دار پکوڑے میں نے کبھی نہیں کھائے۔''

یہ کیفے اپنی کافی اور انواع واقسام کی پیسٹریوں کے لیے بہت مشہور تھا۔

''او کے تم مت پینا کافی!'' وجدان احمد نے ایک نظر اسے دیکھا اور کیفے کے دروازے کو کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اندر کافی اور چاکلیٹ کی مہک تھی۔ ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ایک کونے والی میز کی طرف اشارہ کر کے اسے وہاں بیٹھنے کے لیے کہہ کر خود کاؤنٹر کی طرف بڑھا کہ یہاں اپنا آرڈر خود کاؤنٹر پر جا کر دینا پڑتا تھا۔ ایک کافی اور ایک چاکلیٹ پیسٹری کا آرڈر دے کر وہ اپنی ٹیبل پر آیا تو وہ کچھ الجھی الجھی سی بیٹھی تھی۔

''اب بتا بھی دو وجو......!'' اس کے بیٹھتے ہی سمیرا نے بے چینی سے کہا۔

وجدان کچھ دیر خاموشی سے اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اسے جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''کیا کوئی لڑکی پسند کر لی ہے تمہاری اماں نے یا تم کسی سے محبت کر بیٹھے ہو۔ اگر ایسی بات ہے تو کچھ بتانے سے پہلے سن لو کہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں کیا کروں گی۔ پہلے تو اس لڑکی کو گولی ماروں گی۔ پھر خود کو مارلوں گی۔'' سمیرا کے مزاج میں ٹھہراؤ اور صبر تو بالکل بھی نہیں تھا۔

تب ہی ویٹر نے جھاگ اڑاتی کافی کا کپ اور ایک تشتری میں ایک چاکلیٹ پیسٹری لا کر رکھی۔ تشتری میں ہی ایک چھوٹی سی نفیس سی چھری اور کانٹا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر وجدان احمد نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

''تمہاری فیورٹ پیسٹری......!''

''مارے تجسس کے میرا ہارٹ فیل ہونے والا ہے۔'' سمیرا نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر کانٹے میں پھنسایا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں سمیرا، کہ یہ سب کیا ہے۔ اور تم کیا کر رہی ہو؟''

''کیا مطلب، کیا کر رہی ہوں میں؟'' منہ کی طرف جاتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

''کیا تم نہیں جانتیں کہ تم کیا کر رہی ہو؟'' وجدان نے کپ اٹھایا۔

''نہیں، تم وضاحت کرو، تمہارا اشارہ کس طرف ہے کیونکہ میں بیک وقت کئی محاذوں پر کام کر رہی ہوں۔'' اس نے پیسٹری کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

''تم آزین اور زل کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر رہی ہو۔ لیکن کیوں ایسا کر رہی ہو، میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے ایک گھونٹ بھرا لیکن نگاہیں سمیرا کے چہرے پر تھیں۔

''اگر میں نہ بتانا چاہوں تو؟'' سمیرا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''تو ٹھیک ہے اگر تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے تو میں اب تمہارے اس کھیل کا حصہ نہیں بنوں گا۔'' وجدان احمد کا انداز حتمی تھا۔

''تم نے کہا تھا تم میرا ساتھ دو گے اور مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔'' اس نے کانٹے میں ایک اور ٹکڑا پھنسایا۔

''ہاں میں نے کہا تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ یہ ایک چھوٹا سا ایڈونچر ہے۔ جس میں مجھے ایک معمولی سا کردار ادا کرنا ہے۔ لیکن سمیرا شاہ! یہ ایک ایڈونچر یا prank (مذاق) نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں ہر جگہ تمہارے ساتھ کھڑا ہوں لیکن تم یہ کیوں کر رہی ہو یہ جاننا میرا حق ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں کہ میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ مجھے آج تم سے پوچھنا ہے، جاننا ہے کہ تم یہ سب کیوں کر رہی ہو۔ یہ تو واضح ہے کہ تم زل اور آزین کے رشتے کو خراب کرنا چاہتی ہو۔ لیکن کیوں؟ شروع میں تو مجھے لگا تھا کہ تم کوئی پرینک کر رہی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ تم بہت سوچ سمجھ کر اپنا کھیل کھیل رہی ہو اور مجھے مہرے کے طور پر استعمال کر رہی ہو۔''

وہ وجدان احمد تھا جس کی نظر گہری اور مشاہدہ بہت اچھا تھا۔ سمیرا اسے بہت دیر تک بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔

''او کے، میں تسلیم کرتی ہوں میں بہت سوچ سمجھ کر یہ کھیل کھیل رہی ہوں لیکن کیوں اس کا جواب تمہیں جلد ہی دے دوں گی لیکن آج نہیں۔'' اس نے منہ کی طرف لے جاتا کانٹا واپس تشتری میں رکھ دیا۔

''او کے تو پھر میں بھی تمہارے اس کھیل میں شامل نہیں ہوں گا۔''

وہ سمیرا سے محبت کرتا تھا لیکن وہ ایک کھرا اور سچا انسان تھا۔ کسی کو دھوکا دینا اور کسی پر ظلم و زیادتی کرنا اس کا مسلک نہیں تھا۔

''میں کچھ غلط نہیں کر رہی۔ پلیز! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو وجو۔'' سمیرا کی ملتجی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

''تم صحیح بھی نہیں کر رہی ہو سمیرا۔ تم نے دو سادہ اور مخلص محبت کرنے والوں کے درمیان غلط فہمی کا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ اور کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ آزین کا نکاح زل سے ہو چکا ہے۔''

وہ گھونٹ گھونٹ کافی پیتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور پھر بھی تم......'' وجدان احمد کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ ''کیا تم نہیں جانتیں سمیرا، کہ دو محبت کرنے والے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ شیطان کا کام ہے۔''

''وہ میاں بیوی نہیں ہیں۔'' سمیرا نے بودا سا جواز پیش کیا۔

''ان کا نکاح ہو چکا ہے۔ بے شک رخصتی نہیں ہوئی لیکن رشتہ میاں بیوی کا ہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری ان کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ تم تو انہیں جانتی بھی نہیں تھیں سمیرا! پہلی بار ثوبیہ کے ساتھ تم ان کے ہاں گئی تھیں اور اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اتنے کم عرصے میں آخر ایسا کیا ہوا کہ تم انہیں جدا کرنا چاہتی ہو۔ اگر کسی نے تمہیں ہرٹ کیا ہے تو پلیز انہیں معاف کر دو۔ کچھ ایسا مت کرو جس پر بعد میں پچھتاؤ۔ اگر یہ مذاق ہے کوئی تو اسے یہاں ہی ختم کر دو۔''

وجدان احمد کو گمان گزرا کہ شاید اپنی کسی بات سے زمل یا آزین نے اس کی انا کو ہرٹ کیا ہو اور سمیرا اس کا بدلہ لے رہی ہو۔ وہ ایسی ہی تھی کسی معمولی بات پر ہائپر ہو جانا۔ کسی نے اگر اسے کوئی تکلیف پہنچائی ہو تو اسے معاف نہ کرنا جب تک بدلہ نہ لے لینا۔ لیکن اس نے اسے اس کی خامیوں کمزوریوں سمیت محبت کی تھی۔ تاہم وہ اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرے، درگزر کرنا اور معاف کرنا سیکھے کہ یہ اللہ کو بھی پسند ہے۔

''او کے، کر دیا معاف۔ ختم کر دیا مذاق۔'' سمیرا مسکرائی لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ پراسراری چمک تھی۔

''سمو! میں سنجیدہ ہوں۔'' وجدان احمد کو لگا جیسے وہ یوں ہی ٹالنے کو کہہ رہی ہے۔

''اور میں بھی تو سنجیدگی سے ہی کہہ رہی ہوں کہ بس اب یہ مذاق ختم۔ آج کے بعد تم سے ایسا کچھ نہیں کہوں گی پرامس۔''

وجدان احمد کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ گہری اندر تک اترتی نظریں......

سمیرا نے فوراً ہی نگاہیں جھکا لیں کہ کہیں وہ اس کے اندر کا حال نہ جان لے اور جو کچھ اس کے اندر چل رہا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ وجدان احمد کو اس کا ذرا سا بھی اندازہ ہو۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ خود سب کچھ اسے بتا دے گی۔ بے شک وہ تب بھی اس سے ناراض اور خفا ہوگا لیکن وہ اسے منا لے گی۔ جانتی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اس سے ناراض نہیں رہ سکتا۔

ایک گہری سانس لے کر وجدان احمد نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور پیسٹری کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تمہاری پسندیدہ ہے۔''

''ہاں لیکن میں نے کھانا دیر سے کھایا تھا، اس لیے اس وقت کچھ بھی کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔''

وہ اندر سے کچھ پریشان ہو گئی تھی ورنہ ایسی بھی بات نہ تھی کہ وہ ایک چھوٹی سی پیسٹری بھی نہ کھا سکتی اور وہ بھی اپنی پسندیدہ۔

''او کے تو پھر چلتے ہیں۔''

وہ اٹھا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کیفے کے اصولوں کے مطابق اس نے کاؤنٹر پر ادائیگی کی اور سمیرا کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کیفے سے باہر آیا۔ اور پھر ڈی دروازے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ سمیرا نے دو تین بار کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تمہارا موڈ خراب کیوں ہے؟'' قریبی مارکیٹ کی پارکنگ میں جب وہ گاڑی پارک کر کے موروں والی حویلی کی طرف جا رہے تھے تو سمیرا نے پوچھا۔

''نہیں تو...... بھلا خراب کیوں ہوگا؟'' اس کی سوالیہ نظریں سمیرا کی طرف اٹھیں۔

''بس ایسے ہی اتنے چپ چپ اور خاموش سے ہو تو...... پھر کیا ناراض ہو؟''

''نہیں......!'' اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''میرا یقین کرو وجدان! میں نے کہا ہے نا، اب ایسا کچھ نہیں ہوگا تو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے یقین دلایا۔

''اوکے!'' وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن سمیرا کو اس کی مسکراہٹ ہمیشہ جیسی نہیں لگی بلکہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔

''تم جانتے ہو نا وجو...... میں تمہاری ناراضی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کہا تو ہے یار! نہیں ہوں ناراض۔ لیکن سمو! میری ایک بات یاد رکھنا۔ ہم نے آج جو بونا ہے وہی کاٹنا ہے کل۔ ایسا نہ ہو کہ آج کا بویا کل ہمیں ہاتھ ملنے اور رونے پر مجبور کر دے۔''

وہ اب موروں والی حویلی کے اونچے گیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ سمیرا کا دل اندر ہی اندر لرزا اور اس نے بے آواز اپنے لیے دعا کی۔ اور دھیان بٹانے کے لیے گیٹ کے اطراف موروں والی ٹائلوں کی طرف اشارہ کیا۔

''میں سوچ رہی ہوں زل سے کہوں گی کہ کسی آرٹسٹ سے کہہ کر ان آدھے ادھورے ٹوٹے پھوٹے موروں کو مکمل کروا دے۔''

وجدان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور بھاری دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ ڈیوڑھی میں شیخو بابا اپنی مخصوص چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''ارے ارے بیٹھیں شیخو بابا! اس طرح کھڑے ہو کر شرمندہ نہ کیا کریں۔'' وجدان احمد نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ مدھم سا مسکرائے۔

''کیا پڑھا جا رہا ہے؟'' وجدان کا ہاتھ ان کے بازو پر ہی تھا۔

''مغلوں کی تاریخ ہے بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک۔ شاہ بابا نے دی ہے پڑھنے کے لیے۔'' انہوں نے کتاب کا سرورق وجدان احمد کو دکھایا۔

''آپ خود بھی تو کوئی مغل شہزادے ہی لگتے ہیں جیسے کسی تاریخ کی کتاب سے نکل کر ہماری دنیا میں آ گئے ہوں۔'' وجدان احمد نے ایک گہری نظر ان پر ڈالتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے بازو سے ہٹایا۔

''آپ نے آج جاب پر نہیں جانا تھا کیا؟''

''آج اتوار ہے بھائی!'' شیخو بابا نگاہیں جھکائے کھڑے تھے۔

''اوہ ہاں! خیال ہی نہیں رہا کہ آج سنڈے (اتوار) ہے۔'' وجدان احمد انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''تو پھر آپ مطالعے سے لطف اٹھائیں۔ پھر کسی روز فرصت سے بیٹھ کر آپ سے گپ شپ لگائیں گے۔ کچھ آپ کے متعلق جانیں گے کچھ اپنے متعلق آپ کو بتائیں گے۔''

شیخو بابا سے بات کر کے وجدان کا موڈ اچھا خاصا خوش گوار ہو گیا تھا۔ سمیرا نے اطمینان بھرا سانس لیا اور شیخو بابا سے پوچھا۔

''کیا سب لوگ آ گئے ہیں شیخو بابا؟''

''جی کافی دیر سے آئے ہوئے ہیں سب۔'' شیخو بابا نے جھکی نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

سمیرا نے وجدان کی طرف دیکھا۔

''اب آ جائیں وجدان۔''

''اوکے شینخو بابا!'' وجدان احمد ایک مسکراتی نظر اس پر ڈال کر سمیرا کے پیچھے ہی دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوا۔

گو نومبر کا آغاز تھا اور اکتوبر کے آخری ہفتے سے ہی راتوں کو ہلکی خنکی ہو جاتی تھی لیکن آج اس وقت موسم خوش گوار تھا اور سب لوگ باہر ہی بیٹھے تھے۔ ثوبیہ اور سحرش برآمدے میں تخت پر بیٹھی تھیں جبکہ باقی سب صحن میں تھے۔ سب کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور درمیان میں پڑی گول میز پر پکوڑوں کی ڈش تھی۔ ساتھ میں سبز مرچوں دھنیے اور پودینے کی چٹنی کا پیالہ تھا اور کوارٹر پلیٹیں پڑی تھیں۔ بی بی اماں سب کام سلیقے قرینے سے کرتی تھیں لیکن یہاں کسی نے پلیٹیں استعمال نہیں کی تھیں۔ سب ہی ڈش سے پکوڑے اٹھا اٹھا کر چٹنی کے پیالے میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔ اور طیب بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ البتہ ثوبیہ اور سحرش کے ہاتھ میں پلیٹیں تھیں۔

''السلام علیکم حضرات اور معذرت کہ ہم کچھ لیٹ ہو گئے۔''

''خیر اتنے بھی لیٹ نہیں ہوئے آپ۔ ہاں اگر پکوڑے ختم ہو جاتے تو آپ یقیناً لیٹ تھے۔'' جواب سحرش نے دیا تھا۔

''دیکھا!'' سمیرا نے ایک جتاتی نظر وجدان احمد پر ڈالی۔ ''بی بی اماں کو میری فرمائش یاد تھی۔''

وجدان کچھ کہتے کہتے رک گیا اور سب پر ایک نظر ڈالی۔ سب ہی تھے سوائے زمل اور امان کے۔ امان تو شاید اپنی پڑھائی کی وجہ سے نہیں آیا تھا لیکن زمل بھی نہیں تھی۔

''زمل نہیں ہے آج؟'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

آزین نے یکدم اس کی طرف دیکھا اور وجدان احمد کو اس کی آنکھوں میں ایک اذیت سی دکھائی دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہوا۔

زمل کچن میں بھی مصروف ہو سکتی تھی اور آج سے پہلے تو کبھی اس نے زمل کی موجودگی یا غیر موجودگی کو نوٹس نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مسلسل زمل اور آزین کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی کے متعلق سوچتا رہا تھا تو غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکل گیا تھا اور یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ سمیرا کی بے تکی

حرکتوں کی وجہ سے آزین پہلے ہی اس کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''اور مجھے جلد از جلد آزین کی غلط فہمی کو دور کرنا ہے اس سے پہلے کہ کچھ غلط ہو جائے۔''

''پکوڑے لے لو یار!'' مرسل نے میز پر موجود ڈش کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں یار! دل نہیں چاہ رہا!'' وہ اندر سے بہت پریشان تھا اس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی اور اب سمیرا کی بات مان کر وہ انجانے میں کسی کی تکلیف کا باعث بن گیا تھا۔

''اتنے مزے کے ہیں اور گرما گرم۔'' مرسل نے خود ہی دو تین پکوڑے پلیٹ میں رکھ کر اس کی طرف بڑھائے۔

''پھر علی پور والا مسئلہ حل ہوا؟ کیا سوچا آپ لوگوں نے؟'' اس نے پلیٹ پکڑ لی تھی۔

''سب پلاننگ کر لی ہے ہم نے...... تھوڑا بہت فنڈ بھی ہے۔ اگلی اتوار کو میں، ضیاء اور آزین وہاں جا کر اچھی طرح پھر سے ساری صورت حال کا جائزہ لیں گے اور پھر فوراً ہی کام شروع کر دیں گے۔'' مرسل نے تفصیل بتائی۔

''یہ کچھ میری طرف سے۔'' اس نے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے چیک نکال کر ضیاء کی طرف بڑھایا کہ مالی معاملات اس کے سپرد تھے۔ وہ ہی سارا حساب کتاب رکھتا تھا۔

''بہت شکریہ وجدان!'' ضیاء نے چیک مرسل کی طرف بڑھایا جس نے دیکھ کر ضیاء کو واپس کر دیا۔

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے یار! ہر بندے نے اپنے اپنے حصے کا کام کرنا ہے اور اس کی جزا اللہ نے دینی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سمیرا کی طرف بڑھائی۔

''یہ پکوڑے میری فرمائش پر بنے ہیں لہٰذا دو تین پکوڑوں سے کام نہیں چلے گا۔'' سمیرا نے پلیٹ پکڑ لی تو مرسل نے ڈش اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی، اس نے تھینک یو کہتے ہوئے دو تین پکوڑے اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھے اور برآمدے کی طرف جاتے ہوئے سحرش کی طرف دیکھا۔

''اور میری چائے؟''

''شاید بی بی اماں ابھی کچن میں ہی ہیں۔ آپ اپنے پاؤں کو تکلیف دیں اور خود جا کر اپنی چائے

کے آئیں۔" سحرش کو ہر ایک کی خدمتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔

سمیرا نے پکوڑوں والی پلیٹ تخت پر رکھی اور کچن کی طرف بڑھی۔

"سمیرا! میرے لیے چائے مت لانا۔" وجدان نے کچھ دیر پہلے ہی تو کافی پی تھی سو چائے کا موڈ نہیں تھا۔

سمیرا نے سر ہلایا اور پھر کچن کی طرف جاتے جاتے رکی اور سحرش کی طرف دیکھا۔

"ویسے مس سحرش ارباب! ہم مہمان ہیں اور یہ میزبان کا فرض ہے کہ وہ مہمان کی خاطر تواضع کرے۔"

"میں تو خود مہمان ہوں سمیرا جی، ایک میزبان وہ ہے۔" اس نے آزین کی طرف اشارہ کیا۔

"اور دوسری میزبان کے سر میں درد ہے اور وہ اپنے کمرے میں شاید نہیں بلکہ یقیناً سو رہی ہے لہٰذا اپنی مدد آپ۔"

سحرش نے مسکراتے ہوئے پکوڑا پلیٹ سے اٹھایا۔

"میں کہتا ہوں بی بی اماں کو چائے کے لیے۔" آزین اٹھا تو مرسل نے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹھو زین! وہ جا تو رہی ہے سمیرا چائے لینے۔"

آزین بیٹھ گیا۔ سمیرا نے بھی کچن کی طرف جاتے ہوئے مڑ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ آمریت ہمیشہ تباہی لاتی ہے۔" طیب نے وہیں سے ہی بات شروع کی جہاں سمیرا اور وجدان احمد کے آنے پر چھوڑی تھی۔

"ہم نے افغانیوں کے لیے راستے کھول کر بڑی غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ ہم نے نہ جانے کب تک بھگتنا ہے۔ شاید ہماری آنے والی نسلیں بھی اسے بھگتیں گی۔"

"یہ بات تم صحیح کہہ رہے ہو یار!" مرسل نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ میز پر رکھا۔

"میں نے ایک سروے میں پڑھا تھا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق چالیس لاکھ افغانی ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ایک سو پچاس کیمپ بنائے گئے لیکن یہ کیمپوں تک محدود نہیں رہے۔ ہر شہر میں پھیل

گئے اور ہماری معیشت کو تباہ کر دیا۔ ان کے پاس پیسہ تھا۔ چلے چلائے کاروبار خرید لیے۔ ہمارا ایک متوسط کاروباری اگر دس پندرہ ہزار کرایہ دے کر چھوٹی سی دکان چلا رہا تھا تو ان لوگوں نے پچاس ہزار کرایہ دے کر وہ دکان کرائے پر لے لی۔ اور وہ بے چارہ شخص جو اس دکان سے کما کر اپنا اور اپنے خاندان کا گزارا چلا رہا تھا وہ بے روزگار ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک سے چار دکانیں بنا لیں۔"

"لیکن یار!" ضیاء کو اس سروے پر یقین نہیں تھا۔ "ہجرت کر کے آنے والے تو بے چارے غریب مفلس اور بے گھر تھے ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا؟"

"ہاں ان ہجرت کرنے والوں میں ایسے بھی تھے غریب اور مفلس وہ تو زیادہ تر کیمپوں تک ہی محدود رہے لیکن ان میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی جن کے پاس پیسا بہت تھا۔ ان میں اکثر اسمگلر تھے، منشیات فروش تھے اور اسلحہ فروش تھے۔ ان کے آنے کی وجہ سے دہشت گردی، اغوا اور منشیات کو فروغ ملا۔ جلوزئی کیمپ ایسا کیمپ تھا جہاں پاکستان مخالف سرگرمیاں جنم لیتی تھیں۔ اسی لیے کہتا ہوں حالات حاضرہ جاننے کے لیے اخبار پڑھا کرو۔" مرسل نے پاس بیٹھے ضیاء کے بازو کو تھپتھپایا۔

"اتنا تو مجھے بھی علم ہے کہ افغانیوں کو یہاں آنے کا راستہ دے کر ہم نے غلطی کی تھی۔ اگر امریکا ضیاء الحق کو مروا نہ دیتا تو وہ شاید اس غلطی کا ازالہ کر دیتا۔ بہت ہوشیار آدمی تھا۔" ضیاء نے مرسل کی طرف دیکھا تو مرسل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

وجدان خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔ بے شک وہ ایک بزنس مین تھا لیکن ملکی حالات اور سیاست سے اسے ہمیشہ سے دلچسپی تھی۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کے دادا نے تحریک پاکستان کے لیے بہت کام کیا تھا۔ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے والے ابتدائی لوگوں میں سے تھے اور ان کے خاندان نے پاکستان کی خاطر بہت قربانیاں دی تھیں۔ پاکستان سے محبت اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے خون میں شامل تھی۔ سو وہ بے حد دلچسپی سے انہیں سن رہا تھا لیکن خود اس نے کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا تب ہی سمیرا نے اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑایا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا سمیرا......!''

''پی لو۔ کیا خبر پھر کب بی بی اماں کے ہاتھ کی بنی چائے پینی نصیب ہو۔ کیا چائے بناتی ہیں بی بی اماں کہ حلق تک سے خوشبو آتی ہے۔ یہ ہی چائے کی پتی ہمارا کک بھی استعمال کرتا ہے لیکن ایسی خوشبو نہیں آتی۔''

بی بی اماں نے چائے دم دے کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ بنا کر لے آئی تھی۔

''کیا مطلب کیا وجدان کہیں جا رہا ہے؟''

اس کی بات کو مرتضٰی نے نوٹس کیا تھا جو ابھی مشرقی سیڑھیوں سے اتر کر آیا تھا اور اب مرسل کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

''ہاں یہ کچھ دنوں تک اپنے چاچو کے ساتھ بزنس ٹور پر جا رہا ہے۔''

سمیرا پلیٹ میں چند پکوڑے رکھ کر اور اپنا کپ اٹھائے برآمدے میں جا کر سحرش اور ثوبیہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''تو دوستو!'' طیب نے بھی اپنا خالی کپ ہاتھ بڑھا کر درمیان میں پڑی گول میز پر رکھا۔ ''ہمیں آمریت کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے اور......''

''ہمارے ہاں جمہوریت بھی آمریت سے کم نہیں ہے۔ ہماری جمہوری حکومتوں نے بھی کوئی ایسے بڑے کارنامے سرانجام نہیں دیے۔ ہمارے سیاسی، سماجی، اقتصادی مسائل شاید ہی کبھی حل ہو سکیں۔'' مرسل نے طیب کی بات کاٹی تھی۔

''اور تم کیا کہہ رہے ہو احتجاج کرنا چاہیے۔ کون احتجاج کرے گا۔ کیا تم......؟ ہماری قومی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سیاسی قیادت کی ناکامی کے بعد ہم فوجی انقلاب پر جشن مناتے ہیں۔ اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد تم جیسے جیالے آمریت کے خلاف بڑے بڑے بیان دینے لگتے ہیں۔ ویسے کیا تم نے آج کل کوئی سیاسی پارٹی جوائن کر لی ہے؟''

''نہیں تو......'' طیب نے نظریں چرائیں۔ ''میں بہرحال لولی لنگڑی جیسی بھی جمہوریت ہو،

اسے آمریت پر ترجیح دیتا ہوں۔''

طیب کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بہت کم ان کی میٹنگز میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن طیب، مرسل، اسد وغیرہ یہ وہ چند لوگ تھے جنہوں نے فلاحی کاموں کی ابتدا کی تھی۔

''مجھے کسی کام سے جانا ہے تو اجازت......''

سب نے سر ہلایا تھا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو چکا ہے۔'' مرتضیٰ ابھی تک مرسل کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

''اگر ایسا ہے بھی تو اسے یہاں سیاسی گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ سر اسے پسند نہیں کریں گے۔ انہوں نے منع کیا تھا۔''

وجدان احمد نے آزین کی طرف دیکھا جو کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔

''تم اسے منع کر دو آزین! تمہارا دوست ہے۔''

آزین نے سر ہلایا۔

''ویسے آج ہر طرح کی بات کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔'' اسد چہکا۔

''سر، امان کے ساتھ کراچی گئے ہوئے ہیں۔ امان کی والدہ کی طبیعت خراب تھی کچھ۔''

''اب کیسی ہیں وہ؟'' وجدان احمد اب بھی آزین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہیں لیکن ابھی کراچی میں ہی ہیں۔''

''اوکے، میں بھی اب چلتا ہوں۔'' مرتضیٰ نے کرسی کی پشت سے ہاتھ ہٹایا اور سحرش کی طرف دیکھا۔ ''تو تم نہیں چلو گی؟''

''نہیں! مجھے وہاں جا کر عقیل بھائی اور ان کی فیملی کی بناوٹی باتیں اور جھوٹی لڑائیاں نہیں سننی جو سینکڑوں بار سن چکی ہوں۔''

آج اوپر والوں کی شانزہ کے سسرال میں دعوت تھی۔ نہ جانے کس سلسلے میں...... سحرش نے

جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اسے جانا نہیں تھا اور مہرین کی بھی نائیٹ ڈیوٹی تھی۔ سب لوگ جا چکے تھے سوائے مرتضٰی کے جواب جانے کے لیے ہی تیار ہو کر نیچے آیا تھا۔ آج کل وہ عقیل سے اپنے تعلقات بڑھا رہا تھا۔ اسے اچانک ہی خیال آیا تھا کہ ان سے تعلقات بہتر کر کے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے ایک ناراض سی نظر سحرش پر ڈالی۔

''تم اپنی زبان کو کبھی لگام بھی دے دیا کرو۔ عقیل کے سامنے بھی کتر کتر چلتی رہتی ہے۔ کم از کم یہ ہی سوچ لیا کرو تمہاری ان فضول باتوں سے شانزہ کی زندگی پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔''

''شانزہ کی زندگی پر جو اثر پڑنا تھا وہ پڑ چکا بھائی، کہاں ہماری نازک احساسات رکھنے والی شانے اور کہاں وہ کھڑوس جسے اپنی شیخیاں مارنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔''

عمر نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''تمہیں شاید علم نہیں سحری، کہ عقیل اور اس کے ابو برسراقتدار پارٹی میں شامل ہو چکے ہیں۔''

''تو کیا مجھے بھی اس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ ویسے مجھے ''لوٹے'' بالکل پسند نہیں۔'' ایک شریر سی مسکراہٹ سحرش کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''تم کبھی نہیں سدھرو گی۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا صحن کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''تو دوستو! آج دل بھر کے ہر موضوع پر بات کرو۔ عمر اعجاز سے اس کی غزلیں سنو، وجدان احمد سے موجودہ حالات پر تبصرہ سنو اور پھر آخر میں ضیاء کی خوب صورت آواز میں کوئی زبردست سا گانا کہ آج کوئی ڈر، خوف نہیں کہ کوئی ڈسٹرب ہوگا۔''

یہ اسد تھا۔ بہت کم بولتا تھا اور زیادہ تر سب کی سنتا تھا لیکن آج بقول مرسل کے موڈ میں تھا۔

''بی بی اماں بھی تو ڈسٹرب ہو سکتی ہیں۔'' سمیرا اٹھ کر صحن میں آئی تھی اور خالی کپ اٹھا رہی تھی۔

''ارے نہیں بی بی اماں تو ہماری دوست ہیں۔'' مرسل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''آج ان سے بھی پرانے زمانے کے قصے سنیں گے۔''

''تم رہنے دیتیں سمیرا! میں اٹھا لیتا۔ آخر کو میزبان ہوں میں اور تم مہمان۔'' آزین نے سمیرا کی

طرف دیکھا۔اس کی ہیزل براؤن آنکھوں میں ویرانی سی تھی۔حالانکہ جب پہلی بار وہ آزین سے ملی تھی تو اس کی آنکھوں میں روشنی اور چمک تھی۔اور وہ ہنستی ہوئی سی لگتی تھیں۔ایک لمحہ کے لیے اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''کیا میں جو کچھ کر رہی ہوں غلط کر رہی ہوں۔'' اس نے خود سے پوچھا اور پھر خود ہی جواب دیا۔''نہیں! بالکل صحیح کر رہی ہوں۔''

''اب شرمندہ تو مت کرو زین!'' اس نے کپ اٹھا کر ٹیبل پر پڑی ٹرے میں رکھے اور ڈش میں پڑا آخری پکوڑا اٹھایا۔

''کسی نے کھانا تو نہیں ہے، ورنہ میں کھانے لگی ہوں۔''

سحرش نے اس کے ہاتھ سے پکوڑا اچک لیا۔اور خالی ڈش اور چٹنی والا پیالہ اٹھالیا۔وہ دونوں اب کچن کی طرف جا رہی تھیں۔

''میں نے سوچا تھوڑی سی تمہاری مدد کر دوں۔کہیں کل کو یہ نہ کہو کہ موروں والی حویلی میں تم جیسی امیرزادی سے کام کروایا جاتا تھا۔''

''وہ تو اب بھی کہہ سکتی ہوں تمہاری اس چنی سی مدد کے باوجود۔'' سمیرا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''اوہ ہو......!'' سحرش اب باورچی خانے میں داخل ہو رہی تھی۔اس نے ڈش کاؤنٹر پر رکھی۔

''تو پھر لگے ہاتھوں یہ کپ بھی دھو ڈالو کہ بی بی اماں کو پسند نہیں ہے کہ کچن میں گندے برتن پڑے ہوں۔''

سحرش کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''ویسے اپنے گھر میں تو تم نے شاید ایک گلاس تک نہ دھویا ہو۔''

''یہ تو ہے۔''

سمیرا نے ٹرے کاؤنٹر پر رکھی اور صابن وغیرہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔اور پھر اسے ایک کٹورے میں صابن اور کوچی نظر آگئی جو سنک کے ساتھ ہی پڑا ہوا تھا۔اس نے کٹورا اٹھایا۔

''ارے ارے.....تم تو سچ مچ دھونے لگیں۔میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' سحرش اسے کپ دھوتے

دیکھ کر حیران ہوئی۔

''بے فکر رہو میں اپنا حساب برابر کرلیا کرتی ہوں۔'' سمیرا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''مطلب تم بدلے میں کسی روز زمل سے اپنے گھر کے برتن دھلواؤ گی؟'' سحرش نے آنکھیں پھیلائیں۔

''مے بی!''

تب ہی بی بی اماں کچن میں داخل ہوئیں اور اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔

''میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی تھی اور جو کام تم نے کبھی کیا نہیں وہ کیوں کر رہی ہو؟''

''تو کیا ہوا بی بی اماں۔'' سمیرا نے بی بی اماں کی طرف دیکھا۔ ''اور آپ کا بہت شکریہ بی بی اماں آپ کو یاد رہا کہ میں نے پکوڑوں کی فرمائش کی تھی۔''

''اس میں شکریے کی کیا بات ہے بیٹی۔ میرے بچے اگر کوئی فرمائش کریں تو میں بھولتی نہیں ہوں۔ اور میرے بچوں کے دوست بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی پیارے ہیں۔ پھر بھلا مجھے کیسے یاد نہ رہتا کہ میری بیٹی نے پکوڑوں کی فرمائش کی تھی۔''

بی بی اماں کے آج کل سمیرا سے اچھے تعلقات تھے۔ اور اس کے لیے ان کے دل میں اچھا خاصا نرم گوشہ تھا۔ بے چاری بچی، باپ نے دوسری شادی کرلی اور ماں کو پروا نہیں اولاد کی۔ خودرو پودوں کی طرح پلی بڑھی ہے۔ نہ کوئی روک ٹوک، نہ کوئی نصیحت، نہ عقل کی باتیں کسی نے سمجھائیں۔ اس خیال سے وہ جب بھی آتی پاس بٹھا کر کچھ نہ کچھ سمجھاتی رہتی تھیں۔

سمیرا چند لمحوں کے لیے جیسے ساکت سی بی بی اماں کو دیکھے گئی۔

''آپ بہت اچھی ہیں بی بی اماں! اگر مجھ سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کر دیجیے گا پلیز۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا تم سے کوئی غلطی کیوں ہو گی اور بچوں سے غلطیاں ہو بھی جائیں تو ماں باپ ناراض نہیں ہوتے ان سے۔'' بی بی اماں اب کپ دھو رہی تھیں۔

''چلو اب، مجھے عمر بھائی کی شاعری بہت پسند ہے اور وہ اپنا کلام سنا رہے ہوں گے۔'' سحرش

دروازے کے قریب کھڑی تھی۔

''تم جاؤ۔ مجھے شاعری سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ میں ذرا زمل کا حال احوال پوچھ لوں۔'' سمیرا نے کچن ٹاول سے ہاتھ پونچھے۔

''لیکن زمل شاید سو رہی ہو۔ اس نے کہا تھا وہ درد کی گولی لے کر سو جائے گی۔'' سحرش نے بتایا۔

''تو کوئی بات نہیں، اگر وہ سو رہی ہوئی تو آجاؤں گی عمر کی شاعری سننے کے لیے۔''

لیکن زمل سو نہیں رہی تھی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ گود میں کتاب رکھی ہوئی تھی لیکن وہ پڑھ نہیں رہی تھی۔ بہت ساری باتیں تھیں جو اسے الجھا رہی تھیں، پریشان کر رہی تھیں۔

کتنے سارے دن گزر گئے تھے بلکہ دن کہاں مہینے...... شاید تین ماہ ہو گئے تھے۔ آزین کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ خاموش روکھا اور اجنبی سا۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اتنے سارے دن اس کا موڈ خراب رہے۔ چند دن بعد خود بخود ہی اس کا رویہ بہتر ہو جاتا تھا۔ پھر جب وہ مل بیٹھ کر بات کرتے تھے تو باتوں باتوں میں وہ پھانس نکل جاتی تھی جو اس کے اندر کہیں اٹکی ہوتی تھی۔ لیکن اس بار ایسا کیا ہوا تھا کہ جو اس کے دل سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

اب تو بی بی اماں بھی اس کی سرد مہری کو محسوس کر رہی تھیں اور ایک دو بار اس سے پوچھ بھی چکی تھیں۔

''یہ زین کو کیا ہوا ہے، کیوں منہ لٹکائے پھرتا ہے۔''

''پتا نہیں بی بی اماں!'' وہ انہیں کیا بتاتی جب کہ خود اسے کچھ علم نہ تھا۔

''تو پتا کرو نا کیا غبار دل میں چھپائے پھرتا ہے۔ بچپن سے ایسا ہی گھنا ہے۔ جب تک پوچھو گی نہیں، منہ سے کچھ بھی پھوٹے گا نہیں۔ اندر ہی اندر جلتا کڑھتا رہے گا۔'' بی بی اماں اسے سمجھتی تھیں۔

''لیکن وہ کچھ بتائے بھی تو بی بی اماں۔ وہ تو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ جب کوئی بات کرنے لگو تو اسے کوئی ضروری کام یاد آجاتا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ تم سے بہت ناراض اور خفا ہے اس کے اندر بہت غصہ ہے۔'' بی بی اماں نے اندازہ لگایا۔

''تو وہ مجھ سے کیوں خفا ہے بی بی اماں! کیا کیا ہے میں نے؟'' اس کے اندر غم پھیلتا جا رہا تھا۔

''تو یہ ہی تو تم پوچھو، اس سے بار بار پوچھو۔ غبار اندر ہی اندر اکٹھا ہوتا رہے تو پھر کچھ بھائی نہیں دیتا۔ ابھی گرد ہلکی ہو گی بولے گا بتائے گا تو دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ تم جانتی ہو نا ابھی تک وہ پورے طور پر اس دکھ سے نہیں نکل سکا جو صبوحی کے چلے جانے سے اس نے جھیلا تھا۔ میں نے دیکھی تھی اس کی وہ اذیت...... راتوں کو نہ جانے کتنی بار اٹھ اٹھ کر مجھ سے پوچھتا تھا۔ بی بی اماں کیا مریم چاچی اور مونا تائی بھی ایک دن سب کو چھوڑ کر چلی جائیں گی؟ وہ بے اعتبار ہو گیا ہے میری جان، اور یہ بے اعتباری اسے اندر سے کھائے جا رہی ہے۔''

بی بی اماں کبھی کبھی اس کی سہیلی بن جاتی تھیں اور سہیلیوں کی طرح ہی اسے سمجھاتی تھیں۔

''لیکن بی بی اماں! اب تک تو اسے اس فیز سے نکل آنا چاہیے، اسے اعتبار کرنا چاہیے۔ اور بھی کئی لوگ ہوں گے جن کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ آپ نے خود بتایا تھا ایک بار سلمیٰ خالہ کی دیورانی کے متعلق کہ تین بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ دیور نے شادی کر لی تھی۔ دوسرے بچے زیادہ تر سلمیٰ خالہ ہی سنبھالتی تھیں کہ بے اولاد تھیں اور ان کے تینوں بچے کتنی کامیاب اور خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو روگ نہیں بنایا کہ ان کی ماں انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ بلکہ اس روز سلمیٰ خالہ جب آپ سے ملنے آئی تھیں تو بتا رہی تھیں نا کہ اب ماں سے بھی ملتے رہتے ہیں۔ چار چھ ماہ بعد آ جاتی ہے خود ہی ملنے۔''

زل نے پڑوسی سلمیٰ کا نام لیا تھا جو بھی کبھار بی بی اماں سے ملنے آتی رہتی تھی۔

''سب کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اپنی اپنی حساسیت ہوتی ہے۔ یہ اکلوتا تھا۔ دونوں کا بہت لاڈلا۔ اس لیے بہت بری طرح ٹوٹا ہے۔ اور جب چیزیں اس طرح ٹوٹتی ہیں تو بہت مشکل سے جڑتی ہیں اور جڑ بھی جائیں تو کہیں نہ کہیں کچھ کمی، کچھ کجی رہ جاتی ہے۔''

''تو کیا مجھے ساری زندگی ٹوٹے کانچ پر چلنا ہو گا؟'' اس سے اس نے سوچا تھا اور من بھیگتا چلا گیا تھا۔

''صرف تم...... تمہاری محبت ہی اسے ایک روز اس اذیت سے نکالے گی۔ تم کوشش کرتی رہو۔

ناراض مت ہونے دیا کرو اسے۔'' اسے خاموش دیکھ کر بی اماں نے پھر کہا تھا لیکن ابھی تک وہ اس سے کھل کر بات نہیں کر سکی تھی۔

وہ آفس سے آتے ہی آرام کے لیے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں سے اٹھ کر جہاں زیب بیگ یا شاہ زیب کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔

وہ اس سے بھاگ رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ آزین کو مارجن دیا تھا کہ صبوحی چچی کی وجہ سے اس کا اعتماد اور یقین ہر عورت سے اٹھ گیا تھا لیکن وہ ہر عورت نہیں تھی۔ وہ زل شاہ زیب تھی اور مریم شاہ زیب کی بیٹی جس نے کبھی شاہ زیب بیگ سے ان کی بے اعتنائی اور بے نیازی کا شکوہ نہیں کیا تھا۔ اپنے محرم رشتے سے وفا اسے مریم کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ اور یہ بات وہ اسے بتانا چاہتی تھی، اسے اپنی وفا کا یقین دلانا چاہتی تھی کہ ایسا کرنے کو بی اماں نے اس سے کہا تھا لیکن وہ تو گھر میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔

کھانے اور ناشتے کی ٹیبل پر بھی خاموش ہی رہتا تھا۔ بہت مختصر سی بات کرتا وہ بھی جب بی بی اماں یا جہاں زیب بیگ کوئی بات کرتے اس کا جواب دے دیا۔

وہ کتنی خوشی خوشی مری جانے کی تیاری کر رہی تھی لیکن پھر اچانک اس نے وہاں جانے کا پروگرام کینسل کر دیا تھا۔ شاید تب سے ہی کوئی پھانس اس کے دل میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کبھی پورے طور پر خوش نہیں ہو پائی تھی۔ سکھ کے پھولوں میں کہیں دکھ کا کانٹا بھی چھپا ہوتا تھا۔ ابا کی محبت اور شفقت ملی تو اماں نہیں تھیں۔ پھر ابا ہوش وحواس سے بے گانہ ہوئے تو آزین تھا اس کے ساتھ، ہر لمحہ اس کے آنسو پونچھتا، اسے تسلیاں دیتا...... اور اب ابا کے ٹھیک ہونے کی نوید ملی تو آزین کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کیا اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا کہ ایک خوشی ملے گی تو دوسری دور ہو جائے گی۔

وہ افسردہ ہوئی تھی۔

اور یہ ابھی تین دن پہلے کی ہی تو بات تھی جب ثوبان شاہ کا فون آنے پر کہ اختر بانو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ہارٹ اٹیک ہوا ہے...... جہاں زیب بیگ اماں کے ساتھ کراچی چلے گئے تھے۔ وہ سیڑھیوں پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی اختر بانو کے لیے دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جہاں زیب بیگ

نے جاتے جاتے کہا تھا۔

''میری بچی کے لیے دعا کرنا زمل، اللہ اسے اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔ اللہ اسے صحت و زندگی دے۔''

اور اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسے پھپھو کے لیے دعا کرنا تھی۔ اور جب سے پتا چلا تھا تب سے کر رہی تھی۔ آزین جہاں زیب بیگ کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس آیا تو غیر ارادی طور پر اس کے پاس آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''پریشان نہ ہو، ان شاء اللہ پھپھو ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''ان شاء اللہ!'' اس نے اس کی طرف ذرا سا رخ موڑا تھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے برآمدے میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

''زین! تم کچھ پریشان ہو۔ بہت سارے دنوں سے تم اپ سیٹ لگ رہے ہو۔ کیا چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟ پلیز کیا مجھ سے بھی نہیں کہو گے۔''

''پتا نہیں...... '' وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ''شاید تمہیں وہم ہوا ہے۔''

''نہیں مجھے وہم نہیں ہوا زین! کچھ تو ہے جو تمہارے اندر چل رہا ہے اور تم اجنبیت اوڑھے پھر رہے ہو۔ مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کرو شاید ہم دونوں مل جل کر اس پریشانی کا حل نکال لیں۔'' اس نے بہت آس سے اسے دیکھا تھا کہ وہ آج ضرور کچھ کہہ دے گا اپنے دل کی بات اپنی پریشانی۔

''ایسا لگتا ہے زمل، جیسے میں دھویں اور آگ میں سانس لے رہا ہوں آج کل۔ کبھی کبھی تو دم گھٹنے لگتا ہے میرا۔''

آزین نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا تھا اور کچھ دیر تک دیکھتا رہا تھا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے زین۔ کیا آفس میں کوئی پریشانی ہے۔ اگر جاب تمہارے مطلب کی نہیں ہے تو چھوڑ دو۔''

زمل چاہتی تھی کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہ کہہ دے، جو غبار اس کے دل پر چھایا ہوا ہے، وہ

نکل جائے تو اچھا ہے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا ظفر چاچو سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں آخری بار چار ماہ پہلے بات ہوئی تھی۔"

اب وہ پھر سامنے دیکھنے لگا تھا۔

"تو پھر کیا سوچتے رہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

وہ یکدم ہی اٹھا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ یوں ہی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی تھی یہاں تک کہ شام گہری ہو گئی تھی اور بی بی اماں نے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے کی لائٹ جلائی تھی۔ کہیں کسی مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

"یہاں اس وقت اس طرح کیوں بیٹھی ہو زل!" وہ اس کے قریب آئی تھیں۔ "اللہ خیر کرے گا۔ اختر بانو کو صحت و زندگی دے گا۔ اٹھو! مغرب کی اذان شروع ہوئی ہے۔ نماز پڑھ کر دعا کرو اس کے لیے۔"

"جی بی بی اماں!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے ہاں زین سے بات کی تم نے؟ کیا کہتا ہے؟" بی بی اماں کو یاد آیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے زین اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں بی بی اماں! وہ کچھ بھی نہیں بتاتا۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی تھی۔

"شاید ایک بار پھر کسی بات نے اسے بے یقین کر دیا ہے۔" بی بی اماں جیسے خود سے کہہ رہی تھیں۔

"شاید کسی نے صبوحی کے حوالے سے کوئی بات کر دی ہو۔ کیا خبر مرتضٰی نے ہی کچھ کہا ہو اس کی عادت ہے ماضی کی کوئی نہ کوئی بات لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ جانے اس لڑکے کو کب عقل آئے گی۔ اس روز میں نے خود سمجھایا تھا مرتضٰی کو بلاوجہ ہی ظفریاب اور صبوحی کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔"

''تو زین اب چھوٹا بچہ تو نہیں ہے بی بی اماں! اسے دوسروں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔اسے خود پر یقین ہونا چاہیے۔'' وہ سیڑھیاں اتر کر بی اماں کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔

''یقین ہی تو نہیں ہے میری بچی، اسے...... نہ خود پر نہ تم پر۔'' بی بی اماں دکھی ہوئی تھیں۔''اور اس یقین کو تم نے ہی بحال کرنا ہے۔اس کا خیال رکھا کرو، اسے یقین دلاتی رہا کرو کہ سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

''اپنی حد میں رہ کر میں اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہوں بی بی اماں اور کئی بار میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش بھی کی ہے اور کیا کروں کیا کرسکتی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''کہیں تم پر وہ کوئی شک تو نہیں کررہا زمل؟''

بی بی اماں جہاں دیدہ تھیں انہیں یکدم ہی خیال آیا تھا کہ آزین کے رویے کی یہ ہی وجہ ہوسکتی ہے۔وہ زمل سے بے حد محبت کرتا تھا اور ایک ہی چیز اسے زمل سے دور کرسکتی تھی اور وہ کوئی بے معنی اور فضول شک ہی ہوسکتا تھا۔

''وہ بھلا مجھ پر کیوں شک کرے گا اور کس بات پر؟'' وہ بی بی اماں کی بات سن کر حیران ہوئی تھی۔

''ہاں بھلا وہ کیوں شک کرے گا تم پر۔'' بی بی اماں کو لگا انہیں یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

''میں بھی سحرش کی طرح یوں ہی جو ذہن میں آتا ہے بغیر سوچے سمجھے بول جاتی ہوں۔تمہیں میں نے بتایا تھا کہ صبوحی کے جانے کے بعد کیسے ہاتھ پکڑ پکڑ کر مجھ سے پوچھتا تھا کہ کہیں مریم چچی بھی تو چاچو اور ملی کو چھوڑ کر نہیں چلی جائیں گی تو میری بیٹی اس کے اندر بڑی گہری اور سخت گرہیں ہیں۔بڑی مسموم فضا ہے، بڑا زہر ہے اور اس زہر کو ختم ہونے میں وقت لگے گا۔تمہاری محبت اور تم پر یقین ہی اس زہر کا تریاق ہوگا۔اسی لیے تو بڑے صاحب سے کہتی ہوں جلد از جلد رخصتی کردیں۔ہر وقت کا ساتھ ہوگا تو اس کا اعتبار بھی جلد بحال ہوگا۔''

''اب بھی تو ہر وقت کا ساتھ ہے بی بی اماں...... پھر کیا دادا جان زبردستی میری رخصتی کردیں جب کہ وہ ایسا نہیں چاہتا ابھی۔''

''اس ساتھ اور اس ساتھ میں بہت فرق ہوتا ہے بیٹی۔'' بی بی اماں کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی، اور وہ جھینپ گئی تھی۔

''اختر کی طرف سے خیر کی خبر آئے اور بڑے صاحب واپس آجائیں تو میں پھر سے بات کرتی ہوں ان سے۔ زور دے کر بات کریں گے تو انکار نہیں کر پائے گا۔''

''لیکن بی بی اماں!'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ قریبی مسجد میں بھی اذان شروع ہوگئی تو وہ خاموش ہوگئی۔ بی بی اماں نے اپنا دوپٹا درست کیا اور اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

''صبر اور حوصلہ میری بچی! نماز پڑھ کر اپنے اور زین کے لیے بھی دعا کیا کرو۔''

وہ سر ہلاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف واپس چلی گئی تھیں۔ اور وہ اذان ختم ہونے تک وہاں ہی سیڑھیوں کے پاس صحن میں کھڑی رہی تھی۔ نظریں برآمدہ پار کر کے بار بار آزین کے کمرے کے دروازے پر رک جاتی تھیں۔ اور کیا کبھی کوئی ایسا دن آئے گا اس کی زندگی میں جب آزین ایک بالکل نارمل انسان کی طرح ہو جائے گا، جب وہ اس حقیقت کو قبول کر لے گا کہ ساری انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ بہت پہلے ایک بار دادا جان نے بھی اس سے کہا تھا۔

''زین کم عمری میں جس تکلیف سے گزرا ہے۔ وقت کے ساتھ اس تکلیف کو کم ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا زمل، اس نے اس تکلیف اور اذیت کو دل کا مستقل مہمان بنا رکھا ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے اور اس کے ریلیشن میں کچھ دشواریاں محسوس ہوں لیکن زمل، وہ بہت اچھا ہے اور تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ مجھے تمہارے لیے اس سے بہتر اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ایک دن آئے گا کہ تم دونوں ایک دوسرے کی رفاقت پر فخر محسوس کرو گے۔

تم ماہ الملوک ہو میری بچی...... شفاف، صاف پاکیزہ پانی...... ہر طرح کی آلودگی سے پاک، جس میں ہر چیز حل ہو جائے۔ اس کے تلخ و شیریں ہر طرح کے رویے کو اپنے اندر جذب کر لینا۔ ایک دن وہ خود سے زیادہ تم پر اعتبار کرے گا۔''

''اور وہ دن پتا نہیں کب آئے گا۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے گود میں رکھی کتاب اٹھا کر

کھولی تب ہی تھوڑا سا دروازہ کھلا اور سمیرا نے اندر جھانکا۔

''تم جاگ رہی ہو زمل، سحرش نے بتایا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، تم سو رہی ہو۔''

''ہاں! سر میں درد تھا۔ سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔'' زمل نے ہاتھ میں پکڑی کتاب تکیے کے پاس ہی الٹ کر رکھ دی۔

''تو آ جاؤ کچھ دیر باتیں کریں گے۔ تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے تم سے ملاقات ہوئے اور تم نے تو گھر سے نکلنا نہیں ہے۔'' سمیرا نے کمرے میں قدم رکھا۔

''اب آ تو چکی ہو۔ پھر اجازت کیسی......؟'' زمل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ہاں، آ تو گئی ہوں۔'' سمیرا اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ''تمہیں پتا ہے تمہاری جگہ اگر سحرش ہوتی تو وہ کہتی کہ اگر آ بھی چکی ہو تو واپس تشریف لے جاؤ کہ میرا سونے کا ارادہ ہے۔ مجھے اس کا یہ کھرا پن اچھا لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کو برا بھی لگتا ہو۔''

''ہاں مگر اس کھرے پن سے کسی کی دل آزاری نہ ہو تو......'' کبھی کبھی اس کا بے دھڑک بول دینا زمل کو اس وقت اچھا نہ لگتا تھا جب اس سے کسی کا دل دکھے۔

''تمہاری پھپھو کی طبیعت کیسی ہے اب؟ کیا بائے پاس ہو گا؟'' سمیرا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات جو وہ اس سے کرنا چاہتی ہے یکدم سے کیسے کر دے۔ وجدان کہتا تھا کوئی بھی بات کرنے کے لیے پہلے زمین ہموار کرنی پڑتی ہے۔

''رات دادا جان سے بات ہوئی تھی۔ کافی بہتر ہیں لیکن ابھی ہاسپٹل میں ہی ہیں اور بائے پاس کے متعلق تو دادا جان نے ابھی نہیں بتایا۔'' زمل کا دل اب بھی اختر بانو کے لیے پریشان تھا۔

''پریشان نہ ہو یار۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے گا ان شاء اللہ۔ ویسے یار! یہ جو باہر خدمت گاروں کا ٹولہ بیٹھا ہے نا انہوں نے تمہارے دادا جان کے نہ ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ سیاسی گفتگو، حکومت پر تنقید سب ہی کھل کر ہو رہا تھا۔ تم سوئی نہیں تھیں تو تم بھی آ جاتیں باہر...... میں، ثوبیہ اور سحرش برآمدے میں تھے اور ان کے تبصروں سے پکوڑے کھاتے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔''

''مجھے سیاست سے کچھ ایسی خاص دلچسپی نہیں ہے۔بس اتنا چاہتی ہوں کہ جو بھی حکومت ہو، وہ ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے اور حکومت میں موجود لوگ محبِ وطن ہوں۔''

زمل نے ہمیشہ ہر نماز میں اچھے اور مخلص حکمرانوں کی دعا کی تھی۔

''پتا ہے وجدان کو کسی بھی بات پر تمہارا نقطۂ نظر اور تمہاری رائے پسند ہے۔آج بھی وہ تمہارا پوچھ رہا تھا۔'' سمیرا آہستہ آہستہ اپنے مقصد کی طرف آ رہی تھی۔

''اچھا، مجھے تو نہیں یاد کہ میں نے کبھی کسی چیز کے متعلق کوئی ٹھوس رائے دی ہو اور اپنا نظریہ بیان کیا ہو۔'' زمل کو حیرت ہوئی تھی۔

''بس یوں ہی کوئی بات کر دی ہوگی۔''

''ہاں شاید لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں نا ایسے جن کی عام سی کہی ہوئی بات بھی کسی دوسرے کے لیے بہت اہم ہو جاتی ہے جیسے تمہاری کہی ہر بات وجدان کے لیے بہت خاص ہوتی ہے۔''

سمیرا نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں الجھن تھی جیسے وہ سمیرا کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی؟'' نظریں اب بھی اس کے چہرے پر تھیں۔

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ مجھے برا لگے تو مت کہو کچھ۔'' زمل سنجیدہ تھی۔

''خیر اب ایسی بھی برا ماننے والی بات نہیں ہے۔لڑکیاں تو ایسی باتوں پر خوش ہوتی ہیں۔'' سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''پتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے وجدان احمد تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔''

''پاگل ہو سمیرا! کیا مجھے نہیں معلوم کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور اب تک تمہاری شادی ہو چکی ہوتی لیکن تم حمیرا کی شادی سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ثوبی نے بتایا تھا مجھے سب......''

''یہ ثوبی کی بچی کو کیا ضرورت تھی ساری کہانی زمل کو بتانے کی۔'' سمیرا نے دل ہی دل میں کہا۔

وجدان اب کھٹک گیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اب اسے زمل پر کام کرنا ہے۔یوں بھی وجدان

کے حوالے سے اپنی کارکردگی پر وہ خاصی مطمئن تھی۔

''خیر! وہ الگ بات ہے یار، اگر کوئی کسی سے محبت کرتا ہو تو کیا وہ کسی دوسرے کو پسند نہیں کر سکتا اس کی کسی خوبی کی وجہ سے...... وجدان بھی تمہاری بہت تعریف کرتا ہے اور سچ میں کبھی کبھی تو میں جیلس ہونے لگتی ہوں، میں تو بس یوں ہی ہوں۔ لاابالی اور لاپرواسی۔ اسے تم جیسی لڑکیاں سوٹ کرتی ہیں۔ لیکن پلے پڑ گئی مجھ جیسی بے ڈھنگی لڑکی۔'' وہ ہنسی۔

''وہ تم سے محبت کرتا ہے تو تمہاری خامیوں سے بھی محبت کرتا ہوگا۔ کسی کی کوئی بات اچھی لگنے پر اس کی تعریف کر دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کی تم سے محبت میں کوئی کمی آ گئی ہے۔'' زمل کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی تاہم اس نے اپنی ناگواری کو چھپا لیا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو یار! میرے اور وجدان کے درمیان محبت کا جو تعلق ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ اس میں کھوٹ نہیں ہے۔ بہت خالص رشتہ ہے ہمارا۔ میں تو اس سے کہتی رہتی ہوں کہ اگر کبھی اس نے میرے علاوہ کسی کو سوچا بھی تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔'' اس نے یکدم چال بدلنے کا سوچا تھا۔

''وجدان تو اپنی سادگی میں تمہاری تعریف کر دیتا ہے کبھی کبھار لیکن دوسروں کو تو غلط فہمی ہو سکتی ہے نا۔''

''کیا مطلب کیسی غلط فہمی......؟'' زمل چونکی۔

''تم بہت سادہ اور معصوم ہو زمل یار اور مرد بہت شکی مزاج ہوتا ہے۔ کچھ مرد کم شکی مزاج ہوتے ہیں اور کچھ زیادہ۔ زین مجھے ایک شکی مزاج مرد لگتا ہے۔ ابھی جب ہم آئے تھے اور وجدان نے تمہارا پوچھا تھا تو زین کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور مجھے اس کا موڈ خراب سا لگا تھا۔ حالانکہ تمہارا اور آزین کا نکاح ہو چکا ہے اسے تم پر اعتبار ہونا چاہیے۔ کوئی اگر تمہاری کسی بات کی تعریف کرتا ہے تو یہ اس کا فعل ہے۔ خیر پریشان نہ ہونا یار، یوں بھی وجدان ایک دو ماہ کے لیے بزنس ٹور پر جا رہا ہے تو زین کے دل سے خود ہی نکل جائے گا۔ اگر کوئی شک ہے بھی تو......''

اس نے زمل کی آنکھوں میں موجود پریشانی کو دیکھا تو دل ہی دل میں خود کو داد دی۔ وہ بالکل صحیح کھیل رہی تھی۔

''تو بی اماں کا خیال صحیح تھا کہ زین کے موڈ کی خرابی کی وجہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھ سے بدگمان ہو گیا ہے۔'' زمل نے دل ہی دل میں سوچا لیکن خاموش رہی۔

''سوری یار! میں نے تمہیں پریشان کر دیا۔ مجھے تم سے نہیں کہنا چاہیے تھا کہ زین تم پر شک کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تم اور وجدان...... مطلب تم دونوں کے درمیان کچھ ہے۔ بس میں بھی نا جو سوچتی ہوں محسوس کرتی ہوں سحرش کی طرح کہہ دیتی ہوں۔ خیر اسے میرا تجزیہ سمجھ لو یہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے نا۔''

اسے خاموش دیکھ کر سمیرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں، میں پریشان نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے تم صحیح کہہ رہی ہو لیکن میں سمجھتی ہوں کہ وقتی طور پر شاید اس کا موڈ خراب ہو گیا ہو۔ وہ ہی نہیں کوئی بھی مرد کسی دوسرے مرد کے منہ سے اپنی بیوی کی تعریف نہیں سن سکتا۔ لیکن زین کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ تم جانتی ہو کہ چچا جان اور چچی جان کے شادی کرنے کی وجہ سے وہ اندر سے ڈھے گیا تھا۔ وہ اٹھارہ سال سے جس اسٹیٹ آف تھاٹ میں ایگزسٹ کر رہا ہے وہ ابھی crack نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ وقت لگے اور ہو سکتا ہے کہ آج کل کسی بھی وقت ہو جائے۔ اگر وہ مجھ پر شک کرے اور بدگمان بھی ہو جائے تو یہ وقتی ہے سمیرا! ہمارے درمیان جو بندھن ہے وہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ اتنی سی بات پر ٹوٹ جائے۔ زین ایک بہترین انسان ہے وہ رشتے نبھانے اور رشتوں کی قدر کرنے والا ہے۔''

وہ ذرا سی دیر کو خاموش ہوئی۔ سمیرا حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

اتنا تحمل، اتنا ٹھہراؤ...... اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بھڑک اٹھتی۔ وہ خود بھی ہوتی تو برداشت نہ کر پاتی۔ دل ہی دل میں اس نے اسے سراہا۔ کمال لڑکی ہے یہ زمل بھی۔

''بس یار! میں تمہارے لیے پریشان ہو گئی تھی۔'' اس نے لہجے میں ہمدردی سموئی۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سمیرا! مجھے یقین ہے اپنے اللہ پر، اپنے دل کے اخلاص پر اور اس محرم اور پاکیزہ رشتے پر جو ہمارے درمیان ہے۔ کہ کوئی بھی بدگمانی یا شک ہمارے رشتے کو ختم نہیں کر سکتا۔''

''اللہ تمہارا یقین برقرار رکھے لیکن یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہو گا۔'' لبوں پر ایک معنی خیز سی

مسکراہٹ لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو باہر چلتے ہیں اور سب کو سنتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''نہیں میرا موڈ نہیں ہے، تم جاؤ۔'' زمل نے انکار کر دیا تو سمیرا کو اچھا نہیں لگا۔

''یہ تمہارا گھر ہے زمل، باہر بیٹھے ہوئے لوگ تمہارے مہمان ہیں۔ اور تم ایک طرح سے میزبان ہو تو کیا تمہارا باہر ہونا ضروری نہیں ہے۔''

''نہیں!'' زمل نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ ہمارے مہمان نہیں ہیں۔ انہیں اپنے فلاحی کاموں کے پروگرام ترتیب دینے کے لیے جگہ چاہیے تھی جو زین نے دادا جان کی اجازت سے انہیں دے دی۔ ابتدا میں تو وہ لوگ صرف گیسٹ روم تک ہی محدود تھے۔ پھر ہمیں ان کا مقصد اور کام اچھا لگنے لگا تو میں، سحرش اور مہرین وغیرہ بھی ان کی میٹنگز میں جانے لگے۔ سو ان کی ہر میٹنگ میں شامل ہونا قطعی ضروری نہیں ہے۔ پھر وہ زین کے دوست ہیں اور زین ہے وہاں۔ بی بی اماں حسب توفیق ان کی خاطر تواضع بھی کر دیتی ہیں۔''

سمیرا کو زمل کے جواب پر حیرت ہوئی۔ آج سے پہلے وہ اسے اتنی سنجیدہ کبھی نہ لگی تھی۔

''زین کو تمہارا وہاں نہ جانا برا نہیں لگے گا کیا؟''

''نہیں!''

''بلکہ شاید میرا وہاں جانا اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔'' اس کے دل میں ابھی پہلی بار خیال آیا تھا۔

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 13

'او کے ایزیو وش......'' سمیرا نے کندھے اچکائے اور باہر نکل گئی۔

کمرے کے باہر کھڑے ہو کر سمیرا نے برآمدے اور پھر صحن میں نظر دوڑائی۔ برآمدہ خالی تھا۔ سحرش اور ثوبیہ اب مشرقی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ صحن میں گول میز کے گرد عمر، اسد، ضیا، وجدان اور آزین بیٹھے ہوئے تھے۔ ضیاء ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز زیادہ بلند نہ تھی۔ بی بی اماں نے برآمدے اور صحن کی لائٹیں جلادی تھیں۔

رات نے چند ساعت پہلے ہی آنکھیں کھولی تھیں۔ اوپر آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کچھ دیر یوں ہی سامنے صحن کی طرف دیکھتی رہی۔ یک دم ہی جیسے وہ بے زار سی ہوگئی تھی۔

آج کا دن اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔ صبح اٹھتے ہی ناشتے کی میز پر مما اور حمیرا کی بحث کہ خاندان میں سے ہی حمیرا کا رشتہ آیا تھا اور حمیرا کی ضد کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف اور صرف سعدون نصیر سے۔ سعدون اس کا یونی ورسٹی فیلو تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی اور محبت کا رشتہ دوران تعلیم ہی استوار ہوا تھا۔

سعدون ایک تو غیر سید دوسرا متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ غیر سید کی حد تک تو مما راضی ہو ہی گئی تھیں کہ اب خاندان میں دو تین افراد نے غیر سیدوں میں شادی کی تھی۔ خود اس کے ڈیڈ کی دوسری بیگم غیر سید تھی اور بڑے بھائی نے بھی غیر سید لڑکی سے شادی کی تھی۔ مسئلہ سعدون نصیر کا اسٹیٹس تھا۔ اسلامیہ پارک کے ایک چار مرلے والے گھر میں رہنے والے کلرک نصیر احمد کا بیٹا، سعدون انہیں قابل قبول نہیں تھا۔

دن کا آغاز دونوں کی چیخ چیخ سے ہوا پھر گاڑی خراب ہوگئی اور شام کو وجدان سے ہونے والی گفتگواب جب کہ اس کے خیال میں رزلٹ ملنے والا تھا۔ وجدان کا چونک جانا اس کے لیے انتہائی بے زار کن تھا۔ اس پر زمل سے بات کر کے بھی وہ بد مزا ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس آخری واقعے کے بعد زمل بہت پریشان ہوگی اور اس سے اپنی پریشانی شیئر کرے گی لیکن ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ زمل نے اس روز کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

اس روز وہ سب لاہور کی کچھ پرانی عمارتیں دیکھنے گئے تھے۔ اور یہ تجویز بھی اس کی تھی اسے پرانی عمارتوں پر ایک آرٹیکل لکھنا تھا تو اس نے سب کو ہی چلنے کو کہا تھا۔ زمل کو بھی پرانی عمارتیں فیسی نیٹ کرتی تھیں۔ یوں ایک وین میں وہ سب گھر سے نکلے تھے۔ مسجد وزیر خان دیکھنے کے بعد وہ حویلی نہال سنگھ دیکھنے آئے تھے۔ زمل نے مسجد وزیر خان بھی پہلی بار دیکھی تھی۔

''بچپن میں ظفر چاچو نے ہمیں شاہی مسجد، شالامار باغ، شاہی قلعہ اور مقبرہ جہانگیر دکھایا تھا بس......''

وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی ہولے ہولے سمیرا کو بتا رہی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ کب سب آگے کہیں نکل گئے تھے۔ سمیرا اسے وہاں ہی رکنے کا اشارہ کر کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں کہ سب لوگ کدھر ہیں۔''

اور پھر اس نے آزین کو جو مرسل کے ساتھ بات کرتا ہوا آگے جا رہا تھا روکا۔

''زین پلیز! ذرا پیچھے جا کر دیکھنا تو زمل کہاں رہ گئی ہے۔ ہم دونوں ساتھ ہی آرہے تھے کہ وہ پتا نہیں کہاں پیچھے رہ گئی۔ میرے پاؤں ان جوتوں میں کمفر ٹیبل نہیں ہیں اور وہ گھبرا رہی ہوگی۔''

اور آزین فوراً ہی مڑ گیا تھا لیکن چند لمحوں بعد ہی واپس آ گیا تھا۔

''واپس کیوں آگئے ہو زین، تمہیں پتا تو ہے وہ کبھی اکیلی کہیں گئی نہیں، گھبرا رہی ہوگی۔ وہ وہاں ہی کھڑی تھی۔''

''اکیلی نہیں ہے وہ......وجدان ہے اس کے ساتھ۔''

آزین کی آنکھوں کی اذیت اور چہرے پر موجود پتھریلی سنجیدگی سے اسے کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔آزین آگے بڑھ گیا تھا اور وہ وہاں ہی کھڑی تھی،لبوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ تھی تب ہی کسی طرف سے مرتضٰی نکل کر اس کے قریب آیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے،اکیلے اکیلے کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟''

''ویسے ہی ایک فنی سا خیال آ گیا تھا۔''

اس نے قدم واپسی کے لیے موڑے کہ جانتی تھی وجدان اور زمل وہاں ہی کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

''سنو! کیا تم آزین کو پسند کرتی ہو؟'' مرتضٰی نے ایک غلط اندازہ لگایا تھا اور تھا تو وہ سحرش کا بھائی ہی،اس لیے زیادہ دیر تک بات دل میں نہیں رکھ سکا تھا۔

اس نے صرف مسکرا کر اسے دیکھا۔اس وقت مرتضٰی کی آنکھوں میں اسے کسی لومڑی کی سی چمک نظر آئی تھی۔

''تم اسے زمل سے دور کرنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن کیا جانتی ہو ان کا نکاح ہو چکا ہے۔''

یقیناً وہ بلا کا ہوشیار اور چالاک تھا۔اس نے وہ نوٹ کر لیا تھا جو اور کسی نے نہیں کیا تھا۔الحمرا والے واقعے کے بعد اس نے کبھی مرتضٰی کو اپنے معاملے میں شامل نہیں کیا تھا لیکن شاید وہ تب سے اسے نوٹ کر رہا تھا۔

وہ پھر مسکرائی تھی کہ وہ تو زمل اور آزین کے نکاح کے متعلق جانتی تھی لیکن وہ اس کے اور وجدان کے متعلق نہیں جانتا تھا۔

''تم کچھ بتانا نہیں چاہتیں تو تمہاری مرضی لیکن میں ایک بار تمہارے کام آ چکا ہوں۔دوبارہ بھی آ سکتا ہوں۔ضرورت پڑی تو بتانا......''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوچا تھا کس قدر گھٹیا ہے یہ شخص......لگتا ہے آزین اور زمل

کے ساتھ اس کی کوئی دشمنی ہے۔

''تو اس تابوت میں آخری کیل تم ٹھونکو گے مرتضیٰ ارباب......''

ساری بے زاری یک دم ختم ہوگئی تھی۔ وہ سیدھی ہوئی اور مسکراتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی۔ ثوبیہ نے اسے بلایا لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے آزین کے پاس طیب کی خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسد جو ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا، ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولنے لگا۔

☆......☆......☆

''تو میں کہہ رہا تھا دوستو کہ بے روزگاری، غربت، تعلیم، علاج، مہنگائی، منافقت...... بے شمار ایشوز ہیں۔ اب کس کس پر بات کی جائے اور صاحب اقتدار اپنا پیٹ بھریں یا ان ایشوز کا سوچیں۔'' وہ جیسے بہت دیر سے بول رہا تھا، تھک کر چپ کر گیا۔

''دراصل......'' اس کے خاموش ہو جانے پر اسد نے سب کی طرف دیکھا۔ ''جب سے یہ ملک وجود میں آیا ہے، گدھوں کے نرغے میں ہے، کچھ لاش پر چمٹے ہیں اور کچھ باری کے انتظار میں اوپر اڑ رہے ہیں۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے یار، کہ یہاں سب برا ہے۔ اگر کچھ برے لوگ ہیں تو اچھے بھی ہیں۔ تب ہی تو یہ ملک اب تک دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔'' مرسل ہمیشہ مثبت سوچتا اور پر امید رہتا تھا۔

''تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ تمہاری پیدائش سے پہلے اس ملک کا ایک حصہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا جو آج بنگلہ دیش ہے۔'' اسد کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں نے حقائق سے کبھی انکار نہیں کیا اور میں اپنی ملکی تاریخ سے پوری طرح باخبر ہوں۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم دوسروں پر الزام لگانے کے بجائے اپنے گریبان میں بھی جھانک لیا کریں۔ لیکن ہمیں عادت ہوگئی ہے حکمرانوں کو برا بھلا کہنے کی۔ کیا ہم نے خود کبھی سوچا کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ بجلی ہم چوری کرتے ہیں، منافقت، جھوٹ، رشوت، دھوکا، ظلم...... کیا ہم خود انفرادی طور پر یہ سب نہیں کر رہے۔ کسی سرکاری ادارے میں بل درست کرانے جاؤ تو رشوت مانگتے ہیں۔ کیا اس وقت ملک

کے حکمران نے ان سے کہا تھا کہ مرسل عظیم کا بل درست کرنے کے لیے اس سے دو ہزار رشوت لے لو۔ اگر ہر فرد خود اپنا احتساب کر کے خود کو درست کر لے تو بہت کچھ درست ہو سکتا ہے۔

ارسلان بھائی نے بتایا تھا کہ ایک بار یو کے میں ایک ویران جگہ پر انہوں نے زمین پر گرا ہوا ٹافی کا ریپر ایک بوڑھے کو اٹھا کر اپنی پاکٹ میں ڈالتے دیکھا تھا۔ پولیس کا ڈنڈا اس کے سر پر نہ تھا بلکہ اسے خود پتا تھا کہ اسے اپنے ملک کو صاف رکھنا ہے جب کہ ہم اپنے گھروں کا کوڑا دوسروں کے گھروں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ کئی بار جب میں صبح اٹھتا ہوں تو میری گلی کی عورتیں اس لیے ایک دوسرے سے لڑ رہی ہوتی ہیں کہ ان کے گھر کے سامنے کسی دوسرے نے کوڑا اکٹھا کر کے ڈال دیا ہے تو میرے دوستو! ہمیں سیاست دانوں اور حکمرانوں پر تنقید کرنے کے بجائے اپنے عوام کو ایجوکیٹ کرنا اور ان کی سوچ بدلنا ہے۔ اسے تعمیری رخ دینا ہے۔“

مرسل بات کرتے کرتے موضوع سے کچھ ہٹ گیا تھا۔ وجدان کرسی کی ہتھی پر کہنی ٹکائے بہت دل چسپی اور دھیان سے اسے سن رہا تھا۔ اسے مرسل کی بات سے اتفاق تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا اگلا کالم وہ اس موضوع پر لکھے گا۔ یوں بھی پچھلے کالم کے بعد ایڈیٹر صاحب نے اسے ہاتھ ہولا رکھنے کو کہا تھا۔

”اتنا زہریلا سچ بولو گے تو لوگ جینے نہیں دیں گے۔“

وہ اس کے لیے پریشان تھے تو طے ہوا کہ اگلا کالم ہلکا پھلکا ہوگا اور اس کا عنوان ہوگا ”خود احتسابی“......وہ مسکرا کر سیدھا ہوا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے مرسل، کہ عوام کی سوچ کو کیسے بدلا جائے۔“

”وہ جیسی ہے ایسے ہی رہے گی میرے بھائی، مرسل کو خواب دیکھنے کی عادت ہے۔ زمانوں سے یہ خواب دیکھ رہا ہے کہ کہیں سے اسے جادو کی چھڑی مل جائے اور اسے گھمائے تو سب اس کے خوابوں جیسا ہو جائے۔ عوام خوش حال ہوں، ملک صاف ستھرا ہو۔ حکمران اور سیاست دان بہت اچھے ہوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔“ اسد پتا نہیں کیوں اتنا تلخ ہو رہا تھا۔

”اپنی گزشتہ تاریخ دیکھ لو اس ملک کو وجود میں آئے آج تقریباً پچپن، چھپن سال ہو گئے ہیں۔

کیا تم مجھے بتا سکتے ہو وجدان احمد، کہ ان سالوں میں ہم نے کتنی عزت اور ترقی حاصل کی ہے۔ ان مکار اور جھوٹے لیڈروں نے ملک کی اور قوم کی کتنی خدمت کی ہے اور حکمرانوں نے اپنے خزانے ہی بھرے ہیں۔ ملک وقوم کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"میں مرسل کی بات دہراؤں گا کہ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، تم خود بتاؤ کہ کیا 1947ء میں جب پاکستان بنا تو کیا یہ ہی حالات تھے جواب ہیں۔ تمہیں خود ہی اپنی بات کا جواب مل جائے گا کہ ان سالوں میں ملک نے کتنی ترقی کی ہے۔"

اس سے پہلے کہ اسد وجدان احمد کی بات کا جواب دیتا کہ بی بی اماں کے آنے پر سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہاں تو اس وقت خنکی ہو رہی ہے۔ ڈرائنگ روم میں چلے جاؤ سب...... میں نے صبح ساجدہ سے کہہ کر صفائی کروا دی تھی۔"

"ارے نہیں بی بی اماں، باتوں کی گرما گرمی میں یہ خنکی اچھی لگ رہی ہے۔ پھر اب ہم کچھ دیر تک جانے ہی والے ہیں۔" جواب سمیرا نے دیا تھا۔

"اب کھانا کھا کر ہی جانا سب...... میں نے مرغ چنے پکائے ہیں۔ اور شیخو سے کہتی ہوں باہر سے نان کباب لے آئے۔"

گو سالن اتنا تو ہوتا تھا کہ چار چھ بندے فالتو ہو جانے کے باوجود پورا ہو جاتا لیکن بی بی اماں نے مناسب سمجھا تھا کہ باہر سے بھی کچھ منگوا لیں۔

"نہیں بی بی اماں! ہم کھانا نہیں کھائیں گے فی الحال تو ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔ اتنے پکوڑے کھا لیے تھے۔ اول تو ہم رات کا کھانا گول کریں گے اور اگر کھایا بھی تو بہت دیر سے کھائیں گے۔"

مرسل نے سب کی ترجمانی کی تھی۔

"جیسے تمہاری مرضی پھر بھی......" بی بی اماں نے آزین کی طرف دیکھا۔ "اگر ضرورت ہوئی تو شیخو کو بھیج کر باہر سے کچھ منگوا لینا۔"

آزین نے سر ہلایا۔ اور وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں تاکہ شاہ زیب کے لیے روٹی بنالیں کہ انہیں کھانے کے بعد دوا لینی ہوتی تھی۔

''تمہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں زین...... میں دیکھتی ہوں کہ تم نے کبھی کسی بحث میں حصہ نہیں لیا، نہ ہی کبھی اپنی کوئی رائے دی ہے۔'' بی بی اماں کے جانے کے بعد سمیرا نے آزین سے پوچھا۔

''یہ ہی سمجھ لو۔'' آزین نے مختصر جواب دیا تھا۔

''پھر بھی تمہاری نظر میں کون سی پارٹی یا لیڈر ملک کے لیے بہتر ہو سکتا ہے؟''

سمیرا پتا نہیں کیا جاننا چاہ رہی تھی، اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''مجھے نہ کسی پارٹی سے کوئی دلچسپی ہے نہ کسی لیڈر سے۔''

''کیا اس کی وجہ وہ کرائسس ہیں جن سے تمہاری فیملی کو گزرنا پڑا...... ورنہ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی رائے تو ہوتی ہے کسی لیڈر یا پارٹی کے متعلق......'' سمیرا اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''لیکن میری کوئی رائے نہیں ہے، وجہ جو بھی ہو۔'' ایک کرب ناک سا تبسم اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔

وجدان کا دھیان ان دونوں کی طرف تھا جب کہ باقی سب عمر سے کچھ سنانے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔

''زین......!'' سمیرا نے لہجے میں ہمدردی سموئی تھی۔ ''میں بہت دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں۔ ہمارے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں ہے کہ میں تم سے تمہاری پریشانی کی وجہ پوچھ سکوں اور اگر پوچھوں بھی تو ضروری نہیں کہ تم بتاؤ بھی، اسی لیے میں نے سوچا کہ زل سے پوچھوں گی لیکن زل سے باتیں کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں تمہاری پریشانی کی وجہ زل خود تو نہیں ہے۔ وہ تمہاری کزن ہی نہیں، تمہاری منکوحہ بھی ہے اور اس کا وجدان کی طرف ملتفت ہونا یقیناً تمہیں پریشان کر رہا ہو گا حالانکہ ضروری نہیں زین، جو آپ دیکھ رہے ہوں، وہ سچ ہو۔ کبھی کبھی آنکھیں دھوکا بھی کھا جاتی ہیں۔ زل کا اور تمہارا بندھن بہت مضبوط ہے۔ نکاح کا بندھن...... زل ایک سادہ اور پیاری لڑکی ہے۔ اور

اس کا دل بہت صاف شفاف ہے۔"

سمیرا تیر چلا کر اب مرہم رکھ رہی تھی۔

"کوئی بھی بندھن اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ وہ ٹوٹ نہ سکے، خواہ وہ نکاح کا بندھن ہو یا محبت کا......"

آزین بولا تو اس کی آواز بہت ٹوٹی اور بکھری ہوئی سی تھی۔ وجدان یہ تو نہیں سن سکا تھا کہ سمیرا اور آزین کے درمیان کیا بات ہو رہی ہے لیکن آزین کی آنکھوں میں ایک زخمی سی کیفیت دیکھ کر اس نے بے اختیار سمیرا کو آواز دی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، چلتے ہیں ابھی......" سمیرا اپنی کارکردگی پر بے حد مطمئن تھی۔

عمر کی ڈائری پر جھکے وہ تینوں سیدھے ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ثوبیہ اور سحرش سیڑھیوں پر بیٹھی سر جوڑے کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

"یہ آداب محفل کے خلاف ہے کہ سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے ہیں۔" اسد نے اعتراض کیا تھا۔ "ہمیں سب کو اپنی گفتگو میں شامل رکھنا چاہیے۔"

"ہاں لیکن اب باہمی دلچسپی کی بات ہوگی سیاست اور سیاست دانوں، لیڈروں اور حکمرانوں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" سحرش نے سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی تھی۔

"اور سب سے پہلے تم دونوں نے ہی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی تھی اور محفل میں بیٹھ کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔" اسد بھی اس کی طرح ادھار نہیں رکھتا تھا۔

"تو ہم خالص زنانہ گفتگو کر رہی تھیں یعنی غیبت اور لگائی بجھائی وغیرہ......" سب کے لبوں پر ہی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی سوائے آزین کے......

"کیوں کیا تم عورتوں کے پاس ان دو موضوعات کے علاوہ اور کوئی موضوع نہیں ہوتا؟" اسد کو کبھی کبھار سحرش سے بحث کرنا اچھا لگتا تھا۔

''ہوتے ہیں لیکن وہ ہمارے سیکرٹ ہوتے ہیں، آپ لوگوں کو بتانے والے نہیں ہوتے۔'' وہ بھی سحرش تھی، یہ ناممکن تھا کہ وہ جواب نہ دیتی۔

''ویسے تم سب بھی کیا کر رہے تھے۔ سمیرا بی بی زین کے کان بھر رہی تھیں، تم عمر کو پٹیاں پڑھا رہے تھے۔''

سحرش عمر میں سب سے چھوٹی تھی لیکن کبھی کبھار وہ سب سے برابری کی سطح پر آ کر بات کرنے لگتی تھی۔

''ہم عمر سے اس کا کلام سننا چاہ رہے تھے لیکن جب اس نے نہیں سنایا تو ہم اس کی ڈائری میں سے ایک ساتھ اس کی غزلیں پڑھ رہے تھے۔'' ضیاء نے وضاحت کی البتہ سمیرا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''تو خیر بات وہاں سے ہی شروع کرتے ہیں جہاں ختم کی تھی۔'' اسد کے دل میں آج ملک و قوم کا بہت ہی درد اٹھ رہا تھا۔

''ہرگز نہیں، اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جس کا تعلق سیاست، سیاست دانوں، لیڈروں یا حکمرانوں سے ہوگا۔ اخبار بھرے پڑے ہیں ان کے ذکر سے......'' مرسل نے ہاتھ اٹھایا۔

''تو پھر......؟'' اسد نے پوچھا۔

''تو پھر یہ کہ......

سکھ کے پھول

بدی کے کانٹے

دکھ کی گھاس

سب بکواس......سب بکواس''

مرسل نے بلند آواز سے کہا اور سب ہی اس کے ہم آواز ہو کر گانے لگے تھے۔

سوائے آزین کے......

''سکھ کے پھول

بدی کے کانٹے

دکھ کی گھاس......

سب بکواس، سب بکواس!"

سب کے چہروں سے اطمینان اور سکون جھلکتا تھا اور ایک پر مسرت چہکار کے ساتھ وہ گا رہے تھے۔

☆......☆......☆

ثمرہ بے حد مضطرب اور بے چین سی کبھی بیڈ پر بیٹھ جاتی کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ ماروی نے وہی کیا تھا جیسا اس نے کہا تھا۔ لیکن ویسا کچھ نہیں ہو سکا تھا جیسے اس نے چاہا تھا۔ اختر بانو زندہ تھی اور ثوبان شاہ اسے کراچی لے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اختر بانو کو شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔

اب پتا نہیں یہ ہارٹ اٹیک اسے ویسے ہی ہو گیا تھا یا ماروی نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اس کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی۔ اس کی وجہ سے ہوا تھا، وہ نہیں جانتی تھی لیکن اختر بانو کو مارنے کی جو شیطانی سوچ اس کے اندر اچانک پیدا ہوئی تھی، اس پر اس نے خود کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ آخر اتنے سالوں سے وہ ایک ہی چھت تلے رہ رہی تھیں اور اس سے پہلے کبھی اس کے دل میں ایسا خیال پیدا نہیں ہوا تھا اور اب جانے کیا ہو گا۔ اور کیا نتیجہ نکلے گا۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ تھی۔ اگر اختر بانو نے ماروی کو دیکھ لیا ہو تو...... کیا ہو گا وہ نہیں جانتی تھی لیکن جو بھی ہو گا برا ہی ہو گا۔

کاش وہ ماروی کو ایسا کرنے کو نہ کہتی لیکن حسد ایک ایسی بیماری ہے جو آدمی کو پاگل کر دیتی ہے اور وہ بھی پاگل ہی ہو گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ سب کچھ ویسے ہی آسانی سے ہو جائے گا جیسے اس نے سوچا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تو ناشتے کے بعد ہی منصوبے کے مطابق بڑی حویلی چلی گئی تھی جہاں سب ہی آئے ہوئے تھے۔

شایان تو دو روز سے ادھر ہی تھا۔ صفورا، مہران شاہ کے ساتھ کراچی گئی ہوئی تھی۔ ثمینہ کو وہ ساتھ ہی بڑی حویلی لے گئی تھی کہ چلو سب سے مل لینا۔

جاتے ہوئے اس نے ماروی کو تاکید کی تھی وہی کرنا ہے جو میں نے کہا ہے۔ آنسو بھری آنکھوں

سے ماروی نے ہاتھ جوڑے تھے۔ منت کی تھی لیکن اس وقت اس نے نہ اس کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھا تھا نہ اس کے جڑے ہاتھوں کی پروا کی تھی۔ بس حکم دے کر چلی گئی تھی لیکن پھر کیا ہوا تھا۔ وہ جو بے حد مطمئن سی خوش خوش لاؤنج میں بیٹھی اپنی بھابیوں سے باتیں کر رہی تھی کہ آج اختر بانو کا کانٹا ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جائے گا اور اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آج سے پہلے یہ خیال اس کے دل میں کیوں نہیں آیا تھا۔ آ جاتا تو اس کے تینوں بچے بھی آج اس کے ہی ہوتے، شایان کی طرح......

تب ہی دلاور شاہ لاؤنج میں آئے اور اسے مخاطب کیا۔

''ثوبان کا فون آیا ہے کہ اختر بھابی کی حالت ٹھیک نہیں ہے، وہ اسے لے کر کراچی جا رہے ہیں تم فوراً حویلی پہنچو......''

''حالت ٹھیک نہیں ہے، مطلب وہ زندہ ہے۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ کسی اور نے تو اس کی بات سنی نہیں تھی لیکن دلاور شاہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا لیکن فوری طور پر کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔

ثمینہ بھی اس کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔ بھاگی نے بتایا کہ ثوبان شاہ گھر آئے تو اختر بانو بے ہوش پڑی تھی اور اوکھے اوکھے سانس لے رہی تھی۔ ریحان سے مشورے کے بعد وہ پہلے فوری ٹریٹمنٹ کے لیے بیدار بخت کے اسپتال چلے گئے تھے۔ زمان شاہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بھاگی سے صورت حال معلوم کرنے کے بعد دلاور شاہ اور ثمینہ نے بھی اسپتال جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے دلاور شاہ سے پوچھا۔

''میں......میں بھی ساتھ چلوں......؟'' وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

''بہتر ہے کہ تم گھر پر ہی رہو ثمرہ......گھر میں بھی کسی کا ہونا ضروری ہے۔ ثمینہ ساتھ جا رہی ہے نا۔''

دلاور شاہ نے اسے منع کر دیا تھا اور اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اسے ماروی سے صورت حال جاننی تھی۔ سب کے جانے کے بعد وہ سیدھی ماروی کے کوارٹر میں گئی تھی، وہ کمرے میں دیوار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے وہ کانپ رہی تھی۔ ثمینہ، صفورا اور اس کے ساتھ میکے سے ہی ذاتی ملازمائیں ساتھ آئی تھیں۔ وہ تینوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ اکیلی تھی۔

صفورا کراچی گئی ہوئی تھی اور ثمینہ کی ملازمہ ماروی کی شادی دو ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔

''ماروی......!'' اس نے بلایا تو وہ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''وہ......میں......میں نے بالکل ایسے ہی کیا تھا جیسے آپ نے کہا تھا۔ بڑی بی بی جی دوا کھا کر سو گئی تھیں۔ سنہری نے مجھے بتایا تھا وہ ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ سو گئیں تو وہ باہر آ گئی تھی۔ ماسی تاج دین اور سب اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھیں تو میں احتیاط سے دیکھ بھال کر ان کے کمرے میں گئی تھی۔'' ماروی نے تھوک نگلا۔

''پھر......؟'' ثمرہ کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

''پھر میں نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے کہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مچلی پھر ساکت ہو گئیں۔ میں نے سمجھا گزر گئیں۔ میں تکیہ واپس رکھ کر جلدی سے باہر آ گئی۔''

بھیگی پلکوں پر اٹکے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی کہ ثمرہ سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں تھی اس کی۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ ثمرہ کی طرف دیکھے گی تو وہ اس کی آنکھوں سے حقیقت جان لے گی۔ بات یہاں تک تو ٹھیک تھی کہ وہ اختر بانو کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ بہادر نہیں تھی لیکن خوف اور لالچ نے اسے بہادر بنا دیا تھا۔ اختر بانو سو نہیں رہی تھیں لیکن آنکھیں بند تھیں اور مشکل سے سانس لیتی تھیں۔ ہر سانس پر ان کا جسم ایک جھٹکا لیتا تھا۔ وہ فوراً ہی باہر نکل آئی تھی۔ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اختر بانو کا ویسے ہی آخری وقت آ گیا تھا۔ ہاں اس نے ماسی تاج، بھاگی کسی کو نہیں بتایا تھا کہ بڑی بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ لیکن پھر ثوبان شاہ جو حیدر آباد کسی کام سے گئے ہوئے تھے آ گئے اور......

''تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ زور سے دباتی۔'' ثمرہ نے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کیا اور اسے تھپڑ مارا۔ ''اچھی طرح سے یاد کر کے بتا کہ کسی نے تجھے کمرے میں جاتے اور باہر آتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا۔''

''نہیں......!'' ماروی نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''اور بڑی بی بی نے......؟''

''نہیں......!''اس نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔''وہ تو سو رہی تھیں۔''

لیکن ثمرہ خوف زدہ تھی اگر اسے اختر بانو نے نہیں بھی دیکھا تھا تو جب وہ ہوش میں آ کر بتائے گی کہ کسی نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر مارنے کی کوشش کی تھی تو ماروی تو فوراً ہی بک دے گی سب۔ سو سب سے پہلے اس نے ماروی کو وہاں سے بھجوانے کا بندوبست کیا۔ اور دلاور شاہ کو فون کر کے کہہ دیا کہ ماروی کو کسی سے ملنے اور بات کرنے کا موقع نہ ملے۔

''کیا بات ہے ثمرہ...... ماروی نے کیا کیا ہے؟''دلاور شاہ نے پوچھا تو اس نے پھر بتانے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

پوری رات وہ سو نہیں سکی تھی۔ صبح ثمینہ نے بتایا کہ ثوبان بھائی اختر بانو کو ابتدائی طبی امداد کے بعد کراچی لے گئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر بھی ساتھ ہے اور آکسیجن وغیرہ کا انتظام بھی ہے۔ زمان بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے حیدر آباد ہی رک جائیں۔ لیکن وہ حیدر آباد نہیں رکے تھے۔ وہاں ریحان کے دوست کے والد کے کلینک میں ایک دو گھنٹے ٹھہر کر ان کے مشورے پر کراچی چلے گئے تھے۔ وہ ہوش میں آ گئی تھیں۔ اور ثمینہ نے ہی بتایا تھا کہ اختر بانو کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ آپریشن ہو گا شاید۔

''اللہ کرے آپریشن ٹیبل پر ہی ختم ہو جائے۔''نہ جانے کتنی ہی بار اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

اور اگر ایسا نہ ہوا تو ثوبان شاہ تو ماروی کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے پوچھ گچھ کے لیے۔ تو ماروی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

بعض اوقات ایک جرم چھپانے کے لیے انسان مزید جرم کرتا چلا جاتا ہے اور ثمرہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور فیصلہ کرنے کے بعد فوراً ہی دلاور شاہ کو فون کیا تھا۔

''ادا سائیں! ماروی کو کاری کرنا ہے۔''

''لیکن کیوں...... کیسے؟''دلاور شاہ حیران ہوئے تھے۔

''کیوں کا جواب رہنے دیں اور ایسے جیسے ماروی کی ادی کو کاری کیا گیا تھا۔''

دلاور شاہ کا جواب سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اور بیڈ پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔

لیکن اندر سکون پھیلتا جا رہا تھا۔ چند لمحے وہ یوں ہی گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ پھر پرسکون ہو کر مسکرائی۔

تو اب کوئی نہیں جان سکے گا کہ ماروی کو کس نے بھیجا تھا۔ اول تو جیسا کہ ماروی نے بتایا تھا کہ اختر بانو نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اگر اس نے دیکھ بھی لیا ہو تو ماروی یہ بتانے کے لیے زندہ نہیں ہو گی کہ اسے کس نے اختر بانو کو مارنے کے لیے بھیجا تھا لیکن پھر سوال پیدا ہو گا کہ بھلا ماروی اسے کیوں مارنا چاہتی تھی تو سادہ سی بات ہے کہ اختر بانو کو ماروی کے متعلق پتا چل گیا ہو گا تو ماروی نے سوچا ہو گا کہ اس سے پہلے کہ اختر بانو کسی کو بتائے وہ اسے ختم کر دے۔ لیکن بھلا ایسی باتیں بھی کبھی چھپی ہیں۔ ماروی کے چکر کا پتا چل گیا اور اسے کاری کر دیا گیا۔

اس کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور اس نے دل ہی دل میں خود کو داد دی کہ اسے بروقت سوجھ گئی اور اس نے خود کو ثوبان شاہ اور شایان کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا۔ بات کھلتی تو شاید یہ راز بھی راز نہ رہتا کہ شایان شاہ اس کا نہیں، اختر بانو کا بیٹا ہے۔

وہ بے حد مطمئن سی ہو کر اٹھی۔ اسے یقین تھا کہ دلاور شاہ ایسا ہی کرے گا جیسا اس نے کہا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑا ہوا اپنا دوپٹا اٹھایا اور اسے اوڑھتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔

لاؤنج میں سامنے ہی صوفے پر بیٹھی ثمینہ ماسی تاج کو کچھ کہہ رہی تھی۔ ثمرہ خاموشی سے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ماسی تاج کے جانے کے بعد ثمینہ ثمرہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مہران بھائی کا فون آیا تھا۔ کل اختر بانو کے دل کا آپریشن ہے۔ جب سے مہران بھائی سے بات ہوئی ہے تب سے دعا مانگ رہی ہوں کہ اللہ اختر بانو بھابی کو صحت و زندگی عطا فرمائے۔"

ثمرہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ آج تک تو ان تینوں نے اختر بانو کو کبھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔ اور اب سنو ثمینہ بی بی کی بات کہ اختر بانو کے لیے دعا مانگ رہی ہے۔

ثمینہ نے شاید اس کی آنکھوں کی حیرت بھانپ کی تھی، تب خود ہی بولی۔

''اختر بھابی نے کیسے ساری حویلی کا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ ہمیں تو کبھی خبر ہی نہیں ہوئی کہ کیسے اکیلے وہ ساری ذمہ داریاں سنبھال رہی ہیں۔ اب دیکھو چاچا کرم دین کچھ دیر پہلے ہی ڈیرے سے آیا ہے۔ ماسی تاج بتا رہی تھی کچھ لوگ آئے ہیں کسی دوسرے علاقے سے ڈیرے پر دس بارہ بندے ہیں۔ شاید زمینوں پر کام کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اب مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ کہہ دیا ہے کہ چاچا کرم دین سے کہہ دو ڈیرے پر ہی رک کر شاہ جی کے آنے کا انتظار کریں۔ کھانے کا بھی کہہ دیا ہے کہ جیسے پہلے بھجواتی تھیں، اب بھی بھجوا دینا۔''

''ٹھیک کہا......''

ثمرہ جانتی تھی کہ کام کی تلاش میں دوسرے علاقوں سے لوگ آتے رہتے تھے۔ کبھی کسی علاقے میں بارش نہ ہونے سے سوکھا ہو جاتا، لوگ بھوکے مرنے لگتے تو آس پاس کے علاقوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ ثوبان شاہ اپنے والد سلطان شاہ کی طرح انہیں کبھی مایوس نہ کرتے تھے۔

''لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ ثوبان بھائی کو فون کر کے پوچھ لوں۔ ویسے شایان تو ادھر ہی ہے نا دلاور بھائی کی طرف...... اسے بلوا کر ڈیرے بھیج دیں۔ دیکھے تو جا کر کون لوگ ہیں کہاں سے اور کس نیت سے آئے ہیں۔''

ثمینہ اس وقت بہت ذمہ دار نظر آ رہی تھی۔

''ہاں......!''

ثمرہ کو اپنی پریشانی میں شایان کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ جب ثوبان شاہ کا فون آیا تھا تو وہ حویلی میں نہیں تھا۔ رضی کے ساتھ گیا ہوا تھا۔

''جب میں آئی تو وہ رضی وغیرہ کے ساتھ کسی دوست کی طرف گئے ہوئے تھے۔ کہہ رہا تھا شاید شکار پر جانے کا پروگرام بھی بن جائے۔ پتا نہیں واپس آئے ہیں یا نہیں، میں ابھی فون کر کے پتا کرتی ہوں۔''

''ثمرہ آپا! کیا خیال ہے آپ کا ہمیں اختر بانو بھابی کی مزاج پرسی کے لیے جانا چاہیے

کراچی ...... دل کا آپریشن ہے کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ سوچ رہی ہوں کیوں نہ میں اور آپ شان کے ساتھ کراچی چلے جائیں۔ ایک دن رہ کر واپس آ جائیں گے۔" ثمینہ نے ثمرہ کی رائے پوچھی۔

"ہاں تمہارا خیال صحیح ہے جانا تو چاہیے لیکن یہاں بھی تو کسی کا ہونا ضروری ہے۔ کیا سب کچھ نوکروں پر چھوڑ جائیں۔ مانا پرانے وفادار ملازم ہیں۔ سب معاملات سمجھتے ہیں لیکن آج تک ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ یہاں کوئی ایک بھی نہ ہو ہم میں سے ......" ثمرہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔ کسی کا حویلی میں ہونا ضروری ہے۔ سو مسئلے ہو سکتے ہیں۔" ثمینہ نے ثمرہ کی تائید کی۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں پہلے میں چلی جاتی ہوں۔ اگر شایان ابھی تک نہیں آیا تو میں بھاگی کو ساتھ لے جاؤں گی لیکن پہلے زمان شاہ سے پوچھ لوں گی۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو ڈرائیور اور بھاگی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ رہ رہ کر اختر بانو بھابی کا خیال آ رہا ہے۔ کیسے یکدم بیماری نے آ دبوچا۔ کتنی ٹھیک ٹھاک تھیں۔"

"دل کا درد ایک دن میں تو نہیں ہو جاتا۔ جانے کب سے کیا روگ لگا رکھا ہے اس نے دل کو......"

ثمرہ کا لہجہ طنزیہ تھا اور وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ پہلے تو کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی اختر بانو سے۔ اب خوامخواہ کا درد اٹھ رہا ہے۔

ثمینہ نے ایک نظر ثمرہ پر ڈالی اور سوچا عورت کے لیے اس سے بڑا روگ اور کیا ہو گا کہ اس کا شوہر دوسری شادی کر لے اور پھر اس کے ساتھ ناانصافی بھی کرے۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھلا اور شایان اندر داخل ہوا اور سلام کر کے ثمرہ کی طرف دیکھا۔

"بڑی امی کی طبیعت اتنی خراب تھی اور آپ نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

"جیسے ہی تمہارے بابا کا فون آیا دلاور بھائی کے پاس، میں تو فوراً ہی آ گئی تھی اور پھر تم تھے کہاں حویلی میں جو تمہیں بتاتی کہ تمہاری بڑی امی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" ثمرہ نے اپنی ناگواری

چھپانے کی کوشش کی۔

''لیکن آپ کو پتا تھا کہ ہم رضی بھائی کے دوست جمال سومرو کی طرف گئے ہیں۔ ہادی سے یا کسی سے بھی کہہ کر آپ وہاں فون کروا سکتی تھیں۔'' وہ بہت پریشان سا لگ رہا تھا اور لہجے سے ناراضی جھلکتی تھی۔

''وہ تو میں نے اپنے کسی کام سے اماں کو فون کیا۔ لاہور میں یونیورسٹی میں کسی لڑکے سے کام تھا۔ تب اماں نے بتایا کہ وہ کراچی میں ہے۔ آپ میرے لیے ایک کپ چائے بنوا دیں۔ میں شاور لے کر کراچی کے لیے نکلوں گا۔''

''لیکن تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟ سب ہی تو ہیں وہاں، تمہارے بابا، تمہارے چچا اور بھائی......'' بے اختیار ہی ثمرہ کے لبوں سے نکلا تھا۔

''بڑی امی کے دل کا آپریشن ہے امی۔ آپ کو اندازہ ہے وہاں سب کتنے پریشان ہیں۔ اماں تو ان کے متعلق بتاتے ہوئے رو پڑا تھا۔ اس مشکل وقت میں میرا بھی وہاں ہونا ضروری ہے۔'' شایان نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

''لیکن یہاں بھی تو کسی مرد کا ہونا ضروری ہے۔'' ثمرہ نہیں چاہتی تھی کہ شایان کراچی جائے لیکن نہیں جانتی تھی کہ خون کے رشتے کی اپنی کشش ہوتی ہے۔ بے شک وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کو جنم دینے والی ماں اختر بانو ہے۔ پھر بھی وہ بہت مضطرب اور بے چین تھا۔

''رضی بھائی یا ہادی یہاں ہی ہیں نا۔ ان میں سے کسی کو بلوا لیجیے گا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی اپنی تسلی کے لیے چاہیں تو...... ویسے تو ثمینہ چچی بھی ہیں یہاں۔ بلاوجہ مت روکیں مجھے۔'' اس نے شاکی نظروں سے ثمرہ کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! میں ابھی کراچی جانے کی بات کر رہی تھی ثمرہ آپ سے۔ تم شاور لے کر آؤ، اتنے میں تمہارے چچا جان سے بات کر کے اور انہیں اپنے آنے کا بتا کر میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں واپس آ گئی تو پھر ثمرہ آپا چلی جائیں گی کراچی۔ اور ہاں شاور لے کر پہلے ڈیرے کا ایک چکر

لگا لو۔ کرم دین چاچا نے پیغام دیا ہے کہ ڈیرے پر کسی دوسرے علاقے سے کچھ لوگ آئے ہیں تمہارے بابا سے ملنا ہے انہیں۔ تم ذرا ان سے مل کر دیکھ لو۔ پوچھ گچھ کر لو کہ کہاں سے آئے ہیں اور کس ارادے سے اور پھر نظام دین چاچا کو سمجھا دینا کہ تمہارے بابا یا چاچو کے آنے تک انہیں وہاں ہی روکے رکھیں اور ان کا خیال رکھیں کہ انہیں کوئی شکایت نہ ہو۔"

ثمینہ کو یک دم ہی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یوں کسی دوسرے علاقے سے آنے والوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اب جب کہ گھر میں کوئی بڑا نہیں تھا تو اسے ہی خیال رکھنا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

شایان اثبات میں سر ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو وہ زمان شاہ کو فون کرنے لگی۔

زمان شاہ نے ساری بات سن کر وہی کہا تھا جو اس نے شایان سے کہا تھا اور انہوں نے اسے شایان کے ساتھ آنے کی اجازت دے دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر ثمرہ آپا بھی آنا چاہیں تو آ جائیں۔ بہرحال آپریشن ہے۔ خطرہ تو معمولی آپریشن میں بھی ہوتا ہے اور جہاں تک گھر کی بات ہے تو ماسی تاج اور بخشو سے لے کر سب ہی جانتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ ڈیرے پر بھی چاچا نظام دین سب دیکھ لیتے ہیں۔ اور جب ثمینہ نے فون بند کر کے ثمرہ کو ساری بات بتائی تو اس نے انکار کر دیا۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ رات بھی بخار ہو گیا تھا تو وہاں جا کر زیادہ طبیعت خراب ہو گئی تو سب پہلے ہی پریشان ہیں۔"

"تو ثمرہ آپا! آپ رضی یا ہادی سے کہہ کر دوا منگوا لیں ڈسپنسری سے۔" ثمینہ نے مشورہ دیا۔

"دوا تو ادھر ہی دلاور بھائی نے منگوا دی تھی۔ طبیعت صبح سے بہتر تھی لیکن اب پھر سر بھاری سا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے بخار پھر ہو جائے گا۔" ثمرہ نے بہانا بنایا۔

"ماروی کو رات اپنے کمرے میں ہی سلا لیجیے گا۔" ثمینہ نے پھر مشورہ دیا۔ "کہیں خدانخواستہ رات زیادہ طبیعت خراب ہو گئی تو......"

"ماروی تو گھر گئی ہوئی ہے چھٹی لے کر...... کہہ رہی تھی چھوٹی بہن کی شادی کی تیاری کرنی

ہے۔ میں سنہری کو سلالوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر مجھے لگا کہ طبیعت زیادہ خراب ہے تو بڑی حویلی سے کسی کو بلالوں گی یا خود ادھر چلی جاؤں گی۔"

"میں بس آپریشن کے بعد آ جاؤں گی۔ آپ دعا کرنا ثمرہ آپا...... اللہ اختر بانو بھابی کو صحت و تندرستی اور زندگی عطا فرمائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے میں اور صفورا بیاہ کر حویلی آئے ہیں انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ ہم لوگوں نے کبھی کچھ کہہ بھی دیا تو پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گئیں۔ وہ غیر سید تھیں تو اس بات کو لے کر کئی بار ہم نے سخت باتیں بھی کہہ دیں لیکن......"

ثمینہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

ثمرہ نے اثبات میں سر ہلایا لیکن دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا۔ اللہ کرے اب اختر بانو حویلی میں زندہ سلامت قدم نہ رکھے۔ اب تو میت ہی آئے اس کی۔ کتنی ہی بار اس نے دل ہی دل میں اس کی موت کی دعا مانگی تھی لیکن دل کو پھر بھی قرار نہیں تھا۔ ثمینہ اور شایان کے جانے کے بعد وہ یوں ہی لاؤنج میں بیٹھی رہی۔ ماسی تاج یا بھاگی وغیرہ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بار ماسی تاج اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر آئی تھی یہ پوچھنے کہ اپنی مرضی سے کچھ خاص پکوانا ہو تو بتا دیں۔

"اپنی مرضی سے جو دل چاہے پکا لیا کرو، مجھ سے کچھ پوچھنے مت آیا کرو۔"

وہ بے زاری بیٹھی تھی۔ اسے تو یہ یقین تھا کہ دلاور شاہ وہ ہی کریں گے جو اس نے کہا تھا لیکن کب...... اس کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ انہوں نے تو اسے اس بات کا بھی یقین نہیں دلایا تھا کہ وہ واقعی ماروی کو......

وہ مضطرب سی ہوئی۔ غلطی تو اس کی اپنی ہی تھی۔ اس نے کسی یقین دہانی کے بغیر ہی فون بند کر دیا تھا۔

"مجھے ایک بار پھر دلاور بھائی سے بات کرنی چاہیے۔" وہ انہیں فون کرنے کے خیال سے اٹھی ہی تھی کہ دلاور شاہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

"اداسائیں آپ......!" وہ حیران سی کھڑی ہوئی۔ "میں آپ کو فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی۔"

دلاور شاہ نے حسب عادت اور روایت کے مطابق اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کراچی سے کوئی فون آیا...... کیا خبر ہے؟''

''کل آپریشن ہے اختر بانو کے دل کا۔ شایان اور ثمینہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کراچی جانے کے لیے نکلے ہیں۔''

''اللہ خیر کرے۔'' ثمرہ نے بتایا تو دلاور شاہ کے لبوں سے نکلا اور ثمرہ نے دل ہی دل میں کہا کہ اللہ کبھی خیر نہ کرے اور یہ حویلی پھر کبھی اختر بانو کو زندہ نہ دیکھے۔

''تمہیں بھی جانا چاہیے تھا۔ بھلے تمہارا دل نہ مانتا۔ دنیاداری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔''

وہ جانتے تھے کہ ثمرہ اختر بانو کو پسند نہیں کرتی لیکن بڑے بھائی کی حیثیت سے سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔

''اگر تمہارا ارادہ ہو تو میں ساتھ لے چلوں گا۔''

''جی میں ثمینہ آجائے تو پھر جاؤں گی۔ یہ ہی طے کیا تھا ہم نے، حویلی میں بھی تو کسی اپنے کو ہونا چاہیے نا، خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو......''

''اللہ نہ کرے......'' دلاور شاہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''خیر ثمینہ آجائے تو پھر چلے جائیں گے۔ مجھے بھی تو جانا ہے مزاج پرسی کے لیے۔ اس وقت تو میں تم سے بات کرنے آیا تھا۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے کمرے میں چلو، وہاں جا کر بات کرتے ہیں۔ یہاں لاؤنج میں کسی وقت بھی کوئی ملازمہ کسی کام سے آسکتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی سنے۔''

وہ ابھی تک کھڑے تھے۔ ثمرہ سر جھکائے ان کے ساتھ کمرے میں آئی۔ وہ انہیں دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ ماروی کے متعلق بات کرنے آئے ہیں۔

''تم ماروی کو کیوں مروانا چاہتی ہو؟'' روم چیئر پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اس غریب نے آخر کیا جرم کیا ہے۔ دیکھو ثمرہ! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ ورنہ دوسری

صورت میں......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی ادا سائیں...... میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ ثوبان شاہ اختر بانو کو اتنی توجہ دیں اتنا خیال رکھیں اس کا...... اتنے سال انہوں نے اختر بانو کو نظر انداز کیے رکھا اور اب اس کی پٹی ہی پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ بس میرا دماغ خراب ہو گیا تھا اور میں نے ماروی کو......''

وہ سر جھکائے بتاتی چلی گئی۔ جانتی تھی کہ انہیں سچ بتائے بنا کوئی چارہ نہیں، وہی تھے جو اس کی اس غلطی پر پردہ ڈال سکتے تھے۔

ساری بات سن کر دلاور شاہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

''تم ایک انتہائی بے وقوف عورت ہو ثمرہ۔ پہلے بھی تم نے بابا جان کو مجبور کیا تھا کہ وہ دادا جان سے تمہاری شادی کی بات کریں جب کہ ہم دونوں بھائی اور اماں جان اس کے لیے بالکل رضامند نہ تھے کہ ثوبان پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ دادا جان تو یوں بھی ثوبان شاہ اور اختر بانو کی شادی کے مخالف تھے۔ یہ تو سلطان چچا نے اپنی مرضی کی تھی اور اب جب سلطان چچا نہیں رہے تھے تو انہیں موقع مل گیا تھا ثوبان کو مجبور کرنے کا۔ حالانکہ تمہاری اور ثوبان کی شادی کا کوئی جواز نہیں تھا جب کہ تمہارے جوڑ کا رشتہ خاندان میں موجود تھا۔ اور اب تم نے ایک اور بے وقوفی کی۔ کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا......؟ وہ ایک خاموش طبع اور صابر خاتون ہیں۔ تمہیں تو الٹا ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ انہوں نے اپنے جگر کا ٹکڑا ثوبان کے کہنے پر تمہاری جھولی میں ڈال دیا اور شان کو بھی جتایا تک نہیں۔''

ثمرہ نے جز بز سا ہو کر پہلو بدلا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ یہاں حویلی میں کبھی کسی کو ان سے شکایت ہوئی ہو اگر یہ بات کھل گئی تو جانتی ہو کیا ہو گا...... ثوبان تمہارا یہ قصور کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اختر بانو بھابی اس کے چار بیٹوں کی ماں ہے۔ اس صورت میں تم شایان کو بھی کھو دو گی۔'' ان کی دبی دبی آواز سے غصہ صاف جھلکتا تھا۔

''یہ ہی نہیں ہمارا خاندان بکھر جائے گا۔ بڑے تایا کا خاندان ہو یا چھوٹے تایا اور سلطان چچا کا...... مزاجوں کے اختلاف کے باوجود ہم ہمیشہ ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی بھی مسئلے میں کوئی کسی کو

اکیلا نہیں چھوڑتا۔ یہ جو پچھلے کئی سالوں سے ہم الیکشن میں مخالفت کے باوجود جیت جاتے ہیں تو اس کی وجہ بھی ہم سب کا ایک ہو کر اپنے خاندان کو مضبوط کرنا ہے۔'' انہوں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''اسی لیے...... اسی لیے تو میں نے ماروی کو کاری......''

''منصوبہ بندی میں تو تمہیں کمال حاصل ہے۔'' دلاور شاہ نے اس کی بات کاٹی۔ لہجہ طنزیہ تھا۔

''تو اب کیا ہوگا اداسائیں......؟'' ثمرہ گھبرائی۔ ''کیا کریں گے آپ......؟''

''کیا ہونا ہے؟'' دلاور شاہ بولے تو ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اپنے خاندان کی عزت اور ساکھ بچانے اور اسے مضبوط رکھنے کے لیے......''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر ثمرہ کی طرف دیکھا جو کچھ گھبرائی ہوئی اور پریشان سی لگ رہی تھی۔

''شکر کرو کہ اس کے حویلی پہنچتے ہی میں نے اسے ڈیرے پر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ورنہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھی۔ وہ کوئی ناسمجھ لڑکی یا بچی نہیں ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ تم نے اسے کیوں بھجوایا ہے۔ اکتیس بتیس سال کی ہے۔ وہ میرے پاؤں پر گر گئی تھی۔ ہاتھ جوڑنے لگی تھی کہتی تھی اس نے کچھ نہیں کیا۔ درخواست کر رہی تھی کہ ایک بار تم اس کی بات سن لو۔ شاید وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ چلو سن لو کیا کہنا چاہتی ہے۔''

''نہیں......!'' ثمرہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جانتی ہوں کیا کہنا ہے اسے۔ منت کرے گی زبان بند رکھنے کا وعدہ کرے گی لیکن کیا گارنٹی ہے کہ وہ زبان بند رکھے گی۔ وہ ایک کمزور لڑکی ہے۔ مار نہیں سہہ سکے گی، بک دے گی سب کچھ......''

ثمرہ کو بھی افسوس تھا کہ وہ بے گناہ ماری جائے گی۔ نو دس سال کی بچی سی تھی جب اس کے ساتھ آئی تھی۔ دس سال کی عمر میں ہی اس کا نکاح اس کے چچا کے بیٹے سے ہو گیا تھا لیکن رخصتی سے چند ماہ پہلے کھیت میں کام کرتے ہوئے اسے سانپ نے ڈس لیا۔ یوں وہ رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ پھر اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ خود ہی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک کمزور سے دل کی لڑکی تھی۔ ذرا

اونچا بولنے پر ڈر جاتی تھی۔ ثمرہ کو اس سے ہمدردی تھی اتنے سالوں سے وہ اس کی خدمت کر رہی تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ یا اسے اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ ہمیشہ کئی راستے ہوتے ہیں۔

"کون......کون مارے گا اسے ادا سائیں......؟" ثمرہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

"غیرت کے نام پر کوئی خونی رشتہ ہی مار سکتا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی سے بات کروں گا۔ جوشیلا اور جذباتی سا ہے۔ مارنے کے بعد تھانے جا کر اعتراف کر لے گا۔ بعد میں کچھ دے دلا کر چھڑا لیں گے۔" ایسا ہی تو ہوتا تھا...... غیرت کے نام پر قتل کرنے والوں کو پشت پناہی کرنے والے چھڑا ہی لیتے تھے۔ "گھر والوں کا بھی منہ بند کر دیں گے دے دلا کر۔ آج صبح ایک مسافر آیا ہے ڈیرے پر آگے جانا ہے، رات رکے گا اور......" بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے ثمرہ کی طرف دیکھا۔

"تمہاری اس بے وقوفی اور حماقت کی وجہ سے دو بے گناہ انسانوں کو مروانا پڑے گا۔" وہ متاسف تھے لیکن مجبوری تھی اپنی ساکھ اور ثمرہ کا گھر بھی تو بچانا تھا۔

"آئندہ کوئی بے وقوفی نہیں کرو گی تم، اگر کوئی حماقت کی تو مجھ سے مدد کی توقع نہ رکھنا۔" وہ ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالتے کمرے سے باہر نکل گئے تو اس نے دانت پیسے۔

"اب نہ جانے کب تک جیو گی تم اختر بانو...... تمہاری وجہ سے آج مجھے ادا دلاور شاہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔" اس نے خود ہی ایک اور جرم ان کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ دلاور شاہ کمرے سے نکل گئے۔ وہ تیزی سے اٹھی تاکہ انہیں روک کر ان کی کچھ خاطر تواضع کر سکے۔

"ادا سائیں...... چائے پانی کچھ......"

"نہیں...... پھر سہی۔" انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا پھر اسی تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل کر اندرونی صحن طے کر کے بیرونی صحن میں آئے اور پھر گیٹ سے باہر نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔

مردانے حصے کے صحن میں چراغ سائیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کپڑے کی بنی میلی

کچیلی سی گڑیا تھی۔اس نے ایک نفرت بھری نظر ان پر ڈالی اور پھر زمین پر تھوک دیا اور گڑیا کو کندھے سے لگا کر تھپکنے لگا۔

''سو جا...... میری گڑیا...... سو جا...... میری رانی! سو جا......''

اب وہ دلاور شاہ کو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن دلاور شاہ ٹھٹک کر رک گئے۔پچھلے دنوں ہونے والا واقعہ ان کے ذہن میں آ گیا تھا۔آخر چراغ سائیں ان کے خاندان سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔وہ خود کوئی بہت پارسا نہ تھے لیکن اپنے علاقے کی عورتوں کی عزت کرتے تھے۔چاہے وہ کمیوں کی بہو بیٹیاں کیوں نہ ہوں تو پھر...... کیا رضی یا عرفی...... جن دنوں چراغ سائیں کی بیٹی کی لاش ڈیرے کے پیچھے سے ملی تھی، تب عرفان اپنے دوستوں کے ساتھ حویلی میں آیا ہوا تھا۔ایک تاسف بھری نظر چراغ سائیں پر ڈال کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ثمرہ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر یوں ہی لاؤنج میں کھڑی رہی پھر مطمئن سی ہو کر کمرے میں چلی گئی۔جانتی تھی کہ دلاور شاہ اسے کچھ بھی کہیں، بھلے کتنے بھی ناراض ہوں، بہر حال اسے ثوبان شاہ اور شایان کی نظروں میں گرنے نہ دیں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔اگلی صبح ناشتے کی ٹیبل پر ہی اسے خبر مل گئی تھی کہ ماروی کو اس کے بھائی نے رات کو کسی اجنبی کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر دونوں کو کلہاڑے مار کر مار دیا۔وہ دونوں دلاور شاہ کے ڈیرے کے پیچھے والے کھیتوں میں تھے۔

ماسی تاج نے کرم دین چاچا سے سنی ہوئی تفصیل بتائی تھی۔

رات کو مار کر صبح خود تھانے میں پیش ہو گیا ہے۔پولیس والے دونوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے ہیں۔جانے کب سے چکر چل رہا تھا۔

ماروی کا سہما سہما چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا تو اس نے آملیٹ کی پلیٹ سرکائی اور ہاتھ میں پکڑا پراٹھے کا نوالہ واپس رکھ دیا۔دل یک دم ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

''ماسی ناشتا اٹھا لو۔دل نہیں چاہ رہا۔بس آدھا کپ چائے بنا دو۔'' ماسی تاج کچن میں واپس آئی تو بھاگی رو رہی تھی۔

''بھاگی! بی بی کے لیے چائے بنا کر دے آ...... ناشتا نہیں کریں گی وہ۔''

''اوہ! بھلا نوالہ کیسے حلق سے نیچے جائے۔ برسوں کا ساتھ تھا۔ بڑی خدمت کی ماروی نے ثمرہ بی بی کی۔ کہتی تھی میرا مرنا جینا تو اسی حویلی میں ہے۔''

ماسی تاج نے ٹھنڈی سانس لی اور نم آنکھوں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔ اور چائے کا کپ لے کر باہر آئی تو ثمرہ کچھ بے چین سی نظر آئی اور پھر دو تین گھونٹ بھر کر اس نے کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر گھبراہٹ ہو رہی تھی اس لیے باہر صحن میں آ گئی۔ نوراں جھاڑو دے کر اب صحن میں پونچھا لگا رہی تھی جب کہ منیرا ایک طرف بیٹھی تھی۔ اس نے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھے اور سر گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔

''سلام بی بی جی!'' نوراں نے سلام کر کے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''وہ آپ نے ماروی کا سنا بی بی...... سچی دل بہت دکھا۔ اسی لیے تو مولوی صاحب کہتے ہیں ہمارے مذہب میں ہے کہ بیوہ اور مطلقہ کی جلد شادی کر دیا کرو گھر نہ بٹھاؤ۔''

ثمرہ نے ایک ناگوار سی نظر اس پر ڈالی۔

''بہت بولنے لگی ہو تم......''

''معافی بی بی جی......'' نوراں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیئے تو ثمرہ منیرا کی طرف متوجہ ہوئی۔ جواب گھٹنوں سے سر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ بھیگی پلکیں، ستا ہوا چہرہ، روئی روئی آنکھیں......

''یہ تم کیوں ہر وقت رونا ڈالے بیٹھی رہتی ہو۔ ایسی روتی صورت لے کر مت حویلی آیا کرو۔''

''معاف کر دیں بی بی جی۔ اس کا باپ بہت بیمار ہے نا تو یہ......'' نوراں کو شاید بات بات پر معافی مانگنے کی عادت تھی۔

''تو باپ کو گھر پر ہی رو آیا کرے، یہاں حویلی میں نحوست نہ پھیلائے۔'' ثمرہ منیرا کو ڈانٹ ڈپٹ کر شاید اپنے اندر کی گھبراہٹ دور کرنا چاہتی تھی۔

''آج معافی دے دیں بی بی! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں سمجھا دوں گی اسے۔ سال پہلے بے

چاری کا بڑا بھائی مر گیا اور اب باپ چارپائی پر پڑا ہے۔ غم ہی بڑا ہے اس کا پر میں سمجھا دوں گی اچھی طرح سے سمجھا دوں گی۔"

نوراں ہاتھ باندھے کھڑے تھی۔ ثمرہ ایک ناگوار سی نظر اس پر ڈال کر واپس مڑ گئی تو منیرا کے رکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

"ماروی ایسی نہیں تھی ماسی۔ وہ تو اسی کے نام کے ساتھ مرنا چاہتی تھی جس کے نام کے ساتھ اس کا نام ایک بار جڑا تھا۔ وہ تو کہتی تھی وہ ساری عمر اسی کے نام کے ساتھ بیٹھی رہے گی۔ پھر......"

ثمرہ نے اندرونی صحن کا دروازہ کھولتے سنا تھا۔

"تمہیں تو مر ہی جانا چاہیے اختر بانو...... میں نہیں، تم ہو ماروی کی قاتل۔" اس نے زیر لب کہا اور دروازہ زور سے بند کیا۔

منیرا نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اور دوپٹے کے پلو سے اچھی طرح چہرہ پونچھتے ہوئے نوراں کی طرف دیکھا۔

"ماسی! ہمارا کام تو ختم ہو گیا ہے۔ میں گھر چلی جاؤں اب؟" نوراں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اسے جلد ہی پوتا پوتی کی خوشی دینے والی تھی، اس لیے وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

"چلی جا، میں ماسی تاج کو بتا دوں گی کہ تیرا جی اچھا نہیں تھا۔ اور دیکھ اب گھر جا کر اس ماروی کا غم نہ کرنا۔ برے کام کا برا ہی نتیجہ نکلنا تھا۔ خود بھی جان سے گئی اور ماں کا کلیجہ بھی چیر گئی۔ اب پتا نہیں اس بے چارے کا کیا بنے گا۔ پہلے تو غیرت کے نام پر قتل کر کے لوگ بچ ہی جاتے تھے تھوڑی بہت سزا پا کر باہر آ جاتے تھے جیل سے، پر اب سنا ہے بخشو کہہ رہا تھا قانون سخت ہو گئے ہیں۔ اور سن کسی کے سامنے ماروی کا نام نہ لینا۔"

اس نے تڑپ کر نوراں کو دیکھا اور اپنی چادر کو اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹا۔ اور گیٹ کی طرف قدم بڑھایا۔

میں اس کی بیٹی ہوں

یہ میرا سندھ ہے

یہاں مرنے کے لیے

ایک محبت اور ایک کلہاڑی کافی ہے

اس کے لبوں سے سسکی سی نکلی۔

پانچ جماعتیں پاس منیرا نے ایک روز اخبارات کے ریک میں اخباریں ترتیب سے رکھتے ہوئے یوں ہی ایک صفحے کو کھول کر دیکھا تھا اور یہ چند سطریں پڑھی تھیں اور سوچا تھا بھلا مرنے کے لیے ایک محبت اور ایک کلہاڑی کیسے کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن آج اسے ان سطروں کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا لیکن جو سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ یہ تھا کہ ماروی کی کہانی میں بھلا محبت کہاں تھی۔ وہ تو صرف اپنے مرے ہوئے شوہر سے محبت کرتی تھی۔ پھر وہ اجنبی کب اور کہاں اس کی کہانی میں شامل ہو گیا تھا۔

وہ سر جھکائے گیٹ سے باہر نکل گئی تو نوراں ایک گہری سانس لے کر اٹھی۔ اسے ابھی ماسی تاج کو اس کے جانے کا بتانا تھا کہ بغیر بتائے چلے جانا جرم بھی ہو سکتا تھا۔ اختر بانو نرم مزاج تھیں لیکن ثمرہ بی بی...... ان کے موڈ کا کیا پتا...... اس نے اندر صحن میں قدم رکھا۔ سامنے برآمدے میں ثمرہ بیٹھی تھی اور اضطراب سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی تو ثمرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ بی بی جی! منیرا کا جی اچھا نہیں ہے تو گھر......''

''ہاں ہاں بھیج دو اسے گھر، ویسے بھی نحوست پھیلا رہی ہے۔'' ثمرہ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

''مہربانی...... بہت مہربانی بی بی جی......'' نوراں نے عادتاً ہاتھ باندھے اور الٹے قدموں ہی واپس جانے کے لیے مڑی کہ اسے اختر بانو کا خیال آیا۔

''بڑی بی بی جی کا کیا حال ہے جی...... جب سے وہ گئی ہیں، ہر وقت دعا کر رہی ہوں اللہ خیریت سے واپس لائے۔ آمین۔''

''ٹھیک ہے تیری بڑی بی بی، جا اب دماغ نہ کھا میرا۔'' ثمرہ نے غصے سے کہا تو وہ ہاتھ باندھتی

ہوئی واپس چلی گئی تو ثمرہ نے سر جھٹکا۔

''ہونہہ...... مر ہی کر آئے گی تیری بی بی اس گھر میں...... مرا منہ ہی دیکھنا اس کا...... جسے دیکھو اس کے گن گا رہا ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ اسے ماروی کی موت کا دکھ تھا یا اختر بانو سے جلن کہ وہ اٹھتے بیٹھتے انہیں مرنے کی بددعا دینے لگی تھی۔

لیکن یوں اگر کسی کی بددعا سے لوگ مرنے لگیں تو شاید آدھی دنیا ختم ہو جائے۔

تو اس کی بددعا سے بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ اختر بانو کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ ثمینہ اور زمان شاہ، صفورا اور شایان واپس آ گئے تھے۔ لیکن اختر بانو کو ریحان نے روک لیا تھا۔ وہ ایک ماہ بعد آئی تھیں۔ اور یہ ایک ماہ ثوبان شاہ بھی زیادہ تر کراچی میں ہی رہے تھے۔ ایک ماہ کے دوران وہ صرف دو بار حویلی آئے تھے۔ دن بھر تو ڈیرے کے اور دوسرے معاملات نمٹاتے رہے تھے اور رات میں کہیں ثمرہ کو ان سے بات کرنے کا وقت ملا تھا۔ دونوں بار ہی وہ صرف دو روز ہی رہے تھے اور اب جبکہ وہ اختر بانو کے ساتھ واپس آئے تھے تو زیادہ وقت اختر بانو کے ساتھ ہی گزار رہے تھے۔

وہ خود ان کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اختر بانو اپنی ذات کے حوالے سے بہت لاپروا ہو چکی ہیں۔ اور ثوبان شاہ کو ان کا خیال رکھتے دیکھ کر ثمرہ انگاروں پر لوٹتی تھی۔ اختر بانو کا اتنا بڑا آپریشن ہوا تھا لیکن ثمرہ حیران ہوتی تھی کہ ان کی صحت پہلے کے مقابلے میں اچھی ہو گئی تھی۔ رخساروں اور آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ اور یہ شاید ثوبان شاہ کی توجہ کا اعجاز تھا کہ ہر دم خاموش اور بجھی بجھی رہنے والی اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نظر آنے لگی تھی۔ ثوبان شاہ جب کئی دن ثمرہ کے کمرے میں نہ گئے تو اختر بانو نے ہی انہیں احساس دلایا۔

''آپ اتنے دنوں سے ثمرہ آپا کی طرف نہیں گئے۔ ان کا دل برا ہوتا ہوگا۔ آج چلے جائیں آپ ادھر......''

''کیوں کیا تمہیں میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا؟'' ثوبان شاہ نے ایک بھرپور نظر ان پر ڈالی تھی۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔'' ان کے اس طرح دیکھنے سے وہ گھبرا گئی تھیں اور ان کی پلکیں

لرزنے لگی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں ثمرہ آپا کے ساتھ میری وجہ سے ناانصافی نہ ہو۔''

''لیکن ثمرہ نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ تمہارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔'' ثوبان شاہ نے دل ہی دل میں ان کی اعلیٰ ظرفی کا اعتراف کیا۔

''تمہارے معاملے میں مجھ سے بہت کوتاہی ہوئی ہے اختر...... جو وقت گزر چکا وہ پلٹ نہیں سکتا۔ تم مجھے اس ناانصافی کے لیے معاف کر دینا۔ میں اس وقت سے بہت ڈرتا ہوں اختر بانو جب روز محشر اس ناانصافی کی وجہ سے میری پکڑ ہو گی۔''

''آپ اطمینان رکھیں میری وجہ سے روز محشر آپ کی پکڑ نہیں ہو گی۔ بہت پہلے میں نے اپنے حقوق معاف کر دیے تھے لیکن اب کہیں ثمرہ آپا سے ناانصافی کر کے پکڑے نہ جائیں۔''

اختر بانو کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ثوبان شاہ انہیں دیکھتے رہ گئے۔ کتنے سالوں بعد اختر بانو کا یہ رنگ انہوں نے دیکھا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں بلکہ ریحان کی پیدائش سے پہلے تک وہ یوں ہی شرارت سے کوئی بات کہہ کر لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شریر سی چمک لیے انہیں دیکھتی تھیں۔ ان دنوں وہ شوخ و شریر سی لگتی تھیں۔

''تو تم چاہتی ہو کہ تمہارے شوہر کی روزِ محشر پکڑ نہ ہو تو پھر چلتا ہوں لیکن......'' وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے۔ ''سچی بات ہے، جی نہیں چاہ رہا جانے کو۔ ادھر بھی تمہاری فکر لگی رہے گی۔''

''میں اب اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

''تم مجھے اپنے روم سے نکالنے پر تل ہی گئی ہو تو ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں ابھی۔'' اب ثوبان شاہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ''لیکن پہلے کچھ ضروری باتیں نہ کر لیں۔''

''کیسی ضروری باتیں؟'' اختر بانو حیران ہوئیں۔

''بھئی اپنے بچوں کے متعلق...... میں سوچ رہا ہوں نومی کی شادی کے ساتھ ہی ریحان کا بھی نکاح کر دیں۔ وہ باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہے، وہاں سے کسی گوری کو ہی نہ لے آئے۔ ایک بالکل

مختلف تہذیب، مذہب اور ثقافت کے ساتھ نباہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب گلے پڑا ڈھول بجانا پڑتا ہے تب اس کی سمجھ میں آتی ہے۔"

"ہمارا ریحان ایسا نہیں ہے وہ کسی گوری شوری کو ساتھ لے کر نہیں آئے گا۔" اختر بانو کو یقین تھا۔" اب دیکھ لیں۔ نومی نے بھی ہماری پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ورنہ آج کل لڑکے کہاں والدین کی مرضی سے شادی کرتے ہیں۔"

"ہاں تم صحیح کہہ رہی ہو۔ آج ریحان بھی انکار نہیں کرے گا لیکن وہاں جس قدر ترغیب ہے تو گارنٹی نہیں دی جا سکتی اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ ریحان کا نکاح یا منگنی کر دی جائے جانے سے پہلے اور تمہاری طرح مجھے بھی یقین ہے کہ ریحان پھر زبان اور رشتہ نبھائے گا۔"

ثوبان شاہ کو بھی یقین تھا کہ ریحان کا اگر جانے سے پہلے رشتہ طے ہو گیا تو وہ ہر صورت رشتہ نبھائے گا۔

"تمہارے ذہن میں کوئی لڑکی ہے تو بتاؤ۔"

"نہیں......!" اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔" میں نے ابھی تک ریحان کے لیے نہیں سوچا تھا۔ نومی بڑا تھا تو پہلے اس کے لیے ہی سوچا۔ ویسے آپ ریحان سے پوچھ لیں۔ زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔"

ریحان نے بھی نومی کی طرح فیصلے کا اختیار ہمیں دیا ہے۔" ثوبان شاہ مدھم سا مسکرائے۔

"آپ نے ریحان سے بات بھی کر لی؟" اختر بانو کو حیرت ہوئی۔

"ہاں تمہارے آپریشن کے بعد جس روز سلطانہ کراچی آئی تھی تمہاری مزاج پرسی کے لیے تو اس روز نومی کی شادی کی بات زمان نے چھیڑی تھی کہ تمہارے بالکل ٹھیک ہو جانے پر ہم سلطانہ سے اس کی شادی کی تاریخ لے لیں تاکہ ریحان کے جانے سے پہلے نعمان کی شادی ہو جائے۔ تب مجھے خیال آیا تھا کہ کیوں نہ ریحان کو بھی جانے سے پہلے پابہ زنجیر کر دیا جائے تو ریحان سے بھی پوچھ لیا تو پھر تمہارا کیا خیال ہے۔" ثوبان شاہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"خاندان میں سب کے ہاں ہی لڑکیاں ہیں اور سب ہی اچھی ہیں۔ آپ کے چھوٹے تایا کی

پوتیاں ہیں۔ دوسرے تایا زاد بھائیوں کی بیٹیاں بھی ہیں۔ میری تو کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی ہے تو عادات و مزاج کا کچھ اندازہ نہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں۔ وہ لوگ بھی اختر بانو سے بے تکلف نہیں ہوئے تھے، بس رسمی بات چیت اور ملاقات تھی۔

''میرے ذہن میں تمہاری بھتیجی ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر ہے تو ریحان کے لیے سب سے مناسب اور بہتر مجھے وہ ہی لگی ہے۔''

''لیکن وہ بھلا کیسے......؟'' اختر بانو نے بے حد حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''نہیں......!'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سلطان چچا اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود مجھے بیاہ کر لائے تھے۔ لیکن غیر سید ہونے کی وجہ سے آپ کے خاندان نے مجھے قبول نہیں کیا۔ مہرو تو بہت چھوٹے دل کی ہے، اس میں میرے جتنا صبر اور حوصلہ نہیں ہے۔''

انہوں نے کبھی شکوہ نہیں کیا تھا۔ لیکن آج ان کی نظروں میں شکایت تھی، اذیت تھی۔ گو آج بھی براہ راست انہوں نے شکوہ نہیں کیا تھا لیکن ثوبان شاہ نے ان کے دکھ کو محسوس کیا۔

''میں جانتا ہوں اختر بانو! تم نے یہاں بہت مشکل وقت گزارا ہے، بہت حوصلے اور صبر کے ساتھ۔ لیکن اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ نہ دادا جان رہے ہیں نہ دادی جان، جنہیں سب سے زیادہ اعتراض تھا۔ اماں جان اور ابا جان بھی چلے گئے۔ تمہاری بھتیجی تمہاری بہو ہوگی اختر بانو...... حالات اب پہلے جیسے نہیں ہیں۔ کوئی کسی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ چھوٹے تایا جنہوں نے میری شادی کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی، خود انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی غیر سیدوں میں کی اور چھوٹے بیٹے امریکن لڑکی کو بیاہ کر لے آئے تو تم نے جو کچھ جھیلا مہرین کو وہ سب نہیں جھیلنا پڑے گا۔ تم نے جو زندگی گزاری، اختر بانو اس میں کچھ میری کوتاہی اور کمزوری بھی ہے۔ میں اگر تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا تو شاید تمہیں ان حالات سے نہ گزرنا پڑتا۔''

''لیکن آپ کے خاندان میں ریحان کے جوڑ کی لڑکیاں ہیں پھر مہرین کا خیال آپ کو کیوں آیا۔ جبکہ مہرین سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں ہیں۔'' اختر بانو متذبذب سی ثوبان شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”سچ بتاؤں...... میں چاہتا ہوں کہ ہمارے بعد بھی ہمارے بچوں کا رشتہ اپنے ننھیال سے جڑا رہے۔ وہ زندگی بھر اپنے ننھیال سے دور رہے ہیں، میں چاہتا ہوں اب ایسا نہ ہو۔ تم بے فکر رہو۔ مہرین نے اگر لاہور میں ہی رہنا چاہا تو لاہور میں گھر لے لیں گے۔ وہ بے شک یہاں حویلی نہ آئے۔ کراچی، لاہور...... جہاں بھی!“ وہ مدھم سا مسکرائے۔

اختر بانو ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”میرا یقین کرو اختر بانو! میں نے بہت نیک نیتی کے ساتھ مہرین کے لیے سوچا ہے۔ اس طرح تمہارا تعلق بھی اپنے میکے کے ساتھ مضبوط ہوگا۔“ ثوبان شاہ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”میں ابا جان سے بات کروں گی۔ لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ مان جائیں گے۔ رخسانہ بھابی اور مونا بھابی نے بچوں کے بچپن میں ہی طے کر لیا تھا کہ وہ آپس میں رشتے کریں گے۔ شاہ رخ کی شادی ماہ وش سے ہوگئی لیکن مرتضیٰ نے مہرین سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کوئی باقاعدہ رشتہ نہیں ہوا تھا لیکن دونوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا۔“ اختر بانو نے ضروری سمجھا کہ وہ انہیں بتا دیں۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے جان عزیز! ابھی اس کا کہیں اور تو رشتہ طے نہیں ہوا نا۔ تم بات کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بھتیجی تمہاری بہو بنے۔ شاید اس طرح رشتوں میں جو فاصلے پیدا ہوئے ہیں، وہ ختم ہو جائیں۔ میں تمہیں اب کبھی دکھی اور اداس نہیں دیکھنا چاہتا۔“ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیے اختر بانو کے ہاتھوں کو ہلکا سا دبایا۔

”آپ نے اس طرح سوچا اس کے لیے آپ کا شکریہ۔“ اختر بانو کی بھیگی پلکوں پر اٹکے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

”شکریہ کہہ کر مجھے شرمندہ مت کرو اختر۔“ ایک ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے دوسرا بازو ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے اختر بانو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

”میں نے کہا نا کہ میں اب کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے وہی اختر بانو چاہیے جو ہر دم مسکراتی رہتی تھی۔ جو خاموش بھی ہوتی تو اس کی آنکھیں ہنستی رہتی تھیں۔“

''بہت سارا وقت گزر گیا۔ بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی۔ بچے جوان ہو گئے۔ دل مردہ ہو گیا۔ اب چاہوں بھی تو پہلے جیسی نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی کوشش کروں گی کہ آپ کو شکایت نہ ہو۔''

آنسو زیادہ روانی سے بہنے لگے تو ثوبان شاہ یوں ہی انہیں ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکنے لگے۔ گزرے وقت کا احساس زیاں تھا یا کیا کہ ان کے اپنے اندر بھی کن من کن من ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

زیب النساء حامد کو اسکول بھیج کر اور ناشتے کے برتن دھو کر برآمدے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑا سا کام کرنے سے ہی آج کل اسے تھکن ہو جاتی تھی۔ وہ کچھ دیر یوں ہی برآمدے میں بیٹھی سامنے صحن کی طرف دیکھتی رہی۔ رات بہت آندھی آئی تھی۔ صحن درختوں سے گرنے والے پتوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی، صحن میں آکر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان گرد آلود تھا۔ دھوپ ابھی صحن میں نہیں پہنچی تھی۔ شاید پھر آندھی آئے۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ ابھی صحن میں جھاڑو نہ دے۔ ابھی پھر آندھی آ گئی تو پھر ویسا ہی ہو جائے گا لیکن پھر اس کی صفائی پسند طبیعت کو گوارا نہ ہوا کہ وہ پھر آندھی آنے کے انتظار میں صحن میں یوں ہی پتے بکھرے رہنے دے۔

وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی کھڈے (چبوترہ) تک آئی اور جھاڑو اٹھا کر دینے لگی۔ جھاڑو دیتے ہوئے اس کا سانس اکھڑنے لگا تو وہ وہاں ہی جھاڑو ہاتھ میں لیے بیٹھ گئی۔ تب ہی دروازہ کھول کر زیتون اندر داخل ہوئی۔ تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔

''وہ تیرا شہزادہ تو اسکول جاتے ہوئے بتا گیا تھا کہ اماں کو بخار ہے اور یہاں جھاڑو دی جا رہی ہے۔ ایسی کیا جلدی پڑی تھی۔ تیرے سسرال والوں نے آنا تھا کیا؟ میں آ جاتی تو صفائی کر دیتی۔''

''رات کو اتنی آندھی اور جھکڑ تھا کہ سارا صحن پتوں اور گرد و غبار سے اٹا پڑا تھا۔ میں نے کہا جھاڑو دے دوں اب کیا تمہارے انتظار میں بیٹھی رہتی۔'' زیب النساء کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اب زیتون کے خلوص اور مہربانیوں کی عادی ہو گئی تھی۔

''تو کر لیتیں انتظار...... میں نے آ ہی جانا تھا۔ صفدر اور افضل کو ناشتا بنا کر دیا۔ وہ کھیتوں میں

چلے گئے تو پھر برتن دھو کر جھاڑو دیا اور آ گئی۔ بس اب اتنی دیر تم جھاڑو نہ دیتیں تو کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ اپنا حال دیکھ ذرا۔'' زیتون نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو لے لیا۔

''اب اٹھ، منہ ہاتھ دھو کر اندر کمرے میں جا کر بیٹھ۔ یہاں بیٹھی تو جو مٹی اڑے گی نا اس سے کھانسی ہونے لگے گی۔ میں ابھی جھاڑو دے کر آتی ہوں۔''

زیب النساء نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر تم بھی نہ ہوتیں زیتون تو میں کیسے جی پاتی۔ وقت سے پہلے ہی مر جاتی۔''

''جھلی نہ ہو تو...... وقت سے پہلے کوئی نہیں مرتا۔ جب وقت پورا ہو جاتا ہے تب ہی جاتا ہے آدمی دنیا سے۔ جتنی لکھی ہے نا اتنا تو جینا ہی ہے۔ رو کر جئیں یا ہنس کر...... اور ہاں یہ جو تو ہر روز میری ممنون ہوتی رہتی ہے نا، تو مت کیا کر ایسے...... میرا نہیں، اپنے رب کا شکریہ ادا کیا کرو۔ وہ ہی وسیلہ بناتا ہے۔ میں نہ ہوتی تو کسی اور کو وسیلہ بنا دیتا۔ رب اپنے بندوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا زیب النساء...... وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ اور میری عقل میں تو یہ آتا ہے کہ وہ اپنے پیارے بندوں کو زیادہ آزماتا ہے۔ اور تم بھی نا اس کے پیارے بندوں میں سے ہو۔'' وہ زیب النساء کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ''اب جاؤ کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ، میں یوں منٹوں میں جھاڑو دے کر آتی ہوں۔''

''یہ ساری باتیں تم نے کہاں سے سیکھی ہیں زیتون؟''

''ایسی باتیں کہیں سے سیکھی نہیں جاتیں۔ وقت کے ساتھ ان کا ادراک خود بخود ہو جاتا ہے۔''

وہ بیٹھ کر ڈھیلے جھاڑو کو باندھنے لگی۔

زیب النساء ابھی تک آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ زیتون نے کبھی اسکول کا منہ تک نہیں دیکھا تھا نہ کبھی بڑے بڑے عالموں اور فلسفیوں کی کتابیں پڑھی تھیں لیکن اکثر وہ بڑے عالموں اور فلسفیوں جیسی باتیں کرتی تھی۔ زیب النساء کو اس کی باتیں حوصلہ دیتیں اور اس کی بے چینی اور اضطراب کو کم کرتی تھیں۔

''پتا ہے ماسی کہتی ہے کہ پھوہڑ عورتوں کی جھاڑو ڈھیلی ہوتی ہے اور تنکے اس میں سے نکلتے

رہتے ہیں۔'' زیتون اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے ہنسی۔ ''مجھے پتا ہے تم پھوہڑ بالکل بھی نہیں ہو۔ بس یوں ہی ماسی کی بات یاد آ گئی تھی۔''

زیب النساء بھی مسکرا کر ہولے ہولے چلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔

باہر سے آنے کی وجہ سے اسے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا محسوس ہوا تھا۔ اس نے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ بچے اسکول جا چکے ہوتے اور مرد کھیتوں میں یا اپنے اپنے کام پر۔ یوں بھی ان کا گھر گلی سے کافی اونچا تھا کھڑکی کھلی بھی ہوتی تو گلی سے گزرنے والوں کی نظر اندر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر بھی جالی کا پردہ اس نے آگے کر دیا۔ اب کمرہ کچھ روشن لگنے لگا تھا۔ برآمدے والی کھڑکی پہلے ہی کھلی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں آج کل اندھیرے بند کمروں میں اس کا دل گھبراتا تھا۔ وہ تپتی دوپہروں میں بھی اکثر باہر برآمدے میں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر ہولے ہولے چلتی ہوئی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یوں ہی پاؤں لٹکا کر بیٹھی رہی۔ باہر سے جھاڑو دینے کی آواز آ رہی تھی۔ زیادہ دیر پاؤں لٹکا کر بیٹھتی تو پاؤں سوج جاتے تھے۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

یوں تو وہ ہر روز ہی فجر کی اذان سے پہلے ہی جاگ جاتی تھی لیکن آج تو پوری رات جاگتے ہی گزر گئی تھی۔ کبھی کبھی نیندیں یوں ہی روٹھ جایا کرتی تھی۔ آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ آنکھیں بند کرنے سے بہت سکون ملا۔

''زیتون سے کہوں گی آج شہزادے کے لیے روٹی پکا کر فضل کے ہاتھ بھجوا دینا۔ سالن تو رات کا پڑا ہے۔ پتا نہیں کیوں آج ہمت ہی نہیں ہو رہی۔'' اس نے آنکھیں موندے موندے سوچا۔

حامد اب پانچویں جماعت میں تھا۔ وقت کتنی جلدی گزر رہا تھا۔ لیکن اس کے لیے جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ یا ٹھہرا ہوا سا لگتا تھا۔ حامد اسکول چلا جاتا تو اس کے پاس کرنے کو کوئی کام ہی نہ ہوتا۔ آپا صدیقہ کا اسکول بھی سال بھر بعد ہی بند ہو گیا تھا کہ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری اسکول کھل گیا تھا۔

وہاں سعادت اور صدیقہ کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا تھا۔

شوق سے پڑھتی آنے والی زندگی کے خواب آنکھوں میں سجائے سادہ مزاج بچیاں اسے اپنے بچپن کی یاد دلاتی تھیں۔ آپا صدیقہ میں اسے استانی جی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ اب گھر میں ماضی کی کتاب کے اوراق الٹتی رہتی۔ ماضی کوئی اتنا لمبا چوڑا تو تھا نہیں۔ اس کے سنگ گزارے چند خوب صورت دن، اماں ابا، استانی جی اور آپا فاطمہ کے ساتھ گزارا وقت...... وہ ایک ایک کر کے صفحے الٹتی رہتی اور پھر آخری صفحہ آ جاتا جہاں پر انتظار کھلا تھا...... اور انتظار ختم نہیں ہوتا تھا۔ امید مرتی نہیں تھی تو وقت اس کے لیے یہاں ہی ٹھہر جاتا۔ اسے آج بھی اس سے محبت تھی، وہ آج بھی اس کا انتظار کرتی تھی پورے یقین کے ساتھ۔

انتظار نہ ہو تو محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت انتظار کی اساس پر ٹھہری رہتی ہے۔ اور وہ چاہتی تھی کہ جب وہ آخری سانس لے تب بھی اس کے دل میں اس کی محبت روز اول کی طرح ہو۔ اسی لیے وہ انتظار کرتی تھی۔ اور اس کے ملنے کی امید مرنے نہیں دیتی تھی۔

دو سال پہلے وہ زیتون اور اس کے شوہر صفدر کے ساتھ رحیم یار خان گئی تھی اقبال کے گھر۔ اقبال کی بھابیاں اسے پہچانتی تھیں کہ ماسٹر صاحب جب اسپتال میں تھے تو وہ استانی جی کے ساتھ ان کے گھر ٹھہری تھی۔ صفدر اسے اور زیتون کو ان کے گھر چھوڑ کر خود اپنے دوست کی طرف چلا گیا تھا۔ بھابیاں بہت اچھی طرح سے ملی تھیں لیکن اقبال کے متعلق انہوں نے بتایا تھا وہ تو مڑ کر پھر آیا ہی نہیں البتہ اس کے متعلق خبر ملی تھی کہ وہ ترکی کی جیل میں ہے۔ اس کے اور اس کے دوست کے سامان سے منشیات یا جانے کیا نکلا تھا کہ وہ پکڑے گئے۔ حالانکہ ان کا یہ ہی کہنا تھا کہ انہیں خبر نہیں یہ چیزیں کس نے ان کے سامان میں رکھی تھیں۔

جس شخص نے یہ بات اقبال کے بھائی کو بتائی تھی اس کا خیال تھا کہ یقیناً یہ ایجنٹ کا کام ہوگا جو انہیں ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ پتا نہیں کتنی سزا ہوئی تھی اقبال بھائی کو اور کبھی وہ لوٹ کر آئیں گے بھی یا نہیں...... پھر بھی اس نے ایک موہوم سی امید پر اقبال کی بھابی کو اپنے گاؤں کے ڈاک خانے کا پتا لکھ کر

دے دیا تھا کہ جب بھی اقبال بھائی آئیں، اسے خط لکھ دیں۔ اور بھابی نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اسے خط لکھوا دیں گی۔

''فاطمہ بھی آئی تھی ایک بار تیرا پوچھنے، گاؤں بھی گئی تھی۔'' اقبال کی بھابی نے بتایا تو اس کا دل ایک بار زور سے دھڑکا تھا۔

''آپ کے پاس فاطمہ آپا کا کوئی پتا وغیرہ ہے؟''

''نہیں، وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ بحرین یا قطر جا رہی تھی۔ ٹھیک سے یاد نہیں، کیا بتایا تھا۔ گاؤں والے گھر کا تو اس کا شوہر چند ماہ پہلے ہی سودا کر گیا تھا۔ اب اس نے گھر کا سامان ہی دینا دلانا تھا۔ کہہ رہی تھی سامان تو اس کا میاں بھی دے دلا لیتا۔ اسے تیری فکر تھی کہ کتنے ہی خط اس نے تمہیں لکھے لیکن تم نے جواب نہیں دیا۔ تیرے لیے بہت پریشان تھی۔ کہہ رہی تھی کہ تمہارے گھر میں جو عورت رہتی تھی اس نے بتایا کہ اسے تمہارا پتا نہیں تم کہاں چلی گئی ہو۔ اس لیے فاطمہ کے جو خط آئے وہ اس نے الماری میں رکھ دیے تھے کہ اگر کبھی تم آئیں تو تمہیں دے دے گی۔''

''اور یہ ماسی نور بھری، اللہ اس کا کبھی بھلا نہ کرے......'' زیتون کو بہت غصہ آ رہا تھا لیکن وہ اس سے اقبال کی بھابی کو دیکھ رہی تھی۔

''اگر فاطمہ آپا سے رابطہ ہو کبھی تو میرا انہیں ضرور بتایئے گا کہ میں کہاں ہوں۔ میرا پتا دیجیے گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے خود ہی ملنے آ جائیں گی۔''

اور خاموشی سے ساری باتیں سنتے حامد کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ چہرہ اتر گیا تھا۔

''اماں! کیا اب وہ کبھی نہیں ملیں گے؟ ہم انہیں کبھی ڈھونڈ نہیں سکیں گے؟''

اور اس نے چونک کر اقبال کی بھابی کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے کوئی ڈوبتا شخص تنکے کا سہارا لے۔

''کبھی اقبال بھائی کا پتا کرنے کوئی آیا ہو؟''

''شروع شروع میں اس کے دوست یار آتے رہے، پھر چھوڑ دیا۔ لیکن ہاں......'' اسے ایک دم یاد آیا تھا۔ ''چھوٹے کے ابا نے بتایا تھا ایک بار ایک آدمی آیا تھا گاڑی میں......کوئی بڑا افسر لگتا تھا۔ کوئی

امیر آدمی......"

اور اس کے دل میں امید کی بجھتی لو پھر جل اٹھی تھی۔

"اس نے اپنا نام بتایا تھا؟"

دل کی دھڑکن ایک دم بڑھی تھی۔ زیتون نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے کانپتے ہونٹوں کو اور اس کی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطروں کو اور اقبال کی بھابی سے التجا کی تھی۔

"بہن! آپ مہربانی کر کے ذرا بھائی صاحب سے پوچھ دیں اس بندے کا نام۔"

لیکن اقبال کے بھائی نے بتایا کہ اس نے اپنا نام وغیرہ تو نہیں بتایا تھا بس اقبال کا پوچھ کر چلا گیا تھا......

اور وہ واپس چک مراد شاہ آ گئے تھے۔ لیکن اس کے دل میں اس کے انتظار اور امید کی شمع ایسے ہی جلتی تھی کہ ایک روز وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا آ جائے گا۔

زیتون جھاڑو دے کر منہ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے چہرہ پونچھتی ہوئی کمرے میں آئی تو اسے دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے دیکھ کر پوچھا۔

"سو گئی ہو زیب النساء......؟"

"نہیں تو......" اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"یہ تیرا بخار تو تیری جان کو ہی چمٹ گیا ہے سہیلی......" زیتون اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ "پندرہ بیس دن تو ہو گئے ہیں حکیم جی کی دوائی سے آرام ہی نہیں آ رہا۔ ایسا کرتے ہیں تحصیل کے اسپتال چلتے ہیں۔ وہاں کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے باری کا وہ کیا کہتے ہیں، معیادی بخار ہے۔ صفدر کو تو آج کل بہت کام ہے۔ کاشت کے لیے زمین تیار کر رہا ہے ماسی کو ساتھ لے جائیں گے۔ وہ تو اکیلی بھی جاتی رہتی ہے نا شہر اپنی دوا لینے۔ ادھر اڈے سے گڈی (گاڑی) پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور ادھر شہر میں اڈے پر اتر کر پیدل ہی اسپتال چلی جاتی ہے۔ سارے راستوں کا پتا ہے اسے۔ اس کا بھرا (بھائی) پہلے ادھر ہی رہتا تھا۔"

''اگر آرام آنا ہوا تو حکیم جی کی دوائی سے ہی آرام آجائے گا زیتون......'' زیب النساء کی ہمت نہیں تھی کہیں بھی جانے کی۔

''اگر حکیم جی کی دوائی سے آرام آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا زیبو...... اپنی حالت دیکھی ہے کیسی ہو رہی ہے۔''

زیتون نے بے حد تشویش سے اسے دیکھا جو بے حد کمزور ہو رہی تھی۔ گلابی رنگت کے بجائے رخساروں پر زردیاں اتر آئی تھیں۔ خوب صورت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔

''یوں لگتا ہے جیسے مردہ قبر سے نکل کر آیا ہو۔''

''اب قبر میں ہی تو جانا ہے زیتونی......!'' اس نے آہستگی سے کہا جیسے سرگوشی کی ہو، لیکن زیتون نے سن لیا اور غصے اور ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کبھی کوئی اچھی بات بھی کر لیا کر زیب النساء! جب دیکھو منہ سے بدفال نکال رہی ہے۔ کچھ اپنے شہزادے کا ہی خیال کر لے۔ تجھے کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔ ایک ہی تو رشتہ ہے اس کے پاس۔''

''شہزادے کا خیال ہی تو زنجیر کرتا ہے زیتون......! پر جب لکھا ہوا وقت پورا ہو گیا تو زنجیریں بھی بے معنی ہو جائیں گی۔ ہماری خواہشیں کیا اور آرزوئیں کیا۔ جو مکتوب ہو گیا، وہ ہی ہونا ہے۔'' وہ سامنے دیکھ رہی تھی جیسے دیوار پر لکھا پڑھتی ہو۔

''تو پھر طے ہو گیا، کل بچوں کو اسکول بھیج کر ہم نکل جائیں گے شہر کے لیے...... میں رات صفدر سے بات کر لوں گی۔ اور بچوں کے آنے سے پہلے واپس بھی آجائیں گے۔ اگر کچھ دیر ہو بھی گئی تو فضل کی پھپھی سے کہہ جاؤں گی۔ ہمارے آنے تک میرے گھر آجائے یا منی، فضل اور حامد کو اپنے ساتھ گھر لے جائے۔''

زیتون نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پھر فوراً ہی اٹھا لیا۔

''ہائے میں مر جاؤں، تو تو اب بھی بخار میں جل رہی ہے۔''

''صبح تو نہیں تھا، اب ہو گیا ہے۔ بس کبھی یکدم جسم آگ کی طرح تپ اٹھتا ہے اور کبھی بالکل

ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔'' زیب النساء کی آواز میں نقاہت تھی۔

''بس اب ایک نہیں سننی میں نے تیری۔ تیار رہنا۔ شہزادے کو بھی بتا دینا شہر چلیں گے۔ اللہ کرے گا ڈاکٹر کی دوا سے آرام آجائے گا...... اور سن آج یہ روٹی اور سالن نہ کھانا۔ میری اماں کہتی تھیں معیادی بخار میں روٹی کھانے سے آنتوں میں زخم ہو جاتے ہیں۔ میں ساگودانہ بنا کر بھیج دوں گی تجھے اور تیرے شہزادے کے لیے روٹی پکا کر بھیج دوں گی تو نے آرام کرنا ہے بس، تجھے نہیں پتا یہ بخار بے آرامی سے بھی بگڑ جاتا ہے۔''

زیتون اس کے لیے پریشان ہو گئی تھی۔ زیب النساء نے اثبات میں سر ہلایا اور مدھم سا مسکرائی۔

''تجھے تو حکمت شروع کر دینی چاہیے زیتون۔ حکیم سے زیادہ جانتی ہو۔''

''ہاں تو تجربہ ہو جاتا ہے نا، میرے افضل، منی اور فضل کو بچپن میں ہر سال ہی یہ معیادی بخار ہو جاتا تھا تو شہر والا ڈاکٹر کہتا تھا۔ دودھ اور ہلکی غذا ہی دینی ہے۔ روٹی تو بالکل نہیں...... خیر اب میں چلتی ہوں۔ افضل اور اس کے ابا کے لیے روٹی بجھوانی ہے۔ فضل جیسے ہی اسکول سے آئے گا۔ اس کے ہاتھ بجھوا کر پھر آتی ہوں۔ تم فضول کاموں میں نہ لگ جانا۔ جو بھی ہوا، آکر کر دوں گی۔''

افضل اس کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کا نام محمد افضل صفدر نے اپنے دادا کے نام پر رکھا تھا اور فضل کا نام فضل الرحمٰن اس نے اپنے ابا کے نام پر رکھا تھا۔

''اور ہاں تم لیٹی رہو۔ میں باہر سے کنڈی لگا جاؤں گی۔'' زیتون اٹھی تو زیب النساء نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم بہت اچھی ہو زیتون......''

''وہ تو میں ہوں......'' اس نے شرارت سے کہا اور ایک بار پھر اسے آرام کی تلقین کرتے ہوئے چلی گئی۔

زیتون کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس بخار نے تو جیسے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جی چاہتا تھا بس بیٹھی رہے۔ اٹھ کر چلتی تو قدم من من بھر کے ہو جاتے۔ ایک قدم اٹھانا محال ہو

جاتا۔ کمزوری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

"زیتون صحیح کہتی ہے، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرا شہزادہ تو اکیلا رہ جائے گا اس بھری دنیا میں، میرے علاوہ تو کوئی بھی اس کا سگا نہیں ہے۔ میں کل ضرور زیتون کے ساتھ اسپتال جاؤں گی۔ کتنی بے وقوفی کی میں نے اتنے دن یوں ہی اپنے اندر اس بخار کو پالتی رہی۔ بس زیتون سا گودانہ اور کھانا دینے آئے گی تو اسے بتا دوں گی کہ صبح میں اسپتال چلی جاؤں گی۔ ماسی کو کیا تکلیف دینی، ہم دونوں ہی چلے جائیں گے۔ شہزادے کو ساتھ لے جائیں گے۔

دس سال کا تو ہونے ہی والا ہے ایک ماہ تک اور پھر ماشاء اللہ قد بت سے تو اپنی عمر سے بڑا ہی لگتا ہے۔ فضل کے ساتھ کھڑا ہو تو فضل تو بہت چھوٹا لگتا ہے حالانکہ بس عمروں میں ایک دو ماہ کا ہی فرق ہو گا۔ گھنٹہ بھر کا ہی تو راستہ ہے۔ ادھر اڈے سے لاری پر بیٹھ جائیں گے اور وہاں اتر کر تانگا لے لیں گے، تانگے والا لے جائے گا اسپتال......"

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

"شہزادہ ساتھ ہو گا تو پھر ڈر کیسا...... ماشاء اللہ دس سال کا ہے۔ کوئی چھوٹا بچہ تو نہیں ہے نا۔"

"دس سال......" وہ چونکی۔ دس طویل سال گزر گئے اور وہ ابھی تک انتظار کی شمعیں جلائے بیٹھی ہے۔ اب تو اس کا انتظار ختم ہو جانا چاہیے یا امید مر جانی چاہیے لیکن نہ انتظار ختم ہوتا تھا نہ امید مرتی تھی۔

اس نے تکیہ ہٹا کر چابی اٹھائی اور چارپائی سے اتر کر ہولے ہولے چلتی ہوئی الماری تک آئی اور الماری کھول کر کپڑے کا تھیلا نکالا اور چارپائی پر رکھا۔

اور دوبارہ واپس الماری تک گئی۔ اب اس نے الماری میں سے پین اور کاپی نکالی اور واپس آ کر چارپائی پر پہلے کی طرح ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کاپی کھول کر گھٹنوں پر رکھی۔

میری زندگی کی طرح اس میں بھی چند ہی صفحات رہ گئے ہیں۔ اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا اور اس نے کاپی سے دو صفحات نکالے اور کاپی بند کر دی۔ پین ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر صفحات بند کاپی پر رکھے اور لکھا۔

''میرے شاہ! پتا ہے ہمارا بیٹا ہمارا شہزادہ دس سال کا ہونے والا ہے۔ دس سال کم عرصہ تو نہیں ہوتا نا اور تم تو شہزادے کی پیدائش سے پہلے ہی ہجر ہمارے نام کر گئے تھے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا ہجر...... میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے تھکنے لگی ہیں اور میری ان تھکی ہوئی آنکھوں میں اب انتظار کی تاب باقی نہیں رہی۔ اب تو مجھے بھی ابا کی طرح لگنے لگا ہے کہ یہ تھکی ہوئی آنکھیں ایک روز چپکے سے بند ہو جائیں گی اور ہمارا شہزادہ بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ کاش میری زندگی میں ہی تم آ جاؤ اور میں اپنے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے کر سکون سے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاؤں۔ پتا ہے میرے شاہ! دل میں اپنے حامد کو چند ماہ سے شہزادہ سلیم کہہ کر بلانے لگی ہوں۔ جب پہلی بار میں نے اسے شہزادہ سلیم کہہ کر بلایا تھا تو وہ بہت حیران ہوا تھا اور مجھے یوں دیکھنے لگا تھا جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں۔

''اماں! کیا ہوا ہے، میں حامد ہوں آپ کا بیٹا......''

میں اسے راجہ، سوہنا، موہنا اور جانے کن کن ناموں سے پکارتی تھی لیکن آج تو میں نے اس کا پورے کا پورا نام ہی بدل دیا تھا تو اسے پریشان تو ہونا ہی تھا کہ اس کی ماں کا شاید دماغ چل گیا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اس کی آنکھیں بالکل تمہاری آنکھوں جیسی ہیں۔ وہی ہلکی براؤن سی رنگت ویسی ہی مڑی ہوئی گھنی پلکیں......

وہ جب چھوٹا سا تھا اور میری گود میں سو رہا ہوتا تو میں اس کی آنکھیں چومتی رہتی تھی، پر اس روز تو میں نے اسے اسکول رخصت کرتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی تھی۔ تمہارے جیسی ہی خوب صورت روشن پیشانی اور سلکی بال تو میرے منہ سے بے اختیار ہی پتا نہیں کیوں نکل گیا۔ میرا شہزادہ...... میرا شہزادہ سلیم...... بس اس سے تم مجھے بے حد یاد آئے تھے۔ بھولی تو میں کبھی بھی نہیں تمہیں...... اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے کام کرتے ہوئے تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے نا کبھی کبھی کوئی یاد اچانک زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے تو اس روز بس ایسے ہی ہوا تھا کہ تمہاری یاد نے زیادہ شدت اختیار کر لی تھی اور حامد کا چہرہ ہاتھوں میں لیے لیے تم میرے تصور میں چلے آئے تھے۔ وہی خواب والا منظر...... کنویں کے پاس کھڑے تم، تو بس بے خیالی

میں ہی میرے لبوں سے نکل گیا تھا شہزادہ سلیم......

تو میں کیا کہہ رہی تھی ہمارا رابجہ میری طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے یوں پریشان دیکھ کر ہولے سے ہنس دی تھی۔

”کیا میں اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتی۔ تم میرے حامد ہو۔ میرے ابا نے تمہارا نام حامد رکھا تھا میرے بھائی کے نام پر۔ بس مجھے یوں ہی تمہیں دیکھ کر کوئی یاد آ گیا تھا۔“

”کون اماں! کون یاد آ گیا تھا۔ یہ شہزادہ سلیم کون ہے۔ پہلے تو کبھی آپ نے یہ نام نہیں لیا؟“

وہ تمہارا بیٹا ہے نا تو تمہاری طرح ہی ذہین ہے۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے، ہر بات کی کھوج لگاتا ہے۔

”یہ نام تو کسی کا نہیں۔ بس میں نے تمہارے ابا کو جب پہلی بار خواب میں دیکھا تھا تو یہ نام دیا تھا......“

پھر میں نے اسے بتایا کہ کب پہلی بار میں نے تمہیں استانی جی کے گھر دور سے دیکھا تھا اور پھر خواب میں تم مغل شہزادے کے روپ میں نظر آئے تھے تو تمہاری طرح وہ بھی ہنس دیا تھا۔

”اماں! آپ بھی نا کتنی معصوم اور سادہ تھیں۔“

میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس خواب سے پہلے ہی تمہاری محبت نے میرے دل پر وار کر دیا تھا اور یہ میرا خیال ہی تھا جس نے خواب کا روپ دھارا تھا۔“

”جب ابا سے آپ کی شادی ہوئی تو کیا ان کی شکل آپ کے خواب والے شہزادہ سلیم سے ملتی تھی؟“

وہ تمہارے متعلق ہر بات، بہت دلچسپی سے سنتا ہے۔ اور کرید کرید کر پوچھتا ہے اور ایسے میں اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح دمکتی ہیں اور ایسے میں وہ کہتا ہے کہ دیکھنا اماں جب میں بڑا ہو جاؤں گا اور ابا جتنا بڑا افسر بن جاؤں گا تو ایک روز اپنے ابا کو ڈھونڈ لوں گا۔ وہ یہ بات دہراتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ......

”بھلے لاہور شہر بہت بڑا شہر ہے لیکن لگن سچی اور ارادہ پختہ ہو تو پھر منزل مل ہی جاتی ہے۔“

شاید یہ بات اس کے ماسٹر جی نے اس سے کہی ہوگی۔ وہ اپنے ماسٹر کی کہی ہوئی ہر بات یاد رکھتا ہے۔ اس کے ماسٹر جی اسے نصاب کی کتابوں کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے

رہتے ہیں۔ وہ اسے وظیفے کا امتحان دلوانے کے لیے شہر بھی لے جائیں گے۔ وہ ہر سال ہی اپنے اسکول سے بچے وظیفے کا امتحان دلوانے کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے شہزادے کے متعلق وہ کہتے ہیں۔ آج تک انہوں نے جتنے بھی بچوں کو پڑھایا ہے۔ شہزادے جیسا لائق اور ذہین کوئی بھی نہیں تھا۔

لو میں بھی بات کرتے کرتے کہاں سے کہاں چلی جاتی ہوں۔ تو شہزادہ کہتا ہے کہ اس کی لگن سچی ہوگی تو وہ ایک روز تمہیں ڈھونڈ لے گا تو کیا میری لگن سچی نہیں تھی میرے بادشاہ! لیکن میں نے تمہیں ڈھونڈنے کے لیے گلیوں کی خاک نہیں چھانی۔ مرد ہوتی تو گیرو کپڑے پہن کر ہاتھ میں کشکول پکڑ کر گھر سے نکل پکڑتی، صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھانتی۔ شہروں شہروں، گلیوں گلیوں تمہیں ڈھونڈتی پھرتی لیکن میں تو ایک کمزور عورت تھی، اور ابا کہتے تھے۔

”زیب النساء! باہر کی دنیا بہت خوب صورت اور اچھی لگتی ہے لیکن اکیلی جوان عورت کے لیے بھیڑیا بن جاتی ہے۔ نوچ کر کھا جاتی ہے اسے......“

تو میں کیسے اکیلی گھر سے نکل پڑتی لیکن میں نے کبھی تمہارا انتظار نہیں کھویا۔ میں نے ہر روز ہر نماز میں اور یوں بھی اٹھتے بیٹھتے تمہارے لوٹ آنے کی دعائیں کی ہیں۔ پتا نہیں مجھے دعا کرنا نہیں آتی یا میری دعاؤں میں اثر ہی نہیں ہے۔ میری ہر صبح اس خیال سے طلوع ہوتی ہے کہ آج...... ہاں آج ضرور کہیں سے کوئی خبر تمہارے متعلق آ جائے گی شاید اقبال بھائی...... شاید فاطمہ آپا کچھ بتائیں آ کر یا شاید تم خود ہی ہمیں کھوجتے ہوئے چلے آؤ، میری منتظر آنکھیں صبح سویرے ہی دہلیز پر لگ جاتی ہیں لیکن اب تو لگنے لگا ہے شاہ کہ اپنی منتظر آنکھیں دہلیز پر ہی چھوڑ جاؤں گی، ان آنکھوں کا انتظار کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پتا ہے جب شہزادہ چلا جاتا ہے اسکول تو جانے کہاں سے آنسو آ کر آنکھوں کی دہلیز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پتا نہیں آج کل اتنا رونا کیوں آتا ہے۔ شاید صبر نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، پتا نہیں اتنا پانی کہاں سے آ گیا ہے ان آنکھوں میں...... لگتا ہے سمندر نے میری آنکھوں پر حکمرانی کر لی ہے۔ اب یہ آنکھیں آخری سانسوں تک خشک نہیں ہوں گی۔ تمہاری گنی چنی باتیں، گنے چنے دن بس یہی تو سرمایہ زندگی ہیں۔ انہیں دہراتی رہتی ہوں دن بھر فارغ بیٹھی۔ پہلے یہ باتیں خوش کرتی تھیں، اب پتا نہیں کیوں یاد کرتی

ہوں تو سمندر ابل پڑتے ہیں۔ سرمایہ زندگی سے یاد آیا ایک بار تم نے کہا تھا۔

''زیب! تمہاری محبت اور احساسات میرا سرمایہ زندگی ہے۔ میں خوشی و مسرت کے سارے چاند، سورج، ستارے تمہارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ خوشی کے سارے چاند، سورج، ستارے میرا نصیب نہیں تھے شاید۔''

اس کی آنکھیں پہلے آنسوؤں سے بھریں اور پھر سمندر ابل پڑے۔ اس نے خط یوں ہی ادھورا چھوڑ دیا۔ اچھی طرح رونے کے بعد جب دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ ادھورا خط ہی تھیلے میں موجود لفافے میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تھیلا الماری میں رکھا اور تالا لگا کر چابی گدے کے نیچے رکھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ دھوپ اب سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی برآمدے میں کھڑی رہی پھر ہولے ہولے چلتی ہوئی صحن میں آئی اور حمام کے پاس پڑی چوکی پر بیٹھ کر اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ جلتی آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارے اور دیوار کے ساتھ پڑے گھڑے کی طرف دیکھا تو حلق میں جیسے کانٹے چبھنے لگے۔ دوپٹے سے ہی چہرہ پونچھ کر وہ گھڑے کے پاس آئی۔ کٹورے میں پانی ڈال کر وہاں ہی بیٹھ کر پیا لیکن پھر اٹھ نہ سکی۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

دو بار دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا تب وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور وہ گرتی چلی گئی۔ ابھی اسے گرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ زیتون چینی لینے کے لیے آئی کہ اس کے گھر میں چینی ختم ہو چکی تھی۔ جوں ہی اس نے دروازہ کھولا اسے صحن کے فرش پر گرا دیکھ کر بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

''زیب...... زیب النساء! آنکھیں کھولو...... کیا ہوا ہے۔ کیسے گر پڑیں......؟''

لیکن زیب النساء یوں ہی پڑی رہی۔ زیتون نے اسے ہلایا جلایا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر مایوس ہو کر دروازے کی طرف بھاگی اور دروازہ کھول کر بلند آواز میں سامنے والے گھروں میں رہنے والی بلقیس اور سکینہ کو بلانے لگی۔

''نی بلقیس، نی سکینہ! جلدی آؤ......''

فوراً ہی سامنے والے دونوں گھروں کے دروازے کھلے، بلقیس اور سکینہ اپنے اپنے گھر سے دوڑتی ہوئی باہر گلی میں آئیں۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا زیتونی......؟ خیر ہے؟''

''وہ اپنی زیب النساء بے ہوش ہو کر گر گئی ہے۔'' وہ بتا کر اسی طرح بھاگتی ہوئی واپس زیب النساء کے پاس آئی۔ وہ اسی طرح ہوش و حواس سے بے گانہ پڑی ہوئی تھی۔

''بلقیس! تم جا کر اپنے چھوٹے کو حکیم صاحب کی طرف بھیجو...... انہیں بلا لائے یا پھر خود ہی چلی جاؤ، اگر گھر میں کوئی نہیں ہے تو...... میں اور سکینہ اسے اٹھا کر اندر لے جاتے ہیں۔''

بلقیس سر ہلاتی ہوئی یوں ہی الٹے قدموں واپس چلی گئی اور زیتون نے سکینہ کی مدد سے زیب النساء کو اٹھا کر کمرے میں چارپائی پر لٹایا۔

زیب النساء دھان پان سی تو تھی وہ آرام سے اسے اٹھا کر کمرے میں لے آئی تھیں اور اب دونوں ہی اس کے ہاتھ پاؤں مل رہی تھیں۔ زیتون وقفے وقفے سے اسے آوازیں بھی دے رہی تھی۔ حکیم صاحب فوراً ہی بلقیس کے ساتھ اپنا تھیلا اٹھائے آ گئے تھے۔ انہوں نے آ کر نبض چیک کی، ایک شیشی سے ڈراپر کے ذریعے چند قطرے نکال کر اس کے حلق میں ٹپکائے۔

''بخار بہت تیز ہے۔ اور کمزوری بھی بہت ہے۔ اسی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھو، بخار اتر جائے تو دودھ کے ساتھ دوا دینا۔ دوا تو کل ہی حامد پتر لے کر آیا ہے۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ! جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ دودھ اور ہلکی غذا ہی دو، روٹی وغیرہ نہ کھائے۔'' وہ تھیلا اٹھا کر کھڑے ہوئے۔

''پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں حکیم صاحب بخار ٹوٹ ہی نہیں رہا، اگر آپ اجازت دیں تو کل شہر لے جائیں؟'' زیتون نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ حکیم جی ذرا غصے کے تیز تھے۔

''ہاں ضرور لے جاؤ، میرا خیال ہے معیادی بخار (ٹائیفائیڈ) ہے۔ پہلے کچھ دن تو ملیریا کی دوا

دی تھی، پر اب دوا بدل دی ہے۔ وہاں خون چیک کریں گے تو پتا چل جائے گا کون سا بخار ہے۔ میری دوا سے اگر آرام نہیں آ رہا تو کیا خبر انگریزی دوا سے آرام آ جائے۔'' حکیم صاحب نے فراخ دلی سے کہا۔

''بڑی مہربانی حکیم صاحب!'' زیتون نے جو ڈر رہی تھی کہ کہیں حکیم صاحب منع نہ کر دیں بے اختیار کہا۔

''اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔ اتنے دن سے بخار نہیں اتر رہا تو میں خود سوچ رہا تھا کہ زیب النساء بیٹی سے کہوں کہ شہر جا کر دکھا لے۔ وہاں ٹیسٹ ہوں گے تو مرض کی تشخیص ہو جائے گی۔ تمہیں نہیں پتا بیٹی! اس کی دادی کا میری اماں سے بہت بہناپا تھا۔ اس کی دادی کا میکہ ہے ہمارا گاؤں......''

زیتون نے سر ہلایا اور حکیم صاحب کے جانے کے بعد زیب النساء کے ماتھے پر پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر رکھنے لگی۔ سکینہ اور بلقیس تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اللہ زیب النساء کو صحت و زندگی دے۔ اسے کچھ ہو گیا تو اس کا شہزادہ تو رل جائے گا۔ مائیں نہ رہیں تو بچے رل جاتے ہیں اور اس غریب کا تو باپ بھی نہیں ہے۔''

زیب النساء کی دیکھا دیکھی گاؤں میں سب ہی اسے شہزادہ کہہ کر بلانے لگے تھے۔

''تم دعا کرنا زیب کے لیے......''

زیتون نے پریشانی سے آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑی زیب النساء کو دیکھا۔ اور ان دونوں کے جانے کے بعد پھر اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھنے لگی۔ پٹیاں رکھنے سے بخار کی شدت کچھ کم ہوئی تو زیب النساء نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر یوں ہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''زیب!'' زیتون نے پیار سے اس کا رخسار سہلایا۔ ''کیسی ہے......؟''

''کیا ہوا ہے مجھے......'' زیب النساء کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔

''میں چینی لینے آئی تو تم وہاں صحن میں گری ہوئی تھیں۔'' زیتون نے ہاتھ میں پکڑی پٹی کٹورے میں رکھی۔

''ہاں میں پانی پینے لگی تھی تو مجھے چکر آ گیا تھا۔'' زیب النساء نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو...... حکیم صاحب نے کہا تھا کہ تمہیں ہوش آ جائے تو دودھ کے ساتھ وہ ایک پڑی دے دوں جو کل حامد لے کر آیا تھا۔ دودھ ہے یا گھر سے لے آؤں؟" زیتون کٹورا اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہے، نعمت خانے میں دیگچی پڑی ہے۔"

زیب النساء اس کے منع کرنے کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔ زیتون فوراً ہی دودھ لے کر آ گئی۔ اور زیب النساء سے پوچھ کر انگیٹھی (کارنس) پر سے پڑیوں والا لفافہ نکال کر ایک پڑیا اسے دی۔

"اس کا ذائقہ بالکل ڈسپرین جیسا ہے۔ لگتا ہے جیسے حکیم صاحب نے ڈسپرین کی گولیاں پیس کر یہ سفوف بنایا ہے۔ کھاتی ہوں تو کچھ دیر بعد بخار اتر جاتا ہے۔" زیب النساء نے پڑیا کھول کر منہ میں ڈالی اور دودھ کا گھونٹ بھرا۔

"تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک ہے تو میں گھر کا چکر لگا کر اور ماسی کو بتا کر آتی ہوں۔ تمہارے لیے ساگودانہ بنانے لگی تھی۔ گھر میں چینی نہیں تھی۔ ماسی سے کہا ابھی چینی لے کر آتی ہوں۔ اور وہ انتظار کرتی ہوگی۔ اسے ذرا تائی کی طرف جانا تھا۔"

"چلی جانا زیتون! لیکن پہلے وعدہ کر، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے شہزادے کا خیال اپنے بیٹے کی طرح ہی رکھے گی۔"

زیب النساء جانے کتنی بار اس سے وعدہ لے چکی تھی۔

"زیتون میرے بیٹے کو کبھی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دینا۔"

"دیکھ زیب النساء! ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی ماں کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ شہزادے کا خیال اپنے فضل کی طرح ہی رکھوں گی لیکن تم...... تم یہ مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو۔ اللہ سے اپنے لیے صحت و زندگی کی دعا کرو کہ شہزادے کی ماں تم ہو۔ تمہارے علاوہ کوئی بھی اسے وہ پیار نہیں دے سکتا جو تم دے سکتی ہو۔"

زیتون چاہتی تھی کہ وہ اس پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی صحت کا خیال رکھے جو وہ بالکل نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا کرے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ مرتی جا رہی تھی۔

''جانتی ہوں زیتون! میرے بعد میرا شہزادہ اکیلا رہ جائے گا لیکن کیا کروں۔ ابا کی طرح میرا دل بھی ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ بس اب وقت پورا ہوا چاہتا ہے تو سنو زیتون! میرے شہزادے کو پڑھنے کے لیے شہر ضرور بھیجنا۔ اس کا باپ بہت پڑھا لکھا تھا، میں چاہتی ہوں کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح بہت سارا پڑھے۔ اس کی پڑھائی کے خرچ کی تم فکر نہ کرنا۔ میرے پاس کچھ نقد رقم اور زیور ہے۔ زیور فروخت کر دینا جب ضرورت پڑے۔ ماسی جنتاں کا یہ گھر اور زمین بھی ہے اور......''

''بس کر زیب النساء!'' زیتون نے اسے ٹوک دیا۔ ''تو تو ایسے باتیں کر رہی ہے جیسے الہام ہوا ہو تجھے۔ ایک دو ماہ تک فضل اور شہزادہ پانچویں پاس کر لیں گے تو دونوں کو شہر کے اسکول میں داخل کروا دیں گے۔ میں نے پہلے ہی اپنے مولیر (ماموں زاد بھائی) سے بات کر لی ہے وہ انہیں داخل کروا آئے گا اور لاری پر صبح صبح اس کے بچوں کے ساتھ ہی یہ بھی اسکول چلے جایا کریں گے۔''

گاؤں کے اکثر بچے شہر پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ گھنٹہ بھر کا رستہ تھا۔ زیب النساء نے اثبات میں سر ہلایا اور زیتون کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''بس اب میں کوئی فضول بات نہیں سنوں گی۔ ان شاء اللہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنے شہزادے کی دلہن اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر لاؤ گی اور میں شہزادے کی شادی پر تم سے خوب صورت سا جوڑا لوں گی۔ ہاں تو خالہ ہوں اپنے شہزادے کی۔'' زیتون نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

''اگر میری زندگی میں وہ وقت آیا تو تم ایک کے بجائے دس جوڑے لے لینا۔ لیکن میری زندگی میں وہ وقت پتا نہیں آئے گا یا نہیں۔''

''پھر وہی مایوسی کی باتیں...... تم نے اگر پھر ایسی باتیں کی نا تو میں نے بات نہیں کرنی تم سے۔''

زیتون نے ناراضی سے اسے دیکھا۔ زیب النساء خاموش رہی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ ماسی نے پورے گاؤں میں ڈھونڈورا پٹوا دینا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر چکر لگاتی ہوں۔ ہاں تھوڑی سی چینی لے کر جا رہی ہوں۔ سا گودانہ بنا کر لے آؤں گی اور تیرے

شہزادے کے لیے بھی کھانا لے آؤں گی اٹھ کر پکانے نہ بیٹھ جانا۔"

اس نے ایک نظر خاموش بیٹھی زیب النساء کو دیکھا اور مزید کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ زیب النساء کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور بند آنکھوں کے سامنے وہ چلا آیا۔ پیشانی پر بار بار گرنے والے اپنے سلکی بالوں سے لڑتا ہوا۔ کبھی بائیں ہاتھ کی پشت سے اور کبھی دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیچھے کرتا ہوا۔

"میرے شاہ!" اس کے ہونٹوں سے سسکی سی نکلی۔ اتنے سال گزرنے کے بعد تم آج بھی میرے تصور میں ایسے ہی چلے آتے ہو۔ اب جب کہ زندگی کا جام لبریز ہونے کو ہے، اب بھی...... ہاں میرے اندر سے آواز آتی رہتی ہے زیب النساء! وقت پورا ہوا چاہتا ہے۔ بس چند دن، چند ہفتے، چند مہینے اور پھر سانسوں کا یہ سفر ختم ہو جائے گا۔ زیتون تو بس یوں ہی مجھے دلاسا دیتی ہے۔ بلکہ مجھ سے زیادہ خود کو...... لیکن میں تو جانتی ہوں کہ میرا وقت پورا ہوا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے چاروں اور سناٹے اور روتی ہوئی ہواؤں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ برسوں میں نے تمہارے لوٹ آنے کا انتظار کیا لیکن تم شاید ایک خوب صورت لمحہ تھے۔ صبا کا ہلکا سا جھونکا یا کسی ستارے کی ہلکی سی روشنی جو پلک جھپکنے تک باقی نہیں رہی۔

میرے دل کے مالک...... میرے شاہ! میں نے اکثر تمہیں خط لکھے ہیں لیکن آج جو کہنے لگی ہوں وہ بات پہلے کبھی نہیں کہی۔ لیکن اب جب کہ موت کی آہٹیں مجھے اپنے آس پاس محسوس ہوتی ہیں تو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے تم سے کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں۔ میرے نصیب میں ایسا ہی ہونا لکھا گیا تھا۔ جب زیتون یا کوئی اور کہتا تھا کہ تم نے میرے دل سے کھلواڑ کیا تب بھی میں نے تمہیں رتی بھر قصوروار نہیں جانا اور نہ ہی آخری سانسوں تک کبھی تمہیں قصوروار سمجھوں گی کہ یہ سب ایسے ہی ہونا کتاب میں لکھا جا چکا تھا۔ تو میرے شاہ! اگر کبھی تم آؤ اور میرے خط پڑھو تو یقین رکھنا کہ میں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تمہاری محبت پر اپنا یقین نہیں کھویا۔ تم اگر کہیں ہو اور ہم کو تلاش نہیں کر پائے یا لوٹ کر نہیں آئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم نے مجھ سے محبت نہیں کی یا ان پندرہ دنوں میں جو تم نے کہا وہ سب جھوٹ تھا۔ اور اگر وہ سچ تھا جو اقبال بھائی نے کہا تو اب بس میرا انتظار ختم ہونے والا ہے۔ دل

بہت شدت سے تڑپتا تھا تمہیں ایک بار دیکھنے کے لیے لیکن اب اس خیال سے تڑپ کبھی کبھی کم ہو جاتی ہے کہ تم وہاں میرے منتظر ہو گے۔"

صحن میں دھپ کی آواز آئی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید باہر صحن میں بلی کودی تھی۔

"تو......"

اس نے سامنے الماری کی طرف دیکھا اور سوچا ابھی وہ جو سوچ رہی تھی اسے اس ادھورے خط میں لکھ دے، پتا نہیں پھر کبھی لکھنے کا وقت ملے نہ ملے۔ لیکن وہ پھر اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔ میں تو جیسے تیار بیٹھی ہوں کہ کب موت کا فرشتہ آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائے......اور میرا شہزادہ میں اس کے متعلق کیوں نہیں سوچتی...... وہ میرے بغیر کیسے رہے گا۔ زیتون کہتی ہے ماں کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ میری اماں چلی گئی تھی تو میں اتنی بڑی تھی پھر بھی کتنا بلکتی تھی۔ اور شہزادہ تو اتنا بڑا بھی نہیں ہے۔

پہلے آنکھیں نم ہوئیں، پھر برس پڑیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی لیکن آنسو تھے کہ بہتے جا رہے تھے۔ تب ہی زیتون نے کمرے میں قدم رکھا۔

"کیا ہوا زیب النساء......؟" ہاتھ میں پکڑا ہوا ساگودانے کا پیالہ اس نے میز پر رکھا۔ "کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا......؟ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں......!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس یوں ہی دل بھر آتا ہے یہ سوچ کر کے میرے بعد میرا شہزادہ بہت روئے گا۔ تم اس کا خیال رکھو گی مجھے پتا ہے لیکن میں اسے یاد آیا کروں گی نا۔"

"پھر وہی پاگلوں جیسی باتیں۔" زیتون نے ناراضی سے اسے دیکھا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"نہیں، پاگلوں جیسی نہیں، حقیقت پسندوں جیسی باتیں کرتی ہوں۔ تم بتاؤ میرے بعد میرا شہزادہ مجھے یاد کر کے کیا نہیں روئے گا؟"

اس نے دوپٹے کے پلو سے اچھی طرح اپنا گیلا چہرہ صاف کیا لیکن پلکیں پھر بھی بھیگی بھیگی تھیں۔

"مجھے تمہارے کسی فضول سوال کا جواب نہیں دینا۔ میں یہ ساگودانہ لے کر آئی تھی۔ تھوڑا سا کھا لو۔ میں چھوٹا پیالہ اور چمچ لے کر آتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی تو زیب النساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

''کھا لوں گی ابھی کچھ دیر تک۔ شہزادہ اسکول سے آجائے گا تو تب ہی کھاؤں گی۔ وہ اکیلے کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتا نا۔''

''تو پھر میں جاتی ہوں۔ ابھی روٹیاں پکانی ہیں آٹا گوندھ آئی تھی۔ ماسی تو تمہیں پتا ہے نا تائی کی طرف گئی تھی، ابھی تک آئی نہیں۔ میں نے سوچا بھاگ کر تجھے ساگودانہ بھی دے آؤں اور تمہاری خیر خبر بھی لے آؤں۔''

وہ پھر اٹھنے لگی تو زیب النساء نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

''بس میری ایک بات سن لو، پھر چلی جانا۔ صفدر بھائی سے میرے بعد بھی کہتی رہنا کہ وہ اقبال بھائی کا پتا کرتے رہیں اور جب بھی وہ آجائیں تو ان سے پوچھ کر شہزادے کو اس کے خاندان میں بھجوا دینا۔ پتا ہے زیتون، وہ کہتا تھا اس کے ابا جان اور اماں جان بہت اچھے ہیں۔ بہت محبت کرنے والے کشادہ دل لوگ...... اور اس کے بھائی بھی...... مجھے یقین ہے اس کے خاندان والے اپنے بیٹے کی نشانی کو بہت محبت اور پیار سے سینے سے لگالیں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھے خیال آیا ہے کہ میں کیوں تم پر ذمہ داری ڈالوں اور شہزادے کو کیوں اپنے رشتوں سے محروم رکھوں۔ اس کا تو اتنا بھرا پرا خاندان ہے۔ دادا، دادی، تائے، پھوپھی...... سب ہی...... ہاں اگر اس کے خاندان کا پتا نہ چل سکا تو پھر تم ہونا میرے شہزادے کی خالہ......''

اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن ہونٹ بس پھیل کر رہ گئے تھے۔ زیتون نے سر ہلایا تھا اور نم آنکھوں کے ساتھ ہاتھ چھڑا کر باہر آگئی تھی۔ اندر کہیں ادراک ہوا تھا کہ زیب النساء بچھڑنے والی ہے۔

''یا اللہ! زیب النساء کو بہت لمبی زندگی دے۔ اتنی لمبی کہ یہ اپنے شہزادے کے سر پر سہرا باندھے، اس کی دلہن کو لے کر آئے اور پھر اس کے بچوں کی خوشیاں دیکھے۔''

لیکن سب دعائیں قبول نہیں ہوتیں، کچھ دعائیں یوں ہی آسمانوں میں بھٹکتی رہ جاتی ہیں۔ زیتون کی دعا بھی قبول نہیں ہوئی تھی اور صرف چار ماہ بعد زیتون اس کی چارپائی کے پاس موڑھے پر بیٹھی ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور زیب النساء کبھی کبھی آنکھیں کھول کر اسے دیکھتی پھر بند کر لیتی۔

''زیب النساء! کچھ کہو، کوئی بات کرو۔ مجھ سے نہ سہی، اپنے شہزادے سے ہی کوئی بات کر لو۔''

زیتون نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بات کروں زیتون، جتنی باتیں کرنی تھیں، کر لیں۔ اب بولنے میں بہت طاقت لگتی ہے۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''اماں! پانی پینا ہے......؟'' شہزادہ جو اس کے پاس ہی اس کی چارپائی پر پائنتی بیٹھا اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا، اٹھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شہزادہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ زیب النساء کی نظروں نے دروازے سے باہر نکلنے تک اس کا تعاقب کیا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

چار ماہ پہلے زیتون کے ساتھ شہر کے اسپتال میں چیک اپ کروانے گئی تھی اور جیسا کہ زیتون اور حکیم جی کا خیال تھا اسے معیادی بخار تھا۔ ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ اسے آرام کرنے کی اور نرم غذا کھانے کی تاکید کی تھی۔ دس گیارہ دن بعد بخار تو اتر گیا تھا لیکن وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ زیتون بار بار اسے تاکید کرتی کہ وہ اپنی خوراک کا خیال رکھے اور دودھ تو لازمی ہر روز پیا کرے اور وہ کوشش کرتی تھی کہ ہر روز ایک پیالی دودھ پی ہی لیا کرے۔ اگر کبھی بھول جاتی یا دل نہ چاہتا تو شہزادہ خود ہی دودھ پیالی میں ڈال کر لے آتا اور ضد کر کے پلاتا۔ کمزوری آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی کھانا بھی شروع کر دی تھی۔ زیتون اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ صفدر جب شہر جاتا اس کے لیے گردن کا گوشت منگوا کر یخنی بناتی۔ آٹے میں تھوڑا سا سوڈا ڈال کر نرم سا پھلکا بنا دیتی۔

''ماسی کہتی ہے اس بخار میں آنتیں سخت روٹی ہضم نہیں کر پاتیں۔ پرانے زمانے میں تو بخار اترنے کے بعد بھی کئی کئی ہفتے تک حکیم، ڈاکٹر روٹی نہیں کھانے دیتے تھے تو بس کچھ دن یہ چھوٹا سا پھلکا بنا دیا کروں گی دن کے وقت اور رات کو ساگودانہ یا پتلی کھچڑی۔''

لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ زیتون کی اتنی احتیاط کے باوجود مہینہ بھر پہلے اسے پھر بخار ہو گیا تھا۔ معمولی حرارت ہو جاتی تھی۔ حکیم صاحب نے کئی بار چیک کیا۔ 99 یا 100 ڈگری سے زیادہ نہ ہوتا۔ لیکن اس معمولی بخار نے اس کی بھوک پیاس ختم کر دی تھی۔ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہ چاہتا تھا۔ حکیم

صاحب کا خیال تھا معدے میں گرمی ہو گئی ہے۔ تین ماہ پہلے ہونے والے "تپ" سے۔ زیتون کا خیال تھا کہ حکیم صاحب کی دوائی اور ٹھنڈی تاثیر والی خوراک سے وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی لیکن زیب النساء کو لگتا تھا کہ اب یہ مرض الموت ہی ہے۔ شہزادے نے پانچویں کا امتحان پاس کر لیا تھا اور چھٹیوں کی وجہ سے ہر وقت گھر ہی ہوتا تھا۔ اب تو وہ فضل اور صابر وغیرہ کے ساتھ کھیلنے بھی نہیں جاتا تھا۔ شاید اسے بھی ادراک ہو گیا تھا کہ ماں کا ساتھ چھوٹنے والا ہے۔

وہ شہزادے کو دیکھتی تو اس کا جی بھر آتا۔ اسے گلے لگاتی اس کی آنکھیں، اس کے ہاتھ، اس کی پیشانی چومتی اور ایسا دن میں کئی بار ہوتا۔ شہزادہ اس کے اس والہانہ انداز سے گھبرا جاتا۔

"اماں! آپ کہیں جانے والی ہیں؟"

صابر کی اماں کی اس کے بھائی نے دوسری شادی کر دی تھی تو سسرال جانے سے پہلے وہ یوں ہی صابر کو گلے لگا کر چومتی تھی۔ صابر کے ابا فوت ہو چکے تھے لیکن اس کے ابا کا تو کچھ پتا نہ تھا کیا خبر وہ زندہ ہی ہوں۔

"نہیں...... میں نے کہاں جانا ہے۔ بس میرا دل بہت گھبراتا ہے شہزادے! مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی تمہارے نانا ابا کی طرح کسی روز دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

وہ آہستہ آہستہ اسے اس روز کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی، جب اسے نہیں ہونا تھا۔

"تمہیں پتا ہے نا شہزادے! جو اس دنیا میں آتا ہے ایک روز اسے واپس بھی جانا ہے۔ اپنے رب کے پاس، ایسے ہی جیسے ماسی جنتاں چلی گئی۔ شاید میں بھی کسی روز ایسے ہی چلی جاؤں۔"

"لیکن ماسی جنتاں تو بوڑھی تھی آپ تو ابھی بوڑھی نہیں ہیں نا۔" شہزادے کا ننھا سا دل اس کی بات سن کر ڈر جاتا۔

"لیکن میرے راجے، میرے شہزادے! موت جوان، بوڑھا، بچہ کچھ نہیں دیکھتی...... جب وقت پورا ہو جاتا ہے تو اپنے رب کے حکم سے وہ دبوچ کر لے جاتی ہے۔ میرا بھی جب وقت پورا ہوا تو مجھے بھی جانا ہو گا۔ آج، کل، پرسوں، کسی بھی وقت...... یہ بھی ہو سکتا ہے، میں بہت سارے سال اور جیوں......

دس، پندرہ، سولہ...... زندگی تو بہت بے اعتبار ہے شہزادے...... اور ہمیں اپنی موت کے وقت کا علم نہیں ہے۔ اس لیے میں وقتاً فوقتاً تمہیں کچھ نہ کچھ بتاتی رہتی ہوں کہ ہو سکتا ہے مجھے تم سے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ ملے اور موت سر پر آ کھڑی ہو۔ بس تم میری باتوں کو دھیان سے سنا کرو، اور انہیں یاد رکھنا۔''

وہ اسے پاس بٹھا کر کچھ نہ کچھ بتاتی رہتی تھی۔

شہزادہ اس روز اس سے لپٹ گیا تھا۔

''میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ میری زندگی کے سارے سال بھی آپ کو دے دے۔ آپ تو بڑی ہیں، میرے بغیر بھی رہ سکتی ہیں۔ میں تو چھوٹا ہوں، میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''اللہ تمہیں لمبی حیاتی دے۔'' اس نے اسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا تھا اور اس کے آنسو شہزادے کے خوب صورت بالوں والے سر پر گر رہے تھے اور شہزادے کے آنسو اس کا سینہ بھگوتے تھے۔

''سنو شہزادے......!'' ایک روز اس نے شہزادے سے کہا تھا۔ ''تمہارے ابا ایک بہت اچھے اور بہترین انسان تھے۔ کبھی زندگی میں وہ ملیں تو ان سے ناراض مت ہونا۔ غصہ مت کرنا، وہ جو ہم تک نہیں آ پائے تو ضرور مجبور رہے ہوں گے۔ مجھے پتا نہیں کیوں کبھی بھی اقبال بھائی کی بات پر یقین نہیں آیا اس لیے مرا دل کہتا ہے کہ میری زندگی میں نہ سہی، تو میرے بعد شاید وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں۔''

اس نے ایک روز شہزادے کو اپنی شادی اور اقبال بھائی اور ماسی نور بھری کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

''میں جانتی ہوں ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ میں تم سے یہ سب ابھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ جو اچانک ہی میرے اندر ایک خوف، ایک ڈر سا بیٹھ گیا ہے کہ کسی روز اچانک ابا کی طرح میں بھی آنکھیں بند کر لوں گی ہمیشہ کے لیے تو اس ڈر سے میں یہ سب باتیں تمہیں بتاتی رہتی ہوں۔ الماری میں کپڑے کا جو تھیلا پڑا ہوا ہے اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھنا۔ اس میں ایسے کاغذات ہیں جن کی تمہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تمہارا برتھ سرٹیفکیٹ، میرا نکاح نامہ...... اور ایسے ہی اہم کاغذات۔ اس میں کچھ خط ہیں جو میں نے تمہارے ابا کے نام لکھے تھے لیکن وہ کبھی پوسٹ نہیں ہو سکے تھے۔ اگر تمہارے ابا

تمہیں مل جائیں تو انہیں دے دینا لیکن جب مایوس ہو جاؤ بالکل تو وہ ضائع کر دینا۔ جلا دینا۔''

''اماں!'' شہزادے کی نم آنکھوں میں ماں کے بچھڑ جانے کے خوف نے مستقل ڈیرہ جما لیا تھا۔

''ایسی باتیں نہ کیا کریں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں روز دعا کرتا ہوں آپ کی لمبی زندگی کی۔''

''اللہ تمہاری دعا قبول کرے شہزادے۔ پتا ہے ابا کہتے تھے۔

''مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا، جانا تو سب کو وہاں ہی ہے۔ تمہاری اماں اور بھائی پہلے چلے گئے۔ اپنی باری پر مجھے بھی جانا ہے۔ لیکن میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے سے ڈرتا ہوں۔''

مجھے بھی موت سے ڈر نہیں لگتا، میں بھی اپنے بعد تمہارے اکیلا رہ جانے سے ڈرتی ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی بہت دعا کرتی، ہر روز کرتی ہوں لیکن میرے اندر سے کوئی کہتا رہتا ہے کہ زیب النساء دعاؤں کا وقت گزر چکا، سانسیں ختم ہوا چاہتی ہیں۔''

''زیب النساء!'' زیتون نے جو اسے اتنی دیر سے آنکھیں موندے دیکھا تو گھبرا گئی۔

بخار تو اب ہفتہ بھر سے نہیں ہو رہا تھا لیکن حکیم صاحب کہتے تھے شاید آنتوں میں زخم ہو گئے ہیں۔ اسے بڑے اسپتال لے جاؤ۔ لیکن زیب النساء سے تو چند قدم چلا نہیں جاتا تھا وہ کیسے اسپتال جاتی۔

''کیا ہے زیتونی، مجھے آرام بھی نہیں کرنے دیتی ہو، بار بار جگا دیتی ہو۔'' اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

''شہزادہ کہاں ہے؟''

''تمہارے لیے پانی لینے گیا ہے۔''

تب ہی شہزادہ پانی لیے کمرے میں آیا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا رو کر آیا ہے۔

''شہزادے! ادھر میرے پاس ہی بیٹھ۔ ابھی کہیں نہ جانا۔'' زیب النساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔

زیتون نے سہارا دے کر اس کا سر اونچا کر کے کٹورا اس کے لبوں سے لگایا تو اس نے ایک

گھونٹ بھر کر ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ زیتون نے کٹورا شہزادے کو پکڑا کر آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھا۔

''حکیم جی کو شاید سمجھ میں نہیں آ رہی تمہاری بیماری کی۔ میں صفدر سے کہتی ہوں شہر سے گاڑی لے آئے، وہ کیا کہتے ہیں اسے ایمبولینس، اس میں تمہیں بڑے اسپتال لے چلتے ہیں۔''

''موت کا کچھ تو بہانا بنا ہوتا ہے نا پگلی۔ حکیم صاحب تو بڑے سیانے ہیں۔ شہزادے......!'' پھر اس نے شہزادے کی طرف دیکھا۔ ''الماری میں وہ جو کالا بیگ پڑا ہے نا وہ نکال کر لے آ۔''

شہزادہ بیگ نکال کر لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''زیتون! یہ بیگ سنبھال لے، میرے شہزادے کی امانت ہے۔''

''نہیں......!'' زیتون نے ہاتھ پیچھے کیا۔ ''تجھے کچھ نہیں ہوگا زیب النساء...... ہم کل تمہیں بڑے اسپتال لے جائیں گے۔ اپنے شہزادے کی امانت کو خود ہی سنبھال کر رکھ اپنے پاس۔''

لیکن زیب النساء نے جیسے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

''تمہیں پتا ہے نا زیتون، پھوڑی والے گھر میں (جہاں فوتگی ہوتی ہے، میت والا گھر) وہاں پورا گاؤں ہی آتا ہے۔ کیا خبر کوئی ایسے ویسے بھی آ جائیں۔ ہر طرح کے بندے ہیں نا دنیا میں۔ تم جاؤ اور جلدی سے سنبھال کر رکھ آؤ۔''

زیتون رو پڑی۔

''ایسا نہ کر زیب النساء......''

''اپنی خوشی سے کون جاتا ہے زیتون۔ جا رکھ کر جلدی آ جانا، زیادہ دیر نہ لگانا۔ میرے آخری وقت میں میرے پاس ہی ہونا۔ میرے شہزادے کو سنبھال لینا۔'' وہ جیسے تھک گئی تھی اور ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

شہزادے نے چمچ سے پانی اس کے منہ میں ٹپکایا۔ اس نے ملتجی نظروں سے زیتون کو دیکھا تو وہ بیگ لے کر روتی ہوئی چلی گئی لیکن پھر فوراً ہی واپس آ گئی۔ اس کے ساتھ اس کی ساس بھی تھی۔

"مجھے لگتا ہے ماسی! زیب النساء کا آخری وقت آ گیا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ۔" زیتون ماسی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بہت بے چین تھی۔ کبھی سینہ ملتی کبھی کروٹ بدلنے کی کوشش کرتی۔

"زیب النساء! میں آ گئی ہوں واپس۔"

زیب النساء نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ اور بہت مضطرب تھی۔

"شہزادے! تجھے سورۃ یاسین آتی ہے نا، یہاں اپنی اماں کے پاس بیٹھ کر پڑھ۔ اس سے تیری ماں کو سکون ملے گا۔" ماسی کو پتا تھا کہ مولوی صاحب سب بچوں کو چھوٹی سورتوں کے علاوہ دو چار بڑی سورتیں بھی زبانی یاد کرواتے تھے۔

شہزادہ فوراً ہی زیب النساء کے سرہانے بیٹھ کر پڑھنے لگا تو آہستہ آہستہ اس کی بے چینی ختم ہو گئی۔ چہرے پر سکون پھیلتا چلا گیا۔

شہزادہ خاموش ہوا تو اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں۔ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر زیتون کے ہاتھ میں دیا۔ پھر ایک ہچکی آئی اور شہزادے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ پھر ایک اور ہچکی جیسے کوئی ننھا بچہ سوتے ہوئے سانس لے جیسے ہلکا سا خراٹا اور بس......

ایک اور ہچکی اور زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ماسی نے نیم وا آنکھوں پر ہاتھ رکھے اور زیتون شہزادے کو اپنے ساتھ لپٹائے رونے لگی۔

☆......☆......☆

موروں والی حویلی کے فرسٹ فلور پر دونوں پورشن کے درمیان وسیع ہال تھا جسے مشترکہ سٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر میمونہ اور رخسانہ دونوں ہی سٹنگ میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ آج موسم عام دنوں کے مقابلے میں ٹھنڈا تھا۔

صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ رخسانہ نے اندر آتے ہی ہیٹر جلا دیا تھا۔ اس لیے باہر کی نسبت اندر اتنی ٹھنڈ نہیں تھی۔ اس وقت یہاں فرسٹ فلور پر ان دونوں کے علاوہ صرف سحرش اور مہرین ہی تھیں جو سردی کی وجہ سے اپنے اپنے کمروں میں گھسی ہوئی تھیں۔

ماہ وش شاہ رخ کے ساتھ اپنے لیے کچھ شاپنگ کرنے گئی ہوئی تھی۔ جبکہ بلال بھی دوستوں کے ساتھ کہیں باہر نکلا ہوا تھا۔ اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ ابھی کارخانے سے واپس نہیں آئے تھے اس لیے میمونہ بیگم نے مناسب سمجھا تھا کہ پچھلے کئی دنوں سے ان کے ذہن میں جو خیال آرہا ہے، وہ رخسانہ سے ڈسکس کرلیں۔ خاص طور پر وہ سحرش کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھیں، خیر ہے نا؟"

رخسانہ نے دونوں پاؤں صوفے کے اوپر رکھ لیے تھے۔

❁ ❁

# قسط نمبر 14

''ہاں...... ہاں خیر ہے۔ بس کئی دنوں سے ایک بات سوچ رہی ہوں۔ یہ اپنا عمر ہے نا رقیہ آپا کا بیٹا۔ مرتضٰی بتا رہا تھا بڑی اچھی پوسٹ پر ہے محکمے کی طرف سے گاڑی بھی مل گئی ہے۔ سنا ہے رقیہ آپا اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔''

مرتضٰی کے انکار کے باوجود رخسانہ اور میمونہ کے تعلقات پہلے جیسے ہی تھے۔ رخسانہ کو ظاہر ہے دکھ تو ہوا تھا لیکن جب مرتضٰی کی مرضی نہیں تھی تو پھر زبردستی کی وہ قائل نہیں تھیں۔ ان کی مہرین میں کوئی کمی تو تھی نہیں۔ شاید مرتضٰی سے بھی اچھا رشتہ مل جائے مہرین کو...... بس اسی خیال سے انہوں نے اپنے رویے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنے دیا تھا جب کہ میمونہ تو کئی دن تک روتی اور معذرت کرتی رہی تھیں۔

''اچھا کیا کہیں طے ہو گیا عمر کا رشتہ......؟'' وہ سوالیہ نظروں سے میمونہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں......!'' میمونہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں پتا تو ہے کہ رقیہ آپا ہمیشہ سے ہمارے گھر عمر کا رشتہ کرنے کی خواہاں تھیں۔ تو میں سوچ رہی ہوں رقیہ آپا سے بات کروں مہرین کے لیے......''

''لیکن......!'' رخسانہ حیران ہوئیں۔ ''ایک بار ہم انہیں انکار کر چکے ہیں مونا...... پھر بھلا وہ کیوں اسی گھر میں دوبارہ سوال ڈالیں گی۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑو...... رقیہ آپا بہت اچھی نیچر کی ہیں۔ انہوں نے ہمارے انکار کو انا کا مسئلہ تو نہیں بنایا نا، ہمارے ساتھ تعلقات بھی ختم تو نہیں کیے۔''

میمونہ کے دل کے اندر شاید کہیں یہ بھی تھا کہ اگر مہرین کا جلد کوئی رشتہ نہ آیا تو ہو سکتا ہے ماہ وش

کی زندگی متاثر ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ رخسانہ، اورنگ زیب، مہرین سب ہی ماہ وش سے بہت پیار کرتے تھے۔

رخسانہ متذبذب سی میمونہ کو دیکھ رہی تھیں۔ان کے تذبذب سے نیم رضامندی جھلکتی تھی۔

''ابھی تم کسی سے بات نہ کرنا، میں کل رقیہ آپا کے ہاں جاؤں گی اور باتوں باتوں میں ذکر کروں گی کہ ہمیں مہرین کا رشتہ کرنا ہے۔ان کا عندیہ لے لوں گی۔''

رخسانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔تب ہی اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ اندر داخل ہوئے۔ آج وہ وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے تھے۔جس طرف ان کا کارخانہ تھا وہاں بارش ہو رہی تھی۔اس لیے انہوں نے ورکرز کو چھٹی دے دی تھی۔

''ہیٹر کے مزے لیے جا رہے ہیں۔''ارباب نے بیوی اور بھاوج کی طرف دیکھا اور ہیٹر کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

''اچھا ہوا آپ دونوں یہاں ہیں۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔''اورنگ زیب بیگ بھی بیٹھ گئے تھے۔

''کیا بات؟''میمونہ کے لبوں سے نکلا۔

''آج کارخانے جانے سے پہلے میں ابا جان کو سلام کرنے گیا تو انہوں نے مجھ سے مہرین کے رشتے کی بات کی۔''

دونوں بھائیوں کی عادت تھی کہ کارخانے جانے سے پہلے جہاں زیب بیگ کو سلام کر کے جاتے تھے۔کبھی کبھار ارباب بیگ جلدی میں نہ بھی جا پاتے لیکن اورنگ زیب بیگ کوشش کرتے تھے کہ گھڑی بھر کے لیے ہی سہی، وہ ابا جان سے مل کر ہی جایا کریں۔ آج بھی ارباب بیگ کو دیر ہو گئی تھی، سو وہ اکیلے ہی گئے تھے۔

''کارخانے میں اتنی مصروفیت تھی کہ وہاں ارباب سے بھی بات نہیں کر سکا۔سوچا گھر جا کر ہی کروں گا۔''

''کون...... کس کا رشتہ آیا ہے؟'' میمونہ میں اتنا صبر نہیں تھا۔

''اختر بانو نے اپنے بیٹے ریحان کے لیے مہرین کا رشتہ مانگا ہے۔''

''کیا......؟'' میمونہ کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔

''کیا اختر بانو نے......'' رخسانہ کو بھی جیسے یقین نہیں آیا تھا دونوں ہی اختر بانو کی امارت سے مرعوب تھیں۔

''ہاں اختر بانو نے......'' اورنگ زیب بیگ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جیسا کہ آپ کو پتا ہے ریحان ڈاکٹر ہے اور شادی میں آپ سب مل بھی چکے ہیں۔ مجھے وہ ہر لحاظ سے مہرین کے لیے موزوں لگا ہے۔ لیکن آپ سب کا کیا خیال ہے؟''

''لیکن بھائی صاحب......'' ارباب بیگ چند لمحوں بعد حیرت سے باہر نکلے تھے۔

''آپ جانتے ہیں کہ اختر بانو کی شادی سراسر سلطان چچا کی خواہش پر ہوئی تھی۔ باقی خاندان والوں نے غیر سید ہونے کی وجہ سے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اسی لیے تو سلطان چچا کے بعد ان کے والد نے ثوبان کی شادی اپنے خاندان میں کر دی تھی۔ اور اختر بانو کیسے سالوں بعد آتی تھی یہاں......''

''سب جانتا ہوں ارباب...... لیکن ابا جان کہتے ہیں اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب وہ لوگ غیر سیدوں میں بھی رشتے کر رہے ہیں۔ پھر اختر نے کہا ہے کہ کوئی مجبوری نہیں ہے کہ مہرین یہاں حویلی میں ہی آ کر رہے۔ وہ جہاں رہنا چاہے گی وہاں ہی اسے گھر لے دیں گے۔ لاہور، کراچی یا جہاں سیٹل ہونا چاہے۔ دونوں ڈاکٹر ہیں، ایک دوسرے کو بہتر سمجھ پائیں گے۔''

اورنگ زیب بیگ نے صبح جہاں زیب بیگ سے ہونے والی ساری گفتگو تفصیل سے بتا دی۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن بھائی صاحب اس کی کیا گارنٹی ہے کہ بعد......'' ارباب بیگ نے کچھ کہنا چاہا تو میمونہ بیگم نے ان کی بات کاٹی۔

''لو...... اس میں بھلا لیکن ویکن کی کیا بات ہے۔ آپ نے سنا نہیں کیا کہ ماں بیٹی وکھری (الگ) ذات، پھوپھی بھتیجی ایک ذات...... پھر اپنی اختر بانو تو اتنی پیاری طبیعت کی ہے۔ محبتی اور جان

لٹانے والی...... پھولوں کی طرح رکھے گی اپنی مہرین کو اور ریحان بھی ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے۔''

''لیکن میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ میں نے ابا جان سے سوچنے کا وقت لیا ہے۔ اختر بانو نے گو کبھی کچھ کہا نہیں لیکن کیا ہم نہیں جانتے کہ اس نے وہاں جو وقت گزارا وہ آسان نہیں تھا۔''

اورنگ زیب بیگ متذبذب سے تھے۔

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے بھائی صاحب...... بس ہاں کر دیجیے میں لکھ کر دیتی ہوں ہماری مہرو عیش کرے گی، پیسے میں کھیلے گی۔'' ان کے نزدیک خوشی کا پیمانہ صرف دولت ہی تھی۔

''سچ میں اگر اختر بانو نے میری سحری کا رشتہ مانگا ہوتا تو فوراً ایک لمحہ بھی سوچے بغیر ہاں کر دیتی۔ لو کیا کسی غیر کے گھر جانا ہے، اپنی پھپھی کے گھر جائے گی نا۔''

''تم دو منٹ کے لیے چپ نہیں کر سکتیں مونا۔'' ارباب بیگ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ ''ہر چیز کو دولت کے ترازو میں نہ تولا کرو۔'' اور پھر وہ اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہوئے۔

''سب سے اہم بات مہرین کی رضامندی اور خوشی ہے۔ آپ فیصلہ اس پر چھوڑ دیں۔ بھابھی سے کہیں وہ مہرین سے بات کریں اور اس کی رائے معلوم کریں۔ اگر اسے اعتراض نہ ہوا تو پھر ہم ابا جان کے پاس بیٹھ کر ہر پہلو پر غور کر لیں گے۔ یقیناً انہوں نے بھی ثوبان اور اختر بانو سے ہر بات کر کے تسلی کر کے ہی آپ سے بات کی ہوگی۔''

''اور اگر مہرین کی مرضی نہ ہوئی تو......'' میمونہ بیگم نے سوچا۔ انہیں مہرین کے مرتضیٰ کے لیے جذبات کا کچھ اندازہ تو تھا...... ''تو میں ابا جان سے کہوں گی وہ سحرش کے لیے اختر بانو سے بات کریں۔''

ان کی تو دلی خواہش تھی کہ سحرش کا رشتہ بھی شانزہ کی طرح کسی دولت مند گھرانے میں ہو...... اور انہوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی فیصلہ کر لیا کہ آج ایک بار پھر وہ مرتضیٰ سے بات کریں گی مہرین کے لیے، کیا خبر اس لڑکی کا بھوت اس کے سر سے نکل گیا ہو۔ اور دروازے کے باہر کھڑی سحرش کا منہ تھوڑا سا کھلا اور آنکھیں ساری گفتگو سن کر چمکنے لگی تھیں۔

اس نے کچھ دیر پہلے اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے تایا جان اور ابا جان کو آتے دیکھا تھا۔ وہ اگر کبھی مغرب سے پہلے آجاتے تو شام کی چائے سب اکٹھے ہی پیتے تھے۔ آج کل وقتی ملازمہ صبح ہی چھٹی پر چلی گئی تھی تو وہ چائے بنانے کے خیال سے اٹھ کر باہر آئی تھی اور سٹنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا کہ پہلے تایا جان اور ابا جان کو سلام کر کے چائے کا پوچھ لے کیا خبر انہوں نے کھانا بھی کھانا ہو۔

کبھی کبھار جب انہیں جلدی آنا ہوتا تھا تو دوپہر کا کھانا کارخانے میں کھانے کے بجائے گھر آ کر ہی کھاتے تھے لیکن جب اندر جانے کے لیے دروازے پر ہاتھ رکھا تو تایا جان کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔ اندر وہ مہرین کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔

اور اب ساری بات سن کر اس نے پہلے تو اپنا کھلا منہ بند کیا اور پھر چمکتی آنکھوں کے ساتھ مہرین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ مہرین کمبل اوڑھے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی موٹی سی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

”اللہ کا واسطہ ہے مہرو......! اب تو ان موٹی موٹی کتابوں کا پیچھا چھوڑ دو۔“ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”بائے داوے، یہ کیا پڑھ رہی ہو؟ کیا کوئی ناول ہے؟“

”نہیں، میرا ہاؤس جاب مکمل ہونے والا ہے تو میں پارٹ ون کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں۔“ مہرین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔ میں نے اماں کی باتوں میں آ کر میڈیکل کا شعبہ نہیں چنا۔ ورنہ میری اماں نے تو ہر طرح سے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ دراصل......“ وہ دھپ سے روم چیئر پر بیٹھی۔

”میری اماں کو تائی خالہ کے پیچھے چلنے کی عادت ہے بلکہ شوق ہے۔ تم میڈیکل کالج میں گئیں تو وہ میرے کان بھرنے لگیں کہ مجھے بھی ڈاکٹر بننا ہے۔ شکر ہے میں ان کے بہکاوے میں نہیں آئی۔ شانے کی شادی ہوئی تو وہ دن رات دعائیں مانگنے لگیں کہ اللہ کرے میرے لیے بھی کسی وزیر سفیر کے

بیٹے کا رشتہ آجائے اور اب......"

"اور اب کیا تمہارے لیے کسی وزیر اعظم کے گھر سے رشتہ آگیا ہے؟" مہرین کی آنکھوں میں دلچسپی نظر آئی۔

"نہیں، میرے لیے نہیں...... تمہارے لیے۔" سحرش نے آنکھیں مٹکائیں۔ "پھپھو نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ ریحان بھائی کے لیے...... ڈاکٹر ریحان ثوبان شاہ۔ سچی خوشی سے میرا دل وجگر سب پھٹنے والے ہیں۔"

مہرین نے ناک پر ڈھلک آنے والی عینک کو پیچھے کیا اور سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مہرو......" سحرش نے آنکھیں پھیلائیں۔ "کتنے شان دار سے ہیں ریحان بھائی۔ پھر بقول میری اماں کے جدی پشتی امیر اور سب سے زیادہ پلس پوائنٹ کہ وہ بھی ڈاکٹر تم بھی ڈاکٹر۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

مہرین بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اندر کہیں سناٹے سے اترے تھے۔ بچپن سے اماں اور خالہ مونا سے مرتضٰی کا نام اس نے اپنے نام کے ساتھ سنا تھا تو اتنی جلدی دل پر نقش وہ نام کیسے مٹ سکتا تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ کیا مٹکا سا سر دائیں بائیں ہلائے جا رہی ہو۔ سچی مہرو، ریحان بھائی بہت اچھے ہیں۔ ان چند دنوں میں جب وہ یہاں رہے، میں نے جتنا جانا انہیں، وہ ایک بہترین انسان ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کی آنکھوں میں ہم سب لڑکیوں کے لیے احترام دیکھا ہے۔ عورت کا احترام کرنے والا مرد بہترین انسان ہوتا ہے۔ تم بہت خوش رہو گی مہرو۔ مرتضٰی بھائی میرے سگے بھائی ہیں لیکن سچی وہ تمہارے لائق نہیں ہیں۔ عجیب سازشی ذہن رکھتے ہیں۔" اور اپنی عادت کے مطابق مرتضٰی پر تبصرہ کرتے کرتے اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ مہرین کی نظروں میں تاسف تھا۔

"سوری یار...... زبان ہے نا، پھسل جاتی ہے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "دراصل مجھے

مرتضیٰ بھائی پر بہت غصہ ہے نا تو...... خیر ادھر ہم دونوں کی امائیں تو اس اچانک اور غیر متوقع آ جانے والے رشتے پر بے حد خوش ہیں۔"

"اور ابا جان......؟" مہرین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ان کے خیال میں تمہاری رائے بہت اہم ہے، انہوں نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے۔"

"تو پھر مجھے ابھی شادی نہیں کرنی، پہلے میں اپنی ایجوکیشن مکمل کروں گی، پھر سوچوں گی۔"

"کیا ساری زندگی پڑھتی رہوگی مہرو......؟" سحرش سنجیدہ ہوئی۔

"کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں نہ کرنا کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"او کے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کروں گی۔" اس نے پھر کتاب کھولی۔

"تم کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے وقت لے لینا مہرو......" سحرش دل سے چاہتی تھی کہ مہرین کو بہترین شریک زندگی ملے اور ریحان بھائی سے بہترین بھلا کون ہو سکتا تھا۔

"پتا ہے مہرین! بعض اوقات ایسا ہوتا ہے نا کہ چیزیں آسانی سے میسر آ جائیں تو ان کی قدر نہیں ہوتی۔ ایسے ہی رشتے بھی ہوتے ہیں۔ آسانی سے میسر آ جائیں تو ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ مرد ہمیشہ سے ہی نئی دنیائیں کھوجنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ دیکھی بھالی دنیائیں انہیں اٹریکٹ نہیں کرتیں۔ مرتضیٰ بھائی تو اماں کے سامنے اکثر ہی اس رشتے سے بے زاری کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ وہ عام مردوں سے بھی زیادہ عام مرد ہیں۔ بھلے میرے بھائی ہیں۔ سمیرا سے تو ان کی ملاقات کچھ عرصہ پہلے ہوئی ہے۔"

سمیرا کے نام پر مہرین نے چونک کر اسے دیکھا تو سحرش نے وضاحت کی۔

"ایک بار زحل نے مجھ سے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے مرتضیٰ بھائی سمیرا میں انٹرسٹڈ ہوں۔ ان دنوں سمیرا نے نیا نیا ادھر آنا شروع کیا تھا اور مرتضیٰ بھائی نے تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن تب میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ میں دو تین بار میں نے مرتضیٰ بھائی اور سمیرا کو دیکھا ہے۔ ایک بار یونی جاتے ہوئے انہیں سمیرا کی گاڑی میں دیکھا۔ ایک بار آئس کریم پارلر کے اندر جاتے

ہوئے۔ سو اگر تمہارے ذہن میں یہ ہو کہ مرتضٰی بھائی کو اس انکار سے کبھی پچھتاوا ہو گا تو میرے خیال میں ایسا نہیں ہونے والا۔ سمیرا خاصی موٹی آسامی ہے۔ جانتی ہو نا......"

مہرین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے کرب جھلکتا تھا۔ سحرش کو دکھ ہوا۔

"سوری اگر میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں دراصل......" تب ہی باہر فون کی گھنٹی بجی۔

(فون برآمدے میں ہی ہوتا تھا)

تو سحرش بات ادھوری چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"شانزہ کا ہو گا۔ اس کا فون آیا تھا تو میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کرنے کو کہا تھا۔"

مہرین بھی کتاب رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم فون سنو، میں ذرا زنل کی طرف جا رہی ہوں اور ہاں......" اس نے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے مڑ کر دیکھا۔

"فون سن کر سب سے چائے کا بھی پوچھ لینا۔ میں اب نیچے جا رہی ہوں تو نیچے ہی پی لوں گی۔ ویسے بھی بقول سمیرا شاہ کے بی بی اماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو تو حلق تک سے خوشبو آتی ہے۔ اور مجھے ان کے ہاتھ کی بنی چائے پیے کئی دن ہو گئے ہیں۔" وہ مسکراتی اور شرارت سے مہرین کی طرف دیکھتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ "اور شانے کو بھی بتا دینا اس پرپوزل کا۔" مہرین نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ریسیور اٹھا چکی تھی۔

"ہاں شانزہ...... میں تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہی تھی، سب خیریت ہے نا؟" سیڑھیوں سے اترتے اترتے سحرش نے سنا۔

تو شانزہ کا ہی فون تھا......

"بے چاری شانزہ......! کن لوگوں میں پھنس گئی۔ لیکن پھپھو ایسی نہیں ہیں۔ مہرین بہت خوش اور سکھی رہے گی۔" لبوں پر مسکراہٹ لیے برآمدے میں ذرا دیر رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کچن کا دروازہ نیم وا تھا اور ہلکی ہلکی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاید بی بی اماں اور زنل کچن میں ہیں۔ اس

نے ناک سکیڑ کر خوشبو سونگھی۔ گوشت بھوننے کی خوشبو آ رہی تھی۔

سردیوں میں تو بی بی اماں صبح ہی دونوں وقت کی ہانڈی بنا لیتی تھیں۔

''تو کیا کوئی مہمان آ رہا ہے؟'' اس نے خود کلامی کی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

بی بی اماں کچن چیئر پر بیٹھی بھیگے ہوئے بادام چھیل رہی تھیں اور زل چولھے کے پاس کھڑی گوشت بھون رہی تھی۔

''کیا کوئی آ رہا ہے؟'' سحرش نے کچن میں قدم رکھا۔

''سحرش بی بی! کتنی بار سمجھایا ہے کہ پہلے سلام کیا کرو۔''

''اوہ...... سوری بی بی اماں......'' سحرش نے باؤل میں سے ایک بادام اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''یہ بادام غالباً گجریلے کے لیے چھیلے جا رہے ہیں۔ اور ہاں آپ نے بتایا نہیں کون آ رہا ہے۔'' وہ صبح بی بی اماں کو گاجریں کدوکش کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

''کوئی نہیں آ رہا۔ وہی اپنے زین کے دوستوں نے آنا تھا۔ مغرب کے بعد۔ اب نجانے کتنی دیر بیٹھیں گے تو میں نے زل سے کہا کہ آلو گوشت پکا لو احتیاطاً۔ دن کو مکس سبزیوں کی بھجیا پکائی تھی۔ زین باہر سے دوستوں کے ساتھ کھا کر آ گیا تھا۔ شاہ زیب کے لیے کھچڑی بنائی تھی۔ بڑے صاحب نے بھی وہی کھا لی۔ زل کو بھوک نہیں تھی۔ پیچھے رہ گئے صرف میں اور شینو تو ساری کی ساری پڑی ہے وہ بھی......'' بی بی اماں نے تفصیل بتائی۔

''اگر زین کے دوستوں نے کھانا کھایا بھی تو دو طرح کا سالن ہو جائے گا۔''

''ویسے کافی دنوں بعد زین کے دوست اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو ہو گیا ہے۔'' اس نے ایک اور بادام اٹھایا تو بی بی اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھ سات بادام اکٹھے ہی اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''ضرورت نہیں ہو گی تو نہیں آئے......''

''شکریہ بی بی اماں......'' اس نے مٹھی بند کی اور زل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں تو خیر علم ہی ہو گا کہ پھپھو نے مہرین کا رشتہ مانگا ہے۔ لیکن میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ

رہے تھے کہ تم سے تفصیل معلوم کروں کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا۔''

''پھپھو نے کل رات دادا جان کو فون کر کے بات کی تھی۔'' زمل نے کٹورے میں موجود آلو ہانڈی میں ڈالے۔ ''کہ وہ تایا جان سے ریحان اور مہرین کے رشتے کی بات کریں۔''

''ہاں وہ تو ابھی ابھی تایا جان نے سب کو بتایا لیکن یار حیرانی کی بات ہے کہ اچانک کیسے پھپھو کو مہرین کا خیال آیا ہے۔'' اس نے مٹھی کھول کر سارے بادام ایک ساتھ ہی منہ میں ڈالے۔

''تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے چندا...... اختر بانو نے بڑے بیٹے کا رشتہ سسرال میں کیا تو چھوٹے کا میکے سے لینے کا سوچ لیا۔'' بی بی اماں اب چھیلے ہوئے بادام کتر رہی تھیں۔

''مجھے تو بہت خوشی ہوئی اب اللہ کرے یہ رشتہ طے پا جائے۔''

''ہاں بی بی اماں! ہے تو خوشی کی بات لیکن وہ مہرین اس کا نہیں پتا فی الحال تو وہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔'' سحرش اب پھر مڑ کر بی بی اماں کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

''تو سمجھاؤ نا اسے، ویسے تو چڑ چڑ زبان چلتی ہے تمہاری۔ اللہ نے چاہا تو بہت خوش رہے گی۔'' بی بی اماں نے کترے ہوئے بادام فریج میں رکھے۔ ان کی عادت تھی کہ سردیوں میں گجریلا بنا کر رکھ دیتی تھیں۔ جب ختم ہوتا پھر بنا لیتیں۔ اور ناشتے پر تو ساری سردیوں میں ہی گاجر کا سادہ حلوہ ہوتا۔ جس میں دودھ اور ملائی ڈال کر جس نے کھانا ہوتا کھا لیتا، ورنہ انڈے پراٹھے تو جس نے کھانے ہوتے، بنتے ہی تھے۔

''سمجھایا تو ہے، پر سمجھنے والی لگتی نہیں۔'' اس نے کاؤنٹر پر پڑی تھرموس کو ہلا کر دیکھا جس میں قہوہ تھا۔

''ہرٹ بھی تو بہت ہوئی ہے نا۔'' زمل نے پانی ڈال کر آنچ دھیمی کی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ دیکھ لینا مرتضیٰ ایک روز ضرور پچھتائیں گے۔''

''خیر اللہ سب کے لیے اچھا کرے۔ آپ لوگ چائے پی چکے؟''

''ہاں......!'' زمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن مجھے تو ابھی پینی ہے اور مہرین سے میں کہہ آئی تھی کہ میرے لیے چائے نہ بنانا۔" اس نے شریر نظروں سے بی بی اماں کی طرف دیکھا۔

"قہوہ تو ہے۔ میں نے بے دھیانی میں تھرموس بھر کر ہی چائے دم کر دی تھی۔" بی بی اماں نے فریج سے دودھ نکال کر گرم کرنے کے لیے رکھا۔

"تم سحرش کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ، میں ابھی ادھر ہی ہوں۔ ہانڈی دیکھ لوں گی۔"

زمل نے اثبات میں سر ہلایا اور سحرش کے ساتھ کچن سے باہر نکلی۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو اس نے رک کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا جو سیاہ بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ صحن میں بیٹھ جائے۔ بادل خوب برسیں اور وہ ساری کی ساری بھیگ جائے۔ بھیگتی رہے اور آسمان سے اترتا یہ شفاف پانی اس کے اندر کی ساری اداسی دھو ڈالے۔

یک دم بادل گرجا تو وہ چونکی اور قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھائے۔

"لگتا ہے آج بارش ہو گی۔"

"ضروری نہیں۔" سحرش بھی جو بہت دھیان سے زمل کو دیکھ رہی تھی، چونکی۔

"کل بھی بادل کتنا گرجے تھے اور دوپہر کو لگتا رات ہو گئی ہے لیکن پھر ایک قطرہ بھی برسائے بغیر بھاگ گئے۔"

زمل نے جواب نہیں دیا تھا۔

"تم چلو، میں اپنی چائے لے کر آتی ہوں، بے دھیانی میں باہر آ گئی۔ اب بی بی اماں میری چائے لے کر میری خدمت میں آئیں گی۔"

زمل نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ آج کل اس میں کچھ مثبت تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ پہلے وہ ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتی تھی۔

شاید یونی ورسٹی میں جانے کے بعد اس کی سوچ بدلی تھی۔ کمرہ کافی ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ زمل نے شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور ہولے ہولے چلتی ہوئی کارنس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس

تصویر کو دیکھنے لگی جس میں وہ، صبوحی چچی، آزین اور مریم تھے۔

کاش سب کچھ ویسا ہی رہتا۔ کہیں کچھ تبدیل نہ ہوتا۔

لیکن وقت ہمیشہ ایک جگہ ٹھہرا نہیں رہتا۔ اسے آگے بڑھنا ہی ہوتا ہے اور وقت کے اس سفر میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ کیا کچھ بدل جاتا ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں شاید بہت زیادہ بدل جاتے ہیں۔ لیکن احساس تعلق کا وقت سے کیا تعلق۔ وہ تو ایسے ہی جامد رہتا ہے، چاہے صدیاں گزر جائیں۔ رنگ مزید گہرا ہو جاتا ہے۔

میرے احساسات میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں آج بھی زین کے لیے دل میں وہی محبت محسوس کرتی ہوں، جو پہلے کرتی تھی۔ آج بھی میرا دل اس کے لیے ایسے ہی دھڑکتا ہے جیسے پہلے دھڑکتا تھا بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ محبت مزید گہری ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ چند سال پہلے شاید اس بندھن کی خوب صورتی اور حسن کا احساس اتنا گہرا نہیں تھا جتنا اب ہے۔

پھر زین کیوں بدل گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنی پتھریلی سی اجنبیت کیوں در آئی ہے۔ لیکن یہ تو میری سوچ ہے میرا خیال ہے کہ احساس تعلق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ احساس تعلق بھی تو محبت کا ہی نام ہے اور محبت، نفرت، احساس، سوچیں ان کو باؤنڈ تو نہیں کیا جا سکتا یہ بھی ختم ہو سکتی ہیں۔ محبت اچانک نفرت میں بدل جائے یا نفرت محبت میں۔ یا پھر اچانک ایسا نہ ہو...... یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہو، فطری طریقے سے...... یہ کوئی مکینیکل کام نہیں ہے نہ ہی کوئی ماس پراجیکٹ یہ تو انسانی ذہن کا معاملہ ہے۔ کب ذہن کی رو کس سمت بہہ جائے۔ جیسے صبوحی چچی...... پتا نہیں ان کی محبت نے اچانک رخ بدلا تھا یا پھر آہستہ آہستہ......

اس نے غیر ارادی طور پر تصویر کو اٹھا لیا۔ اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے تصویر پر موجود نا معلوم سی گرد صاف کی۔ اور آزین کے دل پر بھی تو کوئی نا معلوم سی گرد چھائی ہوئی تھی۔ کاش وہ اپنی انگلی سے اس گرد کو صاف کر سکتی لیکن آزین...... وہ تو نظر ہی نہیں ملاتا تھا۔ نہ کھل کر بات کرتا تھا۔ بی بی اماں نے بھی کئی بار پوچھا تھا لیکن وہ ٹال جاتا تھا۔ یہ کہہ کر کہ کچھ نہیں...... بس یوں ہی آفس میں کام زیادہ

ہے، تھکاوٹ ہو جاتی ہے اور ادھر دادا جان ایک بار پھر ظفریاب چچا سے اس کی رخصتی کی بات کر رہے تھے۔ شاید بی بی اماں نے ان سے کہا تھا یا پھر خود ہی انہیں خیال آیا تھا۔

آج انہوں نے آزین کو شاید اسی لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ کچن میں آتے ہوئے بی بی اماں نے اسے آواز دے کر کہا تھا کہ بڑے صاحب اسے بلا رہے ہیں۔ اور وہ تب سے ادھر ہی تھا دادا جان کے کمرے میں۔ اور پتا نہیں دادا جان اور آزین کے درمیان کیا بات ہوئی ہوگی۔ اور اگر دادا جان نے رخصتی کی بات کی ہو تو نہ جانے زین نے کیا کہا ہوگا۔

وہ یکدم مضطرب سی ہوگئی اور تصویر واپس کارنس پر رکھی۔ ہوسکتا ہے دادا جان سے بات کر کے اس کے دل پر جما غبار چھٹ گیا ہو۔ ہوسکتا ہے اس نے دادا جان کو اس گریز کی وجہ بتادی ہو اور یقیناً وہ کوئی معمولی سی بات ہوگی۔ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ چپ اوڑھ لیتا تھا۔ اور اس کا غصہ اور ناراضی خود ہی ختم ہوگئی ہو۔ دل میں امید کی ایک ننھی سی لو جل اٹھی تھی۔

لیکن اگر اس نے دادا جان سے کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتا تو......

دل جیسے پاتال میں گرا تھا۔

''نہیں......!'' اس نے نفی میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''نہیں......!'' اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا...... ''ایسا نہیں ہوسکتا۔ بھلا زین ایسا کیسے کہہ سکتا ہے۔'' امید کی جلتی لو کی روشنی یکدم تیز ہوئی تھی۔ جیسے کسی یقین نے اس کے دل کو سنبھالا دیا تھا۔ وہ اب بھی کارنس پر رکھی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی سحرش اپنا چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔

''ارے! تم ابھی تک کھڑی ہو۔''

''ہاں بس یہ تصویر دیکھ رہی تھی۔ میرے پاس اماں کی اس تصویر کے علاوہ بس دو تین تصویریں ہی ہوں گی۔ شاید ظفر چچا کے پاس ہوں۔ دادا جان کہتے ہیں، وہ وقت بے وقت اپنے کیمرے میں سب کی تصویریں کھینچتے رہتے تھے۔'' وہ مڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

سحرش نے ایک نظر اسے دیکھا اور کپ بیڈ سائیڈ پر رکھ کر ساتھ ہی پڑی ہوئی روم چیئر پر بیٹھ گئی۔

''تم کچھ پریشان ہو زمل؟''

''نہیں......!'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''میں بہت دنوں سے تمہیں اور زین کو نوٹ کر رہی ہوں۔ کیا زین کی اور تمہاری ناراضی ابھی تک چل رہی ہے؟'' اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

''نہیں......'' اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''بھلا ہم کیوں ناراض ہوں گے۔ کوئی وجہ بھی تو ہو ناراضی کی۔''

''بعض اوقات وجہ کوئی بھی نہیں ہوتی زمل اور دو محبت کرنے والے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور تمہارا زین کے ساتھ تعلق محبت سے آگے ہے۔ نکاح کا بندھن ہے۔ میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے پوچھا تھا کہ یہ زین کیوں منہ پھلائے ہوئے ہے۔'' اس نے ایک گھونٹ بھرا۔

''اور میں نے تم سے کہا تھا کہ اس سے ہی پوچھ لو، مجھے تو اس نے اپنے منہ پھلانے کی وجہ نہیں بتائی۔'' زمل نے پاؤں بیڈ پر رکھے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔

''ہوں...... پوچھا تھا میں نے لیکن حضرت کہنے لگے میری نظر کا فتور ہے۔ لیکن میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور چل رہی ہے۔ تمہارے اندر نہ سہی، اس کے اندر ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ جب ایک فریق اکڑا ہوا ہو تو دوسرے کو پہل کر لینی چاہیے زمل! ناراضیاں بہت طول کھینچ لیں تو پھر دراڑیں بھرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ فاصلے بڑھتے جائیں تو انہیں پاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ناراضیوں کو طول نہیں دینا چاہیے۔ جس کی بھی غلطی ہو اسے معافی مانگ لینی چاہیے۔ اور اگر تمہاری کوئی غلطی نہیں بھی ہے تو اس سے پوچھو تو سہی کہ وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیوں بیٹھا ہے۔''

زمل نے سر ہلایا۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے کتنی بار زین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ٹال جاتا تھا۔

سحرش اب گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے بغور سے دیکھ رہی تھی۔

''ویسے یہ سب تمہاری کون سی ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔''

سحرش نے اپنی ڈائریوں کو نمبر دے رکھے تھے۔

''یہ میرے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔'' اس نے فخریہ گردن اکڑائی۔ ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت میں انا نہیں ہوتی۔ رشتے جوڑے رکھنے کے لیے انا کو مارنا پڑتا ہے۔ زندگی بہت چھوٹی ہے اور تیزی سے گھٹتی ہے اس کو غصے کی نذر کرنا احسن نہیں ہے۔ کلپ بورڈ پر لٹکی ہوئی انا کے پوسٹر کو گھسیٹ کر پھینکنا آسان نہیں ہوتا جانتی ہوں لیکن یار! رشتے بچانے کے لیے کرنا پڑتا ہے ایسا مشکل کام......''

سحرش نے آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی جو آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

کبھی کبھی یوں ہی کوئی بات کر کے اسے حیران کر دیا کرتی تھی۔

''اب زیادہ حیران مت ہو۔ تنہائی میں بیٹھ کر میری باتوں پر غور کرنا اور اب آتے ہیں اصل بات کی طرف...... یہ پھپھو کا ریحان بھائی کے لیے مہرو کا رشتہ مانگنا مجھ سے ہضم نہیں ہو رہا۔ کیا یہ پھپھو کی خواہش ہے یا ریحان بھائی یہاں شادی میں اپنی مہرو کو دیکھ کر دل ہار بیٹھے۔''

''میرے خیال میں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ دادا جان بتا رہے تھے بی بی اماں کو کہ یہ ثوبان انکل کی خواہش ہے وہ چاہتے ہیں کہ پھپھو کا رشتہ اپنے میکے والوں سے جڑا رہے۔ اور وہ فاصلے جو ان سارے گزرے برسوں میں پیدا ہو چکے ہیں وہ اس نئے تعلق کے جڑنے سے ختم ہو جائیں۔ انہوں نے ہر طرح کی گارنٹی دی ہے اور ریحان بھائی سے بھی پوچھ لیا ہے۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

تفصیل بتا کر زل نے پائنتی پڑا کمبل کھول کر ٹانگوں پر ڈالا۔

''اور اس بے وقوف کو دیکھو، وہ انکار کر رہی ہے۔ ابھی تو میرے سامنے کیا ہے۔ بعد میں رخسانہ تائی کے سامنے بھی کر دے گی اس کے انداز اور لہجے سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔'' سحرش کو افسوس ہو رہا تھا کہ اگر مہرین نے انکار کر دیا تو پھر ایسا اچھا رشتہ نہیں آنے والا تھا۔

''ویسے تمہارا ذاتی خیال کیا ہے اس کے متعلق، تم تو پھپھو کے گھر گئی بھی ہو۔ وہاں ماحول کیسا

تھا۔ ریحان بھائی کا رویہ گھر میں کیسا تھا؟‘‘

’’ریحان بھائی سے تو پہلی ملاقات یہاں ہی شادی میں ہوئی ہے۔ زیادہ بات چیت تو نہیں ہو سکی لیکن بہت نرم مزاج اور کم گو سے لگے تھے۔ اور وہاں پھپھو کے گھر کے ماحول میں بھی کچھ ایسا محسوس نہیں ہوا جو ہمارے گھر سے بہت مختلف اور قابل اعتراض ہو۔ ہاں بہت بڑی حویلی ہے۔ مردانہ حصہ الگ ہے اور نوکروں کی بہتات ہے۔ لیکن پھپھو نے دادا جان سے کہا ہے کہ جہاں مہرین سیٹل ہونا چاہے وہاں ہی سیٹ کر دیں گے میرے خیال میں تو مہرین کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ خوش رہے گی وہ۔‘‘ زل نے اپنی رائے دی۔

’’یہ ہی تو...... یہ ہی تو میری اماں کہہ رہی تھیں۔‘‘ سحرش نے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی جو ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ’’ویسے موٹا اماں کا تو تمہیں پتا ہے مہرین کے نہ ماننے کی صورت میں فوراً متبادل بھی پیش کر دیا۔‘‘

زل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

’’یہ ہی کہ اگر مہرین کسی صورت نہ مانی تو وہ دادا جان سے کہیں گی کہ پھپھو سے میرے لیے بات کریں۔ انہیں تو عرصہ سے مجھے کسی دولت مند گھرانے میں جو شانزہ کے سسرال کے ہم پلہ ہو، بیاہنے کی خواہش ہے۔ اور کیا پتا دل ہی دل میں دعا مانگ رہی ہوں کہ مہرین انکار ہی کر دے اور ان کی تمنا پوری ہو جائے۔ لیکن مجھے ایسی دولت کی خواہش نہیں ہے جو ہونٹوں کی ہنسی اور آنکھوں کی چمک ہی چھین لے۔‘‘

’’توبہ ہے سحری...... اپنی اماں کو بھی نہیں بخشتی ہو۔‘‘ زل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

’’تو انہوں نے تایا جان اور ابا جان کے سامنے ایسی چھوٹی بات کیوں کی، کتنی نامناسب بات تھی۔ وہاں تو کسی نے دھیان ہی نہیں دیا، لیکن مجھے برا لگا تھا۔‘‘

’’انہوں نے یقیناً اپنی طرف سے غلط بات نہیں کی ہو گی۔ تم نے اسے غلط لیا۔‘‘ زل کا وہی مخصوص ہر بات کو مثبت لینے والا انداز۔

’’ہو سکتا ہے۔‘‘ سحرش نے کندھے اچکائے اور کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھو نا سحری...... سردی لگ رہی ہے تو ادھر کمبل میں آ جاؤ۔''

زمل کو سحرش سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جو ایک اضطراب سا تھا وہ اس کی موجودگی سے کم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''مغرب ہونے والی ہے۔ نماز پڑھ کر چکر لگاتی ہوں۔ موسم تو آج بہت خراب ہے۔ شاید آج زین کے دوست نہ آئیں۔ مجھے ثوبیہ سے ایک کام تھا۔'' وہ سب کو ہی نام لے کر بلاتی تھی۔ آپی، باجی وغیرہ کہنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

''ویسے یہ ثوبیہ آج کل کیا کر رہی ہے؟ کیا جاب شروع کر دی ہے؟''

''ابھی جاب نہیں ملی۔ اپلائی کرتی رہتی ہے۔ پبلک سروس کمیشن کا امتحان دینے کا ارادہ ہے اس کا۔''

''تو لگے ہاتھوں تم بھی دے دو۔'' زمل نے بتایا تو اس نے فوراً مشورہ دیا۔

''جب جاب ہی نہیں کرنی تو پھر امتحان دینے کا فائدہ......''

زمل نے اس کی طرف دیکھا۔

''تو کر لو نا جاب......'' اس نے دروازہ کھولا۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا تو اس نے جھرجھری سی لی۔

''ایک تو مصروفیت مل جائے گی، دوسرا مفت میں پیسے ملیں گے۔''

''مفت میں تو نہیں بی اماں...... محنت کرنی پڑے گی۔ پڑھانا آسان کام نہیں ہے۔ بقول ثوبیہ دماغ کی دہی بن جاتی ہے۔'' زمل نے کمبل سینے تک تانا۔

تب ہی بادل زور سے گرجا اور ساتھ ہی چند بوندیں صحن میں گریں۔

''موسم سرما کی پہلی بارش......'' سحرش کی آواز میں چہکار تھی۔

''مونا اماں کل کہہ رہی تھیں لگتا ہے اس بار سردیاں یوں ہی سوکھی گزر جائیں گی۔ حالانکہ ابھی جنوری فروری کے مہینے پڑے ہیں پر میری اماں کو ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی تو زمل کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ پھر خالی کپ کچن میں رکھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کپ دھو کر کچن

میں رکھ کر جب باہر نکلی تو آزین دادا جان کے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر بے اختیار دو قدم اس کی طرف بڑھائے۔

''زمل......!''

اس نے نگاہیں اٹھائیں۔

''وہ......بی بی اماں ہیں کچن میں؟''

''نہیں، وہ اپنے کمرے میں ہوں گی۔ کوئی کام ہے، کچھ چاہیے تو مجھے بتا دو۔'' وہی سادہ سا انداز۔

وہ تو ایسے ہی تھی پہلے جیسی کہیں کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تو کیا سارے بدلاؤ اس کے اندر تھے؟

''نہیں......!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

زمل نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حزن تھا، شکوہ تھا۔

آزین کے دل کو تکلیف ہوئی۔

(''کیا میں غلط کر رہا ہوں۔ بلا وجہ ہی اس سے بدگمان ہو رہا ہوں۔'')

''وہ پوچھنا تھا ان سے کہ ساجدہ سے ڈرائنگ روم صاف کروا دیا تھا؟''

''یہ تم مجھ سے بھی پوچھ سکتے تھے زین......'' اس نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

لیکن یہ کیسی اجنبیت در آئی ہے ہمارے درمیان......دل درد سے بوجھل ہوا۔

''ناراضیوں کو طول نہیں دینا چاہیے۔ ورنہ فاصلے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔'' سحرش نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے آزین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے مڑنا چاہا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''زین......!''

فاصلے ختم کرنے کے لیے اگر پہل بھی کرنی پڑے تو پہل کرتے ہوئے جھجکنا نہیں چاہیے۔ ایسی ہی کوئی بات کہی تھی سحرش نے اور اس نے پہل کر دی تھی۔

وہ رک گیا تھا۔

''موسم تو آج خراب ہو رہا ہے، کیا خبر وہ لوگ نہ آئیں۔'' کچھ تو کہنا تھا۔

''نہیں...... '' وہ رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ ''وہ لوگ آ رہے ہیں۔ مرسل گھر سے نکل چکا ہے۔ راستے سے رضا کو پک کرے گا۔ دو تین پراجیکٹ ہیں ان پر بات کرنا ضروری تھی۔ شاید بارش نہ ہی ہو۔''

ایک قدم آگے بڑھا کر اس نے صحن میں جھانکا۔ وہ ایک بادل چند قطرے برسا کر چلا گیا تھا۔

''ہاں شاید......!''

آزین اسی طرح رخ موڑے کھڑا تھا۔

''وہ ابا...... ابا کے متعلق پھر بات ہوئی کچھ ڈاکٹر ارسلان سے......؟'' اس نے بات آگے بڑھائی۔

''ہاں، ہوتی رہتی ہے۔ وہ چچا جان کی امپروومنٹ سے بہت مطمئن ہیں۔'' وہ اب سارا کا سارا اس کی طرف مڑ گیا تھا۔ ''دادا جان نے بتایا نہیں تمہیں کل وہ دیر تک دادا جان سے باتیں کرتے رہے۔ مریم چچی کی بیماری اور پھر ان کی وفات پر بات کی، جیسے بالکل نارمل ہوں۔ تمہارے اور دادی جان کے متعلق بھی پوچھا کہ آپ لوگ کہاں ہیں۔ ان کی گفتگو سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ چھٹی پر گھر آئے ہوئے ہیں۔ ابا کا بھی پوچھ رہے تھے۔ تم دعا کیا کرو ان شاء اللہ ایک روز سارے خلا پُر ہو جائیں گے اور وہ بالکل پہلے جیسے ہو جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ!'' اس کا من بھیگنے لگا۔

''ان شاء اللہ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' آزین کے چہرے کے پتھریلے پن میں نرمی سی در آئی تھی۔

''آج امان آیا تھا ملنے، گھر جا رہا تھا۔ تمہارا انتظار کرتا رہا کچھ دیر لیکن اس کی فلائٹ تھی۔ یونی میں دسمبر کی چھٹیاں ہو گئی ہیں نا تو اسے پھپھو کی فکر تھی۔ بتا رہا تھا کہ روٹین کے چیک اپ کے لیے ریحان بھائی انہیں کراچی لے کر آئے ہوئے ہیں۔ امان بھی سیدھا کراچی گیا ہے۔'' اس نے یوں ہی بات کرنے کے لیے تفصیل بتائی تھی۔ ورنہ جانتی تھی دادا جان اور بی بی اماں نے اسے بتا دیا ہوگا یقیناً۔

''دادا جان نے بتایا تھا لیکن مجھے آج آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ وقت پر نکل آتا تو ملاقات ہو جاتی۔''

دادا جان نے اسے بتا دیا تھا اس نے پھر بھی اس کی پوری بات سنی تھی۔ پہلے کی طرح...... جب وہ اس کی سنی ہوئی باتیں بھی یوں شوق سے سنتا تھا جیسے پہلی بار سن رہا ہو۔ تو کیا برف پگھل رہی تھی۔ کیا دادا جان نے اس سے کوئی ایسی بات کہی ہے کہ اس کی ناراضی کم ہو گئی ہے۔

''آفس میں کیوں دیر ہو گئی تھی زین......؟ بی بی اماں بھی تمہارے دیر سے آنے پر پریشان ہو رہی تھیں۔'' اس نے یوں پوچھا جیسے ہمیشہ پوچھتی تھی ہر بات......

''ایک کولیگ نے اپنی پروموشن کی ٹریٹ دی تھی، وہاں ہی آفس میں......'' آزین کی آنکھوں میں لحہ بھر کو حیرت نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

''ہو سکتا ہے بادل برسے بغیر ہی چلے جائیں۔''

اس نے ایک قدم اور بڑھایا تھا اور برآمدے کے کنارے کھڑے صحن سے نظر آتے آسمان پر نظر ڈالی تھی۔ آزین نے بھی مڑ کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ابھی بھی آدھا آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔

''ہو سکتا ہے بادل برسے بغیر ہی چلے جائیں اور ہو سکتا ہے برس جائیں۔'' اب وہ تقریباً ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔

''اللہ کرے آج تو کچھ بارش ہو ہی جائے، لوگوں کو بہت انتظار ہے بارش کا۔''

چند موٹے موٹے قطرے صحن کے فرش پر گرے تو زل نے بے اختیار ہاتھ آگے بڑھایا۔ ایک موٹا سا قطرہ اس کی ہتھیلی پر گرا۔

''کچھ انتظار لاحاصل ہی رہ جاتے ہیں۔'' آزین نے بھی ہاتھ آگے بڑھا کر بارش کے چند قطروں کو اپنی مٹھی میں بند کیا۔

''اللہ نہ کرے کہ کسی کا انتظار لاحاصل ہو۔'' زل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور وہ برآمدے

کی سیڑھیاں اتر کر صحن میں آئی۔

بارش کی ننھی ننھی بوندیں اس کے سر اور بازوؤں پر گریں۔

''کیا کر رہی ہو؟ بارش ہو گئی تو بھیگ جاؤ گی اور پتا تو ہے تمہیں ذرا سا بھیگنے سے تمہیں فلو ہو جاتا ہے۔ اور آج تو ویسے بھی کافی ٹھنڈ ہے۔'' آزین کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا اور ایک خوش کن سے احساس نے زل کو اپنے حصار میں لے لیا۔

''یہ بادل بھی صرف چند بوندیں برسا کر چلا گیا۔''

اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مغرب کی طرف سے بادلوں کے ٹکڑے جیسے پانی میں تیرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اور بی بی اماں کہتی تھیں کہ اگر مغرب کی طرف سے کالی گھٹائیں آئیں تو ضرور برستی ہیں۔

''بارش نہ بھی ہو تو ٹھنڈ بہت ہے۔ یہاں کھلے آسمان تلے مت کھڑی ہو۔'' آزین کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا۔ وہ اپنی بات کر کے رکا نہیں تھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا لیکن وہ کچھ دیر یوں ہی اس خوش کن احساس میں گھری وہاں ہی کھڑی رہی۔

بہت زمانوں کے بعد تم نے
اسی محبت سے بات کی ہے
تو یوں لگا ہے
کہ جیسے سب کچھ وہیں دھرا ہے
کہ جیسے ہر پل وہیں رکا ہے
کوئی ستارا نہیں بجھا ہے
بہت زمانوں کے بعد تم نے
اسی محبت سے بات کی ہے
تو یوں لگا ہے کہ جیسے

ہر گھاؤ بھر گیا ہے
دلوں کو جکڑا ہوا تھا جس نے
وہ اجنبیت کی سرد مہری کا
زرد موسم گزر گیا ہے
(طلعت اخلاق احمد)

اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تب ہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو اس نے دوپٹا ٹھیک طرح سے سر پر لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آج بہت دنوں بعد اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا سا محسوس ہوا تھا۔

نماز پڑھ کر اس نے بہت دل سے سب کے لیے دعا کی اور بی بی اماں کو بتا کر اوپر مہرین کے پاس چلی آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر لیتی اسے مہرین کو سمجھانا تھا کہ خوش قسمتی بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے اس نے سامنے نظر دوڑائی۔ برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ کمروں کے دروازے بھی بند تھے۔ سب سردی کی وجہ سے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ وہ سیدھی مہرین کے کمرے کی طرف آئی جو کبھی مہرین اور شانزہ کا مشترکہ کمرا ہوتا تھا۔ مہرین جاء نماز تہہ کر رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

''آجاؤ زل، میں ابھی تمہاری طرف ہی آنے کا سوچ رہی تھی۔''

''اور میں آ گئی۔ اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔'' زل نے دیکھا مہرین کی آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔

''دراصل مجھے تم سے ایک مشورہ کرنا تھا۔'' مہرین نے جاء نماز رکھی اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

زل دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں دو سنگل بیڈ تھے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اب بھی شانزہ کی کتابیں پڑی تھیں۔ شادی کے بعد عقیل نے اسے کبھی رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہاں

دس پندرہ دن بعد وہ دن دن میں تھوڑی دیر کے لیے آجاتی تھی۔

''مجھے بھی تم سے بات کرنی تھی مہرین، لیکن چلو پہلے تم بات کرلو۔'' زمل نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ایک کتاب اٹھائی۔

''نہیں، میری بات شاید لمبی ہو جائے۔ پہلے تم بات کرلو۔''

مہرین کو اندازہ تھا کہ زمل کیا بات کرے گی۔ یقیناً سحرش نے رشتے کے حوالے سے اس کے رد عمل کا بتا دیا ہوگا۔

''سحری نے بتایا ہے کہ تم اس رشتے پر راضی نہیں ہو۔'' زمل نے تمہید باندھنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

''ہاں میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' مہرین اسے اتنی سنجیدہ کبھی نہیں لگی تھی جتنی اب لگ رہی تھی۔

''تو وقت لے لو مہرین، لیکن صاف انکار مت کرو۔'' زمل اپنے مخصوص دھیمے اور نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

''دیکھو مہرو! ہم ہر وہ چیز حاصل نہیں کر سکتے جس کی خواہش کریں اور نہ ہی سب ایسا ہو سکتا ہے جیسا ہم چاہیں۔ ہمارے چاہنے میں کھوٹ نہیں ہوتا۔ بس ہماری تقدیر میں ایسا ہونا نہیں لکھا ہوتا۔ میں جانتی ہوں دل پر بنے نقش آسانی سے نہیں مٹتے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے نا ہمیں خود اپنے ہاتھوں پہ نقش مٹانے پڑتے ہیں۔

سوچو تو مہرین! اگر مرتضٰی بھائی تمہیں نہیں ملے تو ہو سکتا ہے مرتضٰی بھائی کو بھی کوئی اور نہ مل سکے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم اپنے دل کی رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ کرو لیکن یہ ضرور چاہتی ہوں کہ تم فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔ جتنا مرضی وقت لے لو لیکن سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ ریحان بھائی بہت اچھے ہیں۔ وہ یقیناً تمہارے بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوں گے۔''

''پھپھو جانتی ہیں زمل، میرے اور مرتضٰی کے متعلق اماں اور خالہ کی خواہش...... اور ریحان بھی

مجھے اس حوالے سے......"

"کبھی بھی نہیں......" زمل نے اس کی بات کاٹی۔ "ریحان بھائی اتنے کم ظرف اور چھوٹے دل کے نہیں ہیں مہرو، میں تمہیں اس کی گارنٹی دیتی ہوں اور پھر پھپھو نے ریحان بھائی اور ثوبان انکل کو اس کے متعلق بتا دیا تھا۔ دادا جان نے خود پھپھو سے کہا تھا کہ وہ انکل کو بچپن میں زبانی طے کیے اس رشتے اور مرتضیٰ کے انکار کے متعلق بتا دیں۔"

مہرین کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل رہی تھی۔

"پھر بھی ابھی نہیں زمل......ابھی تو مرتضیٰ کے انکار کے متعلق سوچتی ہوں تو احساس توہین سے دل جیسے پارہ پارہ ہوتا ہے۔ کاش ہماری اماؤں نے ہمارے بچپن سے ہی یہ بات ہمارے ذہنوں میں نہ ڈالی ہوتی۔ مرتضیٰ کے لیے آسان تھا یوں انکار کرنا لیکن میں...... مجھے کچھ وقت لگے سب کچھ بھلانے میں، شاید کچھ زیادہ وقت......"

"اوکے ریلیکس......میں خود پھپھو سے بات کرلوں گی اور تائی جان سے بھی......" زمل تسلی دینے کے سے انداز میں مسکرائی۔

"اب تم بتاؤ کیا اسی بارے میں مشورہ کرنا تھا؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے شانزہ کے متعلق تم سے بات کرنی تھی۔ میں یہ بات ابھی کسی سے نہیں کرسکتی۔ شانزہ نے بھی مجھے منع کیا ہے۔ مجھے لگا کہ مجھے تم سے بات کرنی چاہیے۔ اماں اور خالہ بھی تو تم سے ہی ہر بات کرتی ہیں۔"

"کیا ہوا مہرو، شانزہ ٹھیک تو ہے نا؟" زمل بے چین ہوئی۔

"نہیں......" مہرین نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ ایک روز بھی ٹھیک نہیں رہی۔ پہلے روز ہی عقیل بھائی کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہ تھا۔ پتا نہیں یہاں ہمارے گھر میں ہی کبھی اماں یا خالہ نے ذکر کیا ہو یا کسی اور سے انہوں نے سنا ہو کہ عمر بھائی کا پروپوزل بھی آیا تھا شانزہ کے لیے......بس اسی بات کو لے کر وہ شانزہ سے عجیب عجیب باتیں کرتے رہے، مثلاً وہ رشتہ دار تھا، گھر

میں بھی آتا رہا ہوگا۔ ملاقاتیں بھی ہوتی ہوں گی، ملاقاتوں کی نوعیت کس طرح کی ہوتی تھی، اسی طرح کی فضول باتیں......"

"مجھے تو ولیمے والے دن ہی وہ بہت بجھی بجھی اور اداس سی لگی تھی۔" زمل کو اندازہ تھا کہ شانزہ خوش نہیں ہے۔"

"یہ ہی نہیں، وہ بھی کبھی ہاتھ بھی اٹھانے لگے تھے شانزہ پر اور غصے میں جو چیز بھی سامنے ہوتی اٹھا کر مار دیتے تھے، میں نے کئی بار چہرے پر نیل دیکھے۔"

مہرین کی آواز بھرا گئی۔

"میں جب بھی پوچھتی تھی کہ یہ نیل کیسا ہے تو کبھی کوئی بہانہ بنا دیتی تھی کبھی کوئی لیکن اب تو حد ہی ہوگئی ہے۔ کل شام وہ شانزہ کو اپنے ساتھ لے گئے ایک لڑکی سے ملوانے اور کہا ہے چند دن پہلے انہوں نے اس لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ لڑکی کی عمر بھی سترہ اٹھارہ سال ہے۔ اس کے والد نہیں ہیں اور والدہ کا اپنا بیوٹی پارلر ہے۔ فی الحال انہوں نے اس شادی کو خفیہ رکھا ہوا ہے۔ شانزہ سے دوسری شادی کی اجازت مانگی ہے اور کہا ہے کہ اگر اس نے اجازت نہ دی تب بھی وہ شادی تو کر ہی چکے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ اسے طلاق دے دیں گے۔"

"اور شانزے......وہ کیا کہتی ہے؟" زمل نے جو ساکت بیٹھی اسے سن رہی تھی، پوچھا۔

"شانے نے ابھی مجھے کسی سے بھی بات کرنے سے منع کیا ہے سختی سے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کا ہونے والا بچہ ایک طلاق یافتہ عورت کا بیٹا کہلائے۔ اماں ابا کو پتا چلے گا تو یقیناً وہ شانے کو گھر لے آئیں گے اور جانے کیا ہو پھر......

ایک طرف میرا دل کہتا ہے کہ مجھے کم از کم اماں ابا سے ضرور بات کرنی چاہیے۔ وہ عقیل بھائی کے والدین سے تو بات کریں اور دوسری طرف شانزہ نے منع کر رکھا ہے۔ تم بتاؤ زمل کیا کروں میں......

اماں ابا کو تو پتا ہونا چاہیے کہ ان کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" مہرین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"مہرو......" زمل اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے

ساتھ لگا لیا۔ مہرین کے آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ زمل نے کچھ دیر اسے رونے دیا، پھر آہستگی سے اسے الگ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

''دیکھو مہرو...... ابھی تم اماں ابا سے بات نہ کرو، شانزہ نے بھی تمہیں منع کیا ہے اور ابھی وہ پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہو گی ایسے میں تایا جان اور تائی جان خاموش تو نہیں رہیں گے۔ بات بڑھے گی تو وہ مزید ڈسٹرب ہو گی۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں ہے کہ اسے چھپایا جا سکے۔ بس ایک دو روز تک وہ سنبھل جائے کچھ تو پھر شانزے سے بات کرنے کے بعد تم اماں ابا کو بتا دینا۔ ویسے میں بی بی اماں سے بھی مشورہ کروں گی۔ وہ بڑی ہیں، تجربہ کار ہیں یقیناً اچھا مشورہ دیں گی۔ انہیں تو پہلے روز سے ہی شانزہ کے سسرال والے پسند نہیں آئے تھے۔''

''لیکن ابھی تم بی بی اماں سے بات نہ کرنا زمل!'' مہرین نے اچھی طرح سے دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھا۔

''بے فکر رہو مہرو! بی بی اماں میری بہت اچھی راز دار دوست ہیں۔'' زمل نے اس کا بازو تھپتھپایا۔

''اب اٹھو اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر آؤ نیچے چلتے ہیں۔ سب لوگ آ چکے ہوں گے، ہمیرا، ثوبیہ وغیرہ سے گپ شپ کرنا۔ یہاں زندگی کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہے مہرو۔ ہمیرا تمہارے ساتھ ہی جاتی ہے نا اس گاؤں میں اور ہر بار کسی نہ کسی کی کوئی دکھ بھری کہانی لے کر آتی ہے اور باقی لوگوں کے پاس بھی ہر بار کسی نہ کسی کا کوئی نیا مسئلہ ہوتا ہے۔ اللہ ہماری شانے کے لیے بھی کوئی بہتر اور اچھی راہ ضرور نکالے گا۔'' زمل کا مخصوص تسلی دیتا ہوا نرم لہجہ...... مہرین اٹھی۔

''اماں کو پتا تھا زمل...... اماں جانتی تھیں شانے اور عمر بھائی کی پسندیدگی کے متعلق...... پھر سحرش نے بھی ان سے کہا تھا کہ شانزہ عمر بھائی کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی عقیل بھائی کی نسبت...... لیکن انہوں نے صرف دولت دیکھی۔ امیر گھرانہ محل جیسا گھر بس اپنی بیٹی کی خوشی نہیں دیکھی۔ چاہے محل جیسے گھر میں ان کی بیٹی کا دم ہی گھٹ جائے۔''

اپنے آنسو روکتی وہ باہر نکل گئی اور زمل کھلے دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ تائی جان اور تایا جان کیسے برداشت کریں گے شانزہ کی تکلیف اور دکھ کو۔ شانزہ جو پہلی پوتی تھی جسے کسی نے مارنا تو در کنار ڈانٹا تک نہ تھا۔ جب تایا جان کو پتا چلے گا کہ وہ گنوار شخص اس پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو کیا گزرے گی ان کے دل پر...... دادا جان کہتے تھے بیٹیوں کے دکھ ماں باپ کو دیمک کی طرح کھا جاتے ہیں۔

زمل کی پلکیں نم ہو گئیں۔ تقدیر نے دونوں بہنوں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا تھا۔

''یا اللہ! اب ان دونوں کے لیے بہت اچھا کرنا۔'' دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے زمل نے ہاتھوں کی پشت سے نم آنکھیں صاف کیں۔ تب ہی سحرش نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

''تم یہاں ہو زمل...... نیچے تمہارے زین کے دوست آ چکے ہیں۔ اور ابھی بلال ثوبیہ کا پیغام لایا ہے کہ سمیرا ابھی تک نہیں آئی اور وہ اکیلی اتنے سارے اسکالر قسم کے ریفارمر لڑکوں میں بیٹھی بہت بور ہو رہی ہے۔ میں نیچے جا رہی تھی تو مہرین کو بلانے آئی تھی، کہاں ہے وہ؟''

''واش روم میں......'' زمل نے اس کے تر و تازہ شگفتہ چہرے کو دیکھا۔ وہ اس وقت بلیک شال اور بلیک ہاف کوٹ پہنے ہوئے تھی۔

''اچھا تم چلو میں مہرین کے ساتھ آتی ہوں۔''

وہ سر ہلاتی ہوئی مڑ گئی۔ تب ہی بادل زور سے گرجا اور ٹپا ٹپ ٹیرس پر بارش کے قطرے گرنے کی آواز آئی۔

تو بالآخر بارش آ ہی گئی۔ زمل اٹھ کر بالکونی کا دروازہ کھول کر بالکونی میں چلی گئی۔ مہرین کے کمرے کی یہ بالکونی پچھلی طرف تھی، وہ بالکونی میں کھڑے ہو کر بارش کو سامنے فلیٹوں کی بالکونیوں میں برستے دیکھنے لگی۔ ادھر نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو تین منزلہ دو دو کمروں کے فلیٹ تھے۔ مہرین بھی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ یکدم ہی بارش تیز ہو گئی۔ وہ شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں جہاں کبھی کبھی بارش کی پھوار آ کر انہیں بھگو جاتی۔ بجلی چمکتی تو سامنے فلیٹوں کی دیواروں اور چھت پر روشنی لپکتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔ نجانے کتنی ہی دیر وہ وہاں کھڑی رہیں۔ پھر مہرین نے ہی اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''اندر چلو زمل...... بیمار پڑ جاؤ گی۔''

''چائے بنا لوں......'' مہرین نے اچھی طرح سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اور ہاتھ صاف کیے۔

''نہیں...... چلو نیچے چلتے ہیں۔'' زمل کو یکدم خیال آیا تھا کہ اسے آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ کیا خبر زین کے دوستوں نے اس سرد موسم میں چائے کی فرمائش کی ہو اور بی بی اماں اکیلی لگی ہوں کچن میں......

بارش کی بوچھاڑ برآمدے تک آ رہی تھی۔ دونوں تقریباً بھاگ کر سیڑھیوں تک آئی تھیں، نیچے سارے میں مونگ پھلی بھننے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ صبح ہی سرگودھا سے دادا جان کے دوست نے مونگ پھلی کی بوری بھجوائی تھی۔ کڑاہی بھر کر مونگ پھلی بی بی اماں نے تقریباً صبح ہی بھون کر رکھ دی تھی۔ یقیناً اب گرم کی ہو گی اور تھوڑی بہت کسر جو تھی وہ بھی پوری کر دی ہو گی۔ صحن عبور کر کے برآمدے تک آتے آتے وہ دونوں اچھی خاصی بھیگ چکی تھیں۔ ڈرائنگ روم سے سب کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''مہرین! تم چلو پہلے میرے کمرے میں کپڑے تبدیل کر لو۔ سارے بھیگ گئے ہیں۔''

زمل اور مہرین کا قد بت ایک جیسا تھا۔ زمل مہرین کے مقابلے میں زیادہ اسمارٹ اور نازک سی لگتی تھی لیکن زمل ذرا کھلے کپڑے پہنتی تھی اس لیے اس کے کپڑے مہرین کو فٹ ہوتے تھے۔ کالج وغیرہ کے فنکشن میں وہ کئی بار اس کے کپڑے پہن چکی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے مہرین تو ڈرائنگ روم میں چلی گئی کہ اسے مرسل کو بتانا تھا کہ وہاں ڈسپنسری میں کون کون سی دواؤں کی فوری ضرورت ہے اور زمل کچن میں آ گئی۔

بی بی اماں چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھ رہی تھیں۔ پاس ہی کاؤنٹر پر چائے دانی رکھی تھی۔ زین کے دوست جب اکٹھے ہوتے تھے تو وہ مکس چائے ہی بناتی تھیں۔

''سوری بی بی اماں! وہ مہرین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیر ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں، یہاں کون سا ایسا کام تھا، چائے ہی تو بنانی تھی۔ شینو سے کہا تھا میں نے کچھ دیر بعد چائے لے جائے سب کے لیے......''

"وہ آج کلینک نہیں گئے؟" زل نے میز پر پڑے باؤل سے ایک مونگ پھلی اٹھائی۔

"نہیں، یکدم بارش شروع ہوگئی تھی تو زین نے فون کر دیا تھا ڈاکٹر ارسلان کو کہ وہ نہیں آسکے گا۔"

"بارش میں تو سواری ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اچھا ہے آج نہیں گئے۔" زل نے مونگ پھلی چھیل کر دانے منہ میں ڈالے۔ اسے مونگ پھلی بہت پسند تھی۔

تب ہی شینخو بابا نے کچن کا دروازہ انگلی سے بجایا۔

"آجاؤ شینخو، چائے تیار ہے۔" بی بی اماں نے ٹرے میں کپ رکھتے ہوئے کہا۔

شینخو بابا سر جھکائے کچن میں داخل ہوئے اور ٹرے اٹھایا۔

"آپ یہ ٹرے اٹھالیں، میں چائے دانی لے کر آتی ہوں۔"

شینخو بابا سر ہلاتے ہوئے ٹرے لے کر باہر نکلے تو زل نے دیکھا ان کی جیکٹ خاصی پرانی ہو رہی تھی۔ وہ چائے دانی لے کر ان کے پیچھے ہی باہر آئی۔

"شینخو بابا! آپ کی جیکٹ تو کافی پرانی ہو رہی ہے۔ دادا جان نے آپ سے کہا تھا کہ اپنے لیے سردیوں کے کپڑے وغیرہ لے لیں لیکن آپ نے نہیں لیے ابھی تک، کیوں؟"

"جی بس ایسے ہی...... لے لوں گا کسی روز جا کر۔"

"لے لوں گا نہیں، بس کل ہی آپ جا کر لے آئیں۔" اپنائیت سے کہتی اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم تک آئی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر سب نیچے کارپٹ پر بیٹھے تھے۔ ہیٹر جل رہا تھا۔ مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھائی جارہی تھیں۔

"السلام علیکم!" سب کو مشترکہ سلام دے کر اس نے چائے دانی ٹیبل پر رکھی جسے نیچے بیٹھنے کے لیے ایک طرف دیوار سے لگا دیا گیا تھا۔ سلام کا جواب بھی مشترکہ آیا تھا۔ اس نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا۔ مرسل، رضا، عمر اور طیب ساتھ ساتھ بیٹھے تھے جب کہ زین اور اسد ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ اسد کی گود میں رجسٹر تھا جس پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ ثوبیہ اور سحرش صوفے سے ٹیک لگائے فلور کشن پر بیٹھی تھیں۔ سحرش کی گود میں مونگ پھلی کی پلیٹ تھی۔ مہرین بھی سحرش کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''واؤ...... بی بی اماں لگتا ہے کوئی ساحرہ ہیں۔ اس وقت چائے کی بڑی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ شام کو دو کپ پیے تھے۔'' اسد نے رجسٹر سے سر اٹھا کر شینخو بابا کی طرف دیکھا جو ٹرے ٹیبل پر رکھ چکے تھے اور اب چائے دانی اٹھا رہے تھے۔

''بیٹھ جاؤ نازل......'' سحرش نے ہاتھ میں پکڑے مونگ پھلی کے دانے منہ میں ڈالے۔

''آج مرسل بھائی نے ہمیں ذکی دروازے کی تاریخ کے متعلق بتایا جس کا ہمیں پہلے پتا نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ مرسل بھائی نے بتایا ہے کہ ذکی دروازے کا نام ذکی پیر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان کے متعلق دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ تاتاریوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے اور ایک یہ کہ منگولوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ان کا سر اور دھڑ الگ دفن ہے۔''

''ہاں ایک بار دادا جان نے بتایا تھا۔'' وہ جانے کے لیے مڑی۔

''لو، میں بھی کسے بتا رہی ہوں جو دادا جان کی کتابیں پڑھ پڑھ کر پہلے ہی عالمہ فاضلہ بن چکی ہیں۔'' سحرش نے مونگ پھلی کی پلیٹ مہرین کی طرف بڑھائی تو مہرین نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے اب بھی پریشانی جھلکتی تھی۔

''آجاؤ نازل! کچھ دیر بیٹھ جاؤ ادھر ہی......'' مہرین اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی تو وہ خاموشی سے مہرین کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور شینخو بابا کو دیکھنے لگی جو سب کو چائے کے کپ پکڑا رہے تھے۔

شینخو بابا کی آنکھوں میں ہمیشہ سے ایک حزن ایک کرب سا دکھائی دیتا۔ ماں باپ کی دائمی جدائی سے شاید حزن یوں ہی آنکھوں میں آ کر ٹھہر جاتا ہے۔

''ڈاکٹر مہرین! بس یہ اتنی ہی دوائیں ہیں یا کچھ اور بھی لکھوا دیں اگر ذہن میں ہیں تو کل اکٹھی ہی بھجوا دوں گا۔'' اسد نے شینخو بابا کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑا۔

''فی الحال تو ذہن میں اور کوئی نہیں ہے۔'' مہرین نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا تو اسد نے رجسٹر رکھ دیا۔ شینخو بابا سب کو چائے پکڑا کر جانے لگے تو مرسل نے انہیں روکا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں شینخو بابا! آج ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں کیا خبر کسی معاملے میں کوئی اچھا

اور بہتر مشورہ دے سکیں۔"

"وہ میں ذرا شاہ زیب صاحب کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے کھانا کھا لیا ہو تو دوا بھی دینی ہے انہیں۔" وہ گھبرا گئے تھے کہ انہیں تنہا رہنے کی عادت تھی۔ زمل نے انہیں صرف شاہ زیب بیگ سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اور ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت کے ستارے سے رقص کرتے نظر آتے تھے۔

"یار! یہ تمہارے شینخو بابا کو جب بھی میں دیکھتا ہوں تو پتا نہیں کیوں وہ مجھے تمہارے ہی خاندان کا کوئی فرد لگتے ہیں۔" شینخو بابا کے جانے کے بعد مرسل نے آزین سے کہا۔ "بالکل بی بی اماں کی طرح سب کا خیال رکھتے ہیں۔ اور انکل شاہ زیب سے تو بہت ہی محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے......" آزین نے اس کی تائید کی۔ "ہمارے لیے وہ ہمارے گھر کے ایک فرد جیسے ہی ہیں۔ ان کی محبت اور خلوص انمول ہے۔"

"ان کے پاس تو سب کچھ ہی انمول ہے۔ بڑے لکی ہیں یہ...... اف...... او...... ہاں......" سحرش نے چائے کا گرم گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔

"مثلاً کیا انمول ہے ان کے پاس؟" ثوبیہ نے پوچھا۔

"ان کے پاس بی بی اماں ہیں۔ ان کے پاس شینخو بابا ہیں اور ان کے پاس ساجدہ بیگم ہیں۔ جو ان کے ایک بار بلانے پر رات دس بجے بھی دوڑی چلی آتی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں جن کے پاس وہ سرمہ ستارہ بیگم ہیں جو صفائی کرتے ہوئے ہمیشہ ڈنڈی مار جاتی ہیں اور دوبارہ تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... اور ان کے پاس انمول سے بھی بڑھ کر زمل شاہ زیب ہیں اور ہمارے نصیب میں جانے بقول اماں کے کون سی چھمک چھلو لکھی ہے۔" مہرین نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر دبایا لیکن وہ سحرش ارباب تھی جب بولنے پر آتی تو بولتی ہی چلی جاتی بغیر سوچے سمجھے......

"اور ایک وہ گل بکاؤلی خانم ہے۔"

"یہ گل بکاؤلی کون ہے؟" ثوبیہ نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔

''میری اماں کی دن رات بلکہ آدھی رات کی بھی دعاؤں کا ثمر......''

''کیا مطلب؟'' ثوبیہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو تھیں۔ ''تمہاری بہن ہوئی ہے...... کب؟''

''لاحول ولا......'' سحرش نے ثوبیہ کے بازو پر ہاتھ مارا۔ زل کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ باقی سب کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''احمق...... ہماری کک...... نازیہ، شازیہ کے جانے کے بعد سے اماں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی مل جائے۔ اور ملی بھی تو اتنی دعاؤں کے بعد یہ گل بکاؤلی۔ جو خود کو کسی شہزادی سے کم نہیں سمجھتی۔''

''سوری......!'' ثوبیہ جھینپ گئی۔

''تمہارا قصور نہیں ہے یار، تمہاری عقل تھوڑی سی موٹی ہے بس۔ کچھ تھوڑی سی عقل اپنی اس چالاک دوست سے ادھار لے لو۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، اس کے پیچھے بیٹھی مہرین نے اس کے بازو پر زور سے چٹکی لی تو اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''توبہ ہے مہرو، کتنے زور سے چٹکی لی ہے۔ میں کوئی فضول بات تو نہیں کرنے والی تھی۔ اب سمیرا شاہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے تو تھوڑی سی ہوشیاری ثوبیہ کو بھی سکھانی چاہیے نا اسے......''

زل پھر ہنسی تھی۔

آزین نے بے اختیار اسے دیکھا۔ کتنی شدت سے چاہا تھا اس نے کہ وہ ہمیشہ عمر کے آخری سانس تک اس خوب صورت ہنسی کو سنتا رہے۔ لیکن شاید اب وہ اسے کھو دے یا شاید ایسا نہ ہو، لیکن پتا نہیں کیوں دل واہموں اور وسوسوں کا شکار ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت جلد اسے کھو دے گا۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ زل کے ہونٹ اب بھی نیم وا تھے۔ سحرش ہولے سے کھنکاری تو اسے احساس ہوا کہ وہ مسلسل اسے ہی دیکھے جا رہا ہے۔ اس نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔ زل کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی۔ شاید اسے بھی آزین کی نظروں کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ دل کے اندر ارتعاش سا تھا۔ کئی گزرے لمحے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے

لگے۔ جب وہ یوں ہی مبہوت سا اسے دیکھے جاتا تھا۔

''میرا خیال ہے بارش اب نہیں ہو رہی تو ہمیں چلنا چاہیے۔''

طیب کو آج کل جانے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔ آزین چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

کیا مرسل اور اسد کا خیال صحیح ہے کہ اس نے کوئی پارٹی جوائن کر لی ہے۔ آج کل اسے ان کے کاموں سے جیسے دلچسپی نہیں رہی تھی۔

''کچھ دیر رک جاتے ہیں۔ سمیرا نے آنے کا کہا تھا۔ شاید بارش کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی ہے اسے۔'' اسد نے اسے روکا۔

''سمیرا نے کچھ فنڈ اکٹھا کیا ہے۔ اپنی ہی فیملی سے اور اس وقت فنڈ کی بے حد ضرورت ہے سوچو تو سیلاب زدہ علاقے میں متاثرہ لوگ ابھی تک کھلے آسمان تلے بیٹھے ہیں۔''

''اور بہت سارے لوگ اور سیاسی پارٹیاں سیلاب زدگان کے لیے کام کر رہی ہیں۔'' طیب کچھ بے زار سا تھا۔

''ضرور کر رہی ہوں گی لیکن جولائی اگست میں آنے والے سیلاب سے متاثرہ لوگوں میں سے بیشتر ابھی تک امداد کے منتظر ہیں۔ ہمیں تو اپنے حصے کا کام کرنا ہے طیب...... کچھ دوسرے پراجیکٹ بھی ہیں۔'' مرسل نے گود میں رکھی فائل کھولی تھی۔

''وجدان نے ہمیشہ فراخ دلی سے فنڈ دیا ہے تو اس سے بھی کہو نا......'' سحرش نے مشورہ دیا۔

''وہ بزنس ٹور پر گیا تھا لیکن ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' جواب اسد نے دیا تھا۔

''ورنہ وجدان کی وجہ سے ہم اپنے بہت سارے مسئلے آسانی سے حل کر لیتے تھے۔''

''یہ صرف بزنس ٹور نہیں ہے دوستو! میں نے سنا ہے کہ اسے جان کا خطرہ ہے۔ اکثر اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں تو ملتی ہی رہتی ہیں لیکن اس بار اس نے کسی بڑے سیاست دان سے پنگا لیا ہے۔ اس کے چاچو بزنس ٹور کے بہانے اسے ملک سے باہر لے گئے ہیں۔'' طیب نے سب کی طرف باری باری دیکھا تھا۔

''لیکن بھلا کوئی اسے کیوں دھمکیاں دے گا جان سے مارنے کی۔ وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔ اتنا امیر کبیر ہونے کے باوجود اس میں نہ تو اکڑ ہے نہ غرور...... اور پھر محبت وطن ہے۔'' سحرش نے اپنی رائے دینا ضروری سمجھا تھا۔

''آپ اسے کتنا جانتی ہیں سحرش......!'' طیب کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''اس شخصیت کے علاوہ بھی اس کی ایک اور شخصیت ہے جسے اس نے چھپا کر رکھا ہے۔ وہ سیاسی کالم لکھتا ہے کسی اور نام سے لیکن جن لوگوں پر وہ تنقید کرتا اور انہیں پاکستان کے دشمن اور غدار کہتا ہے، وہ بھی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ انہوں نے اسے کھوج لیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی ہیں۔''

''خیر یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ وجدان نے اپنے شوق کی بنا پر جرنلزم میں ماسٹر کیا اور کسی اخبار میں کالم لکھتا ہے۔ شاید کسی انگریزی اخبار میں۔ لیکن ہم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس نام سے لکھتا ہے اور کہاں۔ کیونکہ ہماری تنظیم فلاحی کام کرتی ہے اور ہم سب کو سیاست یا سیاسی کالموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

اسد کو طیب کا لہجہ اور بات شاید پسند نہیں آئی تھی۔

''اور جہاں تک پاکستان سے محبت کی بات ہے تو پاکستان کے ساتھ اس کی محبت اور عشق میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے باپ دادا نے اس ملک کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔''

''بے شک......!'' مرسل کے لبوں سے نکلا۔

طیب خاموش ہی رہا تھا۔

زمل نے دل ہی دل میں اسد کی بات کی تائید کی اور اٹھ کر خالی کپ ٹرے میں رکھنے لگی کہ سب چائے پی چکے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلا اور سمیرا نے اندر قدم رکھا۔

''اوہ...... ہو...... بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں۔ مونگ پھلیاں اور ساتھ میں چائے......''

''ہاں وہ تو ہو رہی ہیں لیکن تم نے آنے میں دیر کر دی۔'' سحرش نے اس کے ساتھ آتے مرتضٰی کو دیکھا۔

''چائے پی جا چکی ہے البتہ مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں موجود ہیں۔ تم بھی عیاشی کر سکتی ہو۔''

اگر نہیں تھا تو شریک محفل قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مرا طریقہ نہیں ہے رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

ثوبیہ نے لہک کر پڑھا۔

''ہاں یار قصور تو میرا ہی ہے۔ گھر سے نکلنے ہی لگی تھی کہ حمیرا کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ گئے۔ انہیں بھگتا کر فوراً بھاگی۔'' وہ ثوبیہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''اور یہ مرتضیٰ بھائی کہاں مل گئے تمہیں؟ کیا یہ بھی میری کے متوقع سسرالیوں کے ساتھ تمہارے گھر گئے ہوئے تھے؟''

مرتضیٰ کو سمیرا کے ساتھ آتے دیکھ کر سحرش کے دل میں جو سوال پیدا ہوا تھا وہ زیادہ دیر دل میں نہیں رکھ سکتی تھی۔

''اوہ نہیں...... یہ تو اکثر ہی کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ آج بھی سڑک پر سواری کے انتظار میں کھڑے مل گئے۔'' سمیرا نے قہقہہ لگایا۔ ویسا ہی قہقہہ جس سے بی بی اماں چڑتی تھیں۔

''اور ہاں وہ میری کے متوقع سسرالی نہیں تھے بلکہ اماں حضور کے بلوائے ہوئے کچھ عزیز تھے خیر تو ایک بار پھر سوری دوستو! بارش شاید پھر شروع ہو جائے تو اس لیے بغیر کسی تمہید کے...... یہ رہی وہ رقم جو میں نے ڈیڈ مام اور دونوں بھائیوں سے بٹوری ہے۔ آپی اور میری نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بھی اس کار خیر میں حصہ ضرور ڈالیں گی۔'' اس نے اپنے شولڈر بیگ سے نوٹوں کی کچھ گڈیاں نکال کر اسد کی طرف بڑھائیں۔ اور پھر ایک چیک بھی نکالا۔

''تھینک یو سمیرا......'' مرسل نے چیک پر ایک نظر ڈالی۔ ''اس رقم سے کئی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور یہ رقم جہاں جہاں خرچ کی جائے گی، اس کا حساب تمہیں دے دیا جائے گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے فرینڈ!'' وہ مسکرائی۔

''تمہیں تو ضرورت نہیں ہے لیکن ہمارا تو فرض بنتا ہے کہ ہم ڈونیشن دینے والے کو پوری تفصیل

بتائیں کہ اس کا دیا گیا ڈونیشن کہاں کہاں خرچ کیا گیا ہے۔'' مرسل نے بات مکمل کر کے گود میں رکھی فائل پر نظر ڈالی۔

یہ گجرات کے آس پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ چالیس پچاس گھروں پر مشتمل دریائے چناب کے نزدیک تھا۔ یہاں ابھی بھی چوبیس پچیس گھرانے کھلے آسمان تلے خیموں میں رہ رہے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ان کے لیے ایک لائحہ عمل بنانا ہے کہ ان کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے پہلے تو ان کے لیے شیلٹر مہیا کرنا چاہیے۔ ان کے گھروں کی مرمت یا کوئی متبادل انتظام جہاں پہ سردیاں سکون سے گزر سکیں۔'' سمیرا نے مرسل کے ہاتھ سے فائل لے لی۔

''اور پھر......؟'' اس نے مرتضیٰ کی طرف دیکھا۔ ''تم ابھی تک کھڑے ہو، بیٹھ جاؤ نا۔''

''شاید یہ اپنی پیاری بائیک کے متعلق سوچ رہے ہیں، جسے کہیں کھڑا کر کے وہ تمہاری گاڑی میں بیٹھے تھے۔'' سحرش کی زبان کو کھجلی ہوئی تھی۔

''میری بائیک بلال کے پاس ہے۔'' مرتضیٰ نے اسے گھورا اور آزین کے پاس ہی نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ زل اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ٹرے اٹھائے باہر کی طرف بڑھی۔

''ہمارے لیے چائے مت بنانا زل......ہم ابھی پی کر آئے ہیں۔'' سمیرا نے ہاتھ بڑھا کر ڈش میں سے ایک مونگ پھلی اٹھائی۔ سحرش نے ہونٹوں کو گول کرتے ہوئے معنی خیز نظروں سے مہرین کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں......

''ہاں البتہ کچھ مونگ پھلیاں ضرور لیتی آنا۔''

زل نے سر ہلایا اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی سرد ہوا کے جھونکے اندر آئے اور کہیں بجلی چمکی۔ لمحہ بھر کے لیے صحن روشن ہوا اور ساتھ ہی بادل گرجا۔

''اوہ......لگتا ہے بارش پھر ہونے والی ہے۔'' طیب نے مضطرب ہو کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔

''تو تم کون سا سڑک پر بیٹھے ہو۔ ابھی کچھ دیر میں اکٹھے نکلتے ہیں۔ مرسل آج گاڑی نہیں لایا

اس لیے تم ہم سب کو ڈراپ کرو گے۔ ثوبیہ اور مرسل کو سمیرا ڈراپ کرے گی۔'' اسد نے طیب کی طرف دیکھا تو وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ اور سمیرا کی طرف دیکھا۔

''تمہارے وجدان احمد آج کل کہاں غائب ہیں؟''

''ملک سے باہر ہیں۔'' سمیرا کو طیب کے کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ تعلق کا یقین تھا اس لیے اس نے مختصر بات کی۔

''کب تک آئیں گے؟'' طیب متجسس ہوا۔

''جلد ہی...... چند دن قبل بات ہوئی تھی، سب کو سلام دے رہا تھا۔''

''اور ہاں......'' اس نے زمل کی طرف دیکھا، جو بادل کی گرج سن کر دروازے میں ہی ٹھہر گئی تھی۔ ''وہ تمہارے متعلق پوچھ رہا تھا کہ جاب اسٹارٹ کر دی یا نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو وہ ملک کو فون کر دے گا۔'' سمیرا نے نابینا بچوں کے اسکول کے پرنسپل کا نام لیا۔

''نہیں...... مجھے جاب نہیں کرنی۔'' زمل نے باہر قدم رکھا۔

''اوہ ہاں اس نے تمہیں ایک......'' سمیرا نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ''چلو پھر بات کروں گی۔''

لیکن زمل اس کی بات سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔ سمیرا نے کندھے اچکائے اور مرسل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ لیکن اس نے کن اکھیوں سے آزین کی طرف دیکھا تھا اور دل ہی دل میں بے حد محظوظ ہوئی تھی۔

اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہی ہے۔ اس کے اندر ایک کمینی سی خوشی پھیل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس خوشی کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔

کیا آزین کو تکلیف دے کر اس اذیت کا ازالہ ہو جائے گا جو میں نے اور مما نے اٹھائی اور جو خاندان کے باقی دوسرے لوگوں نے بھی...... اس کے اندر سے سوال اٹھا تو اس نے ایک بار پھر آزین کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے کرب جھلکتا تھا۔

ہاں جب بیٹا تڑپے گا تو ماں کو تکلیف ہوگی اور وہ تکلیف اس اذیت کا ازالہ نہ بھی کر سکی تو دل کو تسکین تو ہوگی نا کہ جس نے ہمیں تکلیف دی، اس کا دل بھی تڑپتا ہے۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔

مرتضیٰ نے اسے بتایا تھا کہ آزین بہت محبت کرتا ہے زمل سے اور زمل بھی...... تو زمل کا کیا قصور ہے۔ ضمیر نے اندر چٹکی بھری تھی۔ وہ تو ایک سادہ سی لڑکی ہے اور اس کا دل بقول ثوبیہ کے پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے پانیوں کی طرح شفاف اور پاکیزہ ہے۔

تو ہمارا کیا قصور تھا۔ اس کے اندر دور تک تلخی سی پھیلتی چلی گئی تو اس نے سر جھٹک کر فائل مرسل کی طرف بڑھائی۔

''تم نے باقی کے پراجیکٹ نہیں دیکھے۔'' مرسل، ہمیرا اور وجدان کے مشوروں پر بہت انحصار کرنے لگا تھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ جب سے وہ دونوں ان کی اس تنظیم کا حصہ بنے تھے انہوں نے بہت خلوص سے مدد کی تھی اور کئی مسئلے محض ان کی وجہ سے حل ہوئے تھے۔

''تم خود ہی بتا دو کیا پراجیکٹ ہیں اور میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔'' اس کے دل پر ایک نامعلوم سا بوجھ آ گرا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہر بات سے اس کی دل چسپی ختم ہو گئی تھی۔

''یہ دونوں پراجیکٹ تعلیم کے حوالے سے ہیں۔ وجدان سے اس موضوع پر بات ہوئی تھی اس کے جانے سے پہلے۔ ایک تو ان بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا ہیں جو اوسط ذہانت کے بچے ہیں۔ اور وہ تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک اور خاندان کے لیے ایک کارآمد فرد بن سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے ایک یتیم لڑکے سے ابتدا کی تھی جس کی ماں گھروں میں کام کرتی ہے۔ وہ خود بھی فارغ وقت میں تھوڑا بہت کام کرتا تھا۔ لائق بچوں کو گورنمنٹ اسکالرشپ دیتی ہے اور ادارے بھی سپورٹ کرتے ہیں لیکن......''

وہ تفصیل بتانے لگا۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ ہم چند لوگ وہ سب نہیں کر سکتے جس کے خواب ہم نے دیکھے ہیں۔ جب تک ہم کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہ ہوں۔ بھلے وہ پارٹی اقتدار میں ہو یا نہ ہو۔ کسی سیاسی پارٹی کی سپورٹ ہو گی تو وہ سارے منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچ سکیں گے جو ہم بناتے رہتے تھے۔'' طیب نے اچانک ہی مرسل کو مخاطب کیا تھا۔

''کب تک ہم سمیرا اور وجدان جیسے لوگوں سے بھیک مانگ کر معمولی معمولی کام کرتے رہیں گے۔ کل کو سب کی شادیاں ہو جائیں گی سب اپنی زندگی میں مصروف ہو جائیں گے اور تمہارے سب پراجیکٹ ادھورے رہ جائیں گے۔''

''لیکن ہم اس طرح نہیں سوچتے طیب......! ہمیں کسی سیاسی پارٹی کی سپورٹ نہیں چاہیے۔ ہم اپنے طور پر جو کر سکے، کریں گے اور جب نہ کر سکے تو ہو سکتا ہے ہماری جگہ کوئی اور آ جائے۔'' آزین نے بے اختیار کہا تھا۔

''کمال ہے، یہ تم کہہ رہے ہو زین! جب کہ تمہارا ابا کالج کے زمانے سے ہی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ میرے ماموں بتا رہے تھے ایک روز کہ جب 1973ء میں بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک چلی تو وہ ہر جلسے اور جلوس میں آگے آگے ہوتے تھے اور پھر جب 1979ء میں ملک کے سربراہ کی پھانسی کے خلاف جلوس نکلنے لگے تو وہ اپنی تقریروں سے نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگا دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ حکومت مخالف پارٹی کا حصہ رہے۔'' طیب کو ظفریاب کے متعلق تفصیل کچھ عرصہ پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔

''میرے ابا نے ہمیشہ جسے حق جانا، اس کا ساتھ دیا۔'' آزین نے غیر ارادی طور پر ظفریاب کا دفاع کیا۔

''1973ء میں جب وہ بنگلہ دیش نامنظور تحریک کا حصہ بنے تھے تو تب انہیں ایسا ہی لگتا تھا کہ ہمیں بنگلہ دیش کو منظور نہیں کرنا چاہیے لیکن جب انہیں احساس ہوا کہ حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے تو وہ اس تحریک سے الگ ہو گئے تھے اور 1979ء میں جب وہ جلسے جلوسوں میں شرکت کر رہے تھے تو ان کا مقصد ایک غیر آئینی فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا زین کہ انہوں نے غلط کیا تھا یا صحیح...... میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی بڑے کام کے لیے کسی پارٹی کی سپورٹ ضروری ہے۔ اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک مضبوط جماعت آپ کی پشت پر ہو تو آپ بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں۔'' یہ طیب کا خیال تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ سب

اس سے متفق ہوتے۔ لیکن طیب پچھلے کئی ماہ سے اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اگر انہیں کسی مضبوط سیاسی پارٹی کی پشت پناہی مل جائے تو وہ اپنے کئی بڑے بڑے منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔

''ایک مضبوط جماعت کی سپورٹ......'' آزین نے زیر لب کہا اور اس کے اندر دور تک تلخی پھیلتی چلی گئی۔ ظفریاب نے اپنی پارٹی کے لیے ان تھک کام کیا تھا۔ اور پارٹی نے انہیں کتنا سپورٹ کیا تھا۔ کتنی مدد کی تھی۔ 1983ء کو ایک رات انہیں کچھ نامعلوم افراد گھر سے لے گئے تھے اور پھر پورا ایک سال پارٹی کے ایک ایک بندے کے گھر جا کر منتیں کی تھیں لیکن نہ پارٹی کے بڑوں نے اور نہ کسی اور نے اپنے اس محنتی کارکن کے لیے کچھ کیا تھا۔ وہ دن وہ کیسے بھول سکتا تھا جب صبوحی صبح صبح اس کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل جاتی تھیں۔ اس کے اندر بہت سارے آنسو گرے تھے۔ بہت سارے زخموں کے ٹانکے ادھڑ گئے تھے اور ان سے خون رستا تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا لیکن وہ پورے سال بھر کی مشقت اور بھاگ دوڑ بھولا نہیں تھا۔ کبھی پیدل، کبھی تانگے پر اور کبھی کسی رکشے یا ویگن پر وہ صبوحی کے ساتھ جانے کہاں کہاں گیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے صبوحی کی آنکھوں کو کبھی خشک نہیں دیکھا تھا۔ ان کی پلکیں ہر وقت بھیگی رہتی تھیں۔ ان کی رنگت میں زردیاں سی گھل گئی تھیں۔ ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ بی بی اماں اور دادی جان کے اصرار پر چند لقمے اور بس۔

پھر اس ایک سال کے بعد جب اسے لگا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کہ ظفریاب گھر آ گئے تھے لیکن صبوحی کی آنکھیں تو اب بھی بھیگی رہتی تھیں اور پھر ظفریاب کے آنے کے صرف دو ماہ بعد وہ رات جس کی صبح بہت تاریک اور سیاہ تھی۔ اس رات صبوحی نے نہ جانے کتنی بار اسے گلے سے لگایا تھا کتنی بار اس کی پیشانی، رخسار اور ہاتھ چومے تھے۔ اور وہ حیران سا ہو کر ان کی آنسو بھری آنکھیں دیکھتا تھا کہ اب تو ابا گھر آ گئے ہیں، اب بھلا اماں کیوں روتی ہیں اور ظفریاب اس کے بیڈ کے سامنے کرسی پر بے چین سے بیٹھے تھے۔

ان کی ملتجی نظریں بار بار صبوحی کی طرف اٹھتی تھیں۔

ان کی وہ ٹوٹی بکھری زخمی سی آواز آج بھی اس کے کانوں میں گونجتی تھی۔

"صبو، مت کرو ایسا۔ کیوں کر رہی ہو سب......"

لیکن صبوحی جواب میں بس روتی تھی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی لیکن اس کی نظریں ظفریاب کے چہرے سے ہٹتی نہ تھیں اور وہ آٹھ نو سالہ بچہ، کچھ نہ سمجھتے ہوئے جانے کب نیند سے مغلوب ہو کر، صبوحی کے بازو پر سر رکھے سو گیا تھا اور جانے کب صبوحی اور ظفریاب اپنے کمرے میں گئے تھے۔

اس کی آنکھ تو صبح خود ہی کھلی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ آج اماں اسے جگانے نہیں آئی تھیں۔ ورنہ ہر صبح تو وہ ہی اٹھانے آتی تھیں۔ شاید وہ آج بھی اٹھانے آئی ہوں لیکن وہ گہری نیند میں تھا، اسے پتا ہی نہیں چلا۔ ایک بار نیند میں اسے لگا تو تھا کہ شاید کمرے میں کوئی آیا ہے۔ اماں نے سوچا ہوگا کہ چلو آج میرا بیٹا اسکول سے چھٹی کر لے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بدلنے والی ہے۔ ویسے آنسو جو اب کبھی خشک نہیں ہونے والے تھے۔ آنکھیں خشک بھی ہو جاتیں لیکن انہیں اندر من میں بہتے ہی رہنا تھا۔

"اب بس کرو طیب......" مرسل کی آواز قدرے بلند تھی۔ آزین چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

پتا نہیں وہ کیا کیا کہہ رہا تھا، اس نے تو سنا ہی نہیں تھا۔

"ہمیں قائل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں تم اگر کسی پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس طرح تم زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو تو بصد شوق...... مقصد تو کچھ کرنا ہے۔ ہمارے ساتھ رہ کر یا کہیں اور...... جب چاہو اپنا راستہ الگ کر لو۔"

"نہیں...... ایسا تو نہیں کہا میں نے......" طیب شرمندہ ہوا۔ "میں نے تو بس یونہی ایک خیال ظاہر کیا تھا کہ اس طرح شاید ہم زیادہ لوگوں کے کام آ سکیں۔"

"تو بس اس یوں ہی کو رہنے دو۔" اسد نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

اب پتا نہیں یہ طیب کی باتوں کی وجہ سے تھا یا مرسل کا حتمی لہجہ کہ اندر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی اور اس خاموشی کو چند لمحوں بعد مہرین کی آواز نے توڑا تھا جو عمر سے مخاطب تھی۔

"عمر بھائی! خالہ کیسی ہیں؟ بہت دنوں سے انہوں نے چکر نہیں لگایا۔"

''ٹھیک ہیں۔'' عمر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ ہمیشہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا۔ جیسے خود میں گم ہو۔

''لیکن دسمبر میں ان کا دل کہیں باہر نکلنے کو نہیں چاہتا تو بس گھر میں ہی رہ کر ماموں کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کی تصاویر ان کی دوسری چیزیں نکال نکال کر دیکھتی رہتی ہیں۔

1971ء کی جنگ میں ان کے اکلوتے بھائی چٹاگانگ کے محاذ پر شہید ہو گئے تھے۔ گھر میں ان کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں اور وہ وہاں شہادت کی تیاری کر رہے تھے۔''

''ہاں اکہتر کے بعد کا ہر آنے والا دسمبر اپنے دامن میں اداسیاں لے کر آتا ہے۔ اور یوں ہی اداسیاں سمیٹ کر چلا جاتا ہے۔'' اسد نے گود میں رکھا رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھا۔

اسد کے چچازاد بھائی کیپٹن سرفراز کو مکتی باہنی والوں نے ان کی بیوی اور دو بچوں سمیت مار دیا تھا اور بعد میں اکہتر میں اسد کے چچا کرنل سجاد کو نوے ہزار فوجیوں کے ساتھ ہتھیار پھینکنے پڑے تھے اور رہائی کے بعد انہوں نے خود کو ایک کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ جوان بیٹے، بہو اور بچوں کی المناک موت، ہتھیار پھینکنے کی ذلت، پاکستان کے دولخت ہونے کا دکھ ان سب چیزوں نے مل کر ان کی ذہنی حالت تباہ کر دی تھی اور پھر اسی کیفیت میں چند سال بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

''ہاں سولہ دسمبر 1971ء کے بعد دسمبر، دسمبر نہیں رہا۔ ہمارے سینے میں ایک زخم ہے جس سے خون رستا رہتا ہے جو شاید کبھی نہ بھرے۔'' مرسل نے بھی تائید کی۔

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 15

''کیا قوم کو یہ جاننے کا حق ہے کہ آخر سولہ دسمبر کے دن کس نے اس لہو سے غداری کی جو پاکستان کے قیام، اس کی سالمیت اور بقا کے لیے بنایا گیا تھا۔ کس نے اقتدار کی کرسی کی خاطر پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔ پورے اور مکمل پاکستان کو پچیس سال کی زندگی بھی نہ ملی۔'' طیب کے لبوں پہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''قوموں کی تاریخ میں ایسے سانحے اچانک نمودار نہیں ہوتے طیب! اس کے پیچھے سالوں کے واقعات اور تاریخ ہوتی ہے۔ انیس سو سینتالیس سے لے کر اکہتر تک اینٹ اینٹ کر کے اس علیحدگی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے میرے دوست کسی روز آرام سے بیٹھ کر اس پر بات کریں گے۔''

مرسل ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا اور اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔

باہر بارش اسی تواتر سے ہو رہی تھی اور اندر ایک گمبھیر سی اداسی نے سب کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ سب کے دل درد سے لبریز تھے، گو اس درد کی نوعیت الگ الگ تھی۔

مہرین نے سب کے چہروں پر باری باری نظر ڈالی اور اس گمبھیر خاموشی اور اداسی سے گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''ذرا دیکھوں بی بی اماں اور زمل کیا کر رہی ہیں۔ اب اتنی بارش میں تندور سے تو روٹی منگوانا مشکل ہے۔ گھر میں ہی بنا لیتے ہیں۔''

''نہیں۔ بی بی اماں سے کہو، کھانے کا تردد مت کریں، جیسے ہی بارش کا زور ٹوٹتا ہے، ہم نکلتے ہیں۔'' اسد نے بے اختیار کہا۔

''لیکن بی بی اماں یہ تردد کر چکی ہیں سو بارش رکے یا نہ رکے، آپ سب کھانا کھا کر ہی جانا، ورنہ بی بی اماں کو دکھ ہوگا۔'' سحرش بھی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ مہرین نے دروازہ کھولا تب ہی بادل زور سے گرجا اور بارش میں ایک بار پھر تیزی آ گئی۔

''اتنے ڈھیروں سال گزر گئے اس سانحے کو۔ 2003ء کا سورج غروب ہونے والا ہے اور ہم سب یوں منہ لٹکائے بیٹھے ہیں جیسے یہ سانحہ ابھی ابھی ہوا ہو۔'' طیب پتا نہیں کیوں آج کل جلا بھنا سا بولتا تھا۔

''بعض سانحے ایسے ہوتے ہیں جو صدیاں گزر جانے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔'' عمر نے آہستگی سے کہا تو اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

''تو چلو پھر اونچا اونچا شور مچا کر اس دکھ کو کم کرنے کی کوشش کریں، جس نے اچانک ہی ہمیں اپنے حصار میں لے لیا ہے۔'' یہ مشورہ مرتضیٰ کی طرف سے آیا تھا۔

''سکھ کے پھول

دکھ کی گھاس''

سمیرا نے مسکراتے ہوئے تان لگائی۔

''بس!'' طیب نے ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔ ''میں یہ فضول مصرعے سن سن کر اوب چکا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ 1975ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے طلباء کو ان فضول مصرعوں میں کیا نظر آیا تھا کہ......''

''بس بکواس، سب بکواس......'' سمیرا نے قہقہہ لگایا اور باہر برآمدے میں کھڑی بارش کو دیکھتی سحرش نے اس قہقہے کو سنا تو اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ خود کو بارش کی پھوار سے بچاتی تیزی سے مہرین کے پیچھے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

بی بی اماں جلدی جلدی روٹیاں توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں رکھتی جا رہی تھیں۔ دوسرے

چولہے پر سالن گرم ہونے کے لیے دھیمی آنچ پر رکھا تھا۔ زمل پلیٹیں ٹرے میں رکھ رہی تھی۔

''بی بی اماں! آپ ہٹیں، باقی کی روٹیاں میں پکا لیتی ہوں۔'' مہرین کو لگا تھا کہ بی بی اماں نو دس بندوں کے لیے روٹیاں بنا بنا کر تھک جائیں گی۔

''ارے نہیں بچے، یہ بس آخری روٹی ہے۔ میں نے اندازے سے زیادہ ہی بنا دی ہیں۔ بچ گئیں تو صبح ساجدہ لے جائے گی۔'' انہوں نے روٹی کو پلٹا۔ ایک بھی سیاہ پھول نہیں تھا۔ ایسی کمال کی روٹی بناتی تھیں بی بی اماں۔ نرم اور پھولی ہوئی۔

مہرین نے توصیفی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں تو شاید کبھی بھی اس طرح کی روٹی نہ بنا سکوں۔''

''اور تمہیں ضرورت بھی نہیں، تمہارے لیے تو کئی کئی ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔'' سحرش نے لبوں پر شریری مسکراہٹ سجائے مہرین کی طرف دیکھتے ہوئے کچن میں قدم رکھا جس کے چہرے کے تاثرات یکدم سپاٹ ہو گئے تھے۔

''اللہ سب بچیوں کے نصیب اچھے کرے لیکن اگر دس نوکر بھی ہوں تو گھر کی مالکن کو سب کام آنے چاہئیں۔'' بی بی اماں نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن ہٹا کر روٹی اندر رکھی۔

''سحرش! تم یہ چٹائی اور دستر خوان لے جاؤ۔ اور تم بچیاں مل کر کھانا لگا دو۔ بچوں نے نہ جانے دن کا کھانا بھی ٹھیک سے کھایا تھا یا نہیں۔''

سحرش نے کچن کے کونے میں دیوار کے ساتھ پڑی چٹائی اٹھائی اور مہرین کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے چٹائی لے کر چلی گئی۔ جب اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو مرسل وغیرہ مدھم سروں میں گا رہے تھے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(اقبال)

کچھ بھی نہیں، سب کورس میں کہتے تھے۔

سمیرا اور ثوبیہ سر جوڑے موبائل فون پر جھکی ہوئی کوئی گیم کھیل رہی تھیں۔ سحرش نے دلچسپی سے دیکھا۔

''یہ فون......''

''بھیا لائے تھے۔'' سمیرا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سب کے ساتھ آواز ملائی۔

''ہاں کچھ بھی نہیں۔''

''ایسا ایک فون آپ کے پاس بھی تو تھا نا زین بھائی۔'' سحرش کا موڈ ہوتا تو آپ اور بھائی کہہ دیتی ورنہ زیادہ تر زین ہی کہتی تھی۔ ''ظفر چاچو نے بھیجا تھا۔ آپ کیوں استعمال نہیں کرتے، کہاں گیا؟''

''مجھے ضرورت نہیں تھی، کہیں کسی دراز یا الماری میں پڑا ہوگا۔'' زین نے لاپروائی سے کہا۔

''آپ کو ضرورت نہیں تو مجھے دے دیں، میری ایک دو فرینڈز کے پاس بھی ہے۔'' سحرش کو ان دنوں ایسا ہی فون لینے کا بہت شوق ہو رہا تھا۔

''لے لینا۔''

آزین کے کہنے پر مرتضیٰ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''ابا تمہیں اتنا زیادہ جیب خرچ دیتے ہیں، لے لو خود۔ پانچ چھ ہزار کا مل جائے گا ایک عام سا فون۔''

آج کل کمپیوٹر کی دکانوں کے ساتھ ساتھ یہاں لاہور میں موبائل فون کی دکانیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔

''آپ کو اگر میرا آزین سے فون لینا اچھا نہیں لگ رہا تو آپ اپنا دے دیں۔'' وہ بھی سحرش تھی، مزے سے کہہ کر ثوبیہ کو چٹائی پکڑائی۔

''کھانا تیار ہے، جلدی سے کارپٹ صاف کر کے چٹائی بچھا دو۔''

''ویسے کھانے میں کیا ہے؟'' سمیرا فون اپنے شولڈر بیگ میں ڈال کر اٹھی۔

''آلو گوشت، مکس سبزیوں کی بھجیا، سلاد اور میٹھے میں گجریلا۔'' سحرش بتا کر باہر نکل گئی۔

دوبارہ جب وہ مہرین کے ساتھ آئی تو مرسل وغیرہ دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پہ بیٹھے تھے۔

ثوبیہ نے چٹائی بچھادی تھی۔ مونگ پھلی وغیرہ کے باؤل ٹیبل پر رکھے تھے۔ فرشی کشن ایک طرف کونے میں رکھ دیے تھے۔

''گڈ......!'' مہرین نے فوراً ہی دستر خوان بچھایا۔

اور پھر اس نے اور مہرین نے جلدی سے پلیٹیں وغیرہ رکھیں۔ مہرین نے دروازے سے ہی زمل کو آواز دی۔

''ملی! سالن کے ڈونگے پکڑا دو۔''

سحرش اس کی مدد کے لیے باہر چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ چکا تھا۔ آلو گوشت اور گرم گرم روٹی کی خوشبو بھوک بڑھا رہی تھی۔

''یہ زمل کیوں نہیں آئی؟ کیا اسے کھانا نہیں کھانا؟'' سحرش نے پانی کا جگ اور گلاس رکھے تو سمیرا نے پوچھا۔

''ہاں......شاید......وہ دادا جان کے ساتھ کھائے۔ ان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اور بی بی اماں شیخو بابا کو کھانا دے کر آ رہی ہیں۔''

تب ہی بی بی اماں کے ساتھ زمل بھی گجریلے والے ہاٹ پاٹ اٹھائے آ گئی۔

''آجاؤ زمل۔'' مہرین نے اس کے لیے جگہ بنائی تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

آج سب ہی نیچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ مرسل وغیرہ ایک کنارے پر آمنے سامنے بیٹھے تھے اور لڑکیاں ایک طرف۔ کھانا بہت خوش گوار ماحول میں ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے کھایا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ سمیرا اور ثوبیہ بی بی اماں کی تعریف بھی کر رہی تھیں۔

''سچی بی بی اماں! اپنی پوری زندگی میں ایسا مزے دار آلو گوشت میں نے کبھی نہیں کھایا۔'' مرسل نے بھی ان کی تائید کی تب ہی زمل اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے زمل! تم نے تو بس چند نوالے لیے ہیں۔ ٹھیک سے کھانا کھاؤ نا۔'' سحرش نے ذرا سی بھجیا اپنی پلیٹ میں ڈالی۔

''پتا نہیں میرے بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ بھوک ہی مر گئی ہے ان کی۔ یہ ہی کیا...... زین بھی بس چند لقمے لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے ٹیبل سے۔'' بی بی اماں نے تشویش سے زمل کو دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے آزین کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ بی بی اماں صحیح ہی تو کہہ رہی تھیں۔ وہ کچھ کمزور ہو رہی تھی۔

''نہیں تو...... میں نے بس کھا لیا پیٹ بھر کر، بی بی اماں کو تو بس ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہم نے کچھ نہیں کھایا، سب ماؤں کی طرح۔'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''کہاں جا رہی ہو، میٹھا تو لے لو۔'' سحرش نے پھر اسے روکا۔

''میں ذرا قہوے کے لیے پانی رکھ کر آتی ہوں۔''

''نہیں زمل بہن، ہم اب قہوے کے لیے نہیں رکیں گے۔ ابھی بارش کی شدت کم ہے تو ہم کھانا کھا کر نکل جائیں گے۔'' مرسل نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ ہمیشہ سب لڑکیوں کو یوں ہی بڑے احترام سے بہن یا سسٹر کہہ کر بلاتا تھا۔

''تو میں دادا جان کو قہوہ بنا کر دے آؤں۔''

جہاں زیب بیگ سردیوں میں لازمی رات کو کھانے کے بعد قہوہ پیتے تھے۔ زمل نے برآمدے میں رک کر سامنے دیکھا۔ بارش رک چکی تھی۔ البتہ تیز ہوا چل رہی تھی۔ سامنے صحن کی دیوار پر دھندلائی ہوئی سی چاندنی ٹھہری ہوئی تھی۔ شاید چاند، کہیں کسی بادل کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ لمحہ بھر رک کر وہ دادا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں زیب بیگ کھانا کھا چکے تھے۔ اس نے ٹرے اٹھائی۔

''دادا جان! قہوہ ابھی پئیں گے یا کچھ دیر بعد؟''

''کچھ دیر بعد پیوں گا۔ بیٹھ جاؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔'' انہوں نے بی بی اماں سے کہا تھا کہ کھانے کے بعد زمل کو بھیج دیں اور اگر وہ نہ بھی کہتیں تو زمل کی عادت تھی سونے سے پہلے انہیں شب بخیر کہنے ضرور آتی تھی۔

''جی دادا جان!'' زمل ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''میں جلد از جلد تمہاری رخصتی کرنا چاہتا ہوں۔ ظفریاب سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ فروری کے سیکنڈ ویک میں آجائے گا تو مارچ کی کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' ان کی نظریں اس کے چہرے پر جیسے کچھ کھوجتی تھیں۔

زمل کی نظریں جھک گئیں۔ رخساروں پر ہلکی سرخی دوڑ گئی اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں دادا جان لیکن زین......''

''زین سے بھی میں نے بات کی ہے۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ خاموش رہا تو خاموشی کا مطلب رضامندی ہی ہے۔ پھر بھی ایک بار دوبارہ بات کرلوں گا کہ اب اچھی جاب کر رہا ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔''

دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ زمل نے جھکا سر نہیں اٹھایا تھا۔

''ظفریاب کی بیوی اچھی ہے۔ وہ آئے گی تو سب تیاری کرلے گی۔ وہ کہہ رہی تھی مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں زمل اور زین دونوں کی ہی ماں ہوں۔ دونوں طرف کی تیاری کرلوں گی۔''

جہاں زیب بیگ بہت مطمئن نظر آرہے تھے۔ تب ہی فون کی بیل ہوئی جہاں زیب بیگ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا۔ زمل نے سوچا ضرور اختر بانو کا فون ہوگا لیکن پھر جہاں زیب بیگ کی بات سن کر چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''صبوحی......صبوحی بیٹا یہ تم ہو، خیریت ہے نا سب، تم اتنی پریشان سی کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے بولو نا۔'' جہاں زیب بیگ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

''دیکھو بیٹی! آرام سے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' وہ خاموش ہوکر صبوحی کی بات سننے لگے۔ زمل حیرت زدہ سی بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، بیٹی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جس کسی نے بھی تمہیں بتایا ہے غلط بتایا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے بچے۔ ہمارے تو اگلے پرانے زخم بھی مندمل نہیں ہوئے۔ ہم کیسے بھول سکتے ہیں وہ دکھ، وہ تکلیف، وہ اذیت......جس کے نشان اب بھی ہمارے دلوں اور روحوں پر ثبت ہیں۔'' ان کی آواز بھرا گئی تو وہ

خاموش ہو گئے۔ اور کچھ دیر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولے۔

''یہ چند ماہ پہلے کی بات ہے ظفریاب کی پارٹی کے کچھ لوگ گھر آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ ظفریاب ہمارے بہت اچھے کارکن تھے تو ہم چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا ہماری پارٹی جوائن کر لے۔ میں نے اور زین نے صاف منع کر دیا۔ تم بے فکر رہو۔

ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہو تم، ظفر بھی چاہتے ہیں کہ زین ان کے پاس یو کے چلا جائے اور ان کا کام سنبھال لے۔ لیکن زین اس کے لیے مانتا ہی نہیں تھا۔ لیکن اب میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اسے یو کے چلے جانا چاہیے۔ ہم لوگ اپریل میں زین کی شادی کر رہے ہیں۔ ظفر بھی اپنی فیملی کے ساتھ فروری میں آ جائیں گے...... کیا تم...... آسکتی ہو صبوحی؟'' اب وہ پوچھ رہے تھے۔

زمل ٹرے اٹھا کر، اشارے سے جہاں زیب بیگ کو جانے کا بتاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچن میں سحرش برتن دھو رہی تھی جبکہ مہرین انہیں خشک کر رہی تھی۔ بی بی اماں بچے ہوئے سالن فریج میں رکھ رہی تھیں۔

''سب لوگ چلے گئے؟''

''ہاں......!'' جواب مہرین نے دیا تھا۔

''چلو سحرش! ہٹو، میں باقی کے برتن دھو لیتی ہوں۔''

''نہیں تم جاؤ...... جا کر سو جاؤ آنکھیں بند کر کے۔'' لہجہ ناراض سا تھا۔

''سحری......'' زمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''میں ذرا دادا جان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ سوری میں آ کر دھو لیتی۔''

''میں اس وقت بہت غصے میں ہوں اور اپنا غصہ برتن دھو کر نکال رہی ہوں۔'' سحرش نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی چہرہ موڑ لیا۔

زمل نے مہرین کی طرف دیکھا تو مہرین نے کندھے اچکائے۔ وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ سحرش کو کس بات کا غصہ ہے۔ اور جو تھوڑا بہت جانتی تھیں وہ فریج کا دروازہ کھولے اندر موجود چیزیں ادھر ادھر کر رہی تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر باہر نکل آئی۔

بارش اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ آزین صحن کا دروازہ بند کر کے آ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں، رخساروں پر حدت سی دوڑنے لگی۔

"زین......!" وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی، اسے بتانا چاہتی تھی جو دادا جان نے اس سے کہا تھا اور صبوحی چچی کے فون کے متعلق بھی اسے بتانا تھا لیکن شاید آزین نے سنا نہیں تھا۔ وہ برآمدے میں رک کر اپنے جوتے جھاڑ رہا تھا۔ شاید صحن میں کھڑا بارش کا پانی اس کے جوتوں میں چلا گیا تھا۔

"زین......!" وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھی۔

وہ دو تین ماہ بعد اس کی زندگی میں شامل ہونے والی تھی تو وہ چاہتی تھی کہ اگر زین کے دل میں کوئی غبار، کوئی شکوک ہیں تو آج وہ انہیں دور کر دے۔ اس سے کہے جو کہنا ہے، کہہ لو۔ جو پوچھنا ہے، پوچھ لو، تاکہ ہماری نئی شروع ہونے والی زندگی میں کوئی شک اور وہم کے بادل نہ ہوں۔ ہماری زندگی کا آسمان بہت صاف، روشن اور چمکیلا ہو۔

"زین......! آؤ ادھر بیٹھ کر کچھ دیر بات کرتے ہیں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا دل عجیب بے ڈھنگے انداز میں دھڑک رہا تھا اور لبوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"لیکن مجھے تم سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنی زمل شاہ زیب......" سپاٹ پتھریلا لہجہ۔

زمل نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

کیا یہ زین کہہ رہا تھا۔ اتنا اجنبی و اتنا پتھر سا لہجہ۔

آزین نے نظریں اٹھائیں۔ شعلے برساتی نظریں......

وہ وہاں ہی ساکت کھڑی رہ گئی۔ اور زین تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نہیں...... یہ زین نہیں ہو سکتا۔ شاید اس کے کانوں نے غلط سنا ہے۔ لیکن کیا اس کی نظروں نے

بھی دھوکا کھایا ہے۔ وہ جلاتی، راکھ کرتی نظریں۔

وہ ہولے ہولے بیٹھتی چلی گئی۔ برآمدے تک آنے والی بارش کی بوچھاڑ نے تخت پر بچھی چادر کو گیلا کر دیا تھا لیکن اسے کچھ احساس نہیں تھا۔

''تو...... کچھ دیر پہلے جو امید کے جگنو دل کی منڈیروں پر آ کر بیٹھ گئے تھے، وہ سب میرے خوش فہم دل کی شرارت تھی۔''

اس نے دایاں ہاتھ تخت پر ٹکایا جیسے اس نے سہارا نہ لیا تو ڈھے جائے گی۔ دھندلائی ہوئی چاندنی اب نکھری سی گئی تھی شاید چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس کے اندر جیسے گہرے سیاہ بادل چھاتے جا رہے تھے۔ دل کی منڈیروں پر بیٹھے جگنو مر گئے تھے۔ شاید ان کی زندگی اتنی مختصر تھی۔

ہاں......

یہ طے ہی کب ہے کہ تم نے ہم سے
اسی محبت سے بات کی تھی
اگر تمہاری نظر سے دیکھیں تو
تم نے صرف ہم سے بات کی تھی
تو ہم نے کیوں یہ سمجھ لیا تھا
اسی محبت سے بات کی ہے
اور جیسے ہم تم
انہیں زمانوں کے سحر میں ہیں
ہمارے خوش فہم دل کا کیا ہے؟
(طلعت اخلاق احمد)

تو وہ اشتباہ نظر تھا۔ منڈیروں پر کوئی جگنو نہیں تھے اور اندر پھیلتا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اختر بانو بیڈ پر زیورات کے ڈبے رکھے بیٹھی ایک ایک ڈبا کھول کر دیکھ رہی تھیں، جب ثوبان شاہ ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''یہ اپنے زیورات میں سے نومی کی دلہن کے لیے الگ کر رہی تھی۔ یہ دیکھیں یہ نورتن کا گلوبند سیٹ ہے، کیسا ہے؟'' اختر بانو نے ایک ڈبا اٹھا کر ثوبان شاہ کی طرف بڑھایا۔ ''اماں جان نے مجھے بتایا تھا کہ دادا جان یہ کلکتہ سے لائے تھے۔ وہاں کے مشہور ہندو سنار لالہ رام نے بنایا تھا۔ اس میں سب اصلی پتھر ہیں۔ بہت خوب صورت ہے۔''

ثوبان شاہ نے ڈبا پکڑ لیا۔

''لیکن یہ تو تمہارے زیورات ہیں بانو! تم ان میں سے نومی کی دلہن کو کیوں دے رہی ہو؟ اس کے لیے جو جو کچھ بنوانا ہے، کل یا پرسوں کراچی جا کے لے آتے ہیں۔ یا پھر اپنی پسند کا جو آرڈر دینا ہو دے آنا۔''

''نئے زیور تو بنیں گے ہی...... یہ جو میرا زیور ہے یہ بھی سب اپنے بیٹوں کی دلہنوں کو تقسیم کروں گی۔ ابھی تو ایسے ہی دھلوا کر یا پالش کروا کے دے دوں گی بعد میں انہیں پسند نہیں ہوا تو تڑوا کر اپنی مرضی سے بنوا لیں گی۔'' اختر بانو نے ایک اور ڈبا کھولا۔

''لیکن یہ تو بہت انٹیک ہیں۔ آج کل بھلا ایسی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔ بھلا وہ کیوں تڑوائیں گی...... اور پھر پالش کروانے یا دھلوانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ایسے چمک دمک رہے ہیں جیسے ابھی بنوائے ہوں۔'' ثوبان شاہ زیور دیکھنے لگے۔

''حیرت ہے میں نے کبھی تمہیں ان میں سے کوئی زیور پہنے نہیں دیکھا۔''

''ہاں مجھے زیادہ شوق نہیں تھا زیورات کا۔ پھر بھی شادی کے ابتدائی دنوں میں کہیں دعوت وغیرہ پر جاتے ہوئے کوئی چیز پہن لیتی تھی۔ آپ نے شاید کبھی دھیان سے نہیں دیکھا ہوگا مجھے۔''

اختر بانو نے روانی میں کہا تو ثوبان شاہ نے ہاتھ میں پکڑا ڈبا بیڈ پر رکھتے ہوئے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اب ایسا الزام تو نہ دو۔ تب تمہارے سوا اور کچھ دکھتا ہی نہ تھا۔ بیس اکیس سال کا ثوبان شاہ اپنی اٹھارہ سالہ دلہن کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا۔''

تب اختر بانو کے لبوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہو کو معدوم ہوگئی۔

''یہ کندن سیٹ ہے۔ ان دونوں میں سے ایک نومی کی دلہن کے لیے اور ایک ریحان کی دلہن کے لیے ہے۔ یہ دو کنگن اور دو گھڑی چین ہیں۔ اماں جان کو ابا جان نے بنوا کر دیے تھے انہوں نے مجھے دے دیے۔ ان پر جو مینے کا کام ہوا ہے، ایسا نفیس اور خوب صورت کام اب پاکستان میں نہیں ہوتا۔ یہ بارہ چوڑیاں ابا جان نے لاہور سے ہی بنوائی تھیں چاند بھائی صراف سے۔ میں نے ڈیزائن خود پسند کیا تھا۔ یہ دو دو سب کو دوں گی۔ دو میں نے پہن رکھی ہیں۔''

انہوں نے کلائی آگے کی تو ثوبان شاہ نے بغور اسے دیکھا۔ ہاتھ میں دو چوڑیاں اور انگلی میں ان کی رونمائی میں دی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی اور کانوں میں چھوٹے ٹاپس۔

''اور بری کا زیور...... کیا وہ بھی تقسیم کر دو گی؟ وہ یاقوت والا لاکٹ سیٹ نہ دینا۔ وہ میں نے اپنی پسند سے خریدا تھا۔ یاد ہے نا جب جب تم وہ پہنتی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ گولڈ کی زنجیر میں دل کی شکل کا لاکٹ تھا جس میں اصلی یاقوت جڑے تھے۔''

''وہ مطلب، بری کا زیور......'' اختر بانو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''بری کا تو سب زیور دادی جان نے مجھ سے لے کر ثمرہ آپا کو دے دیا تھا یہ کہہ کر یہ خاندانی زیور ہے اور خاندانی بہو کو ہی ملنا چاہیے جب کہ میں غیر خاندان سے تھی۔''

''نہیں......!'' ثوبان شاہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''دادی جان نے تم سے زیور مانگا تو تم نے سارا زیور دے دیا۔ عورتوں کو تو زیور سے بہت محبت ہوتی ہے۔ کیسے حوصلہ کیا تم نے سب دینے کا۔''

''عورت کا اصل سنگھار تو اس کا شوہر ہوتا ہے جب شوہر کو تقسیم کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا تو پھر زیور کیا اہمیت رکھتا تھا۔'' سادگی سے کہتی ہوئی وہ اٹھیں اور ڈبے اٹھا کر لاکر میں رکھنے لگیں۔ ثوبان شاہ حیرت اور تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''تم نے مجھے بتایا تک نہیں اختر بانو...... ذکر تو کرتیں میں دادی جان اور اماں جان سے بات کر لیتا۔ کتنے سکون اور صبر سے تم نے اپنا نقصان برداشت کر لیا۔''

''میرا جو نقصان ہو چکا تھا اس کے مقابلے میں یہ نقصان تو کچھ بھی نہیں تھا۔''

انہوں نے نومی کے لیے الگ کیئے گئے زیورات کے ڈبے اٹھا کر لا کر کے دوسرے خانے میں رکھے۔

ثوبان شاہ کے پاس جیسے کہنے کے لیے مزید کوئی لفظ باقی نہ رہے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''سوری اختر بانو......''

''کس بات کے لیے......؟'' اختر بانو لاکر بند کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''اپنی بے خبری پر۔ ہر اس زیادتی پر جو تم پر ہوئی۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔'' جب بھی کسی نئی بات کا انکشاف ہوتا وہ یوں ہی شرمندہ ہوتے اور سوری کرتے تھے۔

''کتنی بار معافی مانگیں گے آپ......'' بے حد دل فریب سی مسکراہٹ اختر بانو کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

''جو گزر گیا، وہ گزر گیا۔''

''جب جب اپنی غلطی اپنی کوتاہی کا احساس ہوگا تب تب معافی مانگوں گا اور تم ہر بار مجھے معاف کر دینا۔ روز محشر کی پکڑ سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے اختر بانو۔'' انہوں نے اختر بانو کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''میں اپنے تمام حقوق آپ کو معاف کر چکی، میرے حقوق ادا نہ کرنے پر آپ کی پکڑ نہیں ہو گی۔'' مسکراہٹ اب بھی اختر بانو کے لبوں پر سجی تھی۔

''تمہاری مسکراہٹ آج بھی اتنی ہی دلکش اور اتنی ہی دل آویز ہے جتنی آج سے انتیس سال پہلے تھی۔'' وہ ان کے رخسار کو دونوں انگلیوں سے نرمی سے چھو کر کھڑے ہو گئے۔

''مجھے ڈیرے پر جانا تھا۔ کچھ دوست آئے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس وقت تم سے بہت ساری باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگے پھر ڈریسنگ ٹیبل سے ہیئر برش اٹھایا۔ ان کے بال آج بھی بے حد گھنے اور سلکی تھے۔ حالانکہ ان سے دو برس چھوٹے زمان شاہ کے بال آگے سے اڑ گئے تھے اور ابھی چند دن پہلے ہی وہ ان سے کہہ رہے تھے کہ پچاس سال کے آپ ہیں اور لگتا میں ہوں پچاس سال کا۔ زمان شاہ کی بات یاد کرتے ہوئے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر وہ یکدم مڑے۔ اختر بانو غیر ارادی طور پر انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں اختر بانو......؟'' مسکراہٹ اب بھی ان کے لبوں پر سجی تھی۔

اختر بانو نے محجوب ہو کر نظریں جھکا لیں۔ رخساروں پر ہلکا سا گلابی پن جھلکا۔

''بخدا! تم آج بھی دل و جان کو لوٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' وہ ان کے قریب آئے، لمحہ بھر اسے دیکھتے رہے اختر بانو کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ انہوں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

''میرے کالج کے دوست ہیں حیدر آباد سے آئے ہیں۔ چار لوگ ہیں۔ ماسی تاج کو بتا دینا کہ کھانے میں کیا کیا بنانا ہے۔ بس ہدایت دے دینا اسے، خود نہ کچن میں گھس جانا۔ اب اگر تمہاری طبیعت خراب ہوئی نا تو تمہارے بیٹوں نے میری کلاس لینی ہے۔''

وہ مسکرائے تو اختر بانو بھی مسکرا دیں۔ نومی اور ریحان جس طرح اس بیماری کے بعد ان کے لیے پریشان رہتے اور ان کی فکر کرتے تھے، اس نے بہت سارے زخم بھر دیے تھے۔ وہ اپنے رب کی جتنی بھی شکر گزار ہوتیں کم تھا۔

''اپنی بات مکمل کر کے وہ رکے نہیں تھے لیکن اختر بانو کچھ دیر ان کی بات کے سحر میں جکڑی وہاں ہی کھڑی رہیں اور پھر ماسی تاج کو مہمانوں کے بتانے اور کھانے کے متعلق ہدایات دینے کے لیے باہر نکلیں تو لاؤنج میں ثمینہ صوفے پر بیٹھی تھی اور سنہری اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

''کیا ہوا ثمینہ......؟'' اختر بانو اس کے پاس رکیں۔

''کچھ نہیں، کل میچنگ جوتے کے لیے حیدر آباد کے بازاروں میں چل چل کر پاؤں سوج گئے

تھے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عادت پڑ گئی ہے پاؤں دبوانے کی، بڑا سکون ملتا ہے۔'' ثمینہ مسکرائی۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟ بیٹھ جائیں بھابھی!''

''ثوبان شاہ کے دوست آئے ہوئے ہیں ڈیرے پر ان کا کھانا بھجوانا ہے۔''

''مجھے بتائیں کیا کرنا یا پکانا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا کتنا بڑا آپریشن ہوا ہے آپ کا، زیادہ مت تھکایا کریں خود کو۔''

ان کے آپریشن کے بعد ثمینہ کے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ بن گیا تھا۔

''آرام ہی تو کرتی ہوں سارا دن۔'' اختر بانو مسکرائیں۔ ''ابھی بھی خود سے کچھ کرنے نہیں جا رہی بس ماسی تاج کو سمجھانا تھا کہ کیا کچھ تیار کرنا ہے۔''

''سنہری! جاؤ ماسی تاج کو بلا لاؤ'' ثمینہ نے پاؤں پیچھے کیے اور اختر بانو کو پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی منٹوں میں ماسی تاج لاؤنج میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اختر بانو نے اسے سمجھایا کہ کیا کچھ تیار کرنا ہے۔

''بھاگی کو کہنا وہ پہلے کھیر بنا کر ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھ دے، پھر تمہاری مدد کرے۔ بخشو آئے گا ڈیرے سے کھانا لینے۔''

ماسی تاج سر ہلاتی ہوئی چلی گئی تو ثمینہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کتنی تیاری ہو گئی ہے نومی کی شادی کی۔ ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتائیں بھابھی......!''

''تھوڑی بہت تیاری تو ہو گئی ہے۔ کپڑوں کے لیے سلطانہ سے کہہ دیا تھا میں نے فرحی کی پسند سے کچھ جوڑے لے لے اور کام وغیرہ کے لیے دے دے۔'' اختر بانو نے سلطانہ کی بیٹی یعنی اپنی ہونے والی بہو کا نام لیا۔

''جیولری اور ولیمے کے ڈریس کے لیے تین چار دن تک کراچی جانے کا سوچا ہے۔ حیدر آباد سے فرحی اور سلطانہ کو بھی لے لیں گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کپڑے جیولری سب فرحی کی پسند کی ہونی چاہیے آخر اس نے ہی پہننا اوڑھنا اور استعمال کرنا ہے۔ ایک ہماری اماں تھیں جہیز کا ایک جوڑا بھی میری پسند کا نہیں تھا۔ اور چاچی نے بھی سب کچھ اپنی مرضی اور پسند سے بنوایا تھا۔'' ثمینہ کو اپنا دکھ یاد آیا۔

''قسم سے بھابھی! پورے جہیز اور بری میں سے مجھے وہی تین چار جوڑے پسند آئے تھے جو آپ لاہور سے لائی تھیں۔''

''چلو اب ہمارے ساتھ کراچی چلنا اور اپنی پسند کے کپڑے لے لینا۔ چند دنوں تک ہم کراچی جائیں گے۔ سب کے لیے جوڑے لینے ہیں نومی کی شادی کے۔'' اختر بانو مسکرائیں۔

''صرف جوڑے......'' ثمینہ اٹھلائی۔ ''نہ بھابھی! ہم تو سہرے میں جیولری لیں گے یہ نہ ہو کہ چند ہزار کا لفافہ تھما دیں۔''

''اب کچھ سرپرائز بھی رہنے دو ثمینہ۔'' اختر بانو کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

''کیسا سرپرائز بڑی امی......'' شایان اچانک ہی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آیا تھا۔

''سرپرائز تو سرپرائز ہوتا ہے شانی اگر ابھی بتا دیا تو وہ سرپرائز تو نہیں رہے گا نا۔'' ثمینہ کی آواز میں چہکار تھی۔

''ویسے ہم نومی کی شادی ڈسکس کر رہے ہیں۔ چند دن تک شاپنگ کے لیے جانا ہے ہمیں۔''

''اوہ......!'' اس نے اپنے گھنے سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''شاپنگ تو مجھے بھی کرنی ہے لیکن میں مانی کا انتظار کر رہا تھا۔ مل کر شاپنگ کریں گے۔ ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے۔ مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ سب رسمیں کریں گے۔''

''لیکن تمہارے بابا تو سادگی سے کرنے کو کہہ رہے تھے۔'' اختر بانو نے اسے بے حد محبت سے دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔ ہم تو سب رسمیں کریں گے بڑی امی، آپ بابا جان کو بتا دیجیے گا۔ ہم سب کزنوں نے تو پروگرام بنا رکھا ہے کہ نومی بھائی کی مہندی کا ایک فنکشن ہم دوستوں نے بھی کرنا ہے۔ خوب ہلہ گلا کریں گے۔ رئیس خان کے گروپ کو مٹکا ڈانس کے لیے کہہ دیا ہے رضی بھائی نے اور ہوجمالو پہ تو ہم

سب مل کر رقص کریں گے۔ھو جمالو......"

اس نے ایک طرف جھک کر چٹکی بجائی، سیدھا ہوا اور اب وہ دائرے میں گھومتے ہوئے ھو جمالو پر رقص کر رہا تھا۔ جب وہ گاتے ہوئے ھو جمالو کہتا تو ثمینہ بھی اس کی آواز کے ساتھ آواز ملاتی۔

"ھو جمالو......"

اختر بانو مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اس روایتی رقص میں مرکزی گلوکار رقص کرتے ہوئے جمالو کی بہادری کے متعلق چند بول گانے کے بعد جب وہ ھو جمالو کا نعرہ لگاتا تو اس کے اردگرد دائرے کی شکل میں رقص کرتے ہوئے فنکار ھو جمالو کی آواز بلند کرتے تھے تو سماں بندھ جاتا لیکن اس وقت اکیلا شایان لاؤنج کے وسط میں دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے رقص کر رہا تھا۔ جب وہ دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے ھو جمالو کہتا تو ثمینہ جو صوفے پر بیٹھے بیٹھے تالیاں بجا رہی تھی ھو جمالو کا نعرہ لگاتی تو سماں سا ہی بندھ جاتا۔ اور اختر بانو دل ہی دل میں آنے والی خوشی کو نظر نہ لگنے کی دعا پڑھتی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" تب ہی ثمرہ اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئیں اور شایان نے ھو جمالو کی تان لگاتے ہوئے ثمرہ کا بازو پکڑ کر گویا اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا شایان......" ثمرہ کا موڈ خراب ہوا تھا۔ "اور یہ تم کس خوشی میں دھمال ڈال رہے ہو؟"

"اپنے بھائی کی شادی کی خوشی میں۔ ویسے حد ہوگئی امی ڈیئر، وہ کیا کہا تھا بڑی امی آپ کے میر یا جانے کس نے......

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے، گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے"

وہ ثمرہ کا ہاتھ چھوڑ کر دھپ سے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور اختر بانو کی طرف دیکھا۔

"ویسے بڑی امی! اب کل سے ڈھولکی رکھوا دیں گھر میں۔ پتا تو چلے کہ اس گھر کے بڑے بیٹے کی

شادی ہونے والی ہے۔"

اب بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ثمرہ جل کر راکھ ہو گئی۔

"اللہ کرے تمہاری قبر میں کیڑے پڑیں ماروی۔ چار چار روٹیاں ڈکار جاتی تھی اور ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اس اختر بانو کا سانس روک دیتی۔"

"ہاں بھابھی! شانی صحیح کہہ رہا ہے۔ ڈھولکی رکھوائیں کوئی رونق شونق ہو۔" ثمینہ نے اس کی تائید کی۔

"اور اس کو دیکھو ثمینہ کو، کیسے آج کل اختر بانو کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہے جیسے جادو کر دیا ہو اس نے اس پر بھی۔" ثمرہ نے دانت پیسے۔

"ویسے لاہور والے کب آئیں گے؟" شایان نے پیشانی پر جھک آنے والے بالوں کو پیچھے کیا۔

"بارات سے ایک دو روز پہلے آئیں شاید سب لیکن میں نے ابا جان سے کہا ہے کہ زمل کو پہلے ہی بھیج دیں۔ ایسے موقعوں پر بیٹی کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ زمل تو نہیں آنا چاہ رہی تھی اتنا پہلے لیکن میں نے منا ہی لیا۔ امان نے آنا ہے دو روز تک ویک اینڈ پر ساتھ ہی لیتا آئے گا اسے بھی۔ ابھی صرف وہ دو تین روز کے لیے ہی آ رہا ہے ان دنوں میں ہی تم شاپنگ کا پروگرام بنا لینا۔ اپنی اسٹڈی کی وجہ سے وہ شادی سے کچھ دن پہلے ہی آئے گا۔ البتہ زمل آٹھ دس دن رہے گی۔" اختر بانو نے تفصیل سے بتایا۔

"گڈ...... زمل آ گئی تو اب آپ کو مفت کے مشورے مل جائیں گے۔"

شایان کا انداز نارمل تھا۔ وہ جو زمل کو اسیر کرنے کا جنون کچھ دن رہا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

"ثمرہ آپا! بیٹھ جائیں نا آپ بھی، کس طرح کے ڈریسز لیں گی آپ۔ میں تو بھئی مہندی کے فنکشن کے لیے غرارہ سوٹ بنواؤں گی۔ کراچی میں دیکھا تھا آپا کی نند کی شادی میں سب نے مہندی پر غرارہ سوٹ پہنے تھے۔" ثمینہ نے اسے ابھی تک کھڑے دیکھ کر کہا۔

"نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا تھا، بھاگی کو چائے کا کہنے جا رہی تھی۔ تم اختر بانو کے ساتھ بناؤ شاپنگ وغیرہ کا پروگرام۔" وہ لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

شایان اس کا روکھا لہجہ محسوس کر کے اس کے پیچھے ہی لاؤنج سے باہر نکلا۔

''اگر زیادہ درد ہو رہا ہے تو ڈاکٹر کی طرف چلیں۔''

ثمرہ دل ہی دل میں اس کی فکر پر فدا ہوئی لیکن لہجہ روکھا ہی رکھا۔

''نہیں، رہنے دو۔ چائے کے ساتھ سر درد کی گولی لوں گی تو خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم جاؤ اپنی بڑی امی کو خوش کرو، ناچ ناچ کر۔''

''نومی بھائی صرف بڑی امی کے بیٹے تو نہیں ہیں۔ میرے بابا جان کے بیٹے اور میرے بھائی بھی تو ہیں۔'' سنجیدگی سے کہتے کہتے وہ یکدم شوخ ہوا۔

''ویسے اگر آپ کو جیلسی ہو رہی ہے تو میری شادی بھی ساتھ ہی کر دیں۔ بے شک بھائیوں میں میرا نمبر تیسرا ہے لیکن آپ کا تو بڑا اور اکلوتا سپوت ہوں۔''

ثمرہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آئیڈیا برا نہیں لیکن نہ تمہارے بابا جان مانیں گے اور نہ ہی آپا...... کیونکہ گل رعنا ابھی پڑھنا چاہتی ہے۔ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔''

''نہ......'' شایان نے ایک انگلی اٹھائی۔

''شادی کی مجھے بھی کوئی جلدی نہیں، ابھی زندگی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تعلیم بی اے ہی کافی ہے۔ خالہ کو بتا دیجیے گا۔''

''ہیں...... ابھی تو شادی کا مشورہ دے رہے تھے اور ابھی زندگی انجوائے کرنے کا کہہ رہے ہو۔'' ثمرہ حیران ہوئی۔

''وہ تو آپ کی خوشی کے لیے کہہ رہا تھا ڈیئر مدر۔'' وہ یوں ہی مختلف القابات سے اسے بلاتا رہتا تھا۔

''آپ کا موڈ خراب ہو تو پھر میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔ تو آپ بھی خوش ہو کر ثمینہ چچی اور بڑی امی کے ساتھ میری شادی کی پلاننگ کریں۔ بھلے شادی نہ کریں ابھی۔'' اس نے بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

''بدتمیز۔'' ثمرہ نے اس کے بازو پر مکا مارا۔

وہ اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شایان کی شادی کا ذکر چھیڑ کر وہ سب کا دھیان نعمان اور اختر بانو کی طرف سے ہٹا سکتی تھی۔

''اوکے سوئیٹ ہارٹ! میں ذرا ڈیرے پر جا رہا ہوں بابا جان کے دوستوں نے آنا ہے اور بابا جان ملوانا چاہتے ہیں ان سے انہوں نے کہا تھا کچھ دیر تک آ جانا۔''

''تمہیں کیوں اپنے دوستوں سے ملوانا چاہتے ہیں؟''

اگرچہ ثوبان شاہ کے اکثر ملنے جلنے والے اور دوستوں سے کبھی کبھار بچوں کی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی لیکن یہ بطور خاص دوستوں سے ملوانا۔ ثمرہ چونکی تو وہ بے اختیار ہنسا۔

''کیا خبر دادا جان کی طرح بابا جان نے بھی اپنے کسی دوست کی بیٹی کو میرے لیے پسند کر رکھا ہو۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ثمرہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''تو......؟'' شایان نے معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بہتر ہے کہ آپ باقاعدہ میری منگنی اناؤنس کر دیں گل رعنا کے ساتھ...... آپ کے حسین و جمیل بیٹے پر ہر ایک کی نظر ہے۔''

اس نے شرٹ کے کالر کو دو انگلیوں سے پکڑ کر ذرا سی گردن اکڑائی اور پھر مسکراتا ہوا صحن کی طرف بڑھ گیا۔ ثمرہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑی سوچتی رہی اور پھر جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے کہ نعمان کی شادی شروع ہونے سے پہلے وہ بھی شایان کی منگنی کا باقاعدہ فنکشن کر دیں، بھاگی کو چائے کا کہہ کر وہ واپس لاؤنج میں آئی تو ثمینہ شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھی اور اختر بانو باہر آ رہی تھیں۔

''کہاں جا رہی ہو اختر بانو؟'' لہجہ خوش گوار تھا۔

''ذرا نوراں سے پوچھنے جا رہی ہوں کہ اگر بخشو ڈیرے سے آ گیا ہے تو پوچھے کہ مہمان آ گئے ہیں یا نہیں اور یہ کہ کھانا کتنے بجے بھجوانا ہے۔''

چائے وغیرہ کا انتظام نظام دین وہاں ڈیرے پر ہی کر دیتا تھا اور ثمرہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور سوچا کہ پہلے ثوبان شاہ سے بات کر کے سب کو بتائے گی۔

''تو بھاگی یا سنہری سے کہہ دیں، وہ پوچھ آتی ہیں۔'' وہ اس طرح کی ہمدردی جتاتی تو نہیں تھی، لیکن غیر ارادی طور پر کہہ گئی۔

''ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے تو کچھ دیر دھوپ میں بھی بیٹھوں گی۔ آپ بھی آ جائیں۔ ثمینہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی آ رہی ہے دھوپ سینکنے۔''

ثمرہ سر ہلا کر چلی گئی تو اختر بانو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر صحن میں آ گئیں۔

حویلی کی تعمیر کچھ اس طرح تھی کہ وسیع برآمدہ صحن سے کچھ اونچا تھا تین سیڑھیاں اتر کر کشادہ صحن تھا جس میں دیواروں کے ساتھ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ یہ اندرونی صحن کہلاتا تھا یہاں سے دروازہ بیرونی صحن میں کھلتا تھا جو اس سے بھی کشادہ تھا۔ اور یہاں دیواروں کے ساتھ درخت تھے۔ اختر بانو صحن میں موجود سرخ پایوں والی چارپائی پر جا کر بیٹھی ہی تھیں کہ صحن کا دروازہ کھلا اور نوراں اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سر جھکائے ہولے ہولے چلتی ہوئی منیرا تھی۔ نوراں نے اختر بانو کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اور منیرا سیدھی اس کے پاس آئی تھیں اور سلام کر کے بیٹھ گئی تھیں۔

''تم آ گئی ہو منیرا...... کچھ دن اور آرام کر لیتیں۔''

اختر بانو نے دیکھا اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے اور چہرہ مٹی کے ہم رنگ ہو رہا تھا۔

''اور کتنے دن آرام کرتی بڑی بی بی۔ ہم غریب عورتیں تو ساتویں دن کھیتوں میں کام کرنے چل پڑتی ہیں۔ اسے تو ڈیڑھ مہینے سے زیادہ ہو گیا چارپائی پر لیٹ کر آرام کرتے۔'' نوراں نے بے زاری سے کہا۔

اختر بانو نے تاسف سے منیرا کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''یہ صرف کمزور اور بیمار نہیں، دکھی بھی تو ہے نوراں۔ اتنی تکلیف اٹھا کر جب عورت بچے کو جنم دیتی ہے تو اس کی ساری تکلیف اس وقت ختم ہو جاتی ہے۔ جب بچہ اس کی گود میں مسکراتا ہے لیکن اس بے چاری کی تو گود ہی خالی ہو گئی۔ پورے نو ماہ اس نے آنے والے بچے کے متعلق جانے کتنے خواب دیکھے ہوں گے لیکن اللہ کی مرضی بچہ دس دن کی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔''

اندر کہیں کسی پرانے غم سے ٹیس سی اٹھی تھی۔

''چند دن اور آرام کرنے دو اسے۔ اچھی خوراک دو۔ دودھ، یخنی...... جاتے ہوئے مجھ سے کچھ رقم لے جانا۔ فروٹ وغیرہ بھی بخشو سے کہہ کر منگوا لینا۔''

''آپ کی بات ٹھیک ہے بی بی جی۔ بچہ گود میں ہو تو ساری تکلیف بھول جاتی ہے پر اپنے نصیب۔ پہلوٹھی کا بچہ اور وہ بھی اتنی تھوڑی سی عمر لے کر آیا، مجھے اور بخشو کو بھی کچھ کم دکھ نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی۔ پر یہ تو جیسے اللہ سے ہی جھگڑا لگا کر بیٹھ گئی ہے۔ خوراک بالکل چڑیا جیسی رہ گئی ہے۔ وہ بھی منتیں کر کر کے کھلاؤ تو کھاتی ہے۔ ماں اس کی ڈھیروں میوے، کھوپرے بادام ڈال کر پنجیری اور حلوے بنا کر لائی ہے لیکن سب ایسے کا ایسا ہی پڑا ہے۔ آپ سمجھائیں اسے بی بی کھائے پیے گی تو تن میں طاقت پڑے گی نا۔'' نوراں کو بھی موقع ملا تھا دل کی بات کہنے کا۔

''منیرا! اللہ کی رضا پر راضی رہنا سیکھو۔ اللہ یقیناً بہترین نعم البدل عطا فرمائے گا۔'' اختر بانو نے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کو افسوس سے دیکھا۔

''ایسا نہیں ہے بی بی! میں اللہ کی رضا میں راضی ہوں۔ اس نے دے کر لے لیا۔ اس کی مصلحت ہوگی کوئی۔ بس میرا دل ہی نہیں چاہتا نہ اٹھنے بیٹھنے کو، نہ کچھ کھانے پینے اور نہ کوئی کام کرنے کو۔ دل ہی مر گیا ہے جیسے۔'' منیرا کے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

''صبر کرو منیرا! اس طرح یوں دل چھوٹا نہ کرو، ابھی عمر پڑی ہے تمہاری۔ اللہ سے دعا کیا کرو۔'' اختر بانو کے لہجے میں نرمی تھی۔

''اس چری کو صرف اولاد کا دکھ نہیں ہے بی بی جی۔ میکے کے دکھوں کی گٹھری بھی ساتھ باندھ کر لائی تھی۔ اسے سمجھائیں بی بی اب میکے کی فکریں چھوڑ دے۔ اپنی فکر کرے۔ اپنے گھر کا سوچے۔ بخشو بڑا اتھرا سا ہے۔ زنانی بیمار اور زندگی سے بے زار ہو تو مرد کا دل جلدی بھر جاتا ہے۔ وہ کب تک اس کے ناز نخرے اٹھائے گا۔ مرد کی تو عادت ہے بی بی۔ خود محبوبہ بنا رہتا ہے۔ من سے اس کا بھی جی چاہتا ہے کہ اس کی عورت اس کے ناز نخرے اٹھائے۔ اس کی خاطر داریاں کرے۔ اس کے آگے پیچھے پھرے۔

وہ تب ہی خوش ہو کر بیوی کی ناز برداریاں کرتا ہے اور اس کے لیے آسمان کے تارے توڑنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے لیکن جب زنانی یوں منجھی (چارپائی) پر زندگی سے بے زار پڑی ہو تو اس نے بھی آخر ایک دن بے زار ہونا ہی ہے نا۔''

یہ سیدھی سادی اور دیہاتی عورتیں بھی کبھی کبھی کتنی گہری اور سچی باتیں کرتی تھیں۔ اختر بانو نے حیرت سے نوراں کو دیکھا۔

''تمہاری بات صحیح ہے نوراں پر میکہ بھی کبھی بھولتا ہے۔ میکے کے تو اینٹ پتھر بھی نہیں بھولتے۔ جس زمین پر درخت اور پودے اگتے ہیں۔ ان پودوں کو کہیں اور اکھیڑ کر لگا دو یا کاٹ کر پھینک دو تب بھی اس زمین کے اندر ان کی کچھ جڑیں رہ ہی جاتی ہیں تو عورت کیسے اپنے میکے کے دکھ، سکھ، غم، خوشیاں بھول جائے۔ سچ بتاؤ کیا تمہیں میکے کی یاد نہیں آتی نوراں۔''

''کیوں نہیں آتی۔ چالیس سال ہو گئے میکے کی گلیاں چھوڑے، پر سب یاد ہے۔ ایک ایک کونا ایک ایک چیز۔ ماں باپ مر گئے ہیں۔ بھائیوں کو اللہ حیاتی دے، پر جب ماں باپ کی یاد آتی ہے تو دل میں ٹیسیں اٹھتی ہیں۔'' نوراں کی آواز بھرا گئی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''کتنا کام رہتا ہے؟'' اختر بانو نے پوچھا۔

''بس جی، احاطے کی صفائی کرنی ہے۔ صحن تو دونوں ہو گئے۔''

''اگر بخشو باہر آ گیا ہے تو اس سے پوچھنا شاہ جی کے مہمان آ گئے ہیں کیا؟''

اختر بانو نوراں سے بات کر کے منیرا کی طرف دیکھنے لگی جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''منیرا! تمہارے میکے والوں کے کیا مسئلے ہیں؟ مجھے بتاؤ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔''

''مدد تو اللہ ہی کر سکتا ہے بی بی جی۔'' منیرا کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

''مدد تو اللہ ہی کرتا ہے منیرا پر وسیلہ تو انسانوں کو ہی بناتا ہے۔'' اختر بانو کے لہجے میں نرمی تھی۔

''جی......'' منیرا نے سر ہلایا۔ ''ابا کو سال بھر پہلے فالج ہو گیا تھا۔ چارپائی پر پڑا ہے۔ آدھا دھڑ تو بے کار ہی ہو گیا ہے۔ اتنا تگڑا تھا میرا ابا۔ جس کی کلائی پکڑ لیتا وہ چھڑا نہ سکتا تھا۔ اب اس کی بے بسی

دیکھی نہیں جاتی۔بات بھی مشکل سے کر پاتا ہے۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں منیرا؟'' اختر بانو کو ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''ڈاکٹروں نے کیا کہنا ہے جی، بھافضل نے بہت ڈاکٹروں کو دکھایا۔سب کہتے ہیں وقت لگے گا۔ورزش کرواؤ۔بھافضل خود ہی ورزش بھی کرواتا ہے۔مالش بھی صبح و شام کرتا ہے۔پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔پڑے بھی کیسے بی بی جی، اماں کہتی ہے۔''اللہ کی پکڑ بڑی ڈاھڈی ہوتی ہے۔اللہ بندے کو ڈھیل دیتا رہتا ہے پر جب پکڑ لے تو......''

آنسو پلکیں بھگو گئے تھے۔

''ایسا کیا کیا تھا تمہارے ابا نے؟'' اختر بانو کو یاد آیا کہ ایک بار منیرا نے پہلے بھی ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی بات کی تھی۔

''میرے ابا نے بڑا ظلم کمایا بی جی۔پہلے ہم چک مراد شاہ میں رہتے تھے۔اپنا گھر تھا، زمین تھی۔دو بھائی مجھ سے بڑے تھے۔''منیرا کے دل پر بہت بوجھ تھا۔اسے لگتا تھا جیسے اس بوجھ سے کسی روز اس کا دل پھٹ جائے گا۔

اختر بانو ہمدرد اور مہربان تھیں، پڑھی لکھی اور سمجھ دار تھیں۔ان سے سب کچھ کہہ دینے سے شاید دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔شاید وہ کوئی مشورہ دے سکیں۔سو وہ ہولے ہولے بتانے لگی۔

''زیب النساء خالہ اماں کی بہت گوڑھی اور پکی سہیلی تھی۔مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ اماں کے ہاتھ میں دیا تھا اور بہت سارے وعدے لیے تھے اماں سے۔اور اماں نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اپنے فضل کی طرح ہی شہزادے کا خیال رکھے گی۔جب زیب خالہ مریں تو میں پانچ چھ سال کی تھی اور بھافضل اور شہزادہ دس سال کے تھے۔اماں خالہ زیبن کے بعد شہزادے کو گھر لے آئی تھیں۔اماں اس سے بہت پیار کرتی تھیں اور اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔پر ابا کے دل میں اس کے پیسے اور زیور کا لالچ آ گیا تھا جو زیبن خالہ نے اماں کے پاس اپنے بیٹے کے لیے رکھوایا تھا۔

اماں نے مجھے بتایا تھا کہ ابا ایک روز شہزادے کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گیا یہ کہہ کر کہ اس

کے باپ کا پتا چل گیا ہے۔ میراثنگی استانی جی کے بھانجے اقبال سے ملا ہے وہ باہر ملک سے واپس آ گیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ شہزادے کا باپ زندہ ہے۔ تو بس میں اسے لے کر اس کے پاس جا رہا ہوں۔ پہلے اقبال سے ملوں گا پھر اس کے باپ کے پاس جائیں گے۔ اماں نے کہا وہ بھی ساتھ جائے گی شہزادے کی امانت اس کے باپ کے حوالے کرے گی۔ زیب النساء کے متعلق سب بتائے گی اسے لیکن ابا نے اسے ٹال دیا کہ پہلے وہ خود شہزادے کے ساتھ جا کر اس شخص سے مل کر تصدیق کر لے پھر تم چلی جانا میرے ساتھ اس کی امانت دینے۔

اور اماں کہتی ہیں کہ انہیں ابا کی بات صحیح لگی۔ انہیں کیا خبر تھی تب کہ ابا کے دل میں کوئی کھوٹ ہے۔ اور ابا تین دن بعد واپس آئے تو شہزادہ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اماں خوش ہو گئی تھیں کہ شکر اللہ کا شہزادہ اپنے خاندان میں پہنچ گیا۔"

"اس کا گھر کیسا تھا؟ بڑے اور امیر لوگ ہوں گے۔ پوچھا تھا اس سے کہ اتنے سال وہ کیوں نہیں آیا؟" اماں پوچھ رہی تھیں لیکن ابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"پتا نہیں زیتون! مجھے تو شہزادے کا باپ نہیں ملا، نہ ہی اقبال سے ملاقات ہوئی۔ وہ ابھی باہر سے آیا ہی نہیں۔"

"تو پھر شہزادہ کہاں ہے صفدر! اسے کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

"وہ کھو گیا۔ میں اسے ایک جگہ کھڑا کر کے اس کے لیے کھوئے والی قلفی لینے گیا تھا، جو دوسری سڑک پر مل رہی تھی، مڑ کر آیا تو وہ کہیں نہیں تھا۔ بہت ڈھونڈا...... ہر ایک سے پوچھا لیکن وہ نہیں ملا۔ تین دن تک ڈھونڈتا رہا۔"

"اماں روتی رہیں کہ وہ مر کر زیب النساء سے کیا کہیں گی کہ وہ اس کے شہزادے کا خیال نہ رکھ سکیں۔ بھا فضل بھی بہت رویا تھا۔ ابا اماں کو تسلی دیتا رہا کہ وہاں تھانے میں رپورٹ لکھوا آیا ہے مل گیا تو تھانے والے ہمیں اطلاع دے دیں گے بس دعا کیا کر کہ کسی خرکار یا پیشہ ور بھکاری کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ اماں دعا کرتی رہیں شہزادہ نہیں ملا۔

تھانے سے کوئی اطلاع نہیں آئی اور پھر ابا نے اچانک ہی چک مراد چھوڑنے کا ارادہ کرلیا۔ زمین اور گھر بیچ دیا اور ہم دوسرے گاؤں آ گئے۔ اماں نہیں آنا چاہتی تھیں لیکن ابا نے کہا ٹھیک ہے وہ بچوں اور دادی کو لے کر چلے جائیں گے۔ اماں مجبور ہو گئیں۔ انہیں ابا پر شک سا ہونے لگا جب ابا نے دوسرے گاؤں میں کافی ساری زمین اور اچھا سا گھر لینے کے لیے شہزادے کے پیسے خرچ کر دیے اور تھوڑا سا زیور بھی بیچ دیا۔ اماں منع کرتی رہیں۔

''اب وہ نہیں آئے گا۔''

ابا کے لبوں سے نکلا تو اماں کہتی ہیں، وہ ڈر گئیں۔''

''تم نے اسے مار تو نہیں دیا صفدر!''

''جھلی ہو گئی ہے میں بھلا اس معصوم بچے کو کیوں قتل کروں گا۔''

''ابا نے قسم کھائی تب اماں کو یقین ہو گیا کہ ضرور ابا نے اسے بھکاریوں کے کسی گروہ کے پاس بیچ دیا ہو گا اور انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بھکاری بنا دیا ہو گا۔ اماں روتی رہتی تھیں کہ قیامت میں وہ زیب النساء خالہ کا کیسے سامنا کریں گی۔ پر ابا کو پروا نہیں تھی۔ انہوں نے دوسرے گاؤں میں بھی اچھی خاصی زمین لے لی اور بہت اچھا سا گھر بھی۔ بھا فضل کو اور مجھے بھی اسکول داخل کروا دیا۔ اماں کے منع کرنے کے باوجود ابا نے سارا زیور بیچ دیا۔

اماں سمجھاتی رہیں کہ یتیم کا مال کھانے والے کو ڈاھڈی (بہت) مار پڑتی ہے پر ابا کو پروا نہیں تھی۔ اس نے تو ٹریکٹر بھی لے لیا تھا۔

پھر ایک روز رات کو افضل بھرا ابا کے ساتھ کھیتوں میں پانی لگانے گئے اور افضل کو سانپ نے ڈس لیا۔ وہ منٹوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔ دادی کی تو جان تھی افضل بھرا میں، وہ دو ماہ بعد ہی ایک رات وہ سوئیں تو صبح اٹھی ہی نہیں۔'' منیرا کی پلکوں پر اٹکے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

''پھر اب سال بھر پہلے ابا کو فالج ہو گیا۔ اماں کہتی ہے یہ سب اللہ کی پکڑ ہے۔ تیرے ابا نے ظلم کیا ہے، اسے اس کی سزا ملی ہے۔ منی تو اس کے لیے دعا کیا کر۔ اماں ساری رات سجدے میں گر کر اللہ سے

معافی مانگتی رہتی ہے پر اللہ بھی تو تب تک معاف نہیں کرے گا جب تک اس کا بندہ معاف نہ کرے۔

پتا نہیں شہزادہ کبھی چک مراد شاہ آیا ہو۔ اماں کہتی ہیں وہ بہت چھوٹا بچہ تو نہیں تھا۔ اسے اپنے علاقے کا نام اور اپنے گھر کا اتا پتا تھا۔ لاری پر بیٹھ کر کیا خبر کبھی گاؤں آیا ہو۔ لیکن ابا نے تو چک مراد شاہ سے کبھی رابطہ نہیں رکھا نہ وہاں کسی کو بتایا کہ کہاں جا رہے ہیں، شاید ابا کو ڈر ہو کہ کبھی شہزادہ وہاں آنہ جائے۔ اماں کو بھی کبھی جانے نہ دیا۔ اگر گئیں تو پھر مڑ کر نہ آنا۔

اور اب ابا چارپائی پر بے بس پڑا ہے، بول بھی نہیں سکتا۔ اماں اب بھی پوچھتی رہتی ہیں کہ شہزادے کو کہاں چھوڑا، لیکن اب......"

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"منیرا!" اختر بانو تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مت رو۔ اللہ سے دعا کیا کر۔ اللہ تمہارے ابا کو معاف کر دے۔"

"اماں کہتی ہیں جو کسی کے ساتھ برا کرتا ہے، اس کے ساتھ برا ہی ہوتا ہے۔ میری پانچویں جماعت کی استانی آپا زرینہ بتاتی تھیں ہمیں مکافات عمل کے بارے میں، لیکن تب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب آئی ہے کہ یہ مکافات عمل کیا ہوتا ہے۔"

منیرا نے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تا کہ باہر جا کر نوراں کی کچھ مدد کر سکے تب ہی اس کی نظر ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔

"یہ ماسی نے بھی صحن کا دروازہ صحیح طرح سے بند نہیں کیا۔ پتا بھی ہے شاہ جی خفا ہوتے ہیں یوں دروازہ کھلا چھوڑنے پر۔"

"ہاں بند کر دو۔" اختر بانو اس کی ساری بات سن کر اداس تھیں۔

یہ منیرا کا ایسا دکھ تھا جس کو وہ کم نہیں کر سکتی تھیں۔ منیرا صحن کے دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رکی۔ اس کی نظر بیرونی صحن میں سے گزرتے چراغ سائیں پر پڑی۔ جو سر جھکائے شاید احاطے کی طرف جا رہا تھا۔

''یہ مکافاتِ عمل کیا صرف غریبوں کے لیے ہوتا ہے بی بی جی؟'' وہ رخ موڑ کر اختر بانو کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اللہ کے نزدیک امیر غریب سب برابر ہوتے ہیں منیرا۔'' اختر بانو اس کی بات پر حیران ہوئی تھیں۔

''مکافاتِ عمل تو سب کے لیے ہے۔ سب کو ہی اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔''

''پھر جس نے چراغ سائیں کی بیٹی کے ساتھ ظلم کیا، اس کو سزا کیوں نہیں ملی؟''

''کیا خبر اس معصوم پر کس نے ظلم ڈھایا منیرا اور ہو سکتا ہے اسے سزا مل بھی چکی ہو۔ کبھی کبھی اللہ ظالم کی رسی دراز بھی کر دیتا ہے۔ اپنے کیے کی سزا تو ملتی ہی ہے۔ کبھی اس دنیا میں تو کبھی اس دنیا میں۔''

منیرا نے سر ہلایا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ رخ موڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اختر بانو اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''حد سے زیادہ حساس ہے یہ منیرا بھی۔ ورنہ کون اس طرح سوچتا ہے۔ لوگ کیا کچھ نہیں کرتے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ اللہ منیرا کے ابا کو معاف کرے۔ پھر سمجھاؤں گی منیرا کو کسی روز کہ اتنی حساسیت اچھی نہیں ہوتی۔ اتنی حساسیت کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صبر، حوصلہ، شکر گزاری اور دعا اپنی زندگی میں شامل کر لے تو زندگی آسان ہو جائے گی۔ زندگی تو گزارنی ہی ہوتی ہے چاہے روتے دھوتے گزارو چاہے صبر اور شکر کے ساتھ۔''

اس نے بھی تو زندگی گزاری تھی صبر اور شکر کے ساتھ۔ کئی مناظر آنکھوں کے سامنے سے آ کر گزرنے لگے۔ وہ کیسے دروازے کے پیچھے سے چھپ چھپ کر نعمان اور ریحان کو دادی اور پھپھو کے ساتھ لاڈ کرتے حسرت سے دیکھتی تھی اور کبھی جو وہ ہمت کر کے ان کے قریب جاتی تو دادی کسی نہ کسی بہانے انہیں وہاں سے ہٹا دیتی تھیں اور وہ بھی انجان نظروں سے اسے دیکھتے چلے جاتے تھے۔

اب وہ ہی نعمان اور ریحان تھے جو صبح و شام فون کر کے اس کی خیریت پوچھتے اور اگر کبھی جو وہ فون نہ اٹھا پاتی تو بے چین ہو کر بار بار فون کرتے۔ کبھی ثوبان شاہ کو کال کرتے کبھی زمان شاہ سے اس کی خیریت پوچھتے۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی چمکی۔ وقت بدل گیا تھا مشکل وقت گزر رہی گیا تھا۔ اور اب تو

شایان بھی جو کبھی اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا، گھنٹوں گپیں لگاتا تھا۔نم آنکھوں کے ساتھ مسکراہٹ بھی لبوں پر آٹھہری تھی۔تب ہی ثمینہ نے برآمدے میں آکر آواز دی تو وہ چونکیں۔

''بھابھی! ثوبان بھائی کا فون ہے۔''

''یااللہ خیر!'' وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئیں اور تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھیں۔

''خیر ہی ہے بھابھی! ثوبان بھائی نے کھانا بھجوانے سے منع کیا ہے شاید ان کے مہمان واپس جا رہے ہیں۔'' ثمینہ نے ریسیور اسے پکڑایا۔

''یہ لیں بات کرلیں۔''

''جی!'' اختر بانو نے ریسیور لے لیا۔اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''ذرا ذرا سی بات پر گھبرایا نہ کرو اختر بانو۔'' دوسری طرف ثوبان شاہ نے اس کی گھبراہٹ محسوس کرلی تھی۔''میں نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اچانک ہی ایک دوسرے دوست کے والد کے انتقال کی خبر ملی ہے تو ہم سب دوست ادھر ہی جارہے ہیں۔اگر جنازہ جلدی ہوگیا تو رات کو لوٹ آؤں گا۔دیر ہوگئی تو پھر صبح......احتیاطاً ایک جوڑا کپڑے اور نائٹ ڈریس وغیرہ بخشو کے ساتھ بیگ میں رکھ کر بھجوادو۔''

''رات میں تو سفر مت ہی کیجیے گا۔'' اختر بانو آج بھی رات کے وقت ان کے سفر کرنے سے ڈر جاتی تھیں۔

''اوکے میم!'' دوسری طرف شاید وہ مسکرائے تھے۔''اپنا خیال رکھنا۔''

اللہ حافظ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا تھا لیکن وہ کچھ دیر تک ریسیور یوں ہی ہاتھ میں لیے کھڑی رہیں۔دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہورہی تھیں۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' ان چند الفاظ نے جیسے کئی سالوں کی مسافت سمیٹ دی تھی۔جیسے درمیان میں اتنے بہت سارے سال گزرے ہی نہیں تھے۔

ہمیشہ کہیں جاتے ہوئے ثوبان شاہ اسے اپنا خیال رکھنے کا کہتے۔آج برسوں بعد ان کی سماعت

نے اس جملے کو سنا تھا۔ کتنی اپنائیت اور فکر تھی اس ایک چھوٹے سے جملے میں۔ اپنا پن، محبت اور خلوص......

ریسیور کریڈل پر ڈال کر اختر بانو نے چھوٹا سفری بیگ تیار کر کے سنہری کے ہاتھ باہر بخشو کو بھجوایا اور خود لاؤنج میں آ گئیں، جہاں ثمینہ کچھ کپڑے صوفے پر رکھے بیٹھی تھی۔

"بھابھی! یہ دیکھیں چاندی پتی کے سوٹ ہیں، ایک بار بابا جان پشاور گئے تھے تو اماں جان نے میرے جہیز کے لیے لنڈی کوتل سے منگوائے تھے۔ کسی ایک فنکشن کے لیے یہ نہ بنوالوں۔ بلکہ ثمرہ آپا نومی کے مہندی کے فنکشن سے پہلے شانی کی منگنی کا پروگرام بنا رہی ہیں تو منگنی کے فنکشن میں یہ سلوا لیتی ہوں۔"

"ہاں یہ دونوں کلر ہی تم پر خوب سوٹ کریں گے۔" ثمینہ کا رنگ بہت صاف اور گورا چٹا تھا۔

"یہ بلو والا سلوا لینا۔" اختر بانو نے ہاتھوں میں لے کر سوٹ کی نرماہٹ کو محسوس کیا۔

"میرے پاس بھی ہیں شاید ایک دو ہوں۔ اس زمانے میں ہمارے لاہور میں پٹھان عورتیں گھر گھر آ کر کپڑا بیچتی تھیں۔ اماں جان نے بھی لیے تھے سونا پتی اور چاندی پتی کے سوٹ۔"

"تو بس پھر شانی کی منگنی پر آپ بھی وہی سلوایئے گا۔"

"بہت گہرے رنگوں کے تھے شاید میرون اور فیروزی رنگ کے، اب وہ رنگ پہنتی میں اچھی لگوں گی۔ ویسے اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ بھاگی سے کہہ کر جہیز کا بکس نکلواتی ہوں اسٹور سے۔ اپنی بہو کے لیے نکالوں گی دو تین یونیک سے سوٹ۔" اختر بانو کو بھی اپنے جہیز کے کچھ ان سلے کپڑے یاد آئے تھے۔

"واہ! کیوں نہیں اچھی لگیں گی۔ دولہا کی اماں ہیں آخر۔ میں تو اپنے بیٹے کی شادی پر اپنے جہیز کا لہنگا سوٹ پہنوں گی، وہ بھی سرخ رنگ کا۔"

ثمینہ کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ نعمان کی شادی کو لے کر بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔ مہران شاہ کی شادی کے بعد گھر میں اس طرح کا پہلا فنکشن ہونے جا رہا تھا۔ اختر بانو مسکرا دیں۔ انہیں ثمینہ کا نعمان کی شادی کے حوالے سے ڈسکس کرنا اور تیاری کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

"اور ہاں......" سوٹ تہہ کرتے کرتے ثمینہ کو خیال آیا۔ "وہ آپ کی بھتیجی، کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا، وہ کب آ رہی ہے لاہور سے؟"

''زمل......ایک دو روز تک امان کے ساتھ ہی آئے گی۔ میں نے تو کہا ہے شادی تک اب ادھر ہی رہے لیکن وہ نہیں مان رہی۔ دراصل شاہ زیب بھائی اور ابا جان کی وجہ سے وہ تو آنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ ابا جان نے بمشکل راضی کیا اسے۔ ہفتہ بھر کے لیے۔'' اختر بانو نے بتایا۔

''تو پھر ہم اس کے آنے کے بعد ہی شاپنگ کے لیے حیدر آباد جائیں گے۔ لاہور میں تو لڑکیاں سنا ہے بڑی فیشن ایبل ہوتی ہیں۔ اپنی زمل کو بھی نئے فیشن کا پتا ہوگا تو بس اس کے مشورے سے ہی اپنی شاپنگ کریں گے۔'' ثمینہ نے فیصلہ کیا۔

''زمل تو مزاجاً بہت سادا سی ہے۔'' اختر بانو جانتی تھیں کہ زمل کو جدید لباس یا فیشن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

''بھلے سادا مزاج ہے پر رہتی تو لاہور شہر میں ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھتی رہی ہے، پتا تو ہوگا آج کل کیا فیشن میں ہے، مشورہ تو دے سکتی ہے۔''

☆......☆......☆

اور ایسا ہی ہوا تھا۔ ثمینہ، صفورا اور اختر بانو زمل کے ساتھ ہی شاپنگ کے لیے حیدر آباد گئی تھیں۔ دلہن کے زیادہ تر جوڑے تو سلطانہ کے ذمے تھے اور وہ ساری خریداری کراچی سے کر رہی تھیں۔ ویسے کا جوڑا بھی دلہن کی پسند سے وہاں سے ہی تیار کروانا تھا۔ سوانہوں نے صرف اپنی ہی شاپنگ کرنی تھی، کچھ حیدر آباد سے کر لی تھی۔ اور کچھ کراچی سے کرنے کا ارادہ تھا۔ زمل کے مشورے سب کو ہی مناسب لگے تھے۔ اختر بانو نے زمل کے لیے بھی اپنی پسند سے دو سوٹ لیے تھے۔ گو اس نے بار بار منع کیا تھا۔

''بھائی کی شادی کے جوڑے تو دینے ہی ہیں نا بھابھی نے۔ بھئی ہم تو مانگ کر سارے نیگ لیں گے۔ اور تم بلاوجہ ہی انکار کر رہی ہو۔'' ثمینہ کو زمل جیسا کہ اختر بانو نے بتایا تھا بہت سادا مزاج لگی تھی۔

لیکن اختر بانو کو اس بار وہ کچھ اداس اور پریشان سی بھی لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک اضطراب اور بے چینی سی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی کچھ بے رنگ اور پھیکی سی لگی تھی۔

ثمرہ اس روز صبح ناشتے کے بعد ہی دوسری حویلی میں چلی گئی تھی کہ وہاں بھائیوں اور

بھابھیوں سے شایان کی منگنی کے متعلق بات کرنی تھی اور مشورہ لینا تھا کہ کب تاریخ رکھی جائے۔اس کا اپنا ارادہ نعمان کی شادی کے فنکشن شروع ہونے سے ایک روز پہلے کرنے کا تھا۔حویلی میں پہلا فنکشن اس کے بیٹے کا ہو۔اس پر وہ دل میں بہت خوش تھی۔ثوبان شاہ یا کسی اور کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔صفورا اور ثمینہ بھی ناشتے کے بعد میکے چلی گئی تھیں۔ثمینہ جاتے جاتے کہہ گئی تھی کہ رات تک ہم واپس آجائیں گے۔نوراں سے ڈھولکی منگوا لیجیے گا۔کل سے ڈھولکی رکھ دینی ہے ہم نے۔بیس دن بعد بیٹے کی شادی ہے اور یہاں کوئی رونق شونق ہی نہیں لگی ابھی تک۔

سو اختر بانو اور زمل ناشتے کے بعد لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ثوبان شاہ اور زمان شاہ بھی ناشتے کے بعد زمینوں کی طرف نکل گئے تھے۔گو ہلکی آواز میں ٹی وی لگا ہوا تھا لیکن اختر بانو دیکھ رہی تھیں کہ زمل کا دھیان ٹی وی کی طرف نہیں ہے۔وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو زمل!'' اختر بانو نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ چونکی۔

''کیا کوئی پریشانی ہے زمل بچے تو مجھے بتاؤ۔بہت اداس اور پریشان لگ رہی ہو جب سے آئی ہو۔''

''نہیں تو پھپھو......'' وہ زبردستی مسکرائی۔''آپ کو پتا ہے نا میں شروع سے ہی کم گو ہوں۔''

''کم گو ہونے اور اداس ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے میری جان۔شاہ رخ وغیرہ کی شادی میں کیسے تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھیں۔مجھے پھپھو نہیں اپنا دوست سمجھو۔کیا زہبی بھائی کے لیے پریشان ہو؟'' اختر بانو کو لگتا تھا کہ کچھ تو ہے۔جس نے زمل کی آنکھوں کی چمک چھین لی ہے۔

''نہیں پھپھو! ابا تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ڈاکٹر ارسلان کہتے ہیں وہ بہت جلد نارمل ہو جائیں گے۔ایک روز تو صبح صبح آکر دادا جان پر ناراض ہونے لگے کہ انہوں نے آپ کو اتنی دور غیروں میں کیوں بیاہ دیا۔'' زمل نے کہا تو اختر بانو اداس ہو گئیں۔

''میرے شہزادوں جیسے بھائی کو جانے کس کی نظر لگ گئی۔''

''آپ دعا کیا کریں پھپھو ان کے لیے۔''

زمل نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اختر بانو کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ کر شاہ زیب کی طرف چلا گیا۔ لیکن کچھ دیر شاہ زیب کے متعلق باتیں کرنے کے بعد اختر بانو کا دھیان پھر اس کی طرف گیا۔

''کہیں زین سے ناراضی تو نہیں چل رہی ان دنوں جو اتنی اداس اور پریشان ہو۔''

''نہیں تو پھپھو......'' اس نے نظریں چرائیں۔

''رات ظفر بھائی سے بات ہوئی تھی میں نے نومی کی شادی کا بتانے کے لیے کال بک کروائی تھی۔ بتا رہے تھے کہ وہ بھی زین اور تمہاری شادی کے لیے فروری میں پاکستان آ رہے ہیں۔''

''ارے کس کی شادی ہو رہی ہے فروری میں؟'' شایان نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہوئے آدھی بات سنی تھی۔

''اپنی زمل اور زین کی۔ نکاح تو تمہیں شاید پتا ہی ہو گئی سال پہلے ہو گیا تھا تب دونوں پڑھ رہے تھے۔''

اختر بانو نے بتایا تو شایان نے بے اختیار خوشی کا اظہار کیا۔

''زبردست یعنی فروری میں پنجاب کا ٹرپ پکا۔ زیادہ عرصہ لاہور میں نہیں رہا لیکن لاہور یاد بہت آتا ہے۔ چلو اب زمل اور زین کی شادی کے بہانے لاہور کا چکر لگ جائے گا۔''

''زمل بڑی ہے تم سے، آپی یا باجی کہا کرو۔'' اختر بانو نے ٹوکا تو وہ ہنس دیا۔

''مجھ سے یہ القاب وغیرہ نہیں لگائے جاتے۔ ماموں کی بیٹیوں کو بھی نام لے کر ہی بلاتا ہوں۔ آپی یا باجی کہنے سے کیا ہو گا۔ ہیں تو ہماری بہن ہی نا۔''

اس نے امان کے بازو پر ہاتھ رکھا جو چند لمحے پہلے ہی لاؤنج میں آیا تھا اور شایان کی بات سن کر اسے سحرش کی لاحقوں سابقوں والی بات یاد آ گئی۔ مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

''اور زمل جی آپ فکر نہ کرنا۔ میں اور امان آپ کو بھائیوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ بھائیوں کی طرح رخصت کریں گے۔''

زمل اس کے خلوص سے متاثر ہوئی۔

''اور بھائیوں والے سارے نیگ بھی زین سے وصول کریں گے۔''

''نیگ تو بہنیں وصول کرتی ہیں بیٹا۔'' اختر بانو بے اختیار ہنسی تھیں۔

''اوہ اچھا۔'' اس نے جھینپ کر سر کھجایا۔

''ویسے یہ بھائیوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہے کچھ۔''

وہ کہہ رہا تھا اور زمل سوچ رہی تھی کہ وہ جو اس نے لاہور میں شایان کے متعلق رائے قائم کی تھی وہ غلط تھی۔ وہ تو بالکل امان جیسا ہی تھا۔ اور سحرش نے کیا بتایا تھا اسے کہ مرتضیٰ بھائی کہتے ہیں شایان بگڑا ہوا امیر زادہ ہے اور وہ زمل کو غلط نظر سے دیکھتا ہے اور یہ کہ شاید وہ اسے پسند کرنے لگا ہے اور اپنی وجاہت اور دولت کے زور پر اسے پھنسانا چاہتا ہے۔

سحرش نے سنا تھا جب مرتضیٰ آزین کو کہہ رہا تھا کہ وہ زمل کو کہے کہ وہ شایان سے زیادہ بے تکلف نہ ہو۔ آخر کیا رشتہ ہے اس کا ہم سے جو ہر ویک اینڈ پر امان کے ساتھ چلا آتا ہے گھر اور دادا جان بھی کچھ نہیں کہتے۔ زین نے تو اس سے کچھ نہیں کہا تھا البتہ سحرش نے ساری بات بتا کر اسے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔

''اور یہ مرتضیٰ بھائی بھی نا...... پورے بی جمالو ہیں۔'' اسے سحرش کی بات یاد آئی تو لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ بکھر گئی۔ خوامخواہ ہی وہ شایان سے بدگمان ہوگئی تھی اور جب جب وہ امان کے ساتھ گھر آتا تو وہ اسے اگنور کرتی تھی۔

''چلو ظفر بھائی سے کہوں گی بہو کے بھائیوں کے ہاتھوں پر بھی کچھ رکھ کر نئی روایت شروع کریں۔'' اختر بانو اب بھی ہنس رہی تھیں۔

''آپ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں بڑی امی۔'' اس سے پہلے کہ اختر بانو کچھ کہتیں، نوراں ڈھولکی لیے لاؤنج میں آئی۔

''یہ لیں بی بی جی ڈھولکی لے آئی ہوں۔'' نوراں نے ڈھولکی نیچے رکھی۔

''واؤ...... یعنی آج سے باقاعدہ شادی شروع۔''

شایان نے جھک کر ڈھولکی پر دو ہاتھ مارے تو امان کو یاد آیا کہ وہ شایان کو بلانے آیا تھا۔

''یار! وہ رضی بھائی کی طرف جانا ہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''میں آ ہی رہا تھا۔ بڑی امی اور زل کو یہاں بیٹھے دیکھ کر رک گیا تھا۔ چلو۔'' شایان نے کہا تو امان نے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''اچھا اماں جان! ہم چلتے ہیں اور ہاں وہ ریحان بھائی نے جو آپ کو سیل فون دیا تھا اسے پاس ہی رکھا کریں۔''

''یاد ہی نہیں رہتا اور پھر سگنل ہی نہیں ملتے۔'' ریحان پچھلی بار جب حویلی آیا تو اختر بانو کے لیے سیل فون لے آیا تھا تاکہ اگر اختر بانو کبھی اپنے کمرے میں یا کچن وغیرہ میں ہوں تو بات کر لیں انہیں فون سننے کے لیے باہر نہ آنا پڑے۔

''بڑی امی! آپ کی ڈھولکی کی محفل میں کیا ہم بھی شریک ہو سکتے ہیں؟'' شایان جاتے جاتے مڑا تھا۔

''آخر ہمارے بھائی کی شادی ہے، ہمیں بھی تو خوشی منانے کا حق ہے۔''

''یہ تو ثمینہ نے منگوائی ہے۔ کہہ رہی تھی سنہری بھاگی اور سوہنی وغیرہ کو بلا کر رات کو ڈھولکی بجا کر رونق لگائے گی۔ جب تمہارے کزنز وغیرہ آجائیں گے تو تم لڑکے مردانے میں الگ سے رونق لگا لینا۔''

ابھی تو یہ گھر کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر ثمینہ پروگرام بنا رہی تھیں۔ اختر بانو شایان کے اس طرح نعمان کی شادی میں دلچسپی لینے پر بہت خوش تھیں۔

''ہم بھی تو گھر کے ہی بندے ہیں بڑی امی! تو طے ہوا کہ میں اور مانی بھی آپ کی ڈھولکی کی محفل میں آئیں گے اور دولہا میاں کو بھی ذرا فون کر کے بتا دیجیے گا۔ دس پندرہ دن پہلے آجائیں۔ عین بارات والے دن نہ تشریف لے آئیں۔''

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔ جب عشاء کے بعد ثمینہ سنہری وغیرہ کو جمع کر کے لاؤنج میں آئی تو وہ بھی امان کو ساتھ لے کر آ گیا تھا۔ پہلے ماسی تاج نے ڈھولکی سنبھالی تھی، پھر ثمینہ نے......

دونوں ہی اچھی ڈھولکی بجاتی تھیں۔ پھر دیر تک سندھی، پنجابی، اردو ہر طرح کے گانے ٹپے سب گائے گئے۔ اماں اور شایان صوفے پر بیٹھے تالیاں بجا کر ان کا ساتھ دیتے رہے۔ پھر ہر رات ہی ثمینہ سب کو لے کر لاؤنج میں کارپٹ پر بیٹھ جاتی۔ ہنسی، مذاق، گانے...... خوب رونق لگ جاتی۔

ثمینہ صفورا کو بھی کھینچ کر لے آئی۔ فطرتاً وہ خوش مزاج اور شوخ تھی۔ زمل کا دل بھی بہل گیا تھا۔ وہ زین کی بے اعتنائی کو وقتی طور پر بھول گئی تھی۔ سب کے ساتھ مل کر ہنستے گاتے اور شادی کی تیاری کرتے پتا ہی نہیں چلا کہ دس دن گزر گئے اور دادا جان کا فون آ گیا کہ وہ زین کو بھیج رہے ہیں اسے لینے کے لیے۔

''ارے اتنی جلدی۔'' اختر بانو افسردہ ہو گئیں۔

''جلدی تو نہیں پھپھو دس دن ہو گئے۔ دو ہفتے بعد پھر سب کے ساتھ تو آنا ہی ہے۔ میرا دل بھی اداس ہو گیا ہے دادا جان اور ابا کے لیے۔ ابھی تو دو دن ہیں نا اور کل کپڑے وغیرہ ٹانک کر رکھ لیں گے اور جو کام بھی رہتا ہے۔ دادا جان نے بتایا تھا زین اتوار کو آئے گا لینے۔''

''کام تو ہو ہی جاتے ہیں زمل! بس تمہارے آنے سے مجھے بیٹی کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تم سے شیئر کرنا، مشورہ کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔'' اختر بانو کو زمل کے آنے سے بڑی تقویت ملی تھی۔ انوکھی سی خوشی۔

سنہری، بھاگی، صفورا کی بیٹی سب ہی اس کے جانے کا سن کر افسردہ ہو گئی تھیں۔ اتنے سے دنوں میں سب سے بے تکلفی ہو گئی تھی اور اس کی وجہ رات کو لاؤنج میں بیٹھ کر اکٹھے ڈھولکی بجانا تھی۔ اس نے انہیں پنجابی گانے خاص طور پر ٹپے سکھائے تھے اور ان سے سندھی شادی کے گیت سنے تھے۔

پچھلی بار جب وہ آئی تو صرف منیرا سے بات چیت ہوئی تھی اس کی لیکن اس بار منیرا سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ اختر بانو نے اسے بتایا تھا کہ بیٹے کی پیدائش اور وفات کے بعد سے وہ بیمار رہنے لگی ہے تو میں نے اسے کچھ دن اور آرام کرنے کو کہہ دیا ہے کہ پھر مہمان آ گئے تو بہت کام ہو گا حویلی میں۔

اتوار کو زین نے آنا تھا اسے لینے اور ہفتے کو وہ اختر بانو کو بتا کر منیرا سے ملنے کے لیے حویلی سے نکلی۔ اختر بانو نے کہا بھی تھا کہ وہ سوہنی یا سنہری کو ساتھ لے کر جائے لیکن اس نے دیکھا تھا کہ مہمانوں

کے لیے فرسٹ فلور کی صفائی کی جا رہی تھی سب ہی مصروف تھے۔

کراچی، لاہور، ملتان، ساہیوال سب جگہ سے ہی مہمانوں نے آنا تھا دونوں حویلیوں میں ہی مہمان ٹھہرائے جانے تھے۔ ماسی تاج بھی آج کچن میں اکیلی ہی تھیں۔ اس لیے ناشتے کے بعد وہ کسی کو لیے بغیر ہی حویلی سے نکل آئی تھی۔ لاہور سے منیرا کے لیے وہ ایک سوٹ اور کچھ دوسری چیزیں لائی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اس کے بیٹے کا افسوس بھی کر لے گی اور کچھ رقم اور پیسے بھی اسے دے آئے گی۔

منیرا کا گھر حویلی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اور وہاں تک جانے کے لیے ایک شارٹ کٹ منیرا نے بتایا تھا جو ثوبان شاہ کے بڑے اور چھوٹے تایا کے مشترکہ ڈیرے کے پچھلی طرف سے نکلتا تھا۔ زل نے بھی وہی شارٹ کٹ اختیار کیا تھا۔ کل زین نے آنا تھا۔ دادا جان نے ٹرین کی سیٹیں بک کروادی تھیں دونوں کو...... سوموار کی صبح انہوں نے چلے جانا تھا۔ ثوبان شاہ نے کہا بھی تھا کہ وہ اسے بائے ایئر بھیج دیتے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں دادا جان نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اتنے لمبے سفر میں اسے زین کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملے گا تو وہ پوچھے گی اس سے کہ آخر وہ اس طرح کیوں کر رہا ہے، اس کی اس ناراضی، غصے اور رویے کی کیا وجہ ہے۔ سحرش بھی تو کہتی تھی نا کہ چھوٹی چھوٹی کدورتیں دل میں اکٹھی ہوتی رہیں تو پھر ان کدورتوں کا پہاڑ بن جاتا ہے اور پھر نفرت اور دشمنی کے اس پہاڑ کو ڈھانا مشکل ہو جاتا ہے اگر ڈھا بھی دو تو کچھ کنکر، ریت، ذرے اندر ہی رہ جاتے ہیں۔

اس لیے اگر اپنوں سے کوئی گلہ، شکوہ یا ناراضی ہو تو اسے فوراً ہی دور کر لینا چاہیے۔ یقیناً کوئی چھوٹی سی ہی بات ہو گی جسے لے کر اس کا موڈ خراب تھا۔ ورنہ وہ دادا جان کو شادی سے صاف منع کر دیتا۔

وہ زین کے متعلق سوچتی ہوئی اپنے خیالوں میں گم ادھر ادھر سے بے نیاز تنگ سی پگڈنڈی پر جا رہی تھی کہ یکدم کسی نے پیچھے سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کی آواز نہیں نکل سکی تھی کہ پیچھے موجود شخص نے اس کے منہ کو زور سے دبا رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ ناک پر بھی تھا۔ سانس الجھ رہی تھی اور حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر پیچھے موجود شخص نے جانے کون سی رگ دبائی تھی کہ وہ لہرا کر گرنے لگی۔ ہاتھ میں پکڑا شاپر نیچے گر پڑا اور پیچھے والے شخص نے اسے گرنے سے پہلے

دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور اپنے پیچھے کھڑے شخص کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ ہوش وحواس سے بے گانہ نرم ونازک سی زمل کو اس نے کندھوں پر ڈال لیا تھا اور پیچھے آنے والے نے اس پر چادر ڈال دی تھی۔

☆......☆......☆

وہ سر جھکائے تیز تیز چلتا ہوا سر حمید کے روم کی طرف جا رہا تھا کہ اگر کوئی طالب علم دو منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو وہ میٹھی میٹھی بے عزتی کر دیتے تھے اور اس کے ساتھ تو پچھلے دو دن سے ایسا اتفاق ہو رہا تھا کہ باوجود کوشش کے وہ تین چار منٹ تو لیٹ ہو ہی جاتا تھا اور جوں ہی وہ مے آئی کم ان سر کہتا ان کی آواز پورے کمرے میں گونجتی۔

وہ ہی ان کا مخصوص جملہ......

''اور یہ ہیں ہمارے ہونہار نوجوان جنہوں نے مستقبل میں ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے۔ بھئی جو وقت کی قدر کرنا نہیں جانتے انہوں نے ملک کے لیے کیا کرنا ہے۔''

یہ جملہ خاص اس کے لیے مخصوص تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا تعلق ایک سیاسی خاندان سے ہے۔ اس کے دادا، تایا، چچا، والد کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی وزارت رہی تھی۔ اس ہفتے ان کی تین ہی کلاسز تھیں اور آج اس ہفتے کا آخر لیکچر تھا اور آج وہ اس ہفتے کی آخری کلاس میں لیٹ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن قسمت کی خرابی کہ اپنے دھیان میں تیز تیز چلتے ہوئے جوں ہی وہ دائیں طرف مڑا دوسری طرف سے آنے والی لڑکی سے بری طرح ٹکرا گیا۔

دونوں کے ہاتھ سے کتابیں اور فائل نیچے گری اور دونوں نے ایک ساتھ ہی جھک کر اپنی اپنی کتاب اور فائل اٹھانی چاہی تو اس بار اس کا سر بری طرح لڑکی کے ناک سے ٹکرایا۔ لڑکی یک دم ناک پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''سوری مس......''

اس کا اپنی فائل کی طرف بڑھتا ہاتھ وہاں ہی ٹھہر گیا تھا اور نظریں ناک کی لونگ پر سے ہو کر

جھک گئی تھیں۔

لڑکی نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ہولے ہولے اپنی ناک سہلا رہی تھی۔ اور وہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''سوری......'' اس نے ایک بار پھر کہا تو لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کوئی بات نہیں، میری بھی غلطی ہے میں بھی دیکھے بغیر مڑ رہی تھی۔'' اور ساتھ ہی اس کے بال کھل کر اس کے اردگرد بکھر گئے۔ اب پتا نہیں اس کا کیچر ٹوٹ گیا تھا یا گھنے بالوں کا بوجھ برداشت نہ کر سکنے پر کھل گیا تھا۔ یا پھر کیوپڈ کی شرارت تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی تھی اور اس کے گھنے سیاہ چمکیلے، سلکی بال زمین کو چھو رہے تھے۔ اور وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔

لڑکی نے ذرا سا رخ موڑ کر پیچھے زمین پر پڑا ہوا کیچر اٹھایا اور زمین پر بیٹھے بیٹھے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹ کر پیچھے کیے اور کیچر لگایا۔ اس کا دل چاہا کہ اس سے کہے کہ ابھی ان بالوں کو مت سمیٹو۔ کچھ دیر اور ان گھٹاؤں کا حسن دیکھنے دو۔

اسے بچپن سے ہی عورتوں کے لمبے بال بہت پسند تھے۔ وہ چھوٹا سا تھا تو اپنی اماں جان کے لمبے گھنے بالوں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹتا۔ مٹھی میں بھر کر ان کی خوشبو سونگھتا۔ ان کے بال بے حد لمبے، گھنے اور سلکی تھے بالکل اس لڑکی کے بالوں کی طرح جو کیچر لگانے میں ناکام ہو کر اب اسے ہاتھ میں پکڑے تاسف سے دیکھ رہی تھی۔ کیچر یقیناً ٹوٹ چکا تھا۔

اس نے اپنے بال پیچھے کر دیے تھے اور بڑے دوپٹے کو اچھی طرح سے اپنے سر کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ اس نے زمین پر پڑی اپنی فائل اور کتاب اٹھاتے ہوئے اس کی فائل اور کتاب بھی اٹھا کر اسے پکڑائی۔

''تھینک یو۔'' وہ کتاب اور فائل لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ہاتھ میں پکڑا کیچر اپنے شولڈر بیگ میں ڈالا۔

اس نے دیکھا سانولی سی اس لڑکی کے نقوش میں بلا کی ملاحت اور جاذبیت تھی۔ گو آنکھیں بڑی بڑی اور غلافی نہ تھیں لیکن ان کی پہرے دار پلکیں بے حد گھنی اور مڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ میں فائل

اور کتاب پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اپنا دوپٹا درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی تو غیر ارادی طور پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

اس کے خوب صورت بال پشت پر بکھرے کمر سے نیچے تک آ رہے تھے۔ جنہیں کوشش کے باوجود وہ دوپٹے میں چھپا نہیں پائی تھی۔ شاید وہ نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے دیکھتا رہا کہ اس کے دوست نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''کیا افسانوی، فلمی اور رومانٹک سین تھا۔ لڑکا اور لڑکی آپس میں ٹکرائے، پہلی نظر کی محبت، پھر طوفانی عشق، ظالم سماج اور پھر آخر میں ساری رکاوٹیں عبور کر کے اپنی محبت میں کامیاب۔''

''بکومت۔'' اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

''میں سر حمید کی کلاس میں آج وقت سے پہلے جانا چاہتا تھا اس لیے بے دھیانی میں مڑا تو......''

''لیکن تم آج بھی لیٹ ہو گئے ہو۔''

''ہاں......'' اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور مسکرایا۔

''یقیناً میں آج بھی لیٹ ہو گیا ہوں۔''

لیٹ تو وہ ہو ہی گیا، اس لیے اب اطمینان سے اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرتا ہوا سر حمید کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟ پہلے نہیں دیکھا کبھی۔''

''نیو ایڈمیشن ہے۔ ابھی دو تین دن ہی تو ہوئے ان کی کلاسز سٹارٹ ہوئے۔''

وہ فائنل ایئر میں تھے۔

''کس ڈپارٹمنٹ میں ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''خیر تو ہے ناشاہ......'' دوست نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''دل تو نہیں ہار بیٹھے اس سانولے سلونے حسن پر۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' وہ سر حمید کے روم کے باہر تھے اب۔

"آ جاؤ شہزادو......" سر حمید کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہے تھے۔ "اور آج آپ چار منٹ لیٹ ہیں۔"

"سر وہ......" ایک وضاحتی سی مسکراہٹ دونوں کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"اب سجاد علی کی طرح یہ نہ کہہ دینا کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔" چند لمحے پہلے سجاد علی نے اقبال کا تاریخی جملہ اپنے لیٹ آنے کے جواز میں کہا تھا۔

"نو سر......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آج کل تو اقبال دیر سے آئے تو بھوکا ہی رہ جاتا ہے۔ اس نے اقبال عظیم کی طرف دیکھا جو چند دن پہلے ہونے والے اینول ڈنر میں اس وقت پہنچا تھا جب میزوں سے برتن اٹھائے جا رہے تھے۔ سر حمید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے انہوں نے سر جھکا کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔

اس اثناء میں وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

"تو شاہ صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ایک سیکنڈ کی تاخیر میں دنیا الٹ پلٹ ہو سکتی ہے۔ وقت کی قدر اور پابندی کرنا سیکھیں۔"

وہ جانتا تھا اب اس کی بہت بے عزتی ہونے والی ہے لیکن آج اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر سر حمید کی باتیں سن رہا تھا اور تصور میں ایک سانولے چہرے کے گرد بکھرے بال بار بار آ رہے تھے۔ ناک کی لونگ کا سفید زرقون آنکھوں کے سامنے لشکارے مارتا اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ ایک عام سی شکل وصورت کی اور عام سی لڑکی کے متعلق غیر ارادی طور پر سارا دن سوچتا رہا۔ لیکن نہیں، وہ عام کہاں تھی۔ اس کی ہلکی سانولی رنگت میں بلا کی کشش تھی اور اس کے وہ بے حد خوب صورت بال اسے بہت خاص بنا رہے تھے۔

یہاں تک کہ شام کے وقت اپنے بیٹے کی برتھ ڈے پارٹی میں بھی اس کا دھیان بار بار اس کے خوب صورت بالوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس نے مہمان خواتین پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی، دو تین

خواتین کے بال کمر سے نیچے تک تھے لیکن اس کے جیسے بال تو کسی کے نہ تھے۔

اس کی غائب دماغی کو کسی اور نے محسوس کیا تھا یا نہیں، لیکن اس کی بیوی عفت شاہ نے محسوس کر لیا تھا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں؟'' ڈنر سے فارغ ہو کر وہ اپنے بیڈ روم میں آئے تو عفت نے پوچھا۔

''ہاں......نہیں تو......'' وہ چونک کر عفت کو دیکھنے لگا جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی جیولری اتار رہی تھی۔

بے حد سفید رنگت۔ عام سے نقوش، قدرے موٹے ہونٹ۔ وہ خوب صورت نہیں تھی لیکن اپنی سفید رنگت اور لمبے قد کی وجہ سے خوب صورت ہی لگتی تھی۔ بہترین ڈریسنگ اور اعلیٰ خاندانی پس منظریوں بھی عام سی لڑکیوں کو بھی خوب صورت بنا دیتا تھا اور عفت شاہ کو خود کو خوب صورت بنانے کا ہنر آتا تھا۔

عفت جہانگیر شاہ اس کے تایا کی بیٹی تھی۔ عمر میں اس سے دو سال بڑی تھی لیکن بچپن میں ہی اس کی نسبت اس سے طے کر دی گئی تھی۔ اس کا اپنا قد بت اور اٹھان ایسی ہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کھڑی اس سے چھوٹی ہی لگتی تھی اسے کبھی بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوا تھا کہ ان کے ہاں خاندان میں ہی شادیاں ہوتی تھیں۔ اور خاندان میں اگر رشتہ نہ ہو تو پھر لڑکیاں ساری عمر بیٹھی ہی رہتی تھیں، اس لیے چند سالوں کی چھوٹائی بڑائی کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے بڑے دونوں بھائیوں کی شادیاں بڑے تایا اور ماموں کے گھر ہو چکی تھیں اس لیے اس کی کم عمری میں ہی اس کی نسبت عفت سے طے کر دی گئی تھی کہ خاندان میں عفت جہانگیر کے جوڑ کا کوئی اور رشتہ نہ تھا۔

جہانگیر شاہ صوبائی وزیر تھے ان دنوں جب انہوں نے اس کے والد سے دونوں کی شادی کی بات کی تھی کہ عفت کی والدہ کو کینسر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے آپریشن سے پہلے عفت کی شادی کر دیں۔ کسی کو اعتراض نہ تھا یوں ابھی وہ کالج میں ہی تھا کہ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اور جب وہ یونیورسٹی میں آیا تو دو بچوں کا باپ تھا ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔

اسے اپنے دونوں بچوں سے بے حد محبت تھی اور وہ بہت شاندار طریقے سے ان کی سالگرہ مناتا

تھا۔ سالگرہ کا انتظام تو اب بھی شاندار تھا لیکن اس کی خاموشی عفت کو کھٹک رہی تھی۔

''کچھ تو ہے، ساری تقریب کے دوران آپ کھوئے کھوئے سے رہے۔'' عفت جیولری دراز میں ڈال کر اب بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کچھ خاص نہیں، آج بھی سر حمید کی کلاس میں لیٹ پہنچا تو انہوں نے بے عزتی کر دی، اسی کا خیال آ رہا تھا۔''

عفت کو بہر حال مطمئن تو کرنا تھا، سو یہی خیال سوجھا ورنہ عفت کی عادت تھی کہ کسی بات کے پیچھے پڑ جاتی تو جب تک کھوج نہ لگا لیتی، خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔

''بابا جان سے بات کرا کے ان سر حمید کی چھٹی کروا دیں۔ کیا وہ نہیں جانتے آپ کے متعلق کہ کس خاندان سے تعلق ہے۔'' عفت کا موڈ خراب ہوا تھا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ وہ استاد ہیں میرے۔ کیا اتنی سی بات پر میں انہیں نوکری سے فارغ کروا دوں۔''

اسے غصہ آ گیا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ جہانگیر شاہ اتنے بے وقوف ہرگز نہیں ہیں۔ ورنہ اگر وہ عفت کی بات سننے والے ہوتے تو وہ اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو فارغ کروا چکی ہوتی۔

''لیکن آپ کے ان استاد صاحب کو بھی تو سوچنا چاہیے کہ دو تین منٹ لیٹ ہو جانے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ وہ آپ کی بے عزتی کر دیتے ہیں۔'' ناگواری سے پیشانی پر شکنیں لیے وہ اٹھی۔

''وہ بہت پیارے انسان ہیں عفت...... میں ہی نہیں، کوئی بھی لیٹ آئے سب کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن آپ میں اور دوسروں میں فرق ہے۔''

وہ نخوت سے کہتی ہوئی واش روم میں چلی گئی اور جب چینج کر کے آئی تو پنک نائٹی میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں عفت کے لائٹ براؤن بالوں میں الجھ گئیں جو بے حد ہلکے تھے۔ عفت مختلف انداز میں انہیں سیٹ کرواتی رہتی تھی۔ آج گردن تک سٹیپ میں ہلکے ہلکے کرل کے ساتھ

یہ اسٹائل اس کے چہرے پر اچھا لگ رہا تھا لیکن اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
''عفی! تم اپنے بال بڑھا کیوں نہیں لیتی ہو؟''
''کیوں کیا یہ اسٹائل اچھا نہیں لگ رہا؟''
ڈریسنگ کے سامنے کھڑے اپنے چہرے پر نائٹ کریم لگاتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔
''نہیں، بہت سوٹ کر رہا ہے تم پر لیکن مجھے لمبے بال پسند ہیں۔ جیسے اماں جان کے ہیں۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے بال بھی اماں جان جیسے ہوتے۔''
وہ سیاہ گھنے بال جو کمر سے نیچے تک آرہے تھے، پھر آنکھوں کے سامنے آگئے۔
''مجھے بھی لمبے بال بہت پسند تھے۔ بہت کوشش کی، طرح طرح کے تیل لگائے مہینوں سیکا کائی اور آملے وغیرہ سے دھوئے لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا'' وہ کریم لگا کر مڑی۔
''بچے سو گئے کیا؟'' اس نے موضوع بدلا۔
''گلشن سے کہا تھا سلا دے۔ بہت تھک گئے تھے۔ سو گئے ہوں گے۔ لیکن ایک بار دیکھ لیتی ہوں۔ بعض اوقات سائرہ بہت ضد کرتی ہے۔ جب تک اسے گڈ نائٹ نہ کہہ دوں، سوتی نہیں ہے۔'' اس نے بیٹی کا نام لیا۔
''ٹھیک ہے، میں بھی بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ سو جاؤں گا۔ جاتے ہوئے لائٹ آف کر جانا۔''
اس نے لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور بند آنکھوں میں پھر وہی منظر زندہ ہو گیا۔
زمین پر بیٹھی وہ لڑکی اور اس کے گرد بکھرے زمین کو چھوتے ہوئے اس کے بال......
اس رات سونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اپنی اماں جان کے بعد اس نے پہلی بار کسی کے ایسے بال دیکھے ہیں اور چونکہ خواتین کے لمبے بال اس کی کمزوری ہیں اس لیے وہ ان کے سحر سے نکل نہیں رہا۔
اور رات ہی نہیں، اگلے کئی دنوں تک اس کا یہ ہی خیال تھا کہ اس ایک عام سی لڑکی کے خوب صورت بالوں سے وہ متاثر ہوا ہے بس۔ اور یہ اس کے بالوں کو ایک بار اور دیکھنے کی خواہش ہی ہے کہ

اگلے کئی روز یونیورسٹی آتے ہی اس کی نظروں نے اسے تلاشا تھا۔

اور مزید کچھ دنوں بعد وہ اس کے متعلق جان چکا تھا کہ اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے اور وہ اندرون شہر سے آتی ہے۔ اس کے بالوں کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش پھر پوری نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے بالوں کو باندھ کر ہی رکھتی تھی اور پھر چادر نما دوپٹہ خوب اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹا ہوتا تھا۔

آتے جاتے اسے دیکھتے اس سے سلام دعا کرتے خیریت پوچھتے ہوئے ایک روز اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے۔

یعنی وہ اظہار شاہ کا لاڈلا بیٹا جس نے کبھی کسی لڑکی کو لفٹ نہیں کروائی تھی، وہ اس عام سی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ اس عام سی لڑکی کو متاثر نہیں کر سکا تھا اس نے کبھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی خاص جذبہ یا ستائش نہیں دیکھی تھی۔ کیا وہ مغرور تھی یا اس میں ایسا کچھ نہ تھا کہ وہ اسے متاثر نہ کر سکا تھا۔

جب کہ اکثر لڑکیوں کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے کچھ خاص جذبے محسوس کیے تھے جنہیں وہ نظر انداز کر دیتا تھا لیکن وہ ایک سانولی سلونی سی لڑکی اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کو اپنا حال دل بتائے، اپنی محبت کا اعتراف کرے۔ وہ بلا وجہ ہی اس کے ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگاتا۔ ایک نظر اسے دیکھنے کے لیے کئی بار اپنی کوئی کلاس مس کر دیتا تھا۔ اور اس لڑکی کو پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ اسے ایک نظر دیکھ کر کسی کے دل میں دیوالی کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔

”کیا محبت کر بیٹھے ہو اس ڈیپارٹمنٹ کی کسی لڑکی سے۔“

اس کے دوست سے زیادہ دنوں تک اس کی کیفیت چھپ نہ سکی تھی۔

”ہاں......“ وہ اعتراف کر بیٹھا کہ کوئی تو ہو، جس سے وہ حال دل کہہ سکے۔

”کون......؟“ اس کا دوست حیران ہوا تھا۔

”وہی جو اس روز کوریڈور میں ٹکرائی تھی۔“

”لیکن باری یار تم تو......“

”ہاں میں میریڈ ہوں، دو بچوں کا باپ ہوں۔“ اس نے دوست کی بات کاٹی تھی۔

''کیا محبت کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ آدمی پہلے سے شادی شدہ نہ ہو۔ محبت تو کبھی بھی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا فلسفہ عجب ہے۔ اس کے ڈھب نرالے ہیں۔ کبھی بن مانگے جھولی میں آ پڑتی ہے اور کبھی مانگ کر بھی نہیں ملتی۔ یہ جب ہوتی ہے تو ہو جاتی ہے نہ یہ خاندان دیکھتی ہے نہ عمروں کا حساب کتاب کرتی ہے۔ مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی ہے، وہی بقول تمہارے پہلی نظر والی افسانوی اور فلمی محبت۔''

''اور تمہاری بیوی...... کیا تم اس سے محبت نہیں کرتے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، تم اس کے ساتھ ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہو اور تمہیں کبھی اس سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی۔'' دوست اس کی بات سن کر الجھ گیا تھا۔

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 16

''ہاں ہم ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ جب میری زندگی میں آئی تو میری زندگی میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں ایسے ہی جیسے شوہر اپنی بیویوں سے کرتے ہیں۔ میں نے اس سے تب محبت کی جب وہ میری زندگی میں شامل ہوگئی۔ میں اس کی محبت میں راتوں کو جاگا نہیں۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے اسے سوچا نہیں۔ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے تڑپا نہیں۔ لیکن یہ محبت جس نے اب میرے دل پر کمند ڈالی ہے، یہ بہت انوکھی اور نرالی ہے۔ اس کا رنگ بہت مختلف ہے۔ قوس قزح جیسا بہت خوش رنگ۔ ایسا جذبہ میں نے کبھی پہلے محسوس نہیں کیا۔ دل کو گدگداتا ہوا سا۔ کسک سی پیدا کرتا ہوا۔ اپنی بیوی کے لیے بھی نہیں۔ میں خود نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا ہے لیکن ایسا ہو گیا ہے یار۔''

اس کی آنکھیں محبت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔

''اور کیا اس ایک نظر کی محبت نے تمہارے دل سے تمہاری بیوی کی محبت کو ختم کر دیا ہے اور اس کی جگہ اس لڑکی کی محبت نے لے لی ہے جسے تم ٹھیک سے جانتے تک نہیں؟''

وہ اس کا جگری یار تھا۔ بچپن کی دوستی، ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ وہ اسے اس راستے پر چلنے سے ہر صورت روکنا چاہتا تھا جس پر اس نے قدم رکھ دیے تھے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی محبت ختم ہو گئی ہے۔ وہ صرف میری بیوی ہی نہیں، میرے بچوں کی ماں بھی ہے۔ اس کا جو مقام میرے دل اور میری زندگی میں ہے، وہ ہمیشہ وہی رہے گا۔ شاید محبت کو قرار نہیں ہوتا۔ دوسری محبت پیدا ہوتے ہی پہلی پارے کی طرح تھرک کر دوسری میں ضم ہو جاتی ہے۔ وہ ختم نہیں ہوتی۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''فلسفہ بیان کر رہے ہو، اس چند دن کی محبت نے فلسفی بنا دیا ہے تمہیں۔'' دوست ایک بار پھر اس کی باتیں سن کر حیران ہوا۔

''غلط...... محبت فلسفی نہیں، مجنوں بناتی ہے۔ رانجھا کر دیتی ہے۔'' اس نے دوست کی بات کو رد کیا۔

''تو مجنوں ہو گئے ہو؟'' دوست نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں یار، مجنوں ہونے تک تو کئی منزلیں طے کرنی ہوتی ہیں۔ ابھی تو پہلی سیڑھی پر کھڑا ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تو بہتر ہے کہ پہلی سیڑھی سے ہی نیچے اتر آؤ۔ آخری سیڑھی سے گرو گے تو بہت چوٹ لگے گی۔ اس لیے اس ایک محبت پر ہی قناعت کر لو، جو ہے۔'' دوست نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''وہ محبت اپنی جگہ ہمیشہ رہے گی یار لیکن میرے خیال میں انسان کے دل میں بہت ساری محبتوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری اور شاید دوسری کے بعد تیسری بھی۔ ہر محبت کا اپنا رنگ، اپنی خوشبو ہوتی ہے۔''

اس نے سنجیدگی سے تجزیہ کیا تو اس کا دوست ہنس پڑا۔

''یہ تو تم کسی ہرجائی دل کی بات کر رہے ہو۔''

''نہیں یار، میرا دل ہرجائی نہیں ہے۔ میرے دل میں پہلے سے موجود محبتیں ختم نہیں ہو گئیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے ایسی خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔ دل کسی ضدی بچے کی طرح اسے پانے کے لیے مچلتا ہے۔ اتنے مہینوں کی کشمکش کے بعد میں نے خود سے اعتراف کیا ہے کہ یہ محبت ہے اور اس اعتراف کے بعد سے صبر کا دامن ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔'' وہ جیسے اس محبت کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' اس کا دوست سنجیدہ ہوا۔ ''کیا اس کے ساتھ وقت پاس کرنا اور کچھ محبت بھرے لمحے گزارنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ ''میں اس کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنی زندگی میں

شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کے سنگ اس محبت کو محسوس کرنا چاہتا ہوں جو میرے لیے بالکل نئی اور انوکھی ہے۔ میں اس خوشی کو جینا چاہتا ہوں جو من پسند ساتھی کے سنگ اندر سے پھوٹتی ہے۔''

''لیکن یہ آسان نہیں ہے یار، بلکہ میرے خیال میں تو ناممکن ہوگا یہ۔ بہتر ہے کہ یہاں سے ہی پلٹ آؤ اور اس نئی نویلی محبت کو دل کی تختی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دو۔ تمہاری بیوی تمہارے تایا کی بیٹی ہے اس کے پیچھے تمہارا پورا خاندان کھڑا ہوگا۔ حتیٰ کہ تمہارے والدین بھی تمہیں ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔'' دوست نے سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔

''ہاں جانتا ہوں مشکل ہوگا، لیکن ناممکن نہیں۔''

محبت ایسی ہی خوش فہم اور پر یقین ہوتی ہے۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ یقین ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ اس کا بھی یقین ٹوٹا تھا۔ اظہار شاہ اس کی بات سن کر شاکڈ ہوئے تھے۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ دوسری شادی کرنا چاہتے ہو۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟''

اظہار شاہ کے ساتھ اس کے تعلقات صرف باپ بیٹے کے نہیں، دوستانہ بھی تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ اپنی ہر بات ان سے ہی کہتا آیا تھا۔ وہ اس کی بات دھیان سے سنتے اسے مشورہ دیتے۔ وہ بھی بڑے دو بیٹوں کی نسبت اپنے اس چھوٹے بیٹے کے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا تھا کہ پہلے ان سے بات کرے کہ یونی چھوڑنے سے پہلے وہ اسے اپنا پابند کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ہر غلط صحیح بات میں اس کا ساتھ دینے والے اظہار شاہ اس کی بات سن کر بھڑک اٹھے تھے۔

''کیوں؟ کیا دوسری شادی کرنا گناہ ہے۔ تایا جان نے خود بھی تو دو شادیاں کی ہیں۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔ لیکن یہ مت بھولو کہ عفت کوئی غیر نہیں، میری بھتیجی اور تمہارے تایا کی بیٹی ہے۔'' انہوں نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ ''اور جہانگیر بھائی کی دوسری شادی کی وجہ تم جانتے ہو کہ عفت کی والدہ کو کینسر تھا اور اسی مرض میں ان کی وفات ہوئی۔''

''جی۔ لیکن تایا جی نے تائی جان کی زندگی میں ہی دوسری شادی کر لی تھی۔ اور وہ آپ کے

کزن، خاندانی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دو مزید شادیاں کر چکے ہیں۔ وہ بھی کسی اداکارہ اور ماڈل گرل سے۔"

اس نے کبھی بحث نہیں کی تھی لیکن آج کر رہا تھا۔ اظہار شاہ نے کسی قدر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انہیں ایک عزم نظر آیا۔ جیسے اگر انہوں نے اسے اجازت نہ بھی دی تب بھی وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔

"کون ہے وہ لڑکی اور اس کا خاندان پس منظر کیا ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں، میں اس کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا۔" اس کے چہرے پر ایک دم خوشی کا رنگ جھلکا تھا۔

"کیا مطلب؟" اظہار شاہ پھر حیران ہوئے تھے۔ "ایک لڑکی جس کے ساتھ تمہارا اتنا گہرا تعلق ہو چکا ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر چکے ہو، اس کے باوجود کہ تمہارے دو بچے ہیں، بیوی ہے۔ اس لڑکی نے تمہیں اپنے خاندان کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ یقیناً اس کا تعلق کسی ایسے ویسے خاندان سے ہوگا۔"

"ایسا نہیں ہے بابا جان، میری اس سے بات چیت نہیں ہے۔ بس یونی میں آتے جاتے وہ بھی کبھی کبھار سلام دعا ہو جاتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر انہیں حیران کیا تھا۔

"ایک لڑکی کو صرف دیکھ کر اسے جانے بغیر تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ کیا خبر وہ کہیں انگیجڈ ہو۔ اس کا نکاح ہو چکا ہو۔" اور ان کی بات سن کر وہ بے حد مضطرب ہو گیا تھا۔ اور بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑنے لگا تھا۔

"مجھے اس کا علم نہیں ہے لیکن میں پتا کر لوں گا۔ پہلے مجھے آپ کی اجازت چاہیے تھی۔" اس کی آنکھوں میں کروٹیں لیتے اضطراب اور بے چینی سے اظہار شاہ کو ادراک ہوا کہ ان کا یہ بیٹا اس لڑکی کی

محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔

انہیں اپنے تینوں بیٹوں میں یہ بیٹا بے حد عزیز تھا۔ اور اس سے انہیں بہت امیدیں بھی تھیں۔ بڑے دونوں بیٹوں کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی، سو انہوں نے اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اپنے چچا تایا اور ان کے جلسوں میں تقریر کرتا تو سحر طاری کر دیتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ان کا جان نشین تھا اور انہوں نے اس کے لیے بڑے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اگلے الیکشن میں وہ اسے کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ جیت جائے گا۔ اس کی بے چینی سے وہ خود بھی مضطرب ہو گئے تھے لیکن ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیا تم نے اسے بتایا کہ تم......؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ کیا تم آج کل کے دور میں انیس سو چالیس والی محبت کر رہے ہو۔ لڑکی سے بات نہیں کی، بس دیکھ کر محبت ہو گئی۔'' ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور وہ جھینپ گیا۔

''دراصل وہ مجھ سے جونیئر ہے اور کسی دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ میں نہیں جانتا بابا جان میرا دل کیسے اس کی محبت میں گرفتار ہوا لیکن ایسا ہو گیا۔''

''کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟'' اب اظہار شاہ کسی حد تک ریلیکس ہو کر بات کر رہے تھے۔

''جس نے میرے بیٹے کو دور سے ہی اسیر کر لیا ہے۔''

''شاید نہیں، لیکن مجھے وہ سب سے خوب صورت اور منفرد لگتی ہے۔'' وہ بھی اب بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔

''ویسے کیا یہ بات حیرت کی نہیں کہ جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرنے والا ایک لڑکی سے دل کی بات نہیں کہہ سکا۔''

اور کتنی ہی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے روک کر اس سے بات کر لے، اسے بتائے کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے لیکن گزرے سات ماہ میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہیں کسی ایک جگہ

ذرا دیر کو ہی سہی، رک کر اس سے کوئی طویل بات کرتی۔

''اوکے۔'' اسے خاموش دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔ ''تم اس سے شادی کر سکتے ہو، لیکن میری ایک شرط ہے۔ کچھ عرصہ تک تم اس شادی کو خفیہ رکھو گے۔ میں تمہیں آنے والے الیکشن میں کھڑا کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس سے پہلے شادی وغیرہ کا کوئی اسکینڈل نہیں چاہیے مجھے۔''

''لیکن اس کے والدین خفیہ شادی کے لیے کیسے مانیں گے؟'' اسے اظہار شاہ کی شرط پسند نہیں آئی تھی۔

''ابھی تو یہ بھی تم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ لڑکی اور اس کے والدین ایک شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ کا رشتہ قبول بھی کریں گے یا نہیں۔''

وہ پریشان سا ہو کر اظہار شاہ کو دیکھنے لگا۔

''بھلا کیوں قبول نہیں کریں گے؟ ہمارا بیک گراؤنڈ، ہمارا اسٹیٹس، کیا اس کے باوجود صرف اس وجہ سے انکار کر سکتے ہیں کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔''

''کر بھی سکتے ہیں میری جان، بعض اوقات پیسہ، دولت، خاندانی وقار اور وجاہت بھی میٹر نہیں کرتی۔ بہر حال......'' انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''پہلے تم اس لڑکی سے بات کرو، اگر اسے اعتراض نہ ہوا تو شاید اس کے والدین کو بھی نہ ہو۔ لیکن پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کرو شادی اس کے بعد ہی ہو گی۔''

''ظاہر سی بات ہے۔ شادی تو وہ بھی اپنی تعلیم مکمل کرنے سے پہلے نہیں کرے گی۔ میں تو بس اس سے بات کرنے سے پہلے آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کے والدین سے میرے رشتے کی بات کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اور اس کی بات طے ہو جائے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا تو انہیں اپنے اس بیٹے پر بے حد پیار آیا۔

''کیا خبر اس کی بات پہلے ہی طے ہو چکی ہو۔ بہر حال جو بھی ہے، اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا نہ عفت سے، نہ اپنی ماں سے۔ میں وقت سے پہلے ہی کسی قسم کا ہنگامہ نہیں چاہتا۔''

اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''تھینک یو بابا جان۔''

''اٹس او کے۔''

دل کے اندر کہیں اطمینان سا تھا کہ سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں یہ جنون خود ہی ختم ہو جائے گا۔ تاہم اس کی تسلی کے لیے وہ اس لڑکی کے گھر اس کا رشتہ لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اور وہ اظہار شاہ سے دل کی بات کر کے بے حد مطمئن ہو گیا تھا اب اسے اس سے بات کرنی تھی اور اپنا حالِ دل کہنا تھا لیکن پہلے اس نے اس کے متعلق اس کی ایک کلاس فیلو سے جو اس کے دوست کی کزن تھی، معلوم کر لیا تھا کہ اس کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اور وہ اندرون شہر سے آتی ہے۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ بھلا ایک متوسط گھرانے کی لڑکی اس جیسے دولت مند، اعلیٰ خاندان کے لڑکے کو انکار کر ہی نہیں سکتی کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ڈائریکٹ شادی کی بات کرے گا کہ کہیں وہ اسے دوسرے امیر زادوں کی طرح فلرٹ ہی نہ سمجھ لے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا تھا اور جب اس کے بے حد اصرار پر وہ اس کی بات سننے کے لیے تیار ہو گئی تو کیفے ٹیریا میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے بغیر کسی تمہید کے شادی کی درخواست کر دی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی جو دوسرے ہی لمحے ناگواری میں بدل گئی۔

''تو کیا یہ آپ کی ضروری بات تھی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں میں اپنے بڑوں کو آپ کے گھر بھیجنے سے پہلے آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا مس کہ یہ کیسے اور کیوں ہوا لیکن مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے اور میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

''سوری میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''لیکن کیوں......؟'' وہ جیسے تڑپ اٹھا تھا۔ ''مجھ میں کیا کمی ہے؟''

''کوئی کمی نہیں ہے۔ یقیناً آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ کوئی بھی لڑکی آپ کی زندگی میں شامل ہو کر فخر محسوس کرے گی لیکن میں وہ لڑکی نہیں۔'' اس کا جواب حتمی تھا۔

''میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسے لڑکے کو ایک عام سی متوسط گھرانے کی لڑکی انکار کر سکتی ہے۔ اسے تو فخر ہونا چاہیے تھا کہ اس نے اسے پرپوز کیا تھا۔

''میری منگنی ہو چکی ہے اور تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد میری شادی ہے۔'' وہ اس کی منگوائی ہوئی چائے پیے بغیر ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اور وہ کتنی ہی دیر تک وہاں ہی بیٹھا اپنے ٹوٹے ہوئے یقین کی کرچیاں چنتا رہ گیا تھا۔

''شاید اسے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ کس کا بیٹا ہوں۔ میرا اسٹیٹس کیا ہے۔'' اس نے اپنے زخمی دل پر پھاہے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ''وہ ایک متوسط طبقے کی لڑکی اگر یہ جانتی ہوتی تو شاید انکار نہ کرتی۔ اس کا منگیتر بھی یقیناً اسی کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوگا۔''

اور دو روز بعد اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔

اس کے دوست نے بتایا تھا کہ اس کا منگیتر اس کا دور پار کا رشتہ دار ہے۔ یہاں اس کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ اور منگنی بھی دو تین ماہ پہلے ہوئی ہے اور وہ سوچتا رہا کہ کیا واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ کاش وہ اس منگنی سے پہلے ہی اسے پرپوز کر دیتا لیکن خیر ابھی بھی اس کے پاس ایک پلس پوائنٹ تھا۔ وہ لڑکا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اسے خود پر ناز تھا۔ وہ جب اپنا اور اس لڑکے کا موازنہ کرتا تو اس کا پلڑا آسمان سے جا لگتا تھا۔ وہ اب اسے اگنور نہیں کر سکے گی، اس یقین کے ساتھ ایک بار پھر وہ اس کے سامنے تھا۔

''سنیں وہ...... میرا یقین کریں میں آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔ میں آپ کی ہر خواہش ہر آرزو پوری کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ میرا وعدہ ہے کہ آپ کی ہر تشنہ خواہش پوری کروں گا۔ وہ لڑکا کیا نام ہے اس کا ظفریاب وہ بھلا آپ کو کیا دے سکتا ہے؟''

''یہ آپ سے کس نے کہا کہ میری کچھ تشنہ خواہشیں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے مجھے آپ کی ضرورت ہے؟'' اس کی آنکھوں میں اسے تمسخر سا نظر آیا تھا۔

''ہر چیز کو دولت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا اور نہ ہی ہر چیز دولت سے خریدی جا سکتی ہے۔اور پلیز آئندہ میرا راستہ مت روکیے گا۔'' وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔اور وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

اور پھر اگلے کئی دن وہ یونیورسٹی نہیں گیا تھا ایک عام سی لڑکی نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔اسے...... ابرار شاہ کو...... کاش وہ اسے دل چیر کر دکھا سکتا کہ وہ اس سے کتنی شدید اور گہری محبت کرنے لگا ہے۔ کتنی راتیں جاگ کر اس نے اسے سوچا تھا، کتنی شدت سے چاہا تھا کہ صبح کی کافی کی مہک میں اس کے آنچل کی خوشبو بھی ہو۔لیکن وہ اسے پا نہیں سکتا تھا وہ جو سمجھتا تھا کہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔

وہ اظہار کے لفظوں سے اسے مالا مال کرے گا تو وہ خود کو خوش نصیب سمجھے گی کہ اسے اس کا ساتھ مل رہا ہے۔وہ رد کیے جانے کے قابل تو نہیں تھا لیکن پھر بھی رد کر دیا گیا تھا اور یہ احساس زیاں بہت ظالم تھا، اسے مارے ڈالتا تھا۔

عفت بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی اور وہ آزادی سے اپنے بیڈ روم میں بند اس نارسائی کا غم منا رہا تھا۔اظہار شاہ اسلام آباد سے واپس آئے تو انہیں اس کی گوشہ نشینی کا پتا چلا۔وہ اس کے بیڈ روم میں چلے آئے۔

''کیا بات ہے برخوردار؟ کیوں یونی ورسٹی نہیں جا رہے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اور وہ اظہار شاہ کو سب بتاتا چلا گیا۔اور اظہار شاہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوئے کہ جانتے تھے کہ اگر یہ شادی ہوئی اور جب بھی سب کو پتا چلا تو بہت سارے مسئلے کھڑے ہوں گے۔لیکن اس کی تسلی کے لیے پوچھا۔

''کہو تو میں اس لڑکی سے بات کروں، جیسی سیکورٹی وہ چاہتی ہے اسے دے دیتے ہیں، کوٹھی، بینک بیلنس کچھ بھی......''

''وہ ایسی نہیں ہے بابا...... لالچی اور دولت سے مرعوب ہونے والی۔'' وہ بہت دل گرفتہ سا تھا۔

''تو تمہیں تو فخر کرنا چاہیے کہ تم نے ایک بہترین لڑکی سے محبت کی...... ضروری نہیں کہ تم جس سے محبت کرو وہ حاصل ہو جائے۔محبت صرف وصل کا نام نہیں ہے۔''

اظہار شاہ کا انداز دوستانہ تھا۔ اس نے شا کی نظروں سے انہیں دیکھا اور سوچا کہ کتنا آسان ہے یہ کہنا کہ محبت صرف وصل کا نام نہیں ہے لیکن حقیقت میں کتنا مشکل اور ظالم...... اظہار شاہ نے اس کی حالت دیکھی۔ اس کی آنکھوں کی زخمی کیفیت کو محسوس کیا اور اسے ایک ماہ کے لیے اپنے ساتھ باہر لے گئے۔

وہ چاہتے تھے کہ وہ اس لڑکی کو بھول جائے۔ اس کے دکھ سے نکل آئے۔ انہیں اس کی بہت ضرورت تھی۔ لیکن دل پر جو نام ایک بار کھد جائے وہ آسانی سے مدھم نہیں ہوتا۔

اس کے دل پر لکھا نام بھی مدھم نہیں ہوا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

واپس آکر وہ یونی ورسٹی بھی گیا لیکن پھر اس کے راستے میں نہیں آیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اظہار شاہ کی خواہش کے مطابق سیاست کے خارزار میں بھی قدم رکھ دیا۔ اسمبلی تک پہنچا...... وہ بظاہر ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اور یوں ہی دس سال گزر گئے تھے۔

اللہ نے اسے دو بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کی تھیں۔ ایک بیٹے اور بیٹی کے بعد ایک بیٹی اور بیٹا جڑواں تھے پھر سب سے چھوٹی بیٹی جو تقریباً چھ سال کی تھی اور جو سب سے زیادہ لاڈلی تھی۔

لیکن دس سالوں میں وہ اسے بھول نہیں سکا تھا۔ ایک کسک تھی جواب بھی موجود تھی اور کبھی کبھی وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا تھا۔ زمین پر بیٹھی اپنی ناک سہلاتی وہ سانولی سی لڑکی اور اس کے گرد بکھر جانے والے اس کے سیاہ چمکیلے خوب صورت بال...... تاہم اظہار شاہ بھی کبھی نہ جان سکے کہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں اب بھی وہ خواہش موجود ہے۔ اس کے سنگ زندگی گزارنے کی خواہش...... عفت کے لیے اس نے کبھی اپنے دل میں وہ محبت محسوس نہیں کی تھی جو اس کے لیے اس کے دل میں اچانک پیدا ہوئی تھی اور ہمیشہ کی کسک دے گئی تھی۔ لیکن اس نے کبھی عفت کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اس کے ہر اہم دن کو یاد رکھتا...... سالگرہ، اینوورسری، بچوں کی سالگرہ اور سب ایونٹس بھرپور طریقے سے منائے جاتے۔ وہ ایک بہترین شوہر اور اچھا باپ تھا۔

اظہار شاہ اسے مطمئن اور کامیاب دیکھ کر بہت خوش تھے۔ اس نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ لیکن خود اس پر کبھی کبھی مایوسی اور قنوطیت سی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ سوچنے لگتا کہ اگر وہ وقت پلٹنے پر قادر ہوتا

تو اسے ہر صورت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے اغوا کر لیتا، ظفریاب کو مروا دیتا۔ کچھ بھی کرتا وہ اسے اپنا بنا لیتا، لیکن یہ سوچ بس چند لمحوں کے لیے ہی آتی تھی اور ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر گزر جاتی تھی۔

☆......☆......☆

اس روز بھی وہ اپنے آفس میں انتہائی بے زار سا بیٹھا تھا جب اس کی سیکرٹری نے بتایا کہ کوئی خاتون اس سے ملنے آئی ہیں۔ صبوحی ظفر نام ہے۔

''صبوحی......'' یہ نام تو دل پر نقش تھا۔ لیکن وہ کیوں ملنے آئی ہے۔ وہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کیوں آئی ہے۔ کیا وہ اس سے...... ابرار شاہ سے ملنے آئی ہے۔ کیا وہ جانتی ہے کہ میں وہی ابرار شاہ ہوں جو اس کے سامنے ایک بار سوالی بنا کھڑا تھا اور وہ منہ پھیر کر چل دی تھی یا پھر وہ صرف ایک سابق ایم این اے سے ملنے آئی ہے۔ اگرچہ 1977ء سے لگنے والا مارشل لاء ابھی تک تھا اور سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی۔ البتہ سننے میں آ رہا تھا کہ اگلے سال ریفرنڈم ہوگا اور پھر غیر جماعتی انتخابات کروائے جائیں گے۔ تاہم ان کی حکومتی اداروں میں خاصی جان پہچان اور عمل دخل تھا۔

اظہار شاہ جیسے لوگ ہمیشہ برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت 1984ء میں فوجی حکومت تھی اور کوئی سیاسی پارٹی برسر اقتدار نہیں تھی لیکن اندرون خانہ ان کی پارٹی حکومت کے ساتھ تھی۔ اور یہ کوئی اتنی ڈھکی چھپی بات نہ تھی تو ہو سکتا ہے کوئی ضرورت اسے یہاں تک لائی ہو۔

شوہر کے لیے کوئی اچھی جاب یا پھر کوئی اور مدد اور کیا خبر یہ وہ صبوحی ظفر نہ ہو۔ صرف اس نام کی وہ ایک لڑکی تو نہیں ہے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کی ہم نام ہوں گی۔ سوچتے ہوئے اس نے ملاقاتی کو اندر بھیجنے کا کہہ کر یوں ہی ٹیبل پر پڑی ایک فائل کھول لی تھی اور پھر السلام علیکم کی آواز پر ہی اس نے نظریں اٹھائی تھیں۔ اور غیر ارادی طور پر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ وہی تھی۔ اس نے ایک آٹھ نو سال کے بچے کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔

''پلیز تشریف رکھیں۔'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا جو دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ تھا۔ وہ بچے کی انگلی پکڑے ہولے ہولے چلتی ہوئی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس اثنا میں اس نے

دیکھ لیا تھا کہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں اس کا بدن کچھ گداز ہو گیا تھا۔ دس سالوں نے اس میں کچھ زیادہ تبدیل نہیں کیا تھا۔ وہ پریشان اور غم زدہ لگ رہی تھی۔ یقیناً کوئی مجبوری ہی اسے یہاں تک لائی تھی۔

''فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ دائیں طرف کرتے ہوئے اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ خشک اور روکھا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں صبوحی ہوں۔ اور یہ میرا بیٹا ہے آزین......'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا تھا۔ ''میں یونیورسٹی میں آپ سے جونیئر تھی، شاید آپ کو یاد نہ ہو۔''

''جی...... میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' جاننے کے باوجود وہ اجنبیت کا لبادہ نہ اوڑھ سکا تھا۔ کیا کہتا کہ وہ اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔

''میں......'' اس کی آنکھوں میں امید کی لو لمحہ بھر کو چمکی تھی۔ ''ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں کہ شاید آپ میری مدد کر سکیں۔ مجھے زرین خالد نے آپ کا بتایا تھا کہ مجھے ایک بار آپ سے بھی بات کرنی چاہیے۔''

''جی کہیے کیا مسئلہ ہے؟''

زرین خالد اس کی کلاس فیلو تھی اور اب بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی تھی۔

''ظفریاب 1982ء میں ایم آر ڈی میں شامل ہو کر جمہوریت کی بحالی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ پھر 83ء کی ایک صبح کچھ لوگ آ کر انہیں لے گئے۔''

ابرار شاہ جانتا تھا کہ 1981ء میں تقریباً سب سیاسی پارٹیوں کے اتحاد سے ایم آر ڈی تشکیل پائی تھی اور 1983ء تک کافی مضبوط ہو چکی تھی تاہم وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

''ایک سال ہو گیا ہے ہمیں ان کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ہم نے ایم آر ڈی میں شامل سب پارٹیوں سے رابطہ کیا۔'' وہ تفصیل بتاتی چلی گئی۔

اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی مڑی ہوئی گھنی پلکوں میں آ کر موتی سے اٹک گئے تھے اور ان

موتیوں کو اپنی انگلیوں سے چھنے کی خواہش کو اس نے بمشکل دبایا تھا۔

''میں ایک دو روز تک پتا کروالوں گا کہ ظفریاب کہاں ہے۔آپ پریشان نہ ہوں پلیز ......ان شاء اللہ پتا چل جائے گا۔'' اسے اندازہ تھا کہ یوں اٹھائے جانے والے لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہوگا۔

''بہت شکریہ......آپ کا بہت احسان ہوگا۔'' وہ ممنون ہوئی تھی۔

''میں کب پتا کروں پھر......؟''

''کل......نہیں پرسوں......اسی وقت آجایئے گا۔کل مجھے اپنی فیکٹری جانا ہے۔'' وہ پارٹی کے آفس میں کبھی کبھار ہی آتا تھا۔

وہ سر ہلا کر کھڑی ہوگئی اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ناک کی لونگ میں موجود اوپل سے نکلنے والے رنگوں نے چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے کو عجیب ملکوتی سا حسن بخشا تھا۔وہ مبہوت سا اسے دیکھے گیا۔وہ شاید اتنی حسین نہ تھی جتنا حسین اسے اس کے دل میں موجود اس کی محبت اور طلب نے بنا دیا تھا۔وہ بچے کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف جا رہی تھی۔اس کی لمبی چٹیا کا کچھ حصہ اس کے دوپٹے کے حصار سے نیچے کمر سے بھی ذرا نیچے نظر آ رہا تھا۔

اس نے چٹیا کے سرے پر سبز بینڈ لگا رکھا تھا۔اس کا بے اختیار جی چاہا، اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس کے سارے بل کھول دیتا اور گھٹاؤں کو اس کی پشت پر لہراتا دیکھتا۔

وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی لیکن وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی بیٹھا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔وہ کیوں آگئی تھی، دس سالوں بعد اس کی زندگی میں ہلچل مچانے......وہ جس آگ پر دس سالوں سے پانی ڈال ڈال کر اسے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ یکدم بھڑک اٹھی تھی۔اس کی محبت کی آگ......اور وہ جیسے جل رہا تھا، راکھ ہو رہا تھا اس کو پانے کی طلب جاگ اٹھی تھی۔

اور وہ اس طلب کو جھٹلانے کی کوشش کرتا رہا۔خود کو یقین دلاتا رہا کہ وہ اب کسی اور کے آنگن کی چاندنی اور کسی اور دل کی مکین ہے۔

گزارے ہوئے وقت کو واپس لانے پر قادر نہیں تھا لیکن طلب اتنی شدید تھی کہ جب دو دن بعد

وہ آئی تو خود کو دیے سارے دلائل جیسے پانی پر لکھی تحریریں تھیں جنہیں ایک ہی لہر مٹا گئی تھی۔ یا پھر ریت پر بنے نقش تھے جو ہوا کے ایک ہی جھونکے سے مٹ گئے تھے۔ آج وہ اکیلی آئی تھی۔ وہ جو صبح سے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا، اس نے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ کا بیٹا نہیں آیا آج؟''

''اسے بخار تھا۔ ظفریاب کے متعلق کچھ پتا چلا؟''

''اس کی بے تابی نے اسے تکلیف دی اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کہاں...... کہاں ہیں وہ؟ کیوں وہ انہیں لے گئے؟ کیا جرم ہے ان کا اور کون لوگ ہیں وہ......؟ اس طرح کسی کو قید میں رکھنا جرم ہے۔ اگر ان کا کوئی قصور ہے تو ان کے خلاف ایف آئی آر کٹوائیں۔ ہم بڑے سے بڑا وکیل کریں گے۔''

وہ بولتی رہی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں تو اس نے دل سے اٹھتے درد کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''بہت محبت کرتی ہیں آپ ظفریاب سے؟''

''ہاں......!''

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''اگر اس کی زندگی اور رہائی کے لیے کوئی قربانی دینی پڑی تو دے سکتی ہیں؟''

''میں ہر قربانی دے سکتی ہوں۔''

اس نے لمحہ بھر بھی نہ سوچا تھا اور ابرار شاہ کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ اسے ظفریاب کے متعلق بتانے لگا۔

اسے ظفریاب کے متعلق معلوم کرنے میں وقت نہیں لگا تھا۔ اس کے اپنے سورسز تھے۔ شاید وہ لوگ جن کا وہ ساتھی تھا وہ بھی جانتے ہوں گے لیکن کسی نے اس کے متعلق نہیں بتایا تھا اسے اب پتا چل گیا تھا تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ شاہ زیب تھا، جہاں زیب بیگ تھے۔ ان کے جاننے والے تھے، کوئی نہ

کوئی تو مدد کرے گا۔ صبوحی سوچ رہی تھی جب ابرار شاہ اپنی کتاب میز پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکا۔

"اس پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وقفے وقفے سے تشدد کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر اسے وہاں سے نکالا نہ گیا تو شاید وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے۔"

اور صبوحی کی آنکھوں سے آنسو کسی آبشار کی طرح پھوٹ پڑے تھے۔

"پلیز صبوحی اس طرح مت روئیں۔ مجھے آپ کے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے آپ کو ظفریاب کے متعلق حرف حرف سچ ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے وہاں سے نکلوا سکوں۔"

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا اس کے مخبر نے اسے بتایا تھا کہ اس کے بازو میں دو جگہ فریکچر ہے۔ وہ درد سے تڑپتا رہتا ہے۔ اس کے ہونٹ زخمی ہیں۔ اور خوراک نہ ہونے کے برابر ہے۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ انہیں وہاں سے آزاد کروا دیں۔ ہم ساری زندگی آپ کا یہ احسان نہیں بھولیں گے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"یہ آسان نہیں ہے لیکن میں پوری کوشش کروں گا۔" اس کی نظریں اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں سے اوپر اٹھیں اور اس کی ناک کی لونگ پر اٹک گئیں اور پھر بالوں کی اس لٹ سے الجھ گئیں جو دوپٹے سے باہر نکل کر اس کے رخسار کو چوم رہی تھی۔ اور وہ ایک خیال جو کچھ دیر پہلے اس کے دل میں آیا تھا ایک بار پھر حملہ آور ہوا اور اس بار وہ مغلوب ہو گیا۔

"یہ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر قائم ہے۔ میں اگر ظفریاب کو آزاد کرواؤں گا تو اس کے بدلے میں کچھ چاہوں گا بھی۔ میری ایک شرط ہے۔"

"ظفریاب کی رہائی اور زندگی کے عوض جتنا پیسہ بھی آپ کو چاہیے، وہ جیسے بھی ہوا ہم دیں گے۔ مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔"

اس کے پاس جو زیور اور جو کچھ موجود تھا وہ سب ابرار شاہ کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے بیچ دے گی۔ اس نے اسی لمحے سوچ لیا تھا۔

''پیسہ تو میرے پاس پہلے بھی بہت ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''آپ کو...... میں چاہتا ہوں آپ ظفریاب سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لیں۔'' وہ اپنی خواہش کے ہاتھوں پوری طرح مغلوب ہو چکا تھا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو......؟'' صبوحی کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑی تھیں۔

''تو...... آپ کبھی نہیں جان سکیں گی کہ وہ کہاں ہے۔ اور ایک روز وہ اس تہہ خانے میں اذیت اٹھا اٹھا کر مر جائے گا اور آپ کو کبھی پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس کی لاش کو کہاں پھینکوا دیا گیا ہے۔'' وہ سفاک ہوا اور اس کے لبوں سے سسکی کی طرح نکلا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔''

وہ میز سے کہنیاں اٹھا کر سیدھا ہوا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے کہا تھا آپ اس کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہیں۔''

لیکن ایسی قربانی کا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر بہنے لگے تھے۔ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ ایسی بھی کوئی بات کر سکتا ہے۔ پھر جیسے اس کے چہرے کے تاثرات سے اسے یقین ہو گیا اور اس نے فوراً ہی ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''ہاں...... میں دے سکتی ہوں ہر قربانی، اور دوں گی۔ آپ ظفریاب کو گھر لے آئیں۔''

چند لمحوں کے لیے ابرار شاہ کو یقین نہیں آیا کہ جو کچھ اس کے کانوں نے سنا، وہ سچ ہے۔

''اور آپ نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے اس پر قائم رہنا ہوگا ورنہ......''

وہ اب ہر صورت اسے یقینی بنانا چاہتا تھا۔ ورنہ کیا ہوگا صبوحی کو وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ورنہ کیا ہو سکتا ہے...... ''ورنہ'' میں چھپی دھمکی نے اسے حوصلہ دیا اور مضبوط کیا تھا۔ سب سے اہم ظفریاب کی بازیابی اور اس کی زندگی تھی۔

''میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔ ہمارے درمیان ایک سودا ہوا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ

خریدنے اور بیچنے والے دونوں کو فیئر ہونا چاہیے۔ اس لیے میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں ظفر یاب سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کی زندگی کی شریک بن کر آپ کی زندگی میں شامل ہو جاؤں گی لیکن محبت پر میرا اختیار نہیں ہے۔ وہ کبھی طلب مت کیجیے گا۔ میں شاید کبھی آپ کو خوشی نہ دے سکوں۔"

اس نے بہت امید سے اسے دیکھا کہ شاید وہ اپنی شرط واپس لے لے لیکن وہ تو ایک انوکھی سی خوشی میں سرشار تھا۔ اس کے اندر جیسے یہ انوکھی خوشی رنگوں کی ہولی کھیل رہی تھی۔ اور وہ ان رنگوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ نہ اسے اس کی ایک دم ویران ہوتی آنکھیں دکھائی دی تھیں اور نہ چہرے پر بکھرتی زردیاں......

وہ بے حد سرشار سا جذب میں ڈوبا کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔ ہاں تم جب بھی چاہو جو بھی چاہو مجھ سے طلب کر سکتی ہو، سوائے اپنی جدائی کے، تمہارے مانگنے یا خواہش کرنے سے پہلے ہی تمہاری تحویل میں دیا، وہ سب جو تم چاہو گی۔"

وہ اسے آپ کے بجائے تم کہہ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں جذبے لٹاتی تھیں۔

"تمہاری میرے پاس موجودگی اور ملکیت ہی میری بادشاہی ہے، یہ میرے لیے بہت ہوگا۔ بہت سے بھی زیادہ......تم نے میرے دل کو درد آشنا کیا...... تمہیں دیکھنے سے پہلے میں محبت کے درد سے نا آشنا تھا۔ میری بیوی تھی، دو بچے تھے لیکن محبت پہلی بار کسی وحی کی طرح میرے دل پر اتری لیکن پھر تم میری زندگی سے چلی گئیں۔ اگر تم دوبارہ مجھے نہ ملتیں تو میں شاید ساری زندگی اس محبت کو جھٹلاتا رہتا جو روزِ اول کی طرح ہی میرے دل میں موجود تھی۔

لیکن تم نے دوبارہ آ کر وہ ساری دیواریں ڈھا دیں جو میں نے اس جذبے کے گرد کھڑی کی تھیں اور وہی ادھوری رسائی بھی میرے لیے کسی بہت قیمتی خزانے سے کم نہیں ہے۔ تم میرے سنگ ہو گی میرے سامنے ہو گی تو پھر اور کوئی آرزو باقی نہیں رہے گی تم جو بھی سوچو گی جو بھی کہو گی مجھے گراں نہیں

گزرے گا۔ میں تمہاری سوچوں کے ہر رنگ کے پھول کو اپنا مقدر جان کر ان کی پنکھڑیوں سے دل بہلاتے زندگی گزاروں گا۔

دل کے آتش فشاں سے پھوٹنے والے اس جذبے کی حرارت تو پہاڑوں کو پگھلانے کی طاقت رکھتی ہے بنجر زمینوں میں پھول اگا سکتی ہے شاید کبھی تمہارے دل کے کسی کونے میں تھوڑی سی جگہ مجھے بھی مل جائے۔ شاید کبھی تم میرے اس جذبے کی تھوڑی سی ہی پذیرائی کر سکو جسے میں نے دس سالوں سے سینت سینت کر خود سے بھی چھپا کر رکھا ہوا تھا اور جو دوبارہ تمہیں اپنے روبرو دیکھ کر میرے اختیار سے باہر ہو گیا۔"

وہ بول رہا تھا اور وہ ساکت بیٹھی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہوا تو جیسے وہ کسی گہری نیند سے بیدار ہو کر تیزی سے اٹھی تھی۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا صبوحی۔" وہ بھی جیسے کسی خواب کی سی کیفیت سے چونکا تھا۔

اس نے سر ہلایا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکی لیکن اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے اندر اتنی لرزش تھی کہ اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکے گی، جیسے وہ واپس گھر پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی کہیں گر کر ختم ہو جائے گی۔

اور اس کے دل نے شدت سے خواہش کی تھی کہ وہ بس ختم ہو جائے ظفریاب رہا ہو جائے زندہ رہے، لیکن وہ وعدہ نبھانے کے لیے باقی نہ رہے۔

لیکن جو انسان چاہتا ہے ایسا کب ہوتا ہے۔ ظفریاب اگلے روز گھر آ گیا تھا یوں کہ اس کا پورا وجود زخم زخم تھا۔ صرف بازو ہی فریکچر نہیں تھا، پاؤں کی ایک ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی اور وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ بغیر سہارے کے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے وعدہ نبھانا تھا اور اس نے نبھایا بھی لیکن ابرار شاہ سے اس وقت تک کی مہلت لے لی تھی جب تک ظفریاب صحت مند نہیں ہو جاتا اور ابرار شاہ نے اسے مہلت دے دی تھی۔ اور اس نے دن رات ظفریاب کی خدمت کی۔ بقول بی بی اماں کے اس نے تو ظفریاب کی چارپائی ہی پکڑ لی تھی۔

اور جس روز ظفریاب کے بازو کا پلاسٹر اترا اور جس روز وہ اپنے قدموں سے چل کر باہر مارکیٹ تک گیا، اس روز اس نے ظفریاب سے جدائی طلب کر لی۔ اور سب کو حیران چھوڑ کر چلی گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ اتنا کرب ناک فیصلہ کیوں کیا ہے۔ سب نے وجہ جاننے پر اصرار کیا، روکا، منتیں کیں۔ اس قصور کی معافی مانگی جس کا خود انہیں علم ہی نہیں تھا لیکن اس نے چپ اوڑھ لی تھی لیکن اس کی وہ آنکھیں جو ظفریاب کے آنے کے بعد بھی مسلسل بھیگی رہتی تھیں اس وقت چھاجوں چھاج برسی تھیں جب ظفریاب نے کہا تھا۔

''تم زین کے بغیر کیسے رہو گی صبوحی! اسے ساتھ لے جاؤ، چاہو تو......''

اکلوتے بیٹے میں دونوں کی ہی جان تھی۔ ظفریاب کو بچے بہت پسند تھے وہ اکثر کہتا تھا کم از کم چار بچے تو ہونے چاہئیں صبوحی...... اور وہ اب اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ زین کو چاہے تو ساتھ لے جائے۔

''میں آپ پر ایک اور ظلم نہیں کر سکتی۔'' اسے آنسوؤں کی بوچھاڑ میں ظفریاب کا چہرہ دھندلا سا نظر آیا تھا اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

عدت کا عرصہ اس نے اپنے میکے میں گزارا تھا۔ وہاں بھی سب نے سمجھایا تھا۔ کوئی بھی اس کے اس فیصلے پر خوش نہ تھا۔ تیسرا نوٹس ملنے تک سب ہی اسے سمجھاتے رہے تھے لیکن یہاں بھی وہ چپ رہتی تھی۔ اور پھر عدت ختم ہونے کے تقریباً دو ہفتے بعد ابرار شاہ اس کے ساتھ نکاح کر کے اسے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف اس کے چند بہت رازدار دوست آئے تھے۔

اس بار اس نے اظہار شاہ سے بھی اجازت نہیں لی تھی نہ ان سے ذکر کیا تھا۔ وہ اب تیئس چوبیس سال کا یونیورسٹی کا طالب علم نہیں تھا، چونتیس پینتیس سال کا ایک خود مختار مرد تھا۔ اس نے اپنی شادی کو خفیہ رکھا تھا اور صبوحی کو لے کر اسلام آباد چلا گیا تھا۔ جہاں اس کی طلاق کے بعد اس نے ایک چھوٹا سا گھر لے لیا تھا۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد وہ سیاست سے بددل ہو کر امریکا چلا گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اس نے صبوحی کو بھی بلا لیا۔ جتنا عرصہ وہ پاکستان میں رہا، ایک ہفتہ لاہور اور ایک ہفتہ اسلام آباد رہتا تھا۔

وہاں کسی کو اس کی شادی کا معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن امریکا آنے کے بعد جب اس کی اور صبوحی کی شادی کو تین برس ہو گئے تھے ایک روز اچانک اس کے ایک چچازاد بھائی بغیر اطلاع کے اس سے ملنے چلے آئے۔ اس کا یہاں اپنا اپارٹمنٹ تھا۔ صبوحی کے ساتھ شادی سے کافی پہلے اس نے یہ اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا، اپنے اپارٹمنٹ میں ہی ٹھہرتا تھا۔ اس کی فیملی کے زیادہ تر لوگوں کے پاس امریکن پاسپورٹ تھے۔ وہ سال میں ایک دو چکر تو یہاں کے لگا تا ہی تھا اس کے دوست احباب بھائی کزن وغیرہ بھی جب آتے تو اسی کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرتے تھے۔

یوں اس کی شادی کا راز کھل گیا تھا۔ اور اس کی توقع کے مطابق گھر میں خوب ہنگامہ ہوا تھا۔ پورا خاندان عفت کے ساتھ کھڑا تھا اور اس پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنی دوسری بیوی کو فوراً طلاق دے دے۔

اظہار شاہ بھی اس سے خفا تھے اور وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ جس کسی سے اس نے شادی کی ہے، اسے کچھ دے دلا کر فارغ کر دے اور اس نے ان سب کے فون اٹینڈ کرنا چھوڑ دیے تھے۔ اور پھر یہ اظہار شاہ اور اس کے تایا جہانگیر شاہ ہی تھے جنہوں نے عفت کو سمجھایا تھا اور معاملات کو ہینڈل کیا تھا اور وہ سات آٹھ ماہ بعد پاکستان کا چکر لگانے لگا تھا۔ گو عفت کا رویہ بہت خراب ہوتا تھا لیکن وہ اگنور کرتا تھا۔ جتنا عرصہ وہ پاکستان میں رہتا تھا، اس کا موڈ خراب رہتا تھا۔ اور وہ مسلسل طنز کرتی رہتی تھی وہ پروا نہیں کرتا تھا لیکن اسے اپنی چھوٹی لاڈلی بیٹی کی ناراضی تکلیف دیتی تھی۔ وہ اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کی موجودگی میں ٹیبل پر نہیں آتی تھی۔ باقی بچے چند دنوں بعد ویسے ہی ہو گئے تھے پہلے کی طرح ہی لاڈ اور فرمائشیں کرتے تھے، انہوں نے ذہنی طور پر اس شادی کو قبول کر لیا تھا لیکن چھوٹی نے نہیں......

شاید کچھ وقت اور گزر جائے تو وہ بھی اس شادی کو ذہنی طور پر قبول کر لے۔ 1988ء کے بعد اظہار شاہ نے بہت چاہا کہ وہ پاکستان آ کر اپنی پارٹی کے لیے کام کرے لیکن وہ اب واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ البتہ کچھ عرصے بعد وہ یو کے منتقل ہو گئے تھے۔ اور لندن کے علاوہ بھی دو تین اور شہروں میں اس نے بڑے بڑے اسٹور بنا لیے تھے اور بے حد مصروف ہو گیا تھا۔ تاہم ہر سال تین چار ہفتوں کے لیے پاکستان ضرور آتا تھا۔ صبوحی ایک اچھی بیوی کی طرح اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ عفت نے کبھی

اس کا اس طرح خیال نہیں رکھا تھا۔ اس کے بیٹے اور بڑی بیٹی بھی امریکا کے قیام کے دوران ہی اس کے گھر آنے لگے تھے اور صبوحی کا رویہ ان کے ساتھ بہت دوستانہ اور محبت بھرا تھا۔ وہ بھی اس کی عزت کرتے اور اس کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے۔

لندن میں بھی وہ چھٹیوں میں اکثر آجاتے تھے۔ وہ آج بھی اس سے اتنی ہی شدید محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے پاس تھی وہ اسے دیکھ سکتا تھا، چھو سکتا تھا۔ گو کہ اس نے صبوحی سے کہا تھا کہ وہ کبھی اس سے اپنی محبت کے جواب میں محبت طلب نہیں کرے گا، وہ اپنے وعدے پر قائم بھی تھا لیکن کبھی کبھی دل بے اختیار چاہنے لگتا تھا کہ وہ جب دن بھر کا تھکا ہارا گھر آئے تو اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تارے دمکنے لگیں۔ لبوں پر مسکراہٹ آجائے۔ وہ جب اس کی طرف دیکھے تو اس کی آنکھیں بھی محبت کے جذبے لٹائیں۔

وہ کئی ہفتوں بعد جب پاکستان سے آئے تو بے تابی سے اس کا استقبال کرے، اس سے کہے کہ اس نے اسے بہت مس کیا۔ لیکن جانتا تھا یہ سودا اس نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا۔ کبھی کبھی جب اس کے سپاٹ چہرے اور بے رنگ آنکھوں کو دیکھتا تو اسے پچھتاوا ہوتا، وہ ان لمحوں پر دل ہی دل میں بے حد شرمندہ ہوتا جب وہ ایک منہ زور خواہش سے مغلوب ہو کر اس پر ظلم کر بیٹھا تھا۔ اس پر جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ محبت تو یہ تھی جو صبوحی نے ظفریاب سے کی تھی، اس کی زندگی اور رہائی کے لیے۔ اس کی قربانی دل گرما دینے والی تھی، اس نے قربانی دے کر اپنے دل کو سولی پر لٹکا لیا تھا۔ ایسی وفا، ایسی محبت...... یہ شدید عشق سے بھی کچھ اوپر تھا۔ اسے اپنا آپ اس کے سامنے بونا سا لگنے لگا تھا۔

وہ اکثر سوچتا تھا کہ ایسی وفا ایسی قربانی جو صبوحی نے دی کیا دنیا کی کسی عورت میں پائی جا سکتی ہے۔ وہ جو تکلیف اسے دے چکا تھا اس کا ازالہ کرنے کے لیے ایک بار اس نے کہا تھا۔

”صبوحی! تم اپنے بیٹے کو لے آؤ، میں اسے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ بہت خیال رکھوں گا اس کا۔ تمہیں کبھی شکایت نہیں ہوگی مجھ سے۔“ تب اس نے بے حد زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں نے خود کو ان سے چھین لیا کیا ان کے بیٹے کو بھی ان سے چھین کر انہیں بالکل تہی دامن کر دوں...... ظفر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں زین کو لے جاؤں، میں خود نہیں لائی۔“

اور وہ جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے وہ پہاڑ کی سی بلندی پر کھڑی ہے۔ اس کے تج دینے میں خود کو اپنے ہی ہاتھوں اپنی محبت اور جنت سے محروم کر دینے میں جو شدتیں تھیں اس نے چند لمحوں کے لیے جیسے اس کی گویائی چھین لی تھی۔ بہت دیر بعد وہ بولا تو اس کی آواز مدھم اور ندامتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''میں تو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے چاہا تھا کہ تم زین کو لے آؤ، اور تم یہ جو روبوٹ کی سی زندگی گزار رہی ہو، اس میں زین کی موجودگی شاید زندگی کی کوئی حرارت پیدا کر دے۔''

اس بار صبوحی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، لیکن اس کی زخمی نظروں میں کرب سا پھیلتا چلا گیا تھا۔ تب اس نے چاہا تھا کہ اگر صبوحی اور اس کا کوئی بچہ ہو جائے تو شاید اس کے لبوں پر مسکراہٹ نظر آنے لگے۔ شاید یہ بچہ ان کے درمیان وہ پل بن جائے جو اس سرد مہری کو ختم کر دے لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد اس کی دعا پوری ہوئی تھی۔ اللہ نے انہیں بیٹے سے نوازا تھا لیکن صبوحی ویسی ہی تھی، کم گو اور خاموش......

وہ ہنسنا بھول گئی تھی۔ کبھی کبھی احساس جرم اتنا بڑھ جاتا کہ کئی کئی راتوں تک سو نہ سکتا تھا تب ہی اس نے ایک فیصلہ کر کے اس سے کہا۔

''میں نے تم پر بہت ظلم کیا صبوحی...... میں جانتا ہوں تم خوش نہیں ہو۔ ریان کا ہونا بھی تمہیں خوش نہیں کر سکا تو اگر تم واپس ظفریاب کے پاس جانا چاہو تو میں تمہیں......''

اور تب اس نے بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''میں ایسا نہیں چاہتی نہ کبھی چاہوں گی۔''

اور ابرار شاہ کے اندر یک دم کچھ دیر پہلے جو سناٹے اتر آئے تھے، وہاں ایک بار پھر چہل پہل اور رونق ہو گئی تھی۔

''ہاں اگر آپ میری رفاقت سے تھکنے لگے ہیں تو......''

''نہیں......'' ابرار شاہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''میں اس ادھوری رسائی پر بھی بہت شانت اور مطمئن ہوں۔ میں نے اسے ایسے ہی قبول کر لیا ہے۔ لکیروں میں تمہارا ساتھ ایسا ہی اور اتنا ہی لکھا تھا، میں نے اسے قبول کیا تھا۔ میں تو تمہارے لیے کہہ رہا تھا کہ تم اداس رہتی ہو۔ ریان کا ہونا بھی تمہیں خوشی نہیں دے سکا تو اگر تم ظفریاب کے پاس جانا چاہو تو میں خود ظفریاب سے مل کر سب کچھ بتا دوں گا، اپنا جرم اور تمہاری اس کے ساتھ محبت اور وفا......

میں اسے بتاؤں گا کہ وہ ایک خوش نصیب انسان ہے کہ اللہ نے اسے ایسی رفیق حیات دی تھی جس کی وفا انمول اور جس کی محبت لاثانی ہے۔ یہ میں تھا جس نے اس کے ہاتھ میں ایسا ترازو پکڑا دیا تھا جس میں ایک طرف اس کے رفیق کی زندگی تھی اور دوسری طرف ہجر تھا جدائی تھی اور ایک ناپسندیدہ رفاقت اور اس نے اپنے لیے ہجر چنا اور تمہارے لیے زندگی۔ میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے دل کی پوری سچائی اور خلوص سے کہا تھا۔ ظفریاب اب کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، میں نہیں جانتا لیکن میں نے سوچا تھا کہ ہم معلوم کروا لیں گے۔''

یہ سچ تھا کہ گزرے سالوں میں نے اس کبھی ظفریاب کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شادی کر چکا ہے یا نہیں۔ صبوحی کو اس کے خلوص پر شک نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے سچ جھلکتا تھا۔

''تو......؟'' اس نے ابرار شاہ کی طرف دیکھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ہمارا بیٹا ماں اور باپ دونوں کے سائے تلے پلے۔ اسے ماں یا باپ کسی کی محبت سے بھی محروم نہ ہونا پڑے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کو خوشی نہیں دے سکتی۔ شاید میں ریان کے لیے خود غرض ہو رہی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ زین کی طرح ریان بھی ماں یا باپ کی محبتوں سے محروم زندگی گزارے۔ میں زندگی بھر آپ سے کچھ اور طلب نہیں کروں گی۔''

''نہیں تم خود غرض نہیں ہو صبوحی...... تم تو محبتوں کی اوج کمال پر ہو۔ اور میں نے تمہیں کہا ہے نا میں خوش ہوں، بہت خوش...... تم نہیں جانتی صبوحی کہ تمہاری محبت میرے ماضی، حال اور مستقبل پر حاوی

ہو چکی ہے۔ اور میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے بیٹے کو تمہاری یا اپنی محبت سے محروم نہیں کروں گا۔" اس نے صبوحی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے گود میں سوئے ریان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"میں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا۔ میرا جرم بہت بڑا ہے۔ کبھی تمہارے دل میں میرے لیے اتنی وسعت پیدا ہو سکے کہ مجھے معاف کر سکو تو مجھے معاف کر دینا۔ ابرار شاہ کو نہیں، ریان کا باپ سمجھ کر ہی۔" اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔

"آپ نے ایک آفر کی تھی میں نے اس آفر کو قبول کیا۔ انکار بھی کر سکتی تھی لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس سودے کو منظور کیا۔ پھر معافی کس بات کی۔ میں یہاں اس گھر میں اپنی مرضی سے موجود ہوں، اور آپ نے بھی اپنی خوشی سے اس بے فیض رفاقت کو قبول کیا۔" وہ سر اٹھائے ابرار شاہ کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اور نو سالوں کی رفاقت میں پہلی بار ابرار شاہ نے ان سپاٹ بنجر آنکھوں میں تھوڑی سی نرمی اور تھوڑا سا نم دیکھا تھا۔ اس کے اندر ایک ساتھ امید کے کئی دیے روشن ہو گئے تھے کہ شاید کبھی ان آنکھوں میں اس کے لیے کوئی محبت کا تارہ چمکے۔ شاید کبھی اس کے دل کے کسی چھوٹے سے گوشے میں اس کے لیے محبت اور نرمی پیدا ہو جائے۔ بہت زیادہ نہ سہی، بس تھوڑی سی۔

اور وہ صبوحی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرایا۔ صبوحی نے نظریں جھکا لی تھیں اور پہلی بار ابرار شاہ کو اس کے ہاتھوں کے لمس میں سرد مہری ٹھنڈک کا نہیں، خلوص کی حرارت کا احساس ہوا تھا اور یہ حرارت اسے یقین دلا رہی تھی کہ کبھی ہاں کبھی......شاید......

☆......☆......☆

اور وہ وجدان احمد تھا۔ وہ ایک بہترین صنعت کار ہی نہیں، ایک ذہین صحافی بھی تھا۔ اسے جمع تفریق کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ سمیرا کے ڈیڈی نے دوسری شادی کی تھی اور وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ یو کے میں رہتے تھے۔ سمیرا اپنے ڈیڈی کی دوسری شادی کی وجہ سے بہت

ڈسٹرب رہی تھی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانا پڑا تھا اور تقریباً ایک سال تک اس کا علاج ہوتا رہا تھا۔ اور بعد میں بھی وہ سیشن لیتی رہی تھی۔ اور یہ سب اسے خود سمیرا نے بتایا تھا۔ اس کے ڈیڈی نے کس سے شادی کی تھی، نہ سمیرا نے کبھی بتایا نہ اس نے کریدنے کی کوشش کی تھی۔

وہ جو بڑے بڑے سیاست دانوں اور جاگیرداروں کے چھپے راز اور خباثتیں جان لیتا تھا تو ابرار شاہ نے کس سے شادی کی تھی، اس کے لیے جاننا مشکل نہ تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو چند گھنٹوں میں جان لیا کہ ابرار شاہ نے دوسری شادی صبوحی ظفریاب سے کی تھی۔ صبوحی ظفریاب جو آزین کی ماں تھیں۔ تو اس کا صاف مطلب تھا کہ اس نے سوچ سمجھ کر ثوبیہ سے روابط بڑھائے تھے اور اس کے ساتھ موروں والی حویلی میں آئی تھی۔ وہ بھی تو ایک صحافی تھی اور اس کے لیے بھی یہ معلوم کرنا کون سا مشکل تھا کہ اس کی سوتیلی ماں کون ہے۔ اور پھر جب ایک روز ثوبیہ نے گروپ میں بیٹھے بیٹھے ذکر کیا تھا کہ وہ لوگ آزین ظفریاب کے گھر اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ ظفریاب کا نام سن کر چونکی تھی۔ حالانکہ دو تین بار پہلے بھی ثوبیہ نے ذکر کیا تھا کہ مرسل اور اسد وغیرہ فلاحی کام کرتے ہیں اور وہ جتنا بھی ہوسکتا ہے ان کی مدد کرتی ہے لیکن تب اس نے فلاحی کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تھی لیکن پھر یکایک اس نے فلاحی کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور ثوبیہ جو پہلے صرف عام کلاس فیلو تھی، اس کی گہری دوست بن گئی تھی۔

وہ سمیرا کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر کوئی اسے ذرا سی تکلیف بھی دیتا تو وہ بدلہ لیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہ اسکول کے زمانے سے ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ ساتویں جماعت میں تھا جب پہلی بار اس نے سمیرا کو روتے دیکھا تھا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گری تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے خون رس رہا تھا۔

"کیا ہوا سمیرا......؟"

وہ اس کی ہم جماعت تھی اور نام کی حد تک وہ اسے جانتا تھا۔ جس اسکول میں وہ پڑھتے تھے وہاں آٹھویں جماعت تک لڑکے لڑکیوں کی کمبائن کلاسز ہوتی تھیں پھر نویں جماعت میں آکر نہ صرف سیکشن الگ ہو جاتے تھے بلکہ گرلز اور بوائز کے بلاکس بھی الگ تھے لیکن اس روز ان کے درمیان دوستی

کی جو بنیاد پڑی وہ کبھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

یہ دوستی محبت میں کب ڈھلی اسے معلوم نہ تھا۔ بس ایک روز اچانک ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ سمیرا ابرار شاہ سے محبت کرنے لگا ہے اور ابھی اظہار کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ایک روز یونی میں دو گروہوں کی لڑائی میں اسے گولی لگ گئی۔ ایک گروپ کے لڑکے نے پسٹل نکال لیا تھا۔ وہ شاید گھر سے لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ اتفاقاً ہی اس طرف آ نکلا تھا جدھر لڑائی ہو رہی تھی اور لڑکے کے پستول سے نکلی ہوئی گولی اس کے بازو میں لگ گئی تھی۔ ہاسپٹل پہنچنے تک کافی خون بہہ گیا تھا۔ گو ہڈی بچ گئی تھی۔ لیکن سمیرا کی حالت کافی خراب تھی۔ اس نے دیکھا تھا وہ کبھی نرسز سے جھگڑتی کبھی ڈاکٹروں کی منتیں کرتی تھی۔

''اس کا بہت خون بہہ گیا ہے۔ پلیز اسے خون چڑھائیں۔ میرا بلڈ گروپ چیک کریں اور اگر ایک ہی ہے تو میرا خون لے لیں۔''

''ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے بی بی!'' ایک ڈاکٹر نے اسے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''لیکن اس کا اتنا زیادہ خون بہا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں آپ کو نہیں پتا۔'' وہ ایک ڈاکٹر سے بحث کر رہی تھی اس نے نیم غنودگی میں سنا تھا۔ ان دوائیوں کے زیر اثر جو ڈاکٹر نے درد دور کرنے کے لیے دی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اور پھر وہ اس وقت تک ہاسپٹل میں رہی تھی جب تک اس کے گھر سے بابا اور چاچو نہیں آ گئے تھے۔ وہ اس وقت جب اسے گولی لگی تھی اس کے ساتھ ہی تھی اور یونی سے دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہی ہاسپٹل آئی تھی۔

شام تک اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا کہ گولی نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ گھر آ کر چاچو نے اسے چھیڑا تھا۔

''یار! وہ لڑکی کون تھی۔ کوئی بہت ہی خاص اور تم اتنے گھنے ہو کہ ذکر تک نہیں کیا مجھ سے کہ کیا کہانی چل رہی ہے۔'' چاچو عمر میں اس سے دس سال بڑے تھے لیکن دونوں میں بہت دوستی تھی۔

''نہیں چاچو، ایسی تو کوئی بات نہیں بس ہم اچھے دوست ہیں۔'' وہ جھینپ گیا تھا۔

''صرف اچھے دوست...... اب اپنے یار سے بھی چھپاؤ گے۔ اس لڑکی کا رونا، اس کی بے چینی......اضطراب تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے یعنی کہ دوستی سے بڑھ کر ہے کچھ۔''

اور اس کے دل میں خوش گوار سی دھڑکنوں کا ردھم شروع ہو گیا تھا۔ یعنی اس کا جذبہ یک طرفہ نہیں ہے۔

''ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں شہزادے! وہ لڑکی تم سے محبت کرتی ہے۔'' چاچو اسے چھیڑ رہے تھے اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اور اگلے دن وہ یونی جانے کے بجائے اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر چلی آئی تھی۔ اس نے ناشتا اپنے کمرے میں ہی کیا تھا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اخبار دیکھ رہا تھا، جب چاچو اسے اپنے ساتھ کمرے میں ہی لے آئے تھے۔

''یہ تمہاری کلاس فیلو تمہاری مزاج پرسی کے لیے آئی ہیں۔'' معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے وہ چلے گئے تو اس نے سمیرا کی طرف دیکھا تھا۔

''تم آج یونی نہیں گئیں؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا تھا اور پھر آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

''ارے کیا ہوا سمیرا؟ تمہارے گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟'' وہ بالکل نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

''ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم، تم ٹھیک ہونا۔ کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے؟''

''نہیں یار، میں ٹھیک ہوں۔ گولی بس گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔'' اس نے اسے تسلی دی۔

''تم یوں ہی پریشان ہو رہی ہو۔''

''تمہیں نہیں پتا وجدان! میں بہت ڈر گئی تھی۔ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔ مین سچ میں مر جاتی وجدان...... میں...... میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تم نہیں جانتے نا۔ تمہیں کبھی پتا ہی نہیں چلا

کہ میں نے صرف تمہاری وجہ سے جرنلزم میں ایڈمیشن لیا تھا۔ مجھے تو کبھی بھی جرنلزم میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ادب سے بھی بس فکشن پڑھنے تک دلچسپی رہی تھی۔ بھائی نے، ڈیڈی نے سب منع کیا۔

سب ہی حیران تھے کہ میں بھلا جرنلزم کیوں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے کون سا صحافی بننا ہے یا کہیں جاب کرنی ہے۔ دادا جان نے کہا، ایم اے کرلو اگر مزید پڑھنے کا اتنا ہی شوق ہے۔ بھائی نے کہا انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرلو۔کون سا تم نے کہیں جاب کرنی ہے۔بس رعب شعب ڈالنے کے لیے ہی ماسٹر کرنا ہے تو جرنلزم میں کرنے کی کیا تک ہے۔نری خواری، لیکن مجھے تو تمہارے نزدیک رہنا تھا۔ میں نے تو ہمیشہ وہ ہی مضامین لیے جو تم لیتے تھے۔'' وہ اعتراف کا دن تھا۔ پہل اس نے کی تھی تو اس نے بھی اعتراف کرلیا تھا کہ محبت کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں ہے، وہ اس کا ہم سفر ہے۔اور اس کے جانے کے بعد اس نے چاچو سے پوچھا تھا۔

''آپ کو سمیرا کیسی لگی چاچو؟''

''جہاں تک شکل وصورت کی بات ہے تو میں نے دھیان سے نہیں دیکھا۔اور اس کی ذات کی کیا خامیاں اور کیا خوبیاں ہیں، ان کا بھی مجھے علم نہیں ہے۔لیکن ایک بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے۔تو جہاں محبت ہو وہاں باقی سب چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور محبت کی قدر کرنی چاہیے کہ محبت سے خالی زندگی کسی خالی برتن جیسی ہوتی ہے۔یا پھر اس درخت جیسی جس پر نہ پھول پتے اگتے ہیں نہ پھل لگتا ہے۔بس خالی سوکھی ٹہنیاں جو صرف جلانے کے کام آتی ہیں۔بے کار اور بے فیض درخت بننے سے بہتر ہے کہ بھرا ہوا برتن اور پھل دار درخت بنو۔''

اسے چاچو ہمیشہ بہت گہرے لگتے تھے لیکن انہوں نے اپنا راز کسی کو نہیں دیا تھا کبھی۔

اعتراف کے بعد ہر گزرتے دن نے انہیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے پر عیاں کیا ہوئے تھے کہ ایک دوسرے پر اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔خاص طور پر سمیرا اور وہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے احساسات کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔وہ بے حد حساس تھی۔اس نے اسے اس کی خامیوں خوبیوں سمیت چاہا تھا۔اس نے کبھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔وہ تو جیسے منتظر

رہتا تھا کہ وہ کچھ کہے اور وہ اس کی خواہش پوری کرے۔

اس نے کہا وہ اس وقت تک اپنا رشتہ نہ بھیجے جب تک میری کی شادی کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔حمیرا اس کی بہن جس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی اس کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔لڑکے کے غیر سید ہونے پر بھی سمیرا کی فیملی کو زیادہ اعتراض نہ تھا۔مسئلہ سوشل اسٹیٹس تھا۔جب کہ خاندان میں کئی اچھے تعلیم یافتہ لڑکے موجود تھے۔

''اوکے۔'' وجدان نے دوسری بات ہی نہیں کی تھی۔حالانکہ اس کے بابا اور ماما جلد اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔اس نے چاچو کو سمیرا کی خواہش بتا دی تھی۔جانتا تھا چاچو سب کو قائل کر لیں گے۔لیکن وہ ایک سچا کھرا اور مخلص شخص تھا اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی۔کبھی کسی کو اپنی ذات سے تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔جب سے اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے تب سے وہ بہت اذیت میں تھا۔وہ انجانے میں استعمال ہوا تھا اور استعمال کرنے والی ہستی کون تھی۔وہ جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا۔اسے خود پر غصہ آتا تھا کہ وہ کیوں نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔اس نے جاننے کی، کھوج لگانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوری جزئیات کے ساتھ اس کی نظر کے سامنے آنے لگی تھیں۔

سمیرا کا تنہا اسے زل کے پاس چھوڑ کر ادھر ادھر ہو جانا اور پھر اچانک آزین کے ساتھ آ جانا اور ایسے ہی کئی واقعات تھے جن کے معانی اس پر اب کھلے تھے۔کاش اسے پہلے ہی علم ہو جاتا تو......

جب پہلی بار اسے شک ہوا تھا تو وہ بزنس ٹور پر جاپان جا رہا تھا۔وہ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اسے جانا پڑا تھا کہ چاچو اسے ہر صورت ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے۔پہلے جب بھی وہ بزنس ٹور پر باہر جاتے تھے، کبھی کچھ زیادہ دن بھی لگ جاتے تھے لیکن اس بار تو چاچو اسے ساتھ لیے لیے ایک سے دوسرے ملک جا رہے تھے۔جاپان سے ہانگ کانگ، وہاں سے سنگاپور...... ابرار شاہ اور صبوحی ظفریاب کی شادی کے متعلق جاننے کے بعد اس نے اس کے فون اٹینڈ کرنا بند کر دیے تھے۔اس کے میسج کے جواب نہیں دیتا تھا۔اور اب پاکستان آنے کے بعد بھی اس نے ابھی تک سمیرا سے رابطہ نہیں کیا

تھا۔ حالانکہ اسے واپس آئے چار دن ہو گئے تھے۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا، شاید اب بھی کرتا ہو۔ لیکن اس وقت اس کے اندر صرف غصہ تھا اس کے لیے اور بس......

اسے افسوس تھا کہ اس نے اس لڑکی سے محبت کی جس کا ظرف اتنا چھوٹا، دل اتنا تنگ اور ذہن اتنا سازشی تھا۔ نہیں مجھے ابھی سمیرا سے بات نہیں کرنی۔ اس نے اپنا فون آف کر رکھا تھا۔ لیکن سمیرا جو اس کے فون اٹینڈ نہ کرنے اور میسجز کے جواب نہ دینے پر پریشان تھی، بار بار آفس فون کر کے پتا کرتی تھی کہ وہ واپس آیا ہے یا نہیں اور جب اسے آفس سے پتا چلا کہ وہ آ گیا ہے لیکن گھر پر ہے اور آفس نہیں آ رہا، اس کا سیل تو آف تھا کہ کہیں وہ بیمار نہ ہو پریشان ہو کر اس نے گھر کے نمبر پر فون کیا تو اس کی بہن نے بتایا کہ بھائی گھر پر ہی ہیں اور سمیرا سے بات کر کے اس نے وجدان کو سمیرا کے فون کا بتایا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد سمیرا وہاں موجود ہوگی۔ اور وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ غصے میں اسے کوئی الٹا سیدھا بولے۔

اس روز کے بعد وہ کبھی کبھار گھر آ جایا کرتی تھی۔ اور گھر میں اس کی دونوں بہنوں اور امی کے ساتھ کافی گپ شپ تھی۔ چھوٹے بھائی اور چاچو سے بھی بے تکلفی سے بات چیت ہوتی تھی اس کی۔

''سمیرا آپی کہہ رہی تھیں کہ آپ کا فون آف ہے اس لیے انہوں نے لینڈ لائن پر کیا ہے۔'' اس کی بہن نے مزید بتایا تو اس نے سر ہلایا۔

''ہاں میرا فون خراب تھا۔'' اور تیزی سے اپنے کمرے سے نکل گیا۔ لاؤنج میں چاچو صوفے پر ٹانگیں دراز کیے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں صبح کا اخبار تھا۔ آج سنڈے تھا اس لیے سب ہی گھر پر تھے۔

''کہاں جا رہے ہو صاحب زادے......؟'' چاچو نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ذرا آزین کی طرف جا رہا ہوں۔'' بلا ارادہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا حالانکہ وہ اس ارادے سے نہیں اٹھا تھا۔ وہ تو بس سمیرا سے بچنا چاہتا تھا۔ سوچا تھا کچھ دیر یوں ہی لانگ ڈرائیو کر کے واپس آ جائے گا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے زین کی طرف جانا چاہیے۔ بہت دیر تک وہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا اسے زین اور زمل کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیاں دور کرنی تھیں۔ زین کو وہ سچ بتانا

تھا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

''تمہارا قلم بہت خطرناک ہو گیا ہے وجدان! ہاتھ ذرا ہولا رکھو بچے، تم ہمیں بہت عزیز ہو۔''

چاچو نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ چونکا۔

''جی چاچو......'' اور پھر ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اپنے گھر سے آزین کے گھر تک وہ سوچتا آیا تھا کہ اسے اس سے کیسے بات کرنی ہے۔ کس طرح اسے بتانا ہے کہ اس کے اور زمل کے رشتے کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس کی وجہ سمیرا ہے۔ اسے زین سے معافی مانگنی ہے کہ اس کی وجہ سے اگر کوئی غلط فہمی ہے تو وہ دور کر لے۔ وہ جو لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ قلم اٹھاتا تھا تو پھر خود بخود جیسے قلم بولنے لگتا تھا اب لفظ ترتیب دیتا جملے بناتا اور خود ہی رد کر دیتا۔

کنفیشن باکس میں کھڑے ہو کر خود اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا یقیناً آسان نہیں ہوتا ہوگا۔ اس نے سوچا تھا لیکن اسے یہ مشکل کام کرنا تھا۔

لیکن جب وہ حویلی پہنچا تو شیخو بابا نے اسے بتایا کہ مرسل، اسد، طیب اور عمر بھی آئے ہوئے ہیں اور سب ڈرائنگ روم میں ہیں۔

''دراصل وہ زین کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا تو وہ سب زین کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔''

اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ہی واپس چلا جائے کہ سب کی موجودگی میں وہ زین سے بات نہیں کر سکتا تھا، لیکن پھر حادثے کا سن کر اسے مناسب نہیں لگا کہ وہ مزاج پرسی کیے بغیر ہی چلا جائے۔ سب نے ہی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

''بڑے دن لگا دیے وجدان......! ہم سب نے تمہیں بہت مس کیا۔'' اس نے اسے گلے لگاتے ہوئے محبت سے کہا۔

وجدان سب ہی سے باری باری گلے ملا۔ آزین سے گلے ملتے ہوئے اس نے بغور اسے دیکھا۔ وہ کچھ کمزور لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں اور اس کی ہیزل براؤن آنکھوں میں وہ

چمک مفقود تھی۔

''سوری یار!'' اس نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کی اور سوچا۔ بہت جلد ان خوب صورت آنکھوں کی چمک لوٹ آئے گی۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ شاید اسے آزین سے بات کرنے کا موقع نہیں ملنے والا تھا۔ کبھی وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور کبھی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔

''خیر آج نہیں تو کل، زین کے آفس چلا جاؤں گا۔'' یہ سوچ کر اس نے خود کو مطمئن کیا تھا۔

''تم نے اتنے دن لگا دیے وجدان! یہاں دشمنوں نے خبر بھی اڑا دی تھی کہ تم ڈر کر باہر بھاگ گئے ہو کہ کچھ لوگوں نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں۔'' مرسل کے لہجے میں تشویش تھی۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں یار! موت تو اپنے وقت پر آتی ہے، چاہے کسی اندھی گولی سے آئے یا گھر پر بستر پر پڑے پڑے، نہ ایک سانس گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔'' وہ مطمئن سا مسکرایا۔ اگر وہ ڈرنے والا ہوتا تو کبھی اس طرح کھل کر سیاست دانوں اور حکمرانوں پر تنقید نہ کرتا۔ وطن سے محبت اس کے خون میں شامل تھی۔ اس کے خاندان نے یہ وطن حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ اس کے دادا وہاں اپنی زمینیں اور گھر بار ہی چھوڑ کر نہیں آئے تھے اپنے پیاروں کی لاشیں بھی چھوڑ کر آئے تھے۔ اس کے دادا نے ہمیشہ اس وطن کی ترقی، خوش حالی اور بہتری کے خواب دیکھے تھے اور یہ ہی خواب انہوں نے اپنے بچوں کو سونپے تھے اور انہیں اپنے ملک سے وفا اور اس کی خاطر مر مٹنے کا سبق سکھایا تھا۔ وہ انیس بیس سال کے تھے جب اپنے والد اور والدہ کے ساتھ سب کچھ لٹا کر یہاں پہنچے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے یار! لیکن ذرا سنبھل کر احتیاط سے لکھو۔ کچھ لوگ جان چکے ہیں کہ جواد احمد کے پیچھے کون ہے۔''

طیب نے خلوص دل سے مشورہ دیا تھا۔ وہ وجدان احمد کو پسند کرتا تھا۔ وجدان احمد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ کچھ لوگ اس کے متعلق جان گئے ہیں لیکن یقین اب آیا تھا جب اس نے حالات حاضرہ پر لکھنے کا سوچا تھا، تو اس کے چاچو نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اصلی نام کے بجائے قلمی نام سے لکھے اور دادا نے اس کا قلمی نام جواد احمد تجویز کیا تھا۔ جواد احمد دادا کے بڑے بھائی

علی گڑھ کے طالب علم، تحریک پاکستان کے پر جوش اور سرگرم رکن۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ شعلہ بیان مقرر تھے اور شہید کر دیے گئے تھے۔ ان کے اپنے ہی ایک ہندو دوست نے اس وقت ان کے سینے میں برچھی اتاری تھی جب وہ مسلم لیگ کے اپنے علاقے میں ہونے والے جلسے میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔

اس کے اپنے خاندان کے علاوہ صرف سمیرا تھی جو جانتی تھی کہ وہ جواد احمد کے نام سے لکھتا ہے لیکن اب اگر طیب جانتا تھا تو شاید یہ راز راز نہیں رہا تھا۔

''تمہیں کس نے بتایا طیب؟''

''کہیں نہ کہیں سے یہ خبر اڑتی اڑتی مجھ تک بھی پہنچ گئی ہے۔ لیکن یہ بات کہاں سے نکلی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔'' طیب کو شام کے وقت نکلنے والے ایک اخبار کے رپورٹر نے بتایا تھا۔

''ہاں جواد احمد میرا ہی قلمی نام ہے۔'' وجدان احمد نے اعتراف کیا تو مرسل اور عمر کی آنکھوں میں یکدم اس کے لیے ستائش ابھری۔

''کمال کا لکھتے ہو یار! میں تو کہتا ہوں تم جیسے لوگوں کو سیاست میں آنا چاہیے۔ اگر تمہارے جیسے لوگ اقتدار میں ہوں جو وطن سے اتنی شدید محبت کرتے ہیں اور اس کے لیے اس طرح سوچتے ہیں تو ہمارا ملک مثالی بن سکتا ہے۔'' مشورہ مرسل کی طرف سے آیا تھا۔

''نہیں یار! مجھے سیاست سے اس طرح کی دلچسپی نہیں ہے۔ جس کا مقصد اقتدار میں آنا ہو، اللہ نے مجھے لکھنے کا ہنر دیا ہے تو میں بس لکھنا ہی چاہتا ہوں کہ شاید کبھی میرے لفظوں سے مردہ ضمیر جاگ جائیں۔''

''چھپن سال ہو گئے اس ملک کو بنے لیکن جن کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں وہ آج بھی مردہ ہیں۔ تمہارے جیسے نہ جانے کتنے محبِ وطن ان کے مردہ ضمیر جگاتے جگاتے ہار گئے۔'' طیب کے لہجے میں تلخی تھی۔

''کوشش ترک نہیں کرنی چاہیے کیا خبر کوئی لفظ ضربِ کلیم ثابت ہو۔'' وجدان احمد مسکرایا۔ یہاں آ کر بہت سارے دنوں سے اس کا خراب ہوا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔ تب ہی مرتضیٰ سفری بیگ کندھے پر لٹکائے اندر داخل ہوا۔

''تو محفل جمی ہے۔'' اس نے باری باری سب پر نظر ڈالی۔

''بلال نے مجھے زین کے ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا تو ہم مزاج پرسی کے لیے آئے تھے۔'' جواب عمر نے دیا تھا۔

''ہاں، زین تم نے ایکسرے کروایا تھا پاؤں کا، کیا ہوا؟'' مرتضٰی لہجے میں فکر سموئے پوچھ رہا تھا۔

''ہوں، فریکچر وغیرہ نہیں ہے، بس درد بہت ہے۔ ڈاکٹر نے گرم پٹی باندھے رکھنے کو کہا ہے۔''

''کیسے ہوا حادثہ؟'' وجدان کو اب خیال آیا تھا۔

''کل شام کو ایک رکشے سے ٹکرا کر میری بائیک گر گئی تھی۔ پاؤں پر چوٹ لگی۔ باقی اللہ کا شکر ہے بچت ہو گئی۔ پاؤں یکدم اتنا سوج گیا تھا کہ ڈر لگا کہ کہیں ہڈی وغیرہ نہ ٹوٹ گئی ہو۔'' آزین نے تفصیل بتائی تو مرتضٰی نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

''ارے ہاں وجدان! تم کب آئے؟''

''کچھ دیر ہوئی۔''

''نہیں میرا مطلب ہے باہر سے کب آئے ہو؟''

''تین چار دن ہو گئے۔'' وجدان اب اس کی طرف متوجہ تھا۔

''سمیرا نہیں آئی تمہارے ساتھ؟ اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟'' مرتضٰی نے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟''

''وہ تو ہفتہ بھر سے بیمار ہے۔ شاید بخار ہو گیا تھا اسے۔ ثوبیہ سحرش کے پاس آئی تھی کسی کام سے تو اس نے بتایا تھا۔'' مرتضٰی نے وضاحت کی۔

''دراصل میرا کئی دنوں سے سمیرا سے رابطہ نہیں ہے تو میرے علم میں نہیں ہے کہ وہ بیمار ہے۔''

وجدان احمد نے سادگی سے سچ بتایا۔ دل سمیرا کی بیماری کا سن کر پریشان ہوا تھا۔ اور آزین چونکا تھا۔ اس کا مطلب ہے مرتضٰی نے جو کہا سچ تھا۔ ابھی تین چار دن پہلے کی بات تھی مرتضٰی نے اسے بتایا تھا کہ وجدان اور سمیرا کا رشتہ تقریباً طے ہی تھا سمیرا وجدان سے محبت کرتی ہے لیکن اب شاید یہ رشتہ طے

نہ ہو سکے۔ وجدان کا ارادہ بدل چکا ہے۔ اس نے تو کافی دنوں سے سمیرا سے رابطہ ہی ختم کر رکھا ہے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بلا وجہ ہی وجدان سمیرا سے رابطہ توڑ دے۔ تعلق ختم کر دے۔'' وہ حیران ہوا تھا۔

''وجہ تو ہے اگر کچھ کہوں تو برا مت منانا اور وجہ ہے زمل! میں نہیں جانتا کہ زمل بھی وجدان میں انٹرسٹڈ ہے یا نہیں لیکن سمیرا کا خیال ہے کہ وجدان زمل میں انٹرسٹڈ ہے۔ وہ اس سے بہت متاثر ہے۔'' سمیرا نے اب ڈائریکٹ وار کرنے کا سوچ کر مرتضیٰ سے کھل کر بات کرنے کو کہا تھا۔

''لیکن سمیرا کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے مرتضیٰ!''

آزین نے اس کی بات کی نفی کی تھی لیکن اس وقت وجدان کے سچ نے مرتضیٰ کے جھوٹ پر یقین کی مہر لگا دی تھی۔ آزین کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ ہاں مرتضیٰ کی یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے کہ وجدان زمل کو پسند کرنے لگا ہے اور اس نے سمیرا سے رابطہ ختم کر رکھا ہے لیکن زمل...... زمل بھلا کیسے اور کیوں وجدان میں انٹرسڈ ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے نکاح میں ہے۔ اس نے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

پچھلے چند ماہ سے غلط فہمیوں کی وجہ سے اس کے رویے میں جو سرد مہری آ گئی تھی، اس کی وجہ سے اس نے زمل کا اضطراب، اداسی اور بے چینی بھی دیکھی تھی لیکن ان بے چینیوں کا احساس اس کے جانے کے بعد اسے ہوا تھا۔ وہ چلی گئی تھی تو اسے لگتا تھا جیسے زندگی سے سارے رنگ چلے گئے ہوں۔ وہ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہا تھا تب بھی وہ اس کی ہر بات کا خیال رکھ رہی تھی۔ وہ آفس سے آتا تو وہ اسے اپنی منتظر ملتی۔ اس کی عدم موجودگی میں اسے لگا تھا کہ مرتضیٰ کی باتوں میں آ کر وہ خوامخواہ ہی الٹی سیدھی غلط فہمیاں پال کر اس سے دور ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا زمل واپس آئے گی تو وہ زمل کو سب بتا دے گا۔ اس سے سوری کرلے گا، اپنے رویے کی اور وہ تو بڑے دل کی مالک ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس کی غلطی کو معاف کر دے گی۔

دادا جان نے اسے کہا تھا کہ وہ جا کر زمل کو لے آئے لیکن پھر پاؤں کی چوٹ کی وجہ سے انہوں

نے مرتضٰی سے کہہ دیا تھا کہ وہ چلا جائے اور ابھی کچھ دیر پہلے مرسل وغیرہ کے آنے سے پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جا کر مرتضٰی کو منع کر دے گا کہ اس کا پاؤں ٹھیک ہے اب اور وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن پھر مرسل وغیرہ آ گئے اور اس نے سوچا تھا ان کے جانے کے بعد وہ اوپر جا کر مرتضٰی کو منع کر دے گا کہ وہ نہ جائے، وہ خود چلا جائے گا۔ یوں بھی مرتضٰی نے کہا تھا کہ وہ سوموار کو جائے گا، اتوار کو اسے کوئی کام ہے۔ اور اب جیسے کوئی دل کے اندر بھالے مارتا تھا اور وہ خود کو بار بار یہ باور کرا کے کہ بھلے وجدان زمل میں انٹرسٹڈ ہو، زمل نہیں ہو سکتی، اپنے زخموں پر تسلی کے پھاہے رکھتا تھا لیکن اذیت تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ مرتضٰی جیسے اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا تھا۔

''یہ جو عورت ذات ہے نا، یہ صرف پیسے سے محبت کرتی ہے۔ آسائشوں اور سہولتوں کی تمنا ہوتی ہے اسے اور جب یہ سب اسے نہیں ملتا تو اس کی محبت کے سارے دعوے مر جاتے ہیں۔ یہ جب دو محبت کرنے والے مردوں کی محبت کو ترازو میں تولتی ہے تو پلڑا اس مرد کا ہی بھاری ہوتا ہے جو محبت کے ساتھ اسے آسائش بھی دے۔'' بہت پہلے پتا نہیں مرتضٰی نے کس بات پر کہا تھا اور آج اس کی سماعتوں میں مرتضٰی کی آواز گونج رہی تھی۔

شاید صحیح ہی تو کہتا ہے مرتضٰی...... صبوحی ظفریاب نے بھی تو دولت کی خاطر محبت کی نفی کر دی تھی۔ اور یہ عمر جو شاید شانزہ کو پسند کرتا تھا یا شاید محبت اس کا رشتہ بھی تو اس لیے ٹھکرا دیا گیا تھا کہ عقیل کے پاس اس کے مقابلے میں زیادہ دولت تھی حالانکہ عمر اس کے مقابلے میں زیادہ ایجوکیٹڈ زیادہ گڈ لکنگ تھا تو زمل بھی تو وجدان میں انٹرسٹڈ ہو سکتی ہے۔ اور وجدان تو ہر لحاظ سے ہی اس سے بہتر تھا۔ اذیت کی لہریں دل سے اٹھ کر جیسے پورے وجود میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا کہ اسے ڈر لگا تھا کہ کہیں اس کی سسکی نہ نکل جائے۔

''میری دو دن پہلے سمیرا سے بات ہوئی تھی اسے تمہارے واپس آنے کا علم نہیں تھا۔'' مرتضٰی وجدان سے کہہ رہا تھا۔ آزین چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ابھی اس کی طرف ہی جاؤں گا یہاں سے اٹھ کر۔''

''تو اسے بتا دینا میرا کہ میں پھپھو کی طرف جا رہا ہوں۔ دو تین روز میں آ جاؤں گا۔ دراصل دو دن سے اس کا فون آف ہے۔ ورنہ میں خود ہی بتا دیتا۔''

''لیکن تم نے تو کل جانا تھا مرتضیٰ!'' آزین نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے جیسے پہلی بار اس کا سفری بیگ دیکھا تھا۔

''ہاں آج ایک دوست نے آنا تھا، اس لیے کل جانے کا کہا تھا میں نے دادا جان سے لیکن اب اس دوست کا پروگرام نہیں بنا تو میں نے سوچا جا کر لے آؤں۔ دادا جان اور بی بی اماں بہت اداس ہو رہی ہیں۔ بلکہ چچا جان بھی مس کر رہے ہیں اسے۔ بی بی اماں بتا رہی تھیں کہ وہ اسے ڈھونڈتے ہیں۔''

مرتضیٰ بے حد خوش لگ رہا تھا۔ جب دادا جان نے اس سے کہا تھا کہ وہ جا کر زل کو لے آئے تو اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ اتنے لمبے سفر میں وہ ساتھ ہوں گے تو اسے بہت کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ جو یہاں نہیں کہہ سکا تھا کہ یہاں کبھی موقع نہیں ملتا تھا لمبی بات کرنے کا۔ اب اتنا وقت ہوگا تو وہ آرام اور سکون سے آزین کے بارے میں وہ کچھ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے گا جو زل شاہ زیب کو آزین ظفریاب سے اس طرح بدگمان کر دے کہ جب آزین اس کے ساتھ شادی سے انکار کرے تو زل کو اعتراض نہ ہو۔ یا پھر ممکن ہے زل خود ہی اس سے شادی سے انکار کر دے۔

وجدان بہت دھیان سے مرتضیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اور مرتضیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اسے کچھ ادراک ہوا تھا۔ سمیرا اور مرتضیٰ کا تال میل اسے سمجھ میں آ رہا تھا۔ تو مرتضیٰ بھی ایک مہرہ تھا جسے سمیرا عقل مندی سے استعمال کر رہی تھی۔ کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اس کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے تھے لیکن اس کے اور سمیرا کے گٹھ جوڑ میں صرف سمیرا کا ہی مقصد پوشیدہ نہیں تھا، بلکہ مرتضیٰ کا بھی کہیں کوئی مقصد چھپا تھا، اور وہ مقصد کیا تھا......

وجدان احمد کے دل پر کسی الہام کی طرح اترا تھا۔ وجدان احمد جس کا آئی کیو بہت ہائی تھا اور جو چہرے دیکھ کر دلوں کے حال جاننے کا ہنر جانتا تھا اس کو ادراک ہو گیا تھا کہ مرتضیٰ سمیرا کا ساتھ کیوں دے رہا ہے۔ سمیرا نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ مرتضیٰ نے مہرین سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور اس

نے خود بھی دو تین بار محسوس کیا تھا کہ مرتضیٰ آزین سے جیلس ہے اور ایک سحرش تھی جو مرتضیٰ کے دل میں چھپی خواہش جان چکی تھی۔

جو اس وقت سیڑھیوں کے تیسرے پوڑے پر وہاں ہی مہرین کے ساتھ بیٹھی تھی جہاں کبھی زین اور زرمل بیٹھتے تھے۔

''تم نے مرتضیٰ بھائی کو دیکھا تھا مہرو، ابھی جب وہ دادا جان کے کمرے سے باہر آ رہے تھے انہیں مل کر تو کتنے خوش نظر آ رہے تھے جیسے پہلی بار ٹرین کا سفر کرنے جا رہے ہوں۔ ویسے زین کو خود جانا چاہیے تھا اسے لینے...... اب اتنی بھی زیادہ چوٹ نہیں ہے کہ سفر بھی نہ کر سکے۔ یا پھر جیسا کہ ثوبان انکل نے کہا تھا وہ انہیں بائے ایئر بھیج دیتے۔ اور وہ بھی تو تھا ناوہاں شایان، وہ بھی تو آ سکتا تھا زرمل کے ساتھ لیکن اس کے ساتھ آنے سے شاید خود ہی زین نے منع کر دیا تھا کہ میں خود لینے آؤں گا لیکن پھر چوٹ لگا کر بیٹھ گیا اور ان حضرت کی تو جیسے لاٹری نکل آئی ہو۔''

مہرین جو دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اس کی بات کو بے دھیانی سے سن رہی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''مطلب خوش تو ایسے ہی لگ رہے ہیں۔'' سحرش نے مہرین کا چونکنا محسوس کر لیا تھا۔

''اماں تو بتا رہی تھیں کہ شاید شینخو بابا جائیں۔'' مہرین نے اپنی اماں کو مونا خالہ سے کہتے سنا تھا، جب وہ زین کے حادثے کا سن کر اسے پوچھ کر اوپر آئی تھیں۔

''شاید زین نے منع کر دیا ہو کہ شینخو بابا نامحرم ہیں لیکن نامحرم تو مرتضیٰ بھائی بھی ہیں پر زین کو اتنی عقل کہاں۔ ایک دو روز بعد جا کر لے آتا، ویسے شینخو بابا ہیں تو غیر لیکن مرتضیٰ بھائی کی طرح بدنظرے نہیں ہیں۔ کبھی نگاہ اٹھا کر بات نہیں کی۔ میں ہوتی نا زین کی جگہ تو مرتضیٰ بھائی کے بجائے شینخو بابا کو ہی بھیج دیتی اگر بھیجنا ضروری ہوتا تو......''

سحرش نے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کیا۔

جنوری کا اختتام تھا اور دھوپ کے باوجود فضا میں خنکی تھی۔ صحن میں پھیلی دھوپ بہت پھیکی پھیکی

سی تھی۔

''سحری! تم کیسے اپنے ہی بھائی کے لیے ایسی باتیں کر لیتی ہو۔'' مہرین کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت تھی۔

''اس لیے کہ میں سحرش ارباب ہوں۔ اور میں جھوٹے پھول پھندے نہیں لگاتی کہ وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ جیسا ہے بھئی سحرش تو اسے ویسا ہی کہے گی، بھلے وہ میرا بھائی ہو یا میری اماں جان۔'' سحرش نے گردن اکڑائی۔

''لیکن......'' مہرین کہتے کہتے رک گئی اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ڈرائنگ روم سے باہر آتے مرتضٰی کی طرف اٹھی تھیں اور پھر فوراً ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

''اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنے گھر والوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ہر ایک سے کرتی پھروں۔ یہ اظہار تو بس اپنوں کے سامنے ہی کرتی ہوں۔ باہر اگر جھوٹی تعریف نہیں کرتی تو برائی بھی نہیں کرتی۔''

وہ مہرین کے لیکن کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''اللہ حافظ مرتضٰی بھائی!'' اب وہ صحن کا دروازہ کھولتے مرتضٰی کو دیکھ رہی تھی۔ مرتضٰی نے مڑ کر ہاتھ ہلایا اور باہر نکل گیا۔

''ویسے مجھے سردیوں کی شادیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔ کپڑوں کی ساری شو ختم ہو جاتی ہے اوپر بھاری سوئیٹر پہن کر اور شالیں لے کر۔'' اب اسے شادی کی فکر ہو گئی تھی۔

''تو تم نہ پہننا اوپر سوئیٹر......بس ہلکی سی شال کندھے پر ڈال لینا۔'' مہرین نے مشورہ دیا۔

''ویسے میں نے یہاں دو تین شادیوں میں دیکھا ہے دسمبر جنوری کی سردیوں میں شیفون کے کپڑوں میں شادیوں میں شرکت کرتے ہوئے زیادہ تر خواتین کو...... یہ الگ بات کہ سردی سے کانپ رہی ہوں۔ فروری میں شاید کچھ موسم بہتر ہو جائے گا لیکن پھپھو کو چاہیے تھا کہ مارچ میں شادی کرتیں ایک ماہ کی ہی تو بات تھی۔''

"تمہیں نہیں پتا ریحان بھائی نے فروری کے اینڈ میں امریکا جانا ہے پیپرز دینے۔ اس لیے شادی فوراً رکھی ہے تاکہ وہ بھی شریک ہو جائیں، انہیں زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے وہاں۔" سحرش کو حیرت ہوئی۔

"نہیں......" مہرین نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم چلو گی نا شادی میں......؟" سحرش بغور اسے دیکھ رہی تھی جس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"پتا نہیں...... فی الحال کچھ نہیں سوچا۔"

"سب ہی تو جائیں گے بی بی اماں اور شینخو بابا بھی...... بہت اصرار کیا ہے پھپھو نے کہ سب آئیں اور تم یہاں اکیلے کیسے رہو گی؟" سحرش کو فکر ہوئی۔

"میں ہوسٹل چلی جاؤں گی اپنی دوست کے پاس تین چار دن کی تو بات ہے۔" مہرین کا ارادہ نہیں تھا شادی میں جانے کا اور وہ اس کے متعلق اماں اور مونا خالہ کو بھی بتا چکی تھی۔

"یار! چلی چلو نا ابھی کون سا باقاعدہ منگنی ہوئی ہے، بس زبانی زبانی ہی تو بات ہوئی ہے۔ اچھا ہے نا ریحان بھائی کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملے گا۔ کس قدر رومانٹک سا ہو گا تم چھپ چھپ کر انہیں دیکھنا اور وہ آتے جاتے گزرتے چور نظروں سے تمہیں دیکھیں گے۔" سحرش شوخ ہوئی تھی لیکن وہ بے زار تھی۔

"مجھے نہیں ضرورت دیکھنے اور جاننے کی۔"

"مہرو......" سحرش سنجیدہ ہوئی۔ "ایک بات تو بتاؤ، تمہیں کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ تم نے اپنی مرضی سے ریحان بھائی کے لیے ہاں کہی تھی۔"

یہ صحیح تھا کہ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ جو بالکل اچانک ہی ہوا تھا، بغیر سوچے سمجھے۔ یہ اسی روز کی بات تھی جب مرتضیٰ اوپر آیا تو مونا اور رخسانہ لاؤنج میں ہیٹر کے پاس بیٹھی ریحان اور مہرین کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔

"میری شانزے خوش نہیں ہے مونا، اور اب میں مہرین کی مرضی کے بغیر ہاں نہیں کروں گی

چاہے کسی شہزادے کا ہی رشتہ کیوں نہ آجائے مہرین کے لیے۔''
وہ ماں تھیں۔ بھلے زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن شانزہ کی آنکھوں کی اداسی اور خاموشی کا دکھ سمجھ سکتی تھیں۔
''ارے بھئی کس شہزادے کا رشتہ آگیا ہے؟'' مرتضیٰ نے پوری بات نہیں سنی تھی۔
''اپنی مہرین کے لیے اختر بانو نے ریحان کا رشتہ دیا ہے۔'' میمونہ نے بتایا۔
''مجھے تو لگتا ہے کہ ریحان اور مہرین کا جوڑ بہت اچھا ہے۔ ریحان خوب صورت ہے، ڈاکٹر ہے، دولت مند ہے اور لڑکیوں کے والدین کو کیا چاہیے ہوتا ہے؟ میں شانی کو سمجھا رہی تھی کہ بس انکار نہ کرے اس رشتے سے......'' رخسانہ بڑی تھیں لیکن مونا کبھی کبھار ہی نام کے ساتھ آپا لگاتی تھیں ورنہ نام لے کر ہی بلاتی تھیں۔
''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوا تھا۔ ''پھپھو نے اس کا مطلب مہرین کا رشتہ مانگا ہے؟'' اسے یقین نہیں آیا تھا۔
''ہاں، اختر نے بڑے چاؤ سے رشتہ مانگا ہے مہرو کا اور میرا دل کہتا ہے مہرین بہت خوش رہے گی۔''
''اور تایا جان نے کیا جواب دیا؟'' اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کچھ ناخوش سا لگنے لگا تھا۔
''ابھی سوچنے کا وقت لیا ہے۔ حالانکہ سوچنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اپنا بھانجا ہے کوئی غیر تو نہیں لیکن مہرین نے منع کر دیا ہے، وہ راضی نہیں ہے۔'' میمونہ بیگم ہی اس کے سوالات کے جواب دے رہی تھیں، جب کہ رخسانہ خاموش تھیں۔
''مہرین راضی نہیں ہے۔'' وہ پھر حیران ہوا تھا۔ بھلا کوئی لڑکی اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہے کہ ریحان جیسے لڑکے سے شادی سے انکار کر دے۔ لیکن مہرین تھی۔ ایسی ہی بے وقوف......وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے کیا جذبات رکھتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں مغرور ہوا تھا۔
''کتنی خواہش تھی میری کہ مہرین کو اپنی بہو بناتی......بچپن سے ہی سوچ رکھا تھا۔ لیکن مرتضیٰ! تم نے میرے ارمان مٹی میں ملا دیے انکار کر کے۔''
''تو ٹھیک ہے میں تیار ہوں مہرین سے شادی کرنے کے لیے۔'' غیر ارادی طور پر اس کے لبوں

سے نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اب یکدم ہی اسے مہرین اچھی لگنے لگی تھی بلکہ دل میں کہیں حسد اور جلن تھی کہ جس لڑکی کو اس نے ٹھکرا دیا اور جسے وہ چشما تو اور چار چشمی کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا تھا اس کا رشتہ اس سے کہیں اچھے اور بہتر شخص سے ہو جائے۔ یہ اندر کی جلن اور کھولن ہی تھی جس نے اس سے اقرار کروایا تھا۔ انکار کا کیا ہے، وہ پھر بھی کر سکتا ہے۔

''لیکن مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔'' مہرین جو نہ جانے کس کام سے ادھر آئی تھی، اس نے بے اختیار کہا تھا۔ وہ اتنی گئی گزری تھی کوئی کھلونا تھی کہ جب دل چاہے تو ٹھکرا دی جائے اور جب دل چاہے اپنا لی جائے۔

اندر کہیں دو آنسو گرے تھے۔ اس نے مرتضیٰ سے نظر ہٹا کر رخسانہ کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں اماں جان! میں آپ سے یہ ہی کہنے آئی تھی کہ آپ پھپھو کو ہاں کہلوا دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

اور اپنی بات کر کے وہ مرتضیٰ کو حیران چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔

''بتاؤ نا! مہرو...... تم نے اپنی مرضی سے ہاں کی تھی نا......؟'' اسے خاموش دیکھ کر سحرش نے پھر پوچھا۔

''اماں نے مجھے بتایا تھا کہ مرتضیٰ بھائی تیار ہو گئے تھے تم سے شادی کرنے کے لیے......''

''ہاں یار! اپنی مرضی سے ہاں کی تھی۔''

''تو پھر پروگرام بناؤ نا...... سچی بہت مزا آئے گا وہاں۔ پھپھو نے اسی لیے تو تمہیں انگوٹھی پہنانے کا پروگرام شادی کے بعد رکھا ہے تاکہ تم بلا جھجک شادی میں شریک ہو سکو۔ ریحان بھائی کو پرکھنے کا اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ یہ جو لڑکے ہوتے ہیں نا، شادیوں میں بڑے شوخے ہو جاتے ہیں اور ان کی اصلیت پتا چل جاتی ہے۔''

مہرین خاموش ہی رہی تھی تب ہی بی بی اماں کچن سے باہر نکل کر صحن میں آئیں۔

''سحرش بیٹی! میں نے چائے دم کر دی ہے۔ ذرا بنا کر ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔ زین کے دوست بے چارے کب سے آئے بیٹھے ہیں۔ میری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی اٹھنے کی، ساجدہ کو بھی کہا

تھا دوپہر کو چکر لگانا، پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔"

"کیا ہوا بی بی اماں آپ کو؟" سحرش کے ساتھ ہی مہرین بھی اٹھی تھی۔

"فلو ہو رہا ہے۔ صبح نہا کر باہر ٹھنڈ میں نکل آئی تھی۔ کتنی دیر سے سوچ رہی تھی کہ بچے بے چارے آئے بیٹھے ہیں۔" بی بی اماں کو ایسی باتوں کا بہت خیال رہتا تھا۔

"آپ مجھے کہتیں بی بی اماں! میں چائے بنا لیتی۔"

"چلو اب تو بن گئی ہے، تم بس سرو کر دینا۔ دودھ میں نے دھیمی آنچ پر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا تھا۔ چنے کی دال کا حلوہ میں نے باؤل میں ڈال دیا ہے مائیکرو میں گرم کر لینا بسکٹ اور نمکو کے جار بھی کاؤنٹر پر رکھ دیے ہیں۔"

جب سے گھر میں مائیکرو آیا تھا بی بی اماں نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ زل ہی کرتی تھی اگر کچھ گرم کرنا ہوتا تو......

"اور ہاں تمہارے دادا جان چائے پی چکے ہیں۔ شینو شاہ زیب کی دوا لینے گیا ہے۔ آجائے تو اسے بھی چائے بھجوانی ہے۔ لیکن پوچھ لینا اس وقت پیے گا بھی یا نہیں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے رکی تھیں۔

"جی بی بی اماں! آپ فکر نہ کریں، ہم کر لیں گے۔ آپ بھی چائے پئیں گی نا۔" سحرش نے انہیں تسلی دی۔

"نہیں، میں نے ابھی قہوہ پیا ہے۔ شام تک طبیعت کچھ بہتر ہو جائے گی ان شاء اللہ۔" بی بی اماں بڑی باہمت تھیں۔ سحرش نے ستائشی نظروں سے انہیں دیکھا۔ اسے تو ذرا سا زکام ہوتا تھا تو بستر پر پڑ جاتی تھی۔

"ابھی تو ہم یہاں ہی ہیں، لیکن اگر چلے بھی گئے تو کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔"

"اچھا لیکن ساجدہ آجائے گی رات کو ابھی کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔" جب سے زل گئی تھی ساجدہ دونوں وقت آ رہی تھی۔ زل اسے تاکید کر کے گئی تھی۔ اگر کوئی کام ہوتا تو بی بی اماں اسے دوپہر کو بھی

آنے کا کہہ دیتی تھیں۔

دونوں کچن میں آئیں۔ صاف ستھرا کچن۔ اور چائے کی خوشبو......

''ایک اکیلی بی بی اماں اس عمر میں بھی کیسے ہر وقت کچن کو صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ ایک ہماری وہ مہارانی ہے ہر وقت کچن کا کاؤنٹر بھرا ہوتا ہے سامان سے۔ جیسے ابھی ابھی تاتاری حملہ کر کے گئے ہوں۔''

سحرش نے حلوے کا باؤل مائیکرو ویو میں رکھا۔

''جی چاہتا ہے کبھی کبھی کہ بی بی اماں کو اغوا کر کے اوپر لے جاؤں اور کبھی جو سرمہ ستارہ بیگم سے کہہ دیں کہ تم ہی کچن کا کاؤنٹر پر بکھرے برتن ٹھکانے لگا دو کہ یہ بی بی کھانے پکانے میں مصروف ہیں تو وہ پٹ سے جواب آتا ہے۔ نہ جی، کچن کا پھیلاؤ سمیٹنا میری ذمہ داری نہیں۔'' سحرش نے حلوہ اوون سے نکال کر ٹرے میں رکھا، باؤل چمچے اور پلیٹیں پہلے ہی مہرین رکھ چکی تھی نمکو اور بسکٹ کے جار بھی اٹھا کر سحرش نے ٹرے میں رکھے۔

''میرا خیال ہے چائے وہاں ہی جا کر بنا لیں گے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی یہاں سے بنا کر لے جائیں گے تو......'' سحرش نے دوسری ٹرے میں مہرین کو گن کر پیالیاں رکھتے ہوئے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ اور دودھ دان میں دودھ ڈالنے لگی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''شینخو بابا ہوں گے۔ ان سے کہتی ہوں ایک ٹرے وہ لے جائیں نہیں تو دو چکر لگانے پڑیں گے۔''

سحرش کو پتا تھا کہ اندر صحن میں آنے سے پہلے شینخو بابا کی عادت تھی دو بار دستک دیتے تھے تا کہ اگر کوئی خاتون بے دھیان اور لاپرواسی دوپٹا اتارے بیٹھی ہو تو اسے پتا چل جائے کہ کوئی آ رہا ہے۔ سحرش نے کچن کے دروازے سے نکل کر دیکھا شینخو بابا ہی تھے جو سر جھکائے شاہ زیب بیگ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں دوائیوں کا شاپر تھا۔

''شینخو بابا! پلیز ذرا ادھر آیئے۔ یہ ٹرے پلیز ذرا ڈرائنگ روم میں لے جائیں۔'' شینخو بابا کے قریب آنے پر سحرش نے ٹرے انہیں پکڑا دیا۔

''اور آپ چائے پئیں گے آپ کے لیے بنا دوں؟''

''نہیں میں اس وقت چائے نہیں پیتا، شام کو ہی پیوں گا۔'' شینخو بابا نے ٹرے لے لی تھی۔

''اچھا مجھے بتا دیجیے گا، میں بنا دوں گی۔ بی بی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آج۔''

''کیا ہوا، مجھے بتایا ہی نہیں، میں دوا لینے جا رہا تھا، ان کی بھی لے آتا۔'' شینخو بابا پریشان سے ہو گئے تھے۔

''فلو ہو گیا ہے۔ دوائی لے لی تھی انہوں نے۔''

شینخو کو بتا کر وہ واپس کچن میں آئی۔

''مہرو! تم یہ کپ وغیرہ لے چلو میں قہوے کا تھرموس اور شوگر پاٹ اٹھا لیتی ہوں۔'' سحرش نے تھرموس اٹھایا اور وہ دونوں بھی شینخو بابا کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں۔ دونوں کے مشترکہ سلام کے جواب میں مشترکہ جواب آیا تھا۔ شینخو بابا نے نہ صرف ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھا بلکہ سب کو باؤل اور چمچے پکڑا کر حلوہ سرو بھی کر دیا۔

''یار! تم بھی بیٹھ جاؤ نا اور لے لو کچھ۔'' وجدان کو شینخو بابا سے انس سا ہو گیا تھا۔ انہیں یہ خاموش طبع اور کم گو سا لڑا بہت اچھا لگتا تھا۔

''شکریہ بھائی، میرا تو اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ اور میں ذرا شاہ بابا کی طرف جا رہا ہوں، یہ ان کی دوائیاں لے کر آیا تھا۔'' اب سب ہی جانتے تھے کہ شینخو بابا شاہ زیب بیگ کو شاہ بابا کہہ کر بلاتے تھے۔

''ارے واہ بی بی اماں زندہ باد!'' اس نے حلوے کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔

''اس سردی میں چائے کی طلب ہو رہی تھی گو چائے کا وقت نہیں ہے لیکن کیا بات ہے بی بی اماں کی۔''

آج سب صوفوں پر بیٹھے تھے۔ سحرش اور مہرین بھی ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

''ہاں تو وجدان تم کیا کہہ رہے تھے۔'' طیب نے حلوے کا ایک چمچہ منہ میں ڈالا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ سیاست بذات خود بری چیز نہیں ہے اگر مثبت ہو تو...... لیکن ہماری سیاست

مثبت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جلسوں میں نعرے لگانا اپنے لیڈر سے اندھی عقیدت رکھنا ہی سیاست ہے۔ بھلے آپ کا لیڈر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہو۔''

وجدان نے طیب کی طرف دیکھا۔

''دراصل میرے بھائی ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ مجھے اکثر کہتے رہتے ہیں کہ تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو کر ہمارے ساتھ کام کرو۔ اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے ہمارے ساتھ مل کر زیادہ بہتر طریقے سے ملک وقوم کی خدمت کر سکو گے آپ کا کیا خیال ہے؟'' آج طیب نے پہلی بار اپنے بھائی کے کسی پارٹی سے منسلک ہونے کے متعلق بتایا تھا اور اپنی شمولیت کے لیے رائے مانگی تھی۔

''اگر تم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تم ان کے ساتھ مل کر بہتر اور زیادہ اچھا کام کر سکتے ہو جو تم اکیلے نہیں کر سکتے۔ اگر تم پورا یقین رکھتے ہو کہ تم جن لوگوں کے ساتھ منسلک ہو رہے ہو، وہ واقعی مخلص ہیں اور ملک وقوم کے لیے کچھ کر رہے ہیں تو اس میں حرج نہیں کہ تم ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں میری نظر میں کوئی بھی مخلص نہیں۔ سب اپنے مفاد کے لیے کر رہے ہیں جو کچھ بھی کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تم جو کر رہے ہو، بہت اعلیٰ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم سب لوگ اپنی اپنی جگہ ایمان داری اور محنت کے ساتھ اپنا کام کریں، چاہے وہ مزدوری ہی کیوں نہ ہو تو ہم ملک وقوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں اپنے ورکرز کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، ٹیکس چوری نہیں کرتا، ملکی املاک کو نقصان نہیں پہنچاتا تو میں انفرادی طور پر اپنے ملک کے لیے کام کر رہا ہوں۔ اگر ہم سب انفرادی طور پر ٹھیک ہو جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے۔''

وجدان کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ اگر سب اپنے اپنے طور پر خود کو ٹھیک کر لیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے بھی شاید اس نے یہ بات کی تھی۔

''لیکن سب تمہاری طرح نہیں سوچتے وجدان۔'' مرسل نے اٹھ کر اپنا باؤل ٹیبل پر رکھا اور پلیٹ میں تھوڑا سا نمکو لیا۔

''ہر شخص اپنی فکر میں گھل رہا ہے۔''

''ہاں شاید تم بھی صحیح کہتے ہو۔ لیکن کچھ لوگ تو ہیں نا جو وطن کی فکر میں گھلتے ہیں۔ اور شاید ان ہی لوگوں کی وجہ سے پاکستان قائم ہے۔ چھپن سال ہو گئے ہیں اس ملک کو قائم ہوئے تو قائم ہے نا ابھی تک اور ان شاء اللہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔ ایک روز میرے ملک کے آسمان پر ایسا سورج ضرور طلوع ہو گا جو کسی انہونی کی خبر دے گا۔'' وجدان کبھی مایوس نہیں ہوتا تھا، ہمیشہ پر امید رہتا تھا۔ سب حقائق جاننے کے باوجود ایک امید کا دیا تھا جو اس کے اندر جلتا رہتا تھا۔

''پاکستان کی چھپن سالہ تاریخ میں آج تک تو کوئی انہونی نہیں ہوئی جو اب تک ہوتا رہا ہے، وہی ہوتا رہے گا۔'' آزین نے یکدم سر اٹھا کر وجدان کی طرف دیکھا تھا۔

''جس سیاست دان کا دل چاہا، کسی کو پٹوانے کو...... اسے پٹوا دیا۔ جسے اٹھانا چاہا، اسے اٹھا لیا۔ جس کو جی چاہا، اسے ذلیل کر دیا۔ کسی نے خوشامد نہیں کی، اسے برباد کر دیا۔ سنہرے خواب دکھا کر یا جبر و زبردستی سے ووٹ لیا۔ ہم تم یوں ہی اپنی آنکھوں میں جھوٹے خواب سجائے بیٹھے ہیں۔ یہ ملک جیسے چل رہا ہے اس طرح چلتا رہے گا۔ با اختیار طبقہ عوام کی امیدوں سے یوں ہی کھیلتا رہے گا۔ اپنے نام نہاد لیڈروں کے اقتدار کے لیے ان کی توانائیاں یوں ہی خرچ ہوتی رہیں گی اور وہ ان کی امیدوں، ان کی آرزوؤں کو اپنے قدموں تلے روندتے ہوئے اپنی کامیابیوں کا جشن مناتے رہیں گے۔ چند لوگوں کے اچھا ہو جانے سے کچھ نہیں ہو گا۔''

آزین کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اتنے یاسی مست کیوں ہو رہے ہو یار۔'' مرسل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ایک بے مثل، پر سکون اور خوش حال ملک کا خواب دیکھنا جرم ہے کیا، اس ملک کو بنانے والوں نے بھی تو پہلے خواب ہی دیکھا تھا نا، ایک الگ آزاد وطن کا۔ اور آج ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ تعبیر پانے کے لیے خواب دیکھنا بھی ضروری ہے نا یار۔''

''وہ اور لوگ تھے مرسل! بے غرض، بے ریا۔ اس خواب کی تعبیر پانے کے لیے جو تنہا ایک شخص کا خواب نہیں تھا انہوں نے اپنا سب کچھ لٹایا، گھر بار...... زمینیں، جائیدادیں۔ اپنے پیارے...... یہ وہ

لوگ نہیں ہیں۔ یہ تو لالچی، حریص اور بھوکے لوگ ہیں۔ اسد نے صحیح کہا ہے کہ یہ سب گدھ ہیں۔ اور ملک کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ ان کے اقتدار کی ہوس نے ہی تو ملک کو دولخت کیا۔'' وہ بہت کم بولتا تھا زیادہ تر سب کو خاموشی سے سنتا رہتا تھا لیکن آج وہ بول رہا تھا اور وجدان کو لگا تھا کہ اس کے سینے میں دھڑکتا دل بھی وطن کی محبت سے لبریز ہے۔

''چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' سحرش نے مرسل اور اسد کی طرف دیکھا۔ مہرین سینٹر ٹیبل کے پاس فلور کشن پر بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔

''اوہ......ہاں......'' مرسل فوراً اٹھا اور کپ اٹھا کر سب کو دینے لگا۔

''میں نے سب میں ایک ٹی سپون چینی ڈال ہے، اگر کسی کو زیادہ چاہیے تو پلیز......'' مہرین نے شوگر پاٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں......ون پلس ٹوٹی سپون لیتا ہوں۔'' اسد نے کہا فوراً کہا تو مہرین کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وجدان کی نظر ذرا کی ذرا مہرین پر پڑی اور اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ کتنی اچھی، سادہ اور معصوم سی لڑکی ہے مہرین اور مرتضٰی نے اسے ٹھکرا دیا تو یقیناً جس کے لیے اسے ٹھکرایا وہ اس سے بہتر ہوگی۔ تو کیا وہ جو اس کے ذہن میں آیا تھا کہ مرتضٰی اور سمیرا کا گٹھ جوڑ یقیناً کسی مشترکہ مفاد کی وجہ سے تھا تو کیا وہ خیال صحیح تھا۔

''وجدان! چائے۔'' مرسل نے اسے چائے کا کپ پکڑایا تو وہ چونکا۔

''حلوہ بہت زبردست تھا سحرش! یقیناً بی اماں نے ہی بنایا ہوگا۔'' مرسل نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو سحرش نے سر ہلایا۔

''یقیناً ایسے مشکل کام وہ ہی کر سکتی ہیں یا پھر زمل......!'' مہرین نے اپنی ناک پر پھسل آنے والی عینک کو درست کیا اور اپنا چائے کا کپ لے کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔ تب ہی جہاں زیب بیگ نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر رک کر اندر جھانکا۔

''السلام علیکم سر!' وجدان کی نظر سب سے پہلے ان پر پڑی تھی۔ وہ کپ ہاتھ میں اٹھائے

اٹھائے کھڑا ہو گیا تھا۔

''ارے بیٹھو بچو!'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے باقی سب کو بھی اٹھنے سے منع کیا۔

''سر! آجائیں، بہت دن ہو گئے آپ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔'' اسد بھی کھڑا ہو چکا تھا۔

''آپ نے جس موضوع پر بھی بات کی، ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔''

''پھر کبھی سہی، اس وقت تو میں ذرا ہاشمی صاحب کی طرف جا رہا ہوں زین کو بتانے آیا تھا۔''

ہاشمی صاحب ان کے کولیگ تھے اور قریب ہی مندر والی گلی میں رہتے تھے۔ ذکی دروازے میں آج بھی کئی مندر تھے۔

''میں چھوڑ آتا ہوں دادا جان یا پھر شینو بابا سے کہیں۔'' آزین بھی یکدم کھڑا ہوا تھا۔

''ارے نہیں یہ ساتھ ہی تو جانا ہے۔ بس بیٹھے بیٹھے دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ذرا ہاشمی صاحب سے گپ شپ لگا آؤں۔''

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ بی پی چیک کیا؟'' آزین پریشان ہو گیا۔

''ہاں یار، طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس رات عجیب سا خواب دیکھا زل کے متعلق...... دراصل......'' وہ ہولے سے ہنسے۔ ''پہلی بار اتنے دنوں کے لیے جدا ہوئی ہے نا۔ شکر ہے مرتضیٰ آج ہی چلا گیا اسے لینے۔'' وہ جانے کے لیے مڑے پھر کسی خیال سے رک کر وجدان کی طرف دیکھا۔

''وجدان بیٹا! اپنا خیال رکھا کرو۔ ہمیں تم جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔ تم ہمارا اثاثہ ہو۔ ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ تمہاری بہت ضرورت ہے بیٹا، لیکن سنبھل کر۔''

''آپ سر، آپ کو علم ہے کہ......''

''ہاں مجھے بہت پہلے سے علم ہے۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا تھپتھپایا اور باہر چلے گئے۔

وہ ابھی تک حیران کھڑا تھا۔

''میں نے غلط نہیں کہا تھا وجدان! تمہارا راز اب راز نہیں رہا اور کچھ لوگوں کی آنکھوں میں تم بہت کھٹک رہے ہو۔ بہتر تو یہ ہی ہے کہ کچھ روز ایسا کچھ مت لکھو کہ لوگ آئینے میں اپنے مکروہ چہرے

دیکھ کر بھڑک اٹھیں۔"

طبیب نے مشورہ دیا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

سحرش نے خالی کپ ٹرے میں رکھے اور مہرین کو بھی اشارہ کیا وہ باؤل وغیرہ دوسرے ٹرے میں رکھ کر لے آئے۔ وہ دونوں باہر نکلیں۔ دھوپ اب ٹیرس اور صحن کی دیواروں پر مرجھائی ہوئی سی موجود تھی۔

"اور گرمیوں میں یہ ہی دھوپ سارا دن صحن میں اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے اور ابھی عصر بھی نہیں ہوئی تو غائب......" سحرش نے صحن کی طرف دیکھا تھا۔

"میرا خیال ہے کپ وغیرہ دھو کر اوپر چلتے ہیں، ایسے ہی بوریت ہو رہی ہے۔" مہرین نے کہا تو سحرش نے سر ہلا دیا۔

سحرش نے کپ وغیرہ دھوئے اور مہرین نے خشک کر کے رکھ دیے۔

"ویسے تو ساجدہ رات کو آ ہی جاتی بی بی اماں کہہ رہی تھیں۔ لیکن خیر اب تو دھل ہی گئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔"

سحرش کو کپ دھونے کے بعد خیال آیا تھا کہ خوامخواہ ہی دھوئے، ساجدہ آتی تو ہے رات کو۔

"کیا خبر نہ ہی آتی اور یوں ہی پڑے رہتے۔ بی بی اماں کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" مہرین نے کہا۔

"چلو جا کر تھرموس بھی لے آؤ، اسے بھی دھو کر رکھ دیں۔"

"نہیں، اس میں قہوہ تھا ابھی کچھ دیر بعد عصر ہو جائے گی تو شینخو بابا کو چائے دینی ہوگی۔ تھرموس میں لے آتی ہوں۔ لیکن ابھی دھونا نہیں ہے۔" سحرش باہر نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ مہرین وہاں ہی کچن کے باہر برآمدے میں کھڑی تھی تب ہی صحن کا دروازہ کھلا اور سمیرا نے اندر قدم رکھا۔

"وہ...... وجدان ادھر ہے کیا؟ میں اس کے گھر گئی تھی، پتا چلا ادھر آیا ہے۔"

"ہاں اندر ہیں۔" سحرش تھرموس لے کر ڈرائنگ روم سے باہر آ رہی تھی، اس نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا تو سمیرا نے رک کر ایک گہری سانس لی اور پھر تیزی سے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

''سمیرا کا موڈ کچھ خراب سا لگ رہا ہے۔'' مہرین نے سحرش سے تھرموس لے کر کچن میں کاؤنٹر پر رکھا۔

''وجدان بھائی اکیلے آگئے ہیں شاید اس لیے موڈ خراب ہوگا۔'' سحرش اور مہرین اب سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھیں۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے سحرش نے مڑ کر دیکھا۔ وجدان اور سمیرا دونوں ڈرائنگ روم سے نکل کر صحن کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

''ارے سمیرا! ابھی تو آئی ہو نا بیٹھو...... میں ذرا اوپر کا چکر لگا کر آتی ہوں۔''

''نہیں، بیٹھوں گی نہیں۔ وجدان جا رہا ہے تو پھر میں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ زمل آجائے واپس تو پھر آؤں گی۔'' اس نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ سحرش چند لمحے وہاں ہی کھڑی بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

''تو سمیرا اور مرتضیٰ بھائی رابطے میں رہتے ہیں تب ہی تو اسے زمل کے جانے آنے کا پتا ہے۔''

''سحری، اب آ بھی جاؤ...... وہاں کھڑی کون سا مسئلہ فیثا غورث حل کر رہی ہو۔'' مہرین چوتھے قدمچے پر کھڑی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''مسئلہ فیثا غورث ہی سمجھ لو۔'' وہ اب بھی صحن کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا تھا اور شانزہ نے اندر قدم رکھا تھا۔

''شانے......'' سحرش کے لبوں سے نکلا اور وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ مہرین بھی تقریباً بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی تھی۔

''شانے......'' اس نے شانزہ کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اور اس کا نیلو نیل چہرہ دیکھ کر اس کے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

''یہ......''

''بس......'' شانزہ نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا۔

''زمل کے کمرے میں چلو......'' اس نے قدم آگے بڑھائے اور لڑکھڑا گئی۔ سحرش نے جیسے ہوش میں آ کر اسے سہارا دیا۔ اور دونوں اسے سہارا دیتی ہوئی تیزی سے صحن پار کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

موڑ توڑ تلے راڑاں

موڑ توڑ تلے راڑاں

راڑاں تو مہاراج جیندا

راڑاں رو ملک جیندا ں

موڑ توڑ تلے راڑاں

بھاگی اور سنہری کی بلند آواز اندر اختر بانو کے کمرے تک آ رہی تھی۔ اختر بانو آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ناشتے کے بعد انہوں نے اپنی روزمرہ کی دوائی لی تھی اور پھر یوں ہی کچھ دیر کو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ ثوبان شاہ حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ ثمینہ اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی، اس کی مزاج پرسی کے لیے...... ثمرہ اپنے کمرے میں تھی اور شاید شایان بھی کمرے میں ہوگا۔

وہ اٹھیں۔

''موڑ توڑ تلے راڑاں......''

سنہری کی آواز میں ایک خاص لوچ تھا۔ تالیوں کی آواز میں بھاگی کی آواز ابھری تھی۔

اوراڑاں راڑاں مور بھلے دے تلے گجر جو

موڑ توڑ تلے راڑاں......

سنہری نے آواز کے ساتھ آواز ملائی تھی۔ اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ حویلی میں نعمان کی شادی کی رونقیں لگی تھیں اور دولہا میاں ابھی کراچی بیٹھے تھے۔

پاؤں میں چپل پہنتے ہوئے اختر بانو باہر نکلیں تو لاؤنج میں سنہری اور بھاگی کے ساتھ دو تین اور بارہ تیرہ سالہ لڑکیاں بھی زور و شور سے تالیاں بجاتی ہوئی گا رہی تھیں۔ یہ بچیاں بھی ملازمین کی ہی تھیں۔ لیکن حویلی کا کام نہیں کرتی تھیں۔ شاید سنہری انہیں بلا کر لائی تھی۔

رانڑاں تو مہاراج جیندا

نتھ گھڑا اہم سنوارے اللہ ہی

''یہ کیا بے وقت کی راگنی شروع کر رکھی ہے تم لوگوں نے۔''اختر بانو نے ان کے قریب آ کر کہا تو لفظ بھاگی کے اندر ہی رہ گئے۔

''وہ جی بڑی بی بی جی......''سنہری نے اپنی بند آنکھیں کھولیں کہ وہ آنکھیں بند کیے بڑے جوش سے گا رہی تھی۔''وہ جی، ہم پریکٹس کر رہے ہیں۔''وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

''ثمینہ بی بی نے کہا ہے رات وہ اپنی بھانجیوں کو بھی لے کر آئیں گی تو خوب رونق لگائیں گے، تو ہم نے سوچا ہم بھی تھوڑی سی پریکٹس کر لیں، خوامخواہ بے عزتی نہ ہو جائے۔''

''کرتی رہنا پریکٹس، اس وقت تو اٹھاؤ یہ سب اور لاؤنج کی صفائی کر دو ٹھیک سے۔''اختر بانو نے ایک طرف پڑی ڈھولکی کی طرف اشارہ کیا۔

''اور بھاگی! تم دیکھو جا کر ماسی تاج کیا کر رہی ہے۔ سب ملازمین کے لیے اور ڈیرے پر بھجوانے کے لیے کھانا تو وہ بنا رہی ہو گی۔ دوپہر میں تو میں، ثمرہ آپا اور زل ہی ہوں گے۔ البتہ رات کو شاید شاہ جی بھی آ جائیں گے اور شایان بھی پلاؤ کی فرمائشیں کر کے گیا ہے۔ رات کے لیے پلاؤ اور قورمہ وغیرہ بنا لینا۔ اور دن کے لیے صرف آلو گوشت بنا لینا۔''

سنہری نے ڈھولک اٹھا لی تھی اور ایک ہاتھ سے اس پر تھاپ لگا رہی تھی۔ بھاگی سنہری کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی چلی گئی تو اختر بانو دوسری بچیوں کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''ہاں تو بچیو! رات کو آنا۔ یہ سنہری لے آئے گی تمہیں جا کر۔''

لڑکیاں بھی مسکرانے لگی تھیں۔

''یہ ڈرائیور چاچا کی بیٹی ہے۔''سنہری کو خیال آیا تھا کہ اس نے ابھی تک تعارف نہیں کروایا تھا۔

''اور یہ دونوں......؟''اس نے باقی دو لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔''خان بابا کی بیٹیاں ہیں۔''

ان کی سرخ و سفید رنگت بتا رہی تھی کہ وہ خان سمندر خان کی ہی کچھ عزیز ہوں گی۔ وہ گارڈ تھا اور وہ کچھ عرصہ پہلے ہی مردان کے قریب کسی گاؤں سے آیا تھا۔

''سنو سنہری......''اختر بانو نے اسے جاتے جاتے روکا۔

''کل دلاور بھائی مٹھائی اور کیک لائے تھے۔ ماسی تاج سے کہنا ان بچیوں کو اس میں سے کچھ دیں۔''

بچیاں شرماتی ہوئی سنہری کے ساتھ چلی گئیں تو اختر بانو کو یکدم خیال آیا کہ اس نے میٹھے کا تو بتایا ہی نہیں۔ ثوبان شاہ کو میٹھا پسند تھا۔ لنچ میں نہ بھی ہو تو خیر تھی لیکن ڈنر کے بعد ضرور میٹھا لیتے تھے چاہے ذرا سا ہی لیں۔ موسم کی مناسبت سے ماسی تاج سے کہتی ہوں وہ کوئی حلوہ بنالے، بلکہ بیسن اور انڈوں کا حلوہ ہی بنالے۔ ثوبان شاہ کو بیسن کا ہر طرح کا حلوہ پسند تھا چاہے سادہ بیسن کا ہو یا سوجی اور بیسن کا۔ اختر بانو لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے باہر آئیں۔ برآمدے میں کھڑے کھڑے صحن میں نظر دوڑائی۔ دھوپ ٹکڑیوں کی صورت صحن کے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔

گو قدرے پھیکی پھیکی سی تھی۔ پھر بھی اندر کی نسبت باہر ہلکی حدت سی تھی۔ اختر بانو کچھ دیر صحن کی طرف دیکھتی رہیں، ماسی تاج کو سمجھا دوں پھر ذرا سی دیر دھوپ میں بیٹھ جاتی ہوں۔ آج کل اختر بانو کو پتا نہیں کیوں سردی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ورنہ پہلے تو شدید سردی میں بھی گرم کپڑے کم ہی پہنتی تھیں۔ شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے وہ کچن کی طرف جانے ہی لگی تھیں کہ صحن کا دروازہ کھلا اور منیرا ہاتھ میں ایک شاپر اٹھائے اندر داخل ہوئی تو اختر بانو رک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”السلام علیکم بی بی جی......“ منیرا نے قریب آ کر سلام کیا لیکن وہ اس کے پیچھے دیکھ رہی تھیں۔

”زمل کیا پیچھے کہیں رک گئی ہے؟“

”جی......؟“ منیرا اختر بانو کی بات نہ سمجھ سکی تھی۔

”مجھے تو پتا نہیں۔ میں تو زمل بی بی کو یہ چادر دینے آئی تھی۔ چھ سات ماہ پہلے بنانی شروع کی تھی۔ شیشوں اور سندھی کڑھائی کا کام کیا ہے۔ خالہ نے بتایا تھا کہ زمل بی بی آئی ہوئی ہیں۔“

”کیا مطلب منیرا...... زمل تو تمہاری طرف گئی تھی تم سے ملنے۔ تمہارے لیے کچھ گفٹ لائی تھی۔ کہہ رہی تھی منیرا تو جانے کب آئے گی، میں خود ہی جا کر مل بھی آؤں اور دے بھی آؤں۔“

”لیکن زمل بی بی تو نہیں آئیں ہماری طرف اور میں تو سیدھی گھر سے آ رہی ہوں اور وہ تو مجھے راستے میں بھی کہیں نہیں ملیں۔ کب گئی تھیں وہ......؟“ منیرا پریشان ہو گئی تھی۔

”کافی دیر ہو گئی ہے، کہیں راستہ نہ بھول گئی ہو۔“

”سیدھا راستہ ہے جی، کوئی موڑ شوڑ نہیں۔“

اختر بانو کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''کیا کوئی اور راستہ بھی ہے تمہارے گھر جانے کا۔''

''ہاں جی، وہ ہے تو ڈیرے والا راستہ، ادھر سے گھر جلدی آجاتا ہے، یہ راستہ تھوڑا لمبا ہے۔''

ابھی اختر بانو نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ صحن کے دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی، بلکہ دستک کیا، کوئی بہت زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔

''یااللہ خیر......!'' اختر بانو نے دل پر ہاتھ رکھا۔

اندرونی صحن میں کوئی غیر یا مرد ملازمین بھی نہیں آتے تھے۔ گھر کے افراد یا پھر خواتین ملازمائیں ہی آتی تھیں جنہیں یوں دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مردانہ تو تھا ہی الگ۔ اختر بانو نے منیرا کی طرف دیکھا تو منیرا تیز تیز چلتی ہوئی صحن کے دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ اب بھی اس طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ منیرا نے دروازہ کھولا۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے چراغ سائیں کھڑا تھا۔ منیرا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی چاچا، کیا بات ہے، خیر ہے نا؟''

''بی بی...... بڑی بی بی کو بلاؤ جلدی کرو، بات کرنی ہے۔'' چراغ سائیں کو منیرا نے پہلی بار بات کرتے سنا تھا۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی، اس نے اسے صرف بابل کے گیت گاتے ہی سنا تھا۔ اس کی پرسوز آواز حویلی کے آس پاس احاطے میں سنائی دیتی رہتی تھی۔ بنا بولے وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ صبح وشام بالٹی لے کر باڑے سے دودھ لینے جاتا اور بغیر کچھ کہے دودھ آکر دے جاتا تھا۔

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 17

''جاؤ بڑی بی بی کو بلاؤ سنا نہیں تم نے۔'' اس کی آواز میں تحکم تھا۔ منیرا فوراً ہی پلٹی تھی۔ اختر بانو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر اب صحن میں کھڑی تھیں۔ منیرا نے آ کر بتایا تو وہ پریشان سی منیرا کی طرح ہی تیز تیز چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئیں اور ادھ کھلے دروازے کی اوٹ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے سائیں چاچا؟''

''وہ...... وہ بی بی جی......'' اس کا سانس پھول رہا تھا۔ ''انہیں اٹھا کر لے گئے وہ......'' اس نے گالی دی۔

''کون کسے اٹھا کر لے گئے اور کہاں؟''

''انہیں...... وہ چھوٹی مہمان بی بی کو...... بڑے ڈیرے پر۔ وہ ہی دونوں......''

''نہیں۔'' اختر بانو کا دل جیسے پھٹنے لگا تھا۔

''جی...... میں اوپر تھا ٹیلوں پر۔ میں نے خود دیکھا اس خبیث نے انہیں کندھے پر ڈال لیا تھا۔ میرے نیچے آتے آتے وہ ڈیرے کے اندر جا چکے تھے۔ وہ مجھے مار دیتے اور آپ کو کبھی پتا بھی نہ چلتا کہ بی بی کہاں گئیں اور میری رانو کی طرح......''

اس کی آواز بند ہو گئی تھی...... اور بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

''اس لیے میں ڈیرے پر جانے کے بجائے ادھر چلا آیا۔ جلدی کریں بی بی۔''

اختر بانو کا دل جیسے پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ منیرا جو شاپر صحن میں پڑے تخت پر رکھ کر واپس آ گئی تھی۔ اور وحشت بھری نظروں سے چراغ سائیں کی طرف دیکھ رہی تھی، یکدم بولی۔

"چلو...... چلو چاچا میں...... میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ یا اللہ! ہماری زمل بی بی کی حفاظت کرنا۔ چاچا! تم دیکھو اندر مردانے میں کوئی ملازم ہے تو ساتھ لے لو۔"

"نہ......" اختر بانو جیسے ہوش میں آئی تھیں اور دوپٹا اچھی طرح سے لپیٹتی صحن کا دروازہ اپنے پیچھے بند کرتی ہوئی تیزی سے بیرونی صحن عبور کر کے باہر آئی تھیں۔ منیرا نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ حویلی کا نظام سالوں سے سنبھال رہی تھیں۔ کون سی بات حویلی سے باہر جانی چاہیے اور کون سی نہیں، سمجھتی تھیں۔ اور یہاں تو ان کی پیاری زمل کی عزت کی بات تھی۔

"یا اللہ! میری بچی کو محفوظ رکھنا۔ یا اللہ اسے کچھ نہ ہو۔" مسلسل اللہ سے دعا کرتے ہوئے اختر بانو نے خود کو سنبھالا تھا اور وہ دونوں چراغ سائیں کے پیچھے تقریباً بھاگتے ہوئے بڑے ڈیرے کے دروازے پر پہنچی تھیں۔

اور اپنا پھولا ہوا سانس درست کرنے کے لیے ذرا سی دیر کے لیے دروازے کے باہر ہی رک گئی تھیں جبکہ چراغ سائیں دروازے کو دھکا دے کر کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔ سامنے ہی احاطے میں چارپائی پر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ان کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ زور سے دھکا دے کر کھولنے کی وجہ سے جو واپس بند ہو گیا تھا یا چراغ سائیں نے ہی اسے طاقت سے پیچھے کیا تھا۔ یہ ایک پٹ والا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر کھڑی اختر بانو گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں اور منیرا تشویش سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مچھو......!"

چراغ سائیں کی دھاڑ دروازے کے باہر تک سنائی دی تھی۔ اس کی لمبی لمبی مونچھوں کی وجہ سے ڈیرے میں سب اسے مچھو کہتے تھے۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے مچھو اور اس کے ساتھی نے بیک وقت مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاہا...... چراغ سائیں......" وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ "مجھے شک تھا کہ اوپر اونچے ٹیلے پر کوئی بیٹھا تھا شاید تو...... اور میرا شک صحیح ہی نکلا۔ چلو آج تمہارا قصہ بھی پاک کرتے ہیں۔ اپنی بیٹی کو بہت یاد کرتا ہے نا چل تجھے بھی آج اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ کیا یاد کرے گا تو بھی......"

اس نے قہقہہ لگایا تھا اور ساتھ ہی چراغ سائیں کی دھاڑ سنائی دی تھی۔

''چیونٹی کو بھی پر لگ گئے ہیں۔'' دوسرے نے کہا تھا۔ باہر کھڑی اختر بانو اب بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں اور منیرا ان کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔

''میں بھاگ کر چھوٹے ڈیرے سے بخشو اور دوسرے لوگوں کو بلا لاتی ہوں۔''

اختر بانو نے پوری توانائی صرف کر کے خود کو سنبھالا تھا۔ اگر چہ ان کا دل جیسے ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔ وہ ساری نزاکتیں سمجھتی تھیں۔ ان کے پیش نظر خاندان، حویلی اور زل کی عزت سب کچھ تھا۔ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ بات ملازموں تک پہنچی تو کہاں تک جائے گی۔

''یا اللہ! مجھے میرے باپ اور بھائیوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچانا۔ میری بچی کی حفاظت کرنا۔'' وہ بے آواز دعا کر رہی تھیں۔

''یہاں جو کچھ ہوا یا ہوگا تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلنا چاہیے۔'' اللہ سے ہمت اور حوصلے کی دعا کرتے ہوئے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ اندر چراغ سائیں ایک شخص سے گتھم گتھا ہو رہا تھا جبکہ دوسرا ذرا فاصلے پر کھڑا اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

''کہاں...... کہاں ہیں وہ...... کہاں رکھا ہے انہیں؟'' چراغ سائیں کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

''وہاں سے ہی ایک روز اٹھا لینا اسے جہاں سے اپنی بیٹی کی لاش اٹھائی تھی۔'' مونچھوں کو بل دیتا شخص مکروہ سی ہنسی ہنسا۔

''بس...... چھوڑ دو۔ چھوڑ دو چراغ سائیں کو۔'' اختر بانو کی آواز بلند تھی اس سمے اسے لگا تھا جیسے اللہ نے ان کے دل کو تقویت دی ہو۔

چراغ سائیں کے ساتھ لڑتا ہوا شخص اسے چھوڑ کر سیدھا ہوا تھا۔ دوسرا شخص اختر بانو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ منیرا کو پہچانتا تھا کہ بخشو کی بیوی ہے جو چھوٹے ڈیرے پر اور چھوٹی حویلی کے مردانے میں ہوتا ہے اور منیرا کے ساتھ جو کوئی بھی تھی اس کی تمکنت اور وقار بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق مالکوں سے ہے لیکن جو شخص چراغ سائیں سے لڑ رہا تھا اس نے اختر بانو پر ایک نظر ڈالتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”بڑی بی بی جی...... یہ چراغ سائیں پاگل ہو گیا ہے۔ خوامخواہ بھڑ گیا ہے آ کر......“

حویلی کی خواتین حجاب یا عبایا نہیں پہنتی تھیں لیکن پردے کے لیے چادریں اوڑھتی تھیں۔ شاید کہیں آتے جاتے اس کی نظر اختر بانو پر پڑی ہو۔ یوں ڈیرے کے ملازم حویلی آتے جاتے نہیں تھے۔

”بکواس کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔“ چراغ سائیں نے اسے گھونسا مارا۔

وہ بس اسے گھور کر رہ گیا۔

”میری بچی کو کہاں رکھا ہے تم نے اور کیا نام ہے تمہارا؟“ اختر بانو کی آواز دھیمی تھی لیکن اس میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ انہیں بڑے ڈیرے یا بڑی حویلی کے مرد ملازموں کے نام معلوم نہیں تھے۔

”اور تمہاری جرأت کیسے ہوئی۔ ہماری حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی اور......“

مونچھوں والا دونوں ہاتھ جوڑتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔

”ہم تو جی حکم کے غلام ہیں۔ ہمیں معاف کر دیں ہمیں تو جی جو حکم ملتا ہے اسے مان بجا لیتے ہیں۔“

”میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ اس نے برآمدے میں ایک قطار میں بنے کمروں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ جس کے دروازے کے باہر کنڈی لگی تھی۔

”چراغ چاچا، ان کا خیال رکھیے گا، بھاگنے نہ پائیں اور بھاگ کر جائیں گے کہاں، پاتال سے بھی ڈھونڈ لیں گے اور پھر ان کا جو انجام ہوگا سو ہوگا ہی لیکن ان کے خاندان کا بھی کوئی فرد نہیں بچے گا۔“ اسی مضبوط آواز میں کہتی ہوئی وہ تیر کی طرح بند کمرے کی طرف بڑھیں۔

منیرا بھی چراغ سائیں کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے کسی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو دبوچ لے گی۔ اختر بانو نے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی بیڈ پر زمل بیٹھی ہوئی تھی۔

”زمل...... میری بچی!“ اختر بانو دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھیں تو زمل بے تابی سے اٹھ کر ان کے بازوؤں میں سما گئی۔

”پھپھو...... پھپھو......!“ اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل سکا تھا۔

”تم...... تم ٹھیک ہو نا ملی......“ اختر بانو نے اسے الگ کر کے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے

کر اس کی پیشانی چومی تو اس نے سر ہلا دیا۔ اس وقت اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ سینے کی چار دیواری میں موجود دل جو کچھ دیر پہلے بڑا مضبوط تھا اب خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمحے کے ہزارویں حصے میں یہاں سے نکل جائے۔ اختر بانو نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کے پاس اس وقت کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ یہ جگہ کچھ پوچھنے اور کچھ کہنے کے لیے مناسب تھی۔ کوئی اور بھی کسی بھی وقت اس طرف آ سکتا تھا۔

اختر بانو نے زمل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تب ہی باہر سے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔

"مچھو......شیدو......! یہ پاگل یہاں کیا کر رہا ہے اور یہ لڑکی کون کھڑی ہے یہاں؟"

یہ آواز ولب ولہجہ......نہیں......شاید ان کی سماعتوں نے غلط سنا ہے۔

"یا اللہ! میری سماعتوں کو مفلوج کر دے۔" اختر بانو نے بے آواز دعا کی۔

"یہ تم ہو منیرا...... یہاں کیا کر رہی ہو؟ عقل نام کی کوئی چیز ہے تم میں......جدھر منہ اٹھا، اٹھ کر چل پڑیں۔ ادھر اگر کسی سے کام تھا تو بخشو کو بھیجتیں۔"

وہی آواز، وہی لہجہ......

"یا اللہ! یہ آواز سننے سے پہلے میں بہری کیوں نہ ہو گئی۔"

اور پھر سچ مچ آوازیں کچھ دیر کے لیے مر گئیں۔ اختر بانو نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک لگژری بیڈ روم تھا یقیناً یہاں حویلی والوں کے مہمان ٹھہرتے ہوں گے۔ یک دم دروازہ کھلا۔ اختر بانو نے غیر ارادی طور پر زمل کو اپنے پیچھے کیا۔

اردگرد جیسے ساری آوازیں زندہ ہو گئی تھیں۔

"بڑی امی......!"

آنے والا شایان ہی تھا۔

"بڑی امی......!" اس کے لبوں سے پھر نکلا تھا۔ اختر بانو سپاٹ اور سرد نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ شایان کو الجھن ہوئی۔ ان آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اپنے لیے اپنائیت، محبت اور شفقت

دیکھی تھی۔ تب بھی جب اس کی اختر بانو سے بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج ان آنکھوں میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ سپاٹ اور بے مہری سی نظریں تھیں۔

”بڑی امی......!“ وہ الجھا الجھا سا ایک قدم آگے بڑھا۔

”کاش! تمہیں یہاں دیکھنے سے پہلے زمین پھٹ جاتی، اور میں اس میں دھنس جاتی۔“ اختر بانو کے لبوں سے نکلا۔ جیسے کوئی مرتا ہوا شخص سخت اذیت میں بات کرے۔

”مجھے شرم آرہی ہے کہ میں نے تمہیں جنم دیا...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ تمہیں میں نے اپنے خون سے سینچا۔ تم میرا خون ہو۔ میں نے تمہیں اپنا دودھ کئی ہفتے پلایا۔ کاش! تم پیدا ہی نہ ہوتے شایان...... یا پیدا ہوتے ہی مر جاتے۔ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور تم نے اپنے ہی گھر کی بچی کو اغوا کروایا۔“

شایان کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ بڑی امی کیا کہہ رہی تھیں۔ یہ زمل اور بڑی امی یہاں کیوں تھیں۔ بھلا حویلی کی عورتیں بھی کبھی ڈیرے پر آتی ہیں۔

”میرا خون...... میرا بیٹا اتنا گھٹیا اور اخلاق سے گرا ہوا ہو سکتا ہے۔“ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے ٹوٹی بکھری آواز میں جس میں ہزاروں کانچ کی کرچیوں کی چبھن اور اذیت تھی، اختر بانو نے کہتے ہوئے زمل کو مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک زمل کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھیں۔ زمل نے اختر بانو کے پیچھے سے ہٹ کر ان کے برابر ہوتے ہوئے دوسرا ہاتھ ان کے بازو پر رکھا۔ شایان بے حد الجھا ہوا سا کھڑا تھا۔

یہ بڑی امی کیا کہہ رہی ہیں...... میرا خون، میرا بیٹا...... اغوا......

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو بڑی حویلی رضی بھائی کی طرف گیا تھا وہاں سے پتا چلا کہ وہ ڈیرے پر گئے ہیں تو ادھر چلا آیا۔ اور یہاں......“

”پھپھو! آپ شایان کی بات سن تو لیں، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے شاید۔“ زمل کو وجدان کی طرح چہرے پڑھنے کا ہنر نہیں آتا تھا پھر بھی شایان کی آنکھوں میں ٹھہری حیرت اور الجھن اسے بتا رہی تھی کہ اس کی یہاں موجودگی سے بے خبر ہے۔ پھر ان دس دنوں میں اس نے شایان کا روپ دیکھا تھا۔ وہ اتنی

گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کبھی سسٹر، کبھی آپی کہنے اور بہن سمجھنے والا بھلا اسے......

''نہیں......'' زمل نے نفی میں سر ہلایا۔

لیکن یہ پھپھو کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا بیٹا، میرا خون...... شایان تو ثمرہ آنٹی کا بیٹا ہے نا......

پھر...... وہ بھی شایان کی طرح الجھی ہوئی تھی۔

''مجھے پوری بات بتائیں بڑی امی......'' اختر بانو کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ اس نے زمل کی طرف دیکھا زمل نے آہستہ آہستہ مختصراً ساری بات بتادی۔

''میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی؟'' وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکا تو اختر بانو نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''حوصلہ اور صبر......'' وہ زمل کا ہاتھ پکڑے پکڑے باہر آئیں۔ احاطے میں وہ دونوں زمین پر بیٹھے تھے اور چراغ سائیں ان کے پیچھے ہی مستعد کھڑا تھا اور ساتھ ہی منیر اتھی۔ شایان تیز تیز چلتا ہوا ان سے آگے ہوا اور پاؤں سے مچھو کو ٹھوکر ماری۔

''ہمارا کوئی قصور نہیں ہے جی۔ عرفان شاہ صاحب نے حکم دے رکھا تھا کہ جیسے ہی یہ نظر آئیں انہیں ڈیرے پر پہنچادیں۔ چار پانچ دن پہلے بھی انہیں دیکھا تھا شاہ جی نے سنہری کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے۔'' اس نے شایان کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ہم تو جی حکم کے غلام ہیں۔ ہمیں معاف کردیں۔'' شایان نے زور سے پاؤں جھٹکا۔ غصے سے اس کا چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔

''آپ لوگ گاڑی میں جا کر بیٹھیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی چابی اختر بانو کی طرف بڑھائی۔ ''میں ذرا ان کا بندوبست کرتا ہوں۔'' پھر اس نے پاکٹ سے سیل فون نکال کر اپنے ڈیرے پر نظام دین کو فون کیا۔

''نظام دین چاچا! فوراً ایک بندے کو لے کر بڑے ڈیرے پر آئیں۔ پیدل آنے کے بجائے اگر کیری ڈبہ ہے ڈیرے پر تو اس میں آئیں۔''

کیری ڈبے میں سبزیاں، پھل وغیرہ شہر بھجوائے جاتے تھے اور جب ضرورت نہ ہوتی تو ڈیرے پر ہی موجود رہتا تھا۔ شیدو نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو چراغ سائیں نے اسے دبوچ لیا۔ نحیف اور کمزور سے چراغ سائیں میں جانے کیسے اتنی طاقت سما گئی تھی۔

''بھاگنے کی کوشش بے کار ہے شیدے...... پاتال سے بھی نکال لوں گا تمہیں۔ اور تمہارے بیوی بچوں کے ٹکڑے کر کے جنگل میں پھنکوا دوں گا۔''

اختر بانو نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا اور کچھ عرصہ پہلے کی ثوبان شاہ کی کہی بات یاد آ گئی تھی۔

''میرے بچوں میں سے شایان ایسا ہے جو اپنے چچا زمان شاہ اور دادا جان کی طرح زمینوں اور حویلی کے معاملات دیکھ اور سنبھال سکے گا۔ ورنہ باقی تینوں کو دلچسپی نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہو کہ شایان میں فوری فیصلے کرنے اور حالات کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہی اختر بانو کی ہمت جواب دے گئی تھی اور رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''تمہیں کچھ ہو جاتا تو...... میں کیا کرتی ملی...... میں تو زندگی بھر ابا جان کو منہ نہ دکھا سکتی۔ میں تو مر جاتی زمل...... میں نے کیوں تمہیں اکیلے جانے دیا۔''

''ریلیکس پھپھو...... کچھ نہیں ہوا آپ حوصلہ رکھیں، سنبھالیں خود کو۔'' زمل جو اختر بانو سے شایان کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی، فی الحال اسے بھول کر تسلی اور حوصلہ دینے لگی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن اختر بانو کی حالت اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''میرا دل ڈوب رہا ہے زمل، جیسے نیچے ہی نیچے گر رہا ہو۔ سنو، وہاں لاہور میں کسی سے ذکر نہ کرنا اس واقعے کا۔''

''نہیں کروں گی، آپ پریشان نہ ہوں پھپھو۔''

وہ اختر بانو کے بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔

''اور منیرا تمہاری زبان سے بھی ایک لفظ نہ نکلے۔''

''جی......!'' منیرا نے سر ہلایا تھا۔

کچھ ہی دیر میں شایان آگیا۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

''فی الحال انہیں اپنے ڈیرے پر بھجوا دیا ہے۔ بابا آجائیں تو پھر فیصلہ ہوگا۔ میں آپ کو حویلی چھوڑ کر واپس آتا ہوں ڈیرے پر۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اختر بانو کو بتایا۔

''شایان...... بھائی!''

زل اختر بانو کی حالت دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ دل پر ہاتھ رکھتی، کبھی گہرے گہرے سانس لیتی، کبھی پیشانی پر آئے پسینے کو پونچھتی نڈھال ہو رہی تھیں۔

شایان نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''پھپھو کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کوئی ڈاکٹر، کلینک ہے یہاں تو وہاں لے چلیں۔''

شایان نے ایک نظر اختر بانو کو دیکھا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ دونوں اس وقت اپنے اندر اٹھتے سوالوں کو بھلا کر اختر بانو کے متعلق سوچ رہے تھے۔ زل نے اختر بانو کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا، کبھی ان کے ہاتھ ملتی، کبھی نرم لہجے میں کہتی۔

''کچھ نہیں ہوا پھپھو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ خود کو سنبھالیں۔'' ہولے ہولے بولتی ہوئی وہ اس وقت وہ ساری اذیت بھول چکی تھی جو تھوڑی سی دیر میں اس نے اٹھائی تھی۔ خوف، ڈر، اذیت، تکلیف ...... کئی بار اسے لگا تھا کہ بس اس کا دل ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو اسے خود کو ختم کر لینا چاہیے۔ اپنی عزت کو بچانے کے لیے حرام موت...... نہیں مجھے اس درندے کو ہی مار دینا چاہیے۔ ان لمحوں میں اس کے ذہن میں کس کس کا خیال نہیں آیا تھا۔ دادا جان، آزین، ابا، بی بی اماں......

''اترو منیرا......'' شایان نے گاڑی حویلی کے گیٹ کے قریب روکی تھی۔ ''اندر جا کر بتا دینا کہ میں زل اور بڑی امی کو ہاسپٹل لے کر گیا ہوں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور یاد رکھنا، اس کے علاوہ ایک لفظ بھی نہیں۔

یہاں بیدار بخت شاہ کے علاقے میں بہت اچھا چھوٹا سا ہاسپٹل ہے۔ بڑی امی کو وہاں ہی لے کر جا رہا ہوں۔ فوری ٹریٹ منٹ مل جائے گی۔'' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تھا۔

اس نے کچھ نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ زمل سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ پھر ہاسپٹل تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ زمل کے لب مسلسل ہل رہے تھے۔ وہ اختر بانو کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے دعا مانگ رہی تھی اور شایان کے ذہن میں الجھنیں تھیں، سوال تھے، غصہ اور شرمندگی تھی جنہیں ایک طرف کیے فی الحال وہ اختر بانو کے لیے دعا کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ذرا سا رخ موڑ کر اختر بانو کی طرف دیکھ لیتا جن کی حالت اسے مسلسل بگڑتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

ہاسپٹل پہنچ کر جب ڈاکٹر نے اطمینان دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے البتہ بی پی کا مسئلہ ہے۔ کبھی یکدم لو ہو جاتا ہے کبھی ہائی تو یہ بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب تک بی پی نارمل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ادھر ہی رہنا ہوگا۔ اور اختر بانو کی طرف سے تھوڑا سا مطمئن ہو کر اس نے ثوبان شاہ کو فون کر کے اختر بانو کا بتایا کہ ''فی الحال وہ ہاسپٹل میں ہیں لیکن بی پی نارمل ہوتے ہی گھر چلے جائیں گے۔ آپ ابھی وہاں سے نکل کر سیدھے حویلی آئیں، ایک مسئلہ اور بھی ہے جس کے لیے آپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔''

''کیا؟'' وہ پریشان ہو گئے تھے۔ ''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو...... اختر بانو......''

''بڑی امی کا بس بی پی کا پرابلم ہے باقی اور کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ جو بھی مسئلہ ہے اسے فون پر ڈسکس نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کا کوئی ضروری کام بھی ہے تو اسے پوسٹ پون کر دیں۔''

اس نے فون بند کر دیا تھا۔ زمل کو وہ اس وقت بہت ذمہ دار اور سمجھدار لگ رہا تھا حالانکہ وہ اسے لاابالی اور لاپروا سا سمجھتی تھی۔ ایک بار نہ جانے کس بات پر وجدان احمد نے کہا تھا۔

''زمل! آپ کو انسانوں کی پہچان نہیں ہے۔ انسان ایسا درندہ ہے جس نے اپنے دانت اندر چھپا رکھے ہیں۔''

شاید اس روز عقیل اور اس کے والد کی بات ہو رہی تھی تو اس نے اس کے والد جو صوبائی اسمبلی

کے رکن بھی رہ چکے تھے کی تعریف کر دی تھی۔اسے یاد آ گیا تھا کہ وجدان احمد نے کس بات پر کہا تھا وہ......اور شاید صحیح ہی کہا تھا اسے واقعی انسانوں کی پہچان نہیں تھی۔شایان کے متعلق بھی کچھ عرصہ تک وہ شکوک اور غلط فہمی کا شکار رہی تھی لیکن شایان پھپھو کا بیٹا......وہ کیا کہا تھا پھپھو نے اس وقت کہ......تب ہی شایان نے اسے مخاطب کیا۔

''زمل! بڑی امی کو ایمرجنسی سے روم میں منتقل کرنے لگے ہیں۔آپ بھی آ جائیں۔'' وہ تیز تیز چلتا ہوا ایمرجنسی کی طرف بڑھ گیا تو وہ بھی جو کچھ دیر پہلے ہی ایمرجنسی سے وزیٹر روم میں آ کر بیٹھی تھی، اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔تھوڑی دیر بعد ہی اختر بانو کو روم میں منتقل کر دیا گیا۔وہ ان کے بیڈ کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی اور اختر بانو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''زمل! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہو جائے گا۔مجھے......''

''پلیز پھپھو! اس وقت آپ نے کچھ نہیں سوچنا اب......'' تب ہی شایان جو ڈاکٹر سے کچھ پوچھنے کے لیے چلا گیا تھا، کمرے میں آیا۔

''شایان بیٹا، مجھے معاف کر دینا، میں نے پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیا تھا تمہیں لیکن میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔'' اختر بانو ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''بڑی امی......فی الحال کچھ نہیں سوچنا۔کوئی بات نہیں......اور یہ معافی والی بات پھر مت کیجیے گا۔مائیں بچوں سے معافی نہیں مانگتیں۔بخدا آپ اگر اس وقت دس جوتے بھی مجھے لگا دیتیں تو آپ کو حق تھا۔اور اب آنکھیں بند کر لیں۔اچھے بچوں کی طرح اور خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کریں۔آپ کو ویسے بھی میڈیسن دی ہے ڈاکٹر نے اس سے آپ کو خود ہی نیند آ جائے گی۔''

اور ایسا ہی ہوا تھا، کچھ دیر بعد ہی اختر بانو سو گئی تھیں۔شایان کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر کچھ دیر بعد باہر چلا گیا۔

زمل نے کئی بار کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا۔پہلی بار جب اس نے شایان کو دیکھا تھا تو اسے امان اور شایان میں بہت مشابہت سی محسوس ہوتی تھی۔ظاہر ہے دونوں بھائی تھے لیکن آج شایان کو

دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ شایان اور امان میں ابا کی مشابہت تھی۔ شاید ان کی آنکھیں، پیشانی، سلکی بال......

''تو وہ جو پھپھو کہہ رہی تھی کہ تم میرے بیٹے ہوتو......''

الجھتے ذہن کے ساتھ اس نے واپس آ کر شایان کو بیٹھتے دیکھا۔

''بیدار انکل آئے تھے شاید بابا نے انہیں فون کیا تھا۔ کھانے کا پوچھ رہے تھے۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ آپ کو اگر کچھ کھانا ہو تو کینٹین سے کچھ لے آتا ہوں۔''

''نہیں...... میرا کچھ بھی کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔'' اس نے بھی منع کر دیا تھا۔ بھوک، پیاس سب ہی جیسے اڑ گئی تھی۔

شام تک اختر بانو کا بی پی نارمل ہو گیا تو انہیں جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس دوران شایان اور زمل میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ واپسی کے سفر میں بھی کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اختر بانو بھی خاموشی سے آنکھیں موندے سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھی رہیں۔ ثمینہ انہیں لاؤنج میں ہی مل گئی تھیں۔

''اتنی پریشان ہو گئی تھی میں جب ثمرہ آپا نے فون کر کے بتایا کہ آپ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور شانی آپ کو ہاسپٹل لے کر گیا ہے۔ میرا تو آج رت جگے کا پروگرام تھا۔ دونوں بھانجیوں کو ساتھ لے کر آنا تھا۔ تب سے دعا کر رہی ہوں کہ اللہ آپ کو صحت و زندگی دے اور اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔''

''آمین!'' اختر بانو اور زمل کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

''زمل! آپ بڑی امی کو کمرے میں لے جائیں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں اور چچی جان......'' اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ ''بڑی امی کے لیے کیا بنایا ہے؟ صبح سے کچھ نہیں کھایا انہوں نے۔''

''وہی ان کا پرہیزی کھانا بغیر نمک کے سبزیاں اور چکن کا سوپ بنوایا تھا میں نے۔ اور تم لوگ بھی تو صبح سے بھوکے ہو گے، کھانا لگواؤں؟'' اختر بانو کی بیماری نے نہ صرف یہ کہ اس کے دل میں اختر بانو کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا بلکہ احساس ذمہ داری بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ فطرتاً اچھی نیچر کی تھی جبکہ

صفورا پہلے کی طرح ہی لاپروا اور خود میں مگن رہتی تھی۔

''نہیں......کھانا اب رات میں ہی اکٹھے کھائیں گے۔ بابا جان اور زمان چچا بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ ہاں بڑی امی کے لیے بھجوا دیں ابھی۔'' اس نے زمل کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زمل اختر بانو کو سہارا دے کر ان کے کمرے میں لے گئی۔ ثمینہ بھاگی کو ہدایت دے کر اختر بانو کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

''بس بھابی! اب میں نے آپ کو بالکل اٹھنے نہیں دینا بیڈ سے۔ مکمل آرام کرنا ہے آپ نے نومی کی شادی تک۔''

''شکریہ ثمینہ! پہلے میں کون سا ہل جوت رہی تھی۔ یوں ہی تھوڑا سا بی پی کا مسئلہ ہو گیا تھا۔'' اختر بانو ثمینہ کے خلوص سے متاثر ہوئیں۔

''زمان شاہ نے تو مجھے دو تین دن تک آنے کو کہا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ حیدر آباد میں کچھ جگہ خریدنی ہے۔ پھر پتا نہیں اچانک واپسی کا کیوں پروگرام بنا لیا۔ ثوبان بھائی بھی واپس آ رہے ہیں تو شاید بات نہیں بنی۔''

ثمینہ کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، پھر اٹھ کر چلی گئیں۔ صفورا بھی کچھ دیر آ کر بیٹھی تھی اور طبیعت کا پتا کر کے چلی گئی البتہ ثمرہ نہیں آئی تھی۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ جب سے منیرا نے آ کر بتایا تھا کہ شایان اختر بانو کو لے کر ہسپتال گیا ہے۔ تب سے ہی وہ کھول رہی تھی۔

''لگتا ہے میرے بیٹے کو کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ جادو کر دیا ہے اس پر۔ بڑی امی کے قصیدے ہی ختم نہیں ہوتے اس کے۔''

بھاگی نے اسے آ کر اختر بانو اور شایان کے آنے کا بتا دیا تھا لیکن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ شایان فریش ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو اختر بانو کے کمرے کی طرف جاتے جاتے کچھ سوچ کر ثمرہ کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

''السلام علیکم امی!'' دستک دے کر وہ کمرے میں آیا تو ثمرہ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ ثمرہ کا موڈ خراب ہے۔

''فرصت مل گئی ہے تمہیں۔ آ گیا ماں کا خیال......'' ثمرہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اف امی! مجھے آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ فریش ہو کر سیدھا آپ کی طرف آیا ہوں سلام کرنے۔''

اسے ثمرہ کا اس طرح طنزیہ انداز میں بات کرنا بالکل پسند نہیں تھا لیکن ثمرہ کو تو جیسے عادت ہو گئی تھی طنز کرنے کی جب سے اس نے اختر بانو سے بات شروع کی تھی۔

''اب آ گئے ہو تو بیٹھ جاؤ دو گھڑی کے لیے یا ابھی اختر بانو کی خدمت کے لیے جانا ہے۔'' ثمرہ کا وہی طنزیہ انداز لیکن شایان کا لہجہ نارمل تھا۔

''جی، بڑی امی کی طرف ہی جا رہا تھا تاکہ زلل کو بتا دوں کہ روزمرہ کی دوائیوں میں سے آج کون سی میڈیسن نہیں دینی اور جو ڈاکٹر نے آج میڈیسن دی ہے اس کے متعلق بھی بتانا ہے کہ کب دینی ہے۔''

''میرا خیال ہے تم وہاں ہی اپنی بڑی امی کے کمرے میں اپنا بستر بچھا لو۔ کس قدر ڈرامہ باز ہے یہ عورت۔ اور کچھ نہیں بنا تو بیماری کا بہانہ بنا کر ساتھ لے کر چلی گئی۔'' غصے میں ثمرہ کو خود پر اختیار نہیں رہتا تھا۔ جو منہ میں آتا، کہتی چلی جاتی تھی۔ شایان نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ نہیں، میں انہیں لے کر گیا تھا۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آپ کو ان سے کیا تحفظات ہیں۔''

وہ اتنا متحمل مزاج نہیں تھا جتنے تحمل کا اس وقت مظاہرہ کر رہا تھا۔ ثمرہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئیں۔ شایان کا جی چاہا کہ وہ لگے ہاتھوں ابھی اسی وقت ثمرہ سے وہ پوچھ لے، جس نے اس کے دماغ میں ہلچل مچائی ہوئی تھی۔

لیکن نہیں......

اس نے خود کو روک لیا۔ پہلے اسے بڑی امی سے وضاحت لینی تھی، پوچھنا تھا انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا۔ کیا وہ ان کا بیٹا ہے، پھر آج تک کسی نے اسے بتایا کیوں نہیں۔ اگر بڑی امی نے مجھے امی

کو دے دیا تھا تو اس میں چھپانے والی کیا بات تھی، مجھے کیوں نہیں بتایا گیا۔

''میں...... میں نے تو بس ایسے ہی کہہ دیا۔ جاؤ...... جا کر بیٹھو اپنی بڑی امی کی پٹی سے لگ کر۔ مجھے بھلا کیا تحفظات ہو سکتے ہیں۔'' تروٹھے انداز میں کہتے ہوئے ثمرہ نے منہ موڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ شایان کچھ کہتا بیرونی گیٹ کھلنے اور ثوبان شاہ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر شایان یہ کہتے ہوئے کہ ''بابا جان آ گئے ہیں'' باہر نکل گیا۔

''انہوں نے تو دو تین دن رہنا تھا حیدر آباد...... ضرور تم نے ہی خبر دی ہو گی۔ آ گئے سارے کام چھوڑ کر اپنی چہیتی کی خدمت کے لیے۔''

شایان نے ثمرہ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بس ایک نظر انہیں دیکھ کر باہر نکل گیا۔ ابھی وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ ثوبان شاہ صحن سے آتے نظر آئے تو وہ برآمدے میں ہی رک گیا۔

''کیسی ہے اب اختر بانو......'' اس کے قریب آ کر ثوبان شاہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''بہت بہتر ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہی ہم ہاسپٹل سے آئے ہیں۔ میں تھا یہاں آپ کو پریشان نہ کرتا لیکن ایک اور مسئلے میں آپ کا یہاں ہونا اور رائے ضروری تھی۔'' وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''کیا بات ہے شایان؟'' وہ اختر بانو کے کمرے کے باہر رک گئے تھے۔ ''مجھے بتاؤ جلدی میں پریشان ہو رہا ہوں۔ یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو تمہیں مجھے اور زمان کو بلانا پڑا۔ میں نے تو خیر آنا ہی تھا آج نہ آ سکتا تو کل آ جاتا، لیکن زمان کو تو رہنا تھا ابھی۔''

''جی بابا...... مشکل وقت ٹل گیا ہے آپ بڑی امی کی خیریت پوچھیں، میں ماسی تاج سے کہتا ہوں آج ذرا جلدی کھانا لگا دے۔ کھانے کے بعد آرام سے مردانے میں چل کر بات کرتے ہیں۔ آپ پریشان بالکل نہ ہوں۔'' اس نے ثوبان شاہ کے بازو پر تسلی کے انداز میں ہاتھ رکھا تو ثوبان شاہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ان کا یہ لاپروا کھلنڈرا سا شایان اس وقت بہت بردبار اور سمجھدار لگ رہا تھا۔

''میں خود ہی سارا معاملہ نپٹا لیتا بابا لیکن ایک تو بڑی امی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، دوسرا اس معاملے میں بڑوں کو انوالو کرنا ضروری تھا۔ سو......''

وہ مدھم سا مسکرایا اور ثوبان شاہ کو بہت پہلے کہی ہوئی دلاور شاہ کی بات یاد آ گئی۔

''تمہارا یہ بیٹا دادا جان کا صحیح جان نشین ہو گا۔ باقی تینوں تو نرے شہری ہیں۔ اس کی پڑھائی کی ٹینشن مت لو۔'' اور دلاور شاہ کی بات یاد کرتے ہوئے ان کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔

کھانا کھا کر ثوبان شاہ، زمان شاہ اور شایان فوراً ہی مردانے میں آ گئے تھے اور شایان شاہ سے ساری بات سن کر زمان شاہ ایک دم کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا رنگ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''میں اس عرفان کے بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی، ہماری حویلی میں مہمان بچی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی اور پھر وہ بچی بھی کوئی غیر نہیں، بھابی جان کی بھتیجی ہے۔''

''بیٹھ جاؤ زمان! ہمیں حویلی کی عزت کا بھی خیال رکھنا ہے تمہارا کوئی بھی جذباتی عمل نہ صرف تمہارے لیے نقصان دہ ہو گا بلکہ اس سے حویلی اور زل کی عزت پر بھی حرف آئے گا اور ہمیں زل کی عزت ہر شے سے بڑھ کر ہے۔'' ثوبان شاہ ہمیشہ سے ہی متحمل مزاج تھے گو جب شایان سب بتا رہا تھا تو ان کا بھی خون کھول رہا تھا اور انہیں بار بار اختر بانو کا بھی خیال آ رہا تھا۔

''تو ثوبان بھائی! ہم کچھ نہ کریں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔'' زمان شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی جا کر اس کا گلا دبا دیں۔

''نہیں...... ہمیں جو بھی کرنا ہے، سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔ شایان، ابھی دلاور بھائی کو فون کر کے اپنے ڈیرے پر آنے کے لیے کہو۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔''

ثوبان شاہ کھڑے ہو گئے تھے۔

''اور ہاں اندر بتا دینا کہ ڈیرے پر کچھ لوگ ملنے آ گئے ہیں تو اس لیے ہم وہاں جا رہے ہیں۔''

ڈیرے پر دلاور شاہ اور وہ آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔

''خیر ہے نا ثوبان شاہ...... اس وقت کیوں بلایا ہے شانی نے کچھ بتایا ہی نہیں...... ساتھ والوں سے پانی کی باری پر جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟ میں احتیاطاً بندوں کو تیار رہنے کا کہہ آیا تھا۔'' رہائشی حصے کی

طرف جاتے ہوئے دلاور شاہ نے پوچھا تو ثوبان شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں......اب تو کئی سال ہوگئے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' ثوبان شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر......؟'' دلاور شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ فکر مند ہوگئے تھے کہ کہیں ثمرہ نے پھر کوئی حماقت تو نہیں کردی۔

''اندر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں بھائی صاحب......'' زمان شاہ کی آنکھوں میں اب بھی سرخی تھی۔

اور جب ثوبان شاہ نے ساری بات بتائی تو کچھ دیر کے لیے وہ بالکل خاموش ہوگئے تھے۔ پھر پوچھا۔

''کہاں ہیں وہ دونوں نمک حرام......؟''

ڈیرے کا چوکیدار اور ایک دوسرا ملازم ساتھ والے گوٹھ میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ شام کو واپس آئے تو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ دونوں ڈیرے پر نہیں ہیں۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ دونوں کیا حرکت کر چکے ہیں۔ گو انہیں یقین تھا کہ ان دونوں نے عرفان شاہ کے کہنے پر ہی سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ عرفان شاہ کی ایسی حرکتوں سے نالاں ہی رہتے تھے۔ اسی لیے تو انہوں نے اسے باہر بھجوا دیا تھا۔ پھر بھی ایک بار وہ ان دونوں سے خود بھی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ ثوبان شاہ نے شایان کو اشارہ کیا تھا اور وہ ان دونوں کو لے آیا تھا۔ ان دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی اور رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ آتے ہی دلاور شاہ کے قدموں میں گر گئے تھے۔

''ہمیں معاف کر دیجیے شاہ جی......ہم تو حکم کے غلام ہیں جی۔ جو حکم ملا......''

''بکواس بند کرو اور ساری بات بتاؤ مجھے۔''

دلاور شاہ نے پاؤں کو زور سے جھٹکا تو شیدا جوان کا پاؤں پکڑے بیٹھا ہوا تھا پیچھے کو الٹ گیا۔ وہ دھاڑے تو ہاتھ باندھتے ہوئے مچھو نے وہ ساری بات دہرائی جو پہلے شایان اور اختر بانو کو بتا چکا تھا۔

''عرفان کو فون کر کے بلواؤ اور یہ بھی کہہ دینا کہ ساتھ بارات لانے کی ضرورت نہیں ہے، اکیلا ہی آئے۔'' انہوں نے شایان کی طرف دیکھا، جو سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ اور پھر عرفان شاہ کے آنے

تک خاموشی ہی رہی، کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''کیا ہوا بابا سائیں، خیریت ہے نا، کیوں بلوایا ہے مجھے۔'' اور بات کرتے کرتے اس کی نظر کونے میں دیوار سے لگے بیٹھے مچھو اور شیدے پر پڑی تو اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے زمل کو اغوا کر لیا تھا۔

''یہ...... یہاں کیا ہوا بابا سائیں۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' دلاور شاہ جیسے غرائے تھے اور پھر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''ادھر آؤ تم دونوں اور پھر سے ساری کہانی سناؤ۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مچھو نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اگر وہ مکر جاتے ہیں اپنی بات سے اور اگر وہ سچ بولتے ہیں موت تو دونوں صورتوں میں ان کا مقدر ہے تو پھر سچ بول کر ہی کیوں نہ مرا جائے۔ شاید سچ بولنے میں کچھ بچنے کا امکان ہو۔ اور مچھو نے وہ ساری بات دہرا دی جو پہلے بتا چکا تھا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ الزام لگا رہا ہے مجھ پر۔'' عرفان شاہ نے جو چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا تھا، سنبھلتے ہی اسے مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ دلاور شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ عرفان شاہ نے نظریں جھکا لیں۔

''ہمیں جو بھی سزا دیں، ہمیں منظور ہے شاہ جی لیکن ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔ چاہیں تو قرآن شریف پر ہاتھ رکھوا کر۔''

''چپ کرو۔'' دلاور شاہ کی آنکھوں کی سرخی اور لہجہ ان کے طیش اور غصے کا پتا دے رہا تھا۔ مچھو اور شیدا اب سر اٹھائے اعتماد سے کھڑے تھے۔ ڈیرے کے ملازم جی دار اور وفادار ہوتے تھے۔ بات اگر حویلی کی بچی کی نہ ہوتی تو شاید کبھی زبان نہ کھولتے۔

''شایان! انہیں لے جاؤ ان کے متعلق بعد میں فیصلہ کرتے ہیں۔''

''ہاں تو سید عرفان شاہ......''

ان کے جانے کے بعد دلاور شاہ نے عرفان کی طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

''قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہنے کو تیار ہو کہ یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''سوری بابا سائیں، مجھے علم نہیں تھا کہ وہ چچی کی بھتیجی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ سنہری کی کوئی رشتے دار ہے۔ کہیں دوسرے گوٹھ سے آئی ہوئی ہے۔'' عرفان شاہ کو کبھی اپنی حرکتوں پر شرمندگی نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر، جھوٹ بولنے کی اس کی ہمت نہیں تھی سو ڈھٹائی سے اعتراف کر لیا۔

ایک دفعہ بابا سائیں معاف کر دیں پھر ان دونوں کا تو وہ حشر کرے گا کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔

''تو تمہارے نزدیک کامیوں کی کوئی عزت نہیں ہے۔'' دلاور شاہ کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ہمارے علاقے میں آج تک حویلی کے کسی مرد نے کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بھلے وہ ہماری کامی ہوں یا سیپی۔''

سیپی مطلب جو سارا سال کام کرتے ہیں بغیر تنخواہ کے جیسے حجام وغیرہ اور سال کے آخر میں انہیں اناج وغیرہ دے دیا جاتا ہے عید تہواروں پر کپڑے اور رقم بھی دی جاتی ہے۔

''چند سال پہلے چراغ سائیں کی بیٹی کے ساتھ جو واقعہ ہوا تھا، تب بھی مجھے تم پر اور تمہارے دوستوں پر شک تھا۔ سوچتا تھا ہمارے لیے چراغ سائیں کی آنکھوں میں نفرت کیوں ہوتی ہے۔ ہماری گاڑی پر پتھر کیوں پھینکتا ہے۔ ایک بار تم سے کیوں لڑ پڑا تھا۔ اگر تمہارا گارڈ اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ مار ہی دیتا تمہیں۔ لیکن باپ ہوں نا......'' دلاور شاہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''ہر بار اپنے شک کو دل سے نوچ کر پھینک دیتا کہ میرا بیٹا ایسا نہیں ہو سکتا۔ بیٹی کے دکھ نے چراغ سائیں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ لاش چونکہ ہمارے ڈیرے کے پچھلی طرف سے ملی تھی تو اس لیے...... پھر بھی میں نے تمہیں باہر بھجوا دیا کہ کہیں اپنے پاگل پن میں وہ تمہیں مار ہی نہ ڈالے۔''

''بابا سائیں...... وہ میرے دوست تھے جو چراغ سائیں......'' عرفان شاہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔

''بس......'' دلاور شاہ نے ہاتھ بلند کیا۔ ''مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔''

اور اسے بازو سے پکڑ کر ثوبان شاہ کے سامنے کھڑا کیا۔

''ثوبان شاہ......! اس کے ساتھ جو دل چاہے سلوک کرو۔ بے شک ابھی اس کے سینے میں گولی اتار دو۔ میں اس کا خون تمہیں معاف کرتا ہوں۔ یہ بڑی سے بڑی سزا کا مستحق ہے تم جو سزا ابھی دو گے، میں اف تک نہیں کروں گا۔'' ثوبان شاہ صرف چچا زاد ہی نہیں، بہنوئی بھی تھے۔ فیصلہ ثوبان شاہ کے ہاتھ میں دے کر گویا انہوں نے ان کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ سیاست دان تھے۔ جانتے تھے کہ ثوبان شاہ نرم دل ہیں اور کیسے ان کا دل جیتنا ہے۔

''نہیں دلاور بھائی، اللہ نے ہماری عزت رکھ لی۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا۔ ساری زندگی چراغ سائیں کا احسان مند رہوں گا اور ساری زندگی میری نظریں اختر بانو کے سامنے جھکی رہیں گی۔''

ثوبان شاہ جانتے تھے کہ عرفان شاہ، دلاور شاہ کا بڑا بیٹا ہے کتنا لاڈلا ہے اور ان کے بے جا لاڈ نے ہی اسے بگاڑا ہے۔ زمان شاہ غصے سے مٹھیاں بھینچے بیٹھے تھے ورنہ ان کا اور شایان کا جی تو یہ ہی چاہ رہا تھا کہ ابھی اس شخص کی گردن اڑا دیں۔ جو اس وقت سر جھکائے کھڑا تھا۔

''نکل جاؤ یہاں سے عرفان شاہ اور صبح مجھے حویلی میں نظر نہ آؤ سورج نکلنے سے پہلے حیدر آباد چلے جاؤ اور پھر وہاں سے پہلی دستیاب فلائٹ پر واپس چلے جاؤ۔ وہاں ہی رہو عمر بھر گوروں کے ملک میں۔ یہاں رہنے کے قابل نہیں ہو تم۔'' اس کے جانے کے بعد دلاور شاہ نے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔

''ان دونوں کا کیا کرنا ہے ثوبان شاہ؟''

''وہ آپ کے ملازم ہیں بھائی صاحب، جو آپ مناسب سمجھیں، کریں۔ لیکن کچھ ایسا مت کیجیے گا کہ علاقے میں چہ مگوئیاں ہوں لوگوں کی انگلیاں اٹھیں اور حویلی کی عزت پر حرف آئے۔'' جواب زمان شاہ نے دیا تھا۔

''یہ حکم کے غلام ہیں دلاور بھائی، انہوں نے وہی کرنا ہے جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔'' ثوبان شاہ کھڑے ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی زمان شاہ اور شایان بھی۔

''بس ان کی زبانیں بند رہنی چاہئیں۔ آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کی زبانوں کو کیسے بند رکھا جا سکتا ہے۔'' دلاور شاہ نے سر ہلایا تھا۔

''رات یہ ادھر ہی رہیں گے، صبح بات ہوگی ان سے......اور ثوبان شاہ، زمان شاہ بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دینا یار۔ یہ اولاد کو یوں ہی تو فتنہ نہیں کہا گیا۔ کیسے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے اس اولاد نے۔''

''بھول جائیں دلاور بھائی، جو ہوا۔ یہ بات یہاں ہی ختم ہوگئی ہے اس کو اب نہ ہم دہرائیں گے نہ آپ......'' ثوبان شاہ نے دلاور شاہ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اور وہ تینوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے احاطے میں آئے تھے جہاں نظام دین چارپائی پر کمبل لپیٹے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

''چاچا! تم اتنی سردی میں یہاں باہر کیوں بیٹھے ہو؟'' شایان اس کے پاس رکا تھا۔

''آپ کا انتظار کر رہا تھا شاہ جی۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''جاؤ کمرے میں جا کر آرام کرو، بیمار ہو جاؤ گے۔'' شایان اسے ہدایت دے کر تیز تیز چلتا ہوا ثوبان شاہ کے قریب آیا تھا جو احاطے کا دروازہ کھول رہے تھے۔ جوں ہی وہ لوگ احاطے سے باہر نکل کر اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے ان کی نظر باہر احاطے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے چراغ سائیں پر پڑی جو گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔

''چراغ سائیں! اتنی سردی میں یہاں کیا کر رہے ہو؟ بیمار ہو جاؤ گے۔'' ثوبان شاہ اسے اس وقت وہاں بیٹھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

''شاہ جی......'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ''شاہ جی! میری رانو مر گئی۔ میری گڈی خاک میں مل گئی۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ رانو کی موت پر اور اس کے بعد کسی نے اسے روتے نہیں دیکھا تھا آج جیسے سالوں کے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''چراغ سائیں! حوصلہ کرو۔'' ثوبان شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آج جو احسان تم نے کیا ہے ہم پر، ہمارے پاس اس کا بدلہ نہیں ہے، ہم ساری زندگی تمہارے احسان مند رہیں گے۔''

ثوبان شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں، کس طرح اسے تسلی دیں۔ چراغ سائیں اس طرح

رو رہا تھا جیسے اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ ہو۔ دلاور شاہ گاڑی کی طرف بڑھتے بڑھتے مڑے تھے۔

''چراغ سائیں! ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔'' چراغ نے بس زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

دلاور شاہ کو مظلوموں کی بددعاؤں سے ڈر لگتا تھا۔ چراغ سائیں پر ایک نظر ڈال کر وہ تیزی سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''چاچا! آ جائیں ہمارے ساتھ ہی۔'' شایان کے لہجے میں آج نرمی اور ہمدردی تھی،

چراغ سائیں کا کوارٹر بھی دوسرے ملازمین کے کوارٹروں کے ساتھ حویلی کی پچھلی سائیڈ پر تھا۔ وہ بنا کچھ کہے شایان کے اشارے پر ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

انہوں نے اسے اس کے کوارٹر کے پاس اتارا تھا لیکن صبح وہ قبرستان میں اپنی بیٹی کی قبر پر سر رکھے بازو اس کے گرد حمائل کیے پڑا تھا۔ لوگ کہتے تھے اتنے سالوں میں آج تک کسی نے اسے بیٹی کی قبر پر جاتے نہیں دیکھا تھا لیکن آج وہ نہ جانے کب کس پہر یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پاس ہی وہی میلی کچیلی کپڑے کی گڑیا پڑی تھی۔ جب لوگوں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا تو اس کا جسم ابھی تک نرم تھا، ہونٹ تھوڑے سے نیم وا تھے اور چہرے پر وہ سکون اور اطمینان تھا جو پچھلے سالوں میں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ وہ گڑیا سینے سے لگائے سارا دن مضطرب اور بے چین سا گاتا پھرتا تھا۔

بابل میری گڈیاں......

اور جب حویلی کے احاطے سے اس کا جنازہ اٹھا تو ثوبان شاہ جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ وہ آج اپنی بیٹی کے بعد بھی اب تک زندہ تھا تو شاید اس لیے کہ اس نے حویلی کی عزت بچائی تھی۔

اور فضا میں جیسے چاروں طرف اب بھی اس کی پرسوز آواز گونج رہی تھی۔ اور ان کے کانوں میں بھی آئی تھی۔

بابل میریاں گڈیاں تیرے گھار رہ گیاں

☆......☆......☆

بائیں کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے دائیں ہاتھ میں فائل پکڑے زمل نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر صحن میں قدم رکھا تو تخت پر بیٹھی بی بی اماں جو ڈیوڑھی کے دروازے پر ہی نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں، بے قراری سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھیں۔

''اتنی دیر کر دی زمل، خیریت تھی نا...... بڑے صاحب بھی بہت پریشان ہو رہے تھے۔ زین بھی ابھی تک نہیں آیا کہ اسے ہی تمہارے اسکول بھیج دیتی۔ شیخو بھی شاہ زیب کو لے کر باہر نکلا ہے، کچھ دیر پہلے ہی...... سحرش نے بتایا کہ بلال بھی گھر پر نہیں ہے۔ مجھے تمہارے اسکول کا کچھ اتا پتا نہیں کہ کہاں ہے ورنہ خود ہی چلی آتی۔ میں کہے دیتی ہوں مجھے کسی روز ساتھ لے جا کر اپنا اسکول دکھا دو۔''

وہ جس طرح تیز تیز بول رہی تھیں، اس سے ان کی پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''اب جاب میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں، تین چار دن بعد بچوں کا رزلٹ ہے اسی سلسلے میں پرنسپل کے ساتھ میٹنگ تھی۔ بچوں کے والدین نے بھی رزلٹ والے دن آنا ہوتا ہے تو بس اسی بارے میں ہدایات دیں۔ ٹیچرز کی ڈیوٹیز لگائیں۔''

وہ بی بی اماں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی صحن سے برآمدے میں آئی۔ تقریباً ایک ماہ ہونے والا تھا اسے اس پرائیوٹ اسکول میں جاب کرتے لیکن آج پہلی بار لیٹ ہوئی تھی۔

''پہلے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی تو اس لیے دل بہت گھبرا رہا تھا۔ جانے کیا کیا وہم آ رہے تھے۔'' بی بی اماں سچ مچ بہت پریشان تھیں۔

''سنو پھر کبھی دیر سے آنا ہو تو فون کر دینا۔ فون ہے نا تمہارے اسکول میں؟'' زمل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شولڈر بیگ اور فائل تخت پر رکھی اور وہاں ہی بیٹھ گئی۔

''میں کہتی ہوں تم وہ لے لو۔ وہ ہی چھوٹا سا فون جو سمیرا کے پاس ہے۔ اب تو سحرش اور مہرین نے بھی لے لیا ہے۔ سحرش کہہ رہی تھی پانچ ہزار کا ہے۔'' بی بی اماں ابھی تک کھڑی تھیں۔

''لے لوں گی بی بی اماں۔'' وہ بے حد تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

''میں تو کہتی ہوں جاب کی ضرورت کیا تھی۔ ایک ماہ ہوا نہیں اور شکل دیکھو کیا ذرا سی نکل آئی

ہے۔ اور یہ زین...... نجانے اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ منہ سے کچھ پھوٹتا ہی نہیں۔ پہلے تو بڑا بولتا تھا کہ اگر مجبوری نہ ہو تو عورتوں کو جاب نہیں کرنی چاہیے اور اب جب میں نے بتایا کہ زمل جاب کرنا چاہتی ہے تو ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا جیسے میں کسی تیسرے بندے کی بات کر رہی ہوں۔'' بی بی اماں بڑبڑائیں۔

''آپ کو کیا پتا کہ مجھے کتنی ضرورت تھی جاب کی۔ پیسے کے لیے نہیں جاب کی میں نے، مجھے تو بس مصروفیت چاہیے تھی۔ اور کتنا غنیمت لگا تھا مجھے جب ثوبیہ نے اس جاب کے متعلق بتایا تھا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا اور بی بی اماں کی طرف دیکھا۔

''پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ سارا دن گھر میں بھی فارغ رہ کر کیا کرتی۔ وہاں اسکول میں بچوں کے ساتھ دھیان بٹ جاتا ہے۔''

''جانے کس کی نظر لگ گئی میرے بچوں کو۔'' بی بی اماں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایک نے دھیان بٹانے کے لیے نوکری کر لی اور دوسرا جو ہے، آفس سے اٹھ کر نہ جانے کہاں دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ کبھی دو نوالے کھا لیتا ہے کبھی بھوک نہ ہونے کا کہہ کر کمرے میں گھس جاتا ہے، چلو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو، میں کھانا گرم کرتی ہوں۔''

''بھوک نہیں ہے بی بی اماں، اسکول میں سموسہ کھا لیا تھا۔ اب چائے پیوں گی۔ رات کو ہی کھانا کھاؤں گی۔''

''اب ایسا بھی کیا کہ ایک سموسے سے پیٹ بھر گیا۔ خیر...... عصر کی اذان ہونے والی ہے، نماز پڑھ کر چائے بناتی ہوں۔ تب تک بڑے صاحب بھی جاگ جائیں گے۔ بی پی کچھ ہائی ہو گیا تھا، مہرین نے چیک کر کے دوا دی تھی تو سو گئے، اچھا ہوا، جاگتے رہتے تو تمہارے لیے پریشان ہوتے رہتے۔'' بی بی اماں بات کر کے اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے رک گئیں۔

''اب یہاں ہی بیٹھ گئی ہو۔ فریش ہو کر تھوڑا آرام کر لو۔ صبح سات بجے کی نکلی ہو، عصر ہونے والی ہے، تھک گئی ہو گی۔''

"کچھ دیر ادھر ہی بیٹھوں گی۔ کھلی فضا میں اچھا لگ رہا ہے۔"

مارچ کا آخری ہفتہ تھا، موسم اس وقت بہت خوش گوار تھا۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، درختوں اور پودوں نے سبز پتوں کا لبادہ اوڑھ لیا تھا نکھرے نکھرے سے پودے اور درخت اچھے لگ رہے تھے۔ یہ بھی قدرت کا کتنا خوب صورت نظام ہے۔ موسم ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ سردی، گرمی، بہار، خزاں...... ابھی ایک ماہ پہلے تک خزاں نے ان درختوں اور پودوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سوکھے، زرد پتے، ٹنڈ منڈ درخت اور پھر مارچ کے آغاز سے پہلے ہی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ اگر ہمیشہ ایک ہی سا موسم رہے خزاں یا بہار تو شاید آدمی اوب ہی جائے۔ انسان تو ایسا ہی ہے نا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بھی تو من و سلویٰ کھا کھا کے بےزار ہو گئی تھی۔ لہسن اور مسور کی دال مانگنے لگی تھی۔

وہ یوں ہی سامنے کیاریوں میں پھدکتی چڑیوں پر نظریں جمائے اوٹ پٹانگ باتیں سوچ رہی تھی۔ بی بی اماں نے جو پانی شاید صبح کیاریوں میں دیا تھا، وہ ابھی تک تھوڑا بہت کیاریوں میں موجود تھا۔ چڑیاں اسی پانی میں اب پروں کو بھگو کر پھر پروں کو پھڑ پھڑا کر پانی جھاڑ رہی تھیں۔ شاید موسم کی خوش گواری ان پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔

تو خزاں رخصت ہوئی اور بہار آ گئی ہے۔ اپریل تک سب پودے پتوں اور پھولوں سے بھر جائیں گے۔ زندگی تبدیلی کا ہی نام ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا، جمود موت ہے۔ ابھی بہار کی آمد ہے، پھر خزاں آ جائے گی اور یہ تبدیلی کا عمل جو صدیوں سے جاری و ساری ہے ایسے ہی جاری رہے گا۔ انسان کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہے۔ آج اگر کوئی دل حزیں ہے تو کل اسی دل میں خوشیاں رقص کرتی ہوں گی۔ وہ بھی کتنی مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی، اور یکا یک زندگی کے چہرے پر دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کیا یہ دراڑیں کبھی بھر سکیں گی۔ کیا وہ پھر پہلے جیسی ہی پرسکون اور مطمئن زندگی گزار سکے گی۔ کیا زین پھر پہلے جیسا ہو جائے گا۔

اس کی نظریں خاکستری چڑیا کے ساتھ ساتھ ہر کیاری میں بھٹک رہی تھیں۔ جہاں جہاں چڑیا

جاتی تھی اس کی نظریں بھی ادھر ہی چلی جاتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ زین اتنا بدل گیا ہے۔ یہ وہ زین تو نہیں تھا جو اتنا خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا تھا۔ اماں کے مرنے کے بعد وہ کس طرح اس کا سایہ بن گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا پھر بھی وہ اسے خوش رکھنے کے ہزاروں جتن کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خود بھی رونے والا ہو جاتا تھا۔ تب وہ خود بھی بچہ ہی تو تھا لیکن اب جب کہ وہ ایک ذمہ دار اور سمجھ دار مرد میں ڈھل چکا تھا اور وہ اب صرف اس کی کزن ہی نہیں، اس کی منکوحہ بھی تھی اس نے یکا یک خود کو اس سے دور کر لیا تھا اور یوں بے نیاز ہو گیا تھا جیسے ان کے درمیان کچھ بھی، کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اس نے کتنی بار کوشش کی تھی کہ وہ اس سے کھل کر بات کرے، جو کچھ اس کے دل میں ہے، بتائے۔ لیکن وہ ٹال دیتا تھا۔

''کیا بات ہے زین...... اتنے چپ چپ سے کیوں رہتے ہو؟'' وہ بس اتنا ہی پوچھ پاتی تھی۔

''نہیں تو، تمہارا وہم ہے۔'' یا'' کچھ نہیں'' کہہ کر وہ فوراً ہی ادھر ادھر ہو جاتا تھا بلکہ جب سے وہ اختر بانو کے گھر سے واپس آئی تھی، وہ گھر میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔ اول تو دیر سے گھر آتا اور اگر کبھی جلدی آ بھی جاتا تو کمرے میں گھسا رہتا تھا۔ ناشتے اور رات کے کھانے پر وہ نگاہیں جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ جلدی جلدی کھاتا اور اٹھ جاتا کبھی کبھار بی بی اماں اور دادا جان سے کوئی بات کر لیتا اور بس...... اس سے تو نظریں ہی نہیں ملاتا تھا۔

''جب دل میں چور ہوتا تو تب ہی نظریں ملا کر بات نہیں کرتا بندہ۔ اور تابی کے دل میں بھی چور ہے۔'' آج بریک میں ہی تو نہ جانے کس بات پر ایک ساتھی ٹیچر دوسری سے کہہ رہی تھی۔ نہ جانے کس کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ وہ بھی اسٹاف روم میں ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

اور اس وقت اس ٹیچر کی بات یاد کر کے وہ یک دم چونکی تھی۔ زین بھی تو مجھ سے نظر ملا کر بات نہیں کرتا تو کیا اس کے دل میں بھی کوئی چور ہے۔ کیا مرتضیٰ بھائی نے زین کے متعلق جو کہا تھا وہ سچ ہے۔ اندر کہیں کوئی آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔

''نہیں......'' اس کے دل نے نفی کی۔ ''زین ایسا نہیں ہو سکتا۔''

حیدر آباد سے لاہور تک کے سفر میں مرتضٰی نے بہت باتیں کی تھیں۔ لیکن کیا کیا اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دھیان سے اس کی باتیں سنی ہی کب تھیں۔ بس یہ ایک بات ذہن کے کسی گوشے میں رہ گئی تھی جو اس وقت پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ گئی تھی لیکن تب اس نے مرتضٰی کی بات پر کوئی ردعمل نہیں دیا تھا کہ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک عام سی کمزور سی لڑکی ہی تو تھی۔ اور ایک روز قبل جو واقعات ہوئے تھے ابھی تک اس کا دل دہلا ہوا تھا۔ اور اس کا اثر نہ جانے کب تک اس کے دل و دماغ پر رہنا تھا۔ بظاہر تو اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن اندر جو اضطراب، بے چینی اور خوف تھا، وہ ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔

جب تک ثوبان شاہ وغیرہ ڈیرے سے واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اختر بانو کے بیڈ روم میں ان کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے جیسے کچھ بھی نہ تھا پھر بھی وقفے وقفے سے وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی بات کر لیتی تھیں۔ یوں ہی کوئی ادھر ادھر کی بات جس کا تعلق صبح والے واقعے سے نہیں ہوتا تھا۔ دراصل اندر ہی اندر دونوں ہی مضطرب تھیں کہ جانے ڈیرے پر کیا ہو رہا ہوگا۔ ثوبان شاہ اور زمان شاہ نے کیا کہا ہوگا۔ اور جب ثوبان شاہ آئے تو بے اختیار وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہمیں معاف کر دینا بیٹی، کہ ہمارے گھر میں تمہیں اس تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر خدانخواستہ کچھ غلط ہو جاتا تو ہم کبھی خود کو معاف نہ کر سکتے۔ زندگی بھر ہم خود سے بھی نظر نہ ملا سکتے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آپ کیوں معافی مانگ رہے ہیں انکل۔ میری بھی غلطی ہے مجھے گھر سے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بچا لیا۔'' وہ شرمندہ تھی، اگر وہ اکیلی گھر سے نہ نکلتی تو یہ واقعہ بھی نہ ہوتا۔

''اللہ کا تو جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے بیٹی۔'' ثوبان شاہ بیٹھ گئے تھے۔

''کیا ہوا، کیا فیصلہ کیا آپ لوگوں نے۔ دلاور بھائی نے آپ کی بات پر یقین کرلیا نا۔'' اختر بانو کی سوالیہ نظریں ان پر جمی تھیں۔

''ہاں......'' ثوبان شاہ ڈیرے پر جو کچھ ہوا تھا سب تفصیل سے بتانے لگے۔ وہ خاموشی سے کھڑی سن رہی تھی۔ بات ختم کر کے انہوں نے شایان کی طرف دیکھا تھا۔ جوان کے ساتھ ہی اندر آیا تھا جب کہ زمان شاہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

''شایان بیٹا! یہ بات آج یہاں اسی کمرے میں دفن ہو جائے۔''

''جی بابا! آپ بے فکر رہیں۔'' اس نے انہیں یقین دلایا۔

''اب تم دونوں جاؤ آرام کرو۔'' اختر بانو کو فکر ہوئی تھی اور وہ شب بخیر کہہ کر ساتھ ساتھ ہی اختر بانو کے روم سے باہر نکلے تھے۔

''سوری زمل......!'' اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شایان لاؤنج میں رکا تھا۔

''آپ لوگوں کا بھلا اس میں کیا قصور ہے۔ کچھ باتیں ہونا لکھا ہوتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ بھول جاؤ جو ہوا، میں بھی بھول جاؤں گی۔'' وہ کوشش کر کے مسکرائی تھی۔

''ہاں، لیکن جس نے یہ حرکت کی وہ کوئی اور نہیں، میرے ماموں کا بیٹا تھا۔ تو شاید یہ قصور کچھ نہ کچھ ہمارے کھاتے میں تو لکھا جائے گا نا۔'' وہ نادم سا لگ رہا تھا۔

''نہیں شایان...... کسی کا قصور کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں لکھا جاتا اور نہ ہی کسی کے گناہ کی سزا اس کے بہن بھائیوں اور عزیز و اقارب کو دی جاتی ہے۔ سزا کا مستحق وہی ہوتا ہے جو قصوروار ہوتا ہے۔'' زمل کا انداز سمجھانے والا تھا۔ شایان نے سر ہلایا۔

''لیکن وہ عرفان بھائی......'' اسے یک دم بڑی امی کی باتیں یاد آئی تھیں۔ کچھ کہتے کہتے وہ جھجک سا گیا تھا۔

''زمل! وہ بڑی امی نے وہاں ڈیرے پر جو کچھ کہا تھا اور جو کچھ میں نے سمجھا اگر وہ صحیح اور سچ ہے تو پھر میرا عرفان بھائی سے وہ رشتہ نہیں بنتا جو میں ساری زندگی سمجھتا رہا۔''

شایان ایسا نہیں تھا جیسا اس وقت لگ رہا تھا۔ الجھا ہوا...... پریشان اور بے بس سا۔ وہ تو زمل کو ہمیشہ ہی جب سے وہ اس سے ملی تھی کچھ مغرور اور خود پسند سا لگا تھا لیکن اس وقت دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیے، دونوں ہاتھوں کو سختی سے جکڑے اس کے سامنے کھڑا شایان اس شایان سے کتنا مختلف لگ رہا تھا جسے وہ اب تک جانتی تھی۔

''اگر تمہارا اس سے وہی رشتہ ہو تب بھی تم یا تمہاری فیملی قصوروار نہیں ہے شایان۔'' زمل کچھ دیر کے لیے اپنی ذہنی اذیت اور تکلیف بھول کر وہی زمل بن گئی تھی جو بقول بی بی اماں کے سب کے درد کا درماں بن جایا کرتی تھی۔

''وہ...... یہ بات نہیں ہے زمل...... دراصل وہ میں...... جو بڑی امی نے میرے متعلق کہا۔ تم جانتی تھیں پہلے سے اس کے متعلق؟ اور یہ کیا کہ وہ سچ کہہ رہی تھیں کیا انہوں نے مجھے جنم دیا ہے؟''

''میں اس بارے میں اتنی ہی بے خبر اور انجان ہوں جتنے تم ہو۔ میں بھی پھپھو سے اس کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس ڈر سے نہیں پوچھا کہ کہیں ان کی طبیعت مزید خراب نہ ہو جائے۔ وہ جو کچھ انہوں نے غصے اور جذباتی کیفیت میں کہا وہ جھوٹ تو نہیں ہو سکتا شایان، لیکن جو راز اتنے سالوں سے چھپا ہوا تھا اس کو یوں جذبات میں آ کر عیاں کرنے پر شاید وہ خود بھی نادم ہوں۔

پلیز! ابھی ایک دو روز ان سے کچھ مت پوچھنا، اور نہ ہی ثمرہ آنٹی سے بات کرنا۔ میں سمجھ سکتی ہوں اس انکشاف نے تمہارے اندر کتنی ہلچل مچا رکھی ہوگی۔ تم کتنے الجھے ہوئے اور پریشان ہو گے۔ پھر بھی کہوں گی کہ اب اس کے متعلق کچھ بھی نہ سوچنا اور سکون سے آنکھیں بند کر کے سو جانا۔ میں بھاگی سے کہتی ہوں وہ گرم دودھ تمہیں دے جاتی ہے۔ دن بھر جو ٹینشن اور بھاگ دوڑ رہی ہے اس نے تمہارے دماغ کی دہی بنا دی ہوگی۔'' وہ مدھم سا مسکرائی تھی۔

''نہیں دودھ تو اس وقت پینے کا موڈ نہیں ہے، سونے کی کوشش کروں گا۔ واقعی دماغ تھک سا گیا ہے لیکن مجھ سے زیادہ اذیت اور ٹینشن میں تو آپ رہی ہیں۔'' شایان حیران ہوا تھا کہ اتنے تکلیف دہ اور اذیت ناک لمحات سے گزرنے کے بعد بھی زمل اسے کچھ نہ سوچنے اور سکون سے سونے کی تلقین کر رہی تھی۔

''آپ بھی کچھ مت سوچیے گا اور سونے کی کوشش کیجیے گا۔ بلکہ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو سکون کی کوئی دوا لا دیتا ہوں امی کے پاس ہوتی ہیں۔ آدھی گولی پر سکون نیند کے لیے کھا لیجیے گا۔''

''ہاں میں کچھ نہیں سوچوں گی اور مجھے سکون کی گولی کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے شایان سے کہا تھا لیکن کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آ سکی تھی۔ آنکھیں بند کرتی تو آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ جاتا جب شیدے نے اسے ڈیرے میں لا کر بیڈ پر پھینکا تھا۔

''کون ہو تم اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہم کون ہیں یہ تو تم رہنے دو، البتہ کیوں لائے ہیں، اس کا تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔'' وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔

''اور چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سے تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی۔'' وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک بیڈ پر ساکت بیٹھی رہی تھی۔ اس کے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہو جائے گا۔ اور اب وہ کیا کرے۔ پھپھو کو تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ یا اللہ میری مدد فرما۔ کون تھا اللہ کے سوا مدد کرنے والا، سو وہ اسی کو پکارتی رہی یہاں تک کہ پھپھو آ گئی تھیں۔ اور اگر جو چراغ سائیں پھپھو کو نہ بتاتا تو......

اس نے جھرجھری سی لے کر کارپٹ پر گہری نیند سوئی ہوئی سنہری کو دیکھا تھا۔ جب سے وہ آئی تھی، پھپھو کے کہنے پر سنہری اس کے کمرے میں ہی کارپٹ پر بستر بچھا کر سو جاتی تھی۔

جب پہلے روز پھپھو نے سنہری کو اس کے کمرے میں سونے کے لیے کہا تھا تو وہ حیران ہوئی تھی۔

''میں کوئی چھوٹی بچی ہوں پھپھو جو مجھے ڈر لگے گا اکیلے۔''

''چھوٹی بچی نہیں ہو، لیکن اجنبی جگہ پر بے آرامی ہوتی ہے۔ پھر رات کو کچھ پرابلم ہو جائے تو سنہری ہو گی تو بے فکر رہو گی۔'' تب پھپھو کی بات پر اسے حیرانی ہوئی تھی لیکن آج سنہری کا دم اسے غنیمت لگ رہا تھا۔ ورنہ اکیلے میں اور گھبراہٹ ہوتی۔ گو سنہری تو اس کے کمرے میں آتے ہی کچھ دیر بعد سو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی تھی پھر اپنے بیگ سے الطاف فاطمہ کا ''دستک نہ دو'' نکال کر پڑھنے میں

بھی دل نہیں لگا تھا۔ رات بھر وہ بے چین ہی رہی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہی اسے نیند آئی تھی۔

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سنہری کمرے میں نہیں تھی۔ سامنے گھڑی پر نظر پڑی تو دس بجنے والے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی، فریش ہو کر باہر آئی تو لاؤنج میں اختر بانو صوفے پر بیٹھی تھیں۔

''السلام علیکم پھپھو۔ اتنی دیر ہوگئی کسی نے مجھے جگایا ہی نہیں۔''

''بھاگی جا رہی تھی تمہیں ناشتے کے لیے بلانے میں نے خود ہی منع کر دیا تھا جگانے سے۔ پتا نہیں رات کو تمہیں ٹھیک سے نیند بھی آئی تھی یا نہیں۔ میں تو خود دیر تک جاگتی رہی پھر نیند کی گولی کھانا پڑی تو تب کہیں جا کر نیند آئی۔'' اختر بانو نے اپنے پاس صوفے پر پڑا اخبار اٹھا کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

''جی پھپھو! میں بھی فجر کے بعد لیٹی تو آنکھ لگ گئی تھی۔'' وہ اختر بانو کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''میں ان لمحوں کے متعلق سوچتی ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ نے کرم کیا اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اختر بانو نے ساتھ ہی بھاگی کو آواز دے کر ناشتے کے لیے کہا۔

''نہیں پھپھو، صرف چائے لوں گی، کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

زمل کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ پراٹھا وغیرہ نہ کھاؤ لیکن ایک دو سلائس لے لو۔''

اختر بانو نے بھاگی کے آنے پر اسے چائے کے ساتھ سلائس اور بوائل انڈے لانے کو کہا تو وہ خاموش ہی رہی۔ تب ہی اسے لاؤنج کے کھلے دروازے سے ہلکے شور اور بہت سارے لوگوں کی ہولے ہولے بولنے کی آوازیں آئیں۔ کبھی ہلکی، کبھی کچھ بلند......

''باہر کون لوگ آئے ہوئے ہیں؟''

''احاطے میں چراغ سائیں کا جنازہ رکھا ہوا ہے۔ گیارہ بجے اٹھائیں گے۔ علاقے میں جس جس کو پتا چل رہا ہے، وہ آ رہے ہیں۔ رات کو کسی وقت اس کا انتقال ہو گیا۔ فجر کے وقت خیر دین کو نظام دین چاچا نے بھیجا تھا بتانے کے لیے۔'' وہ افسردگی سے تفصیل بتانے لگیں۔

''میں نے سوچا تھا جانے سے پہلے خود جا کر ان کا شکریہ ادا کروں گی۔ اگر وہ آپ کو نہ بتاتے تو......''

اور وہ جو کل سے لے کر اب تک نہ روئی تھی اب اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے تھے۔

اختر بانو نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگیں۔

''اللہ چراغ سائیں کی مغفرت کرے، زل! کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ چراغ سائیں نے اس دکھ کو کیسے برداشت کیا اکلوتی بیٹی تھی، تیرہ چودہ سال کی۔ ماں کے مرنے کے بعد چراغ سائیں نے اس کو بہت لاڈ سے پالا تھا۔ اندر سے تو وہ اسی روز مر گیا تھا زل، جب اس نے اپنی بیٹی کی کٹی پھٹی لاش دیکھی تھی۔ ایک بے روح جسم تھا جسے اٹھائے پھرتا تھا۔ اللہ نے اسے شاید اسی دن کے لیے زندہ رکھا تھا کہ اسے ہمارے لیے وسیلہ بننا تھا۔''

اختر بانو کی آنکھوں میں نمی تھی۔ زل نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں، تب ہی ثمرہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں آئی اور چند لمحوں کے لیے اختر بانو کے سامنے کھڑی رہی۔

''یہ تم بار بار بیمار ہو جاتی ہو اختر بانو...... ڈاکٹر سے کہتی کیوں نہیں ہو کہ کچھ ایسی دوا دیں کہ روز روز کی بیماری سے جان چھوٹے۔''

زل کو ان کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز اچھا نہیں لگا تھا لیکن اختر بانو نے نرمی سے کہا تھا۔

''ڈاکٹروں نے تو اپنا جو حیلہ کرنا تھا کر دیا۔ اب کسی کا بیمار ہونا ان کے اختیار میں تو نہیں ہوتا نا۔''

تب ہی بھاگی اس کے لیے چائے اور سلائس لے آئی تھی ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔

''تم آج بہت سوئیں کیا رات بھر جاگتی رہی تھیں۔'' ثمرہ اب زل سے مخاطب تھی۔

''جی...... سر میں درد تھا تو نیند نہیں آرہی تھی۔''

''ظاہر ہے دن بھر اسپتالوں میں جو خوار ہونا پڑا۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''یہ......''

لیکن اختر بانو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے منع کر دیا تو وہ کپ اٹھا کر گھونٹ گھونٹ

کر کے چائے پینے لگی۔ کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کانوں میں چراغ سائیں کی آواز آ رہی تھی۔

بابل میریاں گڈیاں......

تب ہی باہر سے بہت سے لوگوں کی آواز آئی۔ پھر ہولے ہولے یہ آوازیں مدھم ہوتی گئیں تو اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگی تھیں۔

''زمل! کچھ دیر سو جاؤ جا کر۔ بہت تھکی تھکی اور نڈھال لگ رہی ہو۔ آج زین نے بھی آنا ہے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ ایک دن میں سالوں کی بیمار لگنے لگی ہو۔'' اختر بانو صحیح ہی کہہ رہی تھیں۔ زین اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور اسے یوں نڈھال دیکھ کر پریشان ہو جائے گا اور ضرور اس کا سبب پوچھے گا تو کیا کہے گی وہ......

''ٹھیک ہے پھپھو، میں کچھ دیر سو جاتی ہوں۔ یوں بھی سر بہت بوجھل ہو رہا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پھر دو تین گھنٹے کی نیند لے کر وہ خود کو بہت بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ اور جب باتھ لے کر ہلکی پھلکی تیار ہو کر اختر بانو کے کمرے میں آئی تو اختر بانو جو بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے جانے کیا سوچ رہی تھیں، سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''ماشاءاللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو زمل۔ ایسے ہی رہا کرو ہمیشہ......'' اور وہ جھینپ گئی تھی۔ اس نے تو بس لپ گلوز اور ہلکا سا بلشر لگایا تھا تاکہ وہ فریش لگے۔

''تم تو خوش ہو زمل اور میں تمہارے جانے سے بہت اداس ہو جاؤں گی اور اس اداسی کو یہ احساس اور بھی بڑھا رہا ہے کہ جانے سے پہلے تمہارے ساتھ......''

''پلیز پھپھو......'' زمل ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ ''انکل نے کہا تھا نا کہ اس موضوع کو یہاں ہی ختم کر دیں تو آپ بھی بھول جائیں جو ہوا۔''

اختر بانو نے سر ہلایا، پھر بہت دیر تک وہ اور اختر بانو باتیں کرتی رہیں۔ اختر بانو اسے مریم کی، صبوحی کی، شاہ زیب کی اور ظفریاب کی باتیں بتاتی رہیں۔ اس نے بہت دلچسپی سے سب سنا۔ ابا اور اماں کے متعلق جاننا اور سننا اسے اچھا لگتا تھا۔

جب بی بی اماں اور دادا جان بات کرتے تھے ان کے متعلق تو تب بھی وہ یوں ہی شوق سے سنا کرتی تھی۔ اس روز لنچ پر صرف گھر کی خواتین تھیں۔ شایان زین کو لینے حیدر آباد چلا گیا تھا جب کہ ثوبان شاہ اور زمان شاہ باہر مردانے میں ہی تھے۔ چراغ سائیں کے جنازے میں شامل ہونے والے علاقے کے لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کروایا گیا تھا۔ وہ لوگ عصر کے بعد ہی اندر حویلی میں آئے تھے۔

☆......☆......☆

آج حویلی میں بہت ہی خاموشی تھی۔ نہ بھاگی اور ماسی تاج کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں نہ ہی سنہری کی گنگناہٹیں...... جب سے نعمان کی شادی کی تیاری شروع ہوئی تھی، وہ چلتے پھرتے گنگناتی رہتی تھی۔ سب ہی چراغ سائیں کی وجہ سے اداس تھے۔ اور خود اس کے لیے ایک ایک پل جیسے سالوں کا ہوگیا تھا۔ سردیوں میں دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ بی بی اماں کہا کرتی تھیں کہ یہ سردیوں کے دن تو یوں پلک جھپکنے میں گزر جاتے ہیں، ادھر آنکھ کھلی اور ادھر شام ڈھلنے لگی لیکن اسے تو لگ رہا تھا جیسے آج کا دن بہت ہی لمبا ہوگیا ہو۔ شاید انتظار کے لمحے یوں ہی طویل ہو جایا کرتے ہیں۔ خدا خدا کر کے انتظار ختم ہوا، سب لاؤنج میں بیٹھے زین اور شایان کا انتظار کر رہے تھے کہ ڈنر ان کے آنے پر ہی کرنے کا پروگرام تھا۔ لیکن شایان کے ساتھ مرتضیٰ کو آتے دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''زین نہیں آیا کیا؟'' اس کی اس بے ساختگی پر جہاں شایان اور اختر بانو کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی وہاں مرتضیٰ کی پیشانی پر شکن سی پڑی تھی۔

''زین نے منع کر دیا تو دادا جان نے مجھ سے کہا کہ تم چلے جاؤ۔'' وہ اس کی بات کا جواب دے کر سب سے ملنے لگا تھا لیکن زل کو جیسے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''وہ ٹھیک تو تھا نا؟''

''پاؤں پر معمولی سی چوٹ لگ گئی تھی اسی کا بہانہ بنا کر اس نے آنے سے انکار کر دیا۔'' مرتضیٰ جلے کٹے لہجے میں کہتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔

''کیسے چوٹ لگی، زیادہ چوٹ تو نہیں ہے؟'' وہ بے قرار ہوئی تھی۔ اسے مرتضیٰ کی بات پر یقین نہیں

آیا تھا کہ چوٹ معمولی ہوگی۔ چوٹ زیادہ ہی ہوگی، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ زین دادا جان کو انکار کر دیتا۔

''بائیک سے گر گیا تھا۔ لیکن معمولی سی چوٹ تھی۔'' سرسری انداز میں کہتے ہوئے وہ ثوبان شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اور اس کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے اختر بانو نے اسے تسلی دی۔

''تم پریشان نہ ہو زمل! مرتضیٰ صحیح کہہ رہا ہے۔ چوٹ معمولی ہوگی۔ احتیاطاً ابا جان نے منع کر دیا ہوگا سفر سے۔''

''جی...... ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے خود کو یقین دلایا تھا لیکن اس مایوسی کا کیا کرتی جو زین کے نہ آنے پر اسے ہوئی تھی۔ اس نے کھانا بھی بے دلی سے کھایا تھا۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔ لیکن وہ سب کے ساتھ ہی ٹیبل سے اٹھی تھی۔

''صبح فجر کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔ آپ تیار ہو جایئے گا۔'' ٹیبل سے اٹھتے اٹھتے شایان نے اس سے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ ثمرہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''تم انہیں حیدر آباد چھوڑنے بھی جاؤ گے۔ ڈرائیور چلا جائے گا۔ لینے تو خیر تم چلے گئے تھے کہ ڈرائیور مرتضیٰ کو نہیں پہچانتا۔''

''جی امی! میں نے مرتضیٰ بھائی سے کہا ہے کہ میں واپسی پر بھی انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے آؤں گا۔'' ثمرہ کو جواب دے کر وہ ثوبان شاہ سے کوئی بات کرنے لگا تھا، وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ آج رات پھر نیند نہیں آنے والی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی رہی پھر سنہری کو دیکھنے کے لیے اٹھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ آجاتی تو وہ بھی سونے کی کوشش کرتی۔ سنہری کچن میں بھاگی کے ساتھ مصروف تھی۔

''وہ ماسی تاج کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کے سر میں درد تھا۔ چراغ چاچا کے مرنے کا سن کر بہت روئی تھیں نا تو بھاگی نے کہا میں کچن سمیٹنے میں ان کی مدد کر دوں بس ابھی دس منٹ میں آتی ہوں۔''

''زمل!''

شایان نے جو مرتضیٰ کو گیسٹ روم میں چھوڑ کر آ رہا تھا، اسے کچن سے نکل کر لاؤنج کی طرف

جاتے دیکھ کر بے اختیار آواز دی۔

زمل رک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''آپ مرتضٰی کے ساتھ نہیں جانا چاہتیں تو میں بڑی امی سے کہتا ہوں کہ وہ مرتضٰی بھائی اور نانا جان سے کہہ دیں کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آپ کو چند روز بعد بھیجیں گی۔ بعد میں آپ کو میں چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں......'' وہ شایان کی اس گہری نظر اور مشاہدے پر حیران ہوئی تھی۔

''شیور......؟'' شایان نے بغور اسے دیکھا۔

''شیور۔'' وہ مدھم سا مسکرائی تھی۔

''دراصل جب میں جا رہا تھا تو آپ کے چہرے پر جو چمک تھی اور آنکھوں میں جو جگمگاہٹ تھی مرتضٰی بھائی کو دیکھ کر یکدم وہ چمک مفقود ہو گئی تھی تو......''

''ہاں! مایوسی تو ہوئی ہے۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔

''جب آپ کسی اور کے منتظر ہوں اور کوئی دوسرا آ جائے تو مایوسی ہونا فطری ہے۔ اور وہ ''کسی اور'' بہت خاص ہو۔'' شایان ہولے سے ہنسا تھا۔

''سب کچھ بھلا کر شادی پر ضرور آیئے گا۔''

شایان نے کہا تو اس نے کہا تھا ''ان شاء اللہ! ضرور آؤں گی'' لیکن پھر وہ شادی پر نہیں جا سکی تھی۔ شاہ زیب کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔ بہت تیز بخار تھا۔ اور پورے جسم میں بے تحاشا درد۔ بی بی اماں اور شینخو بابا تو ویسے بھی نہیں جا رہے تھے۔ وہ بھی رک گئی تھی۔ شانزہ بھی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن سحرش اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی کہ دل بہل جائے گا۔

☆......☆......☆

''ارے زمل! تم کب آئی ہو اسکول سے؟''

مہرین کی آواز پر زمل نے چونک کر سامنے دیکھا۔ مہرین سیڑھیوں سے اتر رہی تھی اور اس کے

پیچھے سحرش بھی تھی۔
''ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوں۔''
''دادا جان کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' مہرین سیڑھیاں اتر کراب برآمدے میں آ گئی تھی۔
''میں جب آئی تو دادا جان سو رہے تھے۔'' زمل نے اس کی طرف دیکھا۔
''اچھا میں دیکھتی ہوں اگر جاگ رہے ہوں گے۔''
''سب ٹھیک ہے نا زمل؟''
''ہاں!'' اس نے سر ہلایا۔
لیکن پتا نہیں سب ٹھیک بھی تھا یا نہیں۔ اسے پھر مرتضٰی کی بات یاد آئی تھی۔ مرتضٰی نے کہا تھا۔
''مجھے لگتا ہے زمل کہ زین کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے۔ کسی اور لڑکی میں، اسی لیے وہ شادی میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ ورنہ دادا جان نے ظفر چچا سے سب طے کر لیا تھا اور انہوں نے یہاں آنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا لیکن پھر جب زین نے دادا جان سے کہا کہ وہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہیا تو ظفر چچا نے بھی اپنا پروگرام کینسل کر دیا ہے۔''
وہ جو کھڑکی کے فریم پر کہنی ٹکائے ٹرین کے ساتھ بھاگتے دوڑتے درختوں کو دیکھ رہی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی اب تک کے سفر میں مرتضٰی کی یہ پہلی بات تھی جو اس نے کچھ دھیان سے سنی تھی اور پھر بے دھیانی سے پوچھا تھا۔
''اچھا...... کس لڑکی میں؟''
''پتا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ تم سے اپنا رشتہ ختم کرنا چاہتا ہے۔''
''اچھا، لیکن میں تو اس سے اپنا رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتی۔ وہ بھلے جس میں بھی انٹرسٹڈ ہو۔'' بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی اور مرتضٰی اس کے ردعمل پر اسے حیران سا دیکھتا رہ گیا تھا۔
''آج اتنی دیر کیوں ہوئی؟'' سحرش ابھی تک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"پرنسپل صاحبہ کے ساتھ میٹنگ تھی اس لیے۔"

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں جاب کی ایسی کیا مجبوری تھی اور وہ بھی ایک پرائیوٹ اسکول میں۔ میری ایک فرینڈ کی بڑی بہن نے کچھ عرصہ تک پڑھایا تھا ایک پرائیوٹ اسکول میں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ پرائیوٹ اسکول والے بندے کی کھال اتار لیتے ہیں۔ کام گدھوں کی طرح لیتے ہیں اور سیلری معمولی سی۔"

سیلری تو واقعی معمولی سی تھی اور اسے جاب کی ضرورت بھی نہ تھی۔ شاہ زیب کے حصے کا جو مارکیٹ کا کرایہ آتا تھا، دادا جان اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتے تھے۔ گھر کا سارا خرچ تو دادا جان چلاتے تھے۔ زین کے حصے کی رقم بھی اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو رہی تھی لیکن شاید وہ کچھ ایسی مصروفیت چاہتی تھی کہ جس میں کھو کر وہ زین کے اس رویے کی تلخی بھول جائے اسی لیے جب ثوبیہ نے اس سے کہا کہ اس کی ایک دوست، جو ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتی ہے وہ اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے ایک دو ماہ کی چھٹی لینا چاہتی ہے لیکن اسکول کی انتظامیہ نے کہا ہے کہ وہ اپنا متبادل دے تو تب ہی اسے چھٹی مل سکتی ہے کیونکہ بچوں کے ایگزام ہونے والے ہیں۔ اگر تم ایک دو ماہ پڑھا دو تو......

اور وہ فوراً ہی تیار ہو گئی تھی پھر دادا جان نے بھی اجازت دے دی تھی۔ یوں اسکول میں بچوں کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا تھا۔

"تمہیں اگر جاب ہی کرنی ہے زمل تو پبلک سروس کمیشن کا امتحان دو اور کسی گورنمنٹ کے اسکول یا کالج میں جاب کرو۔" سحرش نے اسے خاموش دیکھ کر مشورہ دیا۔ "میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اگر مجھے جاب کرنی ہوئی تو بس گورنمنٹ کی ہی جاب کروں گی۔"

"لیکن تمہیں تو جاب کرنا کبھی بھی پسند نہیں رہا۔"

زمل جانتی تھی کہ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ اسے جاب کرنا قطعی پسند نہیں ہے اگر کوئی انتہائی مجبوری نہ ہو تو لڑکیوں کو جاب نہیں کرنی چاہیے گھر میں رہ کر عیش کریں۔ نہ کہ اپنے کندھوں پر دوہری ذمہ داری اٹھا کر وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو جائیں۔ بے چاری آج کی عورت مجھے بڑی مظلوم لگتی ہے۔ دفتر میں سر کھپا کر آتی ہے تو پھر گھر میں جت جاتی ہے۔

"وہ تو خیر اب بھی پسند نہیں ہے لیکن مجبوری میں اگر کرنی پڑی تو پھر گورنمنٹ جاب ہی کروں گی۔ اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے جاب کرنا ہی پڑے گی۔ بی بی اماں کہتی ہیں نا کہ بڑے بول نہیں بولنے چاہئیں اپنے سامنے آجاتے ہیں کبھی۔"

"ایسا کیا ہوگیا ہے سحرش؟ کیا مجبوری آپڑی ہے تمہیں؟" زمل سحرش کی بات سن کر حیران ہوئی تھی اپنی جاب کی وجہ سے کچھ اپنی پریشانی کی وجہ سے شاید اسے گھر کے بہت سے معاملات کا علم نہیں ہوتا تھا۔

"ابھی تو کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے لیکن یہ جو میری اماں کے ارادے ہیں نا، مجھے کسی امیر کبیر خاندان میں بیاہنے کے، یہ ضرور مجھے مجبور کردیں گے جاب کرنے پر۔ آج کل ایک بالکل عقیل بھائی کے خاندان کی کاپی خاندان سے رشتہ آیا ہوا ہے میرے لیے۔ ویسے ہی نو دولتیے۔ موصوف بی اے پاس ہیں۔ اور اماں صاحبہ پورے دل و جان سے ان پر فدا ہوئی جاتی ہیں۔ ہائے سحری، کیا بتاؤں کتنا بڑا گھر ہے ان کا اور اتنا بڑا کچن، اتنے شان دار واش روم......"

اس نے میمونہ تائی کے لہجے کی نقل اتاری۔

"تو میری جان زمل، عقیل بھائی کے جیسے بندے سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری عمر شادی نہ کروں اور جاب کر کے اپنی زندگی گزار دوں کیونکہ اماں اس سے کم پر راضی نہیں ہوں گی اور میں نے تو ان سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے کسی ایسے نو دولتیے سے شادی نہیں کرنی۔ اماں کے دماغ میں تو بس یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ میری بیٹی رخصت ہو کر کسی محل میں جائے، رخسانہ کی بیٹیوں کی طرح، نہ کہ ماہ وش کی طرح ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جائے۔

دراصل یہ جو میری اماں ہیں نا ان کے اندر تھوڑی سی جیلسی ہے کہ شانزہ اور مہرین کا رشتہ اتنے امیر لوگوں میں ہوا تو کم از کم میرا تو وہ کسی ایسے ہی گھر میں کریں۔ محل جیسا گھر۔ آگے پیچھے نوکروں کی فوج۔ بھیجا تو تھا محل جیسے گھر میں شانزہ کو۔ آگئی نا واپس اس محل سے...... تمہیں کیا بتاؤں زمل، جب وہ آئی تھی تو کیا حالت تھی اس کی۔ نیلو نیل ہو رہی تھی۔ تم تو یہاں نہیں تھیں اور وہ اوپر اپنے گھر جانے کے

بجائے تمہارے پاس آئی تھی۔ میں اور مہرین یہاں صحن میں کھڑے تھے۔ اس نے مہرین سے کہا مجھے زمل کے پاس لے چلو کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ جب بھی تمہیں لگے کہ تمہیں کسی کی ضرورت ہے تو میرے پاس آجانا۔''

''ہاں میں نے کہا تھا کہ مجھے لگتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے وہ تکلیف میں ہے۔'' اس سے زمل نے شانزے کا دکھ اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس کیا لیکن سحرش نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ جب بولنے پر آتی تو بولتی ہی چلی جاتی تھی۔

''وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔ تمہارے بیڈ پر بیٹھتے ہی وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی پتا نہیں یہاں تک وہ کیسے پہنچی تھی۔ مہرین اسے آوازیں دے رہی تھی لیکن وہ تو آنکھیں ہی نہیں کھول رہی تھی میں دوڑ کر بی بی اماں کو بلا لائی اور پھر سب ہی غصے میں تھے۔ بلال تو کہتا تھا میں اسے گولی ماردوں گا۔ دادا جان نے سمجھایا کہ شانزہ ابھی حواس میں نہیں ہے۔ اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے اس سے ساری حقیقت معلوم کر کے آرام سے جا کر بات کریں گے۔

اس روز میں اور مہرین تمہارے کمرے میں ہی سوئے تھے۔ مہرین نے اسے نیند کا انجکشن لگا دیا تھا اور درد کا بھی پھر بھی وہ ساری رات بے چین ہی رہی تھی۔ رخسانہ تائی اور تایا جان آدھی رات تک یہاں ہی بیٹھے رہے تھے۔ مہرین نے مشکل سے انہیں سونے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ بڑی اذیت ناک رات تھی، مہرین شانزہ کی حالت دیکھ کر بار بار رونے لگتی تھی۔''

مہرین یہ ساری باتیں زمل کو بتا چکی تھی اور بی بی اماں نے بھی بتایا تھا لیکن وہ پھر بھی خاموشی سے سحرش کو سن رہی تھی۔

''پتا ہے زمل! اس روز عقیل بھائی کے والدین اور بھائی بھابی فیصل آباد کسی عزیز کے ہاں شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور عقیل بھائی نہ صرف یہ کہ اپنی دوسری بیوی کو گھر لے کر آگئے تھے بلکہ انہوں نے شانزہ کو اپنے بیڈ روم سے بھی نکال دیا تھا کہ دو تین روز تک وہ گیسٹ روم میں جا کر رہے۔ شانزہ نے کہا تھا کہ وہ اپنے بیڈ روم سے نہیں جائے گی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ گیسٹ روم میں چلا

جائے۔لیکن عقیل بھائی نے شانزہ کو مارنا شروع کر دیا۔لاتیں، مکے، ٹھڈے اور پھر بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گیٹ تک لے آئے کہ نکل جاؤ میرے گھر سے اسی وقت۔شانے نے بتایا تھا وہ نشے میں تھا۔گارڈ نے شانزہ کو رکشہ لا کر دیا تھا۔رکشے کا کرایہ بھی اس نے اپنے پاس سے رکشے والے کو دیا تھا۔"

سحرش کی آواز بھرا گئی تھی اور وہ خاموش ہو گئی تھی۔بی بی اماں نے اسے بتایا تھا کہ عقیل کے والدین نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی تھی کہ انہیں عقیل کی دوسری شادی کا علم نہیں اور وہ میاں بیوی کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔کچھ غلطی آپ کی لڑکی کی بھی ہوگی، ورنہ ہمارا بیٹا اتنا جاہل نہیں ہے کہ بیوی پر ہاتھ اٹھائے۔اس وقت تو وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے جب آئے گا تو بات کریں گے۔

اور اورنگ زیب بیگ نے کہا تھا کہ آپ کا بیٹا جاہل نہیں ایک وحشی جانور ہے۔ہمیں اپنی بیٹی کو اب یہاں نہیں بھیجنا آپ اپنے بیٹے سے کہیں ہماری بیٹی کو طلاق دے دے۔اور عقیل نے طلاق دینے سے انکار کر دیا ہے۔

"آج تایا جان نے وکیل کی طرف جانا تھا۔وہ کہہ رہے تھے کہ اگر عقیل طلاق نہیں دے رہا تو وہ خلع لے لیں گے لیکن شانزہ نے منع کر دیا۔" سحرش نے کچھ دیر بعد کہا تو وہ چونکی۔

"کیوں شانزہ نے کیوں منع کیا؟"

"وہ کہتی ہے کہ اسے عدالتوں میں ذلیل نہیں ہونا۔اور یہ کہ وہ طلاق دے یا نہ دے اسے فرق نہیں پڑتا۔اسے کون سا شادی کرنا ہے۔

تم سمجھاؤ نا اسے زمل، وہ تمہاری بات سنے گی شاید۔زندگی ایسے نہیں گزرتی۔وہ اتنی پیاری ہے۔خلع لے لے گی تو رخسانہ تائی کہتی ہیں کہ وہ اس کی شادی کر دیں گی۔"

"بات کروں گی اس سے۔لیکن ابھی اسے کچھ سنبھلنے تو دو سحرش......"

تب ہی بی بی اماں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئیں۔

"تم ابھی تک یہاں ہی بیٹھی ہو زمل...... تم لوگ عصر کی نماز پڑھ لو تو میں اتنے میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" بی بی اماں کچن کی طرف بڑھیں تو مہرین دادا جان کے کمرے سے نکلی۔

"دادا جان کا بی پی اب نارمل ہے۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" بی بی اماں کے لبوں سے نکلا۔

"ذرا سا کسی کو کچھ ہو تو میری تو جان پر بن آتی ہے۔"

"میں دادا جان کو سلام کر آؤں تم ادھر بیٹھو یا میرے کمرے میں چلی جاؤ۔ چائے پی کر اوپر چلتے ہیں شانزہ کی طرف۔"

"ٹھیک ہے۔"

مہرین سحرش کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں عصر کی نماز پڑھ کر ہی نیچے آئی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے سحری......؟" مہرین کو وہ بے حد اداس لگی تھی۔

"کچھ نہیں۔ ہم شانزے کے متعلق باتیں کر رہے تھے تو مہرو، تمہارا کیا خیال ہے، اگر عقیل بھائی خود سے طلاق نہیں دیتے تو شانزہ کو خلع لے لینا چاہیے۔ یہ تو طے ہے نا کہ شانزہ کو اب ان کے ساتھ نہیں رہنا۔"

"ہاں، وہ اب واپس نہیں جائے گی سحرش، لیکن تم نہیں جانتیں، جب عورت خلع کے لیے کیس دائر کرتی ہے تو مرد اس کے کردار کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے اور جانے کیا کیا الزامات لگاتا ہے اور شانے کو اسی بات سے ڈر لگتا ہے وہ کہتی ہے ایک بار اس نے وہاں عدالت میں میرے کردار پر انگلی اٹھائی تو میں تو وہاں ہی مر جاؤں گی۔ دعا کیا کرو سحری، کہ عقیل خود ہی طلاق بھجوا دے۔ ورنہ وہ گھٹیا آدمی جو ویسے بھی شانزے کو عمر بھائی کا نام لے کر ٹیز کرتا تھا وہاں اگر اس نے عمر بھائی کا نام لے دیا تو...... عمر بھائی بے چارے کا کیا قصور...... وہ خوامخواہ بدنام ہو جائیں گے۔ ان کی اماں ان کا رشتہ ہی تو لائی تھیں نا شانزے کے لیے اور لڑکیوں کے تو کئی رشتے آتے ہیں اور......"

"عمر بھائی نے ابھی تک شادی نہیں کی مہرو۔ اگر خلع یا طلاق ہو جائے تو اماں رقیہ خالہ سے بات کر سکتی ہیں۔ عمر بھائی بہت اچھے ہیں ہمارے شانے ان کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔"

سحرش کو اندازہ تھا کہ عمر اور شانزہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

”پتا نہیں یار، اب رقیہ خالہ عمر بھائی کے لیے کیا سوچ رہی ہیں۔ جب انہوں نے شانزہ کا رشتہ مانگا تھا تب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، شاید وہ اپنے بیٹے کا رشتہ ایک طلاق یافتہ لڑکی سے نہ کریں اور میرا خیال ہے شانزہ بھی نہیں مانے گی۔“

مہرین نے اپنا خیال ظاہر کیا تو سحرش نے اب کے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اور زمل کے فارغ ہو کر آنے تک وہ وہاں ہی بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ بی بی اماں نے چائے وہاں ہی لگا دی تھی۔ اور زمل کے خیال سے کہ اس نے دن میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا، چائے کے ساتھ کباب، سموسیاں اور نمکو وغیرہ بھی لے آئی تھیں۔ چائے پی کر وہ تینوں اوپر شانزہ کے پاس آ گئیں۔

☆......☆......☆

شانزہ اپنے اور مہرین کے مشترکہ کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر جمیلہ ہاشمی کی ”دشت سوس“ کھلی پڑی تھی۔ یہ کتاب وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ بس یوں ہی وقت گزاری کے لیے اٹھالی تھی اور اب نہ جانے کب سے ایک ہی صفحہ بار بار پڑھ رہی تھی لیکن ذہن میں جیسے کچھ بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ پورا صفحہ پڑھنے کے بعد وہ پھر پہلی لائن سے شروع کر دیتی تھی۔

اس نے پھر پڑھنا شروع کیا۔ جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ پھر پہلے لفظ پر پلٹ آئی تو جھنجھلا کر اس نے کتاب بند کر دی۔ تب ہی زمل اور سحرش نے نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔

”کیا ہو رہا ہے شانزے؟“ سحرش نے پوچھا۔

اس نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے گود میں رکھی کتاب اٹھا کر اسے دکھائی۔

”آ جاؤ۔“

”تم اور زمل باتیں کرو، میں ابھی آتی ہوں۔ اماں جان کے حضور حاضری دے آؤں ورنہ وہ سمجھیں گی ابھی تک نیچے ہی بیٹھی ہوں۔“ سحرش وہاں سے ہی واپس مڑ گئی۔

”کیسی ہو شانے؟“ زمل اس کے پاس ہی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

”اتنے سارے دن ہو گئے تمہارے پاس آ کر بیٹھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ بچوں کے پیپرز ہو رہے

تھے تو گھر آ کر بھی دیر تک چیک کرتی رہتی تھی۔"

"ابھی تجربہ نہیں ہے نا تمہیں، ورنہ میں نے اپنی ایک دوست کی بہن کو دیکھا تھا اتنی جلدی جلدی پیپرز چیک کر رہی تھیں کہ مجھے لگتا تھا جیسے پڑھے بغیر ہی چیک کیے جا رہی ہوں۔" شانزہ مدھم سا مسکرائی لیکن اس کی آنکھیں بجھی بجھی اور بے رنگ سی تھیں۔

"شانے......!" زمل نے بے اختیار اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "بہت ساری باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں ہیں۔ ان کا درد اور کرب اپنی جگہ پر، کچھ خسارے اور کچھ نقصان ایسے ہوتے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہوتے۔ جانتی ہوں تم نے بہت تکلیف، بہت اذیت اٹھائی ہے۔ یہ زخم بھرنے میں بہت وقت لگے گا۔ زخم بھر بھی گئے تو جب جب وہ اذیت یاد آئے گی تو ان زخموں سے ٹیس اٹھے گی، لیکن زندگی پھر دوبارہ نہیں ملے گی۔ تم اس زندگی کو جینے کی کوشش کرو۔ خود کو کمرے میں کیوں بند کر لیا ہے۔ سب کے ساتھ مل کر بیٹھا کرو۔ جو تمہارے ساتھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو زمل، لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میں ایک ناکام عورت ہوں، میں بس نہیں سکی۔ میں نے اپنے والدین کو دکھ دیا۔ لیکن یقین کرو ملی، میں نے بہت کوشش کی کہ میرا گھر نہ ٹوٹے۔ عقیل نے تو پہلے ہی روز مجھے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے کہا تھا۔

"مجھے تم جیسی خود پسند اور مغرور لڑکیاں پسند نہیں ہیں جنہیں اپنی سولہ جماعتوں پر بہت ناز ہوتا ہے۔"

میں حیران سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ میں نہ تو خود پسند تھی اور نہ مغرور پھر وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا شاید اس لیے کہ میں نے فون پر اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ایک دو بار اس نے مہرین سے کہا تھا کہ وہ مجھے ڈنر پر ساتھ لے کر جانا چاہتا ہے لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ تم ہی بتاؤ زمل، میرا اس سے کوئی محرم رشتہ تو تھا نہیں جو میں اس کے ساتھ ڈنر پر جاتی۔ ابا جان اور دادا جان کو بھی پسند نہ آتا۔"

وہ زمل کو آج پہلی بار یہ سب بتا رہی تھی۔ زمل نے اس کا ہاتھ ذرا سا دبا کر اسے خاموش تسلی دی تھی۔ اس کا ہاتھ ابھی تک زمل کے ہاتھ میں تھا۔

"سب نے ہی مجھے سراہا تھا یہاں بھی اور وہاں بھی لیکن وہ بے حد سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں تو میری ماں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے تمہیں میرے لیے پسند کیا۔ ورنہ میرے لیے تو بڑے صنعت کاروں اور جاگیرداروں کے گھر سے رشتے آ رہے تھے۔ ایم این اے اور ایم پی اے بھی مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے خواہش مند تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ماں میرے لیے موچی دروازے، بانس بازار اور ذکی دروازے جیسے علاقوں میں لڑکیاں دیکھ رہی تھی۔ اسے شوق تھا اندرون شہر سے میرے لیے دلہن لانے کا، بقول ان کے اندرون شہر کی لڑکیاں گھر بسا کر رہتی ہیں، تو تم جو یہاں ہو تو صرف میری ماں کی وجہ سے ہو۔

تمہارے لیے تو وہ لڑکا، کیا نام بتایا تھا تمہاری خالہ نے، عمر...... ہاں عمر اعجاز...... وہ ہی مناسب تھا۔ اب میری قسمت کہ میرا رشتہ جب تمہارے لیے آیا تو عمر کا رشتہ بھی زیر غور تھا تو ظاہر ہے میرے مقابلے میں پھر وہ بے چارہ بھی مار کھا گیا۔ سنا ہے تمہارے گھر کافی آنا جانا تھا اس کا۔ تمہاری دوستی ہو گی۔ سچ بتاؤ...... کتنا اور کیسا تعلق تھا اس کے ساتھ۔ لڑکوں کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تو لڑکوں سے بہت دوستی ہوتی ہے۔ تمہاری کن کن کے ساتھ دوستی تھی اس عمر اعجاز کے علاوہ۔“ اس کی ویران اور خشک آنکھوں میں نمی سی چمکی تو زمل نے ہاتھ چھوڑ کر اسے ساتھ لگا لیا۔

”تم دیکھنا شانے! وہ بہت پچھتائے گا۔ اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا تو اس کے ساتھ بھی برا ہو گا...... بہت برا۔“

”وہ ڈرنک کرتا تھا، نشے میں مارتا تھا مجھے۔ جو چیز ہاتھ میں آتی اٹھا کر مار دیتا تھا۔ وہ مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اقرار کر لوں کہ میرا عمر کے ساتھ کوئی چکر تھا۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

”کئی بار میں نے سوچا کہ واپس گھر لوٹ آؤں، کبھی مڑ کر نہ جاؤں لیکن پہلے ابا جان اور اماں جان کا خیال روک دیتا کہ وہ دکھی ہوں گے اور پھر اس روح نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں جس نے میرے اندر سانس لینا شروع کیا تھا۔ لیکن پھر ایک روز اس نے مجھے اس بری طرح مارا کہ وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی چلا گیا پھر بھی میں اپنا گھر بسانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس روز بھی میں تمہارے پاس آئی تھی کہ چند دن تمہارے پاس رہ کر چلی جاؤں گی لیکن......“

آنسو اس کی پلکوں کے کنارے پر آ کر ٹھہر گئے تھے، اس نے انگلی کی پور سے انہیں پونچھا۔

"تم زندگی کو پھر سے شروع کرو شانے...... اس ظالم انسان کے ساتھ جو وقت گزرا، سمجھو وہ تمہاری زندگی کی کتاب کا ایک سیاہ باب تھا، جو بند ہو گیا۔ تایا جان سے اجازت لے کر جاب کر لو، یا پھر ایم فل کر لو۔ تمہیں تو بہت شوق تھا ایم فل اور پی ایچ ڈی کر کے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانے کا۔ ایسا کرتے ہیں کل دونوں چلتے ہیں یونی ورسٹی اور معلومات لے کر آتے ہیں ساری...... بلکہ میں بھی ایم فل کر لیتی ہوں۔ پھر کسی کالج میں جاب مل جائے گی۔"

"لیکن وہ تمہاری شادی......"

"فی الحال نہیں ہو رہی......" زمل نے اس کی بات کاٹی۔

"تو پھر ڈن کل چلتے ہیں۔ اسکول سے کل چھٹی ہے مجھے۔"

"یہ اکیلے اکیلے کہاں جانے کا پروگرام بن رہا ہے؟" سحرش نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ مہرین بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔

اور پھر ان کا جواب سنے بغیر خود ہی پروگرام بنانے لگی۔

"کل ہم انارکلی جائیں گے بانو بازار سے فروٹ چاٹ کھائیں گے، بہت ساری املی کے ساتھ پھر ملک شیک پئیں گے اور تم شانزہ اور نگ زیب ہمیشہ کی طرح اردو بازار سے اپنی پسند کی کوئی کتاب لینا اور پھر تھوڑی سی ونڈو شاپنگ کریں گے اور......"

"بس اتنا کافی ہے۔" زمل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تو پھر طے ہے نا؟"

سحرش نے شانزہ کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں، میرا دل نہیں چاہتا کہیں جانے کا۔"

"تو دل کو سمجھاؤ نا۔" سحرش نے شانزہ کے لیے ہی تو یہ پروگرام بنایا تھا۔ اندر آنے سے پہلے وہ مہرین سے کہہ رہی تھی شانزہ کو اس کیفیت سے باہر نکالنے کے لیے کہیں چلتے ہیں باہر۔"

''چلتے ہیں شانے، میں نے بھی کافی دنوں سے کوئی کتاب نہیں لی۔'' زمل نے بھی اصرار کیا اور یوں اگلے دن انار کلی جانے کا پروگرام طے پا گیا۔ اور پھر مغرب کی نماز پڑھ کر ہی زمل نیچے آئی تھی۔ نماز پڑھ کر کچھ دیر وہ مونا اور رخسانہ تائی کے پاس بیٹھی تھی اور جب مغربی سیڑھیوں کا موڑ مڑتے ہوئے اس کی نظر صحن کی طرف اٹھی تو چند لمحوں کے لیے ٹھٹک کر رک گئی۔ آج وہ مونا تائی کے کمرے سے نکل کر صبوحی چچی کے کچن کے ساتھ والی سیڑھیوں سے آ رہی تھی۔ صحن میں جہاں زیب بیگ اپنے سامنے بیٹھے طیب اور ضیاء سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جب سے وہ پھپھو کے گھر سے واپس آئی تھی آج پہلی بار وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ بی بی اماں کو آزین نے بتایا تھا کہ ضیاء کے والدین اپنی بیٹی کے پاس شارجہ گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک دوبار ضیاء کے گھر میں ہی سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ شاید ضیاء کے امی ابو واپس آ گئے ہیں یا پھر ضیاء اور طیب دادا جان سے ملنے آئے ہیں۔ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگی۔ سب سے پہلے جہاں زیب بیگ کی ہی اس پر نظر پڑی تھی۔

''آؤ...... آ جاؤ بچے بڑی دیر لگا دی۔ سب ٹھیک تھے اوپر۔''

''جی دادا جان، بس یوں ہی شانزے کے پاس بیٹھ گئی تھی۔''

دادا جان کو بتا کر اس نے طیب اور ضیاء کو سلام کیا اور برآمدے کی طرف بڑھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر جوں ہی اس نے برآمدے میں قدم رکھا، آزین، شاہ زیب بیگ کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ شاہ زیب بیگ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں کی نظریں بے اختیار ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔ آزین نے فوراً ہی نظریں جھکائی تھیں لیکن وہ چند لمحے یوں ہی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کیا تھا ان نظروں میں، بے گانگی، اجنبیت اور شکایت...... دل میں اٹھتی ٹیس کو دباتے ہوئے وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔

''السلام علیکم!''

''کیسی ہے میری بیٹی؟'' شاہ زیب رک گئے تھے۔

''ٹھیک ہوں ابا......'' دل کھل سا اٹھا تھا۔ اس وقت وہ بالکل نارمل لگ رہے تھے۔ ان دنوں ان کی صحت بھی کافی اچھی ہو گئی تھی۔

شیخو بابا انہیں باتوں میں لگا کر کافی کچھ کھلا دیتے تھے۔ ورنہ جب سے وہ ان کے لیے کھانا لے کر جاتی تھی، تھوڑا سا کھا کر چھوڑ دیتے تھے۔ ڈاکٹر ارسلان کہتے تھے وہ بہت تیزی کے ساتھ ذہنی صحت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک روز بالکل نارمل ہو جائیں گے۔

"میں تمہیں آج سارا دن ڈھونڈتا رہا کہاں چلی جاتی ہو تم؟"

"میں نے جاب کر لی ہے ابا۔ اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہوں۔" اس نے شاہ زیب کا ہاتھ تھام لیا۔ آزین صحن کی طرف بڑھ گیا۔

"بچوں کے ساتھ سر کھپا کر تھک جاتی ہو گی۔ اور پھر گھر کا کام بھی تو ہوتا ہے نا۔" شاہ زیب شفقت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں، میں بالکل بھی نہیں تھکتی۔ بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزر جاتا ہے۔"

ابا جب بھی اس سے بات کرتے، اسے اچھا لگتا تھا۔ آج کل کبھی کبھار وہ اس سے باتیں کرنے لگے تھے، ورنہ پہلے تو اس کی باتوں کے جواب میں زیادہ تر خاموش ہی رہتے تھے یا پھر ہوں ہاں کر دیتے تھے اور یہ اچھی پروگریس تھی۔

"تمہاری اماں بھی بالکل نہیں تھکتی تھی۔ سارا دن کچھ نہ کچھ لگی رہتی تھی۔ بڑی بڑی دعوتوں پر بھی نہ گھبراتی تھی، میں اور ظفر بھائی اکثر ہی بغیر بتائے دوستوں کو گھر لے آتے اور وہ صبوحی بھابی کے ساتھ مل کر فوراً ہی کھانے کا انتظام کر لیتی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی اور صبوحی بھابی...... وہ پتا نہیں کیوں ظفر بھائی سے ناراض ہو کر چلی گئیں۔ ظفر بھائی آئیں تو مجھے بتانا میں ان سے کہوں گا وہ صبوحی بھابی کو منا کر لے آئیں۔"

وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

ناول **ماہ الملوک** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

# قسط نمبر 18

''جی ابا!'' وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تو وہ ایک دم واپس اپنے کمرے کی طرف مڑے۔
''آپ زین کے ساتھ کہیں جا رہے تھے ابا۔'' زمل کو خیال آیا کہ شاید زین انہیں کہیں لے کر جا رہا تھا۔
''نہیں مجھے تو کہیں نہیں جانا تھا۔ وہ مجھے خود ہی ساتھ لے آیا تھا۔ کہتا تھا چلیں آپ کو اپنے دوستوں سے ملواؤں۔ لیکن میں بھلا کیا کروں گا اس کے دوستوں سے مل کے۔'' وہ الجھے الجھے سے تھے۔
''اچھا ٹھیک ہے آپ کا جی نہیں چاہ رہا تو نہ ملیں۔ ہم آپ کے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ مجھے اماں کے متعلق اور بھی باتیں بتانا، اور یہ کہ آپ کو ان کی کیا بات سب سے اچھی لگتی تھی۔ سب کہتے ہیں میں بالکل اپنی اماں جیسی ہوں کیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے؟'' زمل ان کے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی۔ شاہ زیب نے رک کر اسے دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ وہ ان کے پیچھے ہی اندر آئی تو وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیڈ پر بیٹھے تھے۔
''کیا ہوا ابا؟'' وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
''کچھ نہیں، سوچ رہا تھا مریم کی سب سے اچھی بات کیا تھی۔ یاد ہی نہیں آ رہا۔ بہت اچھی تھی وہ۔ اماں جان کہتی تھیں اکثر مریم بہت صابر اور بڑے ظرف والی ہے۔''
''چلیں جب یاد آیا تو بتا دیجیے گا کوئی اور بات کرتے ہیں۔ اپنے متعلق بتائیں کچھ۔ کون سا کھیل پسند تھا اور کیا کیا دلچسپیاں تھیں۔''
آج کئی سالوں بعد وہ اس سے اتنی باتیں کر رہے تھے اور زمل اس وقت کچھ دیر پہلے آ زین کی

آنکھوں سے جھلکتی اجنبیت کی اذیت کو بھول کر بہت شوق سے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی۔

"میں ہاکی کھیلتا تھا اور ظفر بھائی فٹ بال کے پلیئر تھے لیکن کالج تک ہی شوق رہا کھیلنے کا۔ میں اسکول میں اپنی ہاکی ٹیم کا کیپٹن تھا۔" شاہ زیب کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"کرکٹ پسند نہیں تھی آپ کو؟"

"کچھ زیادہ نہیں...... بورنگ لگتا تھا یہ کھیل۔ یہ زین کیا کرکٹ کھیلتا ہے۔ کل باہر میں نے بیٹ دیکھا تھا برآمدے میں۔" انہیں جیسے اچانک یاد آیا تھا۔

"نہیں، وہ بلال کا تھا۔"

زمل نے بتایا تو کسی قدر حیرانی سے انہوں نے پوچھا۔

"یہ بلال کون ہے؟"

"اورنگ زیب تایا کا بیٹا ہے۔"

"لیکن اس کا نام تو......" وہ کچھ یاد کرنے لگے تھے۔ "شاہ رخ تھا نا......"

"جی شاہ رخ بھائی بڑے ہیں اور بلال سب سے چھوٹا ہے۔"

"اچھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا...... پتا نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے آج کل اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔"

"جی...... وہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آپ بیمار ہو گئے تھے نا...... اس لیے کبھی کبھی کچھ بھول جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔" زمل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"اچھا اچھا......" شاہ زیب بیگ نے سر ہلایا۔ "وہ بھی یہ ہی کہہ رہا تھا...... وہ شہزادہ۔"

"شینو بابا......؟" زمل نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو شاہ زیب نے سر ہلا دیا۔

"ہاں وہی...... اس نے کہا تھا میں نے بیماری کی وجہ سے میڈیکل لیو لے رکھی ہے اسی لیے آفس نہیں جا رہا۔ پتا نہیں میری چھٹی کتنی رہ گئی ہے، کب آفس جانا ہے۔ ایک دو روز تک آفس جاؤں گا۔"

"جی ابا......" زمل کے اندر کوئی آنسو گرا تھا۔

"تم ایسا کرنا میرے آفس جانے والے کپڑے نکال کر استری کے لیے دے دینا۔ مریم کو تو پتا ہوتا تھا سب۔ میرے کپڑے جوتے سب تیار رکھتی تھی۔" وہ زمل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"جی ابا! آپ اب کچھ دیر آرام کرلیں۔ میں اسکول سے آئی تو آپ شینخو بابا کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ وہ جانے کہاں کہاں گھماتے پھرے ہوں گے۔"

زمل کو محسوس ہوا کہ شاہ زیب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ مسکن دوائیوں کے زیر اثر وہ سوئے رہتے تھے لیکن شاید آج شینخو بابا انہیں باہر لے گئے تو وہ سو نہیں سکے ہوں گے۔

"نہیں تو...... ہم تو بس پارک میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے اور بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ میرا دل اندر کمرے میں گھبرا رہا تھا تو میں نے کہا اس سے باہر چلتے ہیں۔" شاہ زیب بیگ مسکرائے تھے۔

"وہ مجھے اپنے نانا جان اور اپنی اماں کے متعلق بتاتا رہا۔ اس نے اپنے گاؤں کے متعلق بھی بتایا۔"

"اچھا......" زمل حیران ہوئی تھی۔ شینخو بابا نے بی بی اماں سے بھی کبھی اپنے متعلق اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔

"لگتا ہے، بہت دوستی ہوگئی ہے آپ کی ان سے۔"

"ہاں!" شاہ زیب بیگ کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"وہ جب میرے پاس بیٹھتا ہے نا تو اس کے پاس سے مجھے مانوس سی خوشبو آتی ہے جیسے...... جیسے ظفر بھائی میرے ساتھ ہوتے تھے تو ان کے پاس سے خوشبو آتی تھی...... اپنائیت کی خوشبو۔"

"بی بی اماں کہتی ہیں ظفر چاچو ہی شینخو بابا کو لے کر آئے تھے گھر۔ جب تک یہاں رہے بہت خیال رکھتے تھے ان کا۔" زمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"اچھا اب تم جاؤ۔"

زمل کھڑی ہوگئی۔

یک دم ہی ان کی پیشانی پر شکنیں سی پڑی تھیں۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتے رہے پھر بیڈ پر لیٹتے

ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ زمل کچھ دیر کھڑی رہی پھر جب انہوں نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی تو وہ کمرے سے باہر آگئی۔

برآمدے میں کم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ جب کہ کچن کی دیوار والے بلب سے صحن میں کافی روشنی تھی۔ وہ برآمدے میں کچھ دیر کھڑی رہی۔ آزین کی اس کی طرف پشت تھی۔ طیب کہہ رہا تھا۔

''ہم بہت احسان فراموش قوم ہیں سر۔ اپنے محسنوں کو سر بازار ذلیل کروانے والے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ ہم نے عبدالقدیر خان کے ساتھ کیا کیا تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

طیب جو کہہ رہا تھا وہ کون سی اتنی پرانی بات تھی۔ ابھی پچھلے ماہ فروری میں ہی تو عبدالقدیر خان نے ٹی وی پر آ کر تسلیم کیا تھا۔ بلکہ ان سے کہلوایا گیا تھا کہ وہ ملک وقوم کی سلامتی کے لیے یہ اعتراف کر لیں۔ فروری 2004ء کا یہ دن زمل کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اس نے عبدالقدیر خان کو ٹی وی پر اعتراف کرتے سنا تھا۔ آج جب طیب ان کے متعلق بات کر رہا تھا تو اسے وہی تکلیف محسوس ہو رہی تھی جو اس روز اس نے محسوس کی تھی۔ وہ برآمدے میں شاہ زیب بیگ کے کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔

''زندہ قومیں اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا نہیں کرتیں سر، جیسا ہم نے کیا۔'' طیب کی آواز بھرا گئی تھی۔

''میرے ابو کہتے ہیں اگر قائد زندہ رہتے تو شاید ہم ان کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے۔''

''ٹھیک کہتے ہو بیٹا آپ...... اس روز ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو سنتے ہوئے مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ ابھی تو وہ زخم بھی نہیں بھرا تھا جو پانچ اپریل 2003ء کو امریکی فوجیوں کو فاتح کی طرح بغداد میں داخل ہوتے دیکھ کر لگا تھا۔'' جہاں زیب بیگ کے لہجے سے دکھ جھلکتا تھا۔

''سر! کیا صدام حسین کے پاس واقعی کیمیائی ہتھیار تھے؟'' ضیاء نے یکدم پوچھا۔

''نہیں۔'' جہاں زیب بیگ نے پورے یقین سے کہا۔ ''عراق کے تیل کے ذخائر اور سونے پر قبضہ کرنے کے لیے کیمیائی ہتھیاروں کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ دراصل امریکا نے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے اور مختلف ممالک کو باہم تباہ کن جنگوں میں دھکیلنے کا سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر

دیا تھا۔ اور عراق جنگ کے بعد تو پورا خطہ ہی غیر مستحکم ہو گیا ہے۔ شام، لیبیا اور لبنان کے عوام امن کو ترس رہے ہیں۔ انسانیت کا یہ قتل عام نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔"

"سر! کیا یہ ضروری تھا کہ نائن الیون کے بعد ہم امریکا کے اتحادی بن جائیں آخر کیوں ہم امریکا کی جنگ لڑ رہے ہیں، ہمیں اس سے کیا فائدہ ہے۔" ضیاء جب بھی آتا اس کے پاس بے شمار سوال ہوتے تھے اور اگر کبھی جہاں زیب بیگ مل جاتے تو وہ اپنے سوال ان کے سامنے رکھتا تھا اور جہاں زیب بیگ بھی کوشش کرتے تھے کہ اس کے تشنہ سوالوں کے جواب دے کر اسے مطمئن کر سکیں۔

"ہم آج سے نہیں، 1958ء سے امریکی ایجنڈے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ امریکا کو افغانستان کو سزا دینے کے لیے جغرافیائی حدود کی وجہ سے پاکستان کی ضرورت تھی۔ ہماری قیادت نے امریکا کے کہنے پر لیس سر کہہ دیا یہ سوچے بغیر کہ پاکستان پر اس کا جو اثر ہو گا وہ ختم ہوتے ہوتے نسلیں گزر جائیں گی۔ جانے کب تک ہم اس نام نہاد اتحاد اور دوستی کو بھگتیں گے۔"

"لیکن سر......" طیب کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور مرسل کے ساتھ ثوبیہ اندر داخل ہوئی۔ مرسل صحن کی طرف چلا گیا اور ثوبیہ اس کے پاس برآمدے میں آ گئی کہ اس نے زمل کو برآمدے میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔

"کیسی ہو زمل؟ جاب کیسی جا رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے تم سناؤ کیا مصروفیت ہے تمہاری آج کل۔" زمل نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھاما تھا۔

"شادی کی تیاری......" وہ ہولے سے ہنسی۔ اس کی منگنی اپنے خالہ زاد بھائی سے دو ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔

"تم سناؤ، زین کے ابا کب تک آ رہے ہیں پاکستان؟ سحرش نے بتایا تھا ان کے آنے پر تمہاری بھی رخصتی ہو جائے گی۔"

"ابھی کسی وجہ سے وہ نہیں آ سکتے تو فی الحال راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔" زمل شاہ زیب کو اپنا

بھرم رکھنا آتا تھا۔

''چلو جب اللہ کو منظور ہوا۔'' ثوبیہ تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں، تم بیٹھو میں ذرا کچن کا چکر لگا آؤں۔ دیکھو بی بی اماں کیا کر رہی ہیں۔ کچن کی لائٹ جل رہی ہے۔'' زمل کا وہاں بیٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ حالانکہ جہاں زیب بیگ اور طیب کی گفتگو سننے والی تھی۔

''ارے ہاں یاد آیا میری دوست تو ریزائن دے رہی ہے۔ اس کی امی کی طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جاب تو پھر بھی ہو جائے گی ماں کی خدمت کا موقع پھر نہیں ملے گا۔ تم چاہو تو اپنی جاب جاری رکھ سکتی ہو۔ نیا سیشن شروع ہونے سے پہلے پرنسپل سے بات کر لینا۔'' ثوبیہ کو اچانک یاد آیا تھا۔

زمل جو جاتے جاتے رک گئی تھی سر ہلاتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ بی بی اماں فروٹ ٹوکری میں رکھ رہی تھیں۔ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''بچے کب سے آئے ہوئے ہیں۔ زین نے چائے کا منع کر دیا تھا تو میں نے سوچا یہ فروٹ ہی لے جاؤں اور یہ چنے ابالے تھے صبح ناشتے پر بنانے کے لیے تو چاٹ بنا دی ہے اس کی۔ سوکھے منہ بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''جی......'' زمل نے دیکھا کاؤنٹر پر چنا چاٹ کا باؤل رکھا تھا۔

''تم بھی کچھ کھا پی لو صبح سے جو ذرا سا ناشتا کر کے نکلی ہو وہی بہت ہو گیا۔'' خفگی سے کہتی ہوئی بی بی اماں ٹرے میں پلیٹیں اور باؤل وغیرہ رکھنے لگیں۔

''اب رات کو کھانا ہی کھاؤں گی بی بی اماں، اگر ابھی کچھ کھا لیا تو پھر کھانے کو دل نہیں چاہے گا۔'' زمل وہاں ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''ثوبیہ کی آواز آ رہی تھی۔ کیا سمیرا بھی آئی ہوئی ہے۔ پتا نہیں اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ دو بار آئی جب تم اسکول گئی ہوتی تھیں۔ بولائی اور بوکھلائی ہوئی سی ہوا کے گھوڑے پر سوار، اے زمل...... تم اس سے پوچھنا تو سہی کیا پریشانی ہے اسے۔ بے چاری بچی، باپ دوسری شادی کر کے بھلا ہی بیٹھا ہے۔''

بی بی اماں کے لہجے میں تاسف تھا۔ انہیں سمیرا سے ہمدردی تھی۔ اورانس تو خیر سب سے ہی ہو گیا تھا۔

''سمیرا کب آئی تھی، آپ نے بتایا ہی نہیں۔'' زمل کو حیرت ہوئی۔

''ارے وہ کچھ دیر ٹکتی تو یاد رہتا۔ ذہن سے ہی نکل گیا۔ وجدان کا پوچھنے آئی تھی کہ وہ ادھر تو نہیں ہے۔ تین چار دن پہلے آئی تھی ایک بار۔ اورایک بار ہفتہ بھر پہلے صحن کے دروازے سے ہی پوچھ کر چلی گئی۔'' بی بی اماں ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئیں تو زمل سمیرا کے متعلق سوچنے لگی۔

''یہ سمیرا وجدان کو ادھر کیوں ڈھونڈنے آئی تھی۔ اور پھر وجدان کے ہر پروگرام کا تو اسے علم ہوتا ہے۔ شاید وجدان نے اسے ادھر آنے کا بتایا ہو اور پھر نہیں آسکا ہو۔''

اسے اپنا یہ خیال صحیح لگا تھا۔

شاید اسے زین سے کوئی کام ہو کہ اس نے ایک روز فون کر کے زین کا پوچھا تھا کہ وہ گھر پر ہے یا نہیں۔

چونکہ زین گھر پر نہیں تھا، اس لیے بی بی اماں نے بتا دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی بے معنی باتیں سوچتی رہی۔ پھر اٹھ کر کچن میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کاؤنٹر پر رکھے دو تین مسالوں کے ڈبے اٹھا کر ان کی مخصوص جگہ پر رکھا۔ کچن صاف ستھرا تھا۔ کوئی بھی کرنے کا کام نہ تھا۔ اس نے فریج کھولا اور چیک کیا۔ سالن پکا ہوا تھا۔ آٹے کا باؤل چیک کیا۔ آٹا تھوڑا سا تھا۔ یوں تو ساجدہ آٹا گوندھتی تھی لیکن اس نے اپنے لیے ایک کام ڈھونڈ لیا تھا۔ آٹا گوندھ کر رکھا۔ پرات دھوئی۔ بی بی اماں شاید باہر سے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اگر کچن میں واپس آتیں تو ان سے ہی باتوں میں کچھ وقت گزر جاتا۔ عشاء کی اذان تو کب کی ہو چکی تھی۔ یقیناً وہ نماز پڑھنے اپنے کمرے میں چلی گئی ہوں گی۔

وہ پھر واپس کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

ابا، زین، پھپھو، شایان، شانزہ...... سوچنے کے لیے اتنا بہت کچھ تھا لیکن اس کا ذہن کہیں کسی

ایک نقطے پر مرکوز ہی نہیں ہو رہا تھا۔ تب وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ پہلی نگاہ برآمدے کی طرف اٹھی تھی۔ سحرش تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاٹ کا باؤل تھا۔ جب کہ ثوبیہ تخت پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی صحن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں زیب بیگ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ مرسل کے علاوہ اب اسد اور عمر بھی تھے۔ یہ لوگ کب آئے تھے۔ موضوع گفتگو اب ملکی حالات اور سیاست تھی۔ طیب ہمیشہ کی طرح پر جوش آواز میں بات کر رہا تھا۔

"بڑے بڑے محل نما گھروں میں رہنے والوں اور لگژری کاروں میں گھومنے والوں کو عوام کے مسائل کا کیا پتا...... اقتدار میں آنے والے تو یہ ہی کہتے ہیں کہ یہ سب دوسری حکومتوں کا کیا دھرا ہے۔ ہم اب سب ٹھیک کر دیں گے لیکن کوئی کچھ ٹھیک نہیں کرتا۔ سب ویسے ہی رہتا ہے۔ وہی بے روزگاری، وہی ناانصافی...... وہی ظلم، وہی جبر...... کیا اس ملک کی تقدیر کبھی نہیں بدلے گی مرسل......"

زمل نے چند لمحے ٹھہر کر اس کی بات سنی اور پھر جہاں زیب بیگ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ بہت دنوں سے اسے ان کے پاس فراغت سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

جہاں زیب بیگ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے اسے اندر آنے کو کہا تو وہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں زیب بیگ جو دوسری طرف کی بات سن رہے تھے، نفی میں سر ہلانے لگے۔

"نہیں...... نہیں صبوحی...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جس کسی نے بھی تمہیں بتایا ہے، غلط بتایا ہے۔ میں نے اس روز بھی تمہیں بتایا تھا کہ زین کا نہ سیاست سے اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق ہے۔ اس کے دوست وغیرہ آتے رہتے ہیں لیکن کوئی بھی کسی سیاسی جماعت سے منسلک نہیں ہے۔"

دوسری طرف جانے صبوحی کیا کہہ رہی تھیں کہ زمل نے جہاں زیب بیگ کی آنکھوں میں ابھرتی حیرت کو صاف محسوس کیا۔

"نہیں، میری نظر سے ایسی کوئی خبر نہیں گزری۔ کون سے اخبار میں خبر لگی ہے کہ زین کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو گیا ہے۔ جس کسی نے بھی یہ خبر لگائی، جھوٹ کہا ہے۔ تم ہزار بار آؤ بیٹی زین تمہارا بیٹا ہے۔

اس سے ملنے کا حق ہے تمہیں۔ یہ تو تم خود ہی کبھی اس سے ملنے نہیں آئیں۔ حالانکہ تمہیں آتے رہنا چاہیے۔ زین کو چھوڑنے کا فیصلہ بھی تمہارا اپنا تھا، ظفر نے ایسا نہیں کہا تھا۔ بلکہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم زین سے بالکل رابطہ ختم کرلو۔ تم نے اور ظفریاب نے دونوں نے زین کے ساتھ زیادتی کی ہے۔''

زمل نے جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھا جو اب صبوحی کی بات سن رہے تھے لیکن جن کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ اب زین تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ اب بچہ نہیں ہے صبوحی، کہ میں اسے زبردستی تمہارے پاس جانے کے لیے کہوں۔ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی عمر میں ہے۔ ظفریاب نے ہمیشہ اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن اس نے ہمیشہ انکار کیا۔ تم خود بات کر کے دیکھ لو، میں بلواتا ہوں زین کو...... اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔''

بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے زمل کی طرف دیکھا۔

''بیٹا! ذرا زین کو بلا لاؤ، کہنا دادا جان بلا رہے ہیں۔''

زمل اٹھ کر باہر آئی۔ ذرا سی دیر جہاں زیب بیگ کے کمرے کے باہر رک کر اس نے صحن میں نظر ڈالی۔ وہ سب اب گول دائرے میں کرسیاں رکھے بیٹھے تھے۔ ثوبیہ، سحرش اور مہرین بھی صحن میں ہی تھیں۔ وہ سب آواز سے آواز ملائے مدھم آواز میں گا رہے تھے۔ ان کی آواز بس برآمدے تک آ رہی تھی۔

حبیب جالب کی نظم تھی۔ چند لمحے وہاں ہی رک کر انہیں سنا۔

جس دیس کے عہدے داروں سے ایک لائن مین نہ سنبھالے جاتے ہوں

اس دیس کے ہر اک حاکم کو سولی پہ چڑھانا واجب ہے

جس دیس کے کوٹ کچہری میں انصاف ٹکوں پر بکتا ہو

جس دیس کے عادل بہرے ہوں، آہیں نہ سنیں معصوموں کی

یہ یقیناً طیب کی ہی چوائس ہوگی۔ وہ آج کل یوں ہی اینگری ینگ مین بنا رہتا تھا۔ خاص طور پر جب سے اس کے بھائی نے ایک سیاسی پارٹی جوائن کی تھی۔

اس دیس کے ہر اک لیڈر پر سوال اٹھانا واجب ہے......

آوازا چانک ہی کچھ بلند ہوئی تو وہ چونکی۔

''زین......!''

سب یک دم خاموش ہو گئے تھے اور زین نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''آپ کو دادا جان بلا رہے ہیں۔ دو منٹ کے لیے ان کی بات سن لیں۔''

اب یہ آپ جناب کا تکلف اختیاری تھا یا غیر اختیاری۔ اس نے غور نہیں کیا تھا اور زین کو اٹھتے دیکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''شان!'' ثمرہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی شاید اس کے کمرے سے نکلنے کی منتظر تھی۔

''جی امی......!'' شایان جو اپنے کمرے سے تیار ہو کر کہیں جانے کے لیے نکلا تھا، رک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا۔'' شایان نے بتا کر لاؤنج کے دروازے کی طرف قدم اٹھایا۔

''کبھی دو گھڑی ماں کے پاس بھی آ کر بیٹھ جایا کرو۔ لیکن بھلا اب کیوں تم میرے پاس آ کر بیٹھو گے۔ میرے پاس بیٹھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تمہیں۔ ماں نہیں سمجھتے مجھے۔ ٹھیک ہے میں نے تمہیں جنم نہیں دیا لیکن پالا تو میں نے ہی ہے نا۔ کیا صرف جنم دینے والی ہی ماں ہوتی ہے۔ پالنے والی ماں نہیں ہوتی۔ کوئی حق نہیں ہوتا اس کا۔'' ثمرہ شا کی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہے امی۔ آپ یوں ہی فضول باتیں سوچ سوچ کر خود کو پریشان نہ کیا کریں۔ ان دنوں کچھ مصروف رہا۔ بابا نے میرے ذمے کچھ کام لگائے تھے تو آپ کے پاس بیٹھنے کا زیادہ وقت نہیں ملا۔'' سنجیدگی سے کہتا ہوا شایان ثمرہ کے قریب آیا تھا۔

''جھوٹ مت بولو شایان...... کیا میں نہیں جانتی اختر بانو نے میرے متعلق الٹی سیدھی باتیں اور جھوٹ بول کر تمہیں مجھ سے متنفر کر دیا ہے۔'' وہ واپس کمرے میں چلی گئی تو شایان بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ثمرہ عدم تحفظ کا شکار ہو رہی ہیں لیکن اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیسے یقین دلائے کہ بڑی امی ایسی نہیں ہیں۔ اور انہوں نے کبھی ثمرہ کے خلاف اس سے بات نہیں کی تھی بلکہ وہ تو اس روز جذبات میں کہی جانے والی اپنی بات سے ہی مکر گئی تھیں۔ زمل کے واپس جانے کے دو دن بعد ہی اس نے اختر بانو سے کہا تھا۔

''بڑی امی! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ پلیز سچ سچ بتایئے گا۔''

اختر بانو اس وقت اپنے کمرے میں وارڈروب کھولے کھڑی تھیں۔

''کہو!'' وہ وہاں سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''وہ اس روز ڈیرے پر......'' وہ کچھ جھجکا تھا۔ ''آپ نے کیا کہا تھا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ کیا......''

''تم میرے بیٹے ہی ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے، کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو؟''

اختر بانو نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بڑی امی لیکن آپ نے کہا تھا آپ نے مجھے جنم دیا میں آپ کا خون ہوں۔ میں اس روز سے الجھن میں ہوں بڑی امی، لیکن آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے خود کو روکے رکھا۔''

''ہاں اس روز میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ تم خود سوچو۔ زمل کا اس طرح اغوا ہونا اور ڈیرے پر تمہیں دیکھ کر سچ کہتی ہوں میرے ہوش و حواس جاتے رہے تھے تو بس جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا کہ مجھے لگا تھا جیسے میرے بیٹے نے میری زمل کو......'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارا بیٹا...... ثوبان شاہ کا بیٹا ایسا کر سکتا ہے تو بس جو کچھ منہ میں آیا کہہ دیا۔ تمہیں دیکھ کر شاکڈ ہو گئی تھی نا...... تم ثمرہ آپا کے بیٹے ہو لیکن امان، ریحان کے بھائی ہو تو مجھے اپنے بیٹے ہی لگتے ہو۔ تم بھول جاؤ جو میں نے کہا تھا۔''

☆......☆......☆

اسے اختر بانو کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن اس نے بحث نہیں کی تھی۔ اختر بانو نے اس سے نظریں ملا کر بات نہیں کی تھی۔ اسے یقین تھا اس روز جذباتی کیفیت میں جو کچھ اختر بانو نے کہا تھا وہ سچ تھا۔ لیکن اب وہ اس سے انکار کر رہی تھیں تو کیوں؟ تب ہی اس نے یہ ہی بات ثمرہ سے پوچھ لی تھی۔

ثمرہ کچھ دیر تو ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم تیز آواز میں بولی تھی۔

"کس...... کس نے بتایا ہے تمہیں یہ...... اس مکار عورت نے......"

"امی، مسئلہ یہ نہیں کہ مجھے کس نے بتایا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے کہ میری سگی ماں بڑی امی ہیں۔ اور آپ نے مجھے......"

"ہاں...... ہاں......!" ثمرہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ "میں جانتی تھی ایک روز وہ کم ظرف اختر بانو تمہیں مجھ سے چھین لے گی۔ میں نے تمہیں پالا...... راتوں کو جاگی۔ تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن...... کہا تھا تمہارے بابا سے کہ مجھے کسی یتیم خانے سے یا ایدھی ہاؤس سے بچہ لا دیں لیکن انہوں نے...... تمہیں لا کر میری گود میں ڈال دیا۔ صرف آٹھ دن کے تھے تم۔ صرف آٹھ دن کے...... ساری ساری رات روتے تھے اور میں تمہیں گود میں لے کر بیٹھی رہتی تھی۔ میں نے تمہیں ماروی، سوہنی، تاجی...... کسی کے حوالے نہیں کیا۔ خود کیا تمہارا ہر کام...... اور آج وہ تمہاری ماں بن گئی۔" ثمرہ اب رو رہی تھی۔

"اگر یتیم خانے سے بچہ لیتی تو وہ آج میرا ہوتا۔ صرف میرا...... وہ مجھ سے یہ سوال کبھی نہ کرتا۔"

"میں بھی آپ کا ہی ہوں۔ بس ایک الجھن تھی جو دور کر لی۔ اور شاید زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر یتیم خانے سے لیا جانے والا بچہ بھی ضرور پوچھتا کہ وہ کون ہے، کس کا بیٹا ہے۔ یہ فطری سی بات ہے۔"

اس نے ثمرہ کا ہاتھ تھام کر اسے بوسہ دیا تھا لیکن ثمرہ نے ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"مجھے پتا تھا۔ میں جانتی تھی یہ ڈائن...... غاصب عورت ایک روز تمہیں مجھ سے دور کر دے گی۔ کتنی دعا کی تھی میں نے کہ یہ وہاں آپریشن ٹیبل پر ہی رہ جائے، مر کر حویلی آئے لیکن بھلی چنگی ہو کر آ گئی تمہیں ورغلانے...... اللہ کرے مر جاؤ تم اختر بانو......!"

شایان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن ثمرہ ہسٹریک ہو رہی تھی۔ بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اختر بانو کو

برا بھلا کہہ رہی تھی، تب شایان نے اس کے گرد بازو حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ ''میں نے آنکھ آپ کی گود میں کھولی، آپ کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہوں۔ میں جتنی محبت آپ سے کرتا ہوں، اتنی بڑی امی سے نہیں کرتا۔'' وہ اسے بہلا تو رہا تھا، سمجھا رہا تھا لیکن اس کا رونا اور تڑپنا کم نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس کی بلند آواز سن کر ثوبان شاہ جو اسی وقت باہر سے آئے تھے، اس کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

''کیا ہوا شان بیٹا......اور ثمرہ تم اس طرح کیوں رو رہی ہو؟''

''میں اس لیے رو رہی ہوں کہ اختر بانو نے اسے بتا دیا ہے کہ یہ میرا بیٹا نہیں، اس کا بیٹا ہے۔ مجھے پتا تھا۔ میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ ایک روز وہ جھوٹ سچ بول کر میرے شانی کو مجھ سے چھین لے گی اور ایسا ہی ہوا نا......''

اس نے اپنے کندھے پر رکھے شایان کے بازو کو پیچھے ہٹایا تھا۔

''تم سے تمہارا بیٹا کوئی نہیں چھین رہا ثمرہ......'' ثوبان شاہ نے نرمی سے کہا۔

''سچ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتا ہے ثمرہ! اسے آپ ساری زندگی نہیں چھپا سکتے۔ اگر شایان یہ جان بھی گیا ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شایان تمہارا بیٹا تھا اور تمہارا ہی بیٹا رہے گا۔ تمہاری وجہ سے کسی نے آج تک یہ سچ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اب اگر یہ حقیقت اتفاق سے ظاہر ہو گئی ہے تو خود کو رو رو کر ہلکان مت کرو۔ تمہاری خواہش تھی کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو تو کسی نے بھی یہ حقیقت ظاہر نہیں کی۔ اب اللہ نے اگر یہ سچ ظاہر کر دیا ہے تو قبول کر لو اسے اور یقین رکھو اختر بانو کا شایان پر کوئی دعویٰ نہیں ہے۔''

اختر بانو نے ثوبان شاہ کو بتا دیا تھا کہ جذبات میں آ کر ان سے کیا غلطی ہو گئی ہے اور انہوں نے ثوبان شاہ سے معذرت بھی کر لی تھی۔

زل کا اغوا ہی کوئی معمولی بات نہیں تھی، اس پر وہاں شایان کو آتا دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں کہ زل کو وہاں ڈیرے پر لانے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا ہے۔

''میں اپنے آپ میں نہیں تھی اس لیے آپ سے کیے وعدے کا پاس نہیں کر سکی۔''

''یہ...... یہ اختر بانو نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ مجھے اذیت دینے کے لیے، میں کیا نہیں سمجھتی تھی کہ جب جب وہ شایان کو میرے ساتھ لاڈ کرتے دیکھتی تھی تو سینے پر سانپ لوٹتے تھے اس کے۔ وہ مجھے ماں کا مان دیتا تھا تو برداشت نہیں ہوا اس سے بتا دیا اسے کہ اسے پیدا کرنے والی ماں وہ ہے...... ہاں وہ تو صرف پیدا کرنے والی ہے۔ پالا تو میں نے ہے نا۔''

ثمرہ کے منہ میں جو آ رہا تھا بولتی جا رہی تھی۔

''بس کرو ثمرہ......'' ثوبان شاہ بے زار ہوئے تھے۔ ''خوامخواہ اختر بانو کو برا بھلا مت کہو۔ میں نے اپنے پورے خاندان بلکہ پوری برادری میں اس جیسی اعلیٰ ظرف، حوصلے اور صبر والی عورت نہیں دیکھی، خوامخواہ واویلا مت مچاؤ۔ ابھی بات گھر کے اندر ہے، تم یوں واویلا کرو گی تو ایک دنیا کو پتا چلے گا۔ الٹی سیدھی باتیں سوچ کر اپنا دماغ مت خراب کرو۔''

ثوبان شاہ غیر ارادی طور پر زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے چلے گئے تو شایان جو ساکت بیٹھا سن رہا تھا، چونکا۔

''مجھے بڑی امی نے تو کچھ نہیں بتایا۔''

''تو کیا تمہیں الہام ہوا ہے؟'' ثمرہ غصے میں تھی۔

''نہیں...... اس روز بڑی حویلی جا رہا تھا تو راستے میں دو عورتیں باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھیں کہ ثمرہ بی بی تو بے اولاد تھیں...... انہوں نے کسی رشتے دار کا بیٹا گود لیا تھا۔''

شایان نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہر روز اختر بانو کو یہ بات لے کر برا بھلا کہتی رہیں۔ سو اس نے بات بنائی تھی۔

''کون تھیں وہ کمبخت عورتیں اور انہیں حویلی کی بات کس نے بتائی؟ ضرور اس ماسی تاج اور بھاگی نے ہی کسی سے بات کی ہوگی۔ نمک حرام......''

ثمرہ کا غصہ اب ان کی طرف منتقل ہو گیا تھا کہ وہ گھر کی پرانی ملازمائیں تھیں اور بھاگی تو شایان کے وقت اختر بانو کے ساتھ ہی اسپتال گئی تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھیں۔ وہ جو بھی تھیں اور انہوں نے جو بھی کیا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے صرف یہ اہم ہے کہ آپ کو میری وجہ سے کوئی دکھ یا تکلیف نہ پہنچے اور یہ کہ آپ اس بات کا یقین رکھیں کہ شایان شاہ صرف آپ کا بیٹا ہے۔ میں نے تو صرف آپ سے تصدیق کرنا چاہی تھی اگر آپ کہہ دیتیں کہ یہ غلط ہے تو میں سمجھتا کہ وہ عورتیں یوں ہی غلط بات کر رہی تھیں۔''

شایان سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

ثمرہ کچھ دیر بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر دل ہی دل میں پچھتانے لگی کہ یہ کیسی غلطی ہو گئی۔ فوراً ہی اقرار کر لیا کہہ دیتی کہ سب غلط ہے، جھوٹ ہے، بکواس کر رہی تھیں وہ عورتیں تو بھلا کیا ثبوت تھا کہ شایان...... دلاور بھائی صحیح ہی تو کہتے ہیں کہ میں بہت جلد باز ہوں۔

''اچھا لیکن تم اختر بانو کو نہ بتانا کہ تمہیں پتا چل گیا ہے کہ...... لیکن تم نہیں بتاؤ گے تو تمہارے بابا نے تو اب تک بتا ہی دیا ہوگا۔ وعدہ کرو شانی، ہمیشہ مجھے ہی اپنی ماں سمجھو گے۔ وہ تو اب ضرور اپنا حق جتائے گی تم پر۔'' وہ پھر زار و قطار رونے لگی تھی۔

''پلیز امی...... اس طرح رو رو کر خود کو اور مجھے اذیت نہ پہنچائیں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کس نے جنم دیا۔ میرے لیے تو بس آپ ہی میری ماں ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر ثمرہ کو یقین دلایا تھا لیکن کیا واقعی اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ جولا ابالی اور شوخ سا تھا، یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ راتوں کو اسے ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ دیر تک جاگتا رہتا۔ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتا اور دل ہی دل میں اختر بانو سے شکوہ کرنے لگتا کہ کیا میں اتنا ان چاہا تھا کہ پیدا ہوتے ہی مجھے ثمرہ امی کی گود میں ڈال دیا۔ بھلا کوئی اپنی اولاد کو یوں کسی اور کی گود میں ڈال دیتا ہے۔ بھلے اس کے کتنے ہی بچے ہوں۔ جہاں آپ دو کو پال رہی تھیں وہاں آپ تیسرے کو نہیں پال سکتی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ ناشتا کر کے گھر سے نکل جاتا، لنچ پر تو ہوتا ہی نہیں تھا۔ ڈنر کی ٹیبل پر آتا تو دو چار لقمے لے کر اٹھ جاتا تھا۔ اختر بانو کو احساس تھا کہ وہ ڈسٹرب ہو گیا ہے۔ اسی لیے انہوں

نے ثوبان شاہ کو کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ ثوبان شاہ بھی محسوس کر رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس انکشاف پر ڈسٹرب ہو جانا نیچرل ہے۔ لیکن نعمان کی شادی سر پر کھڑی تھی ورنہ وہ اسے کچھ عرصہ کے لیے کراچی بھیج دیتے۔ اب تو کراچی سے بھی سب آنے والے تھے۔ سو اس روز ناشتے کے بعد وہ اسے ساتھ ہی ڈیرے پر لے گئے تھے۔

''میں وہاں جا کر کیا کروں گا بابا......'' وہ بے زار سا تھا۔

''کچھ لوگ آ رہے ہیں باغات کے ٹھیکے کے لیے، تم دیکھنا کہ ان سے کیسے بات چیت اور ڈیل کی جاتی ہے۔''

''لیکن بابا! ابھی تو درختوں پر بور بھی نہیں پڑا۔ اتنا پہلے......''

''کچھ لوگ پہلے سے ہی آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ گو سودا تو ابھی طے نہیں ہوگا۔ تم زمان کے ساتھ چلے جایا کرو اور سمجھنے اور سیکھنے کی کوشش کرو۔''

شاید کچھ دن پہلے اگر ثوبان شاہ ایسا کہتے تو وہ بہت خوش ہوتا لیکن آج اس وقت اس کا جانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ چلا گیا تھا۔ جن لوگوں نے آنا تھا وہ نہیں آئے تھے۔ زمان شاہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر نظام دین سے باتیں کر کے ثوبان شاہ سے اجازت لے کر واپس حویلی آ گیا تھا۔ کچن سے سنہری کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے ناشتے کی ٹیبل پر سنا تھا ثمینہ چچی آج رات پھر سے ڈھولکی رکھنے کے متعلق بھاگی کو بتا رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے غیر ارادی طور پر اختر بانو کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ نیم وا دروازے سے ثمرہ کی تیز اور کرخت آواز آ رہی تھی۔

''تم اب یہ مت سمجھنا اختر بانو کہ شانی کو حقیقت پتا چل گئی ہے تو وہ مجھے نہیں تمہیں ماں سمجھے گا۔ یاد رکھنا، وہ میرا بیٹا ہے اور ہمیشہ میرا ہی بیٹا رہے گا۔ وہ کبھی تمہارا نہیں ہو سکتا۔''

''وہ آپ کا ہی بیٹا ہے ثمرہ آپا اور ہمیشہ آپ کا ہی رہے گا۔'' اختر بانو کا لہجہ نرم تھا۔

وہ اختر بانو کے کمرے میں جانے کے بجائے اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑ گیا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے سنا تھا، اختر بانو کہہ رہی تھیں۔

''میں پہلے بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی اب کرتی ہوں۔اس کی ذرا سی تکلیف اور پریشانی پر اتنا ہی تڑپوں گی جتنی آپ تڑپیں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں اسے ورغلاتی ہوں آپ کے خلاف......اور اسے آپ کو چھوڑ دینے کو کہتی ہوں۔ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں......آپ سے جدا کر کے اسے میں کہاں لے کر جاؤں گی اسے اسی گھر میں رہنا ہے میری ممتا کی تسکین کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اسے دیکھ لیتی ہوں۔''

''وہ اس انکشاف پر ذہنی طور پر کچھ ڈسٹرب ہو گیا ہے۔''

''کچھ دن لگیں گے اسے نارمل ہونے میں، آپ پریشان نہ ہوں۔''

اس نے ثمرہ کا جواب نہیں سنا تھا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔وہ صرف ڈسٹرب نہیں تھا، اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ٹھیک ہے، اختر بانو نے اسے ثمرہ امی کو دے دیا تھا تو پھر چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔وہ اپنے سگے بھائیوں کو سوتیلا سمجھ کر ان سے ہمیشہ دور رہا۔کبھی قریب نہ ہو سکا۔اختر بانو کو اس واقعے سے پہلے کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا۔سوتیلی ماں تھی، اور وہ سمجھتا تھا کہ سوتیلی مائیں دشمن ہوتی ہیں۔ثمرہ نے یہ ہی اس کے ذہن میں بٹھایا تھا۔بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں موندے کئی مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے تھے۔

ایک بار جب وہ سات آٹھ سال کا تھا اور لاؤنج میں کھڑا تھا۔اختر بانو بے اختیار اس کی طرف بڑھی تھیں اور اسے پیار کرنے لگی تھیں تو ثمرہ اسے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔کھانے کی ٹیبل پر کبھی کبھی اختر بانو کا اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھنا اور پھر فوراً ہی نظریں جھکا لینا۔

آخر وہ ثمرہ سے یہ کیوں نہیں کہہ سکتی تھیں کہ یہ میرا بیٹا ہے، مجھے حق ہے کہ میں اسے پیار کروں بے شک میں نے اسے تمہیں دے دیا ہے، لیکن وہ تو جیسے اسے دیکھتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔

اور پھر ایک منظر آنکھوں کے سامنے آ کر جیسے ٹھہر سا گیا۔جب اس نے ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھا تھا وہ کیسے تڑپ کر اس کی طرف بڑھی تھیں۔وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔پتا نہیں ظالم کون تھا۔اختر بانو جنہوں نے اسے اپنی ممتا سے محروم کر دیا تھا یا ثمرہ جنہوں نے ہمیشہ اس کے دل میں اختر بانو کے لیے

نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بابا نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ آخر اس بات کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ بس ٹال دیا تھا اور یقیناً اختر بانو اسے کچھ نہیں بتائیں گی۔ کوئی تو وجہ ہوگی۔ وہ الجھا ہوا سا کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا۔ لیکن ایک ہستی ایسی تھی جو اس کی الجھن دور کر سکتی تھیں۔ اور وہ تھیں بڑی ممانی...... ان کی اور ثمرہ کی کچھ زیادہ نہیں بنتی تھی۔ گو وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں لیکن وہ اتنا عرصہ حیدر آباد ان کے گھر میں رہا تھا تو اندازہ تھا اسے کہ بڑی ممانی ثمرہ کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتیں۔

وہ سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتا ہوا باہر آیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' ثمرہ اپنے کمرے سے نکل کر شاید کچن کی طرف جا رہی تھیں۔

''ذرا رضی بھائی کی طرف جا رہا ہوں۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس روز فون پر ناراض ہو رہے تھے کہ ہم یہاں آئے ہوئے ہیں اور تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی کہ کبھی چکر لگا جاؤ۔''

''ہاں تو جانا چاہیے تھا نا تمہیں، کتنی محبت کرتے ہیں سب تم سے۔'' ثمرہ ایک دم خوش ہو گئی تھیں۔

شایان نے ایک نظر ان کے چمکتے چہرے کو دیکھا اور مسکرایا۔

''اللہ حافظ امی۔''

''اللہ حافظ میری جان۔''

ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں آیا کہ وہ اختر بانو کو بھی سلام کرتے ہوئے جائے۔ جانے ثمرہ نے کیا کچھ کہا ہو ان سے اور وہ کتنی اداس اور پریشان ہوں گی ثمرہ کی باتوں سے لیکن پھر ایک نظر ثمرہ پر ڈالتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ بڑی ممانی لیونگ میں اکیلی بیٹھی مل گئی تھیں۔

دلاور ماموں کے ہاں سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔ ممانی اسے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔

''آؤ شانی...... کتنے دنوں بعد چکر لگایا ہے۔ یہاں سب ہی تمہیں یاد کر رہے تھے۔ رضی اور ہادی آج تمہارے ماموں کے کسی کام سے حیدر آباد گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ واپس آ کر تمہیں بڑی حویلی لے آتے ہیں۔ اتنی بوریت ہو رہی ہے۔ پھر تو شادی کے فنکشن شروع ہو جائیں گے تو کہاں ہاتھ لگو گے۔ ویسے کراچی سے نعمان اور ریحان کب آ رہے ہیں؟''

''شاید اگلے ہفتے تک آ جائیں گے سب، بس مہران چچا مہندی کے فنکشن سے دو دن پہلے آئیں گے۔''

''مہران بھائی اب اتنے زیادہ دن تو نہیں رہ سکتے وہاں کام کاج ہوتا ہے۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ تو اب بھی لگ ہی جائے گا۔ ویسے سارا کام تو منیجر، سیلز منیجر وغیرہ ہی دیکھتے ہوں گے۔''

بڑی ممانی کو زیادہ بولنے کی عادت تھی، بس کوئی سامع مل جائے۔

''اور اتنے سالوں بعد عرفان آیا تھا۔ شادی میں شرکت کے لیے لیکن واپس جانا پڑا۔ یہ گورے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چھٹیاں نہیں دیتے اتنی زیادہ...... ٹکے ٹکے کا حساب کرتے ہیں۔''

''جی......!'' عرفان کے ذکر پر اس کے اندر ایک ناگواری کی لہر سی اٹھی تھی۔ ''مامی جی...... آپ کو پتا ہے کہ میں بڑی امی کا بیٹا ہوں۔ امی نے مجھے گود لیا تھا۔''

''ہاں ہاں بھلا ہمیں کیسے نہ پتا ہوگا۔ لیکن تمہیں کس نے بتایا۔ کیا ثمرہ نے یا اختر بانو نے؟'' روانی میں بات کرتے ہوئے وہ چونکی تھیں۔

''بس کہیں سے پتا چل ہی گیا لیکن آپ لوگوں نے کبھی ذکر تک نہ کیا۔'' اس نے جیسے گلہ کیا تھا۔

''ارے کیسے بتاتے، ثمرہ نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی نے بھی تم سے کوئی ایسی بات کی تو زندگی بھر کے لیے ہم سے تعلق توڑ لے گی۔ دراصل ثمرہ تو بچپن سے عجیب مزاج کی تھی۔ نند ہی نہیں، چچازاد بھی ہے رگ رگ سے واقف ہوں اس کی۔'' بڑی ممانی کو تو موقع مل گیا تھا ثمرہ کے خلاف بولنے کا۔

''ثوبان بھائی اچھے بھلے اختر بانو کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہے تھے کہ اس نے رو پیٹ کر اور مرنے کی دھمکیاں دے کر چچا جان کو راضی کیا اور دادا جان تو پہلے ہی ثوبان اور اختر بانو کی شادی سے خوش نہ تھے۔ اور ثمرہ نے تو ایسا سحر پھونکا ثوبان پر کہ انہیں نہ صرف اختر بانو سے دور کر دیا بلکہ ثوبان بھائی کو راضی کر لیا کہ یوں بھی اختر بانو کے دو بیٹے ہیں۔ اس لیے آنے والا بچہ اسے دے دیں کہ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ثمرہ کبھی ماں نہیں بن سکتی اور ثوبان بھائی ایدھی یا کسی بھی یتیم خانے سے بچہ لینے کے لیے نہیں مان رہے تھے۔

اختر بانو تمہیں نہیں دینا چاہتی تھی۔ ہائے کیسا کیسا تڑپتی تھی وہ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے تمہاری دادی کی منتیں کرتے کہ وہ اسے تمہیں دودھ پلانے کی اجازت دے دیں۔ دن میں کچھ دیر کے لیے تمہیں اپنے پاس رکھنے دیں لیکن ثمرہ نے ثوبان بھائی سے وعدہ لیا تھا کہ تمہیں یہ بات کبھی نہ بتائی جائے اور اختر بانو سے بھی ثوبان بھائی نے پتا نہیں کیا کہہ کر کچھ نہ بتانے کا وعدہ لے لیا تھا۔ شاید اس نے تو اپنی میکے میں بھی تمہاری پیدائش کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا ایک بار ثمرہ نے مجھے بتایا تھا مجھے۔"

شایان نے بہت دھیان اور خاموشی سے ان کی بات سنی تھی۔ بات کرتے کرتے بڑی ممانی کو ایک دم خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہیں تو انہوں نے شایان کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں اداس اور غم زدہ سا لگا تھا۔

"لیکن ہم نے تمہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔ ہمارے لیے تم ثمرہ کے بیٹے ہو اور ہمیں بہت پیارے ہو۔ بہت محبت کرتے ہیں ہم سب تم سے۔"

"جی، جانتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"رضی بھائی سے ملنے آیا تھا وہ آئیں تو انہیں بتا دیجیے گا۔"

☆......☆......☆

وہ بڑا دل گرفتہ سا بڑی حویلی سے نکلا تھا اور پھر بہت دیر تک یوں ہی ادھر ادھر گاڑی بھگاتا پھرا۔ بیدار شاہ کے علاقے تک کا چکر لگا کر ڈیرے پر آیا تو پتا چلا کہ ثوبان شاہ تو دوپہر میں ہی کراچی چلے گئے تھے۔ وہ جب گھر واپس آیا تو شام ڈھل چکی تھی۔ سیدھا اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

اسے اختر بانو کی بے بسی اور مجبوری پر دکھ ہو رہا تھا۔ ظالم اختر بانو نہیں، ثمرہ تھیں۔ ثوبان شاہ نے صحیح کہا تھا کہ اختر بانو اعلیٰ ظرف اور صابر عورت ہے۔ وہ بازو آنکھوں پر رکھے لیٹا رہا۔ یہاں تک سنہری اسے رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی تو اس نے منع کر دیا، تب ثمرہ خود چلی آئی تھیں۔

"بھوک نہیں ہے امی۔ بڑی مامی نے چائے کے ساتھ کافی کچھ کھلا دیا تھا۔" اس نے بہانہ بنایا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ سب لوگ کیسے تھے ادھر؟"

"دلاور ماموں ڈیرے پر تھے کچھ آس پاس کے لوگ ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے۔رضی بھائی اور ہادی حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔چھوٹی مامی بھی ماموں اور بچوں کے ساتھ دو دن پہلے شاپنگ کے لیے کراچی چلی گئی تھیں۔"

ثمرہ خوش ہوئی تھی کہ اس نے ثمرہ کے حوالے سے ہی سب رشتوں کے نام لیے تھے۔

"بھاگی سے کہتی ہوں دودھ دے جائے گی سونے سے پہلے پی لینا۔"

"آپ کو پتا ہے نا مجھے دودھ پسند نہیں۔کل ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی اب سو جاؤں گا۔آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔"

وہ سچ میں سونا چاہتا تھا۔سر بھاری ہو رہا تھا۔

ثمرہ نے اس کی پیشانی پر بکھرے سلکی بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا اور پیشانی کو چوم کر باہر چلی گئیں تو وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔اور پھر وہ سو بھی گیا تھا لیکن کچھ دیر بعد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔شاید کوئی خواب دیکھا تھا یا سردی لگ رہی تھی۔حالانکہ ثمرہ نے جاتے ہوئے اس پر کمبل ڈال دیا تھا۔وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی، بھاگی، ماسی تاج وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی ابھی کچن میں ہی ہوگا۔ایک کپ چائے پی لوں۔شاید اسی لیے سر بھاری ہو رہا ہے کہ چائے نہیں پی۔

وہ اٹھ کر لاؤنج میں آیا تو سنہری اختر بانو کے کمرے سے باہر آ رہی تھی۔جب سے اختر بانو بیمار ہوئی تھیں ثوبان شاہ کی غیر موجودگی میں سنہری ان کے کمرے میں ہی سوتی تھی کہ کہیں رات کو طبیعت خراب نہ ہو۔

"بڑی امی سو رہی ہیں کیا؟"

"نہیں کوئی کتاب پڑھ رہی ہیں۔میں اپنا بستر لینے جا رہی ہوں۔"

"میرے سر میں درد ہے۔میرے لیے چائے بنا دو۔میں بڑی امی کے کمرے میں ہوں۔"

سنہری سر ہلا کر چلی گئی تو وہ دستک دے کر اختر بانو کے کمرے میں چلا آیا۔اختر بانو حیران ہوئی تھیں۔

"آؤ......آ جاؤ بیٹا، طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

''جی......!'' وہ بیٹھ گیا تھا۔

''آپ کو ادب سے بہت لگاؤ ہے؟''

''ہاں بچپن سے ہی ابا جان، اماں جان سب کے ہاتھوں میں فارغ وقت میں کتاب ہی دیکھی۔ابا جان کے پاس بہترین کتابوں کا ذخیرہ ہے۔تم نے ان کی اسٹڈی دیکھی؟''

اختر بانو نے ہاتھ میں پکڑی کتاب تکیے کے پاس کر کے رکھ دی تھی۔

''نہیں، اتنی قربت کہاں تھی کہ ان کی اسٹڈی میں چلا جاتا۔شادی کے دنوں میں زین بھائی کے روم میں ہی رہا۔اور بعد میں بھی......'' نا چاہتے ہوئے بھی لہجے میں شکوہ در آیا تھا۔

''ابا جان اور اماں جان کو علم تھا، باقی کسی کو نہیں۔'' اختر بانو بھی افسردہ ہوئی تھیں۔

''مانی بھی ادب کا دیوانہ ہے۔میں جب لاہور تھا تو حیران ہوتا تھا۔ہر وقت مانی کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔'' اس نے اختر بانو کی افسردگی محسوس کر لی تھی اور دل ہی دل میں نادم ہوا کہ کیوں ایسی بات کی۔سو اس بات کا جواب دینے اور اس کے متعلق کچھ پوچھنے کے بجائے امان کے ادبی ذوق کے متعلق بتانے لگا تھا۔

''ہاں تم تینوں بھائی اپنے بابا جان جیسے ہو، جب کہ امان کچھ کچھ مجھ جیسا ہے۔''

''کچھ کچھ نہیں، بہت زیادہ آپ کی طرح ہی حساس، اعلیٰ ظرف اور اور...... بہت اچھا......'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''تم سب بھائی ہی بہت اچھے ہو۔اللہ تم سب کو نظر بد سے بچائے۔'' اختر بانو کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔شایان کتنی ہی دیر بے دھیان سا اختر بانو کو دیکھتا رہا۔وہ بالکل غیر ارادی طور پر یہاں چلا آیا تھا اور اب اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اختر بانو سے کیا بات کرے۔

''پریشان ہو بیٹا......'' اختر بانو کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

''کیا پریشان نہیں ہونا چاہیے بڑی امی؟'' اس کی سوالیہ نظریں اختر بانو کی طرف اٹھی تھیں۔

وہ جانتی تھیں کہ وہ ڈسٹرب ہے اور یہ آسان نہ تھا اس سچ کو تسلیم کر لینا۔سچ جو یہ تھا کہ وہ عورت

اس کی سگی ماں نہیں تھی جسے وہ اب تک ماں سمجھتا آ رہا تھا۔

''سوری بیٹا! میں اس روز اتنی جذباتی نہ ہوتی تو تمہیں اس تکلیف سے نہ گزرنا پڑتا۔''

اختر بانو نے تو کوشش کی تھی شایان کو باور کروانے کی کہ اس روز وہ ہوش وحواس میں نہ تھیں۔ اس لیے فضول اور غلط بولتی رہیں لیکن ثوبان شاہ نے انہیں بتایا تھا کہ ثمرہ نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ سو اب اسے ٹالنے یا جھوٹ بولنے کا فائدہ نہیں ہے۔

''سوری مت کریں امی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''بابا کہتے ہیں سچ ایک نہ ایک روز ظاہر ہو جاتا ہے اور آپ بھی تو کہتی ہیں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے اور کتاب میں ایسا ہی لکھا ہوتا ہے۔''

''زندگی میں کبھی کبھی اچانک کچھ انہونی ہو جاتی ہے بیٹا، وقت لگتا ہے پھر آدمی اس انہونی کو قبول کر لیتا ہے۔ تم بھی کر لو گے ایک دن۔ بس ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تمہارے کسی عمل، کسی رویے سے ثمرہ آپا کا دل نہ دکھے۔ تمہاری اصل ماں تو وہی ہیں، بہت محبت کرتی ہیں وہ تم سے۔''

''میں بھی ان سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ اختر بانو کے گھٹنوں پر رکھے۔

''لیکن جب میں باشعور ہو گیا تھا تو انہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں تب بھی ان کا ہی بیٹا رہتا۔ بہت زیادتی کی ہے مجھ سے یہ سب چھپا کر۔ آپ نے بھی کبھی ظاہر نہیں کیا۔'' اس کے اندر شکوہ تھا۔

''امی نے میری تربیت بالکل مختلف ماحول میں مختلف انداز میں کی، مجھ میں اور میرے بھائیوں میں بہت فرق ہے۔ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ یہ سب چھپایا نہ جاتا تو میں بھی آپ کی تربیت سے مستفید ہوتا۔ ان کی طرح سوچتا، ان جیسا ہوتا۔''

''ایسا نہیں ہے میری جان، تم بالکل اپنے بھائیوں جیسے ہو، بلکہ ان سے زیادہ اچھے اور پیارے۔ وہ جب نہیں تھے میرے پاس تو تب بھی تم تھے میرے پاس۔'' اختر بانو نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور پھر آنکھوں سے لگایا۔

''مجھے فخر ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔'' اس نے سر اٹھا کر اختر بانو کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی

سر اختر بانو کے گھٹنوں پر رکھ دیا کہ نمی آنکھوں تک چلی آئی تھی۔

''آپ کو کیا پتا بڑی امی، میرے اندر کتنی خامیاں، کتنی کجیاں ہیں۔ میں نے زل کو اغوا نہیں کیا لیکن ایک وقت میں سوچا ضرور تھا کہ اسے اپنا اسیر کر کے تڑپتا ہوا چھوڑ آؤں گا۔''

اس نے سوچا تھا اور کتنے ہی آنسوؤں نے اس کا حلق کڑوا کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے آنکھیں بند کیے ماہتا کے لمس اور اس کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ اختر بانو ہولے ہولے اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ان کی اپنی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ سنہری چائے لے کر آئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اگرچہ وہ رویا نہیں تھا۔

''سنہری، تم اپنا بستر لے آؤ۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔

''شب بخیر...... آپ بھی اب آرام کیجیے گا۔'' وہ جانے کے لیے مڑا تھا۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ وہ یوں ہی اختر بانو کے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا رہے اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

''وعدہ کرو بیٹا! ثمرہ آپا کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دو گے کہ تم بدل گئے ہو۔ ویسے ہی رہنا جیسے تھے۔''

وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا تھا۔

اس نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے کسی عمل یا کسی بات سے ثمرہ کو یہ احساس نہ ہو کہ کہیں اس کے اندر کچھ بدلاؤ آیا ہے۔ لیکن ثمرہ کبھی تو مطمئن دکھائی دیتی اور کبھی اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ نعمان کی شادی میں بھی اس کا موڈ خراب ہی رہا تھا۔ ریحان کی بات پکی کرنے اور مہرین کو انگوٹھی پہنانے جب وہ لاہور گئے تو انہوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ریحان کی منگنی کے فنکشن پر بھی وہ چپ چپ سی تھیں۔ سب کے سب ہی بہت خوش تھے۔ حویلی میں تو جیسے بہار اتری ہوئی تھی۔ ثمینہ اور صفورا نے ہر فنکشن میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

☆......☆......☆

"اب وہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ میں غلط کہہ رہی ہوں کیا وہ عورت تمہیں میرے خلاف سکھاتی پڑھاتی نہیں ہے؟" ثمرہ کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ چونکا۔

"نہیں، بڑی امی نے مجھے کبھی آپ کے خلاف کچھ نہیں کہا اور پھر بھلا کیوں کچھ کہیں گی۔ آپ نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے اپنی خوشی سے اپنا بیٹا دیا آپ نے مجھے پالا ہے۔ اور میں بس آپ کا بیٹا ہوں۔" شایان کو اب اکثر ہی یہ سب دہرانا پڑتا تھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" ثمرہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ہم بہت دنوں سے حیدر آباد نہیں گئے، کیا خیال ہے کچھ دنوں کے لیے وہاں نہ چلیں۔ پہلے شادی کی مصروفیت رہی اور پھر پتا نہیں کیوں آپ نے پروگرام ہی نہیں بنایا۔"

شایان نے سوچا تھا کہ کچھ دن دلاور شاہ کے ہاں رہ کر آئیں گے تو ثمرہ بالکل مطمئن ہو جائیں گی۔ یوں بھی رضی اسے بلا رہا تھا لیکن وہ اختر بانو کی اداسی کے خیال سے نہیں جا رہا تھا۔ نعمان فرحی بھابھی کے ساتھ کراچی چلے گئے تھے۔ ریحان امریکا اور امان لاہور، حویلی میں اتنی رونق کے بعد ایک دم اداسی ہو گئی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے، اتنا عرصہ ہو گیا ہمیں حیدر آباد گئے ہوئے۔ میں آپا سے بھی کہوں گی وہ بھی کچھ دنوں کے لیے گل رعنا کے ساتھ وہاں آ جائیں۔" ثمرہ خوش ہو گئی تھی۔

"آپ اپنا پروگرام فائنل کر کے تیاری کریں تو چلتے ہیں۔ ہاں شاید مجھے دوست کے ہاں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہو جایئے گا۔ ڈنر ان شاء اللہ ساتھ کریں گے۔"

"ان شاء اللہ!" ثمرہ نے بھی کہا تو وہ خدا حافظ کہہ کر ان کے کمرے سے باہر نکل کر اختر بانو کے کمرے کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ ثمرہ نے دیکھ لیا تو خوامخواہ موڈ خراب کر لیں گی۔ وہ اب کہیں آتے جاتے اختر بانو کو بھی سلام ضرور کرتا تھا لیکن ثمرہ کی موجودگی میں نہیں۔

جانے یہ صورت حال کب تک چلنی تھی۔ کب ثمرہ کے شکوک اور وہم ختم ہوں گے، کبھی ختم ہوں گے بھی یا نہیں۔

وہ سوچتا ہوا لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آیا تو اختر بانو کو برآمدے میں بیٹھے دیکھ کر یک دم مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''السلام علیکم بڑی امی......!''

''وعلیکم السلام بیٹا! کہیں جارہے ہو کیا؟''

''جی، ایک دوست کی طرف جارہا ہوں۔'' اس نے برآمدے کے فرش پر منیرا اور اس کے پاس بیٹھی عورت کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے اختر بانو کو کئی بار ملنے کے لیے آنے والی ہاریوں کی عورتوں کو اوپر کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہتے سنا تھا لیکن وہ اپنی برسوں کی عادت کی وجہ سے فرش پر ہی بیٹھتی تھیں۔

''ماسی نوراں نہیں آئی کیا؟ ٹھیک تو ہے نا؟''

''جی...... باہر احاطے کی صفائی کر رہی ہیں۔ میں اپنی اماں کو بی بی جی سے ملانے لائی تھی۔'' منیرا نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اب یہاں کے طور طریقوں کی عادی ہو گئی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے تمہیں ہندوؤں کی طرح ہاتھ مت جوڑا کرو۔'' شایان جھنجلایا تو اختر بانو مسکرا دیں۔ شایان کا رویہ ملازموں کے ساتھ ثمرہ جیسا نہیں تھا۔

''او کے بڑی امی، چلتا ہوں اللہ حافظ......''

''اللہ حافظ بیٹا! اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''ہاں تو منیرا! تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تمہاری اماں اس بار صرف مجھ سے ملنے آئی ہیں۔'' شایان کے جانے کے بعد اختر بانو منیرا کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جی بی بی جی، صرف آپ سے ملنے آئی ہوں۔'' منیرا کی اماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ہاں کہو کیوں ملنا چاہتی تھیں مجھ سے، کوئی کام ہے کیا، اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کر دوں گی۔'' اختر بانو نے نرمی سے کہا۔

''پتا نہیں آپ کے بس میں ہے یا نہیں پر ایک ذرا آس پر چلی آئی ہوں۔'' منیرا کی اماں کی آنکھوں میں امید کی ایک ننھی سی کرن چمکتی تھی اور چہرے پر تھکن اور اداسی تھی۔

''منی اپنے ابا سے ملنے آئی تو باتوں باتوں میں کہنے لگی بڑی بی بی کے میکے والے لاہور شہر کے ہیں۔ سب آئے تھے نعمان شاہ کی شادی پر، بہت اچھے تھے سب......بس بی بی جی لاہور کا نام سن کر دل کو ایک تڑپ سی لگ گئی کہ آپ سے ملوں، کیا پتا......'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر اپنی گود میں رکھے شاپر میں سے کچھ نکالنے لگی تھی۔

''بہت بوجھ ہے میرے دل پر بی بی جی۔ راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ پہلے موت سے نہیں ڈرتی تھی کہ آخر جانا تو ہے ایک دن لیکن اب ڈرنے لگی ہوں۔ اس تصور سے ہی تھر تھر کانپنے لگتی ہوں کہ منی کے ابا نے امانت میں خیانت کی۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''منی نے آپ کو بتایا تھا نا سب......''

''ہاں......!'' اختر بانو کو یاد آ گیا تھا کہ منیرا نے جو کچھ بتایا تھا۔ ''لیکن میں کیا کر سکتی ہوں بتاؤ کیا چاہتی ہو۔ تمہاری سہیلی اب اس دنیا میں نہیں کہ اس سے معافی مانگ لو۔ بس اللہ سے ہی معافی مانگتی رہو۔''

''وہ تو جی ہر وقت مانگتی رہتی ہوں۔ پر اللہ بخشے منی کی دادی کہتی تھی۔ اللہ کے بندے نہ معاف کریں تو وہ بھی معاف نہیں کرتا۔ پر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ جن کے گناہ گار ہیں ان سے معافی بھی نہیں مانگ سکتے۔ زیبو میری سہیلی منوں مٹی تلے دفن ہے اور اس کا بیٹا دنیا میں بھیڑ میں کھو گیا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میں بھی زیبو کی طرح جھوٹی آس دل میں لگائے بیٹھی ہوں کہ شاید کسی روز وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو ڈھونڈتا ہوا آ جائے اور میں اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں اس سے کہوں روز محشر زیبو سے ہماری سفارش کر دینا۔ فضلو کہتا ہے میں جھلوں جیسی باتیں کرتی ہوں۔ پر کیا کروں، میں ایسی ہی ہو گئی ہوں۔ جوان پتر منٹوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔ سرکا سائیں بستر پر پڑا ہے۔ منی کی گود اجڑ گئی۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔'' اس نے دوپٹے کے پلو سے نم آنکھیں صاف کیں۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں زیتون؟'' منیرا نے انہیں اپنی اماں کا نام بتایا تھا۔

''وہ جی یہ جو منیرا ہے نا، منی......اسے اپنے ابا سے بہت محبت ہے۔ بہت پیار کرتی ہے۔ جب گھر آتی ہے اس کی خدمت کرتی ہے۔ اس کے کپڑے دھونا، استری کر کے تہہ کر کے الماری میں رکھنا تو جی اس بار جو یہ گھر آئی نا تو اپنے ابا کے بکسے میں سے یہ لفافہ نکال کے لے آئی۔''

اس نے گود میں رکھے شاپر میں سے ایک براؤن بوسیدہ سا لفافہ نکالا۔ پتا نہیں اسے غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت تھی یا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ لفافہ گود میں رکھ کر اس نے خاموشی سے اس کی بات سنتی اختر بانو کی طرف دیکھا۔

''اس لفافے میں زیبو کا نکاح نامہ اور ایک تصویر ملی۔ منی نے ہی دیکھ کر بتایا تھا مجھے۔ پانچ جماعت پڑھ رکھی ہے اس نے، پڑھ لکھ لیتی ہے۔ شاید یہ اس بیگ میں تھا جو زیبو نے مجھے دیا تھا اور منی کے ابا نے جب زیور بیچا تو اسے بکسے میں رکھ دیا ہوگا۔ یا پھر جب وہ رحیم یار خان گیا تھا اسے ڈھونڈنے تو زیبو نے ہی رکھوایا ہو۔ منی کہتی ہے یہ خالہ زیبو کے نکاح نامے کی کاپی ہے۔ بس جی میں نے منی سے کہا میں تمہارے ساتھ جا کر تمہاری بی بی جی کی منت کروں گی، کہ ان کے میکے والے لاہور رہتے ہیں تو زیبو کا خاوند بھی تو لاہور کا تھا، اس کاغذ میں نام و پتا سب لکھا ہے کیا پتا وہ اسے جانتے ہوں۔ نہ جانتے ہوں تو اسے ڈھونڈ لیں گے۔''

اختر بانو کو اس کی سادگی پر پیار آیا۔

''لاہور کوئی چھوٹا سا شہر نہیں ہے زیتون، جہاں سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ پھر اب اسے ڈھونڈ کر کیا کرو گی زیتون، نہ تمہارے پاس زیور یا پیسہ ہے نہ اس کا بیٹا۔ وہ مل بھی گیا تو کیا کہو گی اس سے......؟''

''پتا نہیں جی......'' زیتون نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''معافی تو مانگوں گی ہی نا اس سے، امانت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ دل پر جو یہ منوں بوجھ پڑا ہے شاید کچھ ہلکا ہو جائے جی۔ جب سے منی نے یہ لفافہ دیا ہے نا، ایک آس سی لگ گئی ہے کہ شاید وہ مل جائے وہ کہتی تھی وہ بہت بڑا افسر ہے، بیٹے کا بتاؤں گی تو ڈھونڈ لے گا اسے۔''

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے اسے گم ہوئے؟'' اختر بانو نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''اٹھارہ انیس سال تو ہو گئے ہوں گے، دس سال کا تھا جی، جب پنجویں (پانچویں) پاس کی تھی میں نے اسے شہر کے ہائی اسکول میں داخل کروانا تھا پر......'' اس نے آہ بھری۔

''تو اتنے سالوں بعد اگر اس کا باپ مل بھی گیا تو کیسے ڈھونڈے گا اسے۔''

اختر بانو کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس غریب کے کسی کام نہیں آسکتیں۔

''ہاں جی کیسے ملے گا وہ۔ میں تو جھلی ہوں۔ جھوٹی امیدیں پالتی ہوں۔ جھوٹے خواب دیکھتی ہوں۔ نری جھلی ہوں۔ پہلے ایسی نہیں تھی۔ اب ہو گئی ہوں۔ پہلے تو گاؤں والے کہتے تھے زیتون بڑی عقل والی اور سیانی ہے۔ صفدر کی زبان پر فالج گرا ہے میری تو عقل پر گر گیا۔

اٹھارہ ورے (سال) سے دعا مانگ رہی ہوں میری زیبو کے بیٹے کو اس کا باپ مل جائے پر شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ دس یارہ (گیارہ) ورے تو زیبو نے بھی رو رو کر دعائیں مانگی تھیں پر اس کی مصلحتیں......'' اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

''معاف کر دینا جی۔ آپ کا ٹیم (ٹائم) ضائع کیا پر کیا کروں منی کے ابا نے تو مجھے جھلا کر دیا، جیتے جی مار دیا۔''

وہ لفافہ دوبارہ شاپر میں رکھنے لگی تو اختر بانو کا دل گداز ہوا۔ اسے اس سادہ لوح عورت پر ترس آیا اور اس کا مایوس چہرہ اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

''یہ مجھے دے دو زیتون۔ لاہور جاؤں گی تو ابا جان کو دکھاؤں گی۔ استاد تھے۔ سینکڑوں ہی شاگرد ہوں گے ان کے کیا خبر وہ اسے جانتے ہوں۔''

زیتون کی آنکھوں میں امید کی بجھتی لو جیسے پھر سے جل اٹھی تھی۔

''یہ ہی تو...... یہ ہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ کیا خبر......'' اس نے کسی تبرک کی طرح لفافہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ان کی طرف بڑھایا۔

☆......☆......☆

دھوپ دیواروں سے اتر کر صحن میں بس آنے ہی والی تھی لیکن اقبال سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے سویا ہوا تھا۔

''اب اٹھ بھی جا اقبال، کیا دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔''

اقبال نے سر سے چادر اتار کر دیکھا چھوٹی بھابھی سرہانے کھڑی غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ سو کب رہا تھا اب نیند تو بس کبھی کبھی ہی اس پر مہربان ہوتی تھی۔ احساس جرم تھا جو

کسی پل سونے ہی نہیں دیتا تھا۔ کمرے میں اس کا دل گھبراتا تھا اس لیے گرمیوں میں صحن میں چارپائی بچھا کر سو جاتا تھا۔ ہوا نہ ہوتی تو پیڈسٹل فین لگا لیتا تھا لیکن پچھلے تین دن سے یہ پنکھا جو برآمدے میں پڑا رہتا تھا وہاں سے غائب تھا۔ اس نے کل رات چھوٹی بھابھی سے پوچھا تھا کہ پنکھا کہاں ہے۔ آج بہت حبس اور گرمی ہے۔

"خراب ہو گیا ہے۔ بچے کھیل رہے تھے برآمدے میں گرا دیا بھاگتے ہوئے۔ اسٹور میں رکھوا دیا ہے۔ جب فالتو پیسے ہوں گے تو ٹھیک کروا لوں گی بہت گرمی لگتی ہے تو اپنے کمرے سو جایا کر۔"

چھوٹی بھابھی کے مشورے پر اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کا کمرہ چھوٹی بھابھی کے سپوتوں کے زیر استعمال تھا۔ اس کے واپس آنے پر وہاں ایک چارپائی اور ڈلوا دی گئی تھی۔

"چچا بھتیجے ایک ہی کمرے میں سو جایا کریں گے۔"

چھوٹی بھابھی نے بڑے آرام سے کہہ دیا تھا لیکن دونوں رات گئے تک جاگتے اور اس قدر شور و غل کرتے تھے کہ اس کا سونا محال ہو جاتا تھا۔ چونکہ ابھی گرمیاں تھیں اس لیے وہ صحن میں سو جاتا تھا۔

"اسٹور کی چابی دیں میں دیکھتا ہوں۔" چھوٹی موٹی خرابیاں تو وہ خود بھی ٹھیک کر لیتا تھا۔

لیکن چھوٹی بھابھی نے دو تین بار مانگنے پر ٹال دیا تو وہ سمجھ گیا کہ جان بوجھ کر پنکھا بھابھی نے اسٹور میں رکھ دیا ہے کہ جب کبھی وہ پنکھا لگا کر سوتا تو وہ بجلی کے زیادہ بل کا شور مچائے رکھتی تھی۔ اسٹور چونکہ چھت پر تھا اس لیے اسے تالا لگائے رکھتے تھے کہ چھت پر ادھر ادھر کے گھروں سے آنے کا راستہ تھا۔

وقت وقت کی بات ہے۔ یہ ہی بھابھی تھی جو اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر پاؤں میں چپل ڈالنے لگا۔

"ہاں تمہارے بھائی کہہ گئے تھے کہ تم اٹھ جاؤ تو دکان کا چکر لگا لینا۔ سودا بھجوانا ہے گھر۔" چھوٹی بھابھی ابھی تک کھڑی یوں ہی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا......" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دری اور چادر تہہ کی۔ چارپائی اٹھا کر برآمدے میں کھڑی کی۔

"ہونہہ......کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تو وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر لنگڑاتا ہوا واپس صحن کی طرف چلا گیا کہ باتھ روم وغیرہ صحن میں ہی تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو بڑی بھابھی برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''ہوگئی تمہاری صبح۔'' بڑی بھابھی کے لہجے میں طنز تھا، وہ شرمندہ ہوا۔

''جاگ تو میں کب سے رہا تھا، بس یوں ہی سستی سے لیٹا ہوا تھا۔ رات مچھروں نے بہت تنگ کیا، نیند نہیں آرہی تھی۔ دیر تک جاگتا رہا۔ پنکھا بھی نہیں تھا۔ اور ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔''

''بھابھی! ناشتا دے دیں تو دکان پر جاؤں۔ بھائی صاحب نے دکان پر بلایا ہے۔''

''یہ ناشتے کا بھلا کون سا ویلا (وقت) ہے اقبال میں تو دوپہر کے لیے ہانڈی چڑھانے لگی تھی۔ ناشتا کرنا ہو تو ٹیم (ٹائم) سے اٹھ جایا کر بھائی۔''

اب وہ کیا کہتا کہ وہ تو اٹھا ہی ہوا تھا۔ آملیٹ اور پراٹھوں کی خوشبو نے کتنی بار مجبور کیا کہ اٹھ کر چلا جائے خود ہی لیکن پھر صبر کیے انتظار کرتا رہا کہ کوئی اسے ناشتے کے لیے بلائے تو وہ اٹھ جائے۔ لیکن کسی نے بلایا ہی نہیں۔ سب ناشتا کر کے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے تھے۔ بچے اسکول کالج اور دونوں بھائی دکان پر۔ کبھی کبھار تو وہ خود ہی ڈھیٹ بن کر بن بلائے، ناشتے کھانے کے لیے چلا جاتا تھا۔ لیکن آج دل کا نہیں چاہ رہا تھا۔

''اچھا دیکھ لے ادھر چنگیر میں روٹی پڑی ہوگی۔ میں نے تیرے لیے پکا تو دی تھی چائے بھی پڑی ہوگی۔ گرم کر لے۔'' بڑی بھابھی کبھی کبھار اس کا لحاظ کر لیتی تھیں۔

''رات کی دال پڑی ہے ادھر کٹوری میں۔''

اس نے بنا کچھ کہے چولھے پر رکھی چائے والی دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ آدھا کپ کالی سیاہ چائے پڑی تھی۔ پھر چنگیر میں دیکھا تو آدھی بچی ہوئی رات کی روٹی تھی۔ بڑی بھابھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

''لو، میں نے خود اقبال کے لیے روٹی پکا کر رکھی تھی، کدھر گئی۔''

باہر جاتے جاتے اس نے بڑی بھابھی کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ دونوں بھابیوں کو اس کا وجود کھٹکتا

تھا، جانتا تھا لیکن چھوٹی بھابھی تو جیسے اسے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس گھر میں اس کا حصہ بھی تھا اس لیے اسے گھر سے نکال نہیں سکتے تھے۔ بھابھیاں مجبوراً اسے برداشت کرتی تھیں۔ بھائیوں نے انہیں سمجھایا تھا کہ بیوی بچے تو ہیں نہیں، اس کا حصہ ہمیں ہی ملنا ہے۔ دو وقت کی روٹی ہی تو کھاتا ہے۔ برا سلوک کرو گی تو اپنا حصہ مانگ بیٹھا تو اتنی رقم نہیں ہے کہ اس کا حصہ دے دیں۔ گھر اور دکان فروخت کر دی تو روزی روٹی سے بھی جائیں گے اور ٹھکانے سے بھی۔

اس نے خود بڑے بھائی کو بھابھیوں سے کہتے سنا تھا۔ لیکن کہاں جاتا۔ اسے یہاں ہی رہنا تھا۔ حصہ مانگ بھی لیتا تو وہ پیسے کتنے دن کھاتا۔ یہاں جیسے تیسے پکا پکایا مل ہی جاتا تھا۔ بیمار ہوتا تو بھائی دوا دارو بھی کر دیتے تھے۔ حال چال پوچھ لیتے تھے۔ خود کوئی کام اس سے ہوتا نہیں تھا۔ پاکستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا بہت خوف ناک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ سات آٹھ ماہ تو بیڈ پر ہی پڑا رہا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی تھی راڈ پڑا تھا۔ چلنے کے قابل تو ہو گیا تھا لیکن چلتے ہوئے تھوڑا لنگڑاتا تھا۔

والد کی پرچون کی دکان تھی لیکن وہ ایک روز بھی دکان پر نہیں بیٹھا تھا۔ شکار کا شوقین تھا۔ میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کچھ عرصہ چھوٹے چھوٹے کام کیے پھر شکار کے لیے آنے والے لوگوں کو شکار پر لے کر جانے لگا۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ جن دنوں شکار کا موسم نہ ہوتا، وہ رحیم یار خان سے چیزیں لے کر ملتان اور بہاولپور وغیرہ جاتا اور وہاں کی اشیاء یہاں لا کر فروخت کر دیتا تھا لیکن اب یہ دونوں کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ بھائیوں کے ساتھ دکان پر بیٹھ جائے لیکن انہوں نے منع کر دیا تھا کہ اتنی بڑی دکان نہیں ہے جہاں تین بندوں کی ضرورت ہو۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے ان کی آمدنی کے متعلق پتا چلے کہ گھر میں ہر وقت اخراجات پورے نہ ہونے کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ اپنے جیب خرچ کے لیے دو تین جگہ اس نے نوکری کی تھی لیکن پھرتی سے کام نہ کر سکنے کی وجہ سے ایک دو ماہ بعد فارغ کر دیا جاتا تھا۔

"اب یہاں کھڑے کیا دم کر رہے ہو۔ اگر فارغ ہو گئے ہو تو جاؤ دکان پر، کیا پتا کوئی اور بھی کام ہو تم سے تمہارے بھائی کو۔" چھوٹی بھابھی اچانک ہی کمرے سے باہر نکلی تھی۔ وہ چونکا۔

"جا رہا ہوں بھرجائی۔"

وہ ہولے ہولے چلتا ہوا بیرونی گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ دو تین دن سے چلتے ہوئے ٹانگ میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا۔ بڑے بھائی از راہ مروت پندرہ بیس دن بعد کچھ رقم ہاتھ میں پکڑا دیتے تھے۔

"یہ رکھ لو اپنے سگریٹ پانی کے لیے۔"

وہ خاموشی سے لے لیتا لیکن خود سے کبھی نہیں مانگے تھے۔

"اور تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا بلکہ اس سے بھی برا۔" اس نے گلی میں چلتے ہوئے خود سے کہا اور جیب کو ٹٹول کر دیکھا۔ چند روپے تھے۔

ایک کپ چائے اور ایک سگریٹ کی ڈبیا تو آ ہی جائے گی۔

وہ اب نذیر کے چائے کے کھوکے کی طرف جا رہا تھا۔ نذیر اس کا بچپن کا سنگی تھا۔ جیب میں پیسے نہ بھی ہوتے تو ایک کپ چائے پلا ہی دیتا تھا۔ نذیر ٹرے میں رکھے کپوں میں چائے ڈال رہا تھا۔

"نذیر یار! ایک کپ چائے بنا دو۔"

وہ تھکا تھکا سا بینچ پر بیٹھ گیا۔ نذیر کے کھوکھے کے پاس ہی گلی میں دو تین بینچ رکھے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی دو لکڑی کی میزیں تا کہ اگر کسی نے وہاں ہی بیٹھ کر چائے پینی ہو تو پی سکے۔

"بس دو منٹ یار! یہ چائے بھجوا دوں۔" نذیر نے ٹرے چھوٹے لڑکے کو پکڑائی۔

"لے جاؤ...... اور ہاں عبدل صاحب اور راجہ صاحب سے پچھلا حساب لے آنا۔"

یہ چھوٹا سا بارہ تیرہ سال کا لڑکا اس نے اپنی مدد کے لیے رکھا ہوا تھا۔

آس پاس کے بازاروں میں سارے دکان داروں کو وہ ہی چائے پہنچاتا تھا۔

"کیا حال ہے اقبال...... ٹانگ کا درد کچھ بہتر ہوا۔" نذیر نے ساس پین میں چائے کے لیے پانی ڈال کر چولھے پر رکھا۔

"درد تو ویسا ہی ہے یار۔ بس گولی لے لو درد کی تو تھوڑی دیر آرام رہتا ہے۔" اقبال آج دو دن بعد آیا تھا۔ دو دن وہ ٹانگ کے درد کی وجہ سے گھر سے نکلا ہی نہیں تھا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے اقبال! ڈاکٹر کو چیک کرواؤ۔ کہیں تکلیف بڑھ ہی نہ جائے۔'' اس نے پانی میں پتی ڈالی۔

''ہاں لیکن میرے پاس ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ سرکاری ہسپتال جانے کا سوچ رہا ہوں لیکن وہاں بھی گھنٹوں بیٹھنا پڑے گا۔''

اس نے نذیر سے اپنی حالت کبھی نہیں چھپائی تھی۔

''مجھ سے کچھ رقم لے لو۔ اور ڈاکٹر کو چیک کروالو۔''

اسے نذیر کے خلوص پر شک نہیں تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں یار، تم رہنے دو۔ بھائی صاحب سے بات کروں گا۔''

''ویسے یار اقبال! تمہیں کچھ سوچنا چاہیے اپنے لیے۔ نہ جانے کتنی زندگی ہے کیا یوں ہی پیسے پیسے اور چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھتے رہو گے۔'' نذیر نے چائے کپ میں ڈال کر اس کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی کاؤنٹر پر رکھے جار میں سے دو تین کیک رسک نکال کر تشتری میں رکھے۔ چولھے کی آنچ کم کی اور خود بھی اس کے سامنے بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''یہ کیک رسک کی ضرورت نہیں ہے نذیرے۔'' اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔ اس وقت اسے چائے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

''لے لے یار۔ اب خالی پیٹ صرف چائے نہ پی۔'' نذیر کو اندازہ تھا کہ آج بھی اس کی بھابھیوں نے اسے ناشتے کے لیے نہیں بلایا ہوگا۔

''یہ کیک میری طرف سے۔''

اقبال نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا اور کیک رسک اٹھا کر چائے میں ڈبو کر کھانے لگا۔

❁ ❁

ناول ماہ الملوک کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔